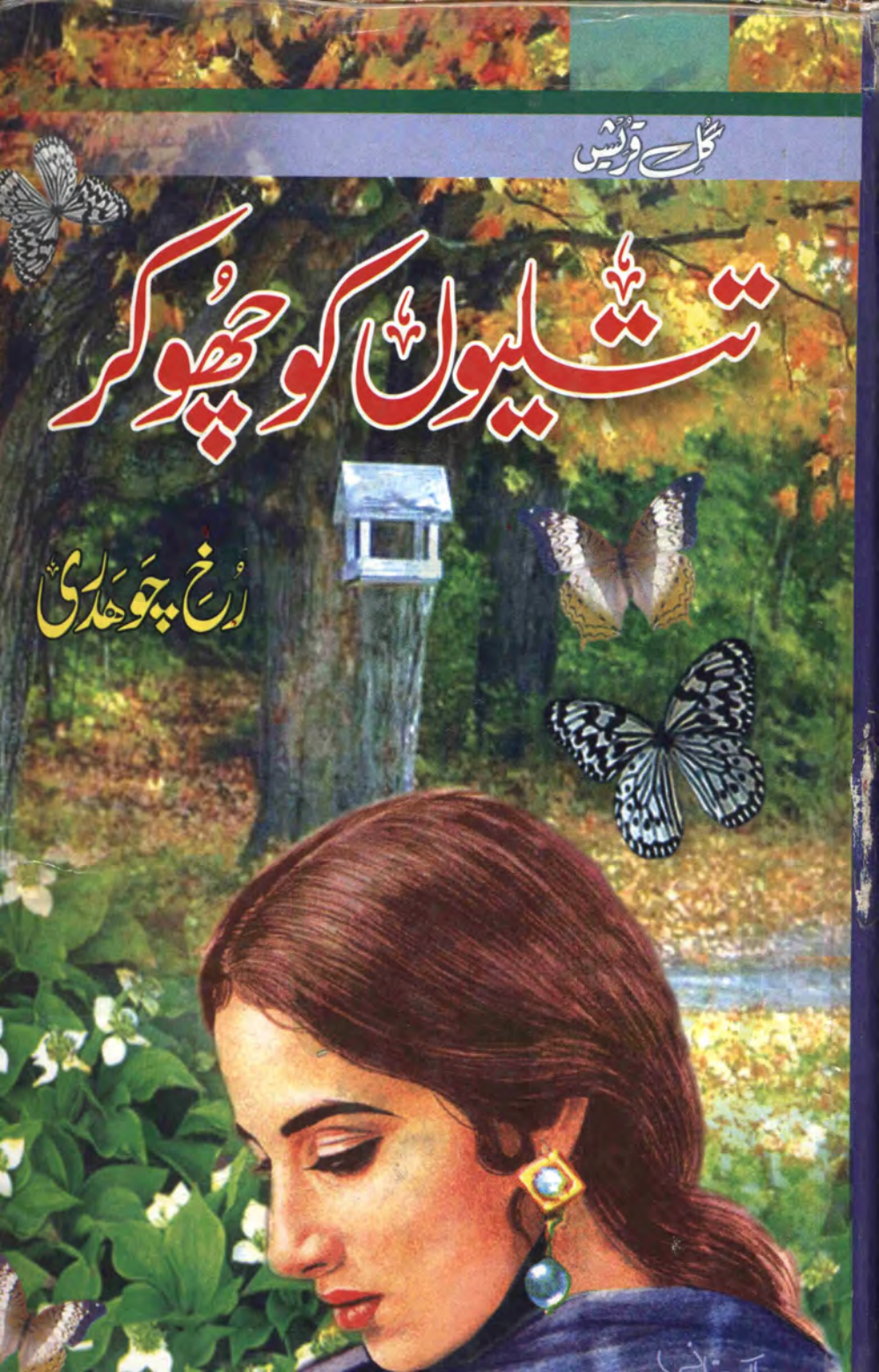


گلے و قیس

# تشیون کو چھو کر

رُخ پوعلی



# انتساب

اپنے عظیم ابو اور امی کے نام کہ  
اللہ تعالیٰ کی عنایات اور کرم نوازیوں کے بعد  
جن پایاں محبت، اعتماد اور بہترین تعلیم و تربیت  
نے آج مجھ جیسی نا اہل کو صاحب کتاب کر دیا۔

”کاش آج میری ماں میرے ساتھ ہوتی  
میرے سر پہ اُس کی دعاؤں کی ردا ہوتی  
میری تمام کامیابیوں کی ہر ثرائی  
آج اس کے ہاتھ ہوتی کاش  
آج میری ماں میرے ساتھ ہوتی  
کاش..... کاش..... اے کاش“

رنج چوہدری

## پیش لفظ

”الحمد للہ رب العالمین“

کہ جس کے قبضہ قدرت میں ہے زمین و آسمان جو وحدہ لا شریک ہے علیٰ کل شئی قدیو ہے اور جو مجھ ناچیز پر اس قدر مہربان ہے کہ کتاب خواہاں کو صاحب کتاب کا اعزاز بخش دیا اور میں نااہل اس قدر مجبور اور بے بس کہ شکرانہ ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتی فقط یہ عرض کر سکتی ہوں کہ اے رب العالمین مجھ گناہ گار کا اتنا شکرانہ قبول فرما جتنا میں ادا نہیں کر سکتی اور عرض کرتی ہوں۔

”اے اللہ تیرا شکر ہے کہ اتنی تعداد میں جتنا کہ تیرا علم ہے“ ”تیلیوں کو چھو کر“ ترتیب کے لحاظ سے یہ میرا پہلا ناول ہے اور یہ..... ناول اس عمر میں لکھا گیا جو انسان کی عمر واقعی تیلیوں کے پیچھے بھاگنے اور پکڑنے کی ہوتی ہے..... یہ بات بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہیں کہیں آپ کو تحریر ناچختہ سی محسوس ہو جو کہ ہوگی۔ تو اس ناچختگی کو گرفت میں لینے کی بجائے عمر کی ناچختگی جان کر درگزر کر دیا جائے اور اس بات کی وضاحت یعنی یوں کرنی پڑی کہ آج جب ”تیلیوں کو چھو کر“ کا پیش لفظ لکھنے کے لیے قارئین کے خطوط پڑھے تو تعریف و تنقید دونوں ہی بھرپور انداز میں پڑھنے کو ملی میرے پختہ عمر اور پختہ سوچ، قارئین کو میرا یہ ناول بہت ناچختہ اور بچکانہ لگا جبکہ ”تیلیوں کو چھو کر“ میرے ان قارئین کا پسندیدہ ترین ناول ٹھہرا جن کی اپنی عمر تیلیوں کو پکڑنے کی تھی۔

بہر حال چونکہ یہ میرا پہلا ناول تھا۔ پہلا تجربہ تھا اور اس ناول کا محرک میرے ہی کالج میں دو جڑواں بہنیں بنیں دونوں بہنیں قدرے حسین شاہکار تھیں ایک ہی سانچے میں ڈھلی ان بہنوں میں چہرے پر صرف ایک تل کا فرق تھا جو ایک کے چہرے پر تھا اور دوسری کے چہرے پر نہیں تھا ان کی ذاتی کہانی تو نجانے کیا تھی۔ بہر حال ان کو دیکھ کر میرے دماغ نے ایک کہانی ترتیب دی جو لفظوں کی صورت میں ڈھل کر صفحہ قرطاس پر اترنے کے بعد میں نے شعاع ڈائجسٹ میں قسط وار طور پر چھپنے کیلئے ان کو دے دی۔

اور الحمد للہ میرے بے شمار قارئین کو اس کی ہر قسط بہت پسند آئی خود ہماری ایڈیٹر اسٹیل ا لصبور نے میرے انداز تحریر کو بہت سراہا میرے انداز کو بہت خوبصورت اور منفرد قرار دیا جس سے

”رخ ناول پھیلا نا اور سینٹا اچھی طرح جانتی ہے“..... اصل الصبور کا یہ جملہ کسی اعزاز سے کم نہیں میرے لیے۔ اسی طرح ملکہ طرہ و مزاج انجم انصار نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ نگہت عبد اللہ، صالحہ محمود میری بہترین دوست ہیں جن کی پیار بھری ڈانٹ اور مشورے میرے لیے بے حد قیمتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کے بعد میرے ان میں مخلص دوستوں نے میرے والدین کی محبت دعاؤں اور دیے گئے اعتماد نے میری تحریر کو نکھارا ہے۔

یہ الگ بات کہ آج میری ماں میرے پاس نہیں جو اپنی دعاؤں کو میری کامیابی کی صورت وصول کرتیں۔ نبانے کیا جلدی تھی امی جی کو جانے کی کہ تمام عمر ساری اولاد کی کامیابیوں کی دعاؤں کے بیج بوتی رہیں آبیاری کرتی رہیں اور جب وہ دعائیں تناور درخت بن کر پھل دینے لگیں تو نہ اس درخت کی چھاؤں میں بیٹھیں نہ ہی پھل کھایا۔ مگر اللہ تعالیٰ سے امید کامل ہے کہ میری ماں اللہ کے فضل سے جنت کے پھل کھا رہی ہوں گی۔

بہر حال ”تتلیوں کو چھو کر“ کی مختصر کہانی میں نے آپ کو سنا دی ہے ”تتلیوں کو چھو کر“ میری ادبی زندگی میں ”سنگ میل“ ثابت ہوا اور اس کے بعد تاحال میرے اللہ کے فضل و کرم سے شعاع، خواتین، پاکیزہ، آنجل، ردا اور نوآموز پرچوں ”صدر رنگ“ اور ”نازنین“ ڈائجسٹ میں دس ناول چھپ چکے ہیں اور کچھ قسط وار جاری ہیں۔ جن میں ”ساحلوں کے گیت“، ”دشت دل“، ”نہ چاند راتیں نہ پھول باتیں“ اور ”سکوت شب کے رنجشے“ کتابی شکل میں آپکے ہیں باقی زیر اشاعت ہیں۔ یہ سب اللہ کا کرم والدین کی دعائیں ہیں، بہنوں بھائیوں رابعہ کے علاوہ میری عزیز از جان دوست ”طلعت“ کی محبت اور مشورے اور تعمیری تنقید اور میری منہ بولی ماں ”آنٹی امینہ غنی“ کی دن رات دعاؤں کا شکر ہے کہ آج میں صاحب کتاب کے عہدے پر فائز ہوں قارئین آپ کی تعریف کی طرح آپ کی تنقید بھی میرے لیے بے حد اہم ہے اور میری تحریر کو نکھارتی ہے اس لیے میرا ناول ”تتلیوں کو چھو کر“ ضرور پڑھیے اور پھر اپنی رائے بذریعہ پبلشرز دیجئے گا۔

اللہ کی بے حد شکر گزار اور آپ سب کی دعاؤں کی طالب۔

رخ چوہدری

”عابی۔ چلتے ہیں۔ اس وقت سب سو رہے ہیں۔ آؤ“ فرمان نے آہستگی سے عابدہ سے کہا۔ ”نہیں فرمان بھائی۔ آغا ناراض ہوں گے۔ انہوں نے پائیں باغ میں جانے سے منع کر رکھا ہے اور وہ بھی اس وقت دوپہر ہیں۔“ عابی آغا جی کے ڈر سے ہچکچا رہی تھی۔ ویسے خود بھی اسے ڈر لگتا تھا۔ ”پاگل۔ ان کو کیا پتا چلے گا۔ تم آؤ ورنہ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ ناراض ہو جاؤں گا۔“ فرمان کے پاس یہ بہت بڑا ہتھیار تھا کہ وہ ذرا سی بات نہ مانتی تو وہ اپنی ناراضگی کا اعلان کر دیتا۔ ”اچھا۔ تم ناراض نہ ہونا۔ میں چلتی ہوں۔“ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مگر وہاں کرنا کیا ہے فرمان؟“ وہ اس کے ساتھ چلتی پوچھ رہی تھی۔ ”کرنا کیا ہے، امر دوکھائیں گے، کیریاں توڑیں گے۔ بیچ بڑا مزہ آئے گا نمک لگا کر کھائیں گے۔“ وہ چٹخارے لیتا ہوا بولا۔

”تو کیا آج بھی ماما ببا کو چار پائی سے باندھنا پڑے گا؟“ وہ اس سے معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ ”نہیں۔ آج کچھ اور سی کریں گے۔ تم آؤ تو۔“ ”اچھا۔ وہ بے بسی سے بولی۔ ہر اچھے برے لمحے میں اس کا ساتھ دینا عابی کی مجبوری تھی، دوستی جو تھی اور پھر شریہ سافر مان اسے اچھا بھی بہت لگتا تھا۔

”آہستہ عابی، خان بابا کی نیند بہت ہلکی ہے۔ ابھی جاگ جائیں گے۔“ فرمان اور عابی آہستگی سے چل رہے تھے۔ بابا گھنے بیڑ کی چھاؤں میں مخو خرائے تھے مگر سوکھے پتوں پر پاؤں پڑنے سے جو شور ہوتا وہ ذرا سائل کر پھر سو رہے۔ فرمان نے بڑھ کر ان کے نیچے کے پاس رکھی نظری سینک اپنی جیب میں ڈال لی۔

”فرمان۔ اس طرح تو ان کو نظر نہیں آئے گا۔“ عابی فرمان کی یہ حرکت سمجھ نہیں پاتی۔

”یہی تو بات ہے لڑکی جو تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“



فرمان امرود کے ایک درخت پر چڑھ بیٹھا۔ اچھے اچھے امرودوں سے اپنی جیسیں بھر لیں اور چند ایک عانی کی طرف اچھال دیے۔ اسی طرح کیریاں بھی توڑیں اور عانی سارا وقت خان بابا کے سونے رہنے کی دعا کرتی رہی۔ فرمان بھی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ مگر پھر بھی ایک کیری سیدی بابا کے منہ میں جا کر فٹ ہو گئی تو بابا بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

”اوو چو۔ خانہ خراب، کون ہے تم؟ ہم ابھی ایک سیکنڈ میں تم کو پکڑتا ہے۔“ بابا چشمہ نزلتے ہوئے بولے تو دونوں سر پٹ بھاگے کیونکہ بابا کا ایک سیکنڈ دس منٹ بعد ہی ہوتا تھا۔ جب تک وہ اٹھتے وہ دونوں اپنے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔

”اف۔ بابا کا چشمہ تو میرے ساتھ آ گیا۔“ فرمان چشمہ نکالتے ہوئے بولا۔

”اب یقیناً وہ درخت کی پٹائی شروع کر دیں گے۔“ عانی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اب کیا ہو سکتا ہے۔ نمک لاؤ، کیریاں کھائیں۔“

فرمان کچی اور مکھی کیریوں پر نمک لگا کر کھانے لگا مگر عانی بابا کے متعلق اور پھر فرمان کے متعلق سوچ رہی تھی جس کو آغا جی سے ڈانٹ پڑی تھی۔

”صالحی بیگم! یہ تمہاری چپارانی کچھ ست ہو گئی ہے۔ ابھی تک چلم بھر کر نہیں لائی۔“ آغا جی حقے کی بیسی نال ہاتھ میں لیے بے چینی سے چلم کا انتظار کر رہے تھے۔

”آپ بھی تو کمال کرتے ہیں۔ آپ کے حقے کی چلم کے لیے سے خاص طور پر آگ جلائی پڑتی ہے ورنہ تو گھر میں گیس ہے تو اس میں دیرو تو لگے گی ہی۔ اس میں بیچاری چپا، یہ تصور۔“ صالحی بیگم فوراً چپارانی کی حمایت میں بولیں۔

”بیگم صاحب، ہم خون پی جائیں گے اس بڑھے کا۔“ چپاروتی ہوئی آگئی۔

”کیوں، آج پھر اس نے پان میں نسوار بھری کیا؟“ آغا جی نے مسکرا کر چپا کو دیکھا۔

”نہیں صاحب، آج اس نے ہمیں چور بنا دیا۔ بولا تم نے ابھی امرود توڑا ہے۔ قسم لے لو صاحب، ہم نے چوری نہیں کی۔“

”تم ملکان کیوں ہو رہی ہو چپا، اس کم بخت کا چشمہ پھر کسی بچے نے شرارت سے اڑا لیا ہوگا۔“

”جی بیگم صاحب، چشمہ تو نہیں تھا ناک پر۔“ صالحی بیگم کی بات پر چپا کو کچھ تسلی ہوئی۔

”چپا۔ تم چلم بناؤ جا کر میں ابھی دیکھتا ہوں، کسی کی شرارت ہے؟“

آغا جی کھتہ پیروں میں ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور گھر کے سب بچوں کو ہال کمرے میں جمع ہونے کو کہا۔ تو سب ڈرتے ہوئے آگے۔ سب آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ سوائے عانی اور فرمان کے، معاملے کی نوعیت کوئی نہیں جانتا تھا۔ عانی کا ننھا سادل کسی زخمی پرندے کی طرح کانپ رہا تھا۔

”خلیفہ کا چشمہ کس نے اٹھایا تھا؟“ آغا جی کی آواز خاموش فضا میں گونجی تو سب بہم گئے۔

”جی ہمیں نہیں معلوم۔“ رحمن نے آہستگی سے کہا۔

”لقمان۔“ آغا جی نے لقمان کی طرف دیکھا۔

”آغا جی ٹھیک ہے، ہم خان بابا کے ساتھ شرارت کرتے رہے ہیں مگر اب تو ہم بڑے ہو گئے ہیں۔“

لقمان کو غالباً آغا جی کا خود پرشہ کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ کیونکہ اب وہ بڑے ہو چکے تھے۔

”ہوں۔“ آغا جی نے ہوں کو لباً کھینچا مگر یوں ان کی بات پر اعتبار کر لیا گیا تھا۔ اب ان کی نظریں فرمان پر

تھیں جس پر ان کو شبہ ہی نہیں، یقین تھا کہ یہ شرارت اسی کی ہے۔

”فرمان۔“ آغا جی کی آواز پر فرمان کا قلع خٹک ہو گیا۔ اس نے عانی کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں

میں کچھ کہا تو اس نے سعادت خدی سے نگاہیں جھکا لیں۔

”آغا جی وہ ہیں۔“

عانی منمنائی اور کمرے میں موجود بڑے بہن بھائیوں کی طرف دیکھا۔ گویا وہ ان کی موجودگی میں اقبال

جرم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آغا جی نے سب کو واپس بھیج دیا۔

”عانی بیٹے۔ یہاں آؤ میرے پاس آؤ، ساری بات بتاؤ۔“ آغا جی نے پیار سے عانی کو اپنے پاس بلایا تو

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے سامنے سر جھکانے لکھڑی ہو گئی۔

”ہاں اب بتاؤ۔“ آغا جی نے اس کا سراو پر کیا۔

”وہ آغا جی۔“ اب اقبال جرم کرنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ ”وہ آغا جی بابا کا چشمہ میں نے اڑایا ہے۔“

وہ جلدی سے کہہ گئی تو فرمان نے گویا سکون کا سانس لیا اور یوں انجان بن کر کھڑا ہو گیا، گویا اس معاملے

سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ آغا جی نے غور سے دونوں کو دیکھا۔ وہ ویسے بھی سمجھتے تھے۔

”فرمان تم جاؤ اپنے کمرے میں۔“

”جی اچھا آغا جی، ویسے اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے تو روکا تھا کہ بڑوں کے ساتھ مذاق نہیں

کرتے مگر یہ نہیں مانی۔“

وہ مزید اپنی صفائی پیش کرتا ہوا بولا کہ شب کا احتمال نہ رہے۔ اس کے جانے کے بعد آغا جی کو لمبی آگئی مگر

دبا گئے۔

”ہاں میں جانتا ہوں تمہیں بھی تم نے یقیناً منع کیا ہوگا۔ جاؤ اب۔“ اس کے جانے کے بعد آغا جی پھر

عانی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”تو واقعی یہ شرارت تمہاری ہے عانی اور واقعی فرمان نے تمہیں روکا تھا ایسا کرنے سے۔“

”جی آغا جی۔“ عانی نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا۔

”جج کہہ رہی ہو؟“ آغا جی جج جھوٹ کی تصدیق اسی سے کرنا چاہتے تھے۔

اس نے اثبات میں سر مزید جھکا دیا۔

”جج ہمیشہ سراٹھا کر بولا جاتا ہے عانی بیٹے۔ یوں سر جھکا کر نہیں۔ اس لیے بیٹے، سانچ کو کبھی آج نہیں

سکتی۔ اب بتاؤ یہ شرارت تمہاری تھی؟“

”جی نہیں۔“

اس نے سراٹھا کر کہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے فرمان کے راز سے پردہ اٹھانا پڑا۔ اسے بہت دکھ ہوا

تھا۔ مگر اب آغا جی کے سامنے تو کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا۔

”یہ ہوئی نابات دیکھو بیٹی، آپس کی محبت بڑی اچھی چیز ہوتی ہے اور میں بے حد خوش ہوں کہ تم سب میں بہت پیار ہے لیکن بیٹے، محبت کا کیا چاہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ جسکو چاہتے ہیں اس کی برائیوں پر پردہ ڈالیں۔ تم لوگ ابھی چھوٹے ہو اور زیادہ غلطیاں کرتے ہو۔ اگر تم لوگ ایک دوسرے کی برائیوں کی یوں ہی پشت پناہی کرتے رہے تو بیٹے تم لوگ سچ بولنا تو درکنار سچ کو پہچان بھی نہیں پاؤ گے اور تم لوگ جھوٹ اور فریب کی دلدل میں جھنٹے چلے جاؤ گے۔ اس لیے آئندہ جھوٹ نہیں بولنا۔ اس سے تمہارا بھی نقصان ہے اور اس کا بھی جس کے لیے تم جھوٹ بولو گی۔ ٹھیک ہے نا؟“ آغا جی دھیمے لہجے میں اسے سمجھاتے رہے اور وہ ان کی ایک ایک بات کو ذہن نشین کرتی رہی۔

”جاؤ بیٹے، اب فرمان کو بھیجو۔“

”فرمان کو“ عالی کی روح کانپ گئی۔ ایک تو اس کو ڈانٹ پڑے گی اور دوسرے وہ اس سے ناراض ہو جائے گا۔ اور اس کی ناراضگی وہ کیونکہ برداشت کرے گی۔

”ہاں، فرمان کو۔ کیوں؟“ آغا جی نے قدرے حیرانی سے کہا۔

”آپ اس کو۔“

”میں اس کو کچھ نہیں کہوں گا جو باتیں تم سے کی ہیں، وہی اس سے کروں گا۔“

آغا جی اس کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ اس نے فرمان سے کہا تو وہ اس کے سر ہو گیا۔

”کیا ضرورت تھی سچ بولنے کی؟ آگئی کہیں سے چٹام بی بی۔ اب میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا۔ نہ ساتھ کھیلوں گا۔ میں بس ناراض ہوں تم سے۔“ وہ مسلسل اسے ڈانٹنے جا رہا تھا۔

”فرمان! قسم سے میں نے نہیں بتایا۔ ان کو پتا نہیں کیسے معلوم ہو گیا تھا خود بخود۔“ وہ شدت سے رو پڑی۔ بھلا اس کا قصور ہی کیا تھا۔ وہ اس سے ناراض اور برہم کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

”فرمان پلیز ناراض نہ ہونا میں۔“

اس کی ناراضگی ہی تو اس کے لیے سوہان روح ہوتی تھی۔ اور اس کی ناراضگی کے خوف سے تو وہ اس کے ساتھ ہر شرارت میں شریک ہو جاتی۔ جھوٹ بھی بول دیتی ورنہ اسے خود خبر تھی کہ جھوٹ بولنے والے۔ اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتے ہیں۔

”میں تم سے ناراض ہوں بس۔“

وہ دھونس سے کہتا ہر نکل گیا تو وہ اور شدت سے رو پڑی۔ اب جانے کتنے دن روغنا رہے گا وہ اس کی واپسی تک اس کی فکری کا خیال کر کے روتی رہی مگر جب فرمان واپس آیا تو وہ اتنا ناراض نہیں تھا۔ اس لیے کہ اب اسے پتا چل گیا تھا کہ عالی کا قصور نہیں۔ آغا جی سچ اگھوانے کا فن جانتے تھے۔ بے شک وہ اس سے اب ناراض نہیں تھا لیکن منائے بغیر مان جانا بھی تو نامناسب تھا، اس لئے منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ عالی نے چپکے چپکے ایک دوبار اسے دیکھا تو اس کا جی چاہا اسی وقت اس کو منالے کیوں روٹھ جاتا ہے وہ اس سے۔ برداشت نہ ہو سکا تو وہ آہستگی سے چلتی اس کے قریب آگئی تو وہ منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

”فرمان تم کتنا ناراض ہو؟“ وہ آہستگی سے بولی۔

”دومن“ وہ کاٹ کھانے والے انداز میں بولا۔

”میں تمہیں کیسے مناؤں؟“

وہ روز روز ہی روٹھتا اور وہ ذہنی منائی لہذا طریقے بھی ختم ہو چکے تھے۔ اب اسی سے پوچھ رہی تھی کہ کیسے

مناؤں؟

”میں کیوں بتاؤں، خود ہی سوچو کوئی طریقہ۔“

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بے نیازی سے کہہ رہا تھا اور وہ کوئی طریقہ سوچ رہی تھی مگر معصوم ذہن میں کوئی طریقہ بھی نہیں آ رہا تھا۔

”اجھا میں وعدہ نہیں وعدہ بھی نہیں، آغا جی کو سب پتا چل جاتا ہے، پتا نہیں کس طرح سے۔ پھر میں کیسے مناؤں تمہیں؟“

عالی اس کی ناراضگی سے بھی ڈرتی تھی اور آغا جی سے بھی، اس لیے وہ زنج ہو گئی تھی۔ فرمان نے گھور کر اس کی طرف دیکھا جو ابھی ہوئی بیٹھی تھی۔

”ٹھیک ہے، اس بار میں خود ہی مان جاتا ہوں مگر آئندہ نہیں مانوں گا۔“ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا احسان کرتا ہوا بولا تو وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

”چمپا بھئی، جلم تیار ہو گئی کہ نہیں؟“ آغا جی اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

”حد ہو گئی آغا صاحب، چمپا بے چاری دوبار بھر چکی ہے مگر آپ کی عدالت ہی درخواست ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ کس نے چرا لی تھی خان کی عینک؟“ صالہ بیگم اپنا چشمہ درست کرتی ہوئی بولیں۔

”عالی نے؟“ آغا جی حقے کی نال منہ سر لگاتے ہوئے بولے۔

”عالی نے؟“ ہوں، میں سمجھی، یہ شرارت فرمان کی ہوگی اور عالی نے سر لے لی ہوگی۔ بہت چاہتی ہے فرمان کو۔ اس کی ذرا سی ناراضگی اسے گوارا نہیں ہے۔ شکر ہے سارے بچے آپس میں مکھل مل گئے ہیں۔“ صالہ بیگم سکون سے بولیں۔

”چاہت کا خمیازہ عالی ہی کیوں بھگتے۔ وہ شیطان تو کبھی بھی اس کی شرارت سر نہیں لیتا۔“ آغا جی نے نال ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”وہ بے چاری کوئی شرارت کرتی ہی نہیں تو وہ کیا سر لے گا۔ بن ماں باپ کے دونوں بچیاں سہمی ہی راتی ہیں۔“ صالہ بیگم نے دکھ کے ساتھ کہا۔

”آئندہ سے ان کو بن ماں باپ کے نہ کہنا صالہ۔ کیا ہم ان کے والدین نہیں؟“

”کیوں نہیں آغا صاحب، یہ دونوں بچیاں پہلے اور باقی بعد میں۔ مجھے تو کبھی ان میں اور عیب نہ کہ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ اتنی توجہ کے باوجود کبھی سی رہتی ہیں۔ نہ جانے کیوں؟“

آغا صاحب ایک جاگیر دار تھے۔ ساتھ ہی اصول پرست بھی تھے۔ اصولوں پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ان کی دشمنیاں بہت زیادہ تھیں۔ خاندانی تنازعات الگ تھے اور ان کے دو بیٹے ان ہی تنازعات کی نذر ہو گئے تو وہ باقی دو بیٹوں کے لیے پریشان ہو گئے حمیدہ بیگم تو سارے کی مانند اپنے بیٹوں کے ساتھ لگی رہیں۔ دو جواں سال بیٹوں کی موت نے ان کو نیم پاگل کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت شوہر کے پیچھے پڑی رہیں۔ کہ کسی

طرح وہ اس گاؤں سے نکلیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے حمیدہ بیگم۔ میں ڈر کر بھاگ جاؤں اور دشمنوں کو خود پر ہنسنے کا موقع دے دوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میرے دو بیٹوں کی جان لے کر یہ کیا سمجھتے ہیں، میرے اصول بدل دیں گے کیا۔“

تو سنبھال کر رکھیے اپنے اصولوں کو۔ میرے بچوں کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیں جہاں ان ظالموں کے ہاتھ نہ جاتے ہوں، میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ خدا را ان کو ملک سے باہر بھیج دیں۔“

”تو کیا یہ جدائی برداشت کر لوگی؟“ آغا حبیب نے بیوی کو دیکھا جن کے چہرے پر تڑپ تھی، حزن تھا۔ وہ جوان بیٹوں کو رخصت کر چکی تھیں۔ ان کی داغی جدائی برداشت کر رہی تھیں۔ تو ان بیٹوں کی عارضی جدائی بھی برداشت کر سکتی تھیں۔

”میں سب برداشت کر لوں گی۔ وہ نظروں سے دور رہیں گے، سلامت تو رہیں گے مجھے ان کی یہ جدائی گوارا ہے۔ آپ ان کو باہر بھیج دیں۔“

حمیدہ بیگم ایک مل ضائع کیے بغیر بچوں کو باہر بھجوانا چاہتی تھیں۔

”حریف یہ ہی کہیں گے کہ میں نے ان کے خوف سے بچوں کو باہر بھیج دیا ہے۔“

بھڑا میں جائیں آپ کے حریف۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ مجھے صرف اپنے بچوں کی زندگی چاہیے۔ آپ نے اگر اپنے حریفوں کی پروا کرنی ہے تو مجھے ابھی سے بتا دیں۔ میں بھی کچھ کھا کر سو رہی ہوں گی۔ دو جوان بیٹے کنوا کر بھی آپ کو سمجھ نہیں آئی۔ ہاں باپ ہیں نا اس لیے۔ جو درد ماں کے جگر میں اٹھتا ہے اس کی کک سے نام نہاں۔ اسی لیے ماں کا دل آپ کے سینے میں صرف ایک بار دھڑکتا تو پھر میں آپ سے پوچھتی۔“

حمیدہ بیگم بری طرح رونے لگیں۔ آغا حبیب نے تڑپتی ممتا کو دیکھا اور ایک فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے بیٹوں آغا شجاعت اور چھوٹے آغا شجاعت کو اعلیٰ تعلیم کی آڑ میں امریکہ بھجوا دیا۔ ان کے دشمنوں، حریفوں نے بہت باتیں بنائیں مگر انہوں نے یہ کیا کہ جاگیر دار نہ بھڑو۔ چھوڑ کر شہر میں جا بیے۔ شہر میں انہوں نے اپنی خاندانی اور پرانی روایات کے مطابق کوئی بنوائی اور ان ہی روایات کے تحت زندگی گزارنے لگے۔ بیٹے امریکہ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آئے تو ماں نے آتے ہی آغا شجاعت کے سر پر سہرا سجا دیا اور نیک سیرت صالحہ کو بہونا کر لے آئیں۔ ساس سر کی خدمت میں دن رات لگی رہیں۔ گھر میں بچوں کی کلکاریاں گونجنے لگیں تو حمیدہ بیگم کے زخم بھی مندمل ہونے لگے۔ اب ان کو دوسری بہولا نے کی شدید خواہش ہو رہی تھی مگر آغا شجاعت کچھ ہنس و پیش سے کام لے رہے تھے۔

”اماں جان ابھی ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آپ کی بہو بھی ہے۔ پوتے پوتیاں بھی ہیں۔ پھر دوسری کے لیے اتنی بے چینی کیوں؟“

”اس لیے بیٹے، عمر کا کچھ پتا نہیں ہوتا، کیا خبر؟“

”ارے، جتنی حمیدہ بیگم لڑکا اگر اتنا پس و پیش سے کام لے رہا ہے تو معلوم کر دو کوئی پکڑ نہ ہو۔“

آغا جی کی بات پر شجاعت گڑ سے گئے۔ وہ سر جھکائے باہر نکل گئے۔

”ویسے بات تو آپ کی ٹھیک ہی لگتی ہے۔ بہو بیگم سے کہتی ہوں، اس سے معلوم کرے۔ اگر اس کی کوئی

پسند ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“

اور پھر اس سلسلے میں صالحہ بیگم کی خدمات حاصل کی گئیں۔

”آپ لوگ فکر مند نہ ہوں اماں جان۔ میں شفاعت سے معلوم کر کے آپ کو آگاہ کر دوں گی۔“

صالحہ بیگم کھوٹ گھٹ درست کرتے ہوئے بولیں کیونکہ سامنے آغا حبیب بھی بیٹھے ہوئے تھے اور ان سے وہ احتراماً پردہ کرتی تھیں۔ اور ان کی یہ عادت، شرم و حیا ہی ساس سر کو بہت پسند تھی۔ صالحہ بیگم وہاں سے آئیں۔ سیدھی شفاعت کے کمرے میں گئیں مگر وہ وہاں پر نہیں تھے۔ البتہ بچے کھیل رہے تھے۔

”لقمان بیٹا آپ کے چچا جان کہاں ہیں؟“

”بی بی جان وہ ہاتھ روم میں ہیں۔“ لقمان کے بجائے یسین بولے۔

”بہتر آپ لوگ یہیں ہیں ناں، تو جب آپ کے چچا جان آئیں تو ان سے کہہ دیں کہ وہ میرے کمرے میں آجائیں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“

وہ ہدایت دے کر واپس پلٹیں۔

”کیا بات کرتی ہے بی بی جان؟“ لقمان ماں کے کان کے قریب آکر بولا۔

”یہ بڑوں کی باتیں ہیں بیٹے، آپ اپنا کام کریں۔“

بی بی جان نرمی سے بولتی آگے بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد شفاعت باہر آئے تو بچے ایک ساتھ بولے۔

”چچا جان آپ کو بی بی جان نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔ کوئی ضروری بات کرنی ہے۔“

”بی بی جان نے۔ اچھا میں ابھی جاتا ہوں۔“

پھر شفاعت گریبان کے شن بند کرتے صالحہ بیگم کے کمرے میں آگئے۔

”جی بی بی جان۔ آپ نے بلایا تھا مجھے؟“

شفاعت نے سب سے پہلے ان کو بی بی جان کہنا شروع کیا تو سارے بچے بھی بی بی جان ہی کہنے لگے۔

”ہاں۔ شفاعت اماں جان اور آغا جی نے شادی کے سلسلے میں تمہاری رائے معلوم کی ہے۔“

”میری رائے بی بی جان؟“ انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں بھئی، اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہو تو بتاؤ ورنہ پھر وہ اپنی پسند سے کر دیں۔“

بی بی جان کی بات پر شفاعت کچھ ہچکچا کر رہ گئے۔

”بی بی جان وہ میں۔“

”دیکھو بھائی، اس میں سمجھنے والی کوئی بات نہیں۔ یہ عمر بھر کا معاملہ ہے اور پھر جب والدین یہ اختیار دے

رہے ہیں تو میرے خیال میں تمہیں بتا دینا چاہیے۔“

”آپ بجا کہتی ہیں بی بی جان مگر سوچتا ہوں آپ بھائی جان اور اماں جان، آغا جان کیا سوچیں گے

۔ لیسے میری بے حیائی تصور نہ کریں۔“

شفاعت نکا ہیں جھکائے بڑی دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے۔

”ہوں تو اس کا مطلب ہے، کوئی ہے۔ بتاؤ۔“

صالحہ نے قدرے شوفی سے کہا تو شفاعت مزید شرمندہ ہو گئے۔

”جی۔ وہ۔ وہ۔“ ادب، لحاظ اور شرم آڑے آ رہی تھی۔

”مجھے بتاؤ شفاعت، مجھے اپنی بڑی بہن سمجھو۔ کسی کو پسند کرنا کوئی گناہ ہے نہ جرم۔“

صالحہ بیگم کی باتوں سے تسلی تو ہوئی تھی مگر پھر بھی وہ خوفزدہ تھے۔ مبادا وہ ناراض ہو جائیں۔  
 ”آپ ناراض تو نہ ہوں گی بی بی جان؟“ احترام کے باعث نگاہیں نہ اٹھ پارہی تھیں۔

”میں کیوں ناراض ہونے لگی میرے بھائی۔“

”اس لیے بی بی جان۔ کہ۔ کہ۔“ وہ پھر بولنے بولنے رک گئے۔

”ہاں بتاؤ ناں شفاعت، کیا اس لیے کہ۔؟“

”اس لیے بی بی جان کہ اس لڑکی کا تعلق آپ سے ہے۔“  
 اتنی سی بات وہ بڑی دقتوں سے کہہ پائے تو صالحہ بیگم حیرت سے ان کو دیکھنے لگیں۔

”فاطمہ۔“

جی۔ بی بی جی۔“

شفاعت نے مزید سر جھکا کر کہا گویا کسی گناہ عظیم کا اعتراف کر رہے ہوں۔

”بی بی جان، آپ خفا تو نہیں ہو گئیں؟“

ان کو خاموش دیکھ کر شفاعت تردد سے بولے۔

”نہیں میرے بھائی اس میں خفا ہونے کی کوئی بات ہے؟“ مگر میں صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ کسی اور لڑکی کی بات ہوتی تو میں اماں جان سے کہہ بھی دیتی مگر اب اپنی بہن کے لیے کس منہ سے اماں جان سے بات کر سکتی ہوں۔“ صالحہ بیگم، ہچکچا رہی تھیں۔

”اب تو آپ کو بات کرنا ہی پڑے گی۔ آپ کہہ چکی ہیں اور پھر اماں جان کو قطعی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ بات کر کے تو دیکھیں۔ مان جائیں تو بہتر ورنہ۔“ ورنہ کے بعد وہ خود افسردہ سے ہو گئے۔

”اچھا اماں جان پوچھیں گی تو بتا دوں گی۔ مگر میں ان سے اسرار کا وعدہ نہیں کرتی۔ وہ کیا خیال کریں گی کہ اپنی بہن کے لیے، خیر، فکر نہ کرو۔ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“

شفاعت سر جھکائے آگئے مگر صالحہ بیگم کے لیے سوچ کے دروازے کھول آئے۔ شام کو جب اماں جان نے صالحہ بیگم سے پوچھا تو وہ جھجک سی گئیں۔

”کیوں بہو، کوئی خاص بات ہے کیا؟ کیا بتایا ہے شفاعت نے؟“

اماں جان نے صالحہ بیگم کو دیکھا جو عجیب کنکاش میں مبتلا تھیں۔

”کیا بات ہے بہو، بتائیں کیوں نہیں؟“

”اماں جان، مجھے خود کہنا مناسب معلوم نہیں ہو رہا۔ شفاعت۔“ وہ پھر جھجک کر چپ ہو گئیں۔

”کہو بہو، اس میں ہچکچانے کی کیا بات ہے؟“

وہ اماں جان، شفاعت کا انتخاب میری چھوٹی بہن فاطمہ ہے۔ آپ یقین جانے اماں جان۔ یہ صرف اور صرف شفاعت کی پسند ہے۔“

وہ جانے کیوں ڈر رہی تھیں۔

”ارے بہو، تو بے حد خوشی کی بات ہے میرے لیے۔ تم کیوں خوفزدہ ہو۔ مجھے اور کیا پتا ہے۔ ایک اور نیک سیرت بہو مجھے مل رہی ہے۔ ہم آج ہی تمہارے والدین سے بات کرنے جائیں گے۔“

اور یوں شفاعت اپنے والدین کی رضا اور خوشی سے اپنی پسند کو بیاہ لائے۔ زندگی بہت خوبصورت انداز میں جانب منزل ہو گئی۔ بزنس سیٹ تھا۔ بچے اپنی اپنی زندگی میں کامیاب تھے۔ اور یہ بی بی بات والدین کے لیے خوشی اور اطمینان کا باعث تھی۔ اسی خوشی اور سکون کے ساتھ دونوں نے یکے بعد دیگرے آنکھیں بند کر لیں ہمیشہ کے لیے تو زندگی کے سمندر میں جو ایک تلاطم اٹھا تھا، نارمل لہروں کی صورت اختیار کر گیا۔ آغا شجاعت کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑے لقمان احمد، پھر یٰسین اور عطیہ کے بعد رحمن اور ذکیہ تھیں۔ فرمان سب سے چھوٹے تھے۔ اسی طرح آغا شفاعت کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ عابدہ اور سیدہ عابدہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ فاطمہ ۶۔ المذہبوں، ہمیشہ تھیں، اس لیے گھر کا ماحول بہت اچھا تھا ہر طرف سکون سا سکون تھا۔ ایسے میں جب ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ انسان کسی دکھ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ غم ہو تو انسان خوشیوں کی آس میں جیتا ہے مگر خوشی کے بعد غم کا تصور انسانی برداشت سے باہر ہوتا ہے۔ زندگی کی شاہراہ پر بھاگتے لمحوں کے بارے میں انسان کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کون سا لمحہ اپنے دامن میں انسان کے لیے خوشیاں لاتا ہے۔ کون سا غم۔ یہ ہی تو آغا یٰسین کے کینوں کے ساتھ ہوا تھا۔ آغا جی کے کسی گھر سے دوست کے بیٹے کی شادی تھی۔ گھر بھر مدھمکھا۔ اور بڑے اسرار کے ساتھ۔ مگر صالحہ بیگم کوئی روز سے بخارا آ رہا تھا۔ وہ نہیں جاسکتی تھیں اور بچوں کے امتحانات تھے۔ اس لیے وہ صبح ہونے والے پیر کی تیاری کر رہے تھے۔ اس لیے وہ بھی نہیں جاسکتے تھے۔

”فاطمہ۔ تم اور شفاعت چلے جاؤ۔ عطیہ اور ذکیہ کو بھی لے جاؤ۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔“

”جی اچھا جاتی۔“

فاطمہ نے سعادت مندی سے کہا اور لڑکیوں کو تیار کرنے لگیں۔ مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ اپنی تیاری کہاں کے لیے کر رہی ہیں۔ شادی سے واپسی پر ان کی گاڑی کا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا۔ بچے شدید زخمی ہو گئے۔ فاطمہ موقع پر ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ جبکہ شفاعت نے ہاسپٹل میں کمرہ پڑھ لیا۔ تو قیامت نوٹ پڑی۔ آغا شجاعت بے حال ہو رہے تھے۔ صالحہ بیگم بار بار بے ہوش ہو رہی تھیں۔ عابدہ تو بہت چھوٹی تھی مگر سیدہ بھجھد تھی اس کا برا حال تھا۔ وقت کے اس ستم کو گو کہ برداشت کرنا بے حد مشکل تھا مگر برداشت کرنا بھی انسان کی مجبوری ہوتا ہے۔ اتنے پیارے چھوڑ جاتے ہیں ہمیشہ کے لیے جتنے بغیر انسان ایک بل بھی نہیں رہ سکتا۔ وقت بھی عجیب شے ہے۔ خود ہی قاتل اور خود ہی مسیحا بن کر زخموں پر مرہم لگا دیتا ہے اور گھاؤ مندمل ہونے لگتے ہیں۔ یا پھر انسان خود ہی سمجھتا کر لیتا ہے۔ ممبر کی سل رکھ لیتا ہے سینے پر کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ جو نہیں ہوتا۔ اس لیے آغا شجاعت نے خود کو سنبھالا اور صالحہ نے عابدہ، سیدہ کو سینے سے لگایا۔ جب سیدہ والدین کی تصویریں دیکھ کر روتی اور عابدہ خاموش نگاہوں سے ان کو ڈھونڈتی تو صالحہ بیگم کا دل پھٹ جاتا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ دونوں میاں بیوی ان دونوں بچوں کو اپنی ساری اولاد سے زیادہ محبت دیتے تھے۔ بڑے بچے تو سمجھتے تھے مگر فرمان خود بچے تھے، اس لیے وہ ان کی مجبوری نہیں سمجھتے تھے۔ عابدہ اس سے بھی چھوٹی تھی۔ اور اس سے بے حد متاثر بھی۔ بس وہ لفٹ کرائے نہ کر سکتا یا جو بات آغا جی سے وہ نہ منوا سکتا، اس کیلئے عابی کو بھیجتا اور وہ اس کی ناراضگی کے خیال سے جیسے تیسے کام ضرور کرتی اور آغا جی کو سب بچوں میں عابی بے حد عزیز تھی۔ وہ اس کی ہر بات مان لیا کرتے تھے۔ فرمان کی شرارتوں کا نشانہ وہ ہی بنا کرتی۔ وہ اس کی گڑیا کا شہر نشہ کر دیتا۔ بال اکھاڑ دیتا۔ کپڑے تار تار کر دیتا۔ مگر وہ



حرف شکایت لیں پر لائے بغیر کٹوراسی آنکھوں میں آنسو لیے اسے دیکھتی رہتی۔

”آغا جی سے شکایت کرو گی میری؟“ وہ خواہ مخواہ ہی لڑنے کے بہانے ترشتا تھا۔

”نہیں تو۔“ لبالب کٹورے پھٹک پڑتے۔

”تو پھر اپنا ہوتا تھا صاف کرو۔“

وہ اپنی جیب سے اپنا چھوٹا سا رومال نکال کر اسے دیتا تو وہ چپکے سے آنسو صاف کر لیتی۔ کبھی کبھی جب وہ اسے ڈانٹ رہا ہوتا تو صالحہ بیگم اسے پیار سے سمجھاتیں۔

”فرمان بیٹا، مت لڑا کرو اس سے، پتا ہے پھر یہ تمہاری دلہن نہیں بنے گی۔ اگر تم یوں ہی لڑتے رہے۔“

”تو نہ بنے، میں خود اس کو نہیں بناؤں گا۔“

وہ کسی بات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے ہاتھ ان کی گرفت سے آزاد کرتا، تلا پکڑ کر باہر نکل جاتا تو وہ سوچتی

رہ جاتیں۔

”یہ کون سی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں صالحہ بیگم؟“

آغا جی اندر آتے ہوئے بولے تو وہ سیدھی ہو گئیں۔

”کچھ نہیں آغا جی، میں تو فرمان کے رویے سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ عالی کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں

لاتا۔ میں نے تو سوچا ہی کچھ اور ہے۔“

وہ افسردہ سے لہجے میں بولیں۔

”کمال کرتی ہیں بیگم آپ بھی۔ ابھی وہ بچہ ہے۔ اسے کیا خبر۔ جب بڑا ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ ہم کس

لیے ہیں؟ ناحق سوچوں میں خود کو ضائع نہ کریں۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں، بہت اکیلا۔“ آغا جی نے گاؤں کیسے سے

نیک لگا کر تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”خدا نہ کرے آپ اکیلے ہوں۔ آپ کے چار بیٹے ہیں۔ ہاں یاد آیا۔ مبارک ہو آپ کو۔ لقمان اور یونس

اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے ہیں۔“

”خدا یا تیرا شکر ہے۔ تمہیں بھی مبارک۔ بلاؤ ذرا ان کو۔“

”جی بہتر۔“ صالحہ بیگم اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

”جی آغا جی۔“ کچھ ہی دیر بعد دونوں سر جھکائے کھڑے تھے۔

”بیٹہ جا بیٹا۔“ آغا جی تکیے پر باؤ ڈال کر اٹھتے ہوئے بولے تو دونوں سامنے والے صوفے پر ٹپک گئے۔

”بیٹے، آج تم لوگوں کی کامیابی کی خبر ملی ہے۔ دل بے حد خوش ہوا۔ تم دونوں کو بہت بہت مبارک ہو۔“

”جی شکر یہ جی۔“ دونوں مودب انداز میں بولے۔

”اب کیا ارادے ہیں؟“ آغا جی نے دونوں کو دیکھا۔

”آپ بتائیں جی۔“ وہ سعادت مندی سے بولے۔

”بیٹے، اعلیٰ تعلیم بہت اچھی چیز ہے اور میری خواہش تھی کہ تم لوگ مزید پڑھو مگر۔“

”مگر جی؟“ دونوں ان کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

”مگر یہ بیٹے کہ ہمارا بزرگ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت پھل رہا ہے۔ اور مجھے معاونین کی ضرورت

ہے۔ دوسروں پر اعتبار کا زمانہ نہیں۔ اس لیے تم لوگ اگر میرا ساتھ دینے کو تیار ہو تو۔ لیکن اگر تم لوگ تعلیم جاری

رکھنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”نہیں آغا جی، جیسا آپ حکم کریں۔ تعلیم تو ہم ساتھ بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“

”جیتے رہو بیٹے، تم لوگ تو میرا مان ہو۔“

آغا جی بیٹوں کی سعادت مندی پر خوش ہو گئے۔ اور یوں لقمان احمد اور یونس احمد گرجویشن کے بعد آغا جی

کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یوں زندگی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی۔ ہرگز رتا بل شعور و آگہی کا پیغام بن کر آتا۔ بچوں کے

شعور کو پختہ کر جاتا۔ ان ہی لمحوں کی آگہی کا فیض تھا۔ ہمیشہ بھائیوں کا احترام کرتیں۔ بڑے بڑے دوپٹے سے

اپنے وجود کو چھپائے رکھتیں جو باتیں بچپن میں بے دھڑک کہہ دیا کرتی تھیں، اب بات کرنے سے پہلے

سوا سوچتیں کہ آیا یہ بات کہنی بھی چاہیے کہ نہیں۔ بھائی بھی، بہنوں کا بہت لحاظ کرتے۔ آغا جی اور صالحہ بیگم نے

اپنے بچوں کی تربیت روایتی انداز میں کی۔ فطری شرم و حیا سے لڑکیوں کی نگاہیں جھکی رہتیں۔

سب سے زیادہ اثر عالی پر ہوا تھا۔ وہ صورت سیرت میں دوسری بہنوں پر سبقت لے گئی۔ سیاہ کٹوراسی

آنکھوں پر گھنیری پلکوں کی چادر گری رہتی۔ حسین چہرے پر جب کبھی نگاہ پڑ جاتی تو رنگت شہابی ہو جاتی اور کان

کی لوہیں تپ جاتیں۔ دھڑکنیں راست بھول جاتیں جبکہ فرمان میں بچپن کی شرارتوں کی جگہ اب لا ابالی پن نے

لے لی تھی۔ ان کو یاد بھی نہیں تھا کہ بچپن میں وہ اور عالی کتنا قریب رہے ہیں۔ کتنی دوستی رہی ہے۔ وہ جس سے

اتنے انجان ہیں، کبھی ان کی خطائیں اپنے نام کھواتی رہی ہے۔ وہ بس اپنی ہی دنیا میں گمن رہتے۔ اب بھی جب

کوئی مطلب ہوتا، عالی سے بات کر لیا کرتا تو وہ عالی جو اس سے پہروں باتیں کیا کرتی تھی۔ اب بات کرتے

ہوئے جھجک جاتی۔ گھنیری پلکیں آنکھوں کے رازوں کو چھپائے رکھتیں۔ بچپن کی معصوم محبت نہ جانے اب کن

جذبول میں بدل گئی تھی، کس لطیف احساس میں ڈھل گئی تھی کہ اب اس سے بات کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ جانے

کب سے چپ چاپ فرمان کو چاہے جا رہی تھی۔ کسی کو خبر کیسے ہوتی، اس نے تو خود سے بھی چھپایا تھا اس راز کو۔

خود فرمان اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ وہ اپنے دل میں ان کے لیے کیسے جذبات رکھتی ہے۔

صالحہ بیگم اب بڑے دونوں بیٹوں اور بیٹی عطیہ کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اکیلی ہی رہتے دیکھتی رہتیں

آغا جی سے ان شکایت تھی کہ وہ اس معاملے میں مدد نہیں کر رہے۔

”کیا بات ہے صالحہ بیگم آپ کی تلاش ختم ہوئی کہ نہیں۔“

وہ آج بھی کئی گھروں میں گئی تھیں مگر بات من کو بھائی نہیں تھی۔

”دیکھیے آغا صاحب مجھے اپنے دو بیٹوں کے لیے لڑکیاں تلاش کرنی ہیں۔ مگر۔“

”کیوں باقی دو سوتیلے ہیں کیا؟“

آغا صاحب نے اخبار ایک طرف رکھ کر ان کو دیکھا۔

”ان کے لیے میری سیدہ عالی جو ہیں۔“ وہ بڑے پیار سے بولیں۔

”ہاں بس میں بھی تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتا تھا۔“ آغا جی مطمئن انداز میں بولے۔

”کیوں آپ کو کوئی شہ تھا کیا؟“

”نہیں، بس تصدیق چاہتا تھا۔ ہاں تم نے تو ابھی تک کوئی خوشخبری سنائی نہیں میں سنا دیتا ہوں میں



نے عطیہ بنی کے لیے لڑکا دکھ لیا ہے کالج میں پروفیسر ہے۔ جمعہ کو وہ لوگ آئیں گے، دیکھ لیتا۔“  
 ”جلیں، شکر ہے خدا کا۔ بنی کی زیادہ فکر تھی مجھے۔ بیٹیوں کا بھی اللہ مالک ہے۔“ صالحہ بیگم خوش ہو گئیں۔  
 یوں بنی کا مسئلہ حل ہوا۔ لقمان احمد کے لیے ان کو قدیرہ بانو پسند آگئیں تو دونوں بہن بھائی کی ایک ساتھ شادیاں  
 ہو گئیں اسی دوران آغا جی کو اپنے ایک دوست کی بیٹی عذرا، بیٹین کے لیے پسند آگئیں مگر وہ چاہتے تھے ان دونوں  
 بہن بھائیوں کی بھی ایک ساتھ کی جائے اور اتفاق سے جلد ہی اچھا لڑکا مل گیا تو دونوں بہن بھائی اپنے اپنے گھر  
 میں آباد ہو گئے۔

چار بچوں کی شادی کے بعد آغا جی اب سکون میں تھے، رحمن چونکہ ابھی یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ اس  
 لیے وہ ان کی تعلیم کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے تھے اور ویسے بھی ان کے لیے لڑکی کی تلاش کا مسئلہ تو تھا نہیں اس  
 لیے ان کی وہ ذرا سلی سے کرنا چاہتے تھے۔ سیدہ او عابدہ دونوں بہت خوبصورت تھیں مگر جو بات عابی کے معصوم  
 حسن میں تھی، وہ بہت کم نظر آتی ہے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اب تک اس کے کئی رشتے آپکے تھے۔ اس روز بھی چند  
 خواتین عابی کے لیے آگئیں۔

”ہمیں آپ کی بیٹی بہت پسند ہے بیگم شجاعت۔ اور ہم کسی صورت اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔“

”بہن! یہ میری بیٹی ہوتی تو میں بھی ہرگز آپ کو انکار نہ کرتی۔“

”جی کیا مطلب؟“ دونوں خواتین ان کو حیرانی سے دیکھنے لگیں۔

”جی ہاں، یہ میری بہن کی بیٹی ہے اور میرے چھوٹے بیٹے سے منسوب ہے۔“

صالحہ بیگم کی وضاحت پر وہ کچھ بد دل سی ہو گئیں۔

”اچھا تو اس سے بڑی کارویں۔ کیا وہ بھی۔“

”جی، میں معذرت خواہ ہوں۔ کیونکہ یہ دونوں لڑکیاں میری بیٹی ہیں۔ آپ کہیں تو میں آپ کو  
 کوئی اچھی سی لڑکی دکھا دیتی ہوں۔“

”جی نہیں، شکر ہے ہمیں تو۔ خیر، اب اجازت دیں، بحق آپ کو زحمت دی۔“

وہ دونوں خواتین افسردہ سی اٹھ گئیں۔ صالحہ بیگم بھی سنجیدہ ہو گئیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اگر کوئی پسند  
 آجائے اور نہ ملے تو کتنی مایوسی ہوتی ہے۔ انہوں نے چمپا کو آواز دے کر برتن اٹھانے کو کہا اور خود کوریڈر سے  
 ہوتی ہوئی لان میں آگئیں۔ جہاں فرمان ایزی چیز پر کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔

”کون خواتین تھیں یہ بی بی جان؟“

وہ چونکہ خواتین کو جاتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور اجنبی خواتین تھیں اس لیے پوچھ رہے تھے۔

”یہ بیٹا عابی کے رشتے کے لیے آئی تھیں۔“

”اچھا۔ پھر؟“ فرمان اب خاص طور پر متوجہ ہو گئے۔

”پھر کیا؟ ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا۔“ وہ سکون سے بولیں۔

”کیوں بی بی جان! اگر اچھا رشتہ تھا تو آپ کو انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اچھے رشتے روز روز تو ہڑی ملتے  
 ہیں۔“ فرمان کتاب بند کرتے ہوئے بولے۔

”تو مجھے ضرورت بھی کیا ہے، اچھا لڑکا تلاش کرنے کی۔ ساری دنیا سے اچھا لڑکا میں اپنی عابی کے لیے

تلاش کر چکی ہوں۔“ صالحہ بیگم نے پیار سے فرمان کو دیکھا جن کو قطعی خبر نہیں تھی کہ ماں کا اشارہ ان کی طرف ہے۔  
 ”اچھا جیسی آپ کی مرضی۔“

وہ لا پرواہی سے کہہ کر کتاب پڑھنے لگے تو صالحہ بیگم واپس آگئیں۔ لقمان احمد دو بچوں کے باپ بن گئے  
 تھے۔ اسی طرح عطیہ اور عذرا کی ایک ایک بیٹی تھی۔ رحمن احمد نے اپنا ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا تو صالحہ بیگم کو ان  
 کے سرسہرا سجانے کی جلدی ہو گئی۔ تو وہ کتنی کترانے لگے۔

”بی بی جان! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو میں تعلیم سے فارغ ہوا ہوں۔ میں جاب کرنا چاہتا ہوں اور  
 بہت سے کام ہیں۔“

رحمن انتہائی مودب انداز میں بولے مگر پھر بھی لہجے میں اکتاہٹ کا احساس نمایاں تھا جو صالحہ بیگم نے  
 صاف محسوس کیا۔

”اچھا بیٹا! جو بھی کرنا ہے، جلدی کو لو۔ اب تمہارے آغا جی کو جلدی ہو رہی ہے۔“

”جی بہتر ہے۔“

ان کے سامنے تو انہوں نے جی بہتر کہہ دیا تھا مگر اب الجھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بی بی جان ان کی  
 آغا جی کیا چاہتے ہیں وہ سیدہ کو ان سے منسوب کرنا چاہتے تھے جبکہ وہ سلی کو چاہتے تھے۔ سلی مستطو گھرانے کی  
 سادہ سی لڑکی تھی۔ یونیورسٹی میں ہی رحمن سے ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں کے خیالات اور سوچ میں اتنی ہم آہنگی تھی  
 کہ غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے اتفاقاً قریب کہ اب دوری کا خیال بھی دونوں کو سہا  
 دیتا تھا۔ خطرے کی تلواری سیدہ کی صورت میں ان کے سر پر لٹکتی رہتی تھی۔

ان کو عطیہ آپانے بتا دیا تھا کہ آغا جی اور بی بی جان کی یہ خواہش ہے۔ خود بہنوں بھی یہ ہی خواہش تھی کہ یہ  
 دونوں پیاری سی لڑکیاں ان کی بھابھیاں بنیں مگر کوئی ان کی خواہش کے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا چاہتے  
 ہیں ان کی کیا تمنائیں ہیں سیدہ ان کی کزن تھی، خوبصورت تھی مگر انہوں نے دل میں اس کے لیے کوئی کسک، کوئی  
 جذبہ محسوس نہیں کیا تھا بلکہ سلی ان کے خواہوں پر چھا گئی تھی وہ ہر صورت میں اس کو شریک حیات بنانا چاہتے تھے  
 مگر کس کے سامنے اظہار تمنا کرتے کسی سے بھی تو ان کو مدد کی توقع نہیں تھی۔ سلی آس نراش کے درمیان ڈول  
 رہی تھی۔ خود اس کے رشتے آرہے تھے۔ چونکہ بہن بھائیوں میں بڑی تھی اس لیے والدین جلدی کر رہے تھے اور  
 وہ ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ رحمن اس کو جھوٹی تسلیاں دیتے رہے ان کا اپنا بس کہاں چلتا تھا۔

”رحمن مت دیا کریں مجھے جھوٹی تسلیاں۔ مجھے معلوم ہے آپ کے والدین مجھے ہرگز قبول نہیں کریں  
 گے۔ کہاں آپ لوگ اور کہاں ہم۔“

”نہیں سلی! تم نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ میرے والدین سطحی سوچ نہیں رکھتے۔ مجھے یقین ہے وہ مان  
 جائیں گے اگر سیدہ کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ فوراً راضی ہو جاتے۔ سیدہ اور عابدہ کے معاملے میں وہ بہت سختی واقع  
 ہوئے ہیں۔ وہ ہر بات برداشت کر سکتے ہیں مگر ان دونوں کی دل کشی یا حق تلفی برداشت نہیں کر سکتے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے رحمن! آپ اپنے والدین کا کہا مان لیں۔ واقعی ان دونوں کے ساتھ تو پہلے ہی اتنی  
 زیادتی ہو چکی ہے۔ مزید دکھ دینا مناسب نہیں۔“

سلی نے بڑے پر خلوص انداز میں کہا تھا مگر رحمن سمجھے وہ طنز کر رہی ہے۔

”سلمیٰ! تم بھی مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔“

”نہیں! تم نے! میں آپ کو سمجھتی ہوں اور میرے لیے اس سے بڑھ کر کیا بات ہوگی کہ آپ مجھے چاہتے ہیں اور پھر آپ یہ بھی تو دیکھیے، ہر پھول کی قسمت میں تو ناز و عروساں نہیں ہوتا کچھ کمزاروں پر بھی مہکتا پڑتا ہے۔ مجھے نہ آپ سے شکایت ہے نہ تقدیر سے گلہ ہے، ضروری نہیں کہ جسے چاہا جائے اسے پایا بھی جائے۔“

سلمیٰ منہ پھیر کر اپنے آنسو ہاتھوں میں چھپاتی ہوئی بولی کس قدر مشکل ہوتا ہے اپنی محبت کسی اور کے حوالے کرنا۔

”تم نے تو ابھی سے ساتھ چھوڑ دیا، میں بی بی جان سے بات کرں گا انشاء اللہ۔“

”یہ دلا سے آپ کس کو دے رہے ہیں! مجھے یا خود کو۔“

سلمیٰ نے سوالیہ نگاہوں سے ان کو دیکھا تو وہ نگاہیں کترا گئیں یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ کس کو دلا سادے رہے ہیں۔ ان کو یقین تھا کہ اگر سیدہ درمیان میں نہ ہوتیں تو آغا جی اور بی بی جان تو سلمیٰ کو بہوضرور بنالیتیں مگر، پھر بھی انہوں نے ہوا میں تیر چلانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بی بی جان سے اس سلسلے میں ضرور بات کریں گے۔ شاید کوئی صورت نکل آئے نہ بھی نکلی تو کم از کم خلش تو نہ رہے گی کہ بات کرتے تو شاید وہ مان جاتے اور پھر بی بی جان سے بات کرنے کے لیے بھی انہوں نے کئی دن نگا دیے بہت نہیں پڑ رہی تھی کہ ان سے کس طرح بات کریں معاملہ ہی بے حد نازک تھا، ان کی عزیز جان سیدہ کا تھا۔ سیدہ تو دیے بھی بی بی جان کو بے حد پیاری تھی۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ سب لا حاصل ہے مگر پھر بھی دل کی تسکین کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اس روز بی بی جان بیٹھی چپکے ساتھ سبزی بنا رہی تھی کہ رحمن آ گئے۔

”بی بی جان! وہ آہستگی سے بولے۔“

”آؤ بیٹے! کیا بات ہے؟ کچھ کہنا چاہتے ہو۔“ انہوں نے رحمن کو دیکھا جو کچھ کہنے کے لیے الفاظ کی تلاش میں تھے۔

”جی وہ میں۔“

وہ چپکائی وجہ سے ہنچکا رہے تھے۔ چپا خود ہی سمجھ گئی اور کہے بغیر ہی وہاں سے اٹھ گئی۔

”ہاں اب کہو، کیا بات ہے۔“ بی بی جان بھی ہاتھ صاف کر کے پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”بی بی جان وہ میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ۔“

زبان پھر اٹک گئی۔ وہ ہاتھوں کو مسل رہے تھے جس سے ان کے ذہنی انتشار کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”رحمن بیٹے! ایسی کیا بات ہے۔ الفاظ تمہاری زبان کا ساتھ نہیں دے رہے جو کہنا ہے بے خوف ہو کر کہو۔“

بی بی جان یہ تو جان گئی تھیں معاملہ سنجیدہ ہے اور ہے بھی کسی لڑکی کا مگر ان کی زبان سے تصدیق چاہتی

تھیں۔ ”وہ۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

بڑی دقتوں کے بعد وہ اتنی سی بات کہہ پائے تو صالحہ بیگم سن سی ہو گئیں گو کہ وہ تیار تھیں ایسی بات کے لیے

مگر پھر بھی ان کو دکھ ہوا۔ وہ کسی صورت میں سیدہ اور عابدہ کی حق تلفی نہیں کر سکتی تھی۔

”لڑکیاں سب ہی بہت اچھی ہوتی ہیں بیٹے۔“ وہ بہت نرمی سے مسکرائیں۔

”بس بی بی جان! حیثیت دمر تبے میں وہ ہم سے کم ہیں نہ۔“

”رحمن بیٹے! ہماری تربیت ایسی تو تھی کہ تم لوگ ایسی چھوٹی اور سطحی باتیں سوچتے یہ جانتے ہوئے بھی کہ حیثیت و مرتبہ ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ پھر بھی تم نے ایسی بات کی۔ خدا کی قسم۔ سلمیٰ اگر کسی بھکاری کی بیٹی بھی ہوتی اور بھگی میں رہ رہی ہوتی ہم پھر بھی اسے بڑی شان سے بہو بنا کر لاتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے مگر بیٹے سیدہ تمہارے مرحوم چچا اور خالہ کی بیٹی ہے اور تمہارے آغا جی نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان دونوں بچیوں کو اپنے سے کبھی نہ جدا کریں گے۔ اور سیدہ کو تمہاری اور عابدہ کو فرمان کی دہن کے روپ میں ہمیشہ اپنے پاس رکھیں گے۔ اور پھر سیدہ میں کس بات کی کمی ہے۔ خوبصورت، سلیقہ مند ہے۔ ہاں بس تعلیم صرف میٹرک ہے مگر ہم نے کون سا اس سے نوکری کروانی ہے۔“

”میں نے کب کہا ہے بی بی جان! کہ سیدہ میں کسی چیز کی، کسی بات کی کمی ہے کہ بات تو ذہنی سوچ کی ہم آہنگی کی ہوتی ہے ناں! اگر ذہنی ہم آہنگی اور سوچ میں یکسانیت ہو تو زندگی بہت پرسکون گزرتی ہے۔“

رحمن اپنے دلائل سے ان کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں انہوں نے تو زندگی کے اس پہلو پر کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسے بھی حالات درپیش آ سکتے ہیں۔

”بی بی جان! آپ آغا جی سے بات تو کریں۔“

رحمن میرے بیٹے! میں ماں ہوں اور ماں اولاد کے اندر تک جھانک کر دیکھ لیتی ہیں کہ اولاد کو کیا تکلیف ہے اور کیا چاہتی ہے۔ اگر سیدہ مجھے عزیز ہے تو تمہارے جذبات او خواہش بھی مجھے پیاری۔۔۔ بیٹے مگر جہاں تک تمہارے آغا جی کا سوال ہے تو۔ تو۔ یہ بہت مشکل ہے کیونکہ وہ جتنے نرم ہیں ناں! اس نے کہیں زیادہ سخت ہیں اپنے اصولوں کے لیے۔ انہوں نے اصولوں پر کھمبوتے کرنا سیکھا ہی نہیں اور پھر سیدہ عابدہ کے لیے تو۔ وہ کوئی بات گوارا نہیں کر سکتے۔ زندگی میں ایک بار تو قربانی دینا ہی پڑتی ہے اور اس معاملے میں تو میرے بیٹے تمہیں ہی قربانی دینا پڑے گی۔ میری جان تمہیں سعادت مندی کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ اس معاملے میں ان سے بات کرنا اپنی بات کھونے کے مترادف ہے اس لیے میری جان جو فیصلہ کر دو سوچ سمجھ کر دو۔ بعض فیصلے انسان کو زندگی میں ایسے بھی کرنے پڑتے ہیں کہ اپنی خواہشات کی قربانی دے کر دوسروں کو خوش کرنا پڑتا ہے۔“

بی بی جان نے بھی ساری ہمتیں توڑ ڈالی تھیں اب تو منزل اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔ ایک بی بی جان ہی تو ڈھارس تھیں۔ انہوں نے بھی زندگی کا فلسفہ کچھ اسی طرح سے سمجھایا تھا کہ ہر بات بے معنی سی ہو گئی۔

آغا جی کو اب بہت جلدی تھی رحمن کی شادی کی۔ وہ اسی طرح تیار یوں اور دھوم دھام سے شادی کرنا چاہتے تھے انہوں نے سیدہ کا جہیز بھی اسی طرح بنایا تھا جس طرح ذکیہ، عطیہ کا بنایا تھا۔ تاکہ ان کو کسی محرومی کا احساس نہ ہو۔ تیاریاں تو تقریباً مکمل تھیں۔ اب صرف تاریخ طے کرنے کی دیر تھی۔

”لیجیے، صالحہ بیگم! ہماری ذمہ داریاں ختم ہوئیں۔ اب تاریخ رکھیں اور بسم اللہ کریں۔ دیکھیے زیورات بن کر آ گئے ہیں۔“ آغا جی نے زیورات کے ڈبے صالحہ بیگم کی طرف بڑھائے۔

”ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہیں۔ اللہ سیدہ کے نصیب اچھے کرے۔ مگر۔“

”صالحہ بیگم! میں خواتین کی اس مکر سے تنگ ہوں ساری بات ان کو پسند آ جائے گی مگر۔ اب کیا بات ہے؟ کیا اعتراض ہے؟“ آغا جی تھوڑے سے تیز لیجے میں بولے۔

”وہ اور تو کوئی خاص بات نہیں مگر رحمن چاہتا ہے کہ اتنی جلدی نہ کی جائے۔ وہ اپنے بیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔“ صالحہ بیگم نے بڑی آہستگی سے کہا۔

”دیکھو بیٹے! بات یہ ہے کہ تمہیں جو کرنا ہے کرو۔ نوکری کرنا چاہو تو کرو، بزنس جوائن کرنا چاہو تو بڑی خوشی سے کرو مگر بچے تمہارا کوئی کام شادی کے لیے رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اس لیے کہ سیدہ اور عابدہ میرے کیا ہیں یہ تم لوگ شاید نہیں جانتے اور ان کو کوئی دکھ تکلیف ہو یہ میں برداشت نہیں کر سکتا اور نہ میں ان کو خود سے جدا کر سکتا ہوں۔ سیدہ کی اب عمر ہوگئی ہے شادی کی۔ تم نے جو کچھ بھی کرنا ہے شادی کے بعد کرتے رہنا مگر پہلے شادی ہوگی۔ کیوں میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

آغا بی نے نال ایک طرف رکھتے ہوئے رخصت سے پوچھا تو وہ ان کو اس وقت، ایسے قاتل کی مانند لگے جو قتل بھی کرتا ہے اور پوچھتا بھی ہے کہ زخم تو نہیں آئے۔ وہ دکھ سے ان کو دیکھ کر رہ گئے انسان کتنا مجبور ہو جاتا ہے بڑوں کے ہاتھوں کہ اپنی جائز خواہش بھی نہیں منوا سکتا۔ اب وہ آغا بی سے یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ سیدہ کا کہیں اچھی سی جگہ رشتہ کر دیں اور مگر یہ بات ان کی سوچ کی حد تک رہ سکتی تھی۔ حدیں کراس نہیں کر سکتی تھی۔

”نہیں تو آغا بی۔“ وہ جانے کس دل سے بولے تھے۔

”تو پھر کون سی تاریخ تجھی جائے؟“

آغا بی ستم پر ستم ڈھا رہے تھے۔

”آپ جو مناسب سمجھیں جی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ رخصت کی گھنٹی سی آواز نکلی۔

”اچھا ٹھیک ہے، تم جاؤ، اب آرام کرو۔“

رخصت ٹوٹے دل کی کڑیاں سینٹے باہر آگئے۔ ان کے اندر کی باقی سوچ کہہ رہی تھی کہ اس فیصلے انکار کر دیں۔ بالائے طاقت رکھ دیں۔ ساری فرمانبرداریاں مگر پھر دوسرے ہی پل وہ سعادت مند سے رخصت بن گئے۔ آج کل وہ جس ذہنی نقش کش کا شکار تھے۔ یہ وہ بھی جانتے تھے۔ ایک طرف سلمیٰ تھی ان کی چاہت۔ جس کو انہوں نے بڑے خلوص اور تمنا سے چاہا تھا جو ان کی سوچوں کو پڑھ لیا کرتی تھی۔ دوسری طرف سیدہ تھی جس کے لیے وہ دل میں کوئی نرم گوشہ محسوس ہی نہیں کرتے تھے۔ نہ سوچوں میں ہم آہنگی۔ سیدہ اگرچہ تمام معاملے سے لاطعلق تہی ہوئی تھی مگر گھر میں کیا ہو رہا ہے وہ بھی اس کے علم میں تھا اور یہ بات دل کو چیر گئی تھی کہ رخصت اس سے شادی پر آمادہ نہیں ہیں۔ وجہ کوئی بھی وہ بتائیں مگر اس کو یقین تھا کہ اس انکار کے پیچھے کوئی نہ کوئی لڑکی ضرور ہے۔ اور یہ اس کی تذلیل تھی کہ وہ زبردستی رخصت کے سر منڈھ دی جائے جبکہ خود وہ تو اس وقت سے ان کے خواب دیکھ رہی تھی جب بچپن میں بی بی جان نے پیارے اس کی پیشانی پر م کر رخصت کی دہن کہا تھا۔ اس نے تو تب ہی سنے بنے شروع کر دیے تھے اس کو کیا خبر تھی کہ یہ صرف خواب ہی خواب ہیں۔ عابدہ اپنی بہن کو بار بار سمجھا چکی تھی کہ اس کو غلط فہمی ہے مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا۔

”نہیں عالی! میرا دل جب نہیں مانتا تو۔ ضرور وہ کسی اور کو چاہتے ہیں۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ آغا بی اور بی بی جان تو۔“

”بات صرف آغا بی اور بی بی جان ہی کی تو نہیں عالی، جس نے زندگی گزارنی ہے وہی تیار نہیں تو۔ خیر میں رخصت سے خود بات کر دوں گی پھر ہی کوئی فیصلہ کروں گی۔“ سیدہ ہنستہ لہجے میں بولی۔

”آپ رخصت بھائی سے اس موضوع پر بات کریں گی۔“

عالی نے حیرانی سے سیدہ کو دیکھا کیونکہ اس گھر کے بچے بچپن میں بھی کم ہی بولا کرتے تھے۔ جب سے بڑے ہوئے تھے۔ وہ حجاب کے پردے کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ عطیہ ذکیہ تو پھر بھی بات کر لیا کرتیں مگر سیدہ

”کیوں اب تک وہ کرائے کے پیروں پر کھڑا تھا۔“ آغا بی حقد کی نال منہ سے لگاتے ہوئے بولے۔

”نہیں! بس وہ ابھی شادی کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کہتا ہے، نوکری کروں گا کچھ ہے نا۔ ہوں گی اس کی کچھ مجبوریاں۔ ویسے میں تو خود چاہتی تھی۔ جلدی ہو جاتی کیونکہ کافی لوگ سیدہ عابدہ کا رشتہ پوچھ چکے ہیں۔“

صالحہ بیگم یہ ہرگز نہیں بتا سکتی تھیں کہ رخصت کیا چاہتے ہیں اگر اشارتا بھی بتا دیتیں تو قیامت آجانی گھر میں۔

”اچھا ٹھیک ہے، اسے میرے پاس بھیج دو میں خود بات کر لیتا ہوں۔“

”جی بہتر مگر آغا صاحب! کچھ ہے ذرا نرمی سے بات کریں۔“ صالحہ بیگم کو جانے کیوں خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔

”آپ تو میری مزاج آشنا ہیں بیگم! پھر آپ نے ایسی بات کیوں کی؟ میں نے آج تک بچوں کو بے وجہ کچھ نہیں کہا تو اس میں تو رخصت کی کوئی غلطی بھی نہیں۔ پھر میں سختی کیوں کرنے لگا۔“ آغا بی نے شکایتی نگاہوں سے بیگم کو دیکھا تو وہ بھی کچھ نادام سی ہو گئیں۔

”میں معذرت چاہتی ہوں آغا صاحب۔“ وہ نادام سی باہر نکل گئیں۔

”آغا بی نے مجھے بلایا ہے بی بی جان کیوں خیریت تو ہے نا۔“ آغا بی کے بلاوے پر رخصت کا حلق پہلے ہی خشک ہو گیا۔

کچھ نہیں بیٹا! گھبرانے کی کیا بات سے جو تم کرنا چاہتے ہو۔ وہ کہہ دو ان کے سامنے۔“

بی بی جان خود تو نماز کے لیے آگے بڑھ گئیں وہ گھبراتے ہوئے آغا بی کے کمرے میں داخل ہوئے۔

”جی آغا بی۔“ وہ ہاتھ پیچھے باندھے کھڑے تھے۔

”کیا چاہتے ہو بیٹے؟“ آغا بی بہت نرم آواز میں بولے۔

”جی میں سمجھ نہیں۔“

”بھئی! تمہاری ماں کہہ رہی تھیں کہ تم نوکری کرنا چاہتے ہو۔ اس لیے شادی سے گریزاں ہو بتاؤ تم کیسی نوکری چاہتے ہو۔“

”اوہ جی وہ میں۔“ آغا بی کی بات پر رخصت کو کچھ تسلی ہوئی کہ بی بی جان نے اصل بات نہیں بتائی۔

”جی وہ میں چاہتا ہوں۔ بینک میں جاب کر لوں ویسے بھی میں نے اکنا کس میں ماسٹر ڈگری لی ہے تو اس کو استعمال بھی کرنا چاہیے۔ اس لیے چاہتا تھا کہ ذرا سکون سے جاب کر لوں۔“

وہ لگا ہیں جھکائے اپنا پروگرام بتا رہے تھے۔ اپنی خواہش کا اظہار آغا بی کے سامنے کرنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ حالانکہ آغا بی نے بچوں کے ساتھ کبھی سخت رویہ نہیں رکھا تھا مگر پھر بھی سارے بچے ہی ان سے بہت ڈرتے تھے اور کبھی ان کی حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور پھر سیدہ، عابدہ کے معاملے میں تو وہ کسی رعایت کے قائل نہیں تھے۔ آغا بی کیا سوچ رہے تھے اور رخصت اپنی ہی محرومیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

”ہوں تو یہ پروگرام ہے تمہارا۔ تو اب میں اپنا پروگرام بتاؤں۔“

وہ بڑے دوستانہ انداز میں بات کیا کرتے تھے مگر پھر بھی دوسروں کو کبھی اختلاف رائے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔

”جی آغا بی۔“ رخصت پوری سعادت مندی سے بولے۔

اور عابدہ تو جہاں کسی لڑکے سے سامنا ہوتا، کتر اکرنگا ہیں جھکا کر رستہ بدل لیتیں۔ ان کو تربیت ہی ایسی دی گئی تھی۔ کبھی عام موضوع پر بات نہ ہوتی۔ کجا ایسے موضوع پر براہ راست رخصت سے بات کرنا انوکھی بات ہی تو تھی۔

”آبا! سوچ لیں۔ بری بات ہوگی، اگر آغا جی کو علم ہو گیا تو۔“ غالی مسلسل سیدہ کو سمجھا رہی تھیں۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ میں رخصت سے کہہ دوں گی کہ وہ آغا جی کو نہ بتائیں۔“

”آبا! پھر بھی سوچ لیں آپ۔ آغا جی اور بی بی جان کے اعتماد کو کھینچ نہیں پھینچنا چاہیے۔“

غالی تو سیدہ کو سمجھا کر چلی گئیں۔ سیدہ تنکے میں منہ چھپا کر شدت سے رو دی اور جانے کب تک گریہ و زاری میں لگی رہی۔ مغرب کی نماز کے بعد باہرنگی تو رخصت لان میں کھل رہے تھے۔ چہرے پر سوچوں کا جال بچھا تھا۔

”رخصت!“ بھیک بھیک آواز رخصت کی ساعتوں سے ٹکرانی تو وہ چونک کر مڑے، ان کی نگاہیں سیدہ پر ٹھہر گئیں۔ بے سکون سوچی آنکھوں میں جانے کتنی راتوں کا رت جگا تھا کپکپاتے لب کچھ کہنے کے لیے لرز رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار سیدہ نے براہ راست ان کو یوں پکارا تھا۔

”سیدہ تم۔“ وہ بس لہجہ میں حیرت لیے یہی کہہ سکے۔

”جی میں۔“ سیدہ آواز پر کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔

”کوئی خاص بات ہے کیا۔“ رخصت نے اس کی سوچی آنکھوں کو دیکھا۔

”آپ کے لیے شاید کوئی خاص نہ ہو، مگر میرے لیے بہت اہم بات ہے۔“

وہ بھیک آواز کی لرزش کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟“

رخصت نے سیدہ کے ہاتھوں کو دیکھا جو آپس میں جکڑے ہوئے تھے اور شدید قسم کی ذہنی کشش کا اظہار رہے تھے۔

”رخصت میں۔“

سیدہ کی زبان پھر لڑکھا گئی وہ بڑی باحیا لڑکی تھی اس قسم کی بات اپنے ہی منہ سے کرنا کس قدر اذیت ناک ہے یہ وہ جانتی تھی۔

”ایسی بھی کیا بات ہے سیدہ! تم کہنا بھی چاہتی ہو اور کہہ نہیں پا رہیں، آج پہلی بار تم نے یوں مجھے مخاطب کیا ہے تو بے وجہ تو نہیں کچھ تو سبب ہوگا۔“ رخصت کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے یا ان کے متعلق کچھ جانتی ہے یا ان ہی کی وجہ سے ذہنی خلش کا شکار ہے۔ وہ ہر بات سے بے خبر اس کو دیکھ رہے تھے۔

”جی ہاں موت کبھی بے سبب نہیں آتی رخصت!“

اب کی بار کتنی غمگین قطرے رخصتوں کی زمین کو سیراب کر گئے تو وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی رخصت گھبرا سے گئے کہ کہیں ناراضگی میں ان ہی سے تو سیدہ کو دکھ نہیں پہنچ گیا ہو۔ کہیں بی بی جان۔ اگر ایسا ہے تو بی بی جان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

”سیدہ، میں جانتا ہوں کوئی بات بھی بے سبب نہیں ہوتی۔ مگر تمہاری ان مبہم باتوں کا میں مطلب نہیں سمجھ پا رہا رخصت نے سیدہ کی بھکی ہوئی ہلکوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔



”اور اس بات کو بیان کرنا میرے لیے کس قدر کٹھن ہے، آپ کیا جانتی ہیں۔“ وہ ہونٹ کاٹ کر آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اس قدر اذیت ناک گھڑی بھی زندگی میں آئے گی۔ یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

”لیکن سیدہ! بن کہے تو میں بھی سمجھ نہیں پاؤں گا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”جی ہاں ایسی تو منزل ہی نہیں آئی تو۔“ خیر میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ۔“

ایک گولا ساحل میں اٹک گیا تو وہ چپ ہو گئیں۔ رخصت باقی کی بات کے خطر ان کو دیکھتے رہے۔

”ہاں۔ کہ۔“

رخصت نے پھر سلسلہ کلام جاری رکھنے کیلئے پہل کی۔ مگر سیدہ سے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”رخصت! میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کو کوئی اور پسند ہے تو آپ بڑے شوق سے انکار کر دیں مجھے بھی بخشی ہوئی جنت کو ارا نہیں۔“

اس بار ان کے لہجے میں ذرا سی تلخی اور خودداری تھی۔ رخصت سن سے ہو گئے۔ اب ان کو یقین ہو گیا کہ ضرور

بی بی جان نے ذکر کیا ہوگا۔ وہ خاموش لگا ہوں سے سیدہ کو دیکھ رہے تھے۔ بچپن سے اب تک وہ لوگ ساتھ رہے

تھے مگر پھر بھی کتنے دور کہ ایک دوسرے کو سمجھ بھی نہ سکے کہ کوئی کیا ہے کیا سوچ رکھتا ہے۔ ان کو یوں خاموش دیکھ

کر سیدہ نے دھندلی آنکھوں سے ان کو دیکھا اور سختی سے آنکھیں صاف کر لیں۔

”ٹھیک ہے رخصت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو کوئی اور لڑکی پسند ہے تو میں خود آپ کی سفارش آغا جی سے

کروں گی۔ جب مجھے ہی کوئی اعتراض نہیں ہوگا تو آغا جی اور بی بی جان کو کیوں ہونے لگا۔ آپ بے فکر رہیں۔ وہ

بات جو آپ ان سے نہ کہہ پائے۔ میں کہہ دوں گی۔ میں آج اور ابھی جا کر آغا جی سے بات کر رہی ہوں۔“ سیدہ پختہ

لہجے میں بولتی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئیں۔

”رخصت سیدہ کو روک لو۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم! اگر تم منزل نہیں پاسکتے تو اس میں سیدہ کا کیا قصور ہے

سیدہ اور غالی، بی بی جان اور آغا جی کے لیے کیا ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی۔ اور پھر جب آغا جی کے سامنے اقرار



رحمن کے مضبوط لہجے میں جانے کون کون سی محرمیاں دم توڑ گئیں۔ وہ اپنی ناقص خواہشوں کو کھوکھلے الفاظ کا فرضی پیرا بن دینے کی کوشش میں ناکام ہو گئے۔

”اچھا تو میں آغا جی سے کہہ دیتی ہوں جو آپ کرنا چاہتے ہیں، وہ پہلے کر لیں۔ بھر۔“ باقی کی بات حیا کے بوجھ میں دب کر رہ گئی۔

”نہیں سیدہ! غلطی نہ کرنا، اگر تم نے آغا جی سے کوئی بات کی تو وہ سمجھیں گے کہ میں نے تم سے کچھ کہا ہے اور تم اور عابی آغا جی اور بی بی جان کے لئے کیا ہو، یہ میں جانتا ہوں۔“ رحمن انتہائی سنجیدہ ہو گئے تھے۔

”اچھا جی! جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی کروں گی۔“

سیدہ خوشیوں سے بوجھل آواز میں تابعداری سے بولتی آگے بڑھ گئیں اور رحمن بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں آگئے۔ کتنا مشکل ہوتا ہے دوسروں کے لئے قربانی دینا۔ اپنے ارمانوں کی قبر پر دوسروں کی خوشیوں کے دیپ جلانا۔ رحمن بستر پر لیٹے مسلسل سیدہ اور سلمیٰ کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ سیدہ ان کی کزن تھی۔ ہر وقت کا ساتھ مگر کوئی جذبہ بھی تو اس کے نام نہیں ہوا تھا۔ تمام جذبے جس کے نام ہوئے وہ ان کے نام نہ ہو سکی، سلمیٰ ان کی کلاس فیلو تھی متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی، سادہ سے نقوش رکھنے والی سلمیٰ۔

وہ لئے لئے سے عطیہ آپا کے ہاں چلے آئے۔

”رحمن! کیا بات ہے میرے بھائی، بہت افسردہ ہو۔“ عطیہ بیگم فوراً بھائی کی طرف بڑھیں۔

”کچھ نہیں بس ایسے ہی۔ دل بوجھل ہو رہا تھا آپا! چلا آیا۔“ وہ تھکے تھکے سے کرسی پر پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

”وہ بی بی جان کا فون آیا تھا تم نے رضامندی دے دی ہے ان کو۔“

آپا جان، جب موت ہی مقدر ٹھہری تھی تو طریقہ کار پر بحث میں نے فضول جانی، اس لیے اپنی رضامندی دے دی آغا جی کو۔“ عطیہ آپا ان کی ہر از تحسین اور ان کی حامی بھی تھی مگر کیا کر سکتی تھیں۔

”خدا نہ کرے رحمن! کیسی باتیں کرتے ہو۔ اللہ تمہیں بہت خوشیاں دے گا۔“ عطیہ آپا نے بڑھ کر ان کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر پیار سے کہا تو رحمن کا جی چاہا کہ آپا کے آنچل میں چہرہ چھپا کر۔ اتنا درویش کہ نارسائیوں کے سارے داغ مٹ جائیں مگر وہ مرد تھے اور ایک مضبوط فیصلہ کر چکے تھے۔

”جی آبا! میں خوش ہوں، ٹھیک ہوں، آپ حلال نہ کریں۔“ انہوں نے آپا کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر اپنے پاس بٹھالیا اور کچھ دیر خاموش بیٹھے، جانے کیا کچھ ضبط کرتے رہے۔

”آپا۔!“ کافی دیر بعد ان کی آواز کسی گھر سے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

”کو میرے بھائی! آپا بھائی کے جذبات اور اس وقت جذباتی کیفیت سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ وہ بہن تھیں، وہ رحمن کا دکھ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھیں۔

”مناسب تو نہیں یہ بات آپا! مگر صرف ایک بار آپ سلمیٰ کو اپنے ہاں بلا سکتی ہیں؟“ وہ منت بھرے سوالیہ لہجے میں بولے تو آپا تڑپ اٹھیں۔

”کیوں نہیں رحمن! ضرور بلاؤ مگر فائدہ کیا تم بھی تڑپو گے اور وہ بھی روئے گی۔“

”آپ کا کہنا بجا ہے آپا! مگر جب درمستر کہہ تو مل بیٹھ کر رونے سے اس کی شدت میں کچھ کمی

کر لیا ہے تو سیدہ کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار کرنے کی ضرورت تھی۔ روک لو رحمن اگر سیدہ آغا جی کے پاس چلی گئی تو ان کی عدالت میں اقبال جرم کر کے ان کی طرف سے ملنے والی ہر سزا کو قبول کرنا پڑے گا، پھر کچھ بھی تو باقی نہیں بچے گا، ان کی بھتیس کھودو گے اور تب بھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکو گے اس سے بہتر نہیں کہ اپنی قربانی رائیگاں نہ جانے دی جائے اور اپنی تمناؤں کو حسرتوں کی لحد میں دفن کر کے دوسروں کی خوشیوں کے چواغ روشن کر دیے جائیں۔“

یہ سب سوچتا اور اس پر عمل کرنا کتنا اذیت ناک تھا، یہ رحمن ہی جانتے تھے مگر آزمائش کی اس منزل سے وہ گزر گئے تو سیدہ کی طرف لپکے جو ضبط کے خادروں پر پلٹی جارہی تھیں۔

”سیدہ۔ سیدہ رکو تو۔“ رحمن تیزی سے چلتے سیدہ کے سامنے آگئے تو وہ ہنگامی پلکوں سے ان کو دیکھنے لگیں۔

”جی!“ آواز کہیں دور سے آئی۔

”کہاں جارہی ہو؟“ رحمن جانتے ہوئے بھی پوچھ رہے تھے۔

”آپ کو معلوم ہے میں آغا جی کے پاس جارہی ہوں۔“ سیدہ نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے دھیمی سی آواز میں کہا۔

”مگر کیوں؟“

رحمن کے اس سوال پر سیدہ نے دکھ سے ان کو دیکھا جو آگ لگا کر پوچھ رہے تھے۔ پانی کیوں ڈال رہی ہو۔

”یہ بھی آپ کو معلوم ہے۔“ سیدہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں سیدہ! اس لیے کہ میں، میں آغا جی کو اپنی رضامندی دے چکا ہوں۔“

رحمن نے آزمائش کے ہل صراط پر ایک قدم اور بڑھایا تو سیدہ کی پلکیں جھکتی چلی گئیں، دل دھڑک اٹھا۔

”ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔“ سیدہ خوشیوں کی بارات میں گھری آہستگی سے بولیں۔

سیدہ خوشیوں کی بارات میں گھری آہستگی سے بولیں۔

”ہاں پوچھو۔“ رحمن مرد تھے اور اس وقت بھی وہ شدید جذباتی ہونے کے باوجود ضبط کے ہر امتحان میں کامیاب ہو رہے تھے۔

”یہ فیصلہ آپ نے دل سے کیا ہے، اپنی خوشی اور دل سے رضامندی دی ہے آغا جی کو؟“

سیدہ کے اس سادگی سے کیے گئے سوال پر رحمن نے تڑپ کر ان کو دیکھا اور جی چاہا کہ دیں کہ دل ہی کا تو رونا ہے نہ دل ہوتا، نہ ارمان ہوتے۔ اب تو جھوٹ بولتے ہوئے بھی ندامت ہو رہی تھی اور بچ بول کر وہ سیدہ کے چہرے پر چمک جانے والی دھنک کو ماند کرنا نہیں چاہتے تھے۔

”کیوں اعتبار نہیں آ رہا تو دل چیر کر دکھا دوں؟“ رحمن نے قدرے شوخی سے کہا تو سیدہ کی پلکیں لرز کر جھک گئیں۔

”جی نہیں ایسی بات نہیں۔ میں صرف آپ کے پس و پیش کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔“ سیدہ بارحیا سے جھکی پلکوں کے ساتھ جیسی ہی آواز میں بولیں۔

”ہاں پس و پیش کی یہ وجہ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ زندگی میں اس معاشرے میں اپنی کوششوں اور صلاحیتوں سے اپنا مقام بناؤں۔ سیدہ ہنس۔ میں تم نہیں جانتیں کیا چاہتا تھا، کیا کرنا چاہتا تھا مگر آغا جی نے۔“



آ جاتی ہے۔ بے چین روح کو قہر سا آ جاتا ہے۔ بتائیے کب بلاؤں اسے یہاں؟ ”رحمن سلطنتِ دلچہ میں بولے۔  
”جب چاہو بلا لو رحمن! لیکن اتنا دھیان رہے کہ آغا جی کو خبر نہ ہو، ورنہ تمہاری قربانی راہیگاں چلی جائے  
گی میرے بھائی۔“

”جی بہتر۔“ رحمن نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگلے روز کی شب شام غم کی پرچھائیاں لے  
کر آگن میں اتری۔ سلمیٰ اور رحمن ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے اپنی چاہت کو ہمیشہ کے لیے حسرتوں کی قبر میں  
اتر رہے تھے۔ اب خاموش تھے مگر قلبِ حزن کی داستان آنکھیں ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں۔ یہ جانتے  
ہوئے بھی کہ یہ ملاپ مشکل ہے، پھر بھی جانے کیوں انہوں نے من کے ڈھیروں خواب دیکھ ڈالے تھے۔

”سلمیٰ! ان رسانی اور جدائی کے اس موڑ پر کہنے کو میرے پاس کچھ بھی نہیں سوائے اس ندامت کے کہ میں  
تمہیں کچھ نہیں دے سکا تمہارے خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھی نہیں بھر سکا۔“ رحمن گہیرا آواز میں بول رہے تھے۔  
”ایسی بات نہ کرو رحمن! تمہاری چاہت نے جو وقار مجھے بخشا ہے، میرے لیے وہی بہت ہے۔ خواب تو  
ہر کوئی دیکھتا ہے مگر ان میں حقیقت کا رنگ کوئی مشکل ہی سے بھر پاتا ہے۔ محبت کے اس سفر میں پالینا تو منزل  
نہیں بلکہ محبت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم لوگ جدا ہو کر بھی ایک دوسرے کو اسی طرح چاہیں۔ ہمارے دلوں میں  
چاہت کی ککب باقی رہے۔ یہ ہی جذبول کی سچائی اور وقار ہے رحمن!۔“

سلمیٰ بظاہر بڑے مضبوط اور پختہ لہجے میں بول رہی تھی مگر اندر کی ٹوٹ پھوٹ کی بازگشت رحمن تک صاف  
آ رہی تھی۔ رحمن نے زخمی سی نگاہ ان پر ڈالی۔

”مجھے بے وفانا سمجھنا سلمیٰ اور سچی اچھے سے شخص سے شادی کر لینا۔“

”میں شاید تم جیسی خوش قسمت نہیں ہوں رحمن، تمہاری طرح مجھے بھی اچھا ساتھی مل جائے اس لئے میں  
اس سلسلے میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی اور تمہیں بے وفا کہہ کر میں گنہگار ہونا نہیں چاہتی رحمن اور پھر ہمارا انجام کوئی  
ایسا اٹکنا بھی تو نہیں اور اس سفر میں ہر کسی کو تو منزل نہیں مل سکتی ناں، کسی نہ کسی کو تو ان رسانی کے زہر کا پیالہ پینا پڑتا  
ہے ناں، اس بار یہ پیالہ تقدیر نے ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا ہے تو ہم کو کم ہمتی کا مظاہرہ کیوں کریں۔ اس لئے  
اچھی یادوں کے ساتھ ہم جدا ہو جاتے ہیں اور دفن کر دیتے ہیں ان یادوں کو جو اب ہمارے زخموں کو کریدنے  
والے خنجر کا کام دیں گی۔“ جدائی کی اس ساعت میں غم کی لہریں دونوں کے قلبِ حزن سے ٹکرائی تھیں۔

”دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ عطیہ بیگم تڑپ گئیں گو کہ ان کو سیدہ کا بھی خیال تھا اور  
وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ سیدہ ہی رحمن کی دلہن بنے مگر اب سلمیٰ اور رحمن کو یوں ہی دامن دیکھ کر وہ تڑپ رہی تھیں۔

”خدا حافظ رحمن! اب میں چلتی ہوں خدا کرے تم سیدہ کے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم زندگی گزارو خدا حافظ۔“  
آرزوئیں قطرہ قطرہ لب سوزاں سے ٹپک رہی تھیں آنکھوں میں دھندلاتی لگی تو سلمیٰ رحمن کی آنکھوں  
سے دور ہوتی چلی گئیں۔ رحمن بھی دلِ ستم زدہ کو تھا بے گھر واپس آ گئے۔ اب وہ خود کو نائل کرنے کی کوشش میں  
لگے رہے۔ ان کو سب سے زیادہ خیال سیدہ کا تھا جو اس معاملے میں قطعی بے قصور تھیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ  
ایسی بات ہو جس سے سیدہ کا دل خراب ہو۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان تمام احتیاطوں کے باوجود سیدہ کے دل  
میں بال آ گیا تھا، گو کہ وہ ہر بات سے بے خبر تھیں مگر پھر بھی کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ اپنے اندر حقیقی اور مکمل  
خوشی کو محسوس نہیں کر پاری تھیں۔

”آپا! آپ کو تو وہم ہو گیا ہے رحمن بھائی کسی اور کو پسند کرتے تو کسی نہ کسی سے تو پتا چل ہی جاتا وہ یقیناً  
درست کہہ رہے ہیں کہ وہ شادی دیر سے کرنا چاہتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے عالی! مگر جانے کیوں دل مطمئن نہیں ہو پا رہا، اگر میں ہی ان کو پسند ہوتی تو وہ دیر  
کے لیے ہرگز نہ کہتے بلکہ خوش ہو جاتے۔“

سیدہ نے وہ کشن جو کا زہر ہی تھیں، ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کچھ بھی کہیں آپا! یہ آپ کا وہم ہے اور کچھ نہیں۔“

”خدا کرے یہ میرا وہم ہو عالی میرے جذبات یوں ہی مستحضر ہیں لیکن اگر بھی یہ وہم حقیقت کا روپ دھار  
کر زندگی کے کسی بھی موڑ پر میرے سامنے آ گیا تو۔“

وہم اور آنے والے اندیشوں نے سیدہ کو پریشان کر دیا۔

”انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا آپا! اور اگر ہوا تو خدا کرے میں نہ رہوں اس دنیا میں کیونکہ میں آپ کو نکھر ا ہوا  
نہ دیکھ پاؤں گی۔ خدا کرے میری زندگی میں وہ وقت نہ آئے۔“

عالی نے صدقِ دل سے دعا مانگی۔ تو سیدہ نے تڑپ کر ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”خدا نہ کرے عالی! کیسی بد فال نکا رہی ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہنا  
ہے۔ اسی چھت کے تلے، ایک سائبان کی چھاؤں میں ہم دونوں ہمیشہ رہیں گی بس ایسے خیال مجھے زندگی بخشے  
ہیں جب میں وہموں کا شکار ہوتی ہوں کہ میری عالی بھی دلہن بن کر نہیں رہے گی میرے قریب۔

گھر میں رحمن کی رضا پاتے ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ خوشی کی ان تیاریوں میں دودل کتنی  
بڑی طرح مجروح ہوئے ہیں یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ سوائے عطیہ آپا کے اور بی بی جان کے کہ دونوں پر کیا قیامت  
گزر گئی ہے۔ رحمن بھی کافی حد تک نائل ہو چکے تھے۔ عطیہ آپا کچھ مطمئن سی ہو گئیں۔

”عطیہ! مجھے اپنے اس بیٹے کے ساتھ زیادتی کا ہمیشہ دکھ رہے گا۔“

”آپ خواخواہ پریشان ہو رہی ہیں بی بی جان! رحمن نائل ہو گیا ہے۔“

عطیہ آپا بی بی جان کو سمجھا رہی تھیں جن کو رحمن کے ساتھ زبانی کا ملال ہو رہا تھا۔ جب سے شادی کی تاریخ  
طے ہوئی تھی قدسیہ بانو بولائی بولائی سی پھرتیں۔ گھر کی بڑی بہو تھیں۔ ساری ذمہ داریاں ان پر ہی  
تھیں۔ عذرا بیگم ذرا ایسے دیے انداز میں رہتیں۔ ساس کے سامنے گو وہ بات کرتیں مگر آغا جی کے سامنے وہ بھی  
بہت سنبھل کر بات کرتیں۔

”عذرا! تم ذرا کچن میں چلی جاؤ، چپاکی تو دوسرے ملازم بات نہیں سنتے ہیں۔ میں ذرا جوڑے دیکھ لوں  
۔ بی بی جان نے کہا ہے کہ تمام رشتہ داروں کو دینے والے جوڑے بھی ٹانگ دیے جائیں۔ یہ لڑکیاں جانے کیا  
کر رہی ہیں۔“ قدسیہ جلدی جلدی بولتی آگے بڑھیں۔

”آپ کچن میں چلی جائیں بھابھی! میرے بچے چھوٹے ہیں۔ میں جوڑے دیکھ لیتی ہوں۔“ عذرا نے  
بیٹے کو بستر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”بچے تو سب کے چھوٹے ہیں، بہو! تم ہی کچن میں جاؤ۔ کیونکہ قدسیہ بیٹی تو سارے رشتہ داروں کو جانتی  
ہے۔ وہ یہ کام کر لیتی ہے تم کچن سنبھال لو۔ بیٹی ایسے موقعوں پر مقابلہ بازی نہیں کی جاتی جاؤ شاباش۔“

قدسیہ بانو کے بجائے بی بی جان نے جواب دے دیا۔ وہ خاموش ہی رہیں۔ ویسے بھی ان کو بات بڑھا: برا لگتا تھا اور بی بی جان نے جواب دے دیا تو ان کے بولنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

”آپ کا کہنا بجابی بی جان میں کوئی مقابلہ بازی نہیں کر رہی مگر آخر میں کب تک نئی نوبلی دلہن رہوں گی اور تمام رشتے داروں سے لاعلم رہوں گی۔ آپ بتائیں گی تو پتا چلے گا ناں رشتہ داروں کے بارے میں۔“ غدر نے یہ بات آہستہ آہستہ پین سے کہی تھی مگر بی بی جان اس بات میں جیسے احتجاج کو پہچان گئی تھیں۔ مگر وہ ان کو جتنا ناہم نہیں چاہتی تھیں۔

”بات تو تمہارے بھی درست ہے، بہو، چلو قدسیہ بیٹی! جیسے عذر دینی کہے ویسے ہی کر لو، واقعی اب اس کو بھی تمام رشتہ داروں کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔“

”بی بی جان! آپ ناراض تو نہیں ہونگی؟“

”ارے نہیں بہو! اگر والدین اولاد کی اتنی ذرا سی باتوں پر ناراض ہونا شروع کر دیں تو زندگی تو دشوار ہو جائے چندا۔ جاؤ اپنے اپنے کام کرو۔“ بی بی جان نے نرمی سے کہا اور خود اپنے تخت پر عصر کی نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

”چچا جی۔ چچا جی کہاں ہیں آپ؟ ڈھیروں کام بڑے ہیں جو مہمان آچکے ہیں ان کے لیے کھانا بنانا ہے۔ اور غنور تم یہ گوشت دھو کر لاؤ۔“ سرین! تم سلا دیناؤ، آغا جی کو یہ بات انتہائی ناگوار گزرتی ہے کہ مہمانوں کو کھانے کا انتظار کرنا پڑے۔ ایک تو چچا جی۔“ قدسیہ بانو کچن میں آکر جلدی جلدی خود بھی ہاتھ چلانے لگیں اور باقی سب کو بھی ایڈجسٹمنٹ کرو دیا۔

”چچا جی! آج بھی چکھیے، کیا کر رہی ہیں آپ؟“ قدسیہ بانو باری باری تمام ہانڈیوں کو دیکھتی ہوئی بولیں۔

”آگنی بڑی بہو! ایک تو یہ گل خان ایسے اٹلے کام کرتا ہے کہ خدا کی پناہ لو، بھلا مومے کو کیا ضرورت تھی۔ اسی شاخ کو کاٹنے کی جس پر خود بیٹھا تھا ایک دو نہیں اکٹھے چھ سات جوڑوٹوٹے ہوں گے۔ کم بخت مارے کے مرہم پٹی بھی میں ہی کروں گی۔“ چچا جی گل خان بابا پر چلاتی چلی آ رہی تھیں۔

”خان بابا! کیوں تنگ کرتے ہیں چچا جی کو مجھے معلوم ہے۔ آپ کو کہیں بھی چوٹ نہیں آئی۔ صرف چچا کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے آپ داؤد بلا چارہ ہیں۔“ قدسیہ بانو نے خان بابا کو اچھا خاصہ دیکھ کر کہا۔

”ارے امارا بڑا بی بی ام کو چوٹ دوٹ نہیں آیا ہے۔ ام صرف بڑھیا کو تنگ کرنا چاہتا ہے۔“ بابا مخرے پن سے مسکرائے پھر بلند آواز سے ہائے ہائے کرنے لگے۔

”کیوں بھلا تنگ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“ قدسیہ بانو مسکرائیں۔

”اس لیے برا بی بی کی صبح بڑھیا چپانے ام کو بد عادی تھا کہ ام گر کر مر جائے۔ خدائی خوار خانہ خراب نے سوچا، بڑھیا کو تنگ کرنا ہے۔ اس لیے یہ دیکھو بڑا بی بی ام نے چاقو تھوڑا سا زخم کر لیا۔ ہائے مر گیا اور بڑھ چیا تیرا خانہ خراب۔“ بابا چچا کو آتا دیکھ کر پھر چلانے لگے تو قدسیہ بانو پختہ عمر کے ان کونوں بچوں کو دیکھتی مسکرائی آگے بڑھ گئیں۔

”اچھا مہر کم بخت! تو مجھے بے وقوف بناتا ہے مہر ابھی تیری خالی کھوپڑی میں بھوسا بھرتی ہوں۔“ چچ

جی اپنا ہماری مہر کم وجود سنبھالتی بابا کی طرف بڑھیں اور مٹھی میں پکڑا نمک بابا کے اس زخم پر چھڑک دیا۔

”ہے کم بخت! اب جی ہائے ہائے لڑنا مراد! میں تو سمجھی تھی جی جی کھوڑے مارے کو چومیں آئی ہیں۔“

”او بڑھیا! پاگل کا پچھتم نے امارے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ او خدا کی خوار تیرا بیڑا غرق۔“

بابا چچا جی کو کوسے باہر نکل گئے۔ چچا جی اندر آ گئیں۔

”ہاں بڑی بہو، کیا کام ہے۔“

”چچا جی! کام کیا ہوتا ہے آپ ذرا ادھر کھانا پکوانیں، جب تک میں لڑکیوں کو دیکھوں کیا کر رہی ہیں۔“

قدسیہ بانو چچا جی کو کام بتا کر آگے بڑھیں۔ ہر طرف کام ہو رہا تھا سب کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

”بھابھی جان!“

”کیا بات ہے فرمان؟“ قدسیہ بانو جو تیزی سے ہال کمرے کی طرف جاری تھیں۔ فرمان کی آواز پر رک گئیں۔

”آپ کو آغا جی بلارہے ہیں۔ کیا آپ فارغ ہیں؟“

پھر فرمان بھی قدسیہ بانو کے ساتھ زنانے میں آگئے جہاں ہال کمرے میں گھر اور رشتہ دار لڑکیاں ڈھیروں ریشمین رنگ برنگے کپڑوں میں گھری کر رہی تھیں۔ ہاتھوں میں رنگین لبادے تھے اور لبوں پر شوخ مسکراہٹوں میں اچھلتے شوخ جملے جھینپی اور کھنکھتی ہنسی کے جلتے تھے۔ رنگوں کی اسی برسات میں شوخ ہنسی مسکراہٹوں کی رم جھم میں ایک کونے میں بیٹھی عابی، سیدہ کے سہاگ کے جوڑے پر اپنے ہاتھوں سے گونا گونا رنگی ٹانک رہی تھی۔ کبھی کبھی رشتہ دار لڑکیوں کی شوخ بات پر پلکیں اٹھا کر دیکھ لیتی مسکرا دیتی۔

”ارے بھی عابی یہ خیالوں کی دنیا میں کون جو گفتگو ہے کہ یوں مسکرایا جا رہا ہے۔“ عابی کی بے تکلف سی سلیکی بشری اس کے قریب آ بیٹھی تو عابی ہلکی سی شکوہ بھری نگاہ اس پر ڈال کر اپنے کام میں مصروف رہی۔

”عابی! تمہیں تو خدا نے بڑی ہی فرصت میں بنایا ہے کہ بن دلہن بنے ہی دلہن لگ رہی ہو۔ لاؤ تو ذرا آپا کا دوپٹہ تمہیں پہناؤں۔“

”ارے نہیں بشری! ایسا مت کرو یہ بدشگونی ہوگی۔“

پھر عابی نا ناں ہی کرتی رہ گئی مگر بشری نے سرخ گوٹے سے بھر دوپٹہ عابی پر ڈال دیا۔ اور خود ہی قصیدہ گو ہو گئی۔

”عابی! اماشاء اللہ ابھی تمہیں فرمان بھائی دیکھ لیں تو قسم سے فوت ہو جائیں۔“

”ہائے اللہ نہ کرے بشری!“ عابی نے تڑپ کر بشری کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور عین وقت جب دوپٹہ اوڑھے بشری کے منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی کہ فرمان قدسیہ بانو کے ساتھ اندر آ گئے۔ تو وہ بدحواسی میں دوپٹہ اتار بھی بھول گئی۔ بشری نے خود ہی دوپٹہ اتار لیا تو عابی گویا ہوش میں آگئی فوراً دروازہ چوٹی کو کچھے کر کے سر پر آٹھل درست کرنے لگی اور عرق آلود پیشانی کو ہتھیلی سے صاف کرنے لگی۔ جبکہ دوسری طرف فرمان اس کے لطیف احساسات سے بے خبر رنگوں کی برسات میں کھو گئے اس پر اچھتی سی نگاہ ڈال کر وہ دلچسپی سے لڑکیوں کے ہاتھوں میں خوبصورت جھلملاتے کپڑے دیکھنے لگے۔

”بھئی تم لوگوں کی دنیا تو بہت خوبصورت اور رنگین ہے۔ میرا تو یہاں سے جانے کو قطعی جی نہیں چاہ رہا۔“

بھابھی جان! میں بھی یہاں آکر پڑ رہوں کیوں بشری۔“

”بھئی تم لوگوں کی دنیا تو بہت خوبصورت اور رنگین ہے۔ میرا تو یہاں سے جانے کو قطعی جی نہیں چاہ رہا۔“

بھابھی جان! میں بھی یہاں آکر پڑ رہوں کیوں بشری۔“

”بھئی تم لوگوں کی دنیا تو بہت خوبصورت اور رنگین ہے۔ میرا تو یہاں سے جانے کو قطعی جی نہیں چاہ رہا۔“

بھابھی جان! میں بھی یہاں آکر پڑ رہوں کیوں بشری۔“

بھابھی جان! میں بھی یہاں آکر پڑ رہوں کیوں بشری۔“

شدید ہو جاتی ہے سیدہ بھی چپکے چپکے حُسن کو چاہے جاری تھیں۔ وہ بچپن ہی سے کم گوشتیں اور حُسن بھی سنجیدہ سے تھے، اس لیے کبھی نہ بچپن میں بات ہوئی اور بڑے ہو کر تو حجاب کی دیواریں حائل ہو گئیں، جن کی اوٹ سے وہ چپکے چپکے حُسن کو دکھا کر تیں جو کبھی اور۔ طرف کم تھے۔ اب وہ پرانے پرانے سے حُسن سدا کے لیے اپنے ہورے تھے۔ وہ اپنی خواہشات سمیت اپنی منزل پار ہی تھیں بس خلش تھی تو والدین کے نہ ہونے کی یہ کن کی بروقت تڑپاتی رہتی۔

”سیدہ! سیدہ! ارے بھئی، کیا بیٹھے بیٹھے سو گئیں؟“ عطیہ جوان کا کھانا لے کر آتی تھیں۔ ان کا سرو پر کرتی ہوئی بولیں۔

”جی نہیں تو۔“ سیدہ نے جلدی سے دوپٹہ کھینچ کر گھونٹ نکال لیا۔ ان دنوں میں تو حُسن کی بہنوں سے بھی شرم آ رہی تھی۔

”بھئی میں حُسن نہیں ہوں جو یہ گھونٹ نکال لیا ہے۔ ہٹاؤ اسے یہ کیا ابھی سے رو رو کر ہلکان ہو رہی ہو۔ پاگل لڑکی! رونے کی کیا بات ہے، تم نے کون سا رخصت ہو کر کہیں اور جاتا ہے۔“

عطیہ نے ان کا کک بیگ چہرہ صاف کر کے ساتھ لگایا تو وہ اور بھی تیزی سے رونے لگیں۔

”عطیہ! اوہ کتنی خوش نصیب لڑکیاں ہوتی ہیں جو والدین کی دعاؤں کی بڑی میں بیٹھ کر سرسرا آتی ہیں۔“ وہ ہچکیوں کے درمیان بولیں تو عطیہ بیگم بھی افسردہ ہو گئیں بچا اور خالہ کی یاد ان کو بھی تڑپا گئی۔

”میں تمہارا دکھ کبھی ہوں سیدہ! مگر میری بہن، اب تقدیر سے تو نہیں لڑ سکتے ناں جو اللہ کو منظور اب یہ ہی تمہارا میکہ ہے اور یہ ہی سرسرا۔ جب دل چاہا میکہ کچھ لیا اور جب دل چاہا سرسرا، چلو شاباش اور اب نہ رونا عالی ادھر ہی آ رہی ہے تمہیں دیکھ کر وہ بھی رونے کی بہن خدا کا یہ شکر کرو کہ عالی نے بھی تمہارے ساتھ ہی رہنا ہے چلو اسو صاف کرو میرے خیال میں وہ آگئی ہے۔“ پھر عطیہ آپ نے سیدہ کا چہرہ صاف کر دیا تو سیدہ بھی نارمل ہونے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک یہ ہی خیال تو زندگی بخش تھا کہ ان کی عزیز از جان بہن عالی ہمیشہ ان کے ساتھ اسی گھر میں رہے گی۔

”عطیہ! آج بھابھی پھر چھو رہی ہیں سیدہ آپ نے کھانا کھالیا ہو تو ان کو پائیں باغ کی طرف لے جائیں۔“ عالی آہستگی سے بولتی ان دنوں کے قریب آگئی۔

”اچھا میں لے جاؤں گی تم ذرا اپنی بہن کو سمجھاؤ جو رہ کر یوں ہلکان ہو رہی ہے گویا کوہ قاف جاری ہے رخصت ہو کر۔ میں ذرا بچوں کو دیکھوں۔“

عطیہ عالی کو سیدہ پاس بٹھا کر باہر آ گئیں۔ سیدہ کا جیمہ کا سامان الگ بنا تھا اور سرسرا کا سامان الگ تھا جو نسبتاً دوسری، بہوں سے زیادہ تھا اور یہ بات ان کے ذہنوں میں موجود تھی، قدسیہ بانو تو یہ سوچ کر کہ ہوگی عالی کی کوئی مصلحت، خاموش رہیں مگر عذرا اس فرق کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھیں۔

”بھابھی جان! آپ نے ایک بات نوٹ کی۔ عذرا سیدہ کا سامان انٹیچی میں ڈالتی ہوئی بولیں۔

”کیوں کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟“ قدسیہ بانو زیورات کے ڈبے احتیاط سے رکھتے ہوئے عذرا کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”بھابھی جان یا تو آپ واقعی بھولی ہیں یا بن رہی ہیں۔“ عذرا کے لہجے میں تھوڑا غصہ اور ناگواری تھی مگر پھر بھی احتیاط سے بولیں۔

”فرمان بھائی! ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں بلکہ آپ کا یہاں آنا تو۔“

”بھئی! زور دھا کہ تو پکڑانا۔“ عالی نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”فرمان تم۔ ارے حد ہو گئی۔ تم یہاں کیوں آئے ہو، آغا جی کو علم ہو گیا کہ تم زنانے میں یوں چلے آئے تھے تو زبردست ڈانٹ پڑے گی۔“ قدسیہ بانو کو تو پتا ہی اب چلا تھا کہ فرمان بھی اندر آ گئے ہیں۔

”بھابھی جان! کام کی زیادتی نے آپ کے حواسوں پر برا اثر ڈال دیا ہے۔ یعنی کہ حد ہو گئی۔ بچن سے میں آپ کے ساتھ آ رہا ہوں۔ باقاعدہ آپ مجھ سے باتیں کر رہی ہیں اور اب میرے وجود سے انکاری ہیں۔“ فرمان نے حیرانی سے قدسیہ بانو کو دیکھا۔

”اچھا، میرا ذہن کاموں میں اتنا تپا ہوا ہے کہ کچھ ہوش ہی نہیں رہتا۔ اچھا خیر، تم جا کر دیکھو آغا جی ادھر نہ آ رہے ہوں۔ اور عطیہ، ذکیہ ذرا سیدہ کی کچھ خبر لو، اسے کھانا کھلاؤ اور رات کو اسے ذرا پائیں باغ کی طرف لے جانا، کافی دن سے اس نے تازہ ہوا بھی نہیں کھائی لیکن بی بی جان سے اجازت ضرور لے لینا اور عذرا آؤ ہم ذرا مہمانوں کا کھانا دیکھ لیں۔“

قدسیہ بانو اور عذرا بیگم باہر آئیں تو کوریڈر میں سامنے سے آتے آغا جی کو دیکھ کر دونوں نے فوراً دوپٹے درست کر لیے اور سر جھکا کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔

”آداب آغا جی!“ دونوں نے آہستگی سے کہا۔ آغا جی زنانے میں بہت کم آتے جب ضروری کام ہوتا تب۔

”جیتی رہو بیٹی! خوش رہو۔“ آغا جی نے دونوں کو دعائیں دیں۔

”آغا جی! فرمان بتا رہے تھے کہ آپ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں، حکم کریں۔“

”ہاں قدسیہ بیٹی اور عذرا بیٹی میں تم لوگوں سے یہ ہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ انتظامات کی کیا نوعیت ہے، تیاریاں کہاں تک پہنچی ہیں مہمانوں کی دیکھ بھال بڑی اچھی ہونی چاہیے۔“

”ہر کام آپ کے حکم کے مطابق ہو گا اور ہو رہا ہے، تیاریاں اللہ تعالیٰ کی مدد سے مکمل اور عمدہ ہو رہی ہیں۔ آپ قطعاً پریشان نہ ہوں، مزید کوئی حکم ہو تو ارشاد۔“ قدسیہ بانو بہت ادب سے احتیاط سے بول رہی تھیں۔

”جیتی رہو بہو! جن والدین کی بیٹیاں اتنی ذمہ دار اور سمجھ دار ہوں تو وہ والدین پریشان نہیں ہوا کرتے، ہاں ایک بات مجھے ضرور کرنی ہے سب سے، اس کے لیے وقت کا تعین میں بعد میں کروں گا۔ نی الحال یہ ہی کہنا تھا۔“

”جی بہتر!“ دونوں نے آہستگی سے ایک ساتھ کہا۔ آغا جی اپنی چھڑی لیے مردانے میں چلے گئے۔ شادی کے انتظامات بہت عمدہ ہو رہے تھے۔ کئی نکال پر بھی کوشی کو لہن کی مانند سجایا جا رہا تھا۔ پوری کوشی کو فائو نوٹس اور برقی قلموں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ہر طرف لگتا تھا کہ خوشیوں کی بارات اتر رہی ہے۔ روشنیوں کے شہر میں گھری ایک گھری ایسی بھی تھی۔ جو تاریک تھی اتنی روشنی کے باوجود اس ہستی میں تاکیاں جی رہی تھیں وہ گھری تھی حُسن کے دل کی جو تمام ہنگاموں سے بے نیاز اپنے ارمانوں کے مزار پر سو گوار بیٹھے تھے۔

دوسری طرف اپنے کمرے میں بیٹھی سیدہ کبھی ماضی کی بھول بھلیوں میں الجھ جاتی تو کبھی حال اور مستقبل سے خیال چن مکتے لگتا۔

عہد شباب میں ہر انسان کا دل ایسے موڑ پر ضرور رکتا ہے جب کوئی اسے اچھا لگتا ہے اور اسے اپنانے کی تمنا

بی بی جان دانستہ اٹھ گئیں کہ رحمن بے تکلفی سے بیٹھ سکیں۔ اور واقعی ان کے جانے کے بعد پھر رحمن نے جوتے پہنے جو کہ ان کو ٹھیک تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ رحمن ایک طرف پڑے سہرے کو دیکھتے ہوئے حیرانی سے بولے۔

”اس کو سہرا کہتے ہیں۔“ عطیہ نے مسکرا کر کہا۔

”مگر کس لیے؟“ انہوں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

”اس لیے کہ ماں بہنیں اپنے ارمان اور دعائیں سہرے کی لڑیوں کی صورت تمہارے ماتھے پر سجانا چاہتی ہیں۔ دیکھو کتنا خوبصورت ہے۔“ قدسیہ بانو نے خوبصورت سا سہرا رحمن کے آگے کر دیا۔

”گستاخی معاف بھابی جان اور آپا میں۔ میں یہ نہیں باندھوں گا مجھے یہ قطعی پسند نہیں۔“ رحمن نے سہرے کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو دونوں حیرانی سے ان کو دیکھنے لگیں۔

”رحمن میرے بھائی! ایسے موقعوں پر ایسی باتیں کر کے بدگلوئی نہیں کیا کرتے۔ ایسے موقعوں پر ماں بہنوں کی خوشی کا خیال کرنا پڑتا ہے۔“

قدسیہ بانو نے نرمی سے رحمن کو سمجھایا تو ایک سرد آہ خرومیوں کی قبر میں اتر گئی۔

”تو یہ سب میں کس کی خوشی کے لیے کر رہا ہوں بھابی جان۔“ وہ بوجھل آواز میں بولتے باہر نکل گئے۔ کاموں سے ذرا فراغت کے باعث سب لڑکیاں بالیاں ڈھولک سنبھال بیٹھی تھیں اور اب کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

شادی میں دو دن رہ گئے تھے اور آغا جی چاہتے تھے کہ اب بات کر لینا ہی مناسب ہے۔

”کیوں بیگم! کیا خیال ہے آپ کا بچوں کو بتا دیا جائے۔“ آغا جی نے بی بی جان کو دیکھا۔

”یہ بات آپ کو پہلے ہی بتا دینی چاہیے تھی آغا صاحب! کیونکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ سیدہ کی زیادہ چیزوں پر اور تو شاید کسی کو نہیں البتہ عذرا بیٹی کو اعتراض ضرور ہے، عطیہ بتا رہی تھی کہ عذرانے اظہار بھی کیا ہے کہ سیدہ کا سب کچھ زیادہ کیوں بن رہا ہے۔“ بی بی جان نہیں چاہتی تھیں کہ دلوں میں بال آئے۔

”ارے بیگم، یہ کیا آپ خالص عورتوں والی بات کر رہی ہیں۔ ہماری بہوئیں سمجھ دار ہیں ایسا نہیں سوچ سکتیں۔“ آغا جی نے نال منہ سے لگاتے ہوئے بہوؤں کی حمایت کی۔

”خدا کرے آپ کا اعتبار برقرار رہے مگر میں خود مناسب نہیں سمجھتی کہ کوئی ایسی بات ہماری طرف سے ہو کہ آپس میں تفرقہ پڑے۔ کیوں چپا۔“ بی بی جان نے اتنی دیر سے خاموش بیٹھی چپا کی کو دیکھا جو منہ میں دبے پان سے پورا پورا انصاف کر رہی تھیں۔

”بالکل سرکار! بیگم صاحب درست کہہ رہی ہیں، عورت ویسے تو بڑی اچھی ہوتی ہے مگر جب رشتوں میں بٹ جاتی ہے ناں تو اس کی سوچ بھی بدل جاتی ہے۔“ چپا نے صرف بی بی جان ہی کی نہیں تام نواہیت کی تعریف کر ڈالی۔

”ہاں چپا تم بھی عورت ہو، تم بھی ویسا ہی سوچو گی جیسے کہ تمہاری بیگم۔ خیر اب تم جاؤ اور رحمن، فرمان کے علاوہ سب بچوں کو بلا لاؤ۔ آج سارے راز فاش کر دیے جائیں تو بہتر ہے۔ لاؤ میاں حقہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔“ آغا جی نے حقہ غور کی طرف بڑھا دیا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھتی عذرا۔“ وہ حیرانی سے بولیں۔

”واہ بھابی! آپ دیکھ نہیں رہیں، سیدہ کی ہر چیز ہم لوگوں سے زیادہ ہے اور جب اس نے اسی گھر میں آنا ہے تو اتنا ذہیروں کے حساب سے جہیز بنانے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔“

”ہاں یہ بات تو ہے عذرا! مگر یہ بھی تو دیکھو ناں اس کے والدین نہیں ہیں اور آغا جی اسے بیٹی سمجھتے ہیں اور پھر وہ جہیز بھی تو اسی گھر میں رہے گا ناں۔ اس نے کہاں لے جانا ہے بچاری نے۔ میرے خیال میں ہمیں تو ایسا جہیز نہیں ملنا تھا۔“ عذرا سیدہ کا سامان بھی سمیٹ رہی تھیں اور بڑا بھی رہی تھیں۔

”دیکھو عذرا! ایک تو جب ہماری شادیاں ہوئی تھیں وقت اور تھا وقت کے تقاضے اور تھے اور پھر جہیز تو والدین دیتے ہیں، جیسا بھی دے دیں اس میں ہم سیدہ کو تو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے ناں۔“

قدسیہ بانو نرمی سے ان کو سمجھا رہی تھی۔

”یہ دیکھیے بھابی! کتنا خوبصورت سیٹ ہے، ہمارے تو ایسے نہیں تھے۔“

عذرا کے سیدہ کا خوبصورت جزاؤ سیٹ قدسیہ کے آگے کر دیا تو وہ گہرا سانس لے کر ان کو دیکھنے لگیں۔

”ہاں ہمارے ایسے نہیں تھے۔ ڈیزائن واقعی مختلف تھا۔“ قدسیہ بانو نے سیٹ ان کے ہاتھ سے لے کر بکس میں رکھتے ہوئے کہا۔

”کتنا کام رہ گیا بھابی؟“

”ارے ڈکیر اچھا ہوا تم گئیں، میں تو ایسی بے ہوش ہوئی کہ بی بی جان نے کہا تھا کہ رحمن کے کپڑے دیکھ لوں، یاد ہی نہیں رہا کو تم اور عذرا یہ کام سنبھالو۔“ قدسیہ بانو کو جیسے ہی یاد آیا وہ جلدی سے باہر آئیں۔

”فرمان بھئی رحمن کے کپڑے وغیرہ کون لا رہا ہے۔“

”کپڑے اور دیگر سامان بی بی جان کے کمرے میں ہے بھابی جان۔“

فرمان کی اطلاع پر وہ فوراً بی بی جان کے کمرے میں پہنچیں۔

”معافی چاہتی ہوں بی بی جان! کچھ مصروف ہو گئی تو یاد نہ رہا۔“ وہ معذرت کرتی آگے بڑھیں۔

”کوئی بات نہیں بہو! یہ دیکھو، جوتا تو مجھے کچھ چھوٹا لگ رہا ہے، دیکھو بھلا۔“ بی بی جان نے رحمن کا شادی کے روز پہنے والا جوتا قدسیہ بانو کی طرف بڑھایا۔

”نہیں بی بی جان! میرے خیال میں مناسب رہے گا۔ ایسے کرتے ہیں رحمن کو بلوا کر پہنا کر دیکھ لیتے ہیں۔ ابھی تو وقت ہے بدلا بھی جاسکتا ہے۔“

”ہاں یہ مناسب رہے گا۔“

اور پھر رحمن کو بلوایا گیا مگر وہ جھجک رہے تھے، اندر نہیں آ رہے تھے۔

”ارے آ جاؤ نوشہ میاں! یہاں آپ سے وہ کرنے والی نہیں ہے آ جاؤ۔“ قدسیہ بانو نے جھجکتے ہوئے رحمن کو چھیڑا اور عطیہ ان کو بازو سے پکڑ کر لے آئیں۔

”لو اب ذرا یہ جوتا پہنو۔“ قدسیہ بانو نے جوتا رحمن کی طرف بڑھایا۔

”بھابی جان ٹھیک ہی ہوگا۔“ بی بی جان کے سامنے رحمن کو شرم آ رہی تھی۔

”لو بھئی تم لوگ یہ کام منشاؤ میری تو نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔“



انکار کی منجانبش نہیں تھی۔

”ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ سیدہ اور عابدہ بیٹی میرے مرحوم بھائی اور صالح بیگم کی مرحومہ بہن کی اولاد ہیں، اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آدمی۔“ انہوں نے رک کر سب کو دیکھا جن کی آنکھوں میں تجسس چمکنے لگے تھا اور دل دھڑکنے لگے تھے۔ البتہ بی بی جان بیٹھی تھیں۔

”کہ میں آدمی جائیداد ان دونوں لڑکیوں کے نام کر رہا ہوں۔“

ایک دو ٹپس کی جھٹکے اس کمرے میں موجود دلوں کو لگے۔ چہروں پر نظر نہ آنے والے ناگوار، ناپسندیدگی کے تاثرات۔

”واہ آغا جی! کمال کر دیا آپ نے تو۔“ یہ لقمان کے ذہن کی گستاخ سوچ تھی۔

”یہ کہاں کا انصاف ہے آغا جی۔!“ یسین کے ذہن نے بھی یہ فیصلہ قبول نہ کیا۔

”بات تو یہ مناسب نہیں مگر ہوگی آغا جی کی کوئی مصلحت، ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ سعادت مند بہو قد سیر بانو کی سوچ بھی سعادت مند تھی۔

”یہ نا انصافی ہے آغا جی! یہ تو ہم برداشت نہ کر پائیں گے۔ آپ کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی پڑے گی ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“ یہ عذرا بیگم کی جارحانہ سوچ تھی۔

عطیہ ذکیہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد بی بی جان کو دیکھ رہی تھیں جو خود آغا جی کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں، آغا جی بھی سب کے چہرے پر بڑھ رہے تھے۔ اور ہر چہرے پر ان کو کم و بیش ایک ہی تحریر پڑھنے کو ملی تھی۔

”کیوں قد سیر بیٹی! کیا خیال ہے تمہارا؟“ آغا جی نے سب سے پہلے قد سیر بانو سے رائے پوچھی۔

”آغا جی! آپ نے آج تک مناسب فیصلے کیے ہیں۔ یقیناً اس میں بھی کوئی بات ہوئی تو آپ نے ایسا فیصلہ کیا ہے۔“ قد سیر بانو آزی سعادت مندی سے بولیں۔

”جی جی رہو بیٹی۔“ آغا جی خوش ہو گئے۔ پھر آغا جی عذرا بیگم کی طرف دیکھنے لگے جن کو قد سیر بانو کی سعادت مندی اس وقت زہر لگی تھی۔

”عذرا بیٹی! تمہاری کیا رائے ہے؟“ انہوں نے نرمی سے عذرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ تو اس سے قبل کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتیں یسین احمد نے بیوی کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کی تاکید کی، وہ غصہ دبا کر رہ گئیں۔

”تم نے جواب نہیں دیا بیٹی۔“

آغا جی میاں بیوی میں ہونے والی آنکھوں کی گفتگو سے بے خبر تھے، اس لیے دوبارہ بولے۔

”آپ نے بہتر سوچا ہوگا آغا جی!۔“

الفاظ کم و بیش وہی تھے جو قد سیر بانو نے ادا کیے تھے مگر ان ادائیگی میں ان کے پیچھے چھپے رد عمل کو وہ بخوبی جانتے تھے۔ وہ پھر ناں کو منہ سے اگا کر خاموش ہو گئے۔ بی بی جان کو شوہر کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی مگر وہ کہہ بھی کہ نہیں سکتی تھیں۔ دوسری طرف آغا جی بھی سمجھ رہے تھے کہ بی بی جان کو یہ بات پسند نہیں آئی بچوں کو تو انہوں نے حیرت میں ڈال ہی دیا تھا۔

بھی میرا خیال تھا کہ تم لوگ پوچھو گے کچھ جاننے کی کوشش کرو گے تو میں اصل بات بتاؤں گا مگر ایسا نہیں

”بہتر سرکار! ابھی مٹی اور ابھی بلا کر لائی۔“ چپا جی بمشکل اپنے بھاری وجود کو سنبھالتی مٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

”جی چپا! تمہاری ابھی ایک آدھ گھنٹے سے کم وقت تو لے گی نہیں۔ کم لکھ لکھ کر دانا وزن بڑھا لیا ہے۔“ آغا جی ان کے بار بار مٹھنے کی کوشش نا کام ہوتے دیکھ کر مسکرائے۔

”کھاتی کہاں ہوں سرکار۔“

”جی سرکار! ہوا کھاتی ہیں تب ہی تو پھولتی جا رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے کبھی کبھی ہوا نکال دوں تو جس طرح غبارہ آسمان کی طرف اڑ جاتا ہے یہ بھی آسمان کی طرف اڑ جائیں۔“ غفور جو بھرا بیٹھا تھا آغا جی کی وجہ سے احتیاط سے بولا۔

”ٹھہرنا مراد! ابھی بتاتی ہوں تجھے۔ گناہ گار ہونے سے بچاتی ہوں ناں، اسی لیے بری لگتی ہوں تم سب کو۔ ارے میرا کیا آج مری کل دو جادوں۔“

”آمین۔“ غفور نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور چپا جی کی جوتی کچھ کرتا کرتا ہوا باہر نکل گیا تو وہ نئے پاؤں باہر آ گئیں آغا جی اور بی بی جان مسکرانے لگے۔

”بیگم! یہ تمام ملازم آخر چپاسے پڑتے کیوں ہیں؟“

”ٹھیک تو کہہ رہی تھی چپا کہ ان کو گناہ گار ہونے سے بچاتی ہے، بے ایمانی کرنے سے منع کرتی ہے۔ ایمان داری سے کام کرنے کو کہتی ہے، جس کی وجہ سے سب اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ آؤ۔ میری بیٹیاں یہاں بیٹھ جائیں۔ آؤ لقمان، یسین۔“ آغا جی ان سب کو آتا دیکھ کر بولے انہوں نے قد سیر بانو اور عذرا کے لیے اپنے پاس جگہ بتائی مگر مارے لحاظ کے وہ وہاں نہ بیٹھ سکیں۔ اس لیے بی بی جان کے پاس صوفے پر بیٹھ گئیں۔ البتہ عطیہ ذکیہ آغا جی کے پاس بیٹھ گئیں۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ ہونے کے بعد آغا جی کو دیکھنے لگے۔ حقے کے کئی کس لے لینے کے بعد انہوں نے ناں ایک طرف رکھ دی اور اپنے اطراف میں بیٹھے اپنے بچوں اور بہوؤں کو دیکھا جن کے سروں پر آنچل گھونگٹ کی طرح جھکے ہوئے تھے، بیٹے بھی موؤب ہو کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے سب پر پیار بھری نظر ڈالی اور اپنی بات کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگے۔

”میرے بچو! جیسا کہ تم سب جانتے ہو کہ دو دن بعد اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہم سیدہ بیٹی اور رحمن بیٹے کے فرض سے فارغ ہو جائیں گے تو اس لیے میں نے سوچا ہے کہ کچھ فیصلے آج کر لیے جائیں کیوں لقمان بیٹے۔“ آغا جی نے لقمان کی طرف دیکھا جو ان کی باتیں جان بوجھ کر پیچھے کر دی پر گردن کو خم دے کر بیٹھے تھے ان کی بات پر کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کو دیکھنے لگے۔

”آغا جی آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔“ وہ تابعداری سے بولے۔

”شناہاش! مجھے تم لوگوں کی تابعداری سے یہی توقع ہے کہ میرے فیصلے سے نہ تو تم لوگ انکار کرو گے اور نہ ہی احتجاج کرو گے۔“

آغا جی کی اس تمہید پر نہ صرف ان کے بچے حیران تھے بلکہ بی بی جان بھی حیرانی سے ان کو دیکھ رہی تھیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں تمہید کی قطعی ضرورت نہ تھی، سیدی سادی بات تھی جس میں کسی کے احتجاج اور



ہوا تو اصل بات میں خود ہی بتائے دیتا ہوں۔“ اتنا کہ کر آغا جی پھر سب دیکھنے لگے جو آغا جی کی یہ باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”آپ تو بچوں سے پہیلیاں بھجوا رہے ہیں آغا جی صاحب۔“

بی بی جان آخر بولی ہی پڑیں، تو آغا جی نے خاموشی سے ان کو دیکھا۔

”نہیں صالحہ بیگم! پہیلیاں تو نہیں بس ذرا۔ خبر، بات یہ ہے میرے بچے کہ یہ جائیداد جو میں نے سیدہ اور عابدہ بیٹی کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان ہی کی ہے۔ ہمارے والد صاحب کی جو بھی وراثت تھی وہ انہوں نے ہم دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم کر دی مگر ہم دونوں بھائی الگ نہیں ہوئے اس لیے ہماری جائیداد بھی اکٹھی رہی لیکن شجاعت کا انتقال ہو گیا تو جو اس کی جائیداد ہے، وہ اس کی اولاد کا حق ہے۔ لہذا قانونی اور شرعی اعتبار سے یہ جائیداد میں سیدہ اور عابدہ بیٹی کے نام کرنا ہوں۔ کسی کو کوئی اعتراض ہو تو۔“

آغا جی نے بات کہہ کر سب کو دیکھا جن کے چہروں پر اب سکون چھلکے لگا تھا۔ آغا جی سے جو تھوڑی بہت شکایت پیدا ہو گئی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔

”نہیں آغا جی! اس میں اعتراض کی کیا بات ہے یہ جائیداد ان دونوں کا حق ہے وہ اس کی وارث ہیں تو ہمیں اعتراض کا کوئی حق نہیں۔“ لقمان احمد نے گویا اپنی اس بات سے کی نمائندگی کر دی۔

”تمہیں عذر اپنی؟“ آغا جی نے بطور خاص عذر راہیکم کو دیکھا جو اصل بات معلوم ہو جانے کے بعد کچھ نادامی مگر پر سکون بیٹھی تھیں۔

”آغا جی مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا، حق دار کو حق دیا ہی جاتا ہے۔“

وہ دھیمی سی آواز میں بولیں۔

”جیتتی رہو بیٹی ایک اور بات میں کہنا چاہتا تھا تم لوگ میری بیٹیاں ہو جس طرح ذکیہ، عطیہ ہیں میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اور شاید قدسیہ بیٹی کے دل میں بھی یہ خیال آیا ہو کہ سیدہ کی چیزیں تم لوگوں سے زیادہ میں یا یہ کہ اگر سیدہ کو اپنی ہی بہو بنانا تھا تو جہیز کی کیا ضرورت تھی۔ ایسی باتیں تم لوگوں کے ذہن میں آنا کوئی انہونی بات نہیں جب رشتے برابر کی ہوں تو اس قسم کے خیالات کا آنا کوئی بڑی بات نہیں تو بیٹیوں، اس کی وضاحت یہ ہے کہ سیدہ کے والدین چونکہ حیات نہیں ہیں اس لیے ہم اس کے والدین ہیں اور چونکہ جہیز والدین دیتے ہیں مگر بد قسمتی سے سیدہ اس نعمت سے محروم ہے۔ اس لئے جہیز بھی ہم نے تیار کیا ہے تاکہ سیدہ کے دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے ہم اس کی تمام خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں جو ایک بیٹی کو اپنے والدین سے ہو سکتی ہیں، یہ ہے اصل صورت حال میرے خیال میں اگر تم لوگوں کے دلوں میں کوئی خیال یا کوئی بات ہو تو میری وضاحت سے ختم ہو جانی چاہیے۔ کیوں عذر اپنی! امید ہے تم مجھ سے متفق ہو گی؟“

آغا جی نے پھر براہ راست عذر راہیکم کو دیکھا تو ان کا سر مزید جھک گیا۔ انہیں گمان گزرا کہ کہیں ان کی باتیں جو انہوں نے قدسیہ بانو سے کی تھیں کسی نے سن نہ لی ہوں اور اگر ایسا ہی ہے اور آغا جی اس لیے ان سے دو بار بار پوچھ رہے ہیں تو کتنی ندامت کی بات ہے انہوں نے آہستگی سے اثبات میں سر جھکا دیا۔

”ہو خوش رہو اور کسی کو کچھ کہنا ہے تو کہو کوئی بھی بات کوئی بھی مسئلہ ہو تو ضرور کہو، بسین! لقمان! تیاریاں کیسی ہیں شادی کی؟“

”اللہ تعالیٰ کا شکر ہے آغا جی تیاریاں بہت اچھی ہو رہی ہیں، آپ کوئی فکر نہ کریں۔ سب کام انشاء اللہ بہت احسن طریقے سے انجام پائیں گے۔“ لقمان احمد نے ساری تفصیلات بتائیں۔

آغا جی نے عدالت برخواست کی تو سب اپنے اپنے کمروں میں آ گئے۔

”عذرا! یہ آغا جی ہر بات کی تم سے ہی کیوں تصدیق کروا رہے تھے؟“ کمرے میں آتے ہی بسین احمد نے بیوی کو آڑے ہاتھوں لیا۔

”مجھے کیا خبر، میں تو آپ کے سامنے کچھ بھی نہیں بولی۔ کوئی غلط بات نہیں کی مگر پھر بھی۔“ وہ شوہر سے نگاہیں چرائیں۔

”آغا جی یونہی کسی بات کو اہمیت نہیں دیتے کوئی نہ کوئی ضرور ہوئی ہے۔ تمہاری طرف سے جو آغا جی تم سے ہی ہر بات کر رہے تھے۔“ بسین احمد کو بھی شک ہو چلا تھا کہ عذر راہیکم نے کوئی بات ضرور کی ہے۔

”میں نے کیا کہا تھا کہ بس ذرا انہوں ہوا تھا کہ آغا جی سیدہ کے لیے ہم لوگوں سے زیادہ اہتمام کیوں کر رہے ہیں، ہم سے زیادہ چیزیں کیوں بنا رہے ہیں اس کے لیے۔“ بالآخر ان کو اپنی بات کا اعتراف کرنا ہی پڑا۔

”مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ آغا جی کو یونہی شبہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ ٹھوس ثبوت کی بنا پر جو بھی بات ہوتی ہے کرتے ہیں۔ کیا عزت رہ گئی ہو گی میری ان کی نظروں میں۔“

”میں نے کسی سے کب کچھ کہا تھا۔ صرف بھابھی جان سے بات ہوئی تھی اور بھابھی جان کی ایسی عادت نہیں کہ وہ آغا جی سے شکایت لگا دیں گی اور ویسے میں نے کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں کہہ دی ہمارا برابری کا رشتہ ہے اور فطری طور پر ہم اپنی اور سیدہ کی ہر چیز کا موازنہ کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ ہم نے کہہ دیا تو کیا ہو گیا۔“

”یہ موازنہ صرف تم نے ہی کیا ہے، بھابھی جان نے کیوں نہیں کیا؟ آخر ان کا بھی سیدہ سے وہی رشتہ ہے۔“

”اب میں کیا کروں، بھابھی جان تو فرشتہ بننے کے چکر میں ہیں۔ ہم سے تو یہ سب نہیں ہوتا۔“ وہ اپنے کلن انارکھلے الماری میں رکھتی ہوئی بولیں۔

”فرشتے سے کہیں افضل انسان ہوتا ہے اور بھابھی جان صحیح انسان ہیں اور تم۔“

”اچھا جی گستاخی ہو گئی۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔ آپ اپنا موڈ بحال کریں دو روز بعد آپ کے بھائی کی شادی ہے اور کل سے آپ کو بخار بھی آ رہا ہے۔“ عذرا! ہول کی بری نہیں تھیں مگر رواجی سوچ رکھتی تھیں۔

شادی والے روز ایک ہنگامہ خیز افراتفری تھی۔ ہر کوئی جلدی میں تھا قدسیہ بانو اور عذر راہیکم مہمانوں کی دیکھ بھال میں لگتی ہوئی تھیں۔ عالی کی ذمہ داری تمام بچوں کو تیار کرنے کی تھی اور وہ باری باری سب کے بچوں کو تیار کر کے بیچ رہی تھی۔ اسی مصروفیت میں اپنا ہوش نہ رہا، باہر سہرا بند کر رہا ہوا بی بی جان اور بار بار سے بلایا جا رہا تھا۔

”بھئی، عالی آ بھی جاؤ۔ کیا کر رہی ہو؟“

”آئی بھابھی جان بس ذرا سی دیر میں۔“ وہ جلدی جلدی دروازوں پر کٹکٹھی کرتے ہوئے بولی۔

”عالی آ جاؤ بھئی، کیا ہو گیا ہے۔“ اب کے بار عطیہ آ پائیں۔

”بی بی ابھی آئی آپا جان۔“ وہاں سے سیدھی عالی، بی بی جان کے کمرے میں گئی۔

”آداب بی بی جان۔“ اس نے آہستگی سے سر جھکا کر سلام کیا۔

”ارے جیتتی رہو بیٹی، ماشاء اللہ آج تو چاند بھی شرمائے گا۔ میری بیٹی کو دیکھ کر، ارے چچا پالاؤ چند مرچیں

ہم اپنی بیٹی کی نظر اتار دیں۔“ پھر بی بی جان نے عالی کی نظر اتاری تو وہ مزید شرمائی۔

”بی بی جان! ہال کمرے میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ سہرا بندی کی رسم ہوتا ہے ناں چلیے میں آپ کو لینے آئی ہوں۔“

پھر عالی نے بی بی جان کا ہاتھ تھام لیا۔ سب لوگ ہال کمرے میں موجود تھے۔ آغا جی کی وجہ سے بڑی دھیمی دھیمی باتیں ہو رہی تھیں، جیسے ہی عالی، بی بی جان کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ سب کی نگاہیں ان پر اٹھ گئیں۔

”عالی! ماشاء اللہ چشم بدور۔ بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ ذکیہ آپا بے ساختگی سے اس کی طرف بڑھیں تو وہ بری طرح جھینپ گئی سب کی نگاہیں اس پر تھیں یہ سوچ کر ہی اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی، ہاتھیں وہ لٹکا ہیں اس پر انھی تھیں کہ نہیں جو اس کو نکھار بخش جاتی تھیں۔ اس کی پلکوں کی چمک کو ذرا اٹھا دیکھا۔ سفید لباس میں فرمان رخن کے کان میں سرگوشی کر رہے تھے۔ وجہ یہ چہرے پر ہلکی سی شوخ مسکراہٹ تھی بھلی لگ رہی تھی۔ یہ خوبصورت سا شخص اس کا ہے اس خیال سے ہی دھڑکنیں کھل اٹھیں، پھر سہرا بندی میں وہ رخن کی بہن کی حیثیت سے شریک ہوئی، پھر سالی کی حیثیت سے اپنے نیک بھی وصول کیے۔ اسی طرح آغا جی اور بی بی جان نے سیدہ کے والدین کی حیثیت سے رخصت کیا اپنی دعاؤں کی چھاؤں میں۔

ایسے میں آغا جی کو اپنے بھائی کی یاد اس شدت سے آئی کہ وہ سیدہ کو ساتھ لگا کر آبدیدہ ہو گئے۔ وہ سوچ رہے تھے اگر بھائی زندہ ہوتا تو آج اس نئے رشتے سے دونوں میں محبتیں مزید بڑھ جائیں۔ اسی طرح بی بی جان کو جب سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اپنی بہن فاطمہ ہر پل یاد آتیں۔ وہ کام بھی ان کو کرنے پڑے تھے۔ جوان کی بہن کو کرنے تھے۔ سیدہ کی حالت سب سے خراب تھی۔ آج والدین کس شدت سے یاد آ رہے تھے۔ یہ وہ ہی جانتی تھیں عالی سے لپٹ کر وہ اس طرح روئیں گویا وہ اس سے کوسوں میل دور جا رہی ہیں۔ اس جذباتی منظر نے ماحول بہت افسردہ کر دیا۔

”سیدہ! عالی! یہ کیا پاگل پن ہے تم لوگ ایک دوسرے سے جدا تو نہیں ہو رہی ہو کہ یوں رورو کر ہلکان ہو رہی ہو چلو ہو، بی بی جان! آپ آئیے اور بہو کو خوش آمدید کہیے۔“ قدسیہ بانو نے بڑھ کر عالی اور سیدہ کو جد کرتے ہوئے کہا تو بی بی جان ڈھیر سارے پھولوں کی پیتل۔ سیدہ اور رخن پر نچھاور کرنے لگیں۔ ”چلو سیدہ! بی بی جان کو ساس کی حیثیت سے سلام کرو۔“ قدسیہ بانو ساتھ ساتھ ہدایات دے رہی تھیں۔ سیدہ کا سر جو ہاروں کے بوجھ سے پہلے ہی جھکا ہوا تھا۔ مزید جھک گیا سلام کرنے کے لیے۔

”جیتی رہو میری بچی خوش رہو، آباؤں ہو سکھی رہو سہاگ سلامت رہے۔“ بی بی جان نے سیدہ کی جھولی میں بے شمار دعائیں ڈالیں، پھر آغا جی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تو یہ لوگ کھل کر بیٹھ گئے اور ملی مذاق ہونے لگا۔ ”بھئی نوشہ میاں! اب تو کچھ بول دو کہ شرماتے ہی رہو گے۔“ قدسیہ بانو نے لڈو رخن کے منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”بھائی جان تو بھائی جان سے زیادہ شرم رہے ہیں۔“ فرمان نے بھی خوشی سے بھائی جان اور بھائی کو دیکھا۔

”وقت آنے دو، تم بھی اس طرح شرمناؤ گے۔“

”ویسے عطیہ آپا دونوں کا ایک ساتھ کر دیتے تو اچھا ہوتا اب بیٹھے دونوں شرم رہے ہوتے۔ فرمان رخن آ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔“ ذکیہ نے پیار سے بھائیوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو فرمان جھینپ گئے اور عالی کے

رخساروں پر سرخیاں دوڑنے لگیں، دھڑکنوں نے وہاں رکنے نہ دیا۔ تو وہ جلدی ہی۔ وہاں سے اٹھ کر آگئی۔

”جاؤ ذکیہ! کیوں ایسی بات کی عالی بچاری شرمناک بھاگ گئی ہے۔“ قدسیہ بانو کی بات پر فرمان بھی اٹھ کھڑے ہوئے تو سب ذہنی انداز میں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

”لیجئے ان کو بھی شرم نے آن گھیرا۔“

فرمان نہ تو ان کی بات کا مطلب سمجھ پائے اور نہ ہی ہنسی کا اس لیے خاموشی سے باہر آ گئے۔ ویسے کا اہتمام دور دراز بعد کیا گیا تھا ان کا خیال تھا کہ ویسے کسی ہوٹل میں یا ہال میں کیا جائے اور سب بھی اس بات سے متفق تھے مگر آغا جی نے سختی سے انکار کر دیا کہ وہاں پر سب گنڈ ہو جاتا ہے۔ خواتین کا پردہ نہیں رہتا جس کے وہ سختی سے پابند تھے۔ اسی لیے ویسے کا اہتمام کوشی کے وسیع و عریض لان میں کیا گیا برقی قہقوں اور فانوسوں نے رات کے وقت بھی دن کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ہر کوئی خوش اور کوشاں تھا مگر عذرا بیٹیم کی خوشیاں اس وقت دوبالا ہو گئیں جب ان کو اپنے چھوٹے بھائی شہزاد کی آمد کا پتہ چلا۔ شہزاد تعلیم کی غرض سے امریکہ میں تھے اور جب عذرا کی شادی ہوئی تھی تو وہ اپنے امتحان کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے تھے اس لیے اب آئے تو پہلی فرصت میں بہن سے ملنے آ گئے۔ عذرا بے حد خوش تھیں۔ شہزاد سب سے چھوٹا بھائی تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی عزیز تھا اور کچھ اتنے عمر سے بعد ملا تھا وہ سب کچھ بھول بھال کر ان کے ساتھ لگ گئیں۔

”باجی! میں بہت شرمندہ تھا اگر آپ کی شادی پر چاہنے کے باوجود نہ آ سکا اصل میں امتحانات ہو رہے تھے۔ اس لیے میں نہ آ سکا ورنہ آپ یقیناً جا بی، میرا دل کس قدر چاہتا تھا۔“ خوبرو سے شہزاد نہ آنے کی کی تو حسیہ پیش کر رہے تھے۔

”کی تو تمہاری خیر ہر پل محسوس ہوئی مگر خبر بتاؤ۔ تمہاری پڑھائی کہاں تک پہنچی اب بھی جانا ہے یا فارغ ہو گئے ہو۔“

”جی نہیں، اب تو میں بالکل فارغ ہو کر آیا ہوں۔ اب تو تقریباً بھی وہاں نہ جاؤں گا۔ دیار غیر میں تو انسان انہوں سے بھی جدا ہو جاتا ہے، اکیلارہا جاتا ہے اور مجھ سے تو اکیلا انہیں رہا جاتا۔ اور ویسے بھی۔“

اس سے قبل کہ وہ اپنی بات مکمل کرتے تھے گلاب بنجر حریری پردوں کی اوٹ سے نکلنے والے مہتاب پڑجم گئیں جانے کب دردوں وا ہو گیا اور ایک نشاط آگئیں نئیں دل کی عمیق گہرائیوں میں اٹھی۔ نگاہیں اس پیکر ضیاء پر ایسی اٹھیں کہ جھلکا بھول گئیں۔ کمرے میں جیسے حسن و جمال کا نور سا پھیل گیا۔ شہزاد بے خود سے اسے دیکھنے لگے۔ کہاں نظروں سے پہلے بھی ایسا حسین چہرہ مگر اٹھا کب کسی کی پلکوں کی لرزش نے ساز دل چھیڑا تھا۔ آج تک تو ایسا نہ ہوا تھا۔ پر آج اچانک یوں زندگی میں حقیقت کا روپ دھار کر آ جائے گی جس کو برسوں خوابوں میں تراشا تھا ایسی پرسوں نگاہوں کا محروم آج تک نہ دیکھا تھا۔ آج دیکھا تو دیکھتا ہی چلا گیا۔

”بھائی جان! بڑی بھائی جان نے چاہی یا منگوئی ہیں دے دیجیے۔“

حسن شکم ہوا تو شہزاد کو محسوس ہوا گویا دور نہیں چٹان پر کوئی نرم شیریں جھرنگر رہا ہو۔

”اچھا تم ذرا شہزاد کے پاس ٹھہرو میں ابھی چاہیاں دے کر آتی ہوں۔“

شہزاد کے دل کی کلی کھل گئی کہ حسن جہاں سوڑ کی رفاقت کی چند ساعتیں مزید نصیب ہو گئیں، مگر عالی کو قطعی پسند نہیں آئی تھی یہ بات مگر ایک تو وہ مہمان اور پر سے عذرا بیٹیم کا بھائی لہذا اسے بیٹھنا پڑا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو

آپس میں سختی سے جکڑے بیٹھی تھی۔ ایسے میں جیسے کہ وہ پریشان سی ابھی سی شہزاد کے سامنے بیٹھی تھی تو اس کو غلیل جبران کی ایک بات یاد آئی تھی کہ ”حسن کا اور اک تو ہماری رو جس ہی کر سکتی ہیں۔ حسن ہمارے اذہان کو مفلوج کر دیتا ہے۔ ہم اسے لفظوں میں بیان کرنے کے قادر نہیں، یہ ایک احساس ہے جو بصارت سے ماوراء ہے۔ یہ دو ٹکا ہوں کے درمیان پوشیدہ ہے جو دیکھنے کی حد تک دیکھتی ہے اور دوسری جو دور بین کی وساطت سے اشیا کا مشاہدہ کرتی ہے لیکن اپنی اپنی جگہ دونوں کا حسن دیکھنے سے محروم ہیں۔ حسن حقیقی اس کرن کا نام ہے جو ارواح مقدسہ کے تقدس سے جنم لیتی اور جسم کو منور کر دیتی ہے۔ زمین کے عشق سے پھوٹنے والی اس زندگی کی طرح کہ پھولوں کو رنگ و بو اور رس عطا کرتی ہے۔“

”ارے شہزاد صاحب! آپ یہاں بیٹھے ہیں۔“ اس آواز پر شہزاد چونک کھڑے ہو گئے سامنے فرمان کو دیکھ کر عالی کی بری حالت ہو گئی۔



عالی ہاتھوں کو آپس میں جکڑے مجرم بنی کھڑی تھی۔ یوں جیسے چوری کرتے رہ گئے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ ”عالی۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ فرمان نے حیرانی سے عالی کو دیکھا جو ان کے آتے ہی کھڑی ہو گئی تھی۔

”جی۔ وہ جی۔“ بات گداز لیوں تک آتے آتے دم توڑ گئی۔ شہزاد حسن جہاں سوز کو یوں کشمکش میں دیکھ رہا تھا۔ اور جی چاہ رہا تھا یوں ہی زندگی تمام ہو جائے۔

”ارے فرمان، تم اچھا ہوا جو آگئے۔ شہزاد اکیلے تھے اور میں ضروری کام سے گئی تھی اس لیے عالی کو یہاں بٹھا گئی تھی۔“

عذرانے آ کر وضاحت کر دی تو عالی پر سکون ہو گئی۔ یوں جیسے اس پر لگایا جانے والا الزام غلط ثابت کیا ہو۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبائے وہ اگلے حکم کی منتظر تھی۔

”عالی۔ اب تم جاؤ۔ فرمان، تم اب بیٹھو شہزاد کے پاس اور شہزاد میں ذرا دوسرے کام دیکھ لوں۔ ابھی آتی ہوں فارغ ہو کر۔ آؤ عالی۔“

عذر راہیکم عالی کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئیں تو شہزاد کو لگا جیسے اس کمرے ہی میں نہیں سارے جہاں میں کچھ باقی ندر ہا ہو۔ فضا بے رنگ و بو ہو گئی ہو۔ فرمان اس سے امریکہ میں تعلیم کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور وہ ان کو ساری تفصیل بتا رہا تھا۔

”کیا آپ کا ارادہ ہے وہاں جانے کا؟“ اگر ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔ ہو سکتا ہے میرا ہاں کا تجربہ آپ کا معاون ہو۔“

”جی ہاں ارادہ تو کیا، میری شدید خواہش ہے کہ باہر اعلیٰ تعلیم کی غرض سے جاؤں مگر۔“

”مگر کیا؟“ شہزاد نے فرمان کو جزیرہ دیکھ کر کہا۔

”آغا جی مجھے اجازت نہ دیں گے۔ جانے کیوں وہ نہیں چاہتے کہ ان کی اولاد باہر جا کر تعلیم حاصل کرے۔“

”جبکہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ آپ کے آغا جی نے خود باہر سے تعلیم حاصل کی ہے۔“  
”جی ہاں شہزاد صاحب مگر جانے کیوں ہمارے معاملے میں وہ ذرا سخت واقع ہوئے ہیں۔ بہر حال کوشش تو پوری کروں گا۔ مان گئے تو ٹھیک ورنہ ان کے حکم سے سرتابی کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آئیے چلیں مردانے میں کہ۔“ فرمان اٹھتے ہوئے بولے۔

”جی ذرا آپ سے بات کرنی ہے۔ میں ابھی حاضر ہوا۔“ جانے کس خواہش کے تحت شہزاد نے انکار کر دیا کہ شاید اس پر ہی روکی جھٹک آنکھوں کو خیرہ کر جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ کھویا کھویا سا عذرا آپا سے باتیں کرتا رہا۔

”آپا۔ ایک بات پوچھوں؟“ شہزاد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”سوتا میں پوچھو میرے بھائی، کیا بات ہے؟“ عذرا آپا بھائی پر شار ہوتے ہوئے بولیں۔

”وہ۔ وہ۔“ وہ جھجک کر خاموش ہو گیا۔

”بات کیا ہے شہزاد۔“ عذرا بیگم شہزاد کو نکلتی دیکھ کر بولیں۔

”وہ آپا۔ وہ لڑکی کون ہے عالی۔ کیا فرمان کی بہن؟“ وہ بمشکل اس کے بارے میں پوچھ پایا۔

”عالی۔ ہاں رشتے کے اعتبار سے تو عالی فرمان کی چچا زاد اور خالہ زاد بہن ہی ہے مگر۔“

”اچھا تو تکران ہے فرمان کی۔“ کرب کی ایک ہلکی سی لہر رگوں میں اتر گئی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا تکران بہت نازک اور خطرناک رشتہ ہوتا ہے، کسی وقت بھی بدل سکتا ہے۔ کھلی کونپلیس مریجھاسی گئیں۔

”اچھا آپا۔ گھر آئیں گی تو تفصیل سے بات ہوگی۔ اب میں مردانے میں چلوں، فرمان بلا گئے ہیں۔“ شہزاد نے بوجھل دل کے ساتھ اس دروازے کو دیکھا اور ان حریری پردوں کو دیکھا جن کی اوٹ سے وہ نہ

جہیں نمودار ہوئی۔ اور چھا گئی۔ وہ دل میں دوبارہ اسے دیکھنے کی حسرت لیے چلا گیا۔ رجن اور سیدہ کی شادی کے بعد تمام غیر معمولی مصروفیات ختم ہو گئی تھیں۔ سارے کام معمول پر آ گئے تھے۔ رجن نے خود کو بڑی حد تک نارمل کر لیا۔ تھا وہ سیدہ کا بہت خیال رکھتے تاکہ ان کے دل میں کوئی وہم پیدا نہ ہو اور پھر اس میں نہ سیدہ کا قصور نہ کسی اور کا تو خواہ مخواہ میں خود بھی اپ سٹ کیوں رہتے اور اپنے سے وابستہ ہستیوں کو بھی دکھ کیوں دیتے۔

”سیدہ! تم میرے ساتھ خوش تو ہونا، کوئی شکایت تو نہیں مجھ سے؟“

”رجن! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو خدا نے دنیا میں ہی جنت دے ڈالی ہے۔ میں تو ہر وقت خدا شکر ادا کرتی رہتی ہوں کہ اس نے مجھ گناہ گار کو ایسی نعمتیں عطا کی ہیں۔“

سیدہ نرمی سے کہتیں تو رجن پر سکون ہو جاتے اور ایک آسودہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ جاتی وہ ناشائستہ تو دوسروں کو خوشیاں دے دی تھیں۔

”اچھا بڑی اور چھوٹی بھابھی کا رویہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟“ رجن کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔  
”جیسے پہلے تھا یعنی بہت اچھا۔ مجھے کس لیے شکایت نہیں رجن! سب ہی محبتوں کے پھول نچھاور کرتے رہے ہیں۔ پھر کسی سے کیا گلہ ہو سکتا ہے؟ کیوں آپ نے یہ سوال کیوں پوچھا؟“ انہوں نے حیرانی سے شوہر کو دیکھا۔

”نہیں کوئی خاص بات تو نہیں ایسے ہی خیال سا آیا تھا کیونکہ ہمارے ہاں رشتے بدل جائیں تو آپا روئے بھی بدل جاتے ہیں۔ میں سمجھا شاید ان کے رویے میں بھی کوئی فرق آیا ہو۔“

”ایک ہلکا سا خوف تو مجھے بھی تھا رجن، مگر خدا کا شکر ہے ایسا نہیں قدیر بھابھی تو خیر ہیں ہی فرشتہ مضاعف

اور عذرا بھابھی بھی اچھی ہیں۔ کبھی کبھی دل دکھانے والی باتیں کر جاتی ہیں مگر کوئی بات نہیں، بڑی ہیں۔“  
سیدہ نے بڑے احترام سے دونوں جھانپیں کا ذکر کیا تو رجن خوش ہو گئے آغا جی اور صالح بیگم نے شروع ہی سے گھر میں ایسے قوانین اور اصول ترتیب دیے تھے کہ کسی کو ان سے انحراف کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ سب چوں چا کیے بغیر اس پر عمل کرتے اس لیے گھر کا ماحول بہت پرسکون تھا۔ آغا جی خود ذاتی طور پر گھر پر نظر رکھتے۔ فردا فردا اپنی بہوؤں اور بیٹیوں کے بارے میں پوچھتے ان کے مسائل پوچھتے کہ ان کو ان سے کوئی شکایت تو نہیں، اگر ہو تو وہ لوگ بلا جھجک کہہ سکتے ہیں۔ آغا جی کا یہ سلجھا ہوا انداز اور صالح بیگم کی کھجھاری ہی تھی جس نے ان دونوں کی زندگی کو کامیاب بنایا تھا۔ بچنے کی اس کامیابی کا ثبوت تھے۔



”شہزاد۔ شہزاد بیٹے۔“ زاہدہ بیگم کی پہلی آواز شاید سامعین کی حوا پار نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری پہنچی تو شہزاد چونک کر اٹھ بیٹھا۔

”جی۔ امی جان۔“ وہ ماں کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ تو وہ اس کو بغور دیکھنے لگیں۔

”یہ تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہوئی ہے بیٹا؟“ جب سے آئے ہو کھوئے کھوئے سے ہو، کیا بات ہے؟“ زاہدہ بیگم، شہزاد کے بستر پر بیٹھ گئیں تو وہ قالین پر ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر ان کو دیکھنے لگا۔

”کچھ بھی تو نہیں امی جان، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے تو کوئی بیماری نہیں۔“

”ضروری نہیں بیٹا کہ ہر بیماری کا تعلق جسم ہی سے ہو۔ بعض الجھنیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو بیمار کر دیتی ہیں۔“ زاہدہ بیگم منجیدگی سے بولیں تو شہزاد کا دل چاہا اپنی بھولی ماں کو سب کچھ بتادے کہ وہ جس قلبی اور روحانی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے اسے صرف عام میں لوگ محبت کا نام دیتے ہیں۔ جذبوں کے اس احساس کو جو خود بخود دل کے کھیتوں میں خود رو پھولوں کی طرح اُگ آتے ہیں۔ مگر وہ کس طرح اور کیوں کہتا۔ ماں کا احترام مانع تھا۔

”شہزاد بیٹے، یہ تم کن سوچوں میں پڑ گئے ہو، میں تم سے کچھ بات کرنے آئی ہوں۔

”ہوں جی۔ جی اچھا۔ ارشاد۔ حکم کریں۔“ وہ چونک کر سیدھا دیا۔

”وہ بیٹا، اب میں چاہتی ہوں کہ تمہارے فرض سے بھی فارغ ہو جاؤں تو روضہ رسول کا نظارہ کر آؤں۔ اس سلسلے میں اگر تمہاری کوئی پسند ہو تو بتادو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

وہ ماں کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کا رواں رواں پیچ اٹھا۔ ”عالی۔ عالی۔“ مگر جب تک عذرا سے عالی کے بارے میں معلومات نہ مل جائیں، وہ اس کا نام لبوں تک لانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی پہلی محبت تھی جسے وہ صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے خاموش رہا۔

”شہزاد۔ یہ تم بات بات پر کھو کیوں جاتے ہو؟“ میں نے تو پہلے ہی تمہاری پسند کو اذیت دی ہے۔ باوجود اس کے کہ بھائی جان کی یہ شدید خواہش ہے کہ میں ان کی چھوٹی بیٹی مجھ کو بہو بنالوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ اگر تمہاری کوئی پسند ہو تو اسی کو دیکھا جائے۔“

”جی شکر یہ امی جان۔ وہ اصل میں عذرا آپا کا بیوی بھابھی بتا رہی تھیں کہ آپا آئیں گی۔“

وہ ماں سے نظریں ملائے بغیر کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا بولا۔

”ہاں، عذرا نے کہا تو تھا کہ آئے گی مگر آغا صاحب کی طبیعت کچھ تازہ ساز ہوگئی ہے اس لیے شاید نہ آسکے۔“

”اوہو۔ آغا جی کی طبیعت خراب ہے؟۔ آپ کہیں تو میں ان کی عیادت کر آؤں امی جان۔“

شہزاد فوراً تیار ہو گیا۔ دل میں ملن کے پھول کھلنے لگے۔ اس حسین چہرے کو دیکھنے کے لیے دل اسی روز سے چل رہا تھا۔ مگر کوئی معقول بہانہ ہاتھ نہیں لگ رہا تھا اور بار بار کسی کے ہاں جانا، وہ بھی بہن کے سرال میں بڑی معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔

”ہاں بیٹے، جانا تو ہے۔ تمہیں فرست ہوتاؤ، کب چلا جائے؟“

”مجھے تو فرست ہی فرست ہے امی جان، ابھی اور اسی وقت چلتے ہیں۔“ وہ بے قراری سے جلدی میں

بولے کیا پھر احساس ہوا تو کچھ کھیا نا سا ہو گیا۔

”میرا مطلب ہے امی جان، مجھے تو آج کل فرست ہی ہے۔ آپ جب کہیں میں تیار ہوں۔“

”اچھا تو ٹھیک ہے، کل شام کو چلیں گے۔ آج رات تو چھوٹی بہو کے گھر والوں کی دعوت ہے۔“

زادہ بیگم تو چلی گئیں مگر وہ اپنے اور عابی کے درمیان حائل ان لمحوں کو شمار کرنے لگا جن پر چل کر اس فراق کے اس سفر کو تمام کرنا تھا۔

وہ سارا وقت شام کا انتظار کرتا رہا۔ بمشکل تمام تین بجے تو وہ الماری کھول کر کپڑوں کا انتخاب کرنے

لگے۔ کبھی سوچتا کہ سوٹ میں جائے۔ کبھی خیال آتا شلوار سوٹ ہی مناسب لگے گا۔ مگر کوئی فیصلہ نہیں رہا تھا۔

شہزاد تھا جو لباس کے معاملے میں سدا کا لا پرواہ تھا۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ زندگی میں ایسا مرحلہ بھی آئے گا کہ وہ

اچھا لگنے کی خواہش میں یوں خود پر توجہ دے گا آخر اس نے سفید کرتا شلوار نکال لی۔

”چلیں امی جان، میں تیار ہوں۔“ اب وہ زادہ بیگم کے کمرے میں تیار کھڑا چہرہ ہاتھا۔

”کہاں بیٹے؟“ انہوں نے قدرے حیرانی سے بیٹے کو دیکھا۔

”تو کیا آپ کی طرف نہیں چلنا؟ آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔“

”ہاں جانا تو ہے بیٹے، مگر ابھی تیز دھوپ میں کہاں جائیں گے؟۔ ذرا سورج کی تمازت کم ہو جا۔

چلیں گے۔ جانا۔ تو ہے۔“

سورج کی تمازت تو آج کل سات بجے تک رہتی ہے۔ تو کیا دید کی اس کی ہیک میں ابھی بھی کوئی کمی

جو پھر انتظار۔ شہزاد خود سے بولتا ہوا ہر آگیا اور کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا اور پھر امی انتظار میں گویا دنگ لگتی تھی

”شہزاد۔ شہزاد۔ اٹھو بھئی، جانا نہیں؟۔ امی کب سے تیار ہو کر کھڑی ہیں۔ اٹھ جاؤ۔ گاڑی بھی آ

ہے۔“ چھوٹی بھابی نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ نظریں سامنے لگے وال کلاک پر اٹھیں

ساڑھے چھ بج رہا تھا۔

”اب کیا فائدہ جانے کا؟۔“ شہزاد کا موڈ کچھ آف ہو گیا۔

”کیوں، فائدے سے کیا مراد ہے تمہاری؟“

”ظاہر ہے ساڑھے چھ بجے تو جارہے ہیں، سات بجے وہاں پہنچیں گے اور نو بجے امی وہاں سے

جائیں گی۔ انسان کسی کے گھر جاتا ہے تو تھوڑی دیر تو بیٹھنا ہی چاہیے۔ یہ کیا کہو یار چھوڑ کر چلا آئے۔“

اس کا موڈ مسلسل آف تھا۔ بھابی نے جا چٹی نگاہوں سے اسے دیکھا اور کچھ پانے کی کوشش کی۔

”تم ہو شہزاد جو کہا کرتے ہو کہ کسی کے گھر زیادہ دیر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ جلدی سے آ جانا چاہیے۔ یہ بات

کیا ہے آخر کہیں وال میں کچھ کالا تو نہیں؟“ بھابی نے مسکرا کر کہا تو شہزاد کتر آکر آگے بڑھ گیا۔ بھابی کی بات

پر شہزاد کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ راستے بھر۔ وہ سوچتا رہا کہ جانے وہ کل رخ کہاں ہوگی۔ اس کے سامنے آئے گی

بھی یا نہیں۔ اسے ایک نظر دیکھنے کا موقع مل سکے گا کہ نہیں۔ ان کی گاڑی گیٹ سے داخل ہوئی تھی ہی کہ اندر تک

ان کے آنے کی خبر پہنچ گئی۔ مردانے زنانے میں ہانپل چمکی۔ فرمان، رُمن، بیسین، شہزاد کی طرف بڑھے۔ قدیر

بیگم نے بڑھ کر زادہ بیگم کا استقبال کیا۔

”سب آغا جی کے کمرے میں ہیں۔ امی جان کو بھابی جان وہیں لے چلیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

بھرہ لوگ آغا جی کے کمرے میں چلے گئے، تو عذرا بیگم کچن میں آگئیں سیدہ جلدی سے آگے بڑھیں۔

”ارے بھابی، اتنے عرصے بعد تو خالہ جان آئی ہیں۔ آپ ان کے پاس بیٹھیے۔ میں جو ہوں

یہاں۔“ سیدہ نے ان کو بھی آغا جی کے کمرے میں بھیج دیا اور خود چائے کا انتظام کرنے لگیں۔

”بھائی صاحب، اب کسی طبیعت ہے آپ کی؟، ہم تو پریشان ہی ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ

ہمیشہ اس گھر پر رکھے۔ بلکہ مجھے تو اپنے گھر میں بھی بڑی ڈھارس رہتی ہے آپ کی۔“

زادہ بیگم نے ہمیشہ آغا جی کی بڑے بھائیوں کی عزت تھی اور وہ ہمیشہ بیٹی کو ہدایت کرتی تھیں کہ ان کی وجہ

سے آغا جی کو کوئی دکھ نہیں پہنچنا چاہیے۔

”اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، بہن جی۔ جب تک بہن کی دعائیں شامل حال ہیں، اللہ کی کرم نوازی ہے۔ آپ

اپنی سناپے گردے کی تکلیف کیسی ہے اب؟“ آغا جی نے اپنی ٹانگوں پر چادر درست کرتے ہوئے کہا۔

آغا جی کے کمرے میں سب موجود تھے اور ہلکی پھلکی باتوں کے ساتھ ہر تکلف چائے کا لطف بھی اٹھا رہے

تھے۔ مگر شہزاد کا دل اس لطیف جموں کے کا خنجر تھا جو آکر اس کی روح مہکا جاتا۔ اور اس کی آنکھیں بار بار بہانے

سے ادھر ادھر بھگ رہی تھیں۔ گہرے نیلے پردوں کی سرسراہٹ پر وہ چونک اٹھتا۔ شاید وہ مہتاب ببولے سے

نکل آئے اور کمرے میں ضیاء بار کر نہیں بکھر جائیں۔ مگر اس کے آنے کے دو درو در تک امکانات نہیں تھے۔

”اور سناؤ، شہزاد دیاں! پاکستان میں دل لگ گیا تمہارا؟ بھئی وہاں سے آنے والے نوجوانوں کا دل کم ہی

لگتا ہے بھر۔“ آغا جی نے اچانک ہی اسے مخاطب کر ڈالا تو وہ بولا کہ سیدہ ہا ہو گیا۔

”جی بالکل دل لگ گیا ہے اپنے گھر اور اپنے دیس کی ہی بات کہیں نہیں ہوتی۔ آغا جی اگر ہو تو کوئی گھر اور

وطن کو یاد نہ کرے۔ اسی رنگین فضا کا ہو رہے۔“ وہ بہت سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔

”شباباش۔ شباباش۔ تمہیں اپنی تعلیم کے مطابق ڈگری مل گئی۔ مطمئن ہو؟“

”جی ویسے تو مطمئن ہوں مگر علامہ اقبال کے مطابق انسان کو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہونی

چاہیے۔ جدوجہد کا جذبہ ہمہ وقت ابھرا ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ انسان جب تک خوب سے خوب تر کی تلاش میں

لگا رہتا ہے۔ وہ زندگی کے نئے اور چھپے ہوئے اسرار و رموز سے آشنائی حاصل کرتا رہتا ہے۔ جستجو کا جذبہ انسان کو

نئی نئی حقیقتوں سے آشنا کرتا ہے۔ اس لیے انسان کو قناعت کر کے بیٹھنا نہیں چاہیے۔ زندہ رہنے اور آگے بڑھنے

کے لیے کھوج اور جستجو میں لگے رہنا چاہیے۔ اس لیے میں بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں لگا رہتا



ہوں۔“ شہزاد کے اتنے سلجھے اور مدلل جواب سے آغا جی کا دل خوش ہو گیا۔

”جیتے رہو شہزاد مہاں، دل خوش کر دیا۔ بہن جی، یہ بیٹا آپ مجھے دے دیں۔ یہ تو میرے خیالات کا پر تو لگتا ہے۔“ آغا جی نے مسکرا کر شہزاد کی طرف دیکھا۔

”آپ ہی کا بیٹا ہے بھائی صاحب۔“ یہ بات کہنے والی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیوں اور کس لیے کہہ رہے ہیں۔ اس کا کوئی مطلب ہے بھی کہ نہیں مگر شہزاد کے دل کی کلیاں ضرور پھول بن گئی تھیں۔

”عذرا بیٹی جاؤ لڑکیوں کو بلاؤ۔ بہن جی کتنی دیر سے آئی ہوئی ہیں۔“

بی بی جی کی بات پر شہزاد کا دل دھڑک اٹھا۔ مگر شاید تڑپ میں کچھ کمی تھی، صرف قدیر اور سیدہ ہی آئی تھیں۔ اندر کہیں گہری شام اترنے لگی تھی کہ بی بی جان کی بات نے پھر امید کے دیے روشن کر دیے۔

”یہ عالی کیوں نہیں آئی؟“

”جی بی بی جان وہ نماز سے فارغ ہوئی ہے۔ ابھی آتی ہے۔“

شہزاد کے دل کی تڑپ کسک سے قطعی بے نیاز عالی دانستہ اندر جانے سے کتر ا رہی تھی۔ وہ تو اس روز وہاں جمنا کا ہی نہیں بھول پائی تھی۔ کتنے ہی دن وہ ہوتی رہی کہ شاید فرمان شہزاد کے پاس اسے بیٹھا دیکھ کر ناراض ہو گیا۔

ہیں۔ جانے کیوں اسے وہم سا ہو گیا تھا کہ فرمان جانے اس کے بارے میں کیا خیال کریں اور وہ تو ان کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی گمنامہ عظیم سمجھتی تھی۔ اس لیے وہ اندر جانا نہیں چاہتی تھی مگر جب سرین بی بی جی کا پیغام لے کر آئی تو جانا پڑا۔ گہرے سبز رنگ کے سوٹ میں بڑے سے سبز ملل کے دوپٹے کو پیشانی تک لائے، وہ چلوں کا

جھار گرائے اندر آگئی تو سب کے ساتھ شہزاد کی نگاہیں بھی حسن کے طواف کے لیے اٹھ گئیں۔ مگر یہ رعب حسن تو یا احترام حسن، اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ عالی بی بی جان کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئی۔

”عالی بیٹی تو بالکل عید کے چاند کی طرح ہے۔ کبھی کبھی ہی نظر آتی ہے۔“ زاہدہ بیگم نے پیار سے عالی کو دیکھا۔

”یہ ہماری اولاد میں سب سے زیادہ کم کو اور شرمیلی ہے۔ یہ آپ کو کیا، ہمیں بھی کبھی کبھی نظر آتی ہے؟“

آغا جی نے شفقت سے عالی کو دیکھا جو ہاتھوں کو آپس میں جکڑے سر جھکا کر بیٹھی تھی۔ شہزاد کی سامعیت اس کی شیریں آواز کی جلتی لگ کی خستہ تھیں۔ مگر اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں عالی کے بولنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”شہزاد صاحب، آپ کھانے تک میری معذرت قبول کریں۔ ایک ضروری کام سے ایک جگہ جا رہے۔“ فرمان اٹھ کھڑے ہوئے تو شہزاد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ عالی کا دل انجانے خدشوں سے دھڑک اٹھا کہ کہیں فرمان اس کے یہاں آنے سے ناراض تو نہیں ہو گئے۔ مگر وہ تو بی بی جان کے بلانے پر آئی تھی۔ اپنی خوشی کا کب دخل تھا۔

”نہیں بیٹے فرمان، اب تو میں اجازت لینے والی ہوں بھائی صاحب سے۔“

زاہدہ بیگم بولیں تو شہزاد کا دل ڈول سا گیا۔ وہ تو اس مقام تک آ گیا تھا جہاں سے واپسی ناممکن تھا۔

”واہ، بہن جی، آپ نے یہ بات کیسے کہ دی، کھانے میں دیر ہی کتنی ہے کھا کر جائے گا۔“

عذرا بیگم بھی یہ ہی چاہتی تھیں کہ ماں اور بھائی کھانا کھا کر جائیں مگر خود سے کہنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا اور شہزاد کی عین خواہش تھی کہ جتنی دیر بھی یہاں ٹھہر جائے بہتر تھا۔ شہزاد نے واپس اپنی جگہ پر آتے ہوئے کہا اکیوں سے عالی کو دیکھا جس کے صبحی رخساروں پر چلوں کا سایہ لرزاں تھا۔ عالی کو یہاں بیٹھنا دہر ہو رہا

تھا۔ جب تک فرمان تھے یہاں بیٹھنا کتنا بھلا لگ رہا تھا مگر ان کے جانے کے بعد تو ٹھہر نہیں جا رہا تھا۔

”بی بی جان۔ میں جاؤں؟“ آواز کا جھرتا شہزاد کی سماعت میں اترتا چلا گیا۔ مگر وہ اس کے اٹھ جانے کے باعث اس کی اگلافتوں کو محسوس نہ کر سکا۔ وہ اس کی طرف پشت کیے دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔

”عالی بیٹے۔“

”جی آغا جی۔“ آغا جی کی آواز پر وہ جلدی سے مڑی تو دوپٹے سر سے سرک گیا اور کئی شوخ تلیں خوبصورت چہرے پر لہرائے لگیں جیسے اسی کی خستہ ہوں تو شہزاد کی نگاہیں گستاخ ہو گئیں۔ کسی بات کا خیال کیے بغیر اس حسین کھڑے پر جی رہیں۔ جو آغا جی کی بات کی منتظر تھی۔

”بیٹے ذرا باورچی خانے میں کہہ دینا کہ کھانے کا اہتمام ذرا جلدی کر لیں۔“

”جی بہتر۔“ وہ دوپٹہ درست کرتی نرمی سے بولتی باہر نکل گئی۔ شہزاد گہرا سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔

”بیگم صاحبہ۔ کھانا تیار ہے۔ چلیں سب۔“ چپا بھانجی ہوئی آگئیں۔

چپا۔ یہ کب کی بات ہے کہ کھانا تیار ہے۔ جب تک آپ کھانے کا پیغام لے کر آئی ہیں، کھانا آدھا باسی ہو گیا ہوگا۔“ آغا جی نے مسکرا کر چپا کو دیکھا۔

”سرکار! سوچیوں کے سامنے تو خوار نہ کریں۔ ابھی ابھی تو بڑی بھونے کہا۔ میں بھاگی چلی آئی۔“

چپا جی نے شکایتی انداز میں آغا جی کو دیکھا۔

”چپا جی اس بھام دوڑ میں کتنوں کو جاں بحق کیا۔ شکور چپا جی کو کبھی نہیں بخشا تھا۔“

”ٹھہر تم بخت بتاتی ہوں میں سب جانوں یہ اس بددماغ بڑھے خان نے تم لوگوں کو میرے خلاف کر رکھا ہے۔ اس کو بھی سمجھ لیتی ہوں اور تم لوگوں کو بھی دیکھتا رہو۔“

اور جب تک چپا جی اس کو پکڑ کر سیدھا کرتیں وہ جانے کہاں کہاں پہنچ چکا ہوتا سب مسکراتے ہوئے کھانے کے کمرے آ گئے، جہاں بڑی سی میز پر کھانا چن دیا گیا تھا۔ شہزاد نے کن اکیوں سے کمرے کا جائزہ لیا مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ دل بچھ سا گیا۔ یہ ہی تو وہ جگہ تھی جہاں دوبارہ سے دیکھنے کی امید تھی۔

”عالی نظر نہیں آ رہی سرین! جاؤ عالی بی بی کو بلاؤ۔ کھانا لگ چکا ہے۔“

بی بی جان کے کہنے پر سرین بھاگی گئی۔ عالی دانستہ کتر ا رہی تھی، مگر بی بی جان کے بلانے پر آنا پڑا۔ وہی دوپٹے سے ڈھکی پیشانی، وہی حیا سے جھکی چلیں۔

”یہاں آ جاؤ بیٹی! میرے برابر کرسی پر۔“ زاہدہ بیگم نے اپنے ساتھ والی کرسی پر اسے بٹھایا تو عالی نے شکر کیا کہ کہیں اسے شہزاد کے برابر والی کرسی نہیں مل گئی، اور اتنی سی تھی نہیں کہ وہ نگاہیں اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیتی کہ کون کہاں بیٹھا ہے۔ بس اس کی پیش نظر تو فرمان کی موجودگی یا عدم موجودگی رہتی۔ سب کھانے میں مصروف تھے۔ مگر شہزاد کی نگاہیں عالی کے سرمری ہاتھوں پر جمی ہوئی تھیں۔

”شہزاد! کیا بات ہے کیا سوچ رہے ہو؟ میں دیکھ رہی ہوں کتنی دیر سے تم نے تین چار نوالے کھائے ہیں۔“

”جی۔ جی آپ دیکھ رہی تھیں۔“ شہزاد یوں چونکا جیسے چوری کرتا پکڑا گیا ہو۔

”ہوں تو گویا بھائی جان آپ سب کے نوالے کمن رہی ہیں۔“ فرمان نے مسکرا کر قدیرہ بانو کو دیکھا

شہزاد اس جھٹکے کے بعد خاصا سنبھل گیا۔ اس نے نگاہوں کو جبراً جھکائے رکھا۔ اس خوشگوار سی بلکل میں عالی پر راز منکشف ہوا کہ وہ شہزاد کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہے۔ وہ سن سی ہو گئی اور اچانک ہاتھ صاف کر کے کھڑی ہو گئی۔ شہزاد بس پہنچی نگاہوں سے اس کے خوبصورت ہاتھوں کو حرکت کرتا، دیکھ کر رہ گیا۔

”کیا ہوا عالی اٹھ کیوں گئیں؟“ عذرا بیگم کے کہنے پر عالی مڑ کر دیکھنے لگی۔

”جی کھالیا کھانا۔“ عالی آہستگی سے بولی شہزاد کی نگاہیں اس پر اٹھ گئیں۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ شہزاد آنکھوں میں دیرانی چھپائے کھانا کھاتا رہا۔ کھانے بعد پھر آغا جی کے کمرے میں قہوے کا دور چلا اور باتیں ہو رہیں، پھر زاہدہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اچھا بھائی صاحب! اب تو اجازت دیں۔“

”بہت بہت شکریہ آپ نے اتنی تکلیف کی آنے کی۔ آتی جاتی رہا کریں۔“

”جی بہتر اچھا بھائی جان اجازت۔“ پھر آغا جی اور صالحہ بیگم نے وہیں سے خدا حافظ کہہ دیا باقی سر گاڑی تک آئے۔

”آپا جان! آپ کب آرہی ہیں گھر پر۔“ شہزاد عذرا کے پاس آ کر آہستگی سے بولا۔

”ابھی تو نہیں چند ہفتوں بعد آؤں گی جب آغا جی مکمل طور پر تندرست ہو جائیں گے۔“

”آپا آپ جلدی نہیں آسکتیں۔“ اس کے لہجے میں بے قرار نمایاں تھیں۔

”کیوں کوئی خاص بات ہے کیا۔“ عذرا بیگم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”جی بہت خاص بہت اہم بات کرنی ہے آپ سے۔“ وہ گاڑی کا دروازہ کھولتا ہوا بولا۔

”ہوں تو اس کا مطلب ہے۔“ پھر میں جو تک لگ چکی ہے۔“ عذرا نے پیار سے بھائی کو دیکھا۔

”اچھا پھر میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔“ عذرا آ پا خوش ہو گئیں۔

”یہ کیا بہن بھائی میں راز داری کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اب ہمیں جانے دو بیٹی کیا رہنمائی گئے ہیں رازدار۔“ زاہدہ بیگم کی آواز پر دونوں بہن بھائی چونک گئیں۔

”آپا جان! میں چند روز بعد آپ کو لینے آ جاؤں گا۔“ شہزاد اپنے آنے کا تاتا خدا حافظ کہتا گاڑی آگے بڑھا گئے اور عذرا بیگم اس لڑکی کے بارے میں سوچتی اندر آ گئیں۔ جو ان کے اتنے خوبرو بھائی کو بھاگتی تھی۔ زیراب مسکراتی رہیں۔



”شکور!“ آغا جی نے حقے کی نال پکڑتے ہوئے کہا جس پر ابھی شکور ٹوپی میں تبا کوڑھ کر مڑا ہی تھا۔

”جی سرکار۔“ شکور جلدی سے واپس پلٹا۔

”جاؤ دیکھو، بیگم صاحبہ کے کمرے میں گھر کی خواتین کے علاوہ کوئی اور تو نہیں ہے۔“

”جی بہتر! ابھی جا کے آیا۔“ شکور جلدی سے باہر نکل گیا۔

”سرکار نہ گھر کی نہ باہر کی۔ ان کے کمرے میں ایک بھی خاتون نہیں۔“

اچھا یہ حقہ اٹھاؤ اور ان کے کمرے میں پہنچا کر آؤ، ہم وہیں آ رہے ہیں۔

آغا جی کمرے میں داخل ہوئے تو صالحہ بیگم نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔

آغا جی نے سب بچوں کی باری باری باتیں پوچھیں۔ وہ اس طرح گھر کے ہر معاملے کی خبر رکھتے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ گھر میں کوئی بات یا غلط فہمی پیدا ہو جو بغاوت کا روپ دھار کر ان کی عمارت میں دراڑیں ڈالی دے۔

”آپ ناخن پریشان ہوتے ہیں آغا صاحب! اللہ کا کرم ہے گھر پر، اولاد آپ کی فرمانبردوار ہے پھر آپ وہم کیوں کرتے ہیں۔“ صالحہ بیگم نے اطمینان دلایا۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ بیگم! میں مطمئن ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ فرمان میاں کیا چاہتے ہیں۔“ آغا جی نے بال ایک طرف رکھ دی اب وہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ بی بی جان پریشان ہو گئیں کہ نجائے کیا بات ہو گئی۔

”کیا ہوا آغا صاحب؟ اس نے کبھی کوئی گستاخی کی تو۔“

”نہیں بیگم! ایسی بات نہیں اس کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کیا کرتا رہتا ہے، کیا کرتا چاہتا ہے۔ آیا تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہے یا بزنس کرنا چاہتا ہے۔ کچھ پتا چلے تو پھر عالی بیٹی کے بارے میں سوچا جائے۔“

”تو آپ یہ باتیں خود فرمان سے کر لیجیے۔ تاکہ پتا چلے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ میں خود کوئی روز سے آپ سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتی تھی کیونکہ سیدہ رحمن کی شادی میں جس جس نے عالی بیٹی کو دیکھا رشتہ لے کر آ گیا۔ اب ان کی باقاعدہ بات یا گفتنی ہو جائے تو آنے والے کو کہہ دیا جائے۔“

”ہوں ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں بات کروں گا فرمان سے۔“

ان تمام سوچوں سے پرے فرمان اپنے خیالوں کے خواب جزیرے میں انوکھے ہی خواب دیکھ رہے تھے۔ باہر کسی بھی ملک میں جا کر تعلیم حاصل کرنا ان کا دیرینہ خواب تھا۔ شہزاد امریکہ سے پڑھ کر آئے تھے۔ تب سے اور بھی شوق زیادہ ہو گیا تھا انہوں نے شہزاد سے ساری معلومات بھی حاصل کر لی تھیں مگر ساری بات تو یہ تھی کہ ملی کے گلے میں گھنٹی باندھے کون آغا جی سے بات کس طرح کی جائے، وہ تو یہ بات سننے کے بھی روادار نہیں ہو سکتے تھے۔

”لیکن اس میں آخر حرج بھی کیا ہے۔ خود تو وہیں سے پڑھے ہوئے ہیں۔ ہم پر پابندیاں ہیں۔ بس میں آغا جی سے بات ضرور کروں گا۔ ضروری تو نہیں کہ انسان باہر جا کر گمراہ ہو جائے۔ خود بھی پڑھ آئے ہیں۔ اچھے خاصے شریف ہیں اور شہزاد بھی اچھے ہیں۔ بس میں آغا جی سے ضرور بات کروں گا۔“

فرمان کی سوچیں فرمانبرداری کی حدود سے نکل کر کچھ بغاوت پر آمادہ ہو گئیں۔ فرمان لوگمان تک نہیں گزرا تھا کہ کوئی ان کے بغیر خود کرا دھورا سمجھتا ہے جس کے دل کی ہر دھڑکن ان کے تصور سے آباد ہے۔ وہ عالی کیا کرے گی جب اسے پتا چلے گا۔ اس کے دل کا قرار اسے چھوڑ کر دیار غیر جا رہا ہے۔ وہ جو ایک پلی بھی ان سے جدائی کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اتنی طویل جدائی کیونکر برداشت کر پائے گی۔ فرمان ان تمام باتوں سے ان تمام جذباتوں سے بے نیاز تھے۔ اس سے قبل کہ وہ آغا جی کے پاس جاتے آغا جی نے ان کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا

اب وہ وطن کے سامنے والے صوفے پر سر جھکائے قائلین کو دیکھ رہے تھے۔

”کیوں صاحب زاوے کیا ارادے ہیں آپ کے؟ آغا جی نے ان کے جھٹکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی کچھ نہیں جی۔“ بے لکھی سی بات ان کی زبان سے آپ ہی پھیل گئی۔

”کیا مطلب کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مستقبل میں کچھ کرنے کا۔ بھی پڑھنا ہے مزید یا پھر کوئی جاب یا بزنس

یا کوئی اور ارادہ تو ہوگا“ آغا جی کے لہجے میں ذرا سی سختی آ گئی تھی۔

”جی میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ فرمان آغا جی کے لہجے سے ذرا گھبرا گئے۔

”تو یوں کہو نا اس میں اس قدر گھبرانے یا شرمانے کی کیا بات ہے۔ یہ تو میرے لیے باعث مسرت خبر ہے کہ تم مزید پڑھنا چاہتے ہو۔ پتا کو تے رہو ایڈیشن اوپن ہوں تو اللہ کا نام لے کر اپلائی کر دو۔“

”جی بہتر، کروں گا۔“ فرمان انتہائی فرمانبرداری سے بولے گویا ان سے اسی سلسلے میں تو اجازت لینے آئے ہوں۔

”اور تو کوئی مسئلہ نہیں تمہیں؟“ آغا جی ان کو خاموش دیکھ کر بولے تو وہ سر جھکائے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی نہیں جی اور تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اب میں جاؤں گی۔“ وہ اجازت مانگ رہے تھے۔

”ہاں جاؤ۔ قیمتی وقت برباد کرنے سے بہتر ہے۔ اچھی کتابوں پر صرف کرو، شکور کو بھیج دینا۔ حقہ خدا ہو گیا ہے۔“

فرمان جی بہتر کہتے باہر نکل آئے۔ شکور کو آغا جی کے پاس بھیج کر خود اپنے کمرے میں آ گئے۔

”تف ہے یا راسی بھی کیا بزدلی کوئی غلط بات تو نہیں کہتی تھی۔ حق بات بھی باہر جانا کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں۔“ فرمان خود کو اپنی بزدلی کو کوس رہے تھے۔ جس کی بناء پر وہ اصل بات نہ کہہ پائے تھے۔ مگر وہ بھی طے کر چکے تھے کہ اپنے اس شوق کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے کریں گے، وہ اسی وقت اٹھ کر بی بی جان کے کمرے سے آ گئے جہاں عالی ان کے سر میں تیل ڈال رہی تھی۔ فرمان پر نظر پڑتے ہی دھڑکنیں شوخ ہو گئیں پلکوں کی جھلار رخساروں پر گر گئی چلی گئی۔ تو یہ ہے جانے کیا بات تھی فرمان میں کہ دل کی دنیا ہی اٹھل پھل ہونے لگتی۔ حواس ہی قابو میں نہ رہتے تھے اس کے۔

”آداب بی بی جان! فرمان بی بی جان کے دائیں طرف بیٹھ گئے جبکہ عالی کھڑی تیل ڈال رہی تھی۔ فرمان کی اتنی قربت پر شفاف پیشانی عرق آلود ہو گئی، ہاتھوں میں آ جانے والی لرزش کو بی بی جان نے محسوس کر لیا تھا۔

”جیتے رہو چاند! آج ماں کی یاد کیسے آگئی؟“ بی بی جان نے شفقت سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے شکوہ کیا۔

”میں۔ میں آپ سے ایک بات کرنے آیا ہوں بی بی جان۔“ فرمان نے ایک نگاہ اس حسین چہرے پر ڈالی جس پر ان کی آمد پر نگاہ کھٹکنے لگے تھے۔ اب تو اور بھی حالت خراب ہو گئی۔ جانے کیا بات ہو کیا خبر اسی کے متعلق ہو۔ ایک شوخ دھڑکن سرگوشی کر گئی تو وہ گھبرا گئی اور جلدی سے بی بی جان جیکے بال سینے لگی۔

”کہہ بھی چکویتا، میں منتظر ہوں۔“ بی بی جان نے گویا فرمان کو یاد دلایا کہ وہ کچھ کہنے کو آئے ہیں۔ اصل میں وہ خاموش اس لیے تھے کہ عالی اپنا کام سمیٹ کر باہر جائے تو وہ بات کریں۔

”عالی! تمہارا کام ختم ہو گیا ہو تو جاؤ مجھے۔ بی بی جان سے بات کرنی ہے۔“ عالی سے بات کرتے ہوئے ان کے لہجے میں جانے اکھڑیں کہاں سے آ جاتا تھا۔ کہ شوخ دھڑکنیں مدھم پڑ جاتیں۔ وہ حکم یک جہل میں آگے بڑھی۔

”عالی! میرے وجود کا حصہ ہے فرمان بیٹے! اسے کیوں باہر بھیج رہے ہو۔“ بی بی جان کو فرمان کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے بی بی جان یہ جو خواتین ہوتی ہیں ناں ان کے پیٹ میں بات زیادہ دیر رہ نہیں سکتی اس لیے کہہ رہا ہوں۔“

فرمان۔ وضاحت کرتے ہوئے بولے عالی نے ایک ہلکی سی شاکی نگاہ اس پر ڈالی کہ وہ اسے اعتبار کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔

”اچھا تو میں کیا ہوں، میرا شمار خواتین میں نہیں ہوتا کیا؟“ بی بی جان۔ فرمان کی بات پر مسکرا پڑیں۔

”آپ۔ آپ تو ماں ہیں میری پیاری بی بی جان!“ انہوں نے ماں کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”بی بی جان میں قدسیہ بھابھی کے کمرے میں ہوں۔ کوئی کام ہو تو آپ بلا لیں۔“ عالی آہستگی سے باہر نکل گئی۔

”ہاں تو اب کہو کیا بات ہے۔“ بی بی جان نے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا تو فرمان ان کے بند پڑے ہاتھوں اور پر کر کے کچھ سوچنے لگے یوں جیسے اپنی بات کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہے ہوں۔

”وہ بی بی جان! میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے باہر جانا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے کہا تو بی بی جان حیرانی سے دیکھنے لگیں۔

”کہاں جانا چاہتے ہو تم؟“ بی بی جان۔ بیٹے کا چہرہ پڑھتے ہوئے بولیں۔

”وہ۔ وہ بی بی جان میں امریکہ جانا چاہتا ہوں تعلیم کے لیے۔ یہ میری شدید خواہش ہے اور آپ لوگوں کو اجازت دینی پڑے گی۔“ وہ ذرا ہمدردی لہجے میں بولے، بی بی جان کے لیے یہ بات نئی تھی اور حیران کن پریشان کن بھی کیونکہ اس بات پر گھر میں ہنگامہ بھی ہو سکتا تھا۔ آغا جی اس بات کے شدید خلاف تھے۔

”بیٹے! بات ہمیشہ بہت سوچنے کے بعد منہ سے نکالنی چاہیے ایسے نہیں کہ جو جاہا کہہ ڈالا۔“

بی بی جان کے لہجے میں ناراضگی کا عنصر شامل تھا۔ فرمان کی ہمت جواب دینے لگی۔

”بی بی جان! یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں کہہ دی۔ ساری دنیا پڑھتی ہے، اور شہزاد بھی تو پڑھ کر آئے ہیں امریکہ سے اور خود آغا جی اور چچا جان مرحوم باہر سے پڑھ کر آئے ہیں آخر خرابی کیا ہے اس میں۔ والدین تو اولاد کی خواہشات کی تکمیل کے لیے جانے کیا کچھ برداشت کر لیتے ہیں اور آپ لوگ۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔“

فرمان ماں سے ناراض ہو گئے، سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بات کم از کم بی بی جان سے کھل کر کر سکتے تھے۔

”بات اعتبار کی نہیں بیٹے! یہ دل ہی بہت کمزور ہے۔ بچوں کو نظروں سے دور نہیں کر سکتی اور تمہارے آغا جی کب اس حق میں ہیں کہ ان کی اولاد باہر جائے اور ان کو بھی ان کے والدین نے مجبوراً باہر بھیجا تھا۔ جائیداد کی وجہ سے لوگ ان کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ اس لیے تمہارے دادا نے دونوں بیٹوں کو باہر بھیج دیا اور خود شہر میں آکر آباد ہو گئے۔“

بی بی جان کی اس بات نے فرمان کے ذہن کو صاف کر دیا کہ آغا جی مجبوراً باہر گئے تھے، مگر وہ تو اپنے شوق کی وجہ سے جانا چاہتے تھے۔ یہ ان کی شدید خواہش تھی۔

”مجھے وہ تو مجبوراً گئے بی بی جان! مگر یہ میری خواہش ہے کہ باہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ بی بی جان پلیز آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں ناں۔ آغا جی کو متائیں ماں باپ تو بچوں کی ہر خواہش پوری کرتے ہیں اور آپ لوگ۔“

فرمان نے منہ ہٹا کر شکوہ کیا تو بی بی جان کو ان کی بات سے بہت دکھ پہنچا۔

”بیٹے! والدین اگر اولاد کی خواہشات پوری کرتے ہیں تو یہ احسان نہیں ہوتا مگر اگر کبھی اولاد کی بھلائی

کے لیے یا اپنی محبتوں سے مجبور ہو کر ان کی کوئی خواہش پوری نہ کر سکتے ہوں تو اولاد۔“  
بی بی جان نے بات ادھوری چھوڑ دی ان کے لہجے میں جانے کیا تھا فرمان چونک گئے۔ انہوں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”آپ ناراض ہو گئیں بی بی جان۔ میں معافی چاہتا ہوں آپ لوگ ہمارے بے مثل والدین ہیں بی بی جان میری کوتاہی میری گستاخی سے آپ کو دکھ پہنچا ہے تو ٹھیک ہے، میں اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دوں گا۔ لیکن پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔ بی بی جان آپ ناراض نہ ہوں مجھ سے، میں گناہ گار ہو گیا ہوں۔“  
فرمان بچی لہجے میں ماں سے معافی مانگ رہے تھے۔ اس وقت فرمان بی بی جان کو بہت اچھے لگے۔ بالکل ایسے بچے کی مانند جو اپنے پسندیدہ کھلونے سے کھیل رہا ہو اور کوئی اس کو منہ کر دے اب اپنی خواہش بھی محترم اور کہنے والے کا احترام بھی لازم تھا۔ چنانچہ احترام جیت گیا اور خواہش دب گئی۔ انہوں نے فرمان کی پیشانی چوم لی۔  
”نہیں میرے بچے! میں ناراض نہیں ہوں بس ذرا شکوہ ہوا کہ ڈالا۔ تم ملال نہ کرو میں آغا صاحب سے بات کروں گی دیکھو کیا جواب دیتے ہیں ویسے کچھ شرائط میری بھی ہیں۔“

”ج ب ج بی جان آپ بات کریں گی ناں مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ فرمان نے بی بی جان کے ہاتھ چوم لیے وہ بے حد خوش ہو گئے گویا اجازت ہی مل گئی ہو ان کی کامیابی کی۔  
یہ پہلی منزل آسان ہوئی تھی۔ خوشی میں وہ یہ بھی پوچھنا بھول گئے کہ بی بی جان کو کسی شرائط عائد کرنا چاہتی ہیں۔ آیا وہ شرائط مان بھی سکیں گے کہ نہیں۔ مگر خوشی میں وہ کچھ بھی سوچ سکے۔ جان سکے، کیونکہ اب ان کو امید ہو گئی تھی کہ اگر بی بی جان مان گئی ہیں تو آغا جی بھی مان جائیں گے۔

مگر یہ خوشی زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوئی بی بی جان نے آغا جی سے بات کی مگر انہوں نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا کہ فرمان کو ایسا سوچنے کی بھی جرأت کیوں ہوئی لہذا وہ باہر جانے کا خیال دل سے نکال دیں اور ملک میں جس شہر میں چاہے جا کر مزید تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ فرمان بس اپنے ہاتھ پر مکتہ مار کر رہ گئے اور تو کچھ نہیں کر سکتے تھے۔



اس روز عذرا کا فون آیا تو شہزاد نے بے قراری سے پوچھا۔ ”آپا کب آؤں آپ کو لینے کے لیے۔“  
”کل شام کو آ جاؤ۔“ عذرا بیگم بھائی کی بے قراری محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔  
”کل شام یہ آپ لوگ کیا اتنے گھنٹوں کے انتظار کی صلیب پر چڑھا دیتی ہیں مجھے۔“  
شہزاد کو کل شام لفظ ہی سے چڑھ گئی تھی۔ اس لیے وہ بے زاری سے بولا۔  
”اچھا تو تم کل صبح آ جاؤ۔ ویسے اتنی بے قراری کا سبب کیا ہے آخر؟“  
”اسی لیے آپ سے ملنا چاہتا ہوں اور آپ ہیں کہ اتر اتر ہی ہیں۔“ وہ کچھ برہم ہو گیا۔  
”اب تو بھئی ملنا ہی پڑے گا۔ ویسے کیسی ہے؟“ عذرا بیگم کو بھی اس لڑکی کو دیکھنے کا اشتیاق ہو رہا تھا۔  
”شاید آپا میں خوشبو کو لفظوں کا پیرا، ہن ندے سکوں؟“ وہ بہت خوبصورت لہجے میں بولا۔  
”ہوں گویا کوئی بے حد ہی حسین لڑکی ہوگی جو میرے چاند بھیا کو پسند آتی ہے۔“

”اچھا میں کل گیارہ بجے کے قریب آؤں گا خدا حافظ۔“

شہزاد ریسور رکھ کر اپنے کمرے میں آ گیا پھر تمام رات سہنوں میں گزر گئی ساڑھے دس بجے قریب وہ آپا کے ہاں جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔

”شہزاد بات کیا ہے آخر؟ یہ بناؤ سنگھار، یہ تئیا ریاں کہاں کی تیاری ہیں۔“

چھوٹی بھابی اسے یوں اہتمام سے تیار ہوتے دیکھ کر بولیں۔

بھابی کے شوخ جملوں کی برسات میں وہ دل میں انجمنی انگٹوں کی لہروں کے سنگ در جاناں پر پہنچ گیا۔

”آداب چپا جی! سب سے پہلی ملاقات چپا جی ہی سے ہوئی تو اس نے آداب کیا۔“

”ارے جیتے رہو شہزاد میاں! اللہ چاندی دلہن نصیب کرے۔“ چپا جی کی پسندیدہ دعا تھی جو وہ ہر جوان کو دے کر اس کے دل میں انگٹوں کو چکا دیتیں اور شہزاد کے تصور میں تو پہلے ہی چاندی صورت آپا تھی وہ مسکرا دیا۔

”آپ یہاں بیٹھے شہزاد میاں! میں اندر اطلاع کرتی ہوں۔“ چپا جی بھاری وجود کو کیسے بھتی باہر نکل گئیں تو شہزاد صوفے میں دھنس گیا۔

”چھوٹی بھو! شہزاد میاں آئے ہیں۔“ تقریباً دس منٹ میں چپا جی باورچی خانے تک پہنچ پائیں۔

”کمال ہے چپا جی شہزاد میاں آئے ہیں اور آپ ان کو ساتھ لانے کے بجائے ڈرائیونگ روم میں مہمانوں کی طرح بٹھا آئی ہیں مگر بر کوئی مرد بھی نہیں۔ انہیں بلا۔ اچھا رہنے دیں آپ کی واپسی تک شاید وہ ناامید ہو کر واپس چلے جائیں۔ شکوہ تم شہزاد کو بلاؤ۔“

عذرا بیگم کے بجائے قدیرہ بانو جلدی سے بولیں۔ قدیرہ بانو کے اپنے تو بھائی تھے نہیں اس لئے وہ اپنی دیوانیوں کے بہن بھائیوں کو بھی اپنے بہن بھائی سمجھتی تھیں اور شہزاد تو ان کو ویسے ہی بہت اچھا لگتا تھا۔

”آداب آ یا! آداب بھابی جان!“ شہزاد نے جھک کر دونوں کو آداب کیا۔

”جیتے رہو بھائی۔“ قدیرہ بانو نے جھکے ہوئے شہزاد کے شانے پر ہاتھ بھیرا۔

”ہتا ہے بھابی جان آج یہ مجھے لینے آئے ہیں موہ دف۔“ اسی بہانے عذرا بیگم نے جانے کی اطلاع دے دی۔

”ہاں ضرور چلی جانا۔ کافی دنوں سے تم نہیں گئیں۔“ قدیرہ بانو نے گویا اجازت دے دی۔

”اس وقت تو اور کوئی نہیں شہزاد جو تمہیں کہنی دے۔ ایسا کر دی بی بی جان کے کمرے میں چلے جاؤ سیدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس لئے کچن میں کام زیادہ ہے۔ میں فارغ ہو کر آتی ہوں۔ جاؤ نسرین شہزاد کے ساتھ بی بی جان کے کمرے تک عذرا بیگم نے کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”نسرین کی کیا ضرورت ہے آپا! مجھے بی بی جان کے کمرے کا راستہ پتا ہے۔ میں خود چلا جاتا ہوں۔“

شہزاد نے بی بی جان کے بند دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور بازو پیچھے کر کے ذرا جھک کر کھڑا ہو گیا۔

”آداب بی بی۔“ شہزاد نے جھکی ہوئی پلکوں کو اٹھایا تو سامنے وہ زہرہ نجیں جلوہ افروز تھیں دوسرا آنکھیں اسے اپنے فوس میں قید کرتی پلکوں کی اوٹ میں چھپ چکی تھیں۔ وہ مہبوت سا گلابی لبادے میں لینے اس حسین سراپے کو دیکھتا رہ گیا۔

”کون ہے عالی بیٹی!“ بی بی جان کی آواز پر وہ ہوش میں آیا تھا ایک حسین خواب سے حقیقت کی دنیا میں،



جہاں عالی۔ دروازے سے پرے کھڑی تھی۔ گویا اس کے لئے راستہ بنا رہی ہو۔  
وہ نظروں کو حسن کے احترام میں جھکا رہنے کی تاکید کرتا اندر چلا آیا۔  
”میں ہوں بی بی جان!“ وہ بی بی جان کے سامنے سر جھکا تا ہوا ہوا۔

”جیتے رہو شہزاد بیٹے! کیا حال ہے؟ ہماری بہن کسی ہیں۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ مسکھ کر سہا  
احوال پوچھا۔ تو وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”آپ کی دعائیں ہیں بی بی جان!“ اللہ کے فضل سے سب ٹھیک ہیں۔ آپ سنائیے کیا حال ہیں۔  
شہزاد کن اکیوں سے عالی کو دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

”کرم ہے اس ذات واحد کا جس حال میں بھی رکھے عالی بیٹے! جاؤ شہزاد کے لئے کچھ لے کر آؤ۔“  
عالی تو پہلے ہی یہ چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے جلدی سے جلدی چلی جائے مگر شہزاد کو یہ کب گوارا تھا۔  
”نہیں پلےز عالی! آپ تکلیف مت کریں۔ فی الحال کسی چیز کی طلب نہیں۔“

اس نے پہلی بار عالی کا نام لیا تو عجیب سی خوشی کی لہر۔ اس نے اپنے دل کے سمندر میں محسوس کی عالی چلا  
جانا چاہ رہی تھی۔ مجبوراً سے ٹھہرنا پڑا۔ بی بی جان شہزاد سے باتیں کرتی رہیں اور وہ کن اکیوں سے عالی کو دیکھتا  
جواب دیتا ہاں سر پر لطف جائے دے مٹی مٹی، عالی تمام وقت باہر جانے کے لئے پرتو لیتی رہی۔ بی بی جان  
اسے کوئی نہ کوئی کام بتا کر روک لیتی تھیں تو ایسے میں شہزاد کو بی بی جان بہت مہربان لگتیں اسے لگتا جیسے بی بی جان اس  
کی تڑپ لک سے آگاہ ہوگی ہیں اور درست طور پر عالی کو روک رہی ہیں۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ عالی  
خاموش تصویر کی مانند بیٹھی رہی۔ کبھی بخرو مٹی اٹھیں اور مڑنے لگتی کبھی اپنے نرم ہیزوں سے دینے والیں کو کمر چم  
لگتی بار شہزاد کا دل چاہا اس کو جذب کرے مگر جرأت نہیں ہوئی اور دوسرے اس طرح بات کرنا بھی مناسب  
نہیں تھا۔

”آپ کے لئے شکر کتنی ڈالوں۔“ شیریں آواز کا جلتنگ کرے کی فضا کو مہکا گیا۔ اس نے ایک گہرے  
لگا وہ اس پر ڈالی جو اس کے جواب کی منتظر تھی۔ اس کا جی چاہا، وہ کوئی جواب نہ دیا اور وہ یوں ہی منتظر رہے۔

”جی میں شکر کم ہی لیتا ہوں۔ ایک ڈال دیں۔“ مجبوراً اسے اس کا انتظار ختم کرنا پڑا۔  
”شکریہ“ وہ کپ لیتا ہوا بولا جب وہ اپنا کپ لیے بغیر اپنی جگہ پر جا بیٹھی تو اس کا جی چاہا پوچھے کہ وہ اس  
کے ساتھ چائے پی کر اسے مست نہیں کر سکتی مگر پاس ناموس عشق بھی تھا اور رعب حسن بھی کہ لیوں پر پُپ کی  
نمہ پڑی تھی۔

”شہزاد بھائی تم بورتو نہیں ہوئے۔“ قدسیہ بانو اندر آتی ہوئی یوں۔  
”ارے نہیں بھائی جان ایسے لمحے تو میری زندگی میں پہلے بھی آئے ہی نہیں۔ میں تو ان لمحوں کے حسن  
اپنی روح میں اتار رہا ہوں بورتو کیسی۔“ شہزاد نے جبریز ہوئی عالی کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
”اچھا تو چلو، کھانا تیار ہے، عالی تمہیں سیدہ بلارہی ہے۔“

عالی کو بہانہ چاہیے تھا۔ وہ برق رفتاری سے باہر نکل گئی۔ شہزاد بھگ سا گیا۔ ساری شوخیاں جانے کہاں  
سوئیں پھر کھانے کے دوران بھی وہ نظر نہیں آئی۔ کھانا کھا کر عذرا بیگم تیار ہو گئیں۔

”عذرا! جلدی آ جانا۔ ان ہی دنوں میں شاید مجھے اسلام آباد جانا پڑے۔“ یسین نے دروازہ بند کر

ہوئے کہا۔

”آپ جب حکم کریں گے، میں آپ کو چھوڑ جاؤں گا۔“ عذرا سے پہلے شہزاد بولا۔  
”اچھا تو کل شام تک چھوڑ جانا۔“

”جی بہتر خدا حافظ شہزاد نے خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑی اشارت کر دی۔ تمام راستہ شہزاد زیر لب  
مسکراہٹ لیے یہ سوچتا رہا کہ آپا کو کیسے بتائے گا کہ وہ عالی کا طالبگار رہے اور خدا جانے وہ کیا جواب دیں۔  
”ہوں تو اب بتاؤ۔ کون ہے وہ پری جو میرے سوچنے بھائی کو بھاگتی ہے اتنی کہ وہ بے قرار ہو گیا ہے۔“  
گھر آتے ہی عذرا بیگم نے شہزاد کو دھر لیا تو وہ نگاہیں جھکا کر مسکرانے لگا۔

”اچھا تو تمہیں خبر ہی نہیں کہ وہ پری کون ہے۔“ بڑی بھابھی نے شوشی سے شہزاد کو دیکھ کر عذرا سے کہا۔  
”نہیں تو بھابھی! مجھے تو آج تک یہ پہیلیاں ہی بھجواتا آیا ہے۔“ عذرا نے پیار سے بھائی کو دیکھا۔  
”موصوف تمہاری کزن تند عالی پر فدا ہو گئے ہیں۔“ چھوٹی بھابھی نے پورے وثوق سے کہا تو عذرا کے  
ساتھ وہ بھی حیران رہ گیا کہ انہوں نے کس قدر وثوق سے کہا تھا حالانکہ اس نے باقاعدہ کسی کو خبر نہیں ہونے دی  
تھی۔

”کیا واقعی شہزاد بھابھی درست کہہ رہی ہیں؟“ عذرا نے خوشی اور حیرانی سے شہزاد کے شانے چھوتے  
ہوئے پوچھا۔ تو اس نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔ بڑی بہن اور بھابیوں کے درمیان اسے شرم سی آرہی تھی۔  
”اچھا تو وہ لڑکی عالی ہے مگر۔“ عذرا کی اس مگر سے سیاہ سا یہ شہزاد کے چہرے پر چھایا تھا گھٹا بن کر۔  
”یہ مگر سے کیا مراد ہے تمہاری۔ کوئی مقابلہ کر سکتا ہے ہمارے شہزاد کا۔“ بڑی بھابھی نے بڑے دیور کو  
دیکھا جس کے وجہ چہرے پر ایرانی سی چھاگتی تھی۔

”مگر۔ مگر خیر میں بات کروں گی بی بی جان سے، ایسی کیا بات ہے۔“ مجھے یہ پہلے بتا دیتا تو میں مگر میں  
بات بکر بھی چکی ہوتی۔“

”تمہارے خیال میں کتنے امکانات ہیں ان کے مان جانے کے۔“ چھوٹی بھابھی پوچھ رہی تھیں کتنی  
مہربان لگ رہی تھیں۔ اس وقت وہ باتیں جو شہزاد کہہ نہیں پارہا تھا وہ کہہ رہی تھیں۔

”امکانات بہت روشن ہیں، میرے بھائی میں کی بھی کیا ہے۔“ عذرا نے بھابھی کا ہاتھ دبا کر خاموش  
رہنے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں خاموش ہو گئیں اور دونوں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

”شہزاد عالی تمہیں واقعی بہت پسند ہے۔“ عذرا نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اس کا جی چاہا  
کہہ دے کہ آپا میرے جنون کو صرف پسند کہہ کر اس کی توہین نہ کریں مگر وہ بڑی بہن کے احترام میں کچھ نہ کہہ  
سکا۔ بس اثبات میں سر جھکا دیا۔

”لڑکی بھی تم نے زبردست پسند کی ہے۔ پتا ہے جتنی آغا جی کے چاروں بیٹوں کی جائیداد ہے ناں اتنی  
ان دونوں بیٹوں کی ہے۔ اللہ کرے یہ بات بن جائے تو تمہارے مزے ہو جائیں۔“

عذرا بیگم دولت جائیداد کو ویسے بھی اہمیت دیتی تھیں مگر اس وقت انہوں نے جانے کس انداز میں کہا تھا  
کہ شہزاد کو یہ بات بہت بُری لگی تھی مگر احترام کے باعث وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

”آپا وہ تو خود پیش قیمت جائیداد ہے۔ اس کا بدلہ تو قارون کا خزانہ بھی نہیں ہو سکتا تو۔“ اس کے گمبیر لہجے

سردیوں کس قدر صاف شفاف آئینے کی طرح ہیں مگر عذرا بیگم ان کو لالچی سمجھتی تھیں کہ اسی لیے انہوں نے بیڈن کو مجبور کر کے ان لڑکیوں کو اپنانے پر آمادہ کیا تھا۔

”اگر فرمان کو کوئی اعتراض نہیں تو ابھی تک اس رشتے کو منظر عام تک کیوں نہیں لایا گیا تاکہ دوسرے لوگوں پہ چل جائے اس طرح انجانے میں نہ لٹ جائیں میرے بھائی کی طرح۔“ عذرا بیگم کو شہزاد کی خواہش کی شدت کا پتا تھا اسی لیے وہ رو ہنسی سی ہو گئیں بات کرتے ہوئے۔

”عذرا تم تو بچوں کی طرح ہارے دے رہی ہو۔ کوئی دیکھ لے تو کیا سمجھے گا ان آنسوؤں کا سبب۔“

قدسیہ بانو نے عذرا کے آنسو اپنے آنچل میں جذب کر لیے۔

”میں اسے کیا منہ دکھاؤں گی بھابھی جان خاندان بھری لڑکیاں اسے پسند نہ آئیں اور ڈھیروں لڑکیاں اسے دکھائیں اسے پسند نہ آئیں پسند آئی بھی تو وہ جب کسی اور کے مقدر کا ستارہ ہے۔ اس کی زندگی تو دیران کرگئی عابی کی چاہت۔“

”دیکھو عذرا! خدا کی قسم شہزاد جس طرح تمہیں عزیز ہے، مجھے بھی اسی طرح عزیز ہے، اس کا دکھ میں بھی اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں مگر میری بہن کیا کیا جاسکتا ہے۔ شہزاد پڑھا لکھا سمجھدار لڑکا ہے۔ سمجھ جائے گا اس میں تو کسی کا بھی قصور نہیں تم کیوں ہلکان ہو رہی ہو۔“

”بھابھی جان! ہو سکتا ہے عابی میرے شہزاد کو پسند کرتی ہو اگر ایسا ہو گیا تو پھر تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا ناں۔“ تارکیوں میں یہ خیال جگنو بن کر چمکا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئیں۔

”بچوں والی باتیں نہ کر عذرا! ہمارے ہاں لڑکیاں اپنے نام کے ساتھ جس نام کو سن لیتی ہیں ناں تو تمام عمر اسی نام پر گنوا دینے کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہوتی ہے کہ والدین کی عزت کی خاطر پوری ایمانداری سے اس کے ساتھ گزار دیتی ہیں جس کو والدین منتخب کرتے ہیں۔ فرمان کے سلسلے میں تو میں دوثق سے نہیں کہہ سکتی البتہ عابی کا مجھے پتا ہے۔ وہ فرمان کو بہت چاہتی ہے۔ اور دیکھو تم بی بی جان سے ہرگز بات نہ کرنا حاصل تو کچھ ہے نہیں۔ خواہ خواہ ہی ان کا دل بھی خراب ہوگا کیونکہ شہزاد کو سب لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔“

مگر ان باتوں کا عذرا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بھائی کے جنون کو سمجھتی تھیں۔ اس لیے وہ اپنی تسلی کے لیے بی بی جان کے پاس بھی پہنچ گئیں۔ پہلے تو بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی پھر ان کے پاؤں دبائے گئیں۔ بی بی جان نے چونک کر ان کو دیکھا پھر خاموشی سے ان کا چہرہ بڑھنے لگیں جس پر انجانی سی تحریر ہو گئی۔

”عذرا بیٹی! کیا کہنا چاہتی ہو؟“ انہوں نے پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”جی وہ بی بی جان۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ۔“ زبان ساتھ چھوڑتی تو وہ خاموش ہو گئیں۔

”جو کہتا ہے، کہہ ڈالو بیٹی! ماں بیٹی کا کیا راز بھلا۔“ ان کی شفقت نے ہمت بندھائی تو انہوں نے لڑکھرائی زبان کے ساتھ سب کچھ کہہ ڈالا۔ بی بی جان تحمل سے سختی رہیں پھر زری سے گویا ہوئیں۔

”عذرا بیٹی! میں یہ نہیں کہوں گی کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہے، پھر بھی تم نے یہ بات کیوں کی۔ اس لیے کہ جہاں بھری ہو، وہاں پھر تو آتے ہی ہیں اور ویسے بھی شہزاد مجھے اور سب کو بے حد پسند ہے۔ اگر عابی کی کہیں باجہ کرنی ہوتی تو شہزاد سے بڑھ کر کوئی انہیں تھا۔ اصل میں ہم ان دونوں لڑکیوں کو خود سے جدا نہیں کر سکتے۔ خدا کا حکم ہے کہ بیٹے تھے جن کے طفیل یہ لڑکیاں گھر پر ہی رہیں گی۔ تم کوئی ملال نہیں رکھنا دل میں بیٹی۔ شہزاد مجھے بھی

میں ناراضگی کا عنصر تھا۔ عذرا شرمندہ سی ہو گئیں۔

اچھا جی تو ہم سے بالا بالا ہی عشق کی اتنی منزلیں طے کر لیں اور اب خبر کی ہے۔ جب جنون انتہا تک پہنچ گیا۔ تم ناراض ہو گئے شہزاد! واقعی اس لڑکی کا بدل تو دنیا کی کوئی جائیداد کوئی دولت نہیں ہو سکتی صورت، سیرت دونوں میں خدا نے فیاضی دکھائی ہے۔ بس اللہ کرے کہ وہ لوگ مان جائیں۔ عذرا نے دل سے دعا مانگی عابی ان کے عزیز بھائی کی چاہت تھی اس لیے وہ اس کے لیے بہت سنجیدہ ہو گئی تھیں۔

عذرا بیگم کو جب سے بھائی کی خواہش کا پتا چلا تھا ان کو عابی پر اور بھی پیارا آنے لگا تھا وہ ان کے پیارے بھائی کی چاہت تھی اور ان کی کوشش تھی کہ وہ بی بی جان سے بات کریں مگر وہ آگے بڑھنے سے پہلے قدسیہ بانو سے مشورہ ضرور کرنا چاہتی تھیں۔

”بھابھی جان! شہزاد عابی کو بہت چاہتا ہے، اس کا دل ٹوٹ جائے گا وہ بہت حساس ہے۔“

”ٹھیک ہے عذرا! شہزاد مجھے بھی بھائیوں کی طرح عزیز ہے مگر سوچو تو جب گھر میں لڑکا موجود ہے اور عابی اس سے منسوب بھی ہے تو یہ بات کیونکر ممکن ہو سکے گی۔“ قدسیہ بانو سمجھنے ہوئے لہجے میں ان کو سمجھا رہی تھیں۔

”ضروری تو نہیں بھابھی کہ فرمان ہی سے عابی کی شادی ہو، میں سب جانتی ہوں کہ آغا جی اور بی بی جان گھر کی دولت باہر نہیں جانے دینا چاہتے کسی دوسرے کو خود میں شامل نہیں کرنا چاہتے اور نہ میں جانتی ہوں کہ فرمان عابی کو قبول تو کر لیں گے مگر وہ عابی کو چاہتے نہیں۔“

عذرا بیگم کے دل میں یہ بات پکی ہو گئی تھی کہ آغا جی صرف گھر کی جائیداد کو بچانے کے لیے دونوں لڑکیوں کا رشتہ باہر نہیں کرنا چاہتے تھے جبکہ قدسیہ بانو اس بات کے خلاف تھیں تاہم بڑے محل سے بولیں۔

”بری بات ہے عذرا وہ ہمارے والدین ہیں، ہمیں ان کے متعلق غلط نہیں سوچنا چاہیے اور پھر قدرتی سی بات ہے جب گھر میں دو لڑکے ان دونوں لڑکیوں کے لیے موجود تھے تو وہ باہر کیوں کرتے اور ویسے بھی وہ دونوں آغا جی اور بی بی جان کو اولاد سے زیادہ عزیز ہیں اور فرمان عابی کو ضرور پسند کرتے ہوں گے عابی ہے ہی چاہے جانے کے قابل، اب فرمان اتنے بے باک تو نہیں کہ عابی سے محبت یا پسندیدگی کا اظہار کرتے پھریں۔“ قدسیہ بانو فرمان کی حمایت میں بولیں۔

”خیر بھابھی! یہ تو آپ رہنے ہی دیں میں باہر کی ہوں ناں اس لیے کسی بات کی ہوا نہیں لگنے دی جاتی اور نہ میں سب جانتی ہوں رجن کون سا سیدہ کے ساتھ شادی کے لیے تیار تھے۔ تو آغا جی کے غضب کے باعث ہاں کر دی میں نے خود سیدہ کو روٹے دیکھا ہے اور آپ شرط لگالیں فرمان عابی کو نہیں چاہتے وہ تو ہیں ہی اور ہواؤں میں۔ ویسے میں تو اسے جبری قرار دوں گی کہ اولاد پر اپنی مرضی ٹھونس دی جائے۔ یہ کیا ہوا کہ آپ اپنی جائیداد کو بچانے کے لیے اولاد کی خواہشات ہی کا گلا دبا دیں۔“ عذرا بیگم منہ بنا کر بولے چلی گئیں قدسیہ بانو ان کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”عذرا! تمہاری یہ غلط فہمیاں کب دور ہوں گی تم اب تک خود کو غیر سمجھتی ہو۔ کب گھر کوئی بات تم سے پوشیدہ ہے ہاں یہ تو۔ حقیقت ہے کہ رجن سیدہ کے ساتھ شادی کے لیے تیار نہ تھے اور فرمان نے تو ایسی کسی بات کا اظہار نہیں کیا وہ مزید تعلیم کے لیے باہر ضرور جانا چاہتے ہیں مگر آغا جی اس بات کو پسند نہیں کرتے لیکن خدا را آغا جی نیت پر شک نہ کرو۔“ قدسیہ بانو کو عذرا کی باتوں سے دلی دکھ ہوا تھا۔ وہ آغا جی اور بی بی جان کو جانتی تھیں

بہت عزیز ہے مگر کیا کریں مجبوری ہے۔“

بی بی جان کے معذرتی الفاظ عذرا کی ساری ہمتیں توڑتے چلے گئے، وہ مایوسی سے اٹھ کر آئیں، وہ بہت ڈسٹرب نہیں کہ اب شہزاد کو کیا جواب دوں گی۔

وہ اسی طرح طولی بیٹھیں نہیں، عالی جو تک مٹی جو سیدہ کو پانی دینے جا رہی تھی۔

”بھابھی جان کیا بات ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔“ عالی ہر بات سے بے نیاز بولی تو عذرا نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں بس ایسے ہی دل خراب ہو رہا ہے۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ یہ لڑکی سارے جہان سے چھین کر اپنے عزیز بھائی جان کو دے دیتی مگر ان کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔“

”نہیں بھابھی جان! کچھ تو بے جو آپ اتنی طولی نظر آ رہی ہیں، بتائیے ناں۔“ وہ وہیں ان کے پاس بیٹھ گئی تو عذرا خاموشی سے اس کو دیکھنے لگیں۔ پھولوں جیسی خوبصورت اور نرم لڑکی کون اس کا طلب گار نہیں ہوگا۔

”عالی ایک بات پوچھوں ناراض تو نہیں ہوگی تم۔“ انہوں نے عالی کے نرم ہاتھ تمام لیے۔

”نہیں بھابھی جان آپ بتائیں تو کیا بات ہے۔“

”عالی! تمہیں شہزاد کیسا لگتا ہے۔“ یہ بھابھی کی آواز تھی یا اس کے اندر کہیں آتش فشاں پھٹنے لگا تھا خاموش لگا ہوں سے دیکھتی رہی کہ انہوں نے کس انداز میں پوچھا ہے۔

”وہ۔ وہ آپ کے بھائی ہیں۔ بھابھی میرا کیا تعلق۔“ آواز بھگ گئی۔

”وہ عالی! تمہیں بہت چاہتا ہے۔ بے حد چاہتا ہے۔ کاش کوئی بیانا ہوتا تو میں تمہیں پیش کر کہ بتاتی کہ وہ تمہیں کتنا چاہتا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے کہے جا رہی تھیں اور وہ اندر تک سر دہکتی۔

”بھابھی جان! آپ۔ آپ کو یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔“ وہ رندھی آواز میں بولی اور اٹھ کر چلی گئی۔ عذرا بھی دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ اب ان کو افسوس ہو رہا تھا کہ ان کو عالی سے بات نہیں کرتی

چاہیے تھی۔ جانتے ہوئے بھی کہ وہ فرمان کو چاہتی ہے مگر وہ کیا کرتیں بھائی کی محبت میں ان کو کچھ خیال نہ رہا۔ عالی اپنے کمرے میں آکر جھل جھل کر روتی رہی اس نے تو خود کو صرف اور صرف فرمان کی امانت سمجھا تھا۔ اگر

کے دل کی سلطنت پر تو فرمان ہی کا قبضہ تھا پھر بھابھی نے ایسی بات کیوں کی۔ اسے اب تو اپنے بھی جذبوں کا شک گزر نے لگا تھا کہ شاید اس کے جذبوں کی چٹائی میں گہرائی یا پاکیزگی میں کوئی فرق رہ گیا ہے۔ جب ہی تو عذرا

بھابھی نے یہ بات کہڑالی تھی۔ اسے رہ رہ کر شہزاد پر تازہ آ رہا تھا جانے کہاں سے آچکا تھا۔ آگیا کہیں سے چاہنے والا۔ سیدہ اچانک ادھر آنکھیں تو وہ اسے یوں روٹا دیکھ کر گھبرا گئیں۔

”عالی۔ عالی کیا بات ہے میری جان کسی نے کچھ کہہ دیا۔“ وہ بے چینی سے اس کے آنسو صاف کرتی بولیں۔ ”کچھ نہیں آپا! بس ایسے ہی آج امی جان یاد آ گئیں۔“ عالی نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔

”میرے ہوتے ہوئے اور بی بی جان کی موجودگی میں؟ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو بتاؤ کیا بات ہے۔“ جب سیدہ کا اصرار بڑھا تو عالی نے ہچکچوں کے درمیان سب کچھ بتا دیا تو ایک طرف جہاں عذرا بھاگ

سے کھوہ ہوا۔ وہاں عالی کی اس حرکت پر ہنسی آگئی۔

”آپ ہنس رہی ہیں آپا۔“ عالی نے شاکی لگا ہوں سے سیدہ کی طرف دیکھا

”تو اور کیا کروں بھئی پاگل لڑکی! اس میں یوں ہلکان ہونے کی کیا بات ہے۔ بلکہ اچھی بات ہے کہ کوئی کسی کو چاہتا ہے تو یہ بڑی عزت کی بات ہے۔ اور پھر شہزاد تو ہے بھی نیک، اچھا اور قابل لڑکا۔ سیدہ مسکرائیں تو عالی نے ناراضگی سے منہ موڑ لیا۔

”لیکن اب تو فرمان ہیں، اللہ چاند اور سورج کی یہ جوڑی سلامت رکھے۔“ سیدہ۔ پیار سے اس کا ہیکہ چہرہ تمام کر بولیں تو حجاب آلود مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

”تمہیں شہزاد کی بات بری لگی ہے تو بتاؤ۔ تم فرمان کو نہیں چاہتیں۔

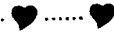
”آپا جان!“ عالی نے لجا کر سیدہ کے ہاتھوں میں منہ چھپالیا۔

”آپا جان! آپ بھابھی سے اس سلسلے میں کچھ مت کہیے گا مبادا ناراض ہو جائیں۔“

عالی کو سب کا ہی خیال رہتا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ذات سے کسی کو دکھ لے یا وہ ناراض ہو۔

”اچھا جی نہیں کہوں گی تم جا کر منہ دھو لو بھابھی جان ادھر ہی آ رہی ہیں۔“ سیدہ اس کو کبھی باہر نکل گئیں۔

یہ تمام باتیں توقع کے عین مطابق ہوئی تھیں اور عذرا بیگم اس کے لیے تیار بھی تھیں مگر پھر بھی وہ بہت ہرٹ ہوئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہزاد کو کس طرح بتائیں گی کہ وہ جو انکار کی صلیب پر لٹکا ہر قسم کی خبر سننے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔



دو پہر کافی دھل چکی تھی سائے آہستہ آہستہ لمبے ہو کر غائب ہو رہے تھے۔ سورج کی دم توڑتی بنفشی کرنیں چٹارا، مٹاس اور جاسن کے اونچے پیلوں پر الوداعی نگاہ ڈالتی۔ اس کی گود میں تھکے ہوئے بچے کی طرح

سو گئیں تو شام کے دھندلے تیزی سے کائنات پر آچل کی مانند پھیل گئے۔ شام کا یہ سماں بہت پر سوز اور حسن بخش تھا۔ چاند چرند ہی اب سارے دن کی آوارگی کے بعد اپنے اپنے گھونٹوں میں آکر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔

عالی نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں دھیمے دھیمے ستارے نظر آنے لگے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی وہ کافی دیر سے گلاب کے تختوں کے قریب بیٹھی رخصن کا سفید کرتا کاڑھ رہی تھی مگر اب روشنی نہ ہونے کے برابر تھی، اس نے سارا سامان سمیٹ کر بیگ میں ڈالا اور واپسی کے لیے مڑی مگر قدم وہیں جم گئے۔

فرمان سینے پر ہاتھ باندھے جانے کب سے اس کی پشت پر کھڑے اس کو دیکھ رہے تھے۔ دل ایسے دھڑکا گویا ابھی پھلانگ کر باہر آچکے گا۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ رخسار تپنے لگے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ

آگے بڑھنے لگی۔

”عالی!“ فرمان کی گھبراہٹ آواز خاموش فضا کو مٹش کر گئی۔ عالی کے قدم وہیں جم گئے۔

”جی!“ یہ آواز کا جلتی رنگ تھا یا شیم شب کا ک معطر جھونکا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع آیا تھا کہ یوں تنہائی میں فرمان اس سے کچھ کہنے کے آرزو مند نظر آ رہے تھے۔ ورنہ تو ساری دوشی ساری شرارتیں بچپن کے ساتھ ہی

رخصت ہو گئی تھیں جب سے بڑے ہوئے تھے۔ پہلی بار فرمان نے یوں اسے تنہائی میں پکارا تھا۔ اس کا دل گویا کانوں میں دھڑکنے لگا رخسار دھکنے لگے ہاتھوں میں نمی کے باعث آنکھل بھگ گیا۔ وہ ان سے اپنی اندر کی

کیفیت چھپانے کی کوشش میں مصروف تھی اور وہ بات کرنے سے پہلے تمہید کی سوچ رہے تھے۔

”واہ بڑا پیارا اگر تا بن رہا ہے۔ دکھاؤ تو ہے کس کا۔“

فرمان اس کے ہاتھ سے سفید کرتا لے کر دیکھنے لگے جس کو عالی کے نازک ہاتھوں نے اپنا حسن بخش دیا تھا۔

”جی رحمن بھائی کا ہے۔“ بھیکے لبوں سے الفاظ آپ ہی پھسل رہے تھے۔

”اچھا تو یہ ثابت ہوا کہ رحمن بھائی ہی تمہارے کچھ لگتے ہیں ظاہر ہے بہنوئی جو ٹہرے ہم سے بھی تو تعلق

ہے ناں تمہارا۔“ انہوں نے شاکی نگاہوں سے عالی کو دیکھا جس کو گہرا ہوتا اندھیرا اچھا لگ رہا تھا جو اس کے دل

کے رازوں کو فرمان سے چھپا رہا تھا جو چہرے پر رنگوں کی صورت اتر آئے تھے عالی نے ذرا سی ہمت کر کے پلکیں

اٹھا کر فرمان کو دیکھا جو اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دل کی حالت مزید بگڑ گئی۔ اس وجہ اور خود برو فرمان کو دیکھ

کر عالی کا جی چاہا کہ ڈالے۔ فرمان آپ سے تو خدا ہے، وہ تعلق وہ رشتہ جوڑ دیا ہے۔ جو بے نام ہوتے ہوئے

بھی ایسا ٹوٹ ہے۔ سانس کڈو تو ٹوٹ سکتی ہے مگر یہ تعلق نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ تعلق تو خوشبو کی مانند ہے وجود

مگر پھر بھی فضا کو مہکا کر اپنے وجود کو منوالیتا ہے مگر اتنی خوبصورت مہکتی بات صرف اس کی سوچ کے نقش ہی

مہک سکی۔ اس کی خوشبو فرمان تک نہ پہنچ پائی۔

”آپ ناراض نہ ہوں آپ کو پسند ہے تو آپ کے لیے بھی ایسا کرتا ہوں گی۔“ بھیکتی آواز کو نارمل

ہوئی بولی۔

”اچھا واقعی بالکل ایسا ہی ہو گا ناں!“

فرمان بے اعتباری سے پوچھ رہے تھے۔ عالی کا جی چاہا کہ دے کہ تو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت

گا اس میں تو میرے دل کے ارمان ٹپکتے ہوں گے میرے خوابوں کا سارا حسن اتر آئے گا۔ اس پر میری روح

کک اس کا نکھار بن جائے گی مگر کہاں بھلان ایسی پیاری باتیں وہ اس سے کہہ سکتی تھی۔ جس کے سائے سے

شرم محسوس ہوتی تھی اور پھر ایسی باتیں کہنے کی تھوڑی ہوتیں ہیں۔ ایسی باتیں تو صرف محسوس کرنے کی

ہیں۔ اگر ان باتوں نے اس کے من کے آنگن کو مہکا دیا تھا تو فرمان بھلا کب بچ پائے ہوں گے۔

”جی کوشش کروں گی کہ ایسا ہی بنا سکوں۔“ دل کے کتنی برعکس بات کہی تھی اس نے۔

”اچھا بیشکی شکر یہ قبول کرو لیکن۔“ لیکن کے بعد فرمان رک گئے تو عالی گہری شام کے دھند لگے۔

کے نمایاں ہوتے سراپے کو دیکھنے لگی۔

”لیکن کیا؟“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”لیکن یہ کہ آج میں تم سے اپنے دل کی بات کہنے آیا ہوں۔“



فرمان کی گھبر آواز تیرگی میں آشناؤں کے دیپ روشن کر گئی۔ تمناؤں کا شہر تاروں سے ج

میا۔ دھڑکنوں کی شوخ دھم بیل سے عالی گھبرا گئی۔ مبادا یہ شوخ دھڑکنیں اس کی چاہتوں کے راز فرمان پر آشکار

نہ کر دیں۔ کتنی منتوں مرادوں کے بعد خدا نے یہ لمحات اس کے نصیب میں لکھے تھے جو اس کے لیے حیات کا

پیغام بن کر آئے تھے۔ فرمان اس سے کچھ کہنا چاہتے تھے کیا یہ ہی کہ۔ کہ وہ اسے چاہتے ہیں۔ بچپن سے چاہتے

ہیں۔ افسوس کتنی حجاب والی بات ہے میں تو مر ہی جاؤں گی۔ وہ عرق آلود پیشانی کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

”عالی! فرمان کی آواز کی گھبر عالی کے دل میں اتر گئی۔

”جی۔!“ وہ دھڑکنوں کی شوخ دھم بیل سے بچتی ہوئی بولی۔

”وہ دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ۔“ فرمان بولتے بولتے پھر رک گئے اور عالی آنچل سے پیشانی صاف

کرنے لگی کچھ کہنے سننے کی کیفیت میں دونوں جلتا تھے۔ ایک کہنے کے لیے شاید مناسب الفاظ کا متلاشی اور دوسرا

جذبوں کے اقرار کا طلبگار تھا۔

”جی۔ میں ہمدن گوش ہوں۔“ وہ آواز کو نارمل بناتے ہوئے گویا اسے یاد دہانی کراتی ہوئی بولی۔ اندھیرا

اس حد تک چھا چکا تھا کہ اسے فرمان کا سفید لبادہ ہی نظر آرہا تھا۔ مگر پھر بھی پلکیں بارحیا سے جھکی ہی رہیں۔

”عالی! میری ایک شدید ترین خواہش ہے جو صرف تم پوری کر سکتی ہو۔“

اتنی دیر میں اتنی سی بات آگے بڑھی تو عالی کا جی چاہا کہ ڈالے آپ کی صرف ایک خواہش۔ میری تو تمام

خواہشیں ہی آپ سے وابستہ ہیں۔ میرے ارمان بھی آپ ہی پورے کر سکتے ہیں۔ مگر ایسی باتیں تو اس نے سات

پروں میں چھپا کر رکھی ہوئی تھیں۔ جن کو کہنے کے لیے ایک عمر چاہیے تھی۔

”آپ کہ کر تو دیکھیں۔“ وہ جھونکڑوں کے ظلم سے آزاد ہوتی ہوئی بولی۔

”بات یہ ہے عالی کہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا میری شدید ترین خواہش ہے۔ مگر آغا جی ہرگز تیار

نہیں۔“



عالی وہیں موچے کے کچ کے قریب رکھی کرسی پر ڈھیر ہو کر واپس جاتے فرمان کو دیکھتی رہی جو راہ داری سے ہوتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

”کاش فرمان! آپ نے کچھ کھانا ہوتا۔ خاموش رہتے کم از کم میں اپنی خوش فہمی میں ہی خوش رہتی۔ کیا کچھ نہیں سوچ لیا تھا اس نے کہ فرمان جانے اسے کیا کہیں گے۔ یقیناً اپنے دل کی بات کریں گے۔“

”ارے عالی بی بی آپ یہاں ہیں۔ بی بی جان آپ کو بلا رہی تھیں۔ میں سارے زمانے میں ڈھونڈ آیا۔“ وہ جانے کب تک اندر باہر کی تاریکیوں میں ڈوبی رہتی کہ شہور نے باہر کی لائٹ آن کر دی۔

”اوہ بس یہاں بیٹھی تو آگ لگ گئی۔“ بچپن سے اب تک وہ جس شکر کو چاہتی آئی تھی صبح اس کی خواہش پر آغا جی سے اس کے جانے کی سفارش کرتی تھی۔ وہ تو چاہت کی تمام منزلیں طے کر چکی تھی اور فرمان نے تو شاید اس راستے پر قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ جب ہی تو اسے انجان تھے کہ اس کی تڑپ سے نا آشنا تھے ورنہ اتنی بے دردی سے اس سے دور ہونے کا نہ کہتے۔ وہ صبح ناشتے کے بعد بی بی جان کے کمرے سے نکل رہی تھی کہ سامنے سے فرمان آگئے۔ وہ اسے دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

”عالی! تمہیں یاد ہے ناں۔“ وہ بے قراری سے بولے تو ایک ٹیس سی عالی کے دل میں اٹھی۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ آئی اس نے شاکی لگا ہوں سے اس خود غرض کو دیکھا۔

”مجھے بھول جانے کی عادت ہی تو نہیں ہے فرمان۔ ورنہ شاید۔ میں ابھی جاری ہوں آغا جی کے پاس۔“ وہ جلدی سے رخ موڑ کر آغا جی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ فرمان اس کے کامیاب لوٹنے کی دعائیں کرنے لگے۔

”میں اندر آسکتی ہوں آغا جی۔“ وہ پردہ تھامے آغا جی سے اجازت مانگ رہی تھی جو صوفے پر بیٹھے ٹائلس رکھے مطالعہ کر رہے تھے۔ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

”ارے بیٹو ہماری گڑیا ہے۔ عالی بیٹے! ہمیں بے نہ نصیب۔ آج ہماری بیٹی ہمارے کمرے میں کیسے؟“ آغا جی کو واقعی بڑی خوشی ہوئی تھی عالی کو دیکھ کر۔ وہ اٹھ کر آگے بڑھے تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”آغا جی! آپ مجھے گناہ گار کر رہے ہیں۔ میں خود آپ کے قدموں میں حاضر ہو جاتی۔“

”ارے بیٹی! اللہ اور رسول نے نبی کو بہت عزت بخشی ہے۔ ہم تو بیٹیوں کی قدر ہی نہیں کرتے۔ آؤ یہاں بیٹھو۔“ آغا جی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا وہ سر جھکائے بیٹھ گئی۔

”ہمیں لگ رہا ہے ہماری بیٹی کچھ کہتا چاہتی ہے۔“ آغا جی نے اس کے چہرے پر نقش کے جال کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی وہ آغا جی۔ بات یہ ہے کہ۔“ وہ رک گئی۔ اپنے لہجے سے اب فرمان کا نام کیسے لیتی۔ لاج بھی اتنی آ رہی تھی۔

”عالی بیٹے! کیا بات ہے۔ کسی نے کچھ کہہ دیا ہماری بیٹی کو۔ بتاؤ ہم ابھی اس کی خبر لیتے ہیں۔ تم نام تو لو۔“ یہ عالی کی سدا کی عادت تھی۔ جب بھی پریشانی ہوتی یا کوئی اہم بات ہوتی تو سیدھی آغا جی کے پاس چلی آتی۔ ہاتھ سب تو ڈرتے بھی تھے آغا جی سے۔ مگر عالی کو کبھی ڈر نہیں لگا۔ آغا جی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کا جی چاہا ان کے مہربان سینے سے لگ کر رو پڑے۔ اور وہ جو بچپن سے فرمان کی خطائیں اپنے نام لکھواتی

یہ فرمان کی آواز تھی کہ شدید آندھی جس نے انہوں کے تمام دیپ بجھا دیے تھے۔ دھڑکنوں کے شروع تاروٹ گئے تھے۔ عالی کے دل کی ہستی اجڑی تھی۔ اس نے کیا سوچا تھا۔ کیا چاہا تھا کہ وہ اس کے کتنے برعکس تھا۔ اف! کس قدر اندھیرا بڑھ گیا تھا کہ دم گھٹنے لگا تھا۔ کیا ہو گیا تھا ایک لخت۔ اسے یوں لگا جیسے یہ خوفناک تاریکی لگھلگے کی۔ دل میں ایسا درد جاگا کہ ٹیسس آنکھوں میں نئی بن کر اتر آئیں۔

”اتنی سب بات کہنے میں آپ نے اتنی دیر لگا دی فرمان کے اندر باہر اندھیرے پھیل گئی ہیں۔“ وہ ہنسی آواز کو نابل بٹاتی ہوئی بولی۔

”اتنی سی بات نہیں ہے عالی! بہت بڑی بات ہے۔“ میری زندگی کی سب سے شدید اور بڑی خواہش ہے۔ میں نے ہر طرح کوشش کر دی تھی ہے مگر آغا جی مان کر نہیں دے رہے۔ اب تم ہی امید کی کرن رہ جاتی ہو۔ مجھے امید ہے تم میرا یہ کام ضرور آغا جی سے کرادو گی۔ کیونکہ تم تو بچپن سے ہی میری خطائیں اپنے نام لکھواتی آئی ہو۔ میری خاطر آغا جی سے سچ بھوٹ بولتی آئی ہو۔ اب بھی تم ہی یہ بات منوانا سکتی ہو۔“ فرمان بڑے جوش میں اسے بچپن کی باتیں یاد دلارہے تھے۔ وہ دکھ سے مسکرا دی۔

”صیبلے، آپ کو بچپن کی کوئی بات تو یاد رہی۔ بچپن میں آپ کی خطائیں اپنے نام لکھواتا اور آغا جی سے آپ کی سفارش کرنا اس وقت میرے اختیار میں تھا اور نہ اب کوئی بات ماننا میرے بس میں ہے۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ بچپن کی طرح اس بار بھی آغا جی سے اپنی بات منوا کر آپ کی خواہش پوری کر سکوں۔“

عالی ہنسی پلکوں کی اوٹ سے اندھیرے میں اس کے نمایاں سراپے کو دیکھتی ہوئی ایک بات میں سب کو کہہ گئی۔ مگر فرمان اس وقت کسی اور بات کو نہیں جانتے تھے۔ ان کے ذہن میں تو اچانک یہ خیال آیا تھا کہ عالی ان کا یہ کام آغا جی سے کر سکتی ہے۔ کیونکہ عالی سب سے چھوٹی تھی اور کچھ اپنی مومن سی صورت اور صورت بھی پیاری سیرت کے باعث سب کو خصوصاً آغا جی کو سب زیادہ عزیز تھی۔ وہ اس کی ہر بات مانتے تھے۔ فرمان نے بچپن کی طرح اب بھی اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا تھا تو وہ ایک لفظ بھی شکایت کا نہ کہہ سکی۔

”عالی۔ عالی! تمہیں یقین ہے کہ آغا جی بچپن کی طرح اب بھی تمہاری بات مان لیں گے۔“

فرمان اس کے اندر ہوتی ٹوٹ پھوٹ سے قطعی بے خبر بے چینی سے بولے تو بے شمار گرم پانی کے قطرے ضبط کی دیواریں پھانڈ کر رخساروں پر پھیل گئے۔ اس نے اندھیرے کو اس نازک وقت میں ایک مہربان دوست کی حیثیت دے دی اور آہستگی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

امید پر تو دنیا قائم ہے۔ مجھے خدا کی ذات پر پورا بھروسہ ہے۔ اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تو چاہتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ انسان جسے چاہتا ہے اس کی ہر بات کو برداشت کرنے کے لیے اپنے اندر ظرف بھی اتنا ہی پاتا ہے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ انشاء اللہ آغا جی مان جائیں گے۔ کسی کی نہ سبکی آپ کی خواہش پوری ہو جائے گی۔“ وہ اٹھتی ٹیسوں کو دباتی ہوئی بڑے ضبط سے بول رہی تھی۔

”شکریہ۔ شکریہ۔ عالی میں تو مایوس ہی ہو گیا تھا، مگر تمہارا خیال آیا تو میں خوش ہو گیا۔ اب انشاء اللہ آغا جی ضرور مان جائیں گے۔ تم صبح ہی ان سے بات کرنا۔“

وہ ایسے خوش ہو گئے جیسے سارے مسئلے حل ہو گئے ہوں۔ یہ جانے بغیر کہ ان کی باتوں سے کسی کے دل پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔

”تم نے بیرون ملک جا۔ کے لیے مابی کو کیوں استعمال کیا؟“  
”وہ۔ اس لیے آغا جی کہ۔“

”بہر حال تمہاری یہ بات ہم نے عالی کے کہنے پر مانی ہے۔ اس لیے احتیاط اب تم پر فرض ہو گئی ہے۔ عالی کو تمہاری طرف سے کوئی پریشانی یا دکھ نہیں ملنا چاہیے۔ عالی میرے لیے کیا ہے یہ تم خوب جانتے ہو اور تمہیں باہر جانے کی اجازت بھی میں نے اسی کے کہنے پر دی ہے۔ اسے تمہاری طرف سے کوئی دکھ ملا تو میں قطعی برداشت نہیں کروں گا۔ امید ہے یہ بات تم اچھی طرح ذہن نشین کر لو گے۔“

آغا جی نے اس مختصری ذوقی بات میں فرمان کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا مگر فرمان تو صرف یہ ہی سمجھ پائے تھے جن پائے تھے کہ آغا جی نے عالی کے کہنے پر ان کو اجازت دے دی تھی اور اس سے بڑھ کر کوئی سی بات ہو سکتی تھی۔ فرمان بے حد خوش تھے مگر اس بے پناہ خوشی میں وہ عالی کا شکر یہ ادا کرنا نہیں بھولے تھے۔ وہ کیا جانیں کہ ان کے دل میں خوشی کے چراغ جلا کر وہ خود کن تارکیوں میں گھوٹی تھی۔

”عالی! میں بہت مشکور ہوں۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“ خوشی سے فرمان کی آواز لڑکھڑاہٹ رہی تھی۔ عالی نے دکھ سے ان کے ہمتا تے چہرے، کو دکھا جہاں انجائی خوشیوں کی بحر طوع ہو رہی تھی۔  
”چلیے آپ میرا کچھ تو یاد رکھیں ناں! یہی بہت ہے۔“ وہ آہستگی سے بولتی دل کا درد چھپائے آگے بڑھ گئی۔



انتظار کی انتہا ہو گئی تھی۔ شہزادی کے قرار یاں عروج پر تھیں۔ وہ پل پل عذرا آپا کا ان کے فون کا منتظر رہتا مگر انہوں نے کھنکھامی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ عذرا بتکم بھی کیا کرتیں۔ کسی طرح اپنے جیتے بھائی کا دل توڑتیں۔ ان میں قطعی ہمت نہیں تھی کہ وہ شہزاد کا اترنا کام منہ نہ لیتیں اسی لیے وہ جانیں رہی تھیں مگر کب تک حقیقت سے منہ موڑتیں۔ اس روز بغیر اطلاع کے میسج آ گئیں۔ لیکن احمد چھوڑ کر جلدی ہی چلے گئے۔  
”واہ عذرا! تم نے خوب راہ دکھائی۔ تمہیں معلوم بھی تھا ہم کتنی بے قراری سے تمہارے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔“

لیکن احمد کے جاتے ہی بڑی بھابھی بولیں تو عذرا افسردگی سے ان کو دکھ کر رہ گئیں۔

”کیا بتاتی۔ یہ شہزاد کہاں ہے؟“

عذرا نے ادھر ادھر دکھ کر پوچھا تو شہزاد۔ جو عذرا کی آواز سن کر ادھر ہی آ رہا تھا۔ کمرے کے باہر ہی رک گیا۔ سانس گھٹے، دھڑکنیں خاموش ہو گئیں۔ اپنی موت و زیست کا فیصلہ سننے کے لیے ہاتھوں میں نمی اتر آئی۔ جانے کیا سننے کو ملے۔

”تم بات کرو۔ شہزاد اپنے کمرے میں ہے۔ ویسے وہ بڑی بے قراری سے تمہارے جواب کا منتظر ہے۔“  
”بس بھابھی اسی کی خوشی کی خاطر تو میں نہیں آئی۔ ورنہ بات تو اسی روز ہو گئی تھی۔ فرمان اور عالی بچپن سے منسوب ہیں اب بس باقاعدہ معافی ہونی باقی ہے۔“

شہزاد عرش سے فرش پر آگرا تھا۔ شدت ضبط سے اس کے دماغ کی نسیں پھینک لگیں۔ اتنی تیز آمد صی میں جانے کیسے۔ وہ گرتا پڑتا اپنے کمرے میں پہنچا۔ کچھ دیر کے لیے وہ بالکل جنونی ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو توج ڈالا۔ سارا کمرہ الٹ پلٹ کر دیا۔ اس کا بس چلنا تو ساری دنیا ہی تہہ بالا کر دیتا۔ تو زڈالے

آئی ہے آج فرمان کی شکایت کرو۔ مگر یہ آئین وفاداری کے خلاف تھا اس لیے وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی۔  
”ایسی کوئی بات نہیں آغا جی۔ بس بات یہ ہے کہ۔“ فرمان کا نام لیتے لیتے پھر حیا آ گئی۔  
”کھل کر بات کرو بیٹی۔“ آغا جی نے دوپٹے سے ڈھکے اس کے سر کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
”آغا جی! وہ فرمان ہیں ناں۔“ وہ بمشکل بول پائی۔

”ہوں تو فرمان نے کوئی بات کہہ دی۔ کیا کہا اس نے ہماری بیٹی کو؟“  
”جی ایسی کوئی بات نہیں آغا جی! انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ دراصل وہ بیرون ملک تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے آپ ان کو اجازت دے دیں۔“

یہ بات کہنے کے لیے وہ تمام رات خود سے لڑی تھی۔ اب وہ بمشکل کہہ پائی تھی۔

”اچھا تو اس نے تمہیں یہاں بھی استعمال کر لیا۔؟“ آغا جی کو فرمان پر غصہ آ گیا۔

”نہیں آغا جی! ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ دراصل ان کی خواہش ہے اور خواہشات اگر پوری نہ ہوں انسان ٹوٹ جاتا ہے اندر سے۔ اور پھر آغا جی یہ کوئی ناجائز خواہش تو نہیں، وہ تعلیم کی غرض سے ہی جانا چاہتے ہیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح فرمان کا دفاع کر رہی تھی۔

”ہمارے ملک میں کون سی تعلیم ہے جو نہیں دی جاتی۔ پھر باہر کیا دھرا ہے۔ باہر والے خود ہمارے ملک میں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں تو کیا وہ امتحان میں جوتے ہیں۔ اگر وہ ہمارا حوالہ دیتا ہے تو ہمارے باہر جانے اور جہتھی تعلیم نہیں۔“ وہ تو آغا جی کی ہر بات سے متفق تھی مگر کیا کرتی۔ فرمان کی خواہش بھی مقدس تھی۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں آغا جی! مگر شوق کی بھی تو اپنی ایک قیمت ہوتی ہے۔ انہوں نے مجھے بھروسے پر بھیجا ہے کہ آپ میری بات مان لیں گے۔ اگر آپ نے انکار کر دیا۔ تو۔“ وہ روہا سی ہو گئی۔ آغا جی چونک کر اسے دیکھا۔

”بیٹی! تم نے کیسے جانا کہ ہم انکار کر دیں گے۔ ہماری بیٹی کہے اور ہم انکار کریں۔ یہ کہاں ہوا ہے۔ جانتا ہے کہ ہم اپنی بیٹی کی بات نہیں مان سکتے۔ اسی لیے۔“

”تو آغا جی آپ مان جائیں گے ناں۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”ہاں۔ جاؤ۔ فرمان کو میرے پاس بھیج دو۔“

”شکر یہ آغا جی! آپ نے میرا مان رکھ لیا۔“ وہ مردہ دل سے ان کا شکر یہ ادا کرتی باہر نکل آئی۔  
جانے کیوں موہوم امید تھی کہ آغا جی اس کے کہنے کے باوجود انکار کر دیں گے۔ کاش وہ انکار کر دیتے آغا جی نے آج تک اس کی بات نہیں مانی تھی تو اب کیسے ٹالتے۔

”شکورا فرمان سے کہو کہ ان کو آغا جی بلارہے ہیں۔“

وہ شکور سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ فرمان پیغام ملتے ہی دھڑکتے دل کے ساتھ آغا جی کے کمرے میں آ گئے اب پیچھے ہاتھ باندھے سر کو ذرا جھکائے کھڑے تھے۔

”کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا اچھے اور اعلیٰ ظرف کی علامت نہیں ہوتی فرمان میاں۔“ آغا جی کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”میں سمجھا نہیں آغا جی!۔“ وہ حیرانی سے ان کو دیکھنے لگے۔

”آپ بھی درست کہہ رہے ہیں آغا صاحب! لیکن منگنی زیادہ مناسب رہے گی۔ انسان کو بھٹکتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔“ بی بی جان نے دورانہنگی سے کام لیا گوکہ ان کو پورا بھر وساتھا فرمان پر۔

”فرمان کا بھٹکان آسان نہیں بیگم!“ یہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ سرکش ٹھوڑوں کا کیا انجام ہوا کرتا ہے۔ میں ایسے ٹھوڑوں کو شوٹ کر دینے کا عادی ہوں۔“ آغا بی بی پر جلال لہجے میں بولے۔

”فرمان آپ کا ٹھوڑا نہیں بیٹا ہے آغا صاحب!“

”یاد دہانی کا شکر یہ۔ بہر حال منگنی کر دی جائے۔ آپ اپنے بیٹے کے گوش گزار یہ بات کر دیں کہ عالی ہمیں کس قدر عزیز ہے۔“ آغا بی بی فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

”جی بہتر!“ بی بی جان اپنے کمرے میں آگئیں اور فرمان کو بلایا۔

”جی بی بی جان!“ وہ سر جھکائے کھڑے تھے۔

”یہاں میرے پاس آکر بیٹھو فرمان بیٹے!“ فرمان ان کے قریب آکر بیٹھ گئے۔

”تمہیں اپنے باپ کی بات کا پتا تو چل ہی گیا ہوگا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔“

بی بی جان کی بات پر وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر آہستگی سے بولے۔

”آغا بی بی کو مجھ پر اعتماد ہونا چاہیے بی بی جان!“

”کیوں تمہیں عالی پسند نہیں؟“

”بات پسندنا پسند کی نہیں بی بی جان، اعتماد کی ہے۔ پھر جب ایک بات سمجھنے سے طے ہے تو پھر ایسی باتوں سے کیا مطلب ہے؟“ فرمان کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

”بے اعتمادی کی اس میں کیا بات ہے بیٹے! اب چونکہ عالی بھی ہماری ذمہ داری ہے تو ہمیں ہی اس کے بارے میں سوچنا ہے۔ اس کے اپنے والدین ہوتے تو وہ بھی ایسی ہی بات کہتے۔“

”نہیں ہے۔ آپ لوگ منگنی کرنا چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں۔“

فرمان نے ایسے اپنی رضامندی دی گویا احسان کر رہے ہوں۔ کتنی عجیب بات تھی۔ وہ جو کسی کی شدید آرزو تھی کوئی ایسے قول کر رہا تھا جیسے بوجہ ہو، احسان ہو۔ زندگی شاید ایسے ہی فریبوں کا نام ہے۔ جب سے منگنی کا اعلان ہوا تھا عالی تو چھوٹی موٹی بن گئی تھی مارے لاج کے وہ اپنے ہی کمرے میں بند ہو گئی۔ شوخ دھڑکنیں فرمان کا نام لے کر چھیڑتی تھیں تو وہ لجا جاتی۔ گھر میں ایک جشن کا سا سماں تھا۔ دونوں گھر میں چھوٹے تھے اس لیے گھر بھر کو عزیز تھے سب ان کی خوشی میں خوش تھے۔ تنہائیں دہن بن جائیں تو چاند کا سارا حسن ان میں اتر آتا ہے۔ فرمان ہر بات سے بے خبر جانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ کس طرح ان کو دہاں رہنا ہے، پڑھنا ہے۔ جب کہ عالی ارمانوں کی سچ پر دہن بنی فرمان ہی کے خیالوں میں کھوئی رہتی۔ فرمان تو کیا اس نے گھر بھر سے پردہ کر لیا تھا۔

”بھئی عالی! تم تو منگنی پر ہی ایسے چھپ کر بیٹھ گئی ہو جیسے مایوں بیٹھی ہو۔“ قدسہ بانو اسے چھیڑتی تھیں مارے حجاب کے اس کا سر مزید جھک جاتا۔

”بھائی جان بس دعا کریں میری عالی ہمیشہ خوش رہے۔“ سیدہ نے پیار سے عالی کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شرافت، اخلاقیات کے تمام اصول و ضوابط اور عالی کو ساری دنیا سے چھپا کر کہیں دور لے جائے۔ وہ لٹا لٹا سا ہار بیٹھا تھا اور کب تک بیٹھا اپنے ارمانوں کا ماتم کرتا رہتا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک گیا۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ کمرے میں جانی بچی ہوئی تھی۔ نیچے پر ہاتھ پڑا تو پتا چلا کہ کچلنے اس کا دل اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ وہ سو گوار لٹھوں کی گرفت سے آزاد بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر دستک ہوئی۔ تو بہتر ہوا کہ اس نے دروازہ لاک کر دیا تھا ورنہ وہ دماغوں کو کہاں چھپا پاتا کسی سے، اس اجڑے روپ اور کمرے کی جانی سے کوئی با آسانی اس کے دل کا راز پاسکتا تھا۔

”یہ یقیناً آپا ہوں گی اور مجھے تھی دامان دیکھ کر ان کو بہت دکھ ہوگا۔ مجھے فریض ہو جانا چاہیے۔ تمہارے دیے زخم بھی میرے لیے بہت معجز ہیں عالی! میں ہنس کر انہیں سینے سے لگاؤں گا مگر اپنے زخموں کی نمائش نہیں کروں گا۔ خواہ وہ آپا ہی کیوں نہ ہوں۔“

شہزاد نے لرزے ہاتھوں سے بکھری ذات کی کرچوں کو سمیٹا۔ کمرے کا طبلہ قدرے درست کیا۔

پھر تیسری دستک پر اس نے سٹکی آنکھوں پر خنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ نیسیں دبا تا مسکراتا ہوا ہوا آگیا۔ دروازہ کھولا تو سامنے عذرا آپا افسردہ کی کھڑی تھیں۔

”اوہو آپا جان آپ آپ کب آئیں؟ یہ آپ مرجھائی ہوئی کیوں ہیں۔ بیمار تو نہیں تمہیں، کیا بات ہے؟“ غیر معمولی اونچی اور مٹکتی ہوئی آواز خود شہزاد کو کھوکھلی اور بے جان محسوس ہوئی تو عذرا کیسے مطمئن ہو جاتیں۔ انہوں نے نو سے بھائی کو دیکھا۔ طوفان کی تباہ کاریاں بالکل نمایاں تھیں۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ شہزاد نے سن لیا ہے۔

”شہزاد! وہ۔ میں یہ بتانے آئی ہوں کہ۔“ عذرا کی زبان لڑکھڑا گئی۔

”کہ عالی کے گھر والے نہیں مانے۔“

لیں اتنی ہی بات پر آپ یوں طول ہیں آپا جان! یہ کیا بات ہوئی۔ آئیے میرے پاس بیٹھیے۔ حد ہوگئی۔“

کھٹکتے لہجے میں شہزاد نے اپنی سسکیوں کو دبا جانا چاہا اور عذرا کو شانے سے پکڑ کو صوفے پر بٹھا دیا۔

”وہ سمجھنے ہی میں شہزاد!“ عذرا رو پڑیں۔

”آپا جان! تو کیا ہو گیا۔ یہ تو طے شدہ بات تھی۔ ہم لوگوں کی یہ حماقت تھی کہ سب جانتے ہوئے بھی حرکت کی۔ بدسا سوال میرا تو آپا جان یہ درست ہے کہ میں نے عالی کو بڑی سنجیدگی سے پسند کیا۔ مگر اب جب کہ میری قسمت میں نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب میں مجنوں بن جاؤں۔ یاد دنیا تیاگ دوں۔ مجھے دکھ ضرور ہے لیکن اب ایسا بھی نہیں۔ آپ تو ایسے روروی ہیں جیسے جانے کتنی بڑی بات ہو گئی ہے۔ انسان میں ہر قسم حقیقت کو تسلیم کرنے کا ظرف ہونا چاہیے اور آپ کا بھائی اتنا کمزور نہیں۔ دیکھیں میں تو ہنس رہا ہوں اور آ، روروی ہیں۔“

شہزاد نے عذرا آپا کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ تو انہوں نے اس کی روتی ہنسی کو دیکھا اور اس پیشانی چوم لی۔

”جانے دو، میرے چاند کے لیے لڑکیوں کی کمی ہے۔ مجھے بس تمہاری ہی فکر تھی۔“



فرمان کو باہر جانے کی اجازت مل گئی مگر آغا بی بی چاہتے تھے کہ عالی اور فرمان کی منگنی کر دی جائے۔

”بلکہ میرے خیال میں تو نکاح کر کے بھیجا جائے۔“ آغا بی بی نے کہا۔

کیوں جی۔ تم کیا خوش نہیں اس گھر میں؟“ قدسیہ بانو مڑ کر بولیں۔  
”میں خوش ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔“

”تو پھر انشاء اللہ عالی بھی خوش رہے گی۔ اس نے بھی اسی گھر میں رہنا ہے۔“  
”آمین!“ سیدہ کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔

”بھابھی! آپ کو آغا جی نے بلوایا ہے۔ ذرا ان کی بات سن آئیں۔“ عذرا بیگم اندر آتی ہوئی بولیں۔ سیدہ ان کے قریب آگئیں۔

”بھابھی جان آپ ناراض تو نہیں ناں۔“

”کس بات پر؟“ عذرا نے حیرانی سے سیدہ کو دیکھا۔

”یہی کہ آپ نے شہزادہ کے لیے پوچھا۔“

”ارے چھوڑو۔ پرانی بات ہو گئی ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولیں۔

”پھر بھابھی جان! آپ عالی کے لیے دعا کریں کہ یہ خوش رہے۔“

سیدہ ہر کسی سے عالی کی خوشیوں کے لیے دعا کر رہی تھیں۔

”ارے بھئی خوش کیوں نہ رہے گی۔ کون سا پرانے گھر جا رہی ہے۔ آغا جی نے ہمیشہ کے لیے سینے سے جو لگا لیا ہے پھر اسے دکھ کیوں ملنے لگے۔“ عذرا کے لہجے میں ہلکی سی تلخی کی کاٹ تھی۔ جسے سیدہ نے اہمیت نہ دی۔



ایزی جی چیز پر شہزادہ نیم دراز تھا اور نگاہیں فرمان اور عالی کی منگنی کے کارڈ پر جمی تھیں جس پر اس کے ارمانوں کو دار پر چڑھانے کی تاریخ درج تھی۔

”کتنے خوش نصیب ہو تم فرمان! کتنا معجز تصور کر رہے ہو گے تم اپنے آپ کو اور ایک ہم ہیں حرام نصیب کہ۔“ وہ جانے کب تک لٹے ارمانوں کا ماتم کرتا کہ بھابھی نہ آجائیں۔

”کیا خیال ہے شہزاد! تم جاؤ گے؟“

”کیوں، کیا خیال ہے آپ کا؟“ اس نے التان پر سوال داغ دیا۔

”اپنے دل سے پوچھ لو۔“

”دل کا کیا پوچھتی ہیں بھابھی! یہ تو سدا کا دیوانہ ہے۔“

یہ آغا جی کے آخری بچوں کی خوشی تھی اسی لیے دھوم دھام سے اسے منا رہے تھے۔ بہت اہتمام کر رہے تھے۔ سیدہ نے خود اپنے ہاتھوں سے عالی کو دلہن بنایا تھا۔ بی بی جان نے سو سو بلائیں لی تھیں۔ ارمانوں کی سچا بیٹھی عالی کی آنکھوں میں فرمان کی صورت بسی تھی۔ سب مہمان آچکے تھے۔ بس اب عذرا بیگم کے گھر والوں کا انتظار تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں، شہزاد تو آئے گا نہیں، باقی سب کو تو آ جانا چاہیے تھا۔ رسم میں دیر ہو رہی تھی۔ اسی وقت شکور نے بتایا کہ سب آ گئے ہیں۔ وہ جلدی سے آگے بڑھیں۔

”آداب آپا جان!“ سیاہ ڈزسوٹ میں شہزادہ بہت سچ رہا تھا۔

”جیتے رہو۔ خدا ہمیشہ خوش رکھے۔“ عذرا نے نظروں ہی نظروں میں بھائی کی نظر اتارتے ہوئے کہا۔

”ہونہ خوش از زندگی کی واحد خوشی بھی غیر کی ہو گئی تو۔“ شہزاد نے دکھ سے سوچا۔ سب مہمانوں کی موجودگی اور چیمبر جہاز میں سیدہ نے فرمان کو انگوٹھی پہنا دی۔ سب کی رائے تھی کہ عالی بھی وہیں آجائے مگر وہ اس کے لیے نہیں مانی تھی۔

”ہائے نہیں بھابھی جان! میں تو سرری جاؤں گی شرم سے۔“

پھر فرمان کے علاوہ سب بھابھی کے کمرے میں آ گئے۔ شہزاد بھی اسے دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ زندگی دلہن بن کے کیسی لگتی ہے۔ مگر وہ یہاں کسی سے اپنی اس شدید خواہش کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”شہزاد! تم فارغ کیوں ہو۔ کمرہ سنبھالو اور کچھ تصویریں اتار دو۔“ کوکہ آغا جی اس بات کے خلاف ہیں مگر ایسے موقع بار بار تو نہیں آتے ناں۔“

قدسیہ بانو نے ایک ستم اور ڈھایا مگر اس سے یہ ہوا کہ وہ اس حسین چہرے کو دیکھ تو سکتا تھا اور پھر کمرے کی آنکھ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اس حسن جہاں سوز کی بے شمار تصویریں بنا ڈالی تھیں۔ آتش بھاری دوپٹے گھرے میک اپ اور زبورات میں وہ شعلہ جوالہ بنی اس کے دل پر قیامت ڈھا رہی تھی۔

شہزاد کو فرمان کی خوش بختی پر رشک آ رہا تھا۔

”شہزاد! چلو، ان دونوں کی ایک خوبصورت سی تصویر بنا دو۔ عالی! تھوڑا سا سراو پر کر دو۔“

سیدہ کے کہنے پر اس نے پھر کمرہ آنکھ سے لگا لیا۔ حسین کھڑے پر سے مٹھو گھٹ ہٹا تو شہزاد کھوسا گیا۔ نظریں اس حسین چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

”شہزاد! جلدی کر دو۔ کیا ہو گیا ہے آغا جی نہ آجائیں۔“

کسی طرف سے آواز آئی تو شہزاد نے چونک کر تصویر اتاری۔ کیسی حسرتیں چل کر روئی تھیں۔

”اچھا جی فرمان صاحب بہت بہت مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو یوں ہی خوش رکھے، مجھے امید ہے عالی آپ کی بہترین جیون ساتھی ثابت ہوگی۔ مجھے اجازت دیں۔“ شہزاد نے تڑپتے دل کے ساتھ فرمان کو مبارک باد دی۔

”تو کیا آپ جا رہے ہیں شہزاد بھائی؟“ فرمان بھی اڑے ہوئے۔

”جی ہاں، کل سے کچھ حرارت سی ہے۔ آج کچھ۔“ وہ محسوس ہو رہی ہے۔ سر میں بھی درد ہے اس نکلنے معذرت کہ آپ کی خوشی میں بھر پور انداز میں شرکت نہیں کر سکا۔“

جواس کے دل کے درد سے آشنا تھے وہ اس کے سر درد کی وجہ بھی جان گئے تھے اس لئے عذرا اور قدسیہ بانو نے شہزاد کو روکا نہیں۔

منگنی کے خوبصورت فریضے کے بعد عالی کو اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی۔ وہ ہمہ وقت زندگی کی اتنی بڑی خواہش پوری ہونے پر خدا کا شکر کرتی رہتی اور فرمان کے خیال میں کوئی رہتی۔ منگنی کی کچھ تصویریں اس کے پاس تھیں مگر وہ تنہائی میں بھی ان کو مارے شرم کے نہ دیکھ پاتی۔ فرمان کی تصویر تو بچپن ہی سے دل کے فریم میں نشی تھی۔ ذرا نظر جھکا کر دیکھ لیتی۔ اب گھر میں فرمان کے باہر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ان کے کپڑے، بیکر ضروریات کا خیال قدسیہ بانو کو تھا۔ آغا جی کی طرف سے ان کو باقاعدہ ایک ہدایت نامہ ملا تھا جسے پڑھ کر ان کو

نسوں ہوا تھا کہ آغا جی کو مجھ پر اعتبار نہیں۔ مگر کی خواتین افسردہ افسردہ سی ان کی تیاری کر رہی تھیں۔ بہنیں الگ



افردہ تھیں، بی بی جان الگ تنہائی میں بار بار رو بکی تھیں۔ سیدہ کو الگ وہم ستارہ ہے تھے۔  
”رحمن! مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہاں کی عورتیں تو یہاں کے مردوں کو آسیب کی طرح چراتی ہیں۔“ وہ اپنے خدشات کا اظہار شوہر ہی سے کرتی تھیں۔

”سیدہ! یہ تم خواتین جو ہوتی ہو ناں! انتہائی شکی اور دہمی ہوتی ہو۔ رسی کو سانپ سمجھ کر بھتی رہتی ہو۔ اور بھی مردوں مردوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ پتا بھی ہے فرمان کی راگوں میں خون بھی کس کا دوڑ رہا ہے۔ آغا جی! انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا اور ہم سب کس لئے ہیں۔ عالی اور اس کی خوشیاں ہم سب کو عزیز ہیں۔“

شوہر کی تسلی پر سیدہ پہل جاتیں۔ جیسے جیسے فرمان کی روانگی کے دن قریب آ رہے تھے عالی کی حالت ہو رہی تھی۔ فرمان کی خواہش پر اس نے دو کرتے بنائے تھے۔ انتہائی نفیس کڑھائی کی تھی۔ وہ بظاہر خود کو پٹارل ظاہر کرتی مگر تنہائی میں دل آنکھوں میں پانی بن کر اتر آتا۔ کہاں فرمان سے پہل بھر کی جدائی گراں کہاں اب سالوں پر محیط جدائی نے اس کے ہمدل کی گلیوں کو ویران و سنسان کر دیا تھا۔

عالی نے کرتے تیار کر لیے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ کس کو دے کر وہ فرمان تک پہنچا دے، جس کو دیتی۔ اس کا مذاق بنانا اور خود وہ مر بھی جاتی تو نہ دیتی۔ اس کے لئے اس نے عطیہ آپا کو بچتا۔

”آپا جان یہ کرتے۔“ اس نے دونوں کرتے ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔  
”ارے واہ! بہت خوبصورت بنائے ہیں مگر ہیں کس کے؟ آپا جانتے ہوئے بھی اس جھپڑنے کی سے بولیں۔“

”یہ وہ آپا جان اس کو دے دیں۔“ مارے حجاب کے اس کی پلکیں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

”بھئی! یہ ان کو کون ہے، ہمارے گھر میں تو کسی کا یہ نام نہیں۔“

”آپا جان۔“ وہ زچ ہو کر ان کے ساتھ آ گئی۔ یہ کرتے عطیہ آپا نے فرمان کو بھی اسی طرح دیے۔

”لو بھائی تمہاری بھیتیر نے بنائے ہیں تمہارے لئے۔“

”آپا جان!“ فرمان بھی عالی والے انداز میں صیغہ گئے۔ فرمان کے جانے سے قبل بی بی جان خیر و برکت کے لئے میلاد شریف کا انتظام کیا جس میں فرمان کی صحت و زندگی کی دعائیں مانگی گئیں۔ چند روز گئے تھے۔ سب تو جذباتی ہو رہی رہے تھے۔ خود فرمان کے دل کی عجیب حالت تھی۔ ایک نئی دنیا نیا ماحول دیکھا شوق اور اپنے اتنے پیاروں سے جدائی۔ دونوں احساسات نے عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

ہر کوئی افسردہ تھا اور سب ہی حسب توقع فرمان کو سمجھا رہے تھے۔ نصیحتیں کر رہے تھے۔ سب ہی فرمان کے گرد موجود تھے۔ مگر عالی جس کے سانس کی دھڑکن میں فرمان کے دل سے جڑی ہوئی تھی لا تعلق بنی اپنے کمرے بند تھی۔ وہ حیا کے پردے سے باہر نہیں آ سکتی تھی تو فرمان ہی کو اس کا خیال آ جاتا۔ کوئی تو ایسی بات کر دینے دل کے تاروں کو چھڑ دیتی۔ کوئی مشعل تو روشن کر جاتے۔ عالی کے پاس کچھ تھا تو فرمان کے نام کی انگوٹھی گہری نگاہوں کا طلسم تھا نہ کوئی میٹھی ذومعنی بات کا لطیف احساس۔ وہ انگوٹھی کو دیکھتی رہی حتیٰ کہ انگوٹھی کا حسن دھندلا گیا۔ کتنی شدید خواہش ہو رہی تھی کہ فرمان ایک بار تو آئیں۔ اس کے پاس اس سے کوئی بات کریں تسلی کے جموئے الفاظ امید کا کوئی دیپ جلا لیں۔

وہ بستر پر گری روئے جا رہی تھی۔ فرمان آج جا رہے تھے۔

قد سیدہ بانو نے آہستگی سے فرمان کے کان میں کہا تو وہ جڑ بڑ ہو گئے۔ عجیب سا لگ رہا تھا کہ وہ اب عالی کو خدا حافظ کہنے جائیں۔

”کیا یہ ضروری ہے بھابھی جان!“ وہ کچھ شرارہ ہے تھی۔

”بہت ضروری ہے، تم لڑکیوں کے جذبات کو نہیں جانتے۔ کالج سے زیادہ نازک اور پھول سے زیادہ حساس ہوتے ہیں اور عالی تو۔“

قد سیدہ بانو کے کہنے پر وہ عالی کو خدا حافظ کہنے آئے۔ وہ اس خوشگوار غیر متوقع حملے کے لئے قطعی تیار نہ تھی۔ اس نے جلدی سے آنکھیں رگڑ کر پورا سا گھونکھٹ نکال لیا۔ اس کے کان کسی خوبصورت سی بات کسی خوبصورت آس کے منتظر تھے۔ کسی لطیف بول کے منتظر تھے۔ مگر یہ تمام باتیں جذبات پر انحصار کرتی ہیں، جب دل میں ایسی بات نہ ہو تو کسی کو ایسی بات کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ فرمان کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔

”خدا حافظ عالی“ ہر قسم کے جذبے اور احساس سے عاری سپاٹ سا، خدا حافظ کہہ کر وہ اس کے دل میں اٹھی، قیامت سے پر خیر باہر آ گئے۔

”اچھا بھابھی جان اجازت۔“ فرمان باری باری سب کے سامنے جھک رہے تھے۔

”احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا بیٹے! تاکہ اعتماد کا سر بلند نہ سکے۔“

آغا جان نے ان کو گلے سے لگا لیا، پھر فرمان ماں، بہنوں اور بھابیوں کے آنسوؤں کی بارش میں بھائیوں اور آغا جی کی نصیحتوں کے سامنے تلے گھر سے نکلے تو عالی کو یوں لگا جیسے جسم سے روح نکل رہی ہو۔ وہ آنسوؤں کی دھند میں بالکونی میں آ گئی پیچھے گھر بھر آفسردہ مکرز فرمان کو رخصت کر رہا تھا۔

”خدا حافظ فرمان۔ خدا کے لئے لوٹ آئیے گا۔ آپ میری چاہت ہیں، میری شدید خواہش بھی اور یہ“

آپ کے الفاظ ہیں کہ شدید خواہشات اگر پوری نہ ہوں تو انسان ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔“

وہ بالکونی میں کھڑی تھی۔ فرمان کو شاید فرصت نہیں تھی۔ دیکھنے کی مگر شہزادی کا ہیں غیر ارادی طور پر انھیں اور گلابی لہادے میں لپٹی انھوں کی بارش میں بیٹکی عالی پر جم گئیں تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ فرمان کی قسمت پر رشک کرتا وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی پورچ سے نکلی تو عالی کو جیسے جکڑ آ گیا۔

”عالی بی بی۔ عالی بی بی“

”شکورا اور باقی سب اوپر کی طرف بھاگے۔“



”آپ لوگ ناحق فکر مند ہو رہی ہیں آپا جان! اچھی بھلی تو ہوں۔ بیگنی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔  
 ”کوئی اچھی بھلی نہیں ہوتی۔ آرام سے لیٹ جاؤ میں ابھی نسرین کے ہاتھ دوا بھیجتی ہوں۔ کھا کر پرسکون  
 ہو کر سو جاؤ، میں سب جانتی ہوں اس طبیعت کو بہل، جانے گی۔“

قد سید بانو اسے پیار سے دیکھتے ہوئے مسکرائیں تو وہ نادام سی ہو گئی وہ تینوں اٹھ گئیں تاکہ وہ آرام کرے۔  
 ”بھابی جان خدا را اس بات کا بی بی جان اور آغا جی کو پتا نہ چلے۔ وہ کیا خیال کریں گے۔“ اس نے  
 جاتے ہوئے ان لوگوں کو منع کر دیا۔

”واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم لوگوں کو اپنی جان بہت عزیز ہے لڑکی! آغا جی کو پتا چلا کہ تمہاری طبیعت خراب  
 رہی اور ہم نے بتایا نہیں تو۔“

”اللہ نہیں بھابی جان! آپ کیسی بھی دو انیں دیں گی میں کھالوں گی ان سے مت بے جا۔“  
 اس نے منت بھرے لہجے میں کہا تو قد سید بانو مسکراتی ہوئی باہر نکل گئیں، قد سید بھابی نے دودھ کے  
 ساتھ اس کے لیے دوا بھیج دی تو وہ ان کی محبت پر مسکرا دی دوا لے کر وہ لیٹ گئی تو ایک دم جانے کہاں سے گھٹا  
 اذنی کی کہ من آنگن بھر جل قتل ہو گیا۔

فرمان کے جانے سے گھر بھر اداس اور افسردہ تھا بی بی جان بیٹے کی اتنی طویل جدائی کے سبب بہت  
 بڑھ چالی تھی جبکہ آغا جان کا خیال تھا فرمان کا جذباتی عاشق ہے وہ جلدی لوٹ آئیں گے مگر بی بی جان کو قرار  
 نہیں تھا۔

”بیگم! اگر یوں ہی کرتا تھا تو جانے نہ دیا ہوتا۔ اس وقت بھی آپ ہی سفارش کر رہی تھیں۔“  
 آغا جی نے چاول نکالتے ہوئے کہا۔ میز پر سب ہی موجود تھے مگر کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا فرمان کی  
 مخصوص کرسی خالی دیکھ کر سب ہی افسردہ ہو گئے مگر بی بی جان اور عالی کے لیے نوالے اتارنا مشکل ہو رہا تھا۔  
 بی بی جان تو اس تھیں۔ کسی طریقے سے بھی اظہار کر سکتی تھیں ایک عالی جی کی کہ اسے شرم دینا کہ تمام تقاضے پورے  
 کرنے سے کہ دل ناتواں پر کوئی بھی واردات گزر جاتی اسے ضبط کے پتھر کو کھائے رہنا تھا۔



فرمان احمد زندگی میں پہلی بار یوں گھر سے، وطن سے دور ہو رہے تھے، اس لیے بہت اداس اور افسردہ تھے  
 اور کچھ انہوں نے محبتوں کی چھاؤں میں روایتی سی زندگی گزری تھی۔ یوں پہلی بار وہ جذباتی فضا سے دور ہوئے تھے  
 اپنی نشست کی پشت سے ٹیک لگائے وہ سطح زمین سے ہزاروں فٹ بلندی پر جہاز کی کھڑکی کے شفاف شیشوں میں  
 خالی نگاہوں سے قدرتی مناظر دیکھ رہے تھے، اپنی زمین ان کو اتنی بلندی سے گڑیا چھوٹا سا گھر لگ رہی تھی جہاں بے  
 شمار گن تھے چھوٹے چھوٹے ان ہی آنکھوں میں ایک آنکھوں سب سے روشن ہو گیا جس کے بڑے سے لان  
 میں وہ اپنے دیگر بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل رہے تھے لڑنا جھگڑنا پھر مل بیٹھنا کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ آغا جی کی  
 اصولی محبت بی بی جان کی سدا کشادہ بانہیں جو ہر وقت اپنے بچوں کے لیے کھلی رہتیں۔ زرد سفید گلاب کے تختے  
 موسیے اور چینی کے خوبصورت کج اور دیوار کے ساتھ لہرائی شہو کی کلیوں کی جھک کی صورت میں معصوم عالی کی بیگنی  
 مسکراہٹ جو جانے کیوں انہیں اس قدر چاہتی تھی۔ بچپن میں ان کی خطائیں اپنے نام لکھوانے والی یہ لڑکی جانے کیا  
 چاہتی تھی۔ ان کو یاد تھا ان سے کوئی غلط کام ہو جانا تو عالی فوراً اپنے سر لے لیتی آغا جی سب جانتے تھے، مگر عالی کی

عالی بستر پر گری گھر سے گھر سے سانس لے رہی تھی نمی تو چاہتا تھا کہ فرمان کے جانے پر ہر شے سے لپٹ  
 کر دے مگر اب اس بات کی شرم کھائے جاری تھی کہ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے مگر جانے کیا ہوا تھا  
 کہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ جب فرمان کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوئی تو اسے چکر سا آگیا اور وہ لڑکھڑائی لگی  
 حالانکہ اسے تو اپنے جذباتوں پر اپنی بے قرار یوں پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ وہ نارل ہونے کی سعی کر رہی تھی اسے  
 شرم محسوس ہو رہی تھی کہ سب ہی اس سے اتنے بڑے ہیں کیا خیال کریں گے کہ مگھیر کے جانے پر اس کی یہ حالت  
 ہو گئی۔ وہ ان کے آنے سے قبل کسی حد تک نارل ہو چکی تھی مگر سکتی آنکھوں اور چنتی پیشانی کو وہ کہاں لے جاتی۔

”عالی۔ عالی۔“ دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے تولیہ رینگ پر رکھ کر بال درست کرتے ہو۔  
 دروازہ کھول دیا قد سید بھابی، عذرا بھابی اور سیدہ ترپ کر اس کی طرف بڑھیں۔

”عالی! میری جان کیا ہوا تھا خدا کا لاکھ احسان کہ تم گریں نہیں رونے۔“ سیدہ نے اسے ساتھ لگایا۔  
 ”عالی ہو کیا تھا آخر تمہیں احتیاط کرنی چاہیے ایسی خطرناک جگہ پر۔“ عذرا بھابی تشویش سے بولیں۔  
 ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں عالی؟“ قد سید بانو اسے چھو کر دیکھ رہی تھیں، وہ ان کی محبتیں پاؤ  
 شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس نے ہنسنے کیلئے ہاتھوں کو پیچھنے سے روکا۔

”کچھ بھی تو نہیں ہوا بھابی جان! وہ رینگ پر تولیہ پڑا تھا۔ وہ لینے لگی تو دودھ پڑا ہوا سے رینگ میں الجھ  
 اور میں تو وزن پر قرار نہ رکھ سکی یوں ذرا لڑکھڑائی تھی۔“

وہ ان کی محبتوں کے پھول چنتی اپنی اس لڑزش کو کسی اور کو تابی کے نام کرتی ہوئی آہستگی سے بولی کو کہ  
 تینوں اس لڑکھڑاہٹ کی وجہ خوب اچھی طرح جانتی تھیں مگر انہوں نے جتایا نہیں، مذاق میں بھی نہیں۔

”عالی! لگتا ہے تمہیں بخار ہے۔“ قد سید بھابی نے تشویش سے اس کی پیشانی چھوئی۔  
 ”جی بھابی! مجھے بھی لگ رہا ہے، دیکھیے تو چہرہ کس قدر گرم اور سرخ ہو رہا ہے کیوں کیا سوچا ہے عالی  
 نے۔“ سیدہ بہت زیادہ فکر مند ہو گئیں۔ عالی میں تو ان کی جان تھی۔

وجہ سے وہ ان کو کچھ نہیں کہتے تھے، وہ ذرا ناراض ہو جاتے تو عالمی کی جان پر بن جاتی۔ حالانکہ ان کو اپنی زیادہ احساس بھی ہوتا مگر پھر بھی نخرے اٹھوانے کے لیے روٹھے رہتے اور وہ اپنے معصوم انداز میں مناتی رہتی۔

آج سے پہلے ان کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا، مگر آج یہ سب کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ سب کتنا یاد آ رہے تھے گھر اپنے لوگ کس قدر پیارے اور عزیز ہوتے ہیں۔ ان سے جدا ہونا کتنا مشکل عمل ہوتا ہے، ان کا جی چاہ جہاز سے کود جائیں اور اپنے پیارے لوگوں کے پاس پہنچ جائیں دیکھتے دیکھتے انہوں نے محسوس کیا کہ شہ شیشے دھندلا گئے ہیں۔

”فرمان کیا بات ہے یا تم تو بالکل ایسے بچے کی مانند لگ رہے ہو جسے اس کی مرضی کے خلاف پہلا اسکول بھیجا جا رہا ہو۔ بہت اداس ہو رہے ہو۔“

فرید جو کہ فرمان کے بے تکلف اور گہرے دوست تھے، اور جن کی ایما پر فرمان بھی باہر جانے کے لیے گئے تھے۔ وہ میگزین ایک طرف رکھ کر فرمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہوں نہیں تو، میں تو اداس نہیں بس قدرتی حسن میں کھویا ہوا ہوں۔“

فرمان دوبارہ باہر دیکھنے لگے، جہاز کسی خوبصورت وادی سے گزر رہا تھا۔

فرید ان کو اپنے وہاں ٹھہرنے کے پروگرام کے بارے میں بتا رہے تھے، اور فرمان اس بات پر بچھتا رہے تھے کہ کس گھڑی کو انہوں نے رخت سفر باندھا کس قدر مشکل لگ رہا تھا ابھی تو وہ سفر میں تھے اور طویل گزرا تھا۔

”کوئی ضروری تو نہیں زبردستی تو نہیں کہ میں وہاں رہوں۔ لوٹ آؤں گا۔“

اس خیال نے ان کو پرسکون کر دیا۔ وہ مسلسل گھر کے بارے میں سوچ رہے تھے، پیچھے ہی دیکھ رہے آگے کا کوئی حسن ان کو متاثر نہیں کر رہا تھا۔

”یار فرمان! کیوں بول کر رہے ہو کوئی بات کرو، میں تم سے ہی مخاطب ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کس یونٹ میں ایڈیشن لیتا ہے؟“

فرید نے مسکرا کر ائیر ہوسٹس کو دیکھا جو ان کے سامنے ڈش لیے کھڑی تھی انہوں نے اپنی پسند کی لے لی اور پھر ہوسٹس نے فرمان کی طرف ڈش بڑھائی۔

”تو ٹھیکس۔“ فرمان نے کوئی بھی سوچ لینے سے انکار کر دیا اور پھر باہر فضاؤں میں دیکھنے لگے۔

بادلوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اور بادل بالکل روٹی کے گوے لگ رہے تھے۔

”فرمان! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ فرید نے پھر یاد دہانی کرائی۔

”یار فرید! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کچھ دن گوم کروٹن واپس لوٹ آؤں گا۔ یار بہت مشکل لگ رہا ہے میں تو نہیں رہوں گا وہاں دیار غیر میں نہ جانے کون سے لوگ ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے یہاں آن بستے ہیں۔ فرمان نے قطعی لہجے میں کہا تو فرید کو ان پر غصہ آ گیا۔

”یار بڑے ہی بے صبرے انسان ہو دیکھو دوست یہ جو زندگی ہے ناں کچھ کھونے اور کچھ پانے ہے کچھ پانے کے لیے انسان کو کچھ قربان بھی کرنا پڑتا ہے، میں جانتا ہوں تمہیں اجازت کس طرح ملی۔ جب انہوں نے اپنی خوشی اور رضامندی سے اجازت دے دی ہے تو دل بڑا کرو، سوچو۔ وہ بھی تو لوگ!

یہ سب حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے پاس ذرا نفع نہیں ہوتے ہمیں تو خدا کا شکر ہے اس نے توفیق دی کہ ہم تیری دنیا دیکھیں، اس کو سمجھیں۔“

فرید، فرمان کو ایسے ہی دلائل سے سمجھا رہے تھے مگر ان کی سوچ اپنی جگہ تھی انہوں نے بہت زیادہ روایتی ماحول میں پرورش پائی تھی اور وہ اپنے ماحول کے اسیر تھے، کئی بار ان کو فرید پر بھی غصہ آیا کہ انہوں نے ان کو اسکیا حالانکہ ان کی اپنی شدید خواہش نہ تھی۔ ان ہی خیالات میں کھوئے فرمان جانے کب سو گئے۔ آنکھ اس وقت کھلی جب ان کو مسافرین کو منزل پر پہنچنے کی خوشخبری سنائی تھی، فرمان کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا۔ ایک عجیب طرح کی بے چینی اور گھبراہٹ نے آن گھیرا۔ ان کی نسبت فرید بہت پرسکون اور فریش لگ رہے تھے، کچھ ہی دیر میں وہ لوگ نیو یارک کے ایر پورٹ پر کھڑے تھے۔ فرمان گم سم سے ابھری ماحول اور انجینی لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔

”قدم آئے ہو حاد یا ر! ایر پورٹ ہی نہیں سنا ہے سارا امریکہ بہت خراب صورت ہے۔“

فرید نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لیا۔ وہ نے فرمان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے وطن سے بڑھ کر خوبصورت تو نہیں ہوگا۔“ فرمان نے ایسے روٹھ کر کہا جیسے کوئی بچہ اپنی چیز کو دوسرے کی چیز سے زیادہ بہتر اور خوبصورت ثابت کر رہا ہو۔

”اپنے وطن کی تو یہ بات ہی چھوڑو، وہ تو جنت ظہیر ہے۔“

دونوں دوست وطن کی یاد میں کھوئے کشم کے عملے کے حوالے ہو گئے، وہاں سے فراغت کے بعد باہر نکلے تو فرید کو اپنے ماموں جان کی تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ فرید اپنے عزیزوں سے مل رہے تھے، اور کھڑے فرمان کو احساس محرومی ستا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے لاتعلقی سے ایک طرف کھڑے رہے، فرید جب ابھی طرح مل چکے تو فرمان کی طرف گھوم گئے۔

”ماموں جان! یہ ہے میرا عزیز دوست فرمان جس کے بارے میں میں نے خط میں بھی لکھا تھا۔“

فرمان ان سے تعارف کراتے ہوئے بولے۔ تو ان کے ماموں نے فرمان کو بھی اسی طرح گلے لگا دیا جیسے فرید کو۔

”اچھا تو یہ فرمان میاں ہیں بیٹے! تم تو بہت گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو، ریلیکس ناؤ۔“

”ماموں جان! یہ تو بہت جذباتی ہو رہا ہے، کہتا ہے جلدی لوٹ جائے گا۔“

”اچھا تو یہ بات ہے، چلو دیکھ لیں گے، فی الحال تو گھر چلو آؤ فرمان میاں۔“

آخر فرمان کب ساتھ لگائے گا ڈی تک لے آئے تو ایک گوند سا سکون ملا۔ پھر تمام راستہ آخر صاحب باتیں کرتے رہے۔ ان کے آئندہ پروگرام کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ آخر صاحب خود بھی بہت اچھے تھے ان کے دعوے بیٹے تھے فرید کی کمائی بہت سی سادہ سی خاتون تھیں۔ ان کے روایتی انداز کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک عرصے سے امریکہ میں ہیں۔ فرمان سے بڑی محبت سے پیش آئیں، فرید نے ان کو بتا دیا تھا کہ یہ اس ہو رہے ہیں اس لیے گھر بھری ان کی دل جوئی میں لگا ہوا تھا۔

”فرمان بیٹے میں نے سنا ہے کہ تم واپس جانا چاہتے ہو۔“ بیگم آخر نے کھانا میز پر لگاتے ہوئے فرمان سے کہا۔ جو حال لگا ہوں سے فی دی پر آنے والی انگریزی فلم دیکھ رہے تھے، چہرے ہی سے اداسی چھک رہی تھی۔

”مئی میں گھر سے پہلی بار دور ہوا ہوں اس لیے کوئی مضبوط فیصلہ نہیں کر پا رہا۔“

فرمان نے لگا ہیں جھکا کر بہت آہستگی سے کہا۔

”بڑی بات ہے فرمان بیٹے! تمہارا تعلق اس وطن سے ہے جس کے مصور کو ایسے نوجوانوں سے محبت جو ستاروں پر کندھ لٹنے میں نئے نئے جہاں آباد کرتے ہیں اپنے زور بازو سے، یہ تو بڑی خوشی اور اطمینان بات ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو اس بات کی ضرورت ہے اور پھر بیٹے انسان کی زندگی ہوتی ہی کتنی ہے لہذا مختصر زندگی میں اس کے رموز کو جتنا سمجھا جائے کم ہے، تم نے ہمت تو کی ہے، یہاں تک آگئے، اب کچھ ماہ کیے بغیر لوگوں کے تو بہت بری بات ہوگی کیونکہ کم ہمتی پاکستانی قوم کا شیوہ نہیں۔“

”حمیدہ بیگم! بچے سفر سے تھکے ہوئے آئے ہیں ان کو لیکچر دینی اور آرام کی ضرورت پہلے وہ فراہم کرو بیچے بعد میں بھلے آپ ان کو لیکچر دیتی رہیں۔“

اختر صاحب نے مسکرا کر بیگم کو دیکھا جو برتن درمیان میں چوڑ کر فرمان کو سمجھانے لگ گئی تھیں۔ شوہر کہنے پر مسکرا کر جلدی جلدی کھانا لگے لگیں۔

”بھئی فرمان بیٹے! بد قسمتی سے تمہاری آٹنی چمہ تھوڑا بہت پڑھ لکھ گئی ہیں۔ اس کی سزا ہمیں اور والوں کو ان کے لیکچر سننے کی صورت میں ملتی ہے۔ آج او میاں مہا دانا کا لیکچر کھانا تھنڈا کر دے۔“

اختر صاحب تو لیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کھانے کی میز پر آگئے تو فرمان اور فرید بھی آگئے۔

”ماموں جان آپ یہاں زیادتی کر گئے ممانی جان سے، پتا ہے فرمان ممانی جان فرانس میں پلی۔ اڑی ہیں اور ماموں جان ان کو تھوڑا بہت پڑھی لکھی کہتے ہیں۔“

”بی۔ ایچ۔ ڈی۔“ حیرت سے فرمان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اتنی تعلیم اور اتنی سادگی وہ بڑے سے کدو پنے میں سادہ سے کپڑوں میں، واقعی کم پڑھی لکھی گھریلو خاتون لگ رہی تھیں۔ ان کو واقعی حیرت ساتھ خوشی ہوئی تھی۔

”فرمان بھائی! آپ بھی تو کچھ بولیں ناں۔“ اختر صاحب کا چھوٹا بیٹا محمود فرمان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم کسی کو موقع دو تو کوئی بولے ناں۔“ بڑے مسعود نے اسی کے انداز میں کہا تو وہ چپ ہو گیا۔

”بھئی باتیں تو ہوتی رہیں گی، آج ان کو آرام کرنے دو بیگم ان کا کمرہ اوپر سیٹ کیا ہے یا نیچے؟“

”کمرہ تو اوپر ہی سیٹ کیا ہے، مگر بچہ! ابھی شہر دہلی نے الہ آبادی والی چائے پلائی ہے۔“

”ہاں بھئی، اگر یہ کوئی چیز اچھی پلائی ہیں تو، وہ چائے ہے۔“

اختر صاحب نے مسکراتے ہوئے بیگم کی تعریف کی تو وہ ہنستی ہوئی اٹھ گئیں۔ مزے دار چائے پی کر

لوگ اپنے کمرے میں آگئے، نفیس سا کمرہ نرم گرم بیڈو کچھ کر فرید تو پڑتے ہی گہری نیند سو گئے، مگر فرمان کو اتنی کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ ان پیاروں کی شکلیں نگاہوں میں محو رہی تھیں جو کوسوں دور تھے، نیند تو آ نہیں تھی، انہوں نے نگاہ دوڑائی تو رابینکٹ ٹیبل پر کاغذ اور قلم موجود تھے، انہوں نے باری باری سب کے نام فردا خط لکھے اپنی اداسی کا ذکر کیا اپنی غلطی کو بھی تسلیم کیا کہ میں نے آکر غلطی کی ہے، اور یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ چچا

میرادل یہاں نہیں لگ رہا۔ اس لیے میں جلدی ہی لوٹ آؤں گا۔ یوں اپنی بے قرار یوں کا ذکر کر کے اپنی داغ کا اعلان کر کے وہ پرسکون ہو گئے، سارے خطوط کیے کے نیچے دبائے اور آنکھیں موند لیں تو بی بی جان کی شینا ہمیشہ آنکھوں میں اتر آئی جانے کب وہ ان سے لوری سنتے نیند کی آغوش میں چلے گئے اور صبح کافی دیر تک

سوئے رہے، صبح اٹھے تو جلدی سے دیکھا خاصا اندر میرا تھا۔

”فرید! اذان ہوگئی کیا؟“ فرمان جلدی سے قیص کی آستین اور پر کرتے ہوئے بولے۔

”جناب فرمان صاحب! یہ امریکہ ہے، کوئی اسلامی ملک نہیں کہ آپ کو اذان کی آواز سنائی دے گی۔

وہ بھی اس وقت دس بج رہے ہیں موسم چونکہ ایسا ہے تو۔“

”اوہ! میں تو سب بھول ہی گیا تھا۔“

فرمان سب کچھ یاد کر کے افسردگی سے بولے، ان کو نماز کے چھوٹ جانے کا ملال ہو رہا تھا۔

”چلو ممانی جان ناشتے کے لیے کئی بار پکار چکی ہیں۔“

”ہاں چلو، مگر فرید ذرا محمود کو یہ خط دینا۔ پوسٹ کروے گا پاکستان، رات کو چونکہ نیند نہیں آ رہی تھی میں نے گھر میں خط لکھ ڈالے۔“

فرمان نے خط فرید کی طرف بڑھانے سے خطوط کے پلندے کو دیکھنے لگے۔

”ساری زندگی کے خط ایک ہی بار لکھ ڈالے دیکھوں تو کس کس کو لکھا ہے۔“ فرید شوخی سے بیٹھ کر خط دیکھنے لگے۔

”بی بی جان، آغا جی، رحمن بھائی، یحییٰ بھائی۔ یہ بتاؤ وہ خط پوسٹ کرو گے؟“ فرید نے شوخی سے کہا تو فرمان حیرانی سے ان کو دیکھنے لگے۔

”کون سا خط۔“

”وہی جو تم نے اپنی مگتیر صاحبہ کے نام تحریر فرمایا ہے۔“

”پاگل ہو، میں اسے خط کیوں لکھنے لگا بھلا۔“ فرمان نے جھپٹتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو پھر کون لکھے گا بھلا؟“ فرید نے ان ہی کے انداز میں جواب دیا تو اس سے قبل کہ فرمان کچھ کہتے

حمیدہ بیگم کی آواز پردوں خاموشی سے نیچے آگئے۔



وہاں اگر فرمان بے قرار تھے تو قرار یہاں بھی کسی کو نہیں تھا۔ ابھی سے گھڑیاں گنی جانے لگی تھیں سب سے زیادہ اثر بی بی جان نے ہی لیا تھا۔ فرمان ان کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ وہ بھی اتنی دور چلے گئے، وہ بہت

طولی رہیں۔ اس لیے ساری بہوئیں ان کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگیں۔ عالی تو ہر وقت ہی ان کے ساتھ لگی رہتی۔ اسے بی بی جان سے فرمان کی مہک آتی۔

”بی بی جان! لایے آپ کا سر دبا دوں۔ پاؤں دبا دوں۔“ وہ مکمل ہٹا کر ان کے پیروں کے قریب بیٹھ کر پاؤں دبا رہی تھی۔

”ارے نہیں بیٹی! کہیں تکلف نہیں ہے، درد تو دل میں ہو رہا ہے، جانے میرے بچے نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں وہاں کس طرح رہتا ہے، کسی جگہ ہے۔“

”بی بی جان! آپ کی پریشانی بے جا ہے۔ رحمن بھائی بتا رہے تھے کہ فرید بھائی کے ماموں وہاں رہے ہیں۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں، وہیں دونوں رہیں گے۔“ جو اطلاع چوری چھپے اس کے کانوں نے حاصل کی تھی وہ

مکان نے بی بی جان تک پہنچا دی۔



”کیاں کل ابھی تھیں۔ گو کہ فرمان۔۔۔ باقاعدہ آنے کا نہیں لکھا تھا۔ مگر اس نے ابھی سے انجانی انتظار کی شاہراہوں پر ملن کے دیپ روشن کر دیے تھے۔“

”عابی۔ عابی۔ عابی۔“

”جی بھابی جان۔“ قدسیہ بانو کی تیسری آواز پردہ چوٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”تیسری آواز تمہاری سماعتوں سے ٹکرائی ہے۔“

”یقین چاہیے بھابی جان میں نے سنا ہی نہیں ورنہ میں۔“

”ہاں بھئی اب ہماری آواز کہاں تمہیں سنائی دے گی، ہر وقت تو کسی اور کی آواز سننے کی منتظر رہتی ہو۔“

قدسیہ بانو نے شوخی سے کہا وہ لپکا گئی۔

”اللہ بھابی جان آپ تو بس شرمندہ کر دیتی ہیں۔“ اس نے چہرہ چھپالیا۔

”اچھا چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ عذرا کی امی کی طبیعت خراب ہے، پتا کر آؤ بی بی جان کے ساتھ۔“

”اللہ نہیں بھابی جان! میں اتنی بڑی کب سے ہو گئی کہ جہاں آپ کو جانا چاہیے وہاں میں جاؤں۔“

”عابی خیر سے تمہیں بھی اسی گھر کی بہو بننا ہے، اسی لیے اب تم بھی لکھا کرو۔ سیدہ بھی جا رہی ہے۔ تم بھی جاؤ ہو آؤ گھر میں پڑے پڑے تمہارا دل نہیں اکتاتا۔“

ان کی اتنی وزنی بات کے جواب میں وہ کیا کہتی۔

”جی بہتر ہو جاتی ہوں تیار۔“ اس نے سرخم کرتے ہوئے کہا۔

فرمان واقعی خوش نصیب ہے کہ حکم کی غلام بیوی پائے گا۔“

”بھابی جان!“ عابی نے شرمناکراں کے شانے پر سر نکا دیا۔

♥.....♥.....♥

”بیگم صاحب! عذرا بی بی کے سسرال سے لوگ آئے ہیں۔“

”عذرا دیکھو، بہن صاحبہ ہوں۔“ زاہدہ بیگم نے نقاہت سے کہا۔

”ہاں بی بی جان ہی ہیں سیدہ اور عابی بھی ہیں۔“

عذرا بڑی تیزی سے ان کے استقبال کے لیے باہر کی طرف بڑھیں۔

”آداب بی بی جان!“ انہوں نے بڑھ کر بی بی جان کے ہاتھ تھام لیے۔

”جھٹکی رہو، کبھی ہیں بہن اب؟“ بی بی جان اپنے ہماری وجود کے ساتھ آہستگی سے قدم اٹھا رہی تھیں۔

”بس بی بی جان! بخار بہت تیز ہے، کم ہو کے نہیں دے رہا۔ آئیں۔“

عذرا بیگم نے دروازہ کھولا تو زاہدہ بیگم سیدی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”معافی چاہتی ہوں آپا جان! کہ اٹھ کر استقبال نہیں کر سکتی، آپ یہاں میرے پاس تشریف رکھیں۔“

عذرا بی بی جان کے پاؤں دباؤ تھک گئیں ہوں گی۔“

”چھوڑیں بھی، میرے غروں میں لگ گئیں۔ اپنی سناہے کیا حال ہے۔ بخار تو اب بھی بہت لگ رہا ہے

بی بی جان نے ان کی پیشانی چھوتے ہوئے کہا۔

”آداب خالہ جان!“ سیدہ اور عابدہ نے زاہدہ کے سامنے سر جھکا دیا۔

”بی بی کب تک کسی کو کوئی رکھتا ہے۔ آخر کو پھر کسی اور جگہ تو جائیں گے ناں اور پھر یہ بات مناسب بھی نہیں کہ کسی پر بوجھ بنا جائے۔ جانے اس بچے کے من میں کیا سالی ڈھنک سے دوسرے بھائیوں کی طرح شام کرتا اور ماں کی آنکھوں کے سامنے رہتا۔“

بی بی جان کی بات پر عابی کے رخسار تپ گئے، وہ دوپٹہ درست کرنے لگی۔ اسی وقت مسکراتی ہوئی قدسیہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

”بی بی جان! منہ بیٹھا کرو ایسے تو آپ کو خوشخبری سناؤں۔“

”ارے بی بی! میری ساری مناس تو تم لوگ ہی ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے میرے فرمان کے آنے کی خوشخبری تو ہو نہیں سکتی۔“ بی بی جان کے نزدیک بس خوشخبری فرمان کے آنے کی تھی۔

”اور بی بی جان! یہ ہی خبر ہو تو۔“

”ہاں! اے بی بی تمہارے منہ میں کچھ اور شکر بتاؤ کیا یہ سچ ہے۔“ بی بی جان بے قرار ہو گئیں۔

”یہ دیکھیے بی بی جان! فرمان کے ڈھیر سارے خط آئے ہیں۔ لڑکی تم پردہ کر دو تمہارے منگیترا کاٹا ہے۔“ قدسیہ بانو نے عابی سے کہا تو مارے حیا کے اس کی پلکیں جھٹک گئیں۔

”بھو! لاؤ، جلدی سے سناؤ۔ میرا چشمہ بخت آج مجھ سے ہی گر کر ٹوٹ گیا۔“

اور جب قدسیہ بانو خط سنانے لگیں تو باہر سے بلاوا آگیا وہ باہر کل گئیں بی بی جان نے عابی کے ہاتھ تھام دیا تو عابی یوں شرمائی، گویا فرمان کا ہاتھ تھما دیا ہو، پھر اس نے بمشکل خط پڑھ کر ان کو سنایا۔ ان کو کیا خبر کما کے دل کی کیا حالص ہو رہی تھی۔ خط میں گو کہ اس کا نام تک نہیں تھا مگر خط کے مضمون کی بے قراری اور لفظوں کا تڑپ وہ اپنے نام منسوب کر رہی تھی کہ فرمان نے در پردہ یہ سب اسی کے لیے تو لکھا ہے فرمان کی خط آنے سے گھر بھر میں گویا زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ فرمان نے واپسی کا کہہ دیا تھا۔ عابی کے دل میں ملن کی کوٹلیں کھلنے لگی تھیں۔

”بیگم اب تو خوش ہیں، صاحب زاوے تشریف لا رہے ہیں۔“

”کیوں آغا صاحب! آپ خوش نہیں ہیں کیا؟“ بی بی جان نے مسکرا کر شوہر کو دیکھا۔

”نہیں بیگم! آج پوچھو مجھے فرمان کی اس حرکت سے قطعی خوشی نہیں ہوئی۔“

آغا جی حق کی نال ایک طرف رکھ کر بولے، تو بی بی جان ناراضگی سے انہیں دیکھنے لگیں۔

”کیوں بھلا؟“

”اس لیے کہ فرمان مستقل حراج نہیں، فیصلوں میں چٹکی اور اراووں میں استحکام نہیں اور ایسے لوگ دعا میں زیادہ کامیاب نہیں ہوتے، یہاں سے اسے جانے کی بھی جلدی تھی اور وہاں سے آنے کی بھی بے قراری

، بتاؤ۔ بھلا کیا تک ہے، ایسے جذباتی پن کی۔ فیصلہ کیسا ہی کیوں نہ ہو انسان کو چاہیے کہ جب وہ فیصلہ کرے تو پڑا رہے بہر حال مجھے فرمان کا یہ جذباتی رویہ قطعی پسند نہیں آیا۔“ آغا جی کے چہرے پر سختی کے آثار دیکھ کر بی

جان چپ بی رہیں، ورنہ بیٹے کی آمد پر آغا جی کی ناگواران اور کو پسند نہیں آتی تھی۔ آغا جی مرد تھے وہ بھی اصولی کے وہ ایک ماں کے جذبات کو نہیں جان سکتے تھے مایک چاہنے والی کے احساس کو محسوس نہیں کر سکتے جو فرمان

تمام تر بے اعتنائیوں کے باوجود اپنی ہر سانس ہر دھڑکن فرمان کی امانت سمجھتی تھی۔ وہ کس قدر خوش ہے۔ مگر

”ارے جیتی رہیں میری پیاری بیٹیاں آئی ہیں، کم بخت بخاری وجہ سے کچھ نظر بھی نہیں آ رہا۔ یہ تو عالم ہے، ماشاء اللہ پہلی بار آئی ہے میرے گھر۔“ زاہدہ بہت خوش ہوئی خصوصاً عالی کو دیکھ کر۔

”آپا یہ دوائیں میں۔ اودھ آپ!“ شہزادہ جوانی دھن میں بولتا ہوا آ رہا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی پہلے عالی پر اٹھی تو کچھ دیر کے لیے جھکتا بھول گئی۔ گہرے سبز رنگ کے سوٹ اور اپنے انداز میں دوپٹہ پیشانی کے لیے وہ جتنی مقدس لگ رہی تھی۔

”آداب بی بی جان۔ اودھوز ہے نصیب آج تو سیدہ بھابھی ہمارے غریب خانے پر جلوہ افروز ہیں۔ بی بی جان کو آداب کرنے کے بعد وہ سیدہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا، کن اکیوں سے عالی کو بھی دیکھا جی آمد کی وجہ سے مزید سٹ گئی تھی۔

”آپا! میں اپنے کمرے میں ہوں۔ کوئی بات ہو تو بلا لیجیے گا۔“ وہ عالی کو سننا دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیوں میرا آنا اتنا گوار گزار شہزادہ بھائی! تم اٹھ کر ہی چل دیے سیدہ نے شکایتی نظروں سے شہزادہ کو دیکھا۔

”کیوں گناہ گار کرتی ہیں بھابھی جان! ہماری آمد آج بڑے چمن کے لیے کیا وقت رکھتی ہے یہ شاید جان سکیں۔“ شہزادہ نے زخمی نگاہوں سے عالی کو دیکھا، جس نے اپنا چہرہ گھونٹ میں اس قدر چھپا لیا تھا کہ اس کے باوجود کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی، تو اس سے بڑھ کر شہزادہ کے لیے کیا اذیت ہوتی کہ اس کے دل کی بستی محبت سے آباد ہے وہ ہی اس سے اس قدر گریزاں ہے اسے فرمان پر رشک آنے لگا، جس کے نام کی انگوٹھی حسین محرومی انگلی میں جگ کر اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی۔ وہ قلب خریں کو لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔

اسی وقت دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

”جی آپا جان کیا بات ہے۔“ وہ عذرا کو دیکھ کر بولا۔

”شہزاد! ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے اور بی بی جان وغیرہ کو تم چھوڑ آؤ۔“ کیونکہ رحمن کا فون آیا تھا

فرمان کا فون آنے والا ہے۔“

”جی بہتر۔“ کچھ دیر کے لیے سبھی اس سنگری سنگت پھر سے میسر آ رہی تھی، وہ دل سے انشتی خوشی کی لہر کے سنگ ابھرتا ہوا بولا۔

”شہزاد بیٹا! جتنی جلدی سے جلدی پہنچا سکتے ہو، پہنچا دو، میرے بچے کا فون آنے والا ہے، لگتا ہے مدت سے اس کی آواز کانوں میں نہیں پڑی۔“ بی بی جان بڑی بے چینی سے بول رہی تھیں۔

”میرا بس چلے تو بی بی جان پاکستان سے امریکہ کے فاصلے کو چٹکیوں میں بدل دوں تاکہ آپ سب لانا کو دیکھ سکیں مل سکیں۔“ دروازہ بند کرتے ہوئے شہزاد نے گھیسری آواز میں کہا نگاہیں گھونٹ کی اوٹ تھا حسین چہرے کو تلاش کر رہی تھیں۔

”ہاتھ ہٹائیے پلیز۔“ عالی کی آواز کے جلتے گونج اٹھے تو شہزاد چونک گیا اور فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔

میں جانے کب دروازے پر رکھے، عالی کے ہاتھوں پر وہ ہاتھ رکھ چکا تھا۔ یہ حرکت نادانستہ دل نادان تھی کہ اس کے پیچھے کوئی چھپی خواہش تھی، کوئی محرومی تھی۔

”سوری۔ ویری سوری مجھے قطعی احساس نہیں ہوا۔ آپ پلیز مائنڈ نہ کریں۔ اسے میری دانستہ گستاخ سمجھنیے گا۔“

وہ بہت نادم ہو رہا تھا۔ اس کی سنگت میں ایک اور سفر کرنے کا خوش کن خیال اس غلطی کی نذر ہو گیا تھا۔ جانے عالی کیا خیال کر رہی ہوگی کہ میں اتنا ہی کم ہمت ہوں کہ یہ حرکت کر بیٹھا۔ اس نے سائیڈ مرر سے دیکھا ٹھنیری ٹیکس شہابی، رخساروں پر سایہ فگن تھیں اس نے گہرا سانس لیا۔ اور سانس دیکھنے لگا دل بار بار دعا کر رہا تھا کہ یہ سفر ساری زندگی پر محیط ہو جائے اور زندگی تمام ہو جائے۔ مگر ان لوگوں کو یہ سفر گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ وقت کتنا عجیب ہوتا ہے کوئی اس کے ٹھہر جانے کی دعا کرتا ہے اور کوئی اسے جلدی ختم ہونے کی بددعا دیتا ہے، بی بی جان اور عالی کے لیے یہ سفر بہت طویل ہو گیا تھا خدا خدا کر کے فاصلے سمٹے گھر آیا۔ تو شہزادان کو چھو کر خود واپسی کے لیے تیار ہو گیا۔

”شہزاد! کھانا کھا کر جانا۔“

”نہیں بھابھی جان! ایک تو بالکل طلب نہیں دوسرے امی جان کو دوا کے بارے میں سمجھانا ہے۔“ شہزاد واپس آ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ زاہدہ بیگم چونکہ سو گئی تھیں۔ اس لیے وہ ابھی لیٹا تھا کہ عذرا بیگم آ گئیں۔

”آئی آپا جان!“ شہزاد اٹھ کھڑا ہوا ان کو اپنے پاس جگہ دی۔

”اب کیا ارادے ہیں شہزاد تمہارے؟“ عذرا بیگم اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”کیسے ارادے؟“ شہزاد حیرانی سے ان کو دیکھنے لگا۔

”بنو مت تمہیں پتا ہے، امی جان کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے، وہ جلد از جلد تمہاری اور بہنہادی کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ بہنہاد تو بچہ اکر شریف جہاں کہیں گے مان جائے گا۔“

”جی ایک بد معاش تو میں ہی ہوں۔“ شہزاد نے شکایتی نظروں سے بہن کو دیکھا۔

”یہ بات نہیں شہزاد! اب تم بتاؤ خاندان میں بھی لڑکیاں ہیں اور خاندان سے باہر ابھی، جہاں تم کہو گے۔ وہیں ہم کر دیں گے۔“

”آپا۔ اب تو میری مرضی میری خواہش رہی ہی نہیں۔ اچھا بتائیں کیا ضروری ہے کہ ہر کوئی شادی کرے شادی کے بغیر بھی تو انسان زندہ رہ سکتا ہے اور پھر امی جان کے چار بیٹے ہیں۔ تین شادی شدہ ہوں گے، چوتھا نہ بھی کرے تو کیا فرق پڑتا ہے۔“

”شہزاد تمہیں سوچنا چاہیے۔“

”آپا جان! میں ذرا خود غرض واقعی ہوا ہوں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے بھی اسی شدت کے ساتھ چاہے جیسے میں چاہتا ہوں۔“ شہزاد اٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔

”حیرا تمہیں اتنی ہی شدت سے چاہتی ہے جتنی شہزادہ نے تم عالی کو چاہت ہو۔“

”آپا! آپ نے مجھے اتنا ہی بے انصاف سمجھ رکھا ہے کہ میں کسی اور کو چاہتا ہوں اور حیرا مجھے، میں تو اسے جواب میں کچھ نہیں دے سکتا ناں، یہ تو سراسر زیادتی ہے۔“

”شہزاد! حیرا ماموں جان کی انگوٹھی بیٹی ہے اور پھر ہماری بہن اس کے بھائی کے گھر میں ہے، ماموں جان نے محض تمہاری خاطر حیرا کو اعلیٰ تعلیم حاصل دلوائی کہ تم باہر سے پڑھ کر آ رہے ہو۔ اب تک وہ انتظار کر رہے ہیں۔ وہ تو تمہاری ضد اور خواہش کے لیے میں نے اور امی جان نے سوچا کہ ماموں جان کی ناراضگی مول لے

لیں گے مگر جب تمہاری بھی خواہش پوری نہیں ہوئی تو ان کی تو ہونی چاہیے ناں۔ اور پھر گھر کی لڑکی خوبصورت تعلیم یافتہ سب سے بڑھ کر تمہیں چاہتی ہے۔“

”آپ درست کہہ رہی ہیں مگر آپا! میں حیرا کے لیے خود کو تیار نہیں کر سکتا۔“

”چلو نہ سہی، حیرا۔ کسی اور کو دیکھ لیتے ہیں۔“

”نہیں آپا! عالی کے بعد سب لڑکیاں ایک جیسی ہیں۔ کسی میں کوئی فرق نہیں مجھے شادی کرنی ہی نہیں۔“

عالی کے نام کی ایک نئیں رگ دوپے میں سرایت کر گئی شہزاد نے سرکھڑی سے نکا دیا تو عذرا بیگم دھکی ہو گئیں، ان کے عزیز بھائی نے ایک ہی خواہش کی وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب چل آئیں۔

”انسان کی زندگی میں اسی طرح کے شیب و فراز آتے رہتے ہیں شہزاد! کہ ہم کسی کوشد توں سے چاہے ہیں اور وہ ہمیں نہیں ملتا اور جس کے متعلق ہم سوچتے بھی نہیں، ہمیں اس کے ساتھ زندگی گزارنا پڑ جاتی ہے، ہمیں کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑے گا، تمہیں معلوم ہے۔ ظہیر ماموں کس قدر سخت ہیں اور شہباز تو بہت زیادہ غصے والا ہے، ماموں جان اور امی جان کے درمیان حیرا کے سلسلے میں بہت عرصہ قبل ہی بات ہو چکی تھی تب ہی تو انہوں نے حیرا کو اپنی مرضی کے خلاف اتنی تعلیم دلوائی محض تمہاری خاطر اور اب جب یہ موقع آیا ہے تو ہم انکار کر دیں ان کو کس قدر دکھ ہوگا۔ اور پھر انہوں نے اپنی تمام جائیداد کو اپنی زندگی ہی میں دونوں بچوں شہباز بھائی اور حیرا میں برابر تقسیم کر دیا ہے اور وہ کسی صورت میں بھی جائیداد خاندان سے باہر جانے نہیں دینا چاہتے۔“ عذرا کا یہ کہہ تھا کہ شہزاد تورا کر مڑا۔

”دولت، جائیداد آپا کیا سمجھ رکھا ہے، آپ لوگوں نے اس مادی شے کو عالی مجھے اس لیے نل سکی کہ گھر کی جائیداد باہر نہ جائے اور حیرا سے نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس لیے شادی کروں کہ خاندان کی دولت باہر نہ جائے میں انسان ہوں آپا پتہ نہیں کہ کبھی دولت جائیداد کی وجہ سے ٹھکرایا جاؤں اور کبھی اسی دولت جائیداد کو باہر جانے سے روکنے کے لیے ذرا محال بنایا جاؤں آپا! پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

شہزاد نے آپا کے شانے سے سر نکا دیا تو وہ بھی دھکی ہو گئیں۔ شہزاد ان کا سب سے چھوٹا بھائی تھا اور جو خواہش اس کے منہ سے نکلنے سے قبل ہی پوری ہو جایا کرتی تھی۔ مگر زندگی کی اتنی بڑی خواہش پوری نہ ہونے پر وہ نوٹ گیا تھا۔ انکے اختیار میں ہوتا تو عالی کو ساری دنیا سے چھپا کر اپنے بھائی کی دلہن بنا دیتیں اور بات بھی تو وہ درست کر رہا تھا کہ جائیداد کی وجہ سے عالی اسے نہ لیتی تھی۔



”میں کہتی ہوں بیٹی کو گھر پر ہی بوڑھا کرنے کا ارادہ ہے، بہن سے بات کیوں نہیں کرتے۔“

صدیقہ نے شوہر کو دیکھا جو پہلے ہی گھر سے سوچوں میں تھے۔

”کمال کرتی ہو بیگم! اب میں خود جا کر بہن سے کہوں کہ میری بیٹی کو بہو بنا لو۔ ارے ان کو خواہش ہوگی خود آئیں گے اور پھر پھل بار پھر میں کیا تھا زائدہ کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ تو تیار ہیں مگر شہزاد نے چاہتا۔ اسی لیے انہوں نے بہانا بنایا کہ فی الحال وہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

ظہیر صاحب نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”مگر باباجی! پھوپھو جان سے تو یہ بات آپ کافی عرصہ قبل طے کر آئے تھے، اب جا کر کہیں ہم شادی کر

چاہتے ہیں۔ ہم نے ان کی وجہ سے ایک سے ایک اچھا رشتہ واپس کر دیا اور اب وہ بخرے کر رہے ہیں۔ آخر کیا کی ہے میری بہن میں۔“ اندر آتے شہباز بھی ساری بات سن چکے تھے اس لیے ماں کے قریب ہی آکر بیٹھ گئے۔

”ہاں بیٹے! تم بھی درست کہہ رہے ہو مگر میں بیٹی کا باپ ہوں۔ بار بار تو نہیں کہہ سکتا ناں۔ میرا خیال ہے شہزاد ہی نہیں مان رہا اور نہ تو سب بہت خوش ہیں۔“

”کیسے نہیں مانا شہزاد ہم نے اپنی روایات کے خلاف صرف اس کی خاطر حیرا کو ہوٹل میں بھیج کر تعلیم دلوائی اور اب وہ مان نہیں رہا۔ میں دیکھ لوں گا شہزاد کو۔“

شہباز جوش میں کھڑے ہوئے گئے ایک تو وہ تھے ہی کہ تعلیم یافتہ دوسرے ان کی ذہنیت بھی جاگیر دار نہ تھی۔

”جوش اور غصے میں آنے کی بات نہیں بیٹے ہم نے کون سا باقاعدہ منگنی یا نکاح کر رکھا ہے ٹھیک ہے اگر نہیں مانا تو نہ سہی ہماری بیٹی کو رشتوں کی ایسی کیا کی ہے، آج نام لیں تو اچھے رشتوں کے ڈھیر لگ جائیں۔“

ظہیر صاحب نے شہباز کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے تسلی دی۔

”کیوں ہم حیرا کا کہیں اور کریں گے، ہماری اتنی جائیداد کس اور خاندان میں چلی جائے گی کوئی اور میرا شریک ہو۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے برابر آگے تو صرف شہزاد اور وہ کوئی نہیں۔“

شہباز کے ارادے بڑے خطرناک تھے وہ تو بڑے جوش اور غصے میں تھے ظہیر صاحب نے بیوی کو دیکھا اور نظروں سے غیظوں میں شہباز کو سمجھانے کے لیے کہا۔

”شہباز بیٹے! یہ تو صرف ہماری قیاس آرائیاں ہیں ہو سکتا ہے، ان لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ ہم شہر جائیں گے آپا سے بات کریں گے۔ اس کے بعد دیکھی جائے گی۔“

صدیقہ بیگم نے شہباز کو پاس بٹھا کر نرمی سے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے آپ بات کریں چھوپو سے اور یاد دہانی بھی کرادیں کہ ان کی بیٹی میرے گھر میں ہے۔“

شہباز یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے اور دروازے کے ساتھ گلی منظرہ تھرا کر رہ گئیں، کیونکہ وہ شہباز کی فطرت کو بڑی اچھی طرح جانتی تھیں اور شہزاد کے بارے میں ہندو بیگم نے ان کو ساری صورت حال آگاہ کر دیا تھا۔

”خدا یا میری لاج رکھنا۔ میرے تین بچے ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو ساتھ لگا کر رو پڑیں۔“

”بھابھی جان! آپ افسردہ کیوں ہوتی ہیں۔ مگر بہتر کرے گا۔ اگر شہزاد مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو

اس میں نہ ان کا قصور ہے اور نہ ہی کسی اور کا، دل پر تو کسی کو بھی اختیار نہیں ہوتا نہ مجھے اپنے دل پر اختیار ہوگا اور نہ ہی شہزاد کو اپنے دل پر اختیار ہوگا قصور وہ تو کوئی بھی نہیں۔ تقدیر سے لڑا تو نہیں جاسکتا۔ آپ فکر نہ کریں میں خود بات کروں گی بھائی جی سے اگر انہوں نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو۔“

حیرا نے منظرہ کو ساتھ لگا کر سمجھایا تو کتنی بے نام سے آنسو اس بھابھی کے بالوں میں جذب ہو گئے، جس کا بھائی اس کی دھڑکنوں کا عنوان بن گیا تھا۔ حیرا کو سب باتیں پتا چل گئی تھیں کہ شہزاد کیا چاہتا ہے یہ جان کر دل پر کیا قیاس لگائی تھیں۔ یہ وہ ہی جانتی تھی اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ گاؤں کے اسکول میں آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی تو گرمیوں کی چھٹیوں میں ابابھی کے ساتھ شہر پھوپھو کے ہاں گئی تھی، وہ باہر سے آ رہی تھی تو اس نے سنا تھا کہ ابابھی اور پھوپھو اسی کا نام لے رہے تھے۔

”ظہیر بھائی! آپ نے میری منظرہ لی ہے تو میں بھی آپ سے شہزاد کے لیے حیرا کو لینے آؤں گی۔“

”یار! اس میں میرا کیا قصور ہے بھی میں نے تو نہیں کہا تھا کہ یونیورسٹی والے ایڈمیشن نہ دیں مجھے تو بہت شوق تھا یہاں پڑھنے کا۔“ فرمان بڑے سکون سے میگزین رکھتے ہوئے بولے۔

”ہونہ شوق تھا ہر وقت لڑکیوں کی طرح بسورتے جوتے تھے، اللہ نے ناشکر کی سزا دی ہے، اچھا ہے میں آغا جی سے کہوں گا بس اس کی سزا یہ ہے کہ اس کی جلدی سے شادی کر دی جائے۔“

”فرید کو فرمان پر بہت غصہ آ رہا تھا جیسے ایڈمیشن نہ ملنے میں ان ہی کا ہاتھ ہو۔“

”ایسا غصہ نہ کرنا دوست آغا جی تو پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں دائیں بائیں نہیں دیکھیں گے اور میں اتنی جلدی شادی کے موڈ میں نہیں، شادی کے بعد تو زندگی بالکل ڈل ہو جاتی ہے۔“

”تم تو شادی سے پہلے بھی ڈل لائف ہی گزار رہے ہو۔“ فرید خار کھائے ہوئے تھے۔

”ہاں فرید جب تم ہاتھ روم میں تھے تو محمود کا فون آیا تھا کہ آج رات کرہم لوگ ان کے ہاں کھانا کھائیں گے ماموں جان نے تاکید کی ہے۔“

فرمان اور فرید نے چند ہفتوں بعد ہی اپنی الگ رہائش کا بندوبست کر لیا تھا۔ فرید کے تو خیر وہ ماموں تھے مگر فرمان اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ کسی پر بوجہ بن جائیں، اس لیے فرید کو فرمان کی وجہ سے الگ ہونا پڑا تھا۔ پھر بھی روز ہی ان کے ہاں جانا ہوتا۔ مسعود، محمود، زیادہ تر ان کے پاس رہتے، اختر اور بیگم اختر بھی روز آتے ان کا بہت خیال رکھتے۔

”اچھا مس سوزی کو تانا نہ بھولنا پتا ہے پھیلی بار جب ہم گئے تھے بیچاری ساری رات سوئی نہیں تھی کہ کب ہم لوگ آجائیں اور دروازہ کھولنا پڑے۔“

”ویسے یار! مس سوزی ہے اچھی، بہت خیال رکھتی ہے ہمارا۔“ فرمان نے مس سوزی کی تعریف کی۔

”ہمارا نہیں صرف تمہارا۔“ فرید نے شوخی سے فرمان کی طرف دیکھا۔

”چھوڑو یار! بزرگ خاتون کے لیے ایسی بات نہ سوچو۔ ویسے یار مس سوزی نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔“

”ظاہر ہے تمہارے انتظار میں۔“ فرید مسلسل شوخ موڈ میں تھے۔

”فرید کے بچے۔“ فرمان نے دو تین گھنٹوں پھر فرید کی طرف اچھال دیے۔

مس سوزی اختر صاحب کی جاننے والی تھیں پختہ عمر کی مس سوزی اکیلی ہی رہتی تھیں ان کی ذہنی اسٹوری گویا تھی، نیچے وہ خود رہتیں اور اوپر والا پورشن کرائے پر دیہیں اختر صاحب نے اوپر والا پورشن فرمان اور فرید کو دلوایا تھا۔ مس سوزی ان دونوں سے بہت خوش تھیں دونوں چونکہ انگلش بہت اچھی بولتے تھے اس لیے وہ ابھی خوش تھیں فارغ وقت میں ان کو نیچے بلا لیتیں اور وسیع لان میں چٹائی گھاس پر ایزی چیئر پر بیٹھ کر وہ تینوں دنیا جہاں کی باتیں کر جاتے مس سوزی کی معلومات بہت زیادہ تھیں خصوصاً پاکستان کے بارے میں ان کی معلومات حیرت انگیز تھیں دونوں بہت متاثر ہوئے تھے۔

”مس سوزی! ماموں کے گھر ہماری دعوت ہے ہم دیر سے آئیں گے۔“

فرید اپنے پورشن کی چابیاں مس سوزی کو دیتے ہوئے بولے۔

”اوکے! میں کب تک انتظار کروں۔“ وہ چابیاں لیتے ہوئے بولیں۔

”ارے بھی زادہ! تم ابھی سے حیران کر رکھو، ہمیں کوئی اعتراض نہیں اچھا ہے اپنے پاس رکھو اپنی مرضی کا تعلیم دلو اور شہری ماحول کے مطابق ذہال لو ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں۔“

ابا جی نے بڑے مان بھرے انداز میں اسے بچپن ہی میں پھوپھو کو سوپ دیا تھا۔ مگر صدیقہ بیگم کو یہ بار نہیں بھائی تھی۔

”میری ایک ہی بیٹی ہے، زادہ جب وقت آئے گا تو لینے آ جانا ابھی تو میں نہیں دیتی۔“

”چلیے بھابھی جیسی آپ کی خوشی۔“ اور یوں یہ بات اس کے ننھے سے ذہن میں محفوظ ہو گئی اور وہ شہر سے خود بخود ہی جھپکنے لگی وہ بات بھی کرتا تو شرماتا اور پھر جیسے جیسے وہ بڑی ہوئی شہرادی کی چاہت بھی پروردگار جی جی رہی جب شہر ادا امریکہ جا رہے تھے تب وہ کتنا رونی تھی چھپ چھپ کر، ابا جی نے اسے شہر میں اچھے سے کالج میں داخل کر دیا وہ بہت شوق سے دل لگا کر پڑھتی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ واقعی اسے تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا بلکہ وہ شہر کے قابل بننے کے لیے دن رات پڑھتی محنت کرتی اور ہمیشہ امتیازی نمبروں سے پاس ہوتی اور جب اس کی چاہت کا پودا پروان چڑھ چکا تو شہر ادا نے اسے بے دخل کر دیا اس کی محبت کی دھنک بکھر گئی، شہر نے اپنی چاہتوں کے تمام رنگ عالی کی مانگ میں سجا دیے تھے، وہ اب سوئی مانگ لیے سسک رہی تھی، مگر وہ غریب نہیں تھی کہ اپنی محرمیوں کی سزا کسی اور کو دیتی وہ ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیار تھی۔



فرمان کے ہر ہنسنے خط آرہے تھے اور ہر خط میں وہ اپنی بے قرار یوں کا ذکر کرتے، بی بی جان تو ان کے آنے کے دن گن رہی تھیں، مگر اس بار جب فرمان کا فون آیا تو آغا جی نے ان کو سختی سے ڈانٹ دیا۔

”فرمان! یہ کیا تم نے عورتوں والی جذباتی کرکٹیں کر رکھی ہیں، اگر جذبات پر اٹھنا نہیں تھا تو جانے کی ضرورت تھی۔ یہیں پڑھنا کھانا پڑھنے یا کوئی اور کام کرتے، میں جانتا تھا اسی لیے میں نے تمہیں اجازت نہیں دی تھی مگر تم نے بیچاری عالی بیٹی کو ڈال کر اجازت لے لی۔ اب اطمینان سے تعلیم حاصل کرو جو کرنے کے تھے وہ کرو۔ اور اگر نہیں کرنا تو فوراً واپس آ جاؤ۔“

آغا جی کا فرمان کے ساتھ یہ سخت رویہ کسی کو نہیں بھایا تھا۔ بی بی جان تو باقاعدہ ان سے ناراض ہو گئی تھیں مگر آغا جی کسی کمزوری کو نہیں مانتے تھے اور نہ ہی ایسی باتوں کو پسند کرتے تھے خصوصاً مردوں کا جذباتی ہونا ان کو بالکل پسند نہیں تھا۔



دو ماہ ہو چلے تھے ان کو آئے ہوئے مگر مجال ہے جو امریکہ کے آزاد ماحول یا کسی رنگینی نے فرمان کو متاثر کیا ہو۔ وہ کسی وقت بھی واپس جاسکتے تھے، وہ تو فرید کے ماموں جان اور آنٹی وغیرہ بہت اچھے تھے ان کا بہرہ خیال رکھتے تھے مگر ان کا دل نہیں لگتا تھا پھر کچھ انگوٹھیاں یونیورسٹی میں ایڈمیشن میں دقت ہو رہی تھی فرید تو انسرا ہو گئے مگر فرمان بہت خوش ہوئے کہ چلو آغا جی کو یہ جواز تو پیش کیا جاسکے گا کہ جب ایڈمیشن ہی نہیں ملا تو وہ دہلا کیا کرتے جب سے پتا چلا تھا وہ بہت خوش تھے۔

”بڑی خوشی ہو رہی ہے، یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے، خوشست ڈال دی تھی۔“

فرید فرمان سے ناراض تھے کہ ان کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔



”مس سوزی! ہم فون کر کے بتا دیں گے اگر نہ آنا ہوا تو۔“

”اوکے گڈ بائے۔“ مس سوزی ہاتھ ہلاتی اندر چلی گئیں۔

”آداب ممانی جان! فرید اور فرمان جیدہ بیگم کے سامنے تھوڑا سا جک گئے۔

”جیتے رہو بیٹا۔ ماشاء اللہ آج تو فرمان بیٹا کافی فریش لگ رہا ہے۔“ حیدہ بیگم نے پیار سے فرمان کو دیکھا

”یہ گلاب واہسی کی تیاری سے کھلے ہیں ممانی جان!“ فرید نے ان کی خوشی کی وجہ بتائی۔

”کہاں واہسی ابھی تو آئے ہوتے لوگ۔“ وہ حیرانی سے بولی

”یہ پاکستان واپس جا رہے ہیں ممانی جان! اس لیے خوش ہیں۔“

”مگر کیوں میاں صاحب زادے؟ واپس کیوں؟ وہ تمہارا شوق کیا ہوا؟“

”مگھتیر کی یاد میں ہوا ہو گیا۔“ فرید نے آہستگی سے فرمان کے کان میں کہا تو فرمان کے نے انہیں گھبراہٹ

”انکل! شوق تو اپنی جگہ موجود ہے مگر جب ایڈمیشن ہی نہیں مل رہا تو پھر یہاں رہ کر کیا کرنا۔“

یہ کہتے ہوئے فرمان خود کو بڑا پرسکون اور سرخرو سامحوس کر رہے تھے، کہ انہوں نے تو اپنا فرض پورا

اب۔ ایڈمیشن نہ ملے تو وہ کیا کریں۔

”تم لوگوں کو کس نہ کہہ دیا کہ ایڈمیشن نہیں مل سکتا۔“ آخر صاحب نے چشمہ اتار کر فرمان کو دیکھا۔

”جی ہم لوگ خود گئے تھے۔“ فرمان آہستگی سے بولے۔

”حق ہیں آپ دونوں، جب میں یہاں موجود ہوں تو مجھے کیونکر نہیں بتایا بہر حال تم دونوں کا ایڈمیشن

میا ہے میں تم لوگوں کی کارکردگی دیکھنے کے لیے خاموش تھا۔“

”مگر انکل! انہوں نے تو ہمیں صاف منع کر دیا تھا۔“ فرمان کا منہ لٹک گیا ایک تو آخر صاحب نے اپنی

کابند و بست کر دیا تھا۔ دوسرے آغا جی کے خاصے ڈانٹ بھرے خط اور فون آنچکے تھے۔ کہ جب ایڈمیشن نہیں

تو جلدی سے واپس آ جاؤ۔ وہ خوش تھے کہ آغا جی نے خود یہ بات کہہ دی مگر اب پھر خوشی ماند پڑ گئی تھی۔

”لیکن میں نے جس شخصیت کو تم لوگوں کے ایڈمیشن کے لیے کہہ رکھا تھا۔“ یونیورسٹی والے ان کو اٹھ

کر سکتے تھے۔“

”واہ ماموں جان کون سی ہستی ہے آپ نے ہمیں ایڈمیشن کا پہلے کیوں نہیں بتایا۔ مجھے تو خاصا دکھ

کہ ہم نا کام لوٹ جائیں گے۔“ فرید کو بے حد خوشی ہو رہی تھی، ایڈمیشن کا سن کر۔

”بھئی ہتا نہیں تم آج کل کے نوجوان چاہتے کیا ہو، کوئی خاص مقصد نہیں ہے زندگی گزارنے کا نہ

میں پچھلی ہے۔ نہ ارادوں میں استحکام۔ ارے بھائی انسان جس چیز کی طلب کرے جس بات کا ارادہ کرے

ہر حال میں پورا کرنے کی کوشش کرے، ہم لوگوں کو تو کامیابی پلیٹ میں دھری ملتی چاہیے، ویسے تو میرا

دونوں کے لیے ہے مگر فرمان کے لیے خصوصاً۔ کیونکہ کل ان کے والد صاحب کا میرے پاس فون آیا

شکایت کی ہے کہ فرمان غیر مستقل مزاجی کا شوبہ دے رہے ہیں، مگر میں جذباتی خط لکھتے ہیں جس سے

خواتین خصوصاً ان کی والدہ پریشان رہتی ہیں فرمان بیٹے! مردوں کو کم از کم جذباتی نہیں ہونا چاہیے، اس

میں تسلی کے خط لکھو کہ تمہارا دل لگ گیا ہے، اب تو ایڈمیشن بھی ہو گیا۔ تم لوگ تو خوش قسمت ہو کہ تمہارے

مالی اعتبار سے اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ تم لوگوں کو باہر بھیج کر تم لوگوں کا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ وہ لوگ

ہیں جو شوق اور لگن رکھنے کے باوجود یہ سب حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے اب میں امید کرتا ہوں کہ تم سیٹ ہو جاؤ  
تم، ٹھیک ہے انسان پہلی بار گھر والوں سے جدا ہوا تو جذباتی ہو جاتا ہے، لیکن اب تم گھر تسلی کا خط لکھو کہ میں سیٹ  
ہو گیا ہوں اور اسٹڈی شروع کرنے لگا ہوں۔ اپنی والدہ کو مطمئن ضرور کر دو۔“

آخر صاحب سمجھا رہے تھے، اور فرمان شرمندہ ہو رہے تھے، کہ انہوں نے تو بچوں والی حرکت کر ڈالی کہ

سب کو پریشان کر دیا۔ اپنے شوق کی خاطر دوسروں کو پریشان کرنا نامناسب ہی تو تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب

وہ جس مقصد کے لیے آئے تھے، وہ پورا کر کے ہی جائیں گے، ورنہ تمام عمر آغا جی کم ہمتی کا طعنہ دیتے رہیں گے۔

”انکل! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ فرمان نے مضبوط سچے میں کہا۔

”ویل ڈن یہ ہوئی ناں مردوں والی بات، مگر والوں کو بھی مطمئن کر دینا۔ کل تم لوگ میرے ساتھ

یونیورسٹی چلنا میں جبار بیگ سے تم لوگوں کی ملاقات کرادوں گا۔“

”ماموں جان یہ کون صاحب ہیں؟“

”یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے تم لوگوں کا ایڈمیشن کر دیا ہے۔“

”یہ پاکستانی ہی ہیں ناں انکل کہ۔“

”ہاں پاکستانی ہیں کچے پاکستانی ہیں ایک عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں یہیں انہوں نے تعلیم حاصل اور

یہیں پڑھا رہے ہیں۔ دیکھ لو ویسے بھی باہت لوگ ہیں کہ ایک پاکستانی انگریزوں کو انگریزی پڑھا رہا ہے، انگلش

کے استاد ہیں جبار صاحب۔“

”ماموں جان! یہ وہ تو نہیں جو ایک بار پوری فیملی کے ساتھ پاکستان میں ہمارے گھر بھی آئے

تھے۔“ فرید ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولے۔

”تمہیں یاد ہے! تم تو خاصے چھوٹے تھے اس وقت، ہاں وہی ہیں چلیں گے کسی وقت۔ بڑے اچھے

دوست ہیں۔ بہت عمدہ اخلاق کے مالک ہیں۔“ آخر صاحب جبار صاحب کی تعریف کر رہے تھے۔

”انکل! کسی وقت کیوں! آج ہی کیوں نہیں؟“ فرمان کو بھی ان سے ملنے کا شوق ہو رہا تھا۔

”ابھی تو مجھے کچھ کام ہے، پھر کسی وقت چلیں گے، ہاں اپنے ڈاکومنٹس تیار رکھنا تم لوگ۔“

”جی بہتر۔“ واہسی پر فرید تو بہت خوش تھے مگر فرمان اپنے فیصلے سے خوش تو نہیں البتہ مطمئن ضرور

تھے، انہوں نے دل میں ایک مضبوط فیصلہ کر لیا تھا اور اسی پر کاربند رہنا چاہتے تھے، وہ اب خود پر کم ہمتی بزدلی اور

جذباتی مرد ہونے کا الزام برداشت نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے گھر بھی تسلی بھرا خط لکھ دیا تھا کہ وہ اب سیٹل ہو

گئے ہیں ان کا ایڈمیشن ہو گیا ہے۔



فرمان کے اس خط نے جہاں آغا جی کو خوش کر دیا تھا، بھائیوں کو مطمئن کر دیا تھا، وہاں گھر کی خواتین کو

افردہ بھی کر دیا تھا۔ بی بی جان تو فرمان کی واہسی کے دن گن رہی تھیں۔ مایوس ہو گئیں۔ انہوں نے کسی بھی

طرح اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔ مگر ایک ایسی ہستی بھی تھی جو اپنی ذات کے گہد میں متعین خوابوں کی دلیز پر بیٹھی

انتظار کے خار چکوں سے چن رہی تھی۔ اس کے پاس تو سوائے ایک بے جان انگٹھی کے کچھ بھی نہیں تھا نہ کوئی

منہ کی نظر نہ دل کے تاروں کو چھو جانے والی گہری بات کہ وہ اپنی تہائیوں کو اسی کی لٹائوں میں گزارے، کوئی

بھاری کھمباتار تے ہوئے ڈرتے ڈرتے شوہر کو دیکھا۔

”کیوں؟“ شہباز پنگ پرچوڑی مار کے بیٹھ گئے اور ان کو خشکیں لگا ہوں سے دیکھنے لگے۔

”اس لیے کہ شہزاد کو حیرا کے ساتھ شادی کے لیے تیار کر سکوں۔“

”ہاں تیار کر سکویں! حیرا شادی کے لیے حیرا انگڑی، انڈی ہے، عیب دار ہے جو تم شہزاد کو اس کے ساتھ شادی کے لیے تیار کرو گی۔“ شہباز دھاڑے تو وہ ہم گئیں۔

”خدا نہ کرے شہباز! حیرا میں کیوں کوئی نقص ہونے لگا، میں اسی لیے تو جانا چاہتی ہوں کہ معلوم تو ہو اس کے انکار کی وجہ کیا ہے، ماشاء اللہ ہماری حیرا لاکھوں میں ایک ہے، پھر وہ کیوں پس و پیش سے کام لے رہے ہے، آخر کوئی وجہ تو ہو گی۔“ منرہ آہستگی سے شہباز کے پاؤں دبائی ہوئی بولیں۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے، اس کی منت کرنے کی حیرا میں کس چیز کی کمی ہے، ایک سے بڑھ کر ایک آفیسر مل سکتا ہے میری بہن کو، بڑے بڑے جاگیردار طلب گار ہیں حیرا کے چہرے مگر ہم نے شہزاد کو اہمیت دی، صرف اس کی خاطر ہم نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی شہزاد نے یقیناً امریکہ میں شادی کر رکھی ہو گی جب ہی وہ ایسے کر رہا ہے۔“

”نہیں شہباز! میرا بھائی ایسا نہیں ہے، اس کی اور ہی وجہ ہے میں جانتی ہوں۔“

”اچھا تو پھر بہن بھائی کی ملی بھگت ہے، وجہ معلوم ہے تو بتاتی کیوں نہیں۔“

شہباز طیش میں آ گئے، انہوں نے پاؤں کھینچ لیے تو منرہ بات کر کے پھنس گئیں۔

”کیا وجہ ہے شہزاد کیوں انکار کر رہا ہے؟“ شہباز سخت لہجے میں بولے تو وہ ڈر گئیں۔

”وہ دراصل شہزاد عذرا آپا کی۔ رشتے کی نند عابدہ کو پسند کرتا ہے۔“ جس بات کے نکلنے سے زیادہ خطرناک ہو جانے کا اندیشہ ہوا اسے اگل دینا ہی بہتر ہوتا ہے، اسی لیے انہوں نے اگل دیا۔

”کیوں وہ حیرا سے زیادہ خوبصورت ہے، زیادہ تعلیم یافتہ ہے، زیادہ قابل ہے۔“

”بات قابلیت یا حسن کی نہیں ہوتی شہباز جذبوں کی ہوتی ہے، ویسے عالی ہے بھی چاہے جانے کے قابل۔“

”ہاں نفرت کے قابل تو میری ہی بہن ہے ناں جیسے۔“ شہباز نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”نہیں شہباز! حیرا تو صرف محبت کے قابل ہے، لیکن دل پر بھی تو اختیار نہیں ہوتا ناں اور پھر شہزاد کو بتایا

بھی نہیں گیا تھا کہ وہ حیرا سے منسوب ہے، اب تو اسے یہ بات معلوم ہوئی ہے جب۔“

”ہاں بھئی، تم لوگ ٹھہرے پڑھے لکھے لوگ، یہ بتانا ہی گوارا نہیں کیا گیا۔“

منرہ مسلسل شہباز کی طرف سے اچھالے جانے والے طنزیہ تیروں کی زد میں تھیں غلطی تو ان سے بھی ہو گئی تھی اب تو یہ سب برداشت کرنا ہی تھا انہوں نے، ظہیر صاحب سے جانے کی خواہش ظاہر کی تو شہباز کچھ نہ کہہ سکے، ویسے بھی منرہ کو گھر گئے، کافی دن ہو گئے تھے، حتیٰ کہ زاہدہ بیگم کی بیماری کا سن کر بھی وہ نہ جاسکی تھیں ان دنوں شہباز کی طبیعت خراب تھی، اس لیے نہ جاسکی تھیں اب تو جانا ضروری ہو گیا تھا۔



”شکر ہے آپا! آپ کو بھی ہمارا خیال ہے۔“ منرہ کو دیکھ کر شہزاد ان کی طرف بڑھا۔

”اور تمہیں تو جیسے روزی آپا کا خیال آتا ہے ناں!“ انہوں نے بھی شکوہ کر دیا۔

”منرہ بیٹی، شہزاد سے شکوہ بے کار ہے، ارے بھئی، ہم لوگ اس کے قابل ہی کہاں ہیں، مزارے لائق

سوغات بھی تو نہیں دی تھی فرمان نے کہ دل بے قرار کو قرار آجائے سوائے انتظار کے لہذا ہی سلسلے کے جس کے اوپر چلتے چلتے اس کی روح تک زخمی ہو جائے، سرد، اداس شام نے سوگ سا پھیلا رکھا تھا دل کی بستی میں۔

”عالی! عالی! ارے بھئی، اتنی ٹھنڈا تر آئی اور تم یہیں بیٹھی ہو۔“

قدسیہ بانو کام سے باہر آئیں تو چنبیلی کے کج کے پاس عالی کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھیں۔

”نہیں تو بھابی جان زیادہ سردی تو نہیں پڑی سردیاں اچھی لگتی ہیں سرد شامیں مجھے بہت پسند ہیں، شاید اس لیے کہ ان کی اداسی ویرانی دل کی اداسی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔“ بات کا آخری جملہ اس نے صرف اپنی سماعت تک محفوظ رکھا۔

”میں سب جانتی ہوں، کیوں اچھی لگتی ہیں تمہیں اداس شامیں، چلو اندر شاباش یہ مگ اندر لیتی جاؤ بچے جانے کیا کرتے رہتے ہیں اور ہاں سیدہ کے ساتھ کھانا لگاؤ میں ابھی آتی ہوں۔“

قدسیہ بھابی کی ہدایات کے ساتھ وہ دونوں ہاتھوں میں مگ تھامے آ گئی۔

”آپا، بھابی جان کہہ رہی ہیں کھانا لگا دیں، لایے میں برتن جن دیتی ہوں۔“

وہ جلدی سے شوکیں کی طرف بڑھی اور برتن نکلنے لگی۔



”پھر کب چلنا ہے پھوپھو کی طرف؟ آپ مجھے حتمی تاریخ بتا دیں کیونکہ میرے اپنے بھی کچھ کام ہیں۔“

اسی کے مطابق پھر مجھے چلنا ہے، کام بہت ضروری ہیں۔“

شہباز ظہیر صاحب کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے تو انہوں نے سوچتی آنکھوں سے بننے کو دیکھا وہ سوچ رہے تھے کہ معاملہ بہن کا ہے اور شہباز کی رگوں میں جوان اور پر جوش خون گردش کر رہا ہے ان کو ساتھ نہ ہی لے جائیں تو بہتر ہے۔“ شہباز! میرے خیال میں میں اور تمہاری ماں ہو آتے ہیں، یہاں گھر پر بھی تو ضرورت ہے

ایک مرد کی۔“

”اباجی! میں سب جانتا ہوں کہ آپ کیوں مجھے ساتھ لے جانا نہیں چاہتے۔ اچھا خیر فی الحال آپ لوگ

جائیں اچھا ہے ناں تمام معاملات صلح صفائی سے ہو جائیں ورنہ وہ لوگ بھی پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ہیں، سب

سمجھتے ہیں کہ۔“ شہباز نے پڑا سا گھونٹ نکال کر سر کو پانی کا گلاس دیتی ہوئی منرہ کو دیکھا تو وہ اندر تک کانپ

گئیں۔ ان کے روئیں روئیں سے دعا نکل رہی تھی کہ خدایا شہزاد مان جائے وہ خود غرض نہیں تھیں کہ اس سے

صرف ان کا گھرا جرنے سے بچ جائے گا بلکہ ان کو حیرا بہت عزیز تھی۔ حیرا سے ان کا رشتہ نند بھاونج کا تھا مگر حیرا

کبھی روایتی ننڈ نہیں بنی تھی۔ دونوں نے ہمیشہ دوستوں اور بہنوں کی طرح وقت گزارا تھا۔ اسی لیے وہ جانتی تھیں

کہ وہ شہزاد کو کس حد تک چاہتی ہے اور شہزاد کے متعلق بھی عذرانے ان کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ جذبوں کا یہ کھیل لگا

کتنا عجیب ہوتا ہے، کوئی جیت کر بھی ہار جاتا ہے اور کوئی ہار کر بھی جیت جاتا ہے، لیکن شہزاد کو جب اپنی چاہ

نہیں ملی تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے چاہنے والے کو مل جائے، میں خود شہزاد کو سمجھاؤں گی مجھے جانا چاہیے، منرہ نے

گھر جانے کا فیصلہ کر لیا یہ فیصلہ حیرا سے بالا بالا تھا ورنہ وہ ان کو جانے سے تو شاید نہ روکتی البتہ شہزاد کو سمجھانے

ضرور روک دیتی۔

”شہباز! اگر آپ اجازت دیں تو میں اباجی اور امی جان کے ساتھ گھر چلی جاؤں۔“ منرہ نے شہباز

پڑے لکھے ہیں ویسے بھی۔“

”ماموں جان! آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں میری کوتاہی کہ میں جلدی جلدی چکر نہیں لگا سکا۔“  
شہزادہ اندامت سے ظہیر صاحب سے بغل گیر ہو گیا۔ شہزادہ سمجھ رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے مگر اس کو اس بات کی فکر تھی کہ ماموں جان کو کیا جواب دیا جائے گا، مگر اب وہ مطمئن تھا۔ رات کھانے کے بعد وہ کے پاس آ گیا۔

”آپ! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ منظرہ کے ہاتھ تمام کر بیٹھ گیا۔

”اور مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“ منظرہ نے پیار سے بھائی کو دیکھا۔

”اچھا تو کریں باتیں آپ۔“ شہزادہ ہیں قالین پر بیٹھ گیا۔

”نہیں تمہاری ایک بات ہے، پہلے تم کرو۔“ منظرہ نے بات کرنے کا پہلا چانس اسے دیا۔

”ہاں آپ کو، بہنادر بھائی حیران کو بہت پسند کرتے ہیں۔“ شہزادہ بڑی خوشی سے بتا رہا تھا۔

”تمہیں کس نے بتایا اس نے تو آج تک ذکر ہی نہیں کیا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

منظرہ کو حیرت ہو رہی تھی یہ جان کر۔

”کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، بات یہ ہے کہ ایک دن غلطی سے میں نے ان کی ڈائری دیکھ لی جس میں

ذکر تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بھائی جان سے پوچھا پہلے تو وہ ناراض ہوئے پھر انہوں نے اعتراف کر لیا شروع ہی سے حیران کو پسند کرتے ہیں، مگر چونکہ وہ مجھ سے منسوب تھی، اس لیے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔“  
”اور اب اس نے یہ سب تم پر ظاہر کیوں کر دیا۔“

”اس لیے کہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تو۔“

”اور تم کیوں نہیں کرنا چاہتے اس سے شادی؟“ منظرہ کی بات پر شہزادہ نے ان کو دیکھا اور ایک لمحہ سے اٹھی، وہ کھڑا ہو گیا اور آہستگی سے چٹا کھڑکی کے پٹ کھول کر سینے پر ہاتھ باندھ کر نیلے آکاش پر اڑنے کو دیکھنے لگا۔

”آئی! آپ سب جانتی ہیں کہ کیوں نہیں کرنا چاہتا میرے پاس جذبات کا جو خزانہ تھا۔ وہ میں نام کر چکا ہوں۔ کسی اور کو دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں جبکہ حیران کی چاہت اس بات کی متقاضی جواب میں اسے بھی اتنا ہی چاہا جائے اور بھائی جان بہنادر اس کا خیال مجھ سے بڑھ کر رکھیں گے، آئی آپ ماموں جان کو بہنادر بھائی کے لیے راضی کر لیں۔ حیران سے میں خود بات کر لوں گا۔“

”حیران کی تو کوئی بات نہیں شہزادہ! عورت کو تو زندگی ہی گزارنا ہوتی ہے، خواہ شہزادہ ہو یا بہنادر۔ کیا نہیں پڑتا۔ بس ارمان ہی تو ہوتے ہیں، ان کو وہ حسرت کی لہجہ میں اتار کر تمام عمر ایک مرد کی قید میں ہے، مسئلہ صرف شہباز کا ہے، جن کو خد ہی ہو گئی ہے کہ حیران کی شادی ہوگی تو تم سے دور نہ رہے، حیران تو شہزادہ بہنادر میں کوئی فرق نہیں۔ شہزادہ ہی ضد چھوڑ دو ورنہ کچھ نہیں رہ جائے گا، وہ شخص کیا شے ہے یہ ہوں ایسا نہ ہو کہ تمہیں پچھتاوا پڑے۔“ منظرہ رو ہنسی ہو گئیں۔

”میں جانتا ہوں آئی! آپ فکر نہ کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، حیران بہت اچھی لڑکی ہے، میں کے قابل نہیں سمجھتا، بھلا میں اسے کیا دے سکتا ہوں، سوائے دکھ کے اور اتنی اچھی لڑکی کو دکھ نہیں

چاہیں۔ میں خود حیران سے بات کروں گا۔“

شہزادہ نے حتی طور پر اعلان کر دیا تھا کہ وہ حیران سے شادی نہیں کر سکتا ایسے میں بہنادر کی آرزوؤں کی ناؤ نہ شات میں گھر گئی تھی۔ آس و فراش کی سوچوں میں ڈوب ابھر رہی تھی، جب کہ بزرگوں میں ابھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، عذرا بیگم بھی ماموں جان کے آنے کا سن کر آگئی تھی۔ رات کھانے کے بعد زائدہ بیگم کے کمرے میں تمام بزرگ جمع ہو گئے تھے، سب کے دل دھڑک رہے تھے، کیونکہ شہزادہ اپنا فیصلہ سنا چکا تھا اور سب چاہتے تھے کہ بات نہ بگڑے بہنادر کی بات ہو جائے جس کی امید کم تھی۔

”زائدہ کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا۔ کیونکہ بات کرنے کا فرض تمہارا تھا۔ مگر تمہاری مسلسل خاموشی نے ہمارے دل میں دوسو سے پیدا کر دیے ہیں۔ آخر ہم بیٹی والے ہیں، ہمیں اور بھی لوگ پوچھتے ہیں مگر ہم کوئی جواب نہیں دے سکتے۔“ صدیقہ بیگم کے لہجے میں کچھ ناخوشی کا عنصر شامل تھا، زائدہ بیگم شرمندہ سی ہو گئیں۔

”میں سب جانتی ہوں بھائی جان مگر انسان اولاد کے ہاتھوں جب مجبور ہو جاتا ہے تو اپنے ہی وعدے توڑنے پڑ جاتے ہیں میرے خیال میں آپ لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ شہزادہ تیار نہیں۔“

”یہ ہمیں اب کا نہیں بہت پہلے کا پتا ہے، زائدہ آخر کیا کی ہے میری بیٹی میں جبکہ تم نے خود اسے مجھ سے مانگا تھا۔ میں نے کوئی بات نہیں سوچی تھی اور ہاں کر دی تھی۔“ ظہیر صاحب برہمی بولے۔

”میں سب جانتی ہوں بھائی جان! خدا نہ کرے میری بیٹی میں کی کیوں ہونے لگی، مگر بھائی جان جب ہم لوگوں نے فیصلہ کیا تھا تو ہمارے بچے چھوٹے تھے اور نہ ہی ہم لوگوں نے انہیں کچھ بتایا۔ اس لیے جب وہ بڑے ہوئے تو انہوں نے اپنی پسند کے مطابق سوچنا شروع کر دیا۔ بھائی جان شہزادہ تو تیار نہیں، زائدہ بیگم بھائی کے سامنے نظر نہیں اٹھا رہی تھیں۔

”واہ حد کر دی تم نے زائدہ! ہم نے بیٹی تمہارے بیٹے کے نام کر دی اور تم نے کس آسانی سے کہہ دیا کہ بیٹی ہی تیار نہیں صرف شہزادہ کی خاطر ہم نے اب تک اس کی شادی نہیں کی، شہزادہ کے مطابق اس کو تعلیم دلائی ہے اور وہ ہے کہ تیار ہی نہیں، آخر کیا عیب ہے حیران میں کہ شہزادہ تیار نہیں؟“ صدیقہ بیگم بہت گرم ہو گئیں۔

”بھائی جان حیران میں تو کوئی عیب ہے نہ کی ہے، لیکن میرے بہنادر میں بھی تو کی اور عیب نہیں میں ہر صورت میں حیران کو اپنی بیوی بنانا چاہتی ہوں، اگر آپ بہنادر کو اپنی فرزندگی میں قبول کر لیں تو میں سمجھوں گی کہ آپ نے نہ صرف مجھے معاف کر دیا ہے بلکہ بیٹی دے کر مجھے زیر احسان بھی کیا ہے۔ شہزادہ اور بہنادر میں فرق ہی کیا ہے دونوں میرے ہی جگر گوشے ہیں، شہزادہ اگر گستاخ نکلا ہے تو بہنادر یقیناً آپ کا مان رکھے گا۔ مجھے آپ سے بڑے ملن کی توقع ہے، میرا مان نہ توڑیے گا بھائی جان۔“

زائدہ بیگم کی بات پر دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیونکہ دونوں کو اس رشتے پر قطعی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بہنادر بھی ان کو بہت پسند تھا۔ بہت سلیبی طبیعت کا مالک۔ شہزادہ سے تو ان کو یہ ہی خطرہ تھا مگر ایک حصہ اس نے باہر گزارا تھا اور کیا عجب تھا کہ شادی کر کے حیران کو باہر لے جاتا اور وہ تو اکلوتی بیٹی کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ وہ دونوں کو خوشی ہوئی تھی اس بات سے تاہم انہوں نے فوری طور پر رضامندی دینا مناسب خیال نہ کیا۔

”ٹھیک ہے زائدہ! ہم سوچ کر جواب دیں گے۔“

”ماموں جان! سوچنے کی کیا بات ہے ہمیں معلوم ہے آپ کو کوئی اعتراض نہیں تو پھر بس اللہ کیجیے ہمارا زائدہ بیگم کی بڑی ہوشگفتہ نے مسکرا کر کہا تو کچھ دیر انتظار کے بعد ظہیر صاحب نے پلیٹ میں سے لٹو کر پہلے ہشفقت کے منہ میں رکھا پھر زائدہ بیگم کو دیا۔

”مبارک ہو زائدہ! ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“

صدیقہ بیگم نے بڑھ کر زائدہ بیگم کو گلے سے لگایا۔ پھر کمرہ مبارک سلامت کے شور سے گونج اٹھا۔ نے شوشی سے بہنرا کو مبارکباد دی تو وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اسے تو یقین ہی نہیں تھا کہ خاموش جذبے پورا آپ منوالیس گئے، بہنرا بے حد خوش تھا خوشی کی کرینیں، اس کے چہرے سے عیاں تھیں، بہنرا حسرت سے دیکھ رہا تھا کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنی چاہت کو یوں اتنی آسانی سے پالیتے ہیں کہ خود ان کا یقین نہیں آتا۔

ظہیر صاحب نے گوکہ یہ بات طے کر دی تھی مگر ان کو شہباز کی طرف سے مکمل مخالفت کی توقع تھی۔ ”کچھ نہیں کہے گا میرے خیال میں تو بہنرا زیادہ بہتر ہے کم از کم اس کے باہر جانے کے ارادے ہیں ہشفقت شہنرا کے بارے میں بتا رہی تھی کہ شہنرا باہر کے لیے پھر پر تول رہے ہیں، اچھا ہے میں خود شہباز بات کر لوں گی۔“

”تم بے شک بات کر لیتا مگر وہ بڑا ضدی ہے مانے گا نہیں اور پھر صدیقہ واقعی فرق ہی کیا دونوں بھائیوں میں یہ تو شہباز کی بے کاری ضد ہے کہ شہنرا کے علاوہ اس کا کوئی بہنوئی نہیں ہو سکتا۔“ دونوں میاں بیوی کو اب شہباز کی طرف سے خطرہ تھا کہ پھڑنا نہ کر ڈالے مگر جس کے دل کے دروازے نیم پلیٹ ہی انہوں نے بدل دی تھی اس کے بارے میں دونوں نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا۔ ان کے لیے کے بجائے بہنرا کو داماد بنا لینا کتنا آسان تھا۔ مگر اپنے دل کو شہنرا کے بجائے بہنرا کے نام پر دھڑکنے پونجھا حیرا کے لے کتنا مشکل تھا۔ یہ وہ ہی جانتی تھی مگر وہ کمزور نہیں تھی ہتھیار ڈال دیتی، پسپائی کا اقرار کر لیتی شہر محبت کے سامنے خود کو جھکا دیتی جو خود آقا تھا اسے سمجھانے کے لیے اسے یہ سمجھانے کے اب مجھے نہیں چاہتا بلکہ چاہت کارخ بہنرا کی طرف موڑ لو۔

”حیرا! تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟“ شہنرا بہت نادم تھا حیرا سے حیرا نے ایک جھپتی ہوئی پڑالی۔

”کیوں میں آپ سے ناراض کیوں ہونے لگی، آپ نے میرا کیا کیا ڈاڑھے؟“ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ ”نہیں حیرا! میرا مطلب تھا کہ ہمارے درمیان جو ایک تعلق رہ چکا ہے، تو شاید اس حوالے سے نے بات ادھوری چھوڑ دی، وہ سب جانتا تھا مگر اب اس کو جتنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”دیکھیے شہنرا! ہم بڑھے لکھے باشعور لوگ ہیں اور ہم لوگوں کے جذبات بھی ہمارے شعور اور ضبط اثر ہوتے ہیں جب تک وہ تعلق رہا احساسات بھی ویسے ہی عریض ہے اب وہ تعلق نہیں تو کچھ بھی نہیں۔“ حیرا اس وقت شہنرا کو بہت پختہ اور مضبوط لگ رہی تھی مگر وہ اس کے اندر ہوئی ٹوٹ پھوٹ کو نہیں تھا۔ جھکوس طرح اس کی نازک ہستی کو اٹھا اٹھا کر بٹخ رہے تھے، یہ وہ ہی محسوس کر سکتی تھی۔

”تمہارے خیالات قابل قدر ہیں۔ حیرا! عام طور پر ہمارے ہاں لڑکیاں ذرا جذباتی ہوتی؟

میرے ذاتی خیال میں انسان کو اس سے شادی کرنی چاہیے جو اسے بے حد چاہے، اس کا خیال رکھے، اس کی محبت کے جواب میں اتنی ہی محبت دے سکے۔“

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں شہنرا! اگر بازی میرے ہاتھ میں ہوتی تو میں بھی آپ کو ایسا ہی مشورہ دیتی کہ انسان کو اسی سے شادی کرنی چاہیے، جو اسے بے حد چاہے جو اس کا خیال رکھے۔“

حیرا نے رُخ موڑ اور جلدی سے آنسوؤں کو پلکوں کی سرحد پار کرنے سے قبل ہی ختم کر دیا۔

”اب کیا چاہتے ہیں شہنرا! مجھ سے؟“ اس نے ہچکے لہجے میں ایسے کہا کہ حیرا نے جو میں نے تمہاری خاطر محبت کی بازی تو ہار دی اب کیا چاہتے ہو۔

”میں صرف یہ چاہتا ہوں حیرا! کہ بہنرا اب بھی تمہیں بے حد چاہتے ہیں جواب میں ان کو اتنی ہی محبت دو، دوسری بات یہ کہ تم شہباز بھائی سے یہ کہنا کہ اس میں تمہاری پسند شامل ہے۔ ورنہ وہ ناراض ہوں گے۔“

”بلاشبہ اس فیصلے میں میری رضا اور میری پسند شامل ہے، جب ہی میرے والدین نے وہاں ہاں کی ہے اور میرے دل میں بہنرا کے لیے بہت عزت، بہت چاہت ہے جو شخص مجھے چاہے میری عزت کرے تو میں بھی جذبوں کی تو قیر بڑھانا جاتی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں ان کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی اور وہ ہی میری زندگی کا فیصلہ ہے جو میں نے کیا ہے، بھائی جی کو اعتراض کی ضرورت ہے نہ حق۔ جی اور کوئی شکایت تو نہیں آپ کو مجھ سے؟“

حیرا بڑے پر اعتماد لہجے میں بولتی ہوئی اس کی طرف مڑی تو شہنرا شرمندہ سا کھڑا تھا۔

”نہیں حیرا! شکایت کیسی بلکہ میں تو تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے دونوں خاندانوں میں نفاق پیدا ہونے سے بچالیا ہے، اور یہ بات ہمیشہ میرے لیے فخر کا باعث رہے گی کہ ایک اچھی لڑکی نے کچھ عرصہ میرے بارے میں سوچا۔ خدا حافظ حیرا۔“

”صرف سوچا شہنرا! یہاں تو زندگی داؤ پر لگادی تمہاری چاہت میں۔ تم کہتے ہو سوچا۔“

شہنرا گئے جانے کے بعد حیرا اپنی چاہت کو آخری بار الوداع کہتے ہوئے ضبط نہ کر سکی اور جانے کب تک ننگیں سمندر میں ڈوبتی رہی، جن دنوں شہنرا آیا ہوا تھا اور بات طے ہوئی تھی، شہباز شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے واپس آئے تو حالات سے آگاہی کے بعد بددوق پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

”انہوں نے انکار کر دیا اور ابابھی آپ خاموشی سے چلے آئے، ان کی بیٹی ان کے حوالے کر کے آتے؟“ غصہ سے شہباز کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا وہ کچھ نہ کچھ گزرنے والے تھے۔

”کس نے کہا ہے انہوں نے انکار کیا ہے، ہم بہنرا کو انگوٹھی پہنا آئے ہیں۔“

”کیوں؟ کیوں ابابھی کیوں شہنرا کو کیوں نہیں؟ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے کہ اس نے میری بہن کو لہانے سے انکار کیا ہے میں دیکھ لوں گا اس کو۔“

مارے غصے کے شہباز کا برا حال تھا وہ اسے سر اسراپنی بہن کی توہین سمجھ رہے تھے۔

”شہباز بیٹے! بری بات ہے اور پھر شہنرا اور بہنرا دونوں بھائی ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے کوئی بھی ضد چھوڑ دو مگر کی باتوں کو اچھا لائیں کرتے، بہنرا شہنرا سے کم تو نہیں وہ بھی اچھے عہدے پر ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، میرے خیال میں بہنرا زیادہ خوش رکھے گا ہماری بیٹی کو۔“

ظہیر صاحب آہستہ آہستہ سمجھا رہے تھے مگر ان کا ذہن یہ سب تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ان کو یہ وہم تھا کہ



شاید شہزاد ان کی بہن کو اپنے لائق نہیں سمجھتا اس لیے انکار کر رہا ہے۔

”نہیں اباجی! آپ مانیں نہ مانیں حمیرا کی شادی شہزاد سے ہی ہوگی ورنہ کسی سے نہیں وہ بہنراد۔“

”بھائی جی! جو فیصلہ ہو چکا سو چکا۔ میں بہنراد کے ساتھ شادی کے لیے تیار ہوں۔“ شہباز کی اچھی بات حمیرا نے مکمل کر دی تو سب چونک کر اسے دیکھنے لگے جو بڑے اعتماد کے ساتھ کھڑی تھی۔

”حمیرا تمہیں کس نے جرات دی کہ تم اس معاملے میں بولو۔“ شہباز نے گھور کر حمیرا کو دیکھا تو وہ اس اعتماد کے ساتھ چلتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔

”اس تعلیم نے بھائی جی جو آپ نے مجھے محض اس لیے دلوائی کہ میں شہزاد کے قاتل ہو جاؤں اور جب ہم تعلیم نے مجھے شعور عطا کر دیا تو مجھے احساس ہو گیا کہ میرے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔ میرے لیے کون سا ہو سکتا ہے گو کہ شہزاد ایک اچھے انسان ہیں مگر میں سمجھتی ہوں کہ بہنراد بہتر ساتھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ چاہتی ہوں کہ آپ بھی بہنراد کو قبول کر لیں اور کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کریں۔ نفرت فساد کو ختم کرنے کے لیے آپ کو معلوم کیا کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔“

حمیرا کی آواز رندہ گئی اور آہستگی سے منظر کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”ٹھیک ہے حمیرا تم نے بہنراد کے حق میں فیصلہ دے کر میرے ہاتھ ضرور باندھ دیے ہیں لیکن میں لوگوں کو معاف نہیں کر سکتا۔“

شہباز نے قہر بار نظروں سے منظرہ کو گھورا تو وہ سر تاپا کانپ گئیں۔

”بھابھی! آپ کیوں اثر لیتی ہیں؟ بھائی جی تو بس ایسے ہی کہتے رہتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اللہ مالک ہے اور پھر آپ اکیلی تو نہیں۔ چپ ہو جائیں، بچوں پر اثر پڑتا ہے۔“

جب سے شہباز نے دھمکی دی تھی۔ منظرہ کی جان پرینی ہوئی تھی۔ حمیرا اسے مسلسل سمجھا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، میرا! شہباز تمہارے بھائی ہیں مگر میرے بھی شوہر ہیں۔ میں ان کو خوب جانتی ہوں۔ وہ کبھی بھی اس بات کو معاف نہیں کریں گے اور نہ ہی بخشیں گے۔ اگر کبھی بھی انہوں نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا تو حمیرا میں تو سبکدوش کی نہ رہوں گی۔ ایک تو اولاد چمن جائے گی اور پھر جب وہ جوان ہوں گے تو وہ ماں کے متعلق کیا سوچیں گے کہ ہماری ماں میں ایسی کون سی برائی تھی کہ ہمارے باپ نے اس کو چھوڑ دیا۔“ منظرہ بے حال ہو رہی تھیں۔

”بھابھی جان! اگر آپ کو ایسا ہی خطرہ ہے تو اب آپ نہ گھبرائیں۔ اب بھائی جی آپ کے ساتھ کوئی ایسا سلوک — کریں گے تو سوچ سمجھ کر۔ کیونکہ ان کی بہن بھی آپ کے بھائی کے گھر جا رہی ہے۔“

”خدا نہ کرے حمیرا! جو کبھی بہنراد تمہیں ذرا سا بھی دکھ دے، تم جیسی لڑکی تو پھولوں کی بیج پر رہنے کے لیے بنائی ہے اللہ تعالیٰ نے اور اگر کبھی اس نے میری وجہ سے کوئی ایسی بات سوچی بھی تو میں اسے سیدھا کر دوں گی اسے اور کیا چاہیے۔ جسے تم جیسی لڑکی مل جائے۔“

منظرہ نے پیار سے حمیرا کو ساتھ لگا لیا۔ حمیرا نے ہاں کر کے مکندہ فساد کو ختم کر دیا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ شہباز آسانی سے شہزاد کو معاف نہیں کر سکتے بہر حال کچھ بھی تھا۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

بہنراد بے حد خوش تھے، انہیں اور کیا چاہیے تھا جسے چاہا اسے پالیا۔ شادی سے قبل وہ حمیرا کو دیکھنا چاہتے تھے، اس کے رخساروں پر اپنے نام کی سرخی دیکھنا چاہتے تھے مگر دونوں طرف روایات کے سخت پہرے تھے مگر جانے ان کے جذباتوں میں کتنی صداقت تھی کہ موقع مل ہی گیا۔ ان کے ایک دوست کی شادی تھی اور ویسے تو ان کا

وہ دوست ایسا کوئی خاص نہیں تھا نہ بھی جاتے تو گزارہ ہو جاتا۔ مگر یہ تو خدائی تحفہ تھا۔ ملاقات کا یہ موقع نہا طرف سے ملا تھا۔ پھر کیوں گنوا تے۔

”بہنرادی بیٹے، میرے خیال میں وہاں نہ جاؤ تو بہتر ہے۔“

”کیوں امی جان! بھیا کے اتنے گہرے دوست کی شادی ہے۔ اس نے اتنے اصرار سے بلایا ہے۔ جائیں گے تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ بری بات ہے جانے دیں ناں۔“ بہنرادی کے بجائے شہزاد بول رہے تھے۔ وہ بہنرادی کے دل کی حالت جانتے تھے، اسی لیے حمایت کر رہے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر ماموں کے ہاں نہ جانا۔ تاریخ ٹھہر چکی ہے۔“

”کیوں امی جان! نہ جائیں گے تو ماموں جان کو شکایت ہوگی کہ دیکھو، بھانجا ہو کر نہیں آیا۔ تاریخ طعنی ہے تو کیا بات ہے۔ ہاں یہ وعدہ لے لیں کہ تاکہ جہاں تک نہ کریں گے، نہیں کریں گے ناں بھیا؟ شہزاد پھر خوشی سے بہنرادی طرف دیکھا جو خاموشی سے کھڑے تھے۔

”یہ اس کی زبان تمہارے منہ میں کب سے فٹ ہوگئی۔“ زائدہ بیگم نے مسکرا کر شہزاد کو دیکھا۔

”جب سے امی جان۔ ان کے ہاتھ پیلے ہونے کی تاریخ مقرر ہوئی ہے۔“

دوست کی شادی انٹینڈ کرنے کے بعد بہنرادی کا دل جل رہا تھا۔ وہاں جانے کو، مگر ایک جھجکی سی تھی۔ ماموں جان جانے کیا خیال کریں اور شہباز بھائی کا تو ویسے ہی دماغ الٹا ہے جانے کیا کہہ دیں۔ اس لیے جانا ہی بہتر تھا۔ مگر جب وہ واپسی کے لیے آ رہے تھے تو راستے میں ماموں جان مل گئے اور گھر لے گئے، اور گھر کر گزرنے پر اچھی خاصی خاطر بھی کر ڈالی۔ بہنرادی اس گھر کے ہونے والے داماد تھے، سب ہی آگے پیچھے بھرتی تھے۔ منہ تو خوشی سے کھلی جا رہی تھیں۔ البتہ شہباز کے رویے میں رعوت سی تھی۔ جس سے لگ رہا تھا کہ ان کا آنا اچھا نہیں لگا۔ شہباز باہر چلے گئے تو بہنرادی نے منہ سے حیرت کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی پہلے تو انہوں نے انکار کر دیا پھر حیرت کے کمرے میں لے آئیں اندر سے ڈر رہی تھیں کہ شہباز کو خبر ہوگئی تو ہنگامہ کر دیں گے۔ ”آپ!“ حیرت اچانک کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے تو وہم و گمان میں نہیں تھا۔ بہنرادی ہوں گے۔ اس کی جلدی سے دوپٹہ اس طرح لے لیا کہ وہ ساری چھپ گئی۔ بہنرادی یہی تو دیکھنا چاہتے تھے۔

جی میں! کوئی اعتراض ہے آپ کو؟“ بہنرادی اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

”اعتراض جی نہیں تو!“ وہ دھیرے سے بولی اور پھر دوسری طرف رخ کر کے کھڑی ہوگئی۔

”اچھا! یہ بتاؤ کہ تم خوش ہونا؟“ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ملن کی یہ گھڑی کن خوبصورت سے سجائیں۔

”اگر خوش نہ ہوتی تو بہنرادی بات یہاں تک کیسے پہنچتی؟“

حیرانے حجاب آلودہ لہجے میں کہا تو بہنرادی کا دل منور ہوتا چلا گیا۔ بہن بھائی کے درمیان دوہری داری تو پہلے ہی ہو چکی تھی مگر آپ نے رشتے سے مزید پختہ ہو رہی تھی مگر شہباز کچھ خار کھائے بیٹھے تھے۔ بہنرادی میں انہوں نے اپنی مرضی چلائی تھی۔ سارے معاملات اباجی کے منع کرنے کے باوجود خود طے کیے تھے۔ ”شہباز بیٹے! تم تو غیروں والی بات کر رہے ہو۔ معاملات یہ طے کرنے ہیں بھی حیرت امیری بیٹی میں جا کر اسے لے آؤں گی۔ بات ختم۔“

”پھوپھو جی! بات ختم نہیں ہو جاتی۔ چاہے رشتہ داری ہی کیوں نہ ہو مگر جو رسم و روایات ہیں وہ انسان کو ضرور بھائی چاہئیں۔ آپ جہیز میں ہر قسم کا مطالبہ کر سکتی ہیں مگر میں بھی ایک شرط منوانا چاہتا ہوں۔“

”شہباز بیٹے! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں جہیز کا مطالبہ کروں گی۔ ارے جو اپنے جگر کا کلڑا کاٹ کر دے دیتا ہے۔ اس سے اور کیا مانگنا اور پھر میرے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور اگر کمی ہوتی بھی تو میں کبھی کچھ نہ کہتی۔ مجھے تو حیرت کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے اور تم نے جو شرط منوانی ہے، منوالو، میں تیار ہوں۔“ زائدہ بیگم شہباز کی بات ناگوار تو بے حد گزری تھی مگر وہ قہر سے بولیں تو شہباز جو دونوں ہاتھوں کو آپس میں جکڑے بیٹھے تھے۔ زائدہ بیگم پر ایک نظر ڈالی اور کھڑے ہو گئے۔

”پھوپھو جان! میں اس لیے اکیلا آیا ہوں تاکہ کل کر بات کر سکوں۔ وہ دراصل میں چاہتا ہوں کہ۔“ وہ رک کر پھوپھو کو دیکھنے لگے جو ان ہی کی طرف پوری طرح سے متوجہ تھیں۔

”رک کیوں گئے بیٹے؟ بات مکمل کرو ناں۔“

”جی پھوپھو! ایسے معاملات میں صاف گوئی زیادہ مناسب رہتی ہے۔ مروت اور لحاظ بعد میں بچھتاوا بن جایا کرتے ہیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ہر بات کلیئر ہو۔“

”تم جو کہنا چاہتے ہو بے جھجک کہو، میں نہیں چاہتی کہ تم بعد میں بچھتاؤ۔“

”وہ پھوپھو جی! حق مہر دولا کہ ہوگا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ لڑکی کے تحفظ کے لیے۔“

شہباز نے قدر سے جھجکتے ہوئے کہہ دیا تو زائدہ بیگم کو لگا جیسے کوئی انی دل کے آ پار ہوگئی ہو۔ ان کا جی تو چاہا کہ پوچھیں ہم نے اپنی بیٹی کا کیا حق مہر لکھوایا تھا مگر وہ ان سے بحث کرنا نہیں چاہتی تھیں۔

”شہباز بیٹے! گو کہ تمہاری اس بات سے مجھے دکھ ضرور ہوا ہے۔ مگر صرف ایک بات بتا دو کہ تم حیرت کے تحفظ کے لیے جو دولا کا حق مہر کا مطالبہ کر رہے ہو خدا نہ کرے اس کے ساتھ کوئی ٹھانڈا ہوجائے تو یہ دولا کھاس کا اور اس کے بچوں کا تمام عمر تحفظ کر سکیں گے یا یہ دولا کھاس بات کے ضامن بن جائیں گے کہ حیرت ہمیشہ خوش و خرم رہے گی۔ دو تو کیا تم دس لاکھ بھی لکھوا سکتے ہو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہماری نیت صاف ہے اللہ نے چاہا تو حیرت اپنی ساری زندگی خوش رہے گی۔“

یہ بات زائدہ بیگم کو اتنی ناگوار گزری تھی کہ اگر بھائی کی بیٹی نہ ہوتی تو جانے کیا کرتیں مگر وہ ضبط کر گئیں۔ کیونکہ ان کو یقین تھا کہ صرف شہباز کی سطحی ذہنیت ہے ورنہ اور کسی کو تو یہ سب معلوم بھی نہیں ہوگا اور پھر ان کی بیٹی شہباز کے مگر تھی۔ وہ ان کی کوئی بات کس طرح رد کر سکتی تھیں۔ زائدہ بیگم سے بات کرنے کے بعد شہباز بہنرادی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ جو بیڈ پر نیم دراز آئندہ زندگی کے خوش کن خیالات میں محو تھے، ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

”آداب بھائی جی! آپ یہاں بیٹھیں پلیز۔“ وہ کرسی ان کی طرف کرتے ہوئے بولے شہباز کچھ دیر تک جا چھٹی۔ نظروں سے ان کو دیکھتے رہے پھر بیٹھ گئے۔

”بہنرادی! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”شہباز بھائی! ایک رشتے سے آپ میرے بھائی ہیں ایک سے بہنوئی اور۔ اور خیر آپ بات کیجئے۔“ بہنرادی غری جھلے پر آ کر کچھ جھجک سے گئے۔

”ہوں۔“ شہباز نے معنی خیز انداز میں ہوں کہا اور اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹپک لگا کر بیٹھ گئے بہنرادی کچھ

پریشان سے ہو گئے۔

’بات یہ ہے، بہنراد! کہ تاجی کا فیصلہ ہے کہ جائیداد کا ادھار حصہ حیرا کے نام کر دیا جائے۔‘ بات ادھر چھوڑ کر وہ بہنراد کی طرف غور سے دیکھنے لگے جو ان کی باتوں سے الجھ سے گئے تھے۔

”شہباز بھائی! یہ تمام فیصلے آپ بزرگوں کے اپنے فیصلے ہیں ورنہ مجھے حیرا کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں اور نہ ہی میں طلبگار ہوں، کسی جائیداد کا۔ اللہ کا دیا میرے اپنے پاس بہت ہے۔“

بہنراد مضبوط اور پختہ لہجے میں بولے تو شہباز جوش میں اٹھ کر ان کے قریب آ گئے۔

”ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم یہ لکھ دو کہ تمس حیرا کے ساتھ جائیداد نہیں چاہیے۔ کیونکہ حیرا اپنا حصہ چاہتی ہے۔ وہ نا سمجھ ہے، سمجھتی نہیں کہ یہاں بات وہ ضرور مان لے گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں تم اس سے کہو کہ۔“

”کہ وہ اپنے حصے سے دستبردار ہو جائے۔“ اب ساری بات بہنراد سمجھ چکے تھے۔ اس لیے ان کی بات درمیان سے اچک کر کھل کر تے ہوئے بولے۔

”ہاں، میں یہی چاہتا ہوں۔“ شہباز ذرا تیز لہجے میں بولے۔

”یہ ٹھیک ہے کہ شہباز بھائی کہ حیرا میری بات نہیں ٹالے گی لیکن میں اسے کسی ایسی بات کے لیے نہیں کر سکتا جو اس کی خواہش ہو اور میرے کہنے سے وہ باز رہے۔“

بہنراد نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ان کو حیرا پر بہت اعتماد تھا۔ شہباز تیار کر ان کی طرف مڑے۔

”صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم بھی یہی چاہتے ہو۔“

”میں جو چاہتا ہوں۔ آپ کو بتا چکا ہوں۔ اب بات چونکہ حیرا کی ہو رہی ہے تو میں کس طرح اس معاملے میں بول سکتا ہوں۔ آپ اگر ایسا نہیں چاہتے تو زبردستی اس سے اپنی بات منوا سکتے ہیں، ویسے حق دے دینا ایسا کوئی نامناسب بھی نہیں۔“

”مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔ میں تو تمہیں اور ہی کچھ سمجھتا تھا مگر تم تو۔“

شہباز احمد نے ان کو اوپر سے نیچے تک تہہ بارنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کم سچی میری عادت ہے شہباز بھائی! لیکن اسے کم فہمی پر محمول نہ کریں حیرا، آپ کی بہن ہے۔“

”اچھا شکریہ اس یاد دہانی کا، میں بھی تمہیں یاد دلا دوں کہ منزہ تمہاری بھی بہن ہے۔“

جو کچھ خاصا کاری تھا کچھ دیر کے لیے بہنراد چپ سے ہو گئے کیونکہ وہ شہباز جیسے شخص سے کسی بھی بات توقع کر سکتے تھے۔

”شہباز بھائی! مجھے کسی دولت، کسی جائیداد سے کوئی سروکار نہیں۔ حیرا سے میں اس سلسلے میں ضرور کروں گا لیکن جب میں اس کا قائل ہو جاؤں کہ وہ میری بات سن لے۔ فی الحال تو میں اس کا صرف ہوں۔“ منزہ کے ذکر کے بعد بہنراد کچھ سنجیدہ سے ہو گئے تھے۔

”ہوں ٹھیک ہے۔“ شہباز نے ایسے ہوں کہا جیسے کہہ رہے ہوں اب آئے ہوں لاٹن پر۔

جا چکے تھے مگر ان کے دل خراب ہو چکے تھے۔ خصوصاً زائدہ بیگم کو بہت دکھ ہوا تھا۔

”خدا کی قسم اگر مجھے بھائی کا خیال نہ ہوتا اور حیرا اتنی اچھی لڑکی نہ ہوتی تو میں شہباز کے اس رد بعد ہرگز وہاں نہ جاتی۔ مگر میں جانتی ہو۔ شروع ہی سے ایسا ہے، مروت، لحاظ تو اسے چھو کر نہیں گزرا۔ اب

ہمیں جس کرنے والی، حد ہو گئی۔“

”چھوڑے اپنی جان جب آپ جانتی ہیں، شہباز ایسے ہیں تو پھر ان کی بات کو اہمیت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کیوں اڑ لیتی ہیں۔ خود بخود وہی دل خراب نہ کریں۔“ شائستہ نے ساس کو کھماتے ہوئے کہا۔

ابھی تو بہنراد نے اپنے اور شہباز کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں بتائی تھی ورنہ شاید بات بڑھ جاتی اور بہنراد اپنے دل میں اربانوں کی بارات اترتی دیکھ رہے۔ وہ کلکس بچا کر اس کا استقبال کرنا چاہتے تھے۔ اربانوں کی ڈولی میں جگ کر وہ دن آن پہنچا۔ جب حیرا ان کی چاہت ہمیشہ کے لیے ان کی ہوئی۔ شہباز ناراض ناراض سے تھے اور اس وقت وہ ہنسنے سے اکڑ گئے جب نکاح کے وقت بہنراد کی طرف سے حق مہر لکھا گیا تو وہ شرمیلی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

”کیا بات ہے شہباز؟ باہر تو سب ٹھیک ہے ناں!“ منزہ ان کی طرف بڑھیں۔ جن کا غصے سے برا حال تھا۔

”ہاں باہر تو سب کچھ سب کی عین مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ آگ تو میرے اندر لگی ہوئی ہے۔ بے عزتی تو میری کی ہے، تمہارے گھر والوں نے۔ گاؤں بھر میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ پتا بھی ہے۔ کتنے بڑے بڑے جاگیردار آئے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے خوار کر دیا۔ کیا خیال کریں گے کہ فقیروں میں بیٹی دے دی اور پھر جب میں کہہ کر آیا تھا تو پھر یہ کیوں کیا گیا۔ دانستہ میری بے عزتی کرنے کے لیے میں سمجھ لوں گا ان سب کو۔“ شہباز پھرے ہوئے پھر رہے تھے۔ منزہ میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ کہہ سکیں کہ شرعی حکم ماننا گناہ ہے جو وہ اس طرح کر رہے ہیں۔

”امی جان! یہ آپ لوگوں نے کیا کیا ہے۔ اگر شہباز نے حق مہر کی رقم خود بتائی تھی تو آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟ شہباز بہت ناراض ہیں۔“ منزہ کا ماں پر بس چلا تو ان سے شکوہ کر دیا۔

”مجھے تو خود بڑی حیرت ہوئی تھی سن کر۔ مگر۔ مردانے میں کیا ہوا میں خود نہیں جانتی۔ بھائی جی نے کیا کیا ہے، مجھے تو کوئی خبر نہیں۔ میں تو شہباز کا ہر مطالبہ پورا کرنے کو تیار تھی۔“

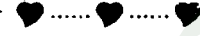
”اس میں کسی کا قصور نہیں آپ! حیرا نے خود دعویٰ میں جان سے کہا تھا کہ ہر کام شرعی لحاظ سے ہوگا۔ خصوصاً ماہر وغیرہ تو اسی لیے ہوا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی سونہیں کہ شہباز بھائی ناراض ہوں اور پھر ہم نے ایسی کون سی حرکت پایا کہ کر دی ہے جو ان کی، برادری یا دوستوں میں ناک کٹ گئی ہے۔ دین کے احکام پر چلنا کوئی گناہ نہیں ہے۔“

”اچھا تو یہ حیرا کے کہنے سے ہوا ہے مگر شہباز مانیں گے تو بڑی اس بات کو حیرا بھی جانے کیوں یہ سب کر رہی ہے۔ عذاب مجھ پر ٹونے گا۔“ منزہ پریشان تھیں۔

”کیوں عذاب ٹونے گا آپ! ایک غلط بات کو نہ ماننا کوئی برائی نہیں اور حیرا جو کر رہی ہے، بہت اچھا کر رہی ہے۔ ایک پدمی لکھی لڑکی کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہم لوگوں نے غلط روایات کو فروغ دے کر معاشرے کو لگا کر رکھا ہے۔ جو صاحب حیثیت ہیں۔ وہ اپنی من مانی کر کے مشکل بچا کر غریبوں کے لیے ڈال دیتے ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا آپ فکر نہ کریں۔“

منزہ نے بڑھ کر منزہ کے ہاتھ تمام لیے بہنراد کی چاہت کی ڈولی میں جگ کر حیرا ان کے آنگن میں اترتی

تو قدم قدم پر سب کی چاہت اور محبت بکھری ہوئی ملی۔ سب کی چاہت اور دعاؤں نے زندگی کو بہت خوبصورت بنا ڈالا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔ بہن کی شکست میں، گو کہ شہزاد کو دیکھ کر دل میں ایک ٹیس سی ضرور اٹھی تھی مگر اس نے خود کو بہن کی چاہت کے نفس میں مقید کر لیا۔ اب اس کی سوچیں صرف بہن کے لیے تھیں اس کے لیے نہیں۔



بیاری بی بی جان! اسلام علیکم۔

میں یہاں خیریت سے ہوں اور دل لگا کر تعلیم حاصل کر رہا ہوں اب میرا دل لگ گیا ہے، بڑا احساں آتا ہے جہاں ہم رہتے ہیں ناں۔ وہ ایک بزرگ خاتون ہیں، آپ کی عمر کی ہیں ”مس سوزی“ ہمارا برا خیال رکھتی ہیں۔ میری صحت اتنی اچھی ہو گئی ہے کہ آپ پہچان نہیں پائیں گی۔ مجھے تو اندیشہ ہے، بھابھیاں مجھے برفانی رکھتے نہ کہہ ڈالیں۔ خیر جو چاہے کہیں۔ سب بہت یاد آتے ہیں۔ آپ کی صحت کبسی رہتی ہے، آغا جی کو میں نے الگ خط لکھا۔ ہے امید ہے مل گیا ہوگا۔ باقی سب کیسے ہیں، قدیر۔ عذر اور سیدہ بھابھی کو بہت سلام۔ بچوں کو پیار۔

آپ کی دعاؤں کا طالب۔

فرمان

عابی نے دیر سے دیر سے خط پڑھ کر سنایا اور پھر بی بی جان کو دے دیا۔

”ارے جیتا رہے میرا بچہ خوش ہے وہاں پر اچھا ہے دل لگ گیا اور نہ تو میں فکر مند ہی رہتی تھی۔ اللہ! قدم قدم پر کامیابیاں نصیب کرے۔“

”آمین“ عابی کا رواں رواں پکارا اٹھا۔

”آج پورے ایک سال اور چھ ماہ ہو گئے فرمان کو گھر سے گئے ہوئے، ہے ناں بیٹی۔“

بی بی جان نے عابی کو دیکھا جو جانے کب سے جھڑکی آگ میں جل رہی تھی۔

”جھڑکی رات تو کٹ جائے گی کاٹے مگر کون ظفر“

عابی نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی جب بھی فرمان کا خط آتا۔ دل کا درد ہوتا جاتا۔ بے وفا ایک بار تو پوچھ لیتا کہ اس برفان کا کیا حال ہے، جسے میں اپنی محبت کی آگ میں جلتا چھوڑ آیا ہوں فرمان۔ جدا ہونے کے رستے آپ کو کتنے اس آگئے ہیں۔

وہ نیکی میں سر دیے جانے کب تک فرمان سے شکوہ کتنا رہتی کہ سیدہ آگئیں تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ فرمان کے وہاں سیٹ ہونے پر آغا جی خوش اور مطمئن ضرور تھے مگر دوسری طرف ان کو عابی کی فکر تھی۔ کیونکہ خاندان میں آج تک اس کی بی بی جان ہی نہیں رہی تھی۔ عابی ابھی تک بیٹی تھی گو کہ وہ ان کے بیٹے کی جگہ تھی۔ کوئی ایسی بات تو نہیں تھی مگر پھر بھی۔

”ہم عابی کی طرف سے پریشان ہیں۔ بیگم اب اس کی عمر ہے کہ شادی ہو جانی چاہیے مگر فرمان کا بھیا

خیال ہے اس کی تعلیم متاثر نہ ہو۔“ آغا جی کمرے میں آہستہ آہستہ ٹپکتے ہوئے بولے۔

”اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ فرمان کو بلایے۔ شادی کر کے عابی کو ساتھ لے جائے، اس کی تعلیم بھلا کیونکر مٹا رہوئے گی۔ مگر کی تو بات ہے عابی کو۔ چاہے لے جائے نہ چاہے تو بھی کوئی بات نہیں۔“

”آپ کی تجویز دل کو تو لگتی ہے بیگم! مگر مجھے زیادہ امید نہیں فرمان سے۔“

آغا جی نے رُک کر بیگم کو دیکھا اور ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”اب ایسی بھی بات نہیں آغا صاحب! وہ اپنی نہیں ہماری مرضی کا پابند ہے۔ منگنی بھی تو اس نے بغیر کسی جیل جت کے کر لی تھی۔ میرا نہیں خیال کہ وہ انکار کرے گا آپ اسے کہہ کر تو دیکھیں۔“

”تو پھر ہم آج ہی فرمان بیٹے کو خط لکھ دیتے ہیں کہ اسے جب بھی ذرا فرصت ملے تو آ جائے تاکہ۔“

”اس کو تو فرصت ملے گی نہیں۔ بہانے بنائے گا۔ آپ حکم دے دیں اس کو کہ اسے ہر حال میں آنا ہے۔“ بی بی جان نے درمیان میں شوہر کی بات کاٹ کر کہا۔ وہ بعد بے قرار ہو رہی تھیں۔ مگر میں سب کے ساتھ عابی کو بھی بتا چکا تھا کہ آغا جی نے فرمان کو واپس آنے کو کہا ہے۔ جیلے بیٹے آنکھوں میں آجے تھے۔ سب ہی خوش تھے کہ یہ بات اب اٹھی ہے تو کچھ نہ کچھ ہو بھی جائے گا۔

مگر اس وقت سب سرد پڑ گئے، جب فرمان نے لکھ دیا کہ آپ کا حکم سنا آنکھوں پر مگر چونکہ یہاں پر پڑھائی بہت سخت ہے۔ اس لیے۔ میں اسے درمیان میں چھوڑ کر نہیں آ سکتا اور نہ ہی یہاں عابی کو رکھ سکتا ہوں۔ لہذا کچھ عرصے کے لیے مہلت دے دیں۔

”یہ لڑکا جانے کیا دکھائے گا۔ سوچا تھا کہ اسی بہانے آجائے گا تو دل کو کچھ سکون ملے گا پتا نہیں اسے ماں کا آخری دیدار بھی نصیب ہوگا کہ نہیں۔“ بی بی جان بہت دل برداشتہ ہو گئی تھیں۔

”خدا نہ کرے بی بی جان! ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ فرمان مصروف ہیں ذرا، فرصت ملے ہی آ جائیں گے۔“ قدیر بیگم نے فوراً بی بی جان کو تسلی دی۔

”آپ کتنے بے درد ہیں فرمان کہ آپ کو اتنی بھی فرصت نہیں کہ محبت کے مارے ہوؤں کو ایک نظر دیکھ ہی لیں۔“ بی بی جان کا سر دباتے ہوئے عابی اپنی تڑپ کو بی بی جان کے نام منسوب کر رہی تھی۔

لیکن اس روز اچانک ہی بالکل غیر متوقع طور پر فرمان آ گئے تو جیسے زندگی مسکرانے لگی۔ ہر کوئی خوش اور شاداب تھا۔ بی بی جان تو بیٹے کے واری صدقے ہو رہی تھیں۔ شوریدہ دھڑکیوں کو لیے عابی تو کمرے میں بند ہوئی تب سے اب تک اس نے فرمان کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی اور فرمان کو ہر وقت بی بی جان ساتھ لگائے رکھتیں۔

”ابھی کتنا کوز ہے بیٹے تمہارا؟ جانے کیا شوق چرایا تمہیں۔ جلدی ختم کرو اسے، میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر۔“ بی بی جان نے فرمان کو اس طرح ساتھ لگا رکھا تھا۔ گویا وہ چھوٹے سے ہوں اور ابھی کہیں بھاگ جائیں گے۔

”بس بی بی جان دو سال اور اس کے بعد کہیں نہیں جاؤں گا۔ میری تو یہ، یہ دیکھیں۔ کان پکڑتا ہوں۔“ فرمان واقعی کانوں کو ہاتھ لگا دے تو بی بی جان مسکرانے لگیں۔ ”ویسے بی بی جان! یہ زیادتی ہوتی ہے، والدین کی



”جیتی رہو بیٹی! تم کہاں تھی یہ ہے تمہیں کتنی عادی ہوں تمہاری مگر تم جانے کہاں رہتی ہو، یہاں آؤ میرے قریب بیٹھو۔“ بی بی جان نے اسے ایسے ساتھ لگایا جیسے صدیوں بعد ملی ہوں۔

”بس بی بی جان! وہ ایسے ہی۔“

”میں سمجھتی آؤ ذرا اپنے نیم نرم ہاتھوں سے سر میں تیل ڈال دو۔ اتنے روز سے بال سوکھے ہو رہے ہیں۔“

”جی بہتر وہ آہستگی سے ان کے سر میں تیل لگانے لگی۔ آہٹ پر مڑ کر جو دیکھا تو فرمان کھڑے تھے۔ دل دھڑکا۔ ہاتھ کانپنے، اور ڈھیر سارا تیل بی بی جان کے سر سے ہوتا ہوا گردن پر پہنچ گیا۔ بدن کا سارا خون چہرے پر جھلک آیا۔ وہ کھڑے تھے، سینے پر ہاتھ باندھے اور اس کی بوکھلاہٹ سے محفوظ ہو رہے تھے۔ جو کبھی دوپٹہ درست کر رہی تھی۔ کبھی تیل کی بوتل رکھ رہی تھیں۔

”آداب!“ دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ بمشکل زبان بل پائی فرمان پھر آگے بڑھ آئے۔

”ولیکم آداب! مجھے آئے ہوئے تو دو ہفتے ہو چلے ہیں عالی! تم کہاں گم تھیں؟ نظر بھی نہیں آئیں۔“

یہ خواب تھا کہ حقیقت۔ جذبے لفظوں کی صورت فرمان کے لبوں تک آگئے تھے۔ یہ ہی تو عالی کا خواب تھا۔ یہ ہی تو خواہش تھی۔ یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ یہ فرمان تک کیسے پہنچ گئی۔ اس نے تو پہرے بٹھائے تھے اپنی سوچوں پر بھی۔ پھر فرمان تک اس کی خواہشوں کی آواز کیسے پہنچ گئی۔ پیشانی اور ہتھیلیوں میں نمی اتر آئی۔ وہاں کھڑا ہوتا دھڑ دھڑا تھا۔ وہ دھڑکنوں کو سنبھالتی بمشکل اپنے کمرے میں آئی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ اماں کی یہ تار کئی آج بہت بھلی لگ رہی تھی۔ یوں تو روز ہی ہوتا ہے۔ آمان پر تارے بھی ہوتے ہیں اور وہ کھڑکی میں یوں روز ہی ان سے باتیں کرتی یہ۔ مگر آج تک نہ کوئی تارا اس کے آنگن میں اتر اور نہ ہی ہوا کے یہ شریر جو کتنے کبھی اتنے بٹھائے تھے آج کیا بات تھی کہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ننھے ننھے تاروں کو دیکھتے ہوئے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ فرمان آئے ہوئے تھے تو گھر بھر خوش اور مصروف تھا اور اب وہ جا رہے تھے تو سب اُداس ویران سے تھے۔ سب اپنے اپنے خول میں واپس چلے گئے۔ کتنے دنوں تک بی بی جان کی پلکیں نہ خشک ہو سکیں اور عالی انتظار کی شاہراہ پر پھر آرزوؤں کے دپیکر۔ جلانے لگی۔



حمیرا کیا کیا یہ کر آئی تھی، جیسے گھر میں رونق بڑھ گئی تھی۔ حمیرا خود بھی بے حد خوش رہتی اور بہزاد کا بھی بے حد خیال رکھتی کہ اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کبھی کسی اور کو چاہتی تھی اس کے دل و دماغ میں اب صرف بہزاد تھے۔

”حمیرا! پتا ہے میں اپنی قسمت پر کس قدر نازاں اور خدا کا کتنا شکر گزار ہوں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں تمہیں پالوں گا۔“ بہزاد محبت سے سرشار لہجے میں کہتے۔

”کیوں بھلا میں کوئی ایسی سرچیز تو نہیں کہ آپ کو نہیں مل سکتی تھی“

”ہاں حمیرا! تم میرے لیے سیر سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ تمہیں کیا خبر میں نے تمہیں کتنا چاہا ہے۔ وہ بچپن ہی سے تم مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ یاد ہے میں بہانے بہانے سے تمہارا ہاتھ پکڑ لیا کرتا۔ اور اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتا اور تم بھاگ جاتیں۔ جب بڑے ہوئے تو اس خبر نے مجھے اندر سے توڑ ڈالا کہ تم اور شہزاد ایک دوسرے سے منسوب ہو۔ پھر میں نے خود پر ضبط کر لیا کہ جو میری نہیں میرے بھائی کی امانت ہے تو میں اس کے

کہ یا تو سب سے بڑی اولاد سے پیار ہوتا ہے یا پھر سب سے چھوٹی اولاد پیاری ہوتی ہے درمیان والی تو ایسے ہی صدقے کی ہوتی ہے، آج وہ کھوبی بی جان کتنی خوش ہیں۔

مگر مجال ہے، فرمان تمہارے پیچھے جو ہم نے انہیں مسکراتے دیکھا ہو۔“

”ارے چند! یہ تو وہم ہوتا ہے اولاد کا ورنہ والدین کے لیے ساری اولاد ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہاں ایک دور ہو جاتا ہے تو روشنی کم ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کی اور تو کوئی بات نہیں۔“ بی بی جان نے رخن کو ساتھ جو شکوہ کر رہے تھے۔

”بس فرمان! اب تیار ہو جاؤ۔ آغا جی تمہاری شادی کر کے ہی واپس جانے دیں گے۔“

قد سیدہ بیگم سب کو چائے پیش کرتی ہوئی بولیں تو فرمان اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

”بھابھی جان! پلےز ایسا مت سوچیں۔ ابھی مشکل سے تو میں سیٹ ہوا ہوں اور پھر میرے پاس کہاں ایک ہفتہ اور روکوں کا بمشکل۔ آپ آغا جی کو منع کر دیں۔“ فرمان لجاجت سے بولے۔

”ایک ہفتہ تو کیا ہوا؟ بھئی، شادی کے لیے کون سا صدیاں درکار ہوتی ہیں بس ایک آدھ گھنٹہ نکاح پڑھا جاتا ہے اور بات ختم ہو جاتی ہے۔ بھئی، میں تو آغا جی کی حامی ہوں۔ اب تو ہو جانی چاہیے شادی بھابھیاں فرمان کو چھوڑ رہی تھیں اور وہ جھینپتے ہوئے ان کو منع کر رہے تھے۔

”یہ تو مذاق کی بات تھی فرمان بیٹے! لیکن میں اور تمہارے آغا جی چاہتے ہیں کہ اب یہ کام ہو ہی نہ کیونکہ عالی کی اب عمر ہو گئی کہ اس کی شادی ہو جائے اور تم تو مزید دو سال دور تک رہے ہو۔ یہ تو مشکل لوگ باتیں۔ بنائیں گے۔ شادی ختم کر جاؤ۔ چاہو تو ساتھ لے جاؤ۔ چاہو تو۔“

”گستاخی مخاف بی بی جان! میں سب جانتا ہوں۔ سمجھتا ہوں لیکن عالی نے کہاں جانا ہے، کیا باتیں بتائیں گے۔ دو سال کی تو بات ہے۔ بس چٹکیوں میں گزر جائیں گے۔ پھر آپ کا جو حکم ہوگا۔ میرا ختم پائیں گی آپ۔“

فرمان نے خیم درمیان میں روک کر بی بی جان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا کر کہا تو ماں کا دل پسج گیا۔

”اچھا بیٹا! جیسے تمہاری خوشی، والدین تو بچوں کی خوشی میں ہی خوش رہتے ہیں۔“ بی بی جان کو مایوس مگر آج کیا کر سکتی تھیں۔

عالی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے انجائی خواہشوں کے حصار میں گھری ہوئی تھی کہ دروازے پر ہوئی۔ دل ایک دم دھڑک اٹھا کہ شاید فرمان ہوں اور اس سے شکوہ کرنے آئے ہوں اس نے دھڑکتے دل ساتھ دروازہ کھولا تو نسرین تھی۔

”کیا بات ہے نسرین؟ دھڑکتیں بے دم ہی ہونے لگیں۔ پاگل تھیں بھلا ایسی خواہشیں کیوں کرتی تم پوری نہ ہو سکتی ہوں۔ جن کی کوئی منزل نہ ہو۔“

”وہ عالی بی بی! آپ کو بی بی جان نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔“ نسرین جس طرح ہانپتی ہوئی اسی طرح چلی گئی اور عالی گہرا سانس لے کر آئینے کے سامنے آ گئی۔ اُلجھے بالوں کو ترتیب دے کر چننا

کیا اور دوپٹہ درست کر دئی ہوئی بی بی جان کے کمرے میں آ گئی۔

”آداب بی بی جان!“

لیں گے اور نہ آب کوئی خطرہ ہے، مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے، بہزاد! بخدا میں نے اس نظریے سے نہیں کہا تھا۔ میں تو آپ کے حکم کی پابند ہوں۔ جو حکم دیں گے۔ میرا سر تسلیم فرما لیں گے۔“

بیوی کی اتنی فرمانبرداری اور اظہار اعتماد نے بہزاد کو مستحضر کر دیا۔ وہ سکون ہو گئے۔

”تم ایسی باتیں نہ کیا کرو جیسا! اتنی بڑھی لکھی ہو، کوئی تم پر حکم نہیں چلا سکتا۔“

”آپ عزت، احترام اور حکم ماننا ہی میری تعلیم کا حصہ ہے۔ اسے میں کس طرح رد کر سکتی ہوں۔ آپ کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔“

”حیرا! اس واقعی بے حد خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم جیسی بیوی ملی ہے۔ ہم کل ہی گاؤں چلیں گے۔“

بہزاد نے فرط جذبات اور مسرت سے حیرا کے ہاتھ تھام لیے۔ تو وہ مسکرانے لگی۔

”آپ کہتا ہے کہ بہزاد! میں کیوں گاؤں جانا چاہ رہی ہوں؟“ حیرا سوالیہ نگاہوں سے شوہر کو دیکھنے لگی۔

”جناب آپ نے فلسفے میں ایم۔ اے کیا ہے ہم اگر یہ کہہ دیں کہ یہ دیوار ہے تو آپ کی منطق اسے دیلوں گے۔“

”یہ دیوار کے بجائے کچھ اور ثابت کر سکتی ہے۔ آپ کی کیا بات ہے جی۔“

”چلیے بتادیں۔ کیوں جانا چاہتی ہیں۔“

بہزاد کی بات پر حیرا لپٹی ہی دیر ہی پھر بنجیدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ کو معلوم ہے بہزاد! کہ تاجی نے آدمی جانیداد میرے نام کر دی ہے۔“ حیرا ان کی طرف گھولی۔

”ہاں معلوم ہے، مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں“ بہزاد کو شہباز کی تلخ گفتگوا یاد آ گئی۔

”آپ کو نہیں سمجھتے تھے کہ دلچسپی، میں اپنے حق سے دست بردار نہیں ہو سکتی آدمی جاگیر ہے، کوئی مذاق نہیں۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ شہباز بھائی درست کہتے تھے۔“ بہزاد نے غور سے حیرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا درست کہتے تھے؟“ حیرا نے حیرانی سے بہزاد کو دیکھا۔

”یہ ہی کہ تم جاگیر سے دست بردار نہیں ہو گئی۔“

”تو کیا اسے سلسلے میں آپ کی بھائی جی سے بات ہوئی تھی؟“ اب حیرا مزید حیران ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”ہاں شادی سے پہلے جب وہ مہر کی رقم بدھوانے آئے تھے تب ہی انہوں نے مجھ سے جاگیر کی بات کی تھی کہ میں نہیں مجبور کروں کہ تم دست بردار ہو جاؤ۔“

”اور آپ نے کیا کہا تھا؟“ حیرا بے قراری سے درمیان میں بول پڑی۔

”میں نے یہ سراسر حیرا کا معاملہ ہے، وہ دست بردار ہونا چاہے گی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ فی الحال میں کوئی فیصلہ کرنے کا حجاز نہیں۔ اس پر وہ ناراض تو بہت ہوئے تھے مگر میں نہیں مانا۔“

”شکر ہے خدا کا، میں تو ڈری گئی تھی کیونکہ اگر آپ کوئی اقرار کر لیتے تو میں پابند ہو جاتی۔ اب تو اپنا حق لے کر چھوڑوں گی۔ جب اس جاگیر پر میرا حق ہے تو میں کیوں دست بردار ہو جاؤں۔“

حیرا نے شکر ادا کیا کہ بہزاد نے کوئی بات نہیں کر دی۔

”حیرا! ویسے مانتا نہ کرنا۔ جاگیر ہمیں لے کر کیا کرنا ہے، اللہ کا دیا میرے پاس کیا نہیں چھوڑ دیا، کیا درست ہے۔ جھگڑا کر کے دل میلا کرنے کی۔ شہباز بھائی طبیعت کے بہت سخت ہیں۔“

”میں بھی ان ہی کی بہن ہوں۔ بہزاد خدا کی قسم مجھے آپ کی محبت اور اعتماد کے علاوہ کسی دوسری چیز کی درست نہیں مگر میں آپ کو بتا دوں کہ یہ جاگیر میں مرکز بھی بھائی جی کو نہیں دوں گی۔ کیوں؟ یہ آپ کو بتا دوں تو

لیے اس قسم کی سوچ رکھ کر گناہ گار ہو رہا ہوں۔ مگر دل آخروں ہوتا ہے۔ عقل کی کوئی بات اس کے پلے تھوڑی ہوتی ہے۔ کسی طور پر بھی تمہاری چاہت سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تم میری کی بن کر اس گھر میں آ جاؤ گی تو میں اس گھر سے چلا جاؤں گا۔ کم از کم مجھ میں تو یہ ہمت نہیں تھی کہ تمہیں کسی اور ہوتے ہوئے دیکھوں۔ خواہ وہ میرا ہی بھائی کیوں نہ ہو اور تم یوں اچانک بہار بن کر میری زندگی میں آ گئے۔ خود کو یقین دلانا مشکل ہو گیا میرے لیے؟

بہزاد فطرتاً بہت خاموش تھے اور کچھ صابر شا کر قسم کے بھی تھے اور خود پر قابو بھی تھا اسی لیے حیرا کا چاہنے کے باوجود کبھی کسی کو خبر نہیں ہو سکتی تھی، سوائے شہزاد کے جس نے ان کی ڈائری پڑھ لی تھی۔

”پہلے، اب یقین کر لیجئے کہ میں آپ کو مل چکی ہوں۔ ویسے آپ ہیں بڑے چپے رستم قسم سے کچھ احساس تک بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ اس قدر چاہتے ہیں مجھے۔ میں خود بھی اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ آپ جیسا نہ صرف چاہنے والا بلکہ عزت کرنے والا شوہر ملا۔“ حیرا نے بھی ان کی محبت کے جواب میں ہر پور محبت کا اظہار کیا۔ وہ اپنے خلوص اور احترام میں کی نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔

”بہزاد! آپ کو اگر فرصت ہو تو گاؤں آئیں۔“ حیرا چائے کے برتن میز پر رکھتی ہوئی بولی تو بہزاد حیرانی سے ان کو دیکھنے لگے۔

”ویسے تو حیرا! مجھے قطعی کوئی اعتراض نہیں مگر ابھی کل ہی تو ماموں جان اور ممانی جان گئے ہیں۔“

”کیوں آپ کا کیا خیال ہے، میں آگئی ہوں تو اپنے بھائی، بھابی اور بچوں کو بھول گئی ہوں۔ ہر دم آتے ہیں۔ بھائی جی تو بھابی کو لائیں گے نہیں، ہم خود ہی مل آتے ہیں۔ میرا دل آداس ہے۔“

”شہباز بھائی تو آپ کا کتر ستر سا کر لاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہماری بہن کالے پانی میں بیابھی گئی۔“

”جہاں نہ ہم جا سکتے ہیں اور نہ وہ آ سکتی ہیں۔“ ڈھکے کے سائے بہزاد کے چہرے پر لہرانے لگے۔

”میں آپ کی اس بات کا کیا مطلب سمجھوں بہزاد! نہ جاؤں کیا؟“

حیرا کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ بہزاد چونکے اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ حیرا کے چہرے کی تحریکات کو ترپا گئی۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حیرا ان کی اس بات کا یہ مطلب لے گی۔

”حیرا! بخدا میرا تو کوئی ایسا مطلب نہیں تھا اور میں اتنا گرا ہوا بھی نہیں کہ اگر میری بہن تمہارے بھائی کے گھر دھکی ہے تو میں تم سے بدلہ لوں۔ نہیں حیرا! ایسا تم نے سوچا ہی کیوں؟ تمہیں کیا خبر تم میری کتنی راتوں کا دعاؤں کا شکر ہو۔ میں تمہیں چاہتا ہی نہیں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔“

بہزاد کے دل کو یہ بات لگ گئی تھی۔ ان کی فطرت کی یہ سب سے بڑی کمزوری تھی کہ کوئی ان کو غلط سمجھ کر حیرا اٹھ کر ان کے قریب آ گئی۔

”چاہتوں کی تو آپ بات ہی نہ کریں بہزاد! مجھے یاد ہے بھائی جی بھی منہ بھائی کے لیے اتنے دعا دیوانے ہو رہے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اگر منہ نہ ملی تو یا تو اس کو اغوا کر لیں گے یا پھر خود کشی کر لیں گے اور پھر پھوپھو بھانجا جان تیار نہیں تھے۔ ان کی حالت دیکھتے ہوئے ان کو ہائی بھرنی پڑی تھی۔ اور یہ بھی مجھے یاد ہے کہ شادی کے بعد سے اب تک بھائی جی نے بھابی کو کھانا کھانے نہیں لینے دیا۔ ہر وقت طنز کے تیراں بیچارے پر ہر سانس رہتے ہیں۔ شادی سے پہلے بھی کبھی میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ آپ لوگ مجھ سے منہ بھابی والا بدلہ

نہرے ہوئے انداز میں بولی۔  
 ”خدا نہ کرے حیر! ہمارا تو ایسا کوئی مطلب نہیں۔ بس ذرا ایسے ہی آسید۔ کیا ضرورت تھی ایسی باتوں کی۔“ کلکل سب کے سامنے ہی بیوی سے اُلجھ پڑے ان کو بہت ناگوار گزر رہی تھی آسید کی بات۔  
 ”اچھا نہیں کروں گی۔ آئندہ مگر پھر چھپ چھپ کر رویا بھی نہ کریں۔ کہ ہماری بہن کے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔ وہ ہو رہا ہے۔“

آسید اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ اچھا بھلا ماحول خراب ہو گیا تھا۔ حیرا کو افسوس ہونے لگا۔ کہ اس کی وجہ سے سب ہوا۔ ”حیرا بیٹی! تم کوئی ملال نہ کرنا۔ جب تمہارا دل چاہے چلی جانا اور جب دل چاہے آ جانا۔ اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ بیٹی! ہماری بیٹی کی قسمت اس کے ساتھ، بہن! ادب! تم سارے کام چھوڑ کر میری بہو کو میکے لے جاؤ۔ میں جانتی ہوں بیٹیاں میکے کے لیے کتنی بے چین رہتی ہیں۔“  
 ”شکر ہے پھوپھو جان! کاش میں منزہ بھابی کے لیے کچھ کر سکوں اور آپ لوگوں کو سکون دے سکوں۔“  
 حیرا نے اٹھ کر ساس کے ہاتھ آٹھ کھوں سے لگا لیے۔



”باؤ جی! وہ رشید آیا ہے۔ اور آپ سے ملنا چاہتا ہے جی۔“  
 ”اتنی کہاں ہیں؟ ان کو تو پتا نہیں چلا رشید کا۔“ شہباز ایک دم کھڑے ہو گئے رشید کا سن کر۔  
 ”نہیں جی، وہ تو سویرے سے زمینوں پر چلے گئے ہیں۔ رشید کو کہاں بٹھاؤں جی۔“  
 ”میرے سپر پر بٹھاؤ۔ ظاہر ہے مردانے میں بٹھاؤ جا کر، میں آ رہا ہوں۔ چائے پانی پوچھو اسے۔“  
 ”بہت بہتر جی۔“ رفیق ہاتھ باندھے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد خود شہباز پہنچ گئے تو رشید کھڑا ہو گیا۔  
 ”سلام باؤ جی۔!“ وہ مودب ہو کر بولا۔ شہباز صوفے پر بیٹھ گئے۔  
 ”کیسے آتا ہو رشید؟ میرے یار کا کیا حال ہے؟ کوئی خیر خبر ہی نہیں اس کی تو۔“

”وہ می ان کا پیغام لے کر ہی تو آیا ہوں جی۔ انہوں نے آپ کو آج رات اپنے ڈیرے پر بلایا ہے جی۔“  
 ”ہوں! ٹھیک ہے۔ تم کھانا دھو رکھاؤ اور جاؤ۔ میں پہنچ جاؤں گا۔ رفیق، رشید کا خیال رکھنا۔“  
 شہباز نے باہر نکلے ہوئے کہا تو، رفیق، رشید کی مدارات میں لگ گیا۔  
 ”میں آج رات عالم خان کے ڈیرے پر ہوں گا۔“ شہباز نے جیسے منزہ کو اطلاع دی۔  
 ”مگر شہباز، آج رات تو آپ نے کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔ آپ کو معلوم ہے، میں ایک ہفتے سے بیمار ہوں۔ تکلیف کی وجہ سے مجھ سے ہلا نہیں جا رہا۔ اور میں اسی انتظار میں تھی کہ آپ۔“

”اوہ تو تقریر بند کر دو کوئی مر نہیں جاؤں تم۔ ایک آدھ دن تو اور نکال لوگی۔ نہ نکال سکو تو کسی ملازم کے ساتھ چل جانا۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔“ شہباز ان کی بات کا ت کر سخت لہجے میں بولے تو منزہ بیسوں کود با کر رہ گئیں۔  
 جواس تکلیف کی نہیں تھیں، شہباز کی بے بسی کی تھیں۔  
 ”شہباز! آپ کو معلوم ہے۔ میں آج تک کسی ملازم کے ساتھ نہیں نکلی۔“  
 ”تو پھر بھاڑ میں جاؤ، کم از کم میرے پاس تو وقت نہیں ہے۔“ شہباز تیزی سے باہر نکل گئے اور منزہ بستر پر گر گئیں۔ تکلیف سے وہ بے حال ہو رہی تھیں۔ اسی امید پر بیسوں کود بائے ہوئے تھیں کہ خود شہباز نے ڈاکٹر

شاید آپ خیر امید ہے آپ اس معاملے میں مجھے آزاد چھوڑ دیں گے۔“  
 حیرا نے گہرا سانس لیا اور اجازت کے لیے شوہر کی طرف منظر نگاہوں سے دیکھنے لگی۔  
 ”اچھا جیسے تمہاری خوشی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن بیچا کر۔ یہ دولت جائیداد کے جھگڑے سرگرد رہتے ہیں۔ صرف جاگیر کی ہوس رہ جاتی ہے اور انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ تمہارا بھائی تو دیے لمبے سخت ہے۔ اور تم میری اکلونی بیوی ہو۔ کہیں آپ پار ہو گئیں تو۔“  
 ”تو دوسری لے آئیے گا۔ کوئی کمی نہیں۔“ حیرا نے اسی طرح مسکرا کر جواب دیا۔  
 ”کوئی لڑکی حیرا نہیں بن سکتی، حیرا! تم کیا جاتو تم میرے لیے کیا ہو۔“  
 ”اگر ایک دوسرے کی جھوٹی تعریفوں سے فرصت مل گئی ہو تو باہر آ جاؤ۔ سب چائے پر انتظار کر رہے باہر سے شانو بھائی نے ہانک لگائی تو دونوں مسکراتے ہوئے باہر آ گئے۔

”ماشاء اللہ۔ کتنے اچھے لگ رہے ہیں میرے بچے۔ اللہ شاد آؤ باؤ رکھے۔ حیرا بیٹی تم یہاں میرا آ جاؤ۔“ زاہدہ بیگم نے اپنے قریب والی کرسی پر حیرا کو بٹھا لیا تو آسید بھابی نے کچھ نیرمی سے نگاہ حیرا جس کا مطلب حیرا قطعی نہ سمجھ پائی۔ حالانکہ وہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔  
 ”بہن! ادب! تم کچھ دنوں کے لیے لاہور چلے جاؤ۔ مجھے یہاں بہت کام ہے ورنہ میں خود چلا جاتا۔ تمہارا ساتھ لے جاؤ۔ ذرا گھوم آ گئی۔ تم تو اسے کہیں بھی لے کر نہیں گئے۔“ کلکل بھائی کپ اٹھاتے ہوئے۔  
 ”کیا کوئی ضروری کام ہے، کلکل؟“ بہن! ادب! پہلے حیرا پھر کلکل کی طرف دیکھا۔  
 ”ہاں ظاہر ہے، ورنہ میں کیوں کہتا۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا؟“  
 ”نہیں بھئی! اعتراض تو نہیں، وہ اصل میں حیرا کچھ دنوں کے لیے گاؤں جانا چاہتی ہے۔ اسے رہا تھا۔“

”گاؤں، ابھی پرسوں ہی تو ماموں اور ممانی گئے ہیں اور خود بھی یہ کافی دن رہ کر آئی ہے۔ اللہ اداں ہو گئی، بی بی! اب خود کو سسرال میں رہنے کا عادی بناؤ۔ ماں باپ سب کے ہوتے ہیں۔“  
 آسید بھابی نے کچھ ایسے منہ بنا کر کہا کہ بہن! ادب! حیرا نے اسے نہیں دیکھنے لگے۔ جواب تو حیرا نے ان کے مکررہ بیویوں کی گستاخی کو اپنی تعلیم کی توہین سمجھتی تھی۔ اس لیے خاموش رہی۔ اور زاہدہ بیگم کی طرف دیکھا۔  
 ”تم جانا چاہتی ہو حیرا بیٹی تو چلی جاؤ۔“ زاہدہ بیگم جلدی سے بول پڑیں۔ کہ وہ دل برداشتہ نہ ہو۔  
 ”اصل میں پھوپھو جان، بھائی جی اور بھابی بچوں کو دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ آپ اجازت دے حیرا! ہنگی سے بولتی ہوئی اصل بات چھپا گئی۔

”دل تو ہمارا بھی منزہ اور بچوں کو دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ حیرا! مگر اس کو سمجھنے کا کسی کو خیال کبھی؟“ گولہ آسید کی باتیں سب کے دل کی آواز تھیں۔ مگر اس وقت کسی کو اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ حیرا شرمندہ کیا جائے۔ خصوصاً بہن! ادب! یہ بات سخت ناگوار گزر رہی تھی۔ مگر انہوں نے ہمیشہ سب کا ادب کا لیے چپ رہے۔ ”بھابی! میں سب جانتی ہوں مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں اب آپ کے اختیار آپ چاہیں تو مجھ سے میرے بھائی کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ جو کچھ منزہ بھابی کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ لے سکتے ہیں۔ میرے لہوں پر آف نہیں آئے گی۔ کیونکہ میں آپ لوگوں کو حق بجانب سمجھتی ہوں۔“

پھر میرا نے خود ہی منظرہ کو جو گردہ کی تکلیف سے تڑپ رہی تھیں۔ چادر اڑھائی اُدھر سہارا دے کر گاڑی تک لے آئیں۔ ڈاکٹر نے فوری آپریشن کا کہہ کر جلدی سے شہر جانے کو کہا۔

”بہزاد! آپ ای کو گھر فون کریں دیں کہ ہم شہر جا رہے ہیں۔ بھابھی کے آپریشن کے لیے، وہ بھی تاجی کو لے کر شہر ہی آ جائیں۔“

”جیرا میرے بچے۔ ان کو بلاؤ جیرا! میں مر گئی تو۔ تو ان کو باپ کے پاس نہ رہنے دینا جیرا بہزاد۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں آپا! آپ خود اپنے بچوں کو پالیں گی۔ مت کریں ایسی باتیں۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ بہزاد نے دُکھ سے کہتے ہوئے بہن کو ساتھ لگایا۔

بھابھی جان! آپ تو اتنی بہادر ہیں، دوسروں کی ہمت بندھاتی ہیں، کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو، یہ ذرا سی تکلیف ہے۔ انشاء اللہ چھوٹے سے آپریشن کے بعد آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔“

بہزاد اور جیرا وہیں سے منظرہ کو لے کر شہر آ گئے۔ ہاسپٹل میں ایڈمٹ کر کر گھر پر اطلاع دی تو سب تڑپ کر پہنچ گئے۔ عذرا بیگم بھی پہنچ گئیں۔ سب ہی پریشان تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے۔ صدیقہ بیگم اور ظہیر احمد بھی بچوں کو لے کر آ گئے۔ منظرہ کا آپریشن ہو رہا تھا اور سب دعائیں مانگ رہے تھے۔

”خدا یا میری بچی، کو صحت اور زندگی عطا فرما، تو پہلے ہی بہت دُکھی ہے۔ میری بیٹی کو بچالے۔“

زادہ بیگم جدے میں مری گری۔ گوگرد اری تھیں۔ ماں یوں گڑگڑا کر اولاد کے لیے دعا مانگے اور خدا کی رحیم ذات کو جوش نہ آئے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ اللہ کی رحمت کا نزول ہو چکا تھا۔ منظرہ کا آپریشن کامیاب ہو گیا تو سب میں زندگی کی لہر دو گئی۔ اب سب سجدہ شکر بجالا رہے تھے۔ منظرہ نے سب سے پہلے اپنے بچوں کو ساتھ لگایا۔ سب ہی آ رہے تھے۔ نہیں آئے تھے تو شہباز نہیں آئے تھے۔ وہ موت کے منہ سے لوٹی تھیں اور شہباز ان کو دیکھنے نہیں آئے تھے۔ جب کہ بار بار فون کیا جا رہا تھا لیکن وہ گھر پر نہ تھے۔ رشتے نے بتایا کہ انہوں نے باؤبی کو سب بتا دیا ہے۔ مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شہباز کے اس رویے پر سب ہی دُکھی ہو رہے تھے۔ مگر کسی نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ مگر آسیر کو بہت تاؤ آ رہا تھا۔

”ابھی کسی کیا بے حسی کہ بیوی موت کے منہ سے لوٹی ہے اور شوہر کو فرصت نہیں حال پوچھنے کی۔“

”بھابھی! رہنے دیں، ہوگی کوئی مصروفیت۔ ہم سب جو ہیں منظرہ کے پاس۔“

عذرا بیگم نے ہاتھ دبا کر آسیر بیگم کو خاموش رہنے کو کہا۔ جیرا ادھ سے منظرہ کو دیکھتی رہی۔

”بھابھی! آپ مجھے معاف کر دیں۔ بھائی جان کے بدلے میں، میں ہاتھ باندھ کر معافی مانگتی ہوں۔“

”جیرا میری جان میں نے کوئی شکوہ کوئی شکایت کی ہے۔ میری بہن یہ تو میر قسمت میں لکھا ہوا ہے۔ مجھے تو کس تقدیر سے شکوہ نہیں جس نے میری ایسی تقدیر لکھی تو۔ تم تو میری پیاری بہن ہو، میرے بھائی کی شریک زندگی ہو۔ میرے دل میں تو کوئی ملال نہیں۔ جانے یہ سب ایسا کیوں سوچ رہے ہیں بھلا ان کے آجائے سے کیا ہوگا۔ تو زخمِ مسل جائیں گے اور نہ ہی میسوں میں کی آئے گی۔ تم دل نہ اٹھ کر دو۔ چلو چہرہ صاف کر دو۔ بہزاد نے والا ہے۔“

منظرہ نے بمشکل آنسو ضبط کیے۔ اور بڑھ کر جیرا کا چہرہ تمام لپکا تو اس نے ان کے ہاتھ چوم لیے۔

کے پاس لے جانے کو کہا تھا۔ اب میں وقت پر تڑپا ہوا چھوڑ گئے تھے۔

”شہباز! میں نے کیا بگاڑ دیا ہے آپ کا۔ کیوں آپ میری زخمی روح کو خادوں پر محسوس رہے ہیں جذبے اتنے ناپائیدار ہوتے ہیں کہ ذرا وقت گزرے تو اپنا وجود کھود دیتے ہیں۔ یہ آپ ہی تو تھے۔ شہباز! کرتے تھے۔ تم نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا اور میں مل گئی ہوں تو مجھے مار رہے ہیں۔ یہ ہی تھی آپ کی محبت۔ شہباز! کتنی ہی دیر منظرہ تڑپتی رہیں۔ صدیقہ بیگم بھی کچھ بیمار تھیں۔ اپنے کمرے میں تھیں۔ بچوں کی کچھ خبر نہ کر کیا کر رہے ہیں۔ کہاں ہیں۔ کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں، وہ تو درد سے تڑپ رہی تھیں۔ اسی طرح تڑپتے تو شہباز بیگم بے ہوش ہو گئیں۔ ان کا سر بیڈ سے نیچے ڈھلک گیا۔ اسی وقت جیرا اور بہزاد اندر داخل ہوئے۔ کودیدہ مردوں تڑپ کر ان کی طرف بڑھے۔

آپا۔ آپا۔“ بہزاد نے تڑپ کر آپا کا سراپائی گود میں رکھ لیا۔

”بھابھی جان۔ بھابھی کیا ہوا ہے آپ کو، انی جان! کہاں ہیں آپ بھابی جی۔“

جیرا جانے کیا سمجھیں، پوری قوت سے چلانے لگیں۔ بہزاد مڑی طرح گھبرا گئے تھے۔ بار بار منظرہ کے لیے پرانی کے چھیننے ڈال رہے تھے۔ جیرا جلدی سے صدیقہ بیگم کے کمرے میں پہنچی تھی۔

”جیرا! میری بچی تم۔ خیریت تو ہے ناں، یوں بوکھلائی ہوئی کیوں ہو۔“ وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھیں۔

”اور آپ کو کچھ خبر ہے انی! کہ بھابھی کی کیا حالت ہے وہ مر رہی ہیں اور آپ یوں بے خبر ہیں اور وہ تو انسان ہیں ہی نہیں۔“ جیرا کو بری طرح غصہ آ گیا اور بولے گئی۔

”خدا یا خیر، کیا ہو گیا۔ منظرہ کو اور وہ تو کہہ رہی تھی کہ شہباز اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہے۔“

”ہونہ! شہباز اسے خدا کے پاس تو پہنچا سکتا ہے۔ مگر کچھ اور نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے پہنچیں۔“

فصتے میں جیرا تمام ادب، احترام بھول گئی۔ صدیقہ بیگم تقریباً بھاگی ہوئی منظرہ کے کمرے میں پہنچی۔

”بہزاد! مجھے کوئی درد داد۔ میں مر جاؤں گی۔ اس تکلیف سے۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔“

منظرہ درد سے تڑپ رہی تھیں۔ بہزاد کا بس چلنا تو وہ بہن کی تمام تکلیفیں لے لیتے۔

”منظرہ! میری بچی! میں تو کبھی کہ تم لوگ ڈاکٹر کے پاس جا چکے ہو۔“ صدیقہ بیگم منظرہ کی طرف بڑھی اور ان کا سراپائی گود میں لے کر پیار کرنے لگیں۔ بہزاد نے شکایت بھری نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

”تو ممانی جان آپ گھر پر ہی تھیں۔“ وہ سلام دعا بھول کر ایسے بولے جیسے کہہ رہے ہوں کہ آپ گھر رہ کر بھی اتنی بے خبر تھی کہ کسی کے تڑپنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

”ہاں بیٹے! میں۔ تو خود جوڑوں کے درد کی مرئیض ہوں۔ صبح ہی تو ان دونوں میں بات ہوئی تھا شہباز نے کہا تھا کہ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا مگر اب وہ کہاں ہے؟“ صدیقہ بیگم کچھ نادامی تھیں۔

”وہ عالم خان کے ڈیرے پر گئے ہیں انی جان۔“ منظرہ تکلیف میں بمشکل بولیں۔

”اور بیٹی! پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں خود لے جاتی۔“

”چلیں بھابھی! میں نے رشتے کو گاڑی لانے کو کہا ہے۔ آپ تیار ہو جائیں۔ انی آپ بچوں کے رہیں میں اور بہزاد بھابھی کو لے جاتے ہیں۔





”کچھ تو بتاؤ فرمان! آخر ہوا کیا ہے؟ کیا بات کی ہے مس سوزی نے۔“  
 ”فرید۔! فرید! تمہارے والد اب حیات نہیں ہیں۔“

”کیا بتا جان۔“ فرید دیوار سے سر ٹکرا دیا پھر فرمان اور مس سوزی سے فرید کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ چونکہ بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ اس لیے اختر صاحب کے ہاں بھی نہ جاسکے لیکن بارش تھمی تو اختر صاحب اور مسعود محمود آ گئے۔ پھر فرید ماموں کے گلے لگ کر تڑپے رہے تیسرے روز وہ سب پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ فرمان کا دل بھی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی چلے جائیں۔ فرید کی حالت ان سے دیکھی نہیں جاری تھی۔ فرید کے چلے جانے کے بعد فرمان بالکل تنہا سے ہو گئے۔ مس سوزی بہت کوشش کرتیں کہ یہ بور نہ ہوں۔ مگر کہاں تک۔ دل بہلتا۔ فرمان روایتی سے پاکستانی تھے۔ انگش بول بول کر وہ خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کرتے، اُن کا جی چاہتا۔ کوئی اپنا ہو۔ اس دیار غیر میں اپنا شناسا ہو جس سے وہ اپنی قومی زبان اردو میں بات کریں۔ اپنے ملک کی مقامی زبانوں میں بات کریں۔ اپنے دیس کی بات کریں۔ اس کی وادیوں کی، میدانوں کی، اس کے گھساروں کی بات کریں۔ مگر یہاں آ کر انہوں نے تو اختر صاحب کی فیملی کے سوا جتنے بھی پاکستانی دیکھے تھے، سب اسی ماحول میں رچ گئے تھے۔

ان دنوں وہ شدت سے کسی ہم وطن کی قربت چاہتے تھے۔ یونیورسٹی میں بھی تو آج کل دل نہیں لگ رہا تھا۔ آج ویسے بھی چھٹی تھی، موسم حسبِ عادت برہم تھا۔ ٹھنڈے بادلوں نے آسمان کی رنگت کو چھپا رکھا تھا فرمان کاہلی سے لیے رہے آج مس سوزی بھی کہیں چلی گئی تھیں۔ بہت بوریت ہو رہی تھی۔ وہ اٹھے، گرم پٹڑے لاوے اور۔ بے مقصد ہی گھومتے رہے۔ کبھی کسی پارک میں چلے جاتے۔ کبھی کسی شاہجنگ سینٹر میں کاروبار زندگی دیکھنے لگتے ایک جزل اسٹور سے انہوں نے شیونگ کریم وغیرہ لی، جیسے ہی واپسی کے لیے نوے ان کی نظریں ایک جگہ ٹھہر گئیں۔ سیاہ شیر وانی، سفید سلوار اور اوپر پچھڑی کوئی خالص پاکستانی تھا۔ عمر بھی ان کے والد کے برابر تھی۔ فرمان کا دل شدت سے چاہا کہ ان سے بات کریں ان کو بے حد خوشی ہو رہی تھی، انہیں دیکھ کر۔ وہ خریداری میں مصروف تھے، جب وہ فارغ ہو کر اپنی کار کی طرف بڑھے تو فرمان بجلی کی کی تیزی کے ساتھ ان کی طرف لپکے، گویا کہ ذرا سی دیر ہو گئی تو وہ یہ تادر موقع کھودیں گے اور ایسا وہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ غیروں کی اس بستی میں کوئی اپنا نظر آ جائے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا۔ وہ صاحب فرمان کے۔ جذبات اور بے چینی سے بے خبر خرید ہوا سامان گاڑی میں سیٹ کر رہے تھے۔ فرمان تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

”السلام علیکم جی!۔“ فرمان نے بری خوش خلقی، سے گرم جوشی سے مصافحے کے لیے ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔

”علیکم السلام نوجوان!۔ انہوں نے بھی بڑے تپاک سے اُن کے غلوں کا جواب دیا۔

”میں جی پاکستانی ہوں۔“ فرمان نے خود ہی بتایا تو وہ صاحب مسکرائے گئے۔

”صاحبزادے! اس میں بتانے والی کیا بات ہے۔ کسی بھی دوسرے ملک میں انسان کی شناخت، اس کا لباس اور زبان ہوتی ہے۔ اور تمہارا لباس اور زبان تمہارے پاکستانی ہونے کا ثبوت ہیں جس طرح میرے لباس نے تمہیں بتایا کہ میں پاکستان ہوں اور تم میری طرف بڑھے، مجھے برہان یزدانی کہتے ہیں اور گزشتہ پندرہ برس

”ہاں تو اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے کر لیں گے شادی کے بعد محبت بھی۔“ فرمان ہانک کر اور قریب ہوتے ہوئے بولے۔

”یارتہم کیسی باتیں کرتے ہو؟“ فرید یوں بولے جیسے ان کو فرمان کی یہ بات پسند نہ آئی ہو۔

”کیوں اب کیا ہو گیا؟ کیا غلط کہہ دیا؟“ فرمان مسکرا کر فرید کو دیکھنے لگے۔

”اجمق ہو تم بھی۔ بھلا محبت بھی کی جاتی ہے، ارے یہ تو وہ آگ ہے جو خود ہی بھڑک جاتی ہے لگتی جاتی۔ فرید بڑے جذب سے بول رہے تھے۔ یادوں کے تصور میں جانے کون اُبھر ڈوب رہا تھا۔

”چھوڑ یا! یہ افسانوی باتیں۔ پتا ہے مجھے کبھی بھی ایسی باتیں سنا نہیں کر سکتیں۔ باقی تمام محبتوں میرا ایمان ہے مگر یہ لوگ جس محبت کا تذکرہ کرتے ہیں ناں! یا جو رمانوی داستانیں سن رہی ہیں، مجھے تو ان اعتماد ہی نہیں کسی غیر لڑکے لڑکی کے درمیان پائی جانے والی محبت کم از کم میں تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہاں خوبی اور محبت سے محبت تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر۔ نہ۔ نہ۔ بابا میں تو یقین نہیں سکتا کہ فلاں لڑکے نے فلاں لڑکی کے لیے ہاتھ دے دی وغیرہ وغیرہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سر راہ ملنے والی لڑکی یا لڑکے کے لیے جان جیسی انمول چیز گموا دی چلا اپنی حماقت ہے اور کچھ نہیں۔“ فرمان ہنس دیے۔

۔ خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اس سے قبل کہ فرید کچھ کہتے ہیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”اس وقت تو سوائے مس سوزی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یا فرید! دروازہ کھول دے۔“ فرمان کا بہت سردی لگ رہی تھی، اس لیے وہ کاہلی سے بولے۔

”جانتے ہو ناں کہ مس سوزی کو تہہ باری بھولی صورت اچھی لگتی ہے، اس لیے اتراتے ہو اور اس وقت وہ تم سے ہی سننے آئی ہوں گی۔ کال کہیں کا۔“ فرید کو اٹھنا پڑا تھا اس لیے وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”آپنے مس سوزی! کیا لائی ہیں آپ ہمارے کھانے کے لیے؟“ فرید نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا۔ مس سوزی سنجیدگی سے کمزری ان کو دیکھتی رہی۔ فرید کے لبوں پر شونخ سی مسکراہٹ آ گئی۔

”بہت اچھا لگ رہا ہوں مس سوزی کیا؟“ وہ تھوڑا سا آگے جبک کر بولے مگر مس سوزی اسی خاموشی سے فرمان کی طرف بڑھ گئیں۔ اور ان کا ہاتھ تھام کر باہر لے گئیں دونوں ہی گھبرا گئے۔

فرید دور رکھڑے اس بات کے بارے میں سوچنے لگے۔ جو مس سوزی فرمان سے کرنے سے انہیں۔

”فرمان! ابھی ابھی فون آیا ہے کہ فرید کے فادر کی ڈیڑھ ہو گئی ہے۔ تم خود ہی اس کو بتا دینا میرے باپ کے بعد میں۔ میں اسے دیکھ ہوتا نہیں دیکھ سکوں گی۔

”اوہ خدا یا کیا ہو گیا۔“ فرمان وہیں دیوار سے ٹپک لگا کر بیٹھ گئے مس سوزی نے بچے چلی گئیں۔

”فرمان۔ فرمان کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا۔ فرمان!“ فرید نے آ کر فرمان کو جھنجھوڑا۔ فرمان ان کے گلے لگ کر رو پڑے۔ مزید اور بھی گھبرا گئے۔

رہیں۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئیں۔ ایسے میں جب انسان صاحب فرماں ہو تو دل ایسوں کو چاہتا ہے ان کی قربت شدت سے چاہتا ہے۔ فرمان کو بھی ان دنوں گھر اور بی بی جان شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ جوان کی ذرا سی تکلیف پر بھی تڑپ جایا کرتی تھیں۔ پتی سے لگی رہتیں۔ صدقے اتار تیں سب بہن بھائی دل جوئی کے لیے آتے رہے بکراں دیوار غیر میں کوئی بھی تو اپنا نہیں تھا۔“

آج فرید شدت سے یاد آ رہے تھے جن کا خط آیا تھا کہ وہ شاید اب اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ کیونکہ والد کے بعد ان پر ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں اس کا بھی فرمان کو بہت دکھ تھا۔ ایسے میں سب بہت یاد آ رہے تھے، دل چاہ رہا تھا اڑ کر وطن چلے جائیں۔ جہاں سب اپنے تھے، چھپ چھپا ہوا تھا۔ درود یوار سے محبت اور اپنائیت نکلتی تھی۔ یہاں کے غیریت بھرے ماحول میں تو سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ آج تین سال گزر جانے کے بعد بھی ان کو اپنا فیملہ غلغلہ رہا تھا۔ کہاں اپنا ملک اپنے لوگ اور کہاں اجنبی چہرے، درود یوار پرائے۔ کافی دن تک وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بیمار رہنے کے بعد صحت یاب ہوئے۔ شدت سے دل چاہا ہر بان یزدانی سے ملیں۔ اسی وقت وہ اٹھے۔ کپڑے نکالے اور تیار ہونے لگے۔ نیچے آئے اور مس سوزی کو ہر بان یزدانی کا ایڈریس دکھا کر پوچھنے لگے۔ وہ زیادہ گھومتے نہیں تھے، اس لیے زیادہ تر جگہیں ان کے لیے اجنبی تھیں۔

اوکے مس سوزی بائے۔“ وہ ایڈریس سمجھ کر مس سوزی کی گاڑی کی چابی لیتے ہوئے بولے۔  
”کب تک آؤ گے فرمان؟“ مس سوزی اخبار سامنے سے ہٹا کر پوچھ رہی تھیں۔  
”یزدانی صاحب مل گئے تو کچھ پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے اور نہ ملے تو ابھی آ جاؤں گا۔“  
فرمان کو یزدانی صاحب کا گھر تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ تیل پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ دھڑکتے دل سے دعا کر رہے تھے کہ یزدانی صاحب گھر پر ہوں۔

”آداب!“ جیسے ہی دروازہ کھلا، انہوں نے سلام جھاڑ دیا۔ مگر نگاہیں مرمریں حسین بیروں سے اٹھتی ہوئی حسین صورت پر ٹھہر گئیں۔ جو قدرت کے حسن کا شاہکار۔ سحرتمی، نیلی جھلیوں میں نا آشنائی کا سکوت تھا۔ گدازلیوں پر مہر پڑی تھی۔ فسوں گرنگاہوں کے طلسم نے ان کو سحر زدہ سا کر دیا۔ دل کی عمارت میں زور سے بجلی کڑکی اور ایک میں دل کو چرتی گزر گئی۔ اور وہ بے خود سے دل پر پئی اچھوتی کیفیتوں کے نزوال کو اترتا دیکھتے رہے۔  
”کون ہیں آپ؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کس سے ملتا ہے؟“ آواز کا یہ جھرتا جانے کن چٹانوں سے گزرتا ہوا دل کی وادی میں گرنے لگا تو لب متفل اور لفظ گو نگے ہو گئے۔ یہ زعب حسن تھا۔ کہ احترام حسن وہ سمجھ نہ پائے۔

”جی وہ میں اپنی تلاش میں نہیں یزدانی صاحب، مہمل سے الفاظ اس مہر جبین کی ہنسی کا سبب بن گئے تو فرمان کو جیسے ہوش سا آ گیا۔ وہ طلسم کدے سے باہر آئے تو پتا چلا کہ وہ بے خودی میں کیا حرکت کر بیٹھے تھے۔ وہ سب کیا تھا۔ وہ کسی کیفیت تھی کہ جس نے ان کو خود سے بے بہرہ کر دیا تھا۔

”جی میں فرمان ہوں۔“ وہ تھوڑا سا اعتماد پیدا کرتے ہوئے۔  
”اچھا! کس کا فرمان ہیں؟ قائد اعظم کا فرمان یا۔“ شوخ ہنسی کے جلیترنگ ان کو بولائے دے رہے تھے۔ حسن جہاں سوز حشر سامانوں کے ساتھ شوخ بھی ہو جائے تو قیامت خیز ہو جاتا ہے اور فرمان بھی اس قیامت کی زد میں تھے۔

سے یہاں ہوں۔ پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہوں اور تم صاحبزادے؟“  
یزدانی صاحب اپنا مختصر سا تعارف کروا کر فرمان سے پوچھ رہے تھے۔

”میراثام فرمان ہے جی۔ اور تعلیم کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ میرا دوست بھی یہیں تھا اور اس کے کام بھی یہیں ہوتے ہیں، اختر صاحب۔ فرید کے والد کا انتقال ہو گیا تو سب پاکستان گئے ہوئے ہیں۔“ فرمان بھی تفصیل سے اپنا اور فرید کا تعارف کر دیا۔

”اوہو، بڑا افسوس ہوا تمہارے دوست کے والد کے انتقال کا سن کر۔ کیا نام تم نے بتایا اس کے کا؟“

”جی اختر حسین، ان کی بیگم بی۔ ایچ ڈی ہیں۔ دو بیٹے ہیں۔“  
”ہاں۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ میں جانتا ہوں ان اختر صاحب کو۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ کچھ پتا ہے تک واپس آ جائیں گے۔؟“

”جی میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کب آئیں گے۔ آپ اپنا کوئی ایڈریس دے دیں یا فون میں ان کے آنے کی اطلاع کرو دوں گا۔“

”ہاں ضرور مگر ایسا کیوں نہ کریں کہ تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ اچھا ہے دیکھ لو جب دل چاہے تم مجھے تم چچا کہہ لو یا ماموں۔ کچھ بھی کہہ لو۔ ہمارے سارے رشتے بہت پیارے ہیں۔“

”جی بہت اچھا چچا جان! میں آج بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ آپ مل گئے ورنہ میں فرید کے بعد اکیلا اور اداس ہو گیا تھا۔“ فرمان بے حد خوش تھے، ہر بان یزدانی سے مل کر۔

”اچھا تو پھر چلیں۔“ یزدانی صاحب نے دوسرا دروازہ فرمان کے لیے کھولتے ہوئے کہا۔  
”میں چلتا چچا جان مگر مس سوزی یعنی ہماری مالک مکان کہیں گئی ہوئی ہیں اور گھر کو میرے حوالے ہیں۔ میں چونکہ بور ہو رہا تھا۔ اس لیے نکل آیا۔ کافی دیر ہو رہی ہے۔ اب میں چلتا ہوں، بڑی خوشی ہوئی کہ آپ مل گئے۔ میں انشاء اللہ خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اجازت دیں۔“

”اچھا جیسے تمہاری مرضی۔ مگر بیٹے میں تمہارا منتظر ہوں گا۔ دیار غیر میں تو اپنے وطن میں جو کبھی رہا ہو، بہت اچھا اور عزیز ہو جاتا ہے۔ میں تمہارا شدت سے منتظر ہوں گا، بہت عرصہ ہوا ہے کسی محب وطن باتیں کیے ہوئے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی تعلیمی مصروفیات میں اس بڑے مجھے بھول ہی جاؤ۔“

”تو بچا چچا جان! ایسا کہاں ممکن ہے، میں تو۔ اپنی خوش قسمتی سمجھ رہا ہوں کہ آج آپ سے ملا ہو گئی۔ آج بھی اگر مس سوزی کی طرف سے ڈالی جانے والی ذمہ داری نہ ہوتی تو میں ضرور چلتا۔ انشاء اللہ

میں حاضر خدمت ہونے کی کوشش کروں گا۔ اجازت خدا حافظ۔“

فرمان ان سے ہاتھ ملاتے خوشی سے سرشار واپس آ گئے۔ مس سوزی واپس آ چکی تھیں۔ انہوں نے سوزی کو بی یزدانی صاحب کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی خوش ہو گئیں۔ کیونکہ وہ کئی روز سے فرمان کو بہت اٹھ دیکھ رہی تھیں۔ فرمان نے گھر بھی خط لکھ دیا۔ اور یزدانی صاحب کے بارے میں بتایا کہ وہ کتنے پکے پاکستانی اور وہ کسی روز ان کے ہاں جائیں گے۔ مگر۔ تعلیمی مصروفیات۔ اپنی بڑھتی تھیں کہ وقت نکالنا مشکل ہو رہا تھا

استحان ختم ہوئے تو بخار نے آ لیا۔ اتنا خیر بخار کہ ان کا دل گہرا لے لگا۔ مس سوزی ان کا بہت

”وہ دیکھئے جی، میں پاکستانی ہوں اور۔“

”جنت! اس میں بتانے والی کیا بات ہے۔ آپ کی بدحواسی ہی سے پتا چل رہا ہے۔“ اس ماہ رخ فرمان کی بات کاٹ کر کہا تو وہ رنج ہو گئے۔

”دیکھیے محترمہ، یزدانی صاحب گھر پر ہیں تو بلا دیں، ورنہ میں جا رہا ہوں۔“ اب ذرا فرمان کو غصہ آ گیا۔  
”ہوں اب اصلی پاکستانی لگ رہے ہیں۔ آئیے تشریف لائے۔“ وہ راستہ دیتی ہوئی ہٹ گئی اور فرما کا پیچہ پکڑ کر رکھے والی اس شوخ موہنی کے پیچھے چلتے ہوئے خود کو جا۔ نے کن نشاط آفریں دادیوں میں دیکھ رہے تھے۔ قدم کا دیت پر نہیں ہواؤں کے دوش پر محسوس ہو رہے تھے۔

”تاہا جان! یہ آپ کے دوست فرمان پاکستانی ہیں۔“ وہ ان کا تعارف کر دیتی تھی۔  
”اوہو فرمان بیٹا! آؤ بھی آؤ۔ تم نے تو خوب راہ دکھائی۔ میں تو روز ہی تمہارا انتظار کرتا اور فرما ملتا کرتا کہ جہیں تو ایڈریس دے دیا۔ مگر تمہارا ڈریس لینا بھول گیا۔“ یزدانی صاحب نے بڑے تپاک ان کا استقبال کیا اور بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

”ویسے تاہا جان! آپ دونوں کی ملاقات کتنی صدیوں بعد ہوئی ہے۔“  
”تمہارا کیا خیال ہے، کتنی صدیوں بعد ہوئی ہے؟“ یزدانی صاحب نے مسکرا کر اٹنا سوال داغ دیا۔  
”آپ دونوں کے ملنے سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ کتنی۔ صدیوں بعد ہوئی ہے۔“  
”واہ کیا بات ہے، دیکھا فرمان ہماری بیٹی کا اندازہ کتنا درست ہے۔“  
”جی۔ جی ہاں۔“ فرمان چونک گئے وہ جو پہلے ہی اس زہرہ جمال کی طرف دیکھ رہے تھے، چونک بولے۔

”بہر حال فرمان بیٹے! یہ میری بیٹی مریم ہے۔“  
”آداب!“ فرمان کی نگاہیں مریم جیسا تقدس رکھنے والی لڑکی پر اٹھیں اور زعب حسن سے فوراً منگیں اور نیلے قالین میں دھنسنے اس کے خوبصورت ہمدردوں پر جا کر ٹھہر گئیں۔  
”اور مریم بیٹے! یہ فرمان بیٹا ہے۔ تعلیم کی غرض سے امریکہ آیا ہوا ہے۔ بڑا اچھا بچہ ہے۔“  
”ویسے تاہا جان! ان کے چہرے پر تو نہیں لکھا ہوا۔“ مریم نے ایک نظر فرمان پر ڈالی۔  
”کیا بیٹا۔؟ یزدانی صاحب حیرانی سے مریم کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”یہ یہ کہ یہ بہت اچھے بچے ہیں۔“ پھر کتنی ہی دیر اس کی کھلتی شوخ لمبی کے جلتیجک بچتے رہے اور ان ساعتوں میں جانے کون سے احساسات ان کے حواس کو مغلوب کرتے ہوئے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گزریں ہو گئے کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکے، خاموشی سے بس دیکھتے رہ گئے۔

”اچھا مریم بیٹے! دیکھو تمہاری اسی نے نماز پڑھ لی ہو تو ان کو یہاں بھیج دو اور خود جا کر اچھی سی جائے بنالائی۔“  
”جی اچھا!“ وہ سعادت مندی سے سر جھکائے باہر نکل گئی۔ تو کمرے میں فرمان کو لگا جیسے اب باقی نہ رہا ہو۔ خوبصورت نفس کمرے کی فضا جو اس کے وجود سے مہک رہی تھی۔ اب بالکل ویران ہو گئی تھی۔  
یہ سب ان کے اپنے دل کے اندر ہو رہا تھا۔ ورنہ تو سب کچھ وہی تھا۔ کچھ دیر بعد بالکل ان کی بی بی جان کی طرح کی خاتون ہاتھ میں پیچ لے لے اندر آ گئیں۔ فرمان ان کے احترام میں کمرے ہو گئے یزدانی صاحب نے تعاناً

کر لیا تو انہوں نے بالکل بی بی جان والے انداز میں پیشانی بخوم کر ساتھ لگا کر ان کو پیار کیا تو ڈھیر سارا سکون فرمان کے اندر اتر گیا۔ وہ بڑی اپنائیت اور غلطی سے ان سے ان کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد مریم جانے کے ساتھ ڈھیر سارے لوازمات لیے آ گئی۔ آسانی سوٹ اور آسانی دوپٹے میں وہ واقعی، کوئی آسانی ملنے لگی۔  
”موصوبہ اور خوشی نے مل کر اس کے حسن کو عجیب ہی رنگ دے دیا تھا۔“  
نظریں یوں بار بار اس کے حسین چہرے کی طرف اٹھ جاتیں۔ گویا کوئی مقناطیس کی چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہے چائے اسی طرح اس کی شوخ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے درمیان پنی گئی۔ چائے کے بعد فرمان نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئے۔ کیونکہ کافی وقت ہو گیا تھا۔

”ارے واہ! آج ہم نے خالص پاکستانی کھانا بنایا ہے اور آپ چھوڑ کر جا رہے ہیں کیسے پاکستانی ہیں۔“  
وہ ان کے ڈوبنے کا خیال کیے بغیر خوبصورت آنکھیں کھولے ان کو دیکھ رہی تھی۔  
”ہاں فرمان بیٹے! آج مریم نے کتنی کی روٹی اور ساگ بنایا ہے۔“ فریدہ بیگم نے کہا تو فرمانی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایک عرصہ ہی تو ہو گیا تھا۔ خالص اپنی چیزیں کھائے ہوئے۔

”اور جناب اتنا لذت بنایا ہے کہ آپ تمام عمر یاد رکھیں گے۔“ مریم اپنی تعریف کرتے ہوئے بولی تو فرمان کا جی چاہا کہہ دیں کہ تمہیں دیکھ کر تو رہبر راہ بھولیں۔ تمہیں یاد تو جب کریں گے جب تمہیں بھلا سکیں۔ کھانا واقعی بہت لذت تھا۔ اس کے سر میں ہاتھوں کا سارا حسن لذت بن کر کھانے میں جذب ہو گیا تھا اور اس پر اس کی خوبصورت شوخیاں تھیں۔

”فرمان صاحب! آپ کو پتا ہے۔ یہ انگریز کتنے بد ذوق ہوتے ہیں۔“  
”ایک دفعہ تان ایک انگریز پاکستان گیا تو اس کے میزبان نے اسے کتنی کی روٹی پر ساگ رکھ کر دیا۔ اس انگریز نے ساگ کھا لیا اور روٹی یہ کہہ کر واپس کر دی کہ اپنی پلیٹ واپس لے لو۔“  
پھر ساتھ ہی اس کی لمبی کے جلتیجک سے فضا گونج اٹھی۔ فرمان اور اس کے والدین مسکرا دیئے تو کہ یہ لطیف کافی پرانا تھا۔ اور بار بار ہوتا ہوا تھا۔ مگر آج اس کے۔ سے بہت اچھا اور نیا لگا۔  
”لیکن میں یہ پلیٹ واپس نہیں کروں گا۔ بلکہ ایک اور ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ اتنی دیر میں فرمان کے لہجے میں پہلی بار اعتماد آیا تھا۔

”ضرور بیٹا جی کیوں نہیں مریم! جاؤ۔ فرمان کے لیے تیار کر دو ساتھ لے جانے کے لیے۔“  
”ارے نہیں خالد جان! میں تو مذاق کر رہا تھا ان سے۔ رہنے دیں تکلف۔“ فرمان نے اٹھتی ہوئی مریم کو روک دیا۔ شاید اس کا اٹھ کر جانا اچھا نہیں لگا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اٹھ گئے۔ گوکہ دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس محل سے اٹھ کر جائیں۔ جس کو اس پر نے سجا رکھا تھا اپنے شوخ رنگوں سے۔

”اچھا جی! اجازت دیں پچھا جان! آپ ان لوگوں کو لے کر ضرور آئیے گا۔“  
”لاؤں!“ میں ضرور لیکن فرمان بیٹا! کیا یہ مناسب نہیں کہ تم ہی آ جایا کرو۔ یہاں تمہیں کم از کم گھر کا ماحول ملے گا۔“ وہاں تو تم اکیلے ہوتے ہو، آ جایا کرو جلدی جلدی۔“

اندھلچلچا جا رہے دو آنکھیں۔ دل نے جست ہائی بھری کہ وہ اب تو ہر وقت ہی حاضر رہتا چاہتے تھے۔ مگر اخلاق نے جو پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ گوکہ کڑی ہیں۔ مگر بہت خوبصورت ہیں۔ ان سے ہی زندگی میں حسن



ہے۔ ”خدا حافظ!“ فرمان نے کن اکھیں سے دیکھا۔ مریم میز پر سے برتن اٹھا رہی تھی۔ جانے دل کے گوشے سے شکایت ابھری کہ اس نے پلٹ کر دیکھا نہ خدا حافظ کہا۔ ”بے حس“ دل نے برہمی سے غصہ دے ڈالا۔ یزدانی صاحب سے ہاتھ ملا کر گاڑی میں بیٹھنے لگے، تو دل میں جیسے بہار آگئی۔ وہ اوپر اچے کر کی کھڑکی میں کھڑی الوداعی نگاہوں سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ ان کے لبوں پر اُٹا تمام راستہ وہ مسکراتے رہے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی انوکھا خزانہ پالیا ہو۔ دل کی زمین سے خوشی کی لہر کونپلوں نے انہیں سرشار کر دیا تھا۔ یہ کن احساسات کا ظہور ہوا تھا۔ یہ کن کیفیات کا ادراک ہوا تھا کہ وہ دنیا یا سامحوس کرنے لگے تھے۔

گھر آ کر وہ مس سوزی سے ملے بغیر لیٹ گئے۔ آج وہ کسی دوسرے انسان سے مل کر اس ملاقات حسن کو زائل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آج تو ان کو یوں محسوس ہوا تھا گویا آج کا دن تھا ہی ان کے نام تمام ان کے لیے کھلے تھے۔ موسم میں حسن ان کے لیے پیدا ہوا تھا یہ کیا ہو گیا تھا، آن کی آن میں سارے طے دھرے رہ گئے تھے۔ وہ ایک غیر، اجنبی لڑکی۔ چپکے سے غیر محسوس انداز سے دل کی مہمان بن گئی۔ یہ کیا ہوا تھا کہ روح کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا تھا۔ وہ اسی پیکر خیاں بار کو دیکھتے سو گئے۔ فرمان کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اب ہم امریکہ جو کبھی زہر لگتا تھا۔ حسین لگنے لگا۔ عزیز ہو گیا۔ وہ خود حیران تھے کہ وہ شباب کے کس موڑ سے گزر رہے کہ لطیف سا درویش بن کر دل کی پڑمردہ پتیوں پر ٹپکنے لگا ہے۔ فرید بھی یہاں نہیں تھے۔ ان کو کسی طوفان کی آغوش میں آنکلی بدو عادے کو خود چلے گئے تھے۔ فرمان جانے کب تک کھوئے رہے کہ مس سوزی نے فون کی آواز دی۔ فرمان جلدی سے نیچے آئے کہ شاید پاکستان سے فوہو۔

”ہیلو جی فرمان۔ اوہ نو۔“

فون سن کر فرمان اندھا دھند بھاگے۔ راستے میں مس سوزی آئیں۔ اس گھبراہٹ اور تیزی کی وجہ سے جانے کی کوشش کی مگر فرمان ہاں ہوں کرتے آگے بڑھے گئے۔ گاڑی فل اسپینڈ پر چھوڑ دی۔ آج فاصلے بھی تو پھیلے جا رہے تھے سینے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ راستے میں ایک دو بار گاڑی بے توازن بھی ہوئی مگر غنیمت ہوا کہ کسی سے ٹکرا نہیں گئی۔ نگاہوں میں مریم کی صورت ابھر آئی۔

”آف میرے خدا جانے کتنی گہری چوٹیں آئی ہیں۔ کتنا پریشان ہو گی مریم۔“

انہوں نے نیل پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوچا کچھ ہی دیر بعد وہ افروز تھی۔ لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں شوخ قد بلیں روشن تھیں۔ فرمان اس کے اس اطمینان اور سکون کی وجہ جان نہ پائے۔

”آداب۔“ مریم نے گنگ کھڑے فرمان کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”اوہ آداب! کیسی ہیں۔ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی اُن کو؟“ وہ جلدی سے بولے۔

”اوہو! بڑی جلدی خیال آگیا اُن کا چھت سے گری ہیں تو چوٹ تو یقیناً گہری آئی ہے، ڈاکٹر کا خیال ہے پاؤں میں موج آگئی ہے جب کہ میرا خیال ہے دماغ میں چوٹ آئی ہے جب ہی تو بھکی بھکی حرکتیں کر رہی ہیں۔“ وہ بڑے نارمل انداز میں بول رہی تھی۔

”اوہو یہ تو بُرا ہوا۔ آئیے، دیکھتے ہیں اُن کو جا کر۔“

”آپ ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیں۔ میں اُن کو وہیں لے کر آتی ہوں۔“

فرمان بیٹھنے نہیں دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھتے رہے۔

”یہ دیکھئے۔“ مترنم آواز پر فرمان گھومے تو مریم نے سفید روئی کے گالوں کی طرح نرم ی لمبی ان کی گود میں ڈال دی تھی کے پاؤں اور سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ فرمان حیرانی سے مریم کو دیکھنے لگے جو لمبی کی پٹی درست کرتی بالکل ایک بچی لگ رہی تھی۔

”تو یہ بلی صلبہ چھت سے گری ہیں میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔“

”آپ کا شکوہ بجا ہے خالہ جان! مگر تعلیمی مصروفیات قصیں اور دوسرے ایک جھجک سی مائع تھی وہ تو انہوں نے بہم سافون کر دیا اور میں پریشان ہو کر آ گیا۔ آنے پر تھکا ہوا تھا کہ ان کی بلی محترمہ ٹیل میں در نہ تو۔۔۔“

”جی در نہ تو یہ ہمیں بھول ہی چکے تھے۔“ مریم نے درمیان میں بات اچک لی تو فرمان ایک گہری سی نگاہ اس پر ڈال کر رہ گئے۔

”انسان کو زندگی کی شاہراہ پر کسی موڑ پر ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جاتا ہے اور پھر انسان خود کو تو بھول سکتا ہے مگر ان لوگوں کو نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“ فرمان ان گہری نیلی جھلیوں میں ڈوبے بڑے جذب سے بول رہے تھے۔ وہ درود ہو تو وہ خود کو فراموش کر دیتے تھے۔ سیکینڈ ٹیم کی موجودگی کا احساس بھی نہ رہا اور جب ہوا تو سنبھل گئے۔

”میرا مطلب ہے خالہ جان اور چچا جان تو اتنے اچھے ہیں کہ ان سے مل کر مجھے اپنے والدین کی سی خوشی ہوتی ہے اس گھر میں اتنا خلوص اور اپنائیت کا احساس ملتا ہے کہ بتائی نہیں سکتا۔“

”اور اسی لیے اتنا کم آتے ہیں وہ بھی نکالنے پر“ فرمان جب سے آئے تھے مریم نے بارہا ان کے نہ آنے کا شکوہ کیا تھا اور ہر بار فرمان نے چونک کر مریم کی جانب دیکھا کہ آیا اس شکوے کے پیچھے کوئی جذبہ بول رہا ہے یا محض رسوا کہہ رہی ہے لیکن ان کو کچھ بھی محسوس نہ ہو سکا۔

”چلو جانے بھی دو مریم! جب اُس نے اپنی بھجوری بتادی ہے تو پھر شکوہ کیسا۔ جیٹا اصل میں جب سے اس کے والد گئے ہیں ناں۔ یہ بہت بوریٹ محسوس کر رہی تھی۔ اسی لیے روز ہی یہاں پر جو اس کے پاکستانی دوست ہیں ان کو فون کر کے بلالیتی ہے۔ اب بلی کی چوٹ کے بہانے تمہیں بلایا اپنی بوریٹ دور کرنے کے لیے۔“

سیکینڈ ٹیم بتاری قصیں اور فرم بلندی سے پستی کی جانب آ رہے تھے۔ مریم نے محض اپنی بوریٹ دور کرنے کے لیے۔ مجھے بلایا ہے۔ انہوں نے تو جانے کیا سمجھ لیا تھا۔ تاروں سے شہروں کو سجایا تھا۔ جانے کیوں دل بوجھل سا ہو گیا تو ان کا دل چاہا۔ اٹھ کر واپس چلے جائیں۔

”مریم بیٹے! تم نے میرے بیٹے کو چائے پانی بھی پوچھا کہ نہیں۔“

”جی نہیں خالہ جان! چائے کا قطعی موڈ نہیں ہو رہا۔ اب چلوں گا واپس، پڑھنا ہے ابھی۔“ فرمان نگاہیں جھکائے سنجیدگی سے بول رہے تھے۔

”ارے واہ! ایسے ہی چلوں گا۔ میں نے آپ کو باتیں کرنے کے لیے بلایا ہے۔“

”مغذیات خواہ ہوں کہ میرے پاس باتوں کے لیے وقت نہیں۔ میں تو آپ کے فون کی وجہ سے پریشان ہو کر چلا آیا در نہ بہت کام ہیں مجھے۔“

پانٹنیں مریم کو کچھ احساس تھا یا نہیں کہ فرمان روٹھ گئے ہیں۔ خفا ہو گئے ہیں جانے کس بات پر۔

”کیا وہ کام ہم سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں؟“ فرمان نے چونک کر مریم کو دیکھا جو پلکوں کی چٹکن اٹھانے ان کو دیکھ رہی تھی۔ اب وہ پھر الجھ گئے۔ ایک تو اُس کی گہری جھلیوں میں جانے کیا فسون تھا کہ بندہ دواؤں ڈوب جاتا اور کچھ باتوں میں ایسا حیرانہ کنوینج کر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے یا پھر۔۔۔“

ان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ وہ سمجھ نہ پائے۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ پار ہے تھے اگر سیکینڈ ٹیم یہاں نہ ہوتیں تو شاید وہ اس بات کا جواب ایسا دیتے جو مریم کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیتا، مگر انہوں نے کسی بھی کمزور جملے کو لبوں کو حدود

”کیوں کچھ اور سمجھتے تھے۔ کیا میری بلی کی کوئی اہمیت نہیں آپ کے نزدیک؟“

وہ خنکی بھری نگاہوں سے اُن کو دیکھ رہی تھی۔ ان کا جی چاہا کہ کہہ دیں۔ تم کیا جانو، کیا اہمیت ہے تمہارے اور تمہاری چیزوں کی اس دیار دل میں۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ پائے اس سچ چہرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ جوان جذبوں کے لمس کی لطافتوں سے قطعی نا آشنا تھا۔

”چچا جان اور خالہ جان نظر نہیں آ رہے۔“ فرمان انجانے سے افسوس سے آزاد ہوتے ہوئے بولے۔

”آپ کو کچھ خبر بھی ہماری کہ نہیں۔“ وہ بڑی اپنائیت سے شکوہ کر رہی تھی۔

”آپ کی خبر کے علاوہ اور کوئی خبر بھی کہاں ہے مجھے۔“

فرمان دھیمی سی آواز میں اس کی گھنیری پلکوں کو دیکھ رہے تھے۔

”تبا جان دو ہمتوں کے لیے نیویارک گئے ہوئے۔ ہیں۔ جانے سے قبل آپ کو فون کرتے رہے مگر کوئی مس سوزی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ آپ گھر پر نہیں۔ جب بھی کرتے، یہی جواب ملتا۔“ وہ بلی کو قائلین پرانے طرف کونے میں بٹھاتی ہوئی بولی۔

”اودہ سوری! وہ اصل میں میں کچھ تعلیمی مصروفیات میں اتنا محو ہو گیا کہ اپنا بھی دھیان نہ رہا سوائے ایک خیال کے۔“

دو تین ملاقاتوں میں فرمان کا اعتماد خاصا بحال ہو چکا تھا۔ اب بھی وہ گہری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بول رہے تھے۔

”احمد اودہ کون سا خوش نصیب خیال ہے جو اتنی مصروفیت میں بھی آپ کو اتنا تاراج کیا کہ اپنا بھی دھیان نہیں تھا۔ بلی کی خدمت سے فارغ ہونے کے بعد وہ صوفے کی نرمی کی کرسی میں جھنسی گئی۔ گھر سے جامنی رنگ کے سوٹ میں اس کی شہابی رنگت بہت چمک رہی تھی۔ گہری نیلی جھلیوں میں اب قدرے سکوت تھا۔ اُن کا دل چاہا کہ دیں کہ ”وہ نشاط پرور خیال تمہارا ہی تو ہے“ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ پائے۔

”خالہ جان تو گھر پر ہیں نا؟“ فرمان اس کے خوبصورت چہرے پر بے نگاہیں بٹھاتے ہوئے ادھر وہ دیکھ کر بولے۔

”فرمان صاحب! یہ آپ میری بات میں دوسری بات کیوں کرتے ہیں۔ اُنی جان تو اپنے وظائف میں مصروف ہیں۔ فارغی کرنے ہی والی ہیں۔“

وہ چہرے پر آئی لٹوں پر سے بٹھائی وضاحتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی تو فرمان اُن نگاہوں کے شعلہ میں کھوکھو کچھ بھی نہ کہہ پائے۔ اس بے خود کر دینے والے فسون کے حصار میں جانے کب تک وہ رہے کہ مریم نے اُنی آگئیں وہ احتراماً کھڑے ہو گئے۔

”آداب خالہ جان۔“ انہوں نے جھک کر آداب کیا۔

”جیتے رہو بیٹے! اتنے دن کہاں رہے؟“ انہوں نے ان کے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”اور اری جان! اب بھی نہ آتے اگر میں ان کو اپنی مانو کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی اطلاع دیتی۔“ مریم نے پھر شکوہ کنناں نظروں سے فرمان کو دیکھا تو دھیمی سی مسکراہٹ فرمان کے لبوں پر آگئی وہ تو کچھ اور ہی سمجھ کر آئے تھے۔

پار کرنے کی اجازت نہیں دی صرف اتنا ہی کہہ پائے۔

”کام اور آپ میں بہت فرق ہے مریم! کام کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔ انسان سے زیادہ اہم نہیں ہوگا۔“

بات انہوں نے وہی کی تھی مگر اس طرح کہ نہ مریم کچھ سمجھ پائی اور نہ ہی سیکیز بیگم کے پلے کچھ پڑا۔

”اچھا چلے جانا بیٹا! چائے تو پی لو، ویسے بھی آج بہت سردی ہے۔ لگتا ہے آج خوب بارش ہوگی۔ لوگ بیٹھو، میں چائے بناتی ہوں۔“

سیکیز بیگم اٹھ کر چلی گئیں تو فرمان کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر کا موسم دیکھنے لگے۔ موسم کے تیور واقعی خاصی خطرناک تھے۔ گھنیرے بادل برسا ہی چاہتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ مریم پیچھے کھڑی اُن کی پشت دیکھ رہی ہے مگر وہ اب خود پہل کرنا نہیں چاہتے تھے۔

”باہر کا موسم کیا اندر کے موسم سے زیادہ خوبصورت ہے؟“

کمرے کے گہرے سکوت میں اس کی آواز کا جھرتا بیٹنے لگا تو۔ فرمان آہستگی سے پیچھے گہرا نگاہوں میں اب بھی غفلت جھلک رہی تھی۔ مگر وہ بات ہی ایسی کر جاتی تھی کہ وہ گھوم کر رہ جاتے۔ اس کی ہر بات معنی رکھتی تھی۔

”آپ اس کمرے اور کمرے سے باہر کے موسم کا موازنہ کر رہی ہیں یا میرے اندر کے موسم کا حال پوچھ رہی ہیں۔“ فرمان نے جانے کس جذبے کے تحت پوچھا۔

”واہ آپ کے اندر کے موسم کی بھلا مجھے کیا خبر۔ میں تو کمرے کے موسم کی بات کر رہی تھی جواب کے موسم کے اثر سے مزید سرد ہو گیا ہے۔ بارش بھی شروع ہوگئی۔ آگ جلائی دوں۔“

وہ بولتی ہوئی انہی اور آتش دان میں آگ جلائے لگی مگر اس کی بے رخی کی سرد ہوائ نے فرمان کے جذبات کو ٹھن سا کر دیا۔

”مریم بیٹے! آکر چائے لے جاؤ۔ میں رات کے کھانے کا بندوبست کولوں۔“

باہر سے سیکیز بیگم کی آواز آئی تو وہ اٹھ گئی۔

”فرمان صاحب! آپ یہاں بیٹھ کر گرم ہوں اور میں چائے لے آؤں آپ کو مزید گرم کرنے کے لیے گرم تو ویسے آپ پہلے ہی بہت ہیں۔“

مریم نے مڑ کر شوخی سے فرمان کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو چائے کے دیگر لوازمات کے ساتھ ٹرائی ٹھیسٹ کراچی جانب کی اور فرمان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔ سرخ شعلے اس کے رخساروں پر منعکس ہو کر اسے شعلہ جوالا بناتے تھے۔ وہ چائے بناتے ہی تھی اور فرمان کی گہری نگاہیں اس کے چہرے پر منعکس ہوتے شعلوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”شکر کتنی فرمان صاحب؟ مریم نے جیسے ہی پلکوں کی چلن اٹھائی نگاہیں فرمان کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ لکھ بھر کے لیے نگاہیں ملیں اور جھک گئیں مگر من آہنگن میں کیا واردات گزر گئی تھی وہ خود بھی سمجھ نہ پائی۔

گرم گرم ماحول اس شدید سردی میں بے حد اچھا لگ رہا تھا اور سب سے بڑھ کر وہ قریب تھا جو دل کو خا۔ لپ کی ہلکی سی روشنی میں آتش دان کے قریب بیٹھ کر مریم مسلسل بول رہی تھی اُس کی باتوں سے خوشبو آ رہی تھی۔ کبھی وہ پتوں پر بارش کے پانی سے قلم لکھنے لگی اور کبھی تئلیوں کے رنگوں کو اپنی ذات پر سجانے لگتی۔

”آپ کو تئلیاں کیسی لگتی ہیں؟“ اُس نے اچانک سر اٹھا کر فرمان کو دیکھا جو اس کی باتوں کے بحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ اس کے بچکانہ سے سوال کا جواب دیتے وہ خود ہی بول پڑی۔

”مجھے تو تئلیوں سے عشق ہے۔ تئلیوں سے اور پھولوں سے یہ دونوں اپنے اندر ایسا قدرتی حسن رکھتے ہیں کہ اُن کو دیکھ کر میں قدرت کی شاکہ میں مصروف ہو جاتی ہوں اور اس مصروفی کے اپنے حسن کے بارے میں سوچنے لگتی ہوں۔ وہ ذات واحد خود کتنی بڑی کتنی حسین ہوگی۔ یہ دیکھیں میں۔“ کتنی تئلیاں اپنی کتاب میں بند کر رکھی ہیں۔ اور پھول بھی ہیں۔“

فرمان اس کی آواز کے بہتے جھرنوں سے موتی چن رہے تھے کہ اُس نے ایک کتاب کھول کر ان کے سامنے رکھ دی جس کے ہر صفحے کے بعد ایک تئلی مردہ پڑی تھی اور دوسرے پر خوبصورت پھول چسپاں تھے۔ تئلیوں کے سارے رنگ ان صفحات پر چپک چکے تھے اور پھولوں کی خوشبو اُڑ چکی تھی۔ فرمان نے ایک نظر اس پر ڈالی جو اُن کو ایسے دیکھ رہی تھی، جیسے وہ ابھی اُس کی خوب تعریف کریں گے۔

”قدرتی حسن کو یوں کتابوں میں مقید کرنا عشق کی انتہا ہے یا ابتدا؟“ فرمان نے اُس کی منتظر آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”عشق کی کوئی منزل نہیں ہوتی فرمان صاحب! اس بحر کی موجیں تو سدا ہی بے قرار رہتی ہیں۔ رہی بات ان کو قید کرنے کی تو یہ اس زمانے کی بات ہے جب مجھے نہ زندگی کا شعور تھا۔ اور نہ موت کا ادراک۔ اب تو میں پھولوں اور تئلیوں کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں کوئی ست رنگی تئلی کسی پھول پر بیٹھی دیکھتی ہوں تو مجھے زندگی کے بعد حسین لگتی ہے۔“

وہ خوبصورت ہیکلے لہجے میں شعلوں سے جہان آباد کر رہی تھی۔ ایسے میں کون تھا جو اتنی پیاری لڑکی کو نہ دیکھتا اس سے پیار نہ کرتا۔ فرمان کی نگاہیں انھیں مگر پھر حسن کے احرام میں جھک جاتیں۔ فرمان مریم کی قربت کی نشاٹ پر در ساحتوں میں سفر کر رہے تھے وہ جانے کہاں پہنچے ہوئے تھے کہ بڑے زور کی بجلی کڑکی۔ وہ چونک کر ہوش میں آ گئے۔ موسلا دھار بارش جاری تھی۔ مریم آتش دان میں مزید کٹکے ڈال رہی تھی۔ انہیں مریم کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ انے خیالوں میں اتنے خود تھے کہ ان کو احساس ہی نہیں ہوا کہ مریم اٹھ کر گئی اور کب اپنے شانوں پر شامل ڈال آئی اور کون کسے لے آئی۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ادب سے بھی لگاؤ ہے۔“ فرمان نے حلیف پر مشہور شاعروں کے مجموعہ کلام دیکھ کر کہا۔

”جی جنتاب میں بہت باادب لڑکی ہوں۔ آپ کیا جانتیں کہ میں کیا ہوں۔“

”یہ ہی تعجبانتا چاہتا ہوں کہ تم کیا ہو۔“ فرمان زیر لب ٹکٹکائے۔ رات کا کھانا تئلیوں نے ساتھ کھایا۔

باہر بارش اسی طرح تیزی سے جاری تھی۔ سردی میں اضافہ ہوتا جا رہا۔ فرمان سوچ رہے تھے کہ کیا کریں کیسے جائیں گے۔

”اچھا خالد جان! اب میں چلتا ہوں۔“ دل تو نہیں چاہ رہا تھا اٹھنے کو مگر جانا تو تھا ہی۔

”بیٹے! اتنی طوفانی بارش میں کس طور جاؤ گے؟ نہیں بھی، میں تو اجازت نہیں دوں گی جانے کی۔“

سیکیز بیگم نے صاف انکار کر کے گویا اُن کے دل کی بات سن لی۔





”سیدہ بیگم! بیگم ایک یہ تم عموں کے دم جو ہوتے ہیں ناں۔ وہ رسی کو ساپ ثابت کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ ارے بھی پڑھنے گیا ہے۔ فارغ ہو کر لوٹ آئے گا کر لینا تم لوگ اپنے ارمان پورے۔ اس میں فکر کیا بات ہے۔ عالی کو نہیں رہنا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ فرمان سے منسوب ہے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ فرمان تعلیمی غرض سے باہر گئے ہوئے ہیں۔“

”پھر بھی رحمن! فرمان جوان ہے۔ نا سمجھ ہے۔ وہاں کا ماحول کیسا ہے۔ آپ کو خبر ہے۔ کہیں وہ بھٹک نہ جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو۔ تو رحمن میری بہن عالی کا کیا ہوگا وہ تو۔“

سیدہ بیگم روہانسی ہو گئیں۔ رحمن کچھ دیر خاموشی سے اُن کو دیکھتے رہے۔ اس امکان کو تو وہ بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خود ایسے دور سے گزر چکے تھے۔ مگر پھر بھی وہ سیدہ پر کوئی خدشہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”دیکھو سیدہ! اللہ تعالیٰ سے ہمیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔ کیونکہ وہ جو ہمارے حق میں کر رہا ہوتا ہے ناں وہی بہتر ہوتا ہے۔ خواہ ظاہر اوہ ہمارے حق میں نہ ہو، فرمان ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ آغا جی کو جانتا ہے۔ تم فضول میں واہموں کو اپنے دل میں جگہ نہ دو تو بہتر ہے۔“

پھر رحمن کتنی ہی دیر سیدہ کو سمجھاتے رہے تو وہ پرسکون ہو گئیں۔

”اب آپ بتائیں کیا بات ہے؟“ سیدہ اب پرسکون ہو گئیں تو رحمن کو دیکھنے لگیں۔

”ابھی تک یاد ہے تمہیں بات؟“ رحمن مسکرائے۔

”کس طرح بھول جاتی۔ وہ بات یقیناً خاص ہوگی جو آپ نے اتنے خاص انداز میں کہی ہے۔ اب بتائیں۔“

رحمن سو جتنی آنکھوں سے سیدہ کو پھر اُن کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

”وہ بات ہاں خاص تو ہے مگر۔“ رحمن پھر سوچ میں پڑ گئے۔

”اچھا یہ بتاؤ تم عورتوں کا دل کتنا بڑا ہوتا ہے؟“ رحمن کی بات پر چونک کر سیدہ نے اُن کو دیکھا مگر اُن کی نگاہوں میں اپنے لیے خلوص دیکھ کر سکون ہو گئیں۔

”عورت کا دل تو سمندر کی طرح وسیع اور گہرا ہوتا ہے رحمن! لیکن آپ کو عورت کے دل کی وسعت اور گہرائی کا خیال کیونکر آیا؟“ سیدہ سوالیہ نگاہوں سے اُن کو دیکھنے لگیں۔

”لیکن بیوی کا دل تو کوزے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔“ رحمن نے شوخ نگاہوں سے اُن کو دیکھا۔

”جی میں مانتی ہوں کہ عورت کا دل بیوی بن کر چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر قسم کی محبت میں تقسیم برداشت کر سکتی ہے مگر شوہر کی محبت میں نہیں۔ اس سلسلے میں تو عورت کا دل کوزے سے بھی کئی گنا چھوٹا ہوتا ہے۔ اس بات کا تو مجھے بھی اعتراف ہے۔“

سیدہ ہلکتی رہیں اور رحمن خاموشی سے اُن کو دیکھتے رہے۔ اس گھر میں جہاں ہر کوئی فرمان کے لیے پائیاں تھا کہ وہ ہاں کوئی گڑبڑ نہ کریں۔ وہاں ایک ہستی ایسی بھی تھی جو کہ چاہتی تھی کہ فرمان وہیں رہ جائیں یا وہیں شادی کر لیں۔ تاکہ ان کی مراد پوری ہو جائے۔ وہ تھیں عذرا بیگم جو دل سے چاہتی تھیں کہ فرمان عالی سے شادی کرنے سے انکار کر دیں اور وہ شہزاد کے لیے مانگ لیں اور ایسی صورت میں جبکہ فرمان عالی کو چھوڑ دیں گے تو گھر میں شہزاد کے علاوہ عالی کے لیے کوئی بہتر لڑکا نہیں ہوگا۔ سب حتمی کہ عالی بھی خوشی سے مان جائے

کر دیا کرتے۔ جب بھی آغا جی شادی کا نام لیتے وہ ہانے تراشنے لگتے کہ ابھی پڑھائی بہت سخت ہے۔ تو وہ نام بھی نہیں لے سکتے تو پھر۔ آغا جی، بی جان سے اُلجھ پڑتے ہیں۔

”بیگم! اس سے زیادہ میں۔ انتظار نہیں کر سکتا۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ ایسی بھی کیا مصروفیت شادی کے لیے نہیں آ سکتا۔“

”مجھے آپ سے زیادہ فکر ہے آغا صاحب! ابھی کل ہی تو قدیرہ کے رشتے کی ایک خالہ اپنے بیٹے کو لے کر آئی تھیں۔ وہ تو قدیرہ نے خود ہی کہہ دیا کہ عالی کا رشتہ ملے ہے تو بات ختم ہوئی۔“ بی بی جان صوبسا بیٹھتی ہوئی بولیں۔

”بات رشتے کے آنے جانے کی نہیں بیگم! عمر ڈھلنے کی ہے۔ ہمارے خاندان کی یہ واحد لڑکی ہے ہمارا عمر تک بن بیاضی ہے بخدا ہم تو بے حد ندامت محسوس کرتے ہیں۔ سیدہ اور عابدہ بیٹی کے سامنے جاتے ہیں۔ کیا خیال کریں گی وہ لوگ۔ اور پھر میرے مرحوم بھائی کی روح بھی بے چین ہوگی کہ اُس کی بیٹیا تک بیٹھی ہے۔ وہ زندہ ہوتا تو اب سے کئی سال قبل عالی کی شادی ہو چکی ہوتی۔“

آغا جی غصے میں بولے گئے۔ بات اصل یہ تھی کہ رات خواب میں اُن کو اپنے مرحوم بھائی نظر آئے اور ان کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ شاید۔ اپنی بیٹی کی شادی نہ ہونے کے باعث وہ ان کو نظر آئے ہیں۔“

”بس آغا صاحب! ایک ڈیڑھ سال کی تو بات ہے۔ کہہ رہا تھا بعد میں باہر کا نام بھی نہیں لوں گا۔“ جان نے جلدی سے یقین دہانی کرائی۔“

”اس بار جب فرمان آیا تو کچھ بدلا بدلا سا تھا بیگم! کہیں انجانے میں وہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھے اور سناٹا صالچہ بیگم! اگر تمہارے بیٹے نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی جس کی وجہ سے مجھے اپنے مرحوم بھائی بھانجے سامنے شرمندہ ہونا پڑے تو خدا کی قسم وہ اس گھر کی دلہن پار نہیں کر سکے گا۔ یہ یاد رکھیے گا اور بیٹے کو بھی بتا دو گا۔“ آغا جی اٹھ کر بیٹھنے لگے تو بی بی جان حیرانی سے شوہر کو دیکھنے لگیں۔

”مجھے آپ کی اس بات سے بہت دکھ ہوا ہے آغا صاحب! فرمان میرا بیٹا ہے۔ اُس کی رگوں میں اُم خون ہے۔ وہ کبھی کوئی غلط بات نہیں کر سکتا۔ آپ بے فکر رہیے۔ آپ نے اتنی بڑی بات کہہ ڈالی ہے کہ میرا ہول گیا ہے میرا فرمان کوئی ایسی ویسی حرکت کر ہی نہیں سکتا۔“

بی بی جان کے لہجے میں ہلکا سا خرم نایاں تھا۔ بیٹے پر اتنا پختہ بھروسہ عشق ایزدی کو نہیں بھلا سکتا۔ ”غدا کہہ بیگم! آپ کا احتیاج بحال رہے۔ آغا جی نے خلوص سے کہا تو بی بی جان آئین کہتی تھیں کہ فرمان کی طرف سے ایک بار پھر شادی سے انکار نے آغا جی اور بی بی جان کو فکر مند کر دیا تھا۔ سب ہی پریشان تھے۔ خواہ ظاہر کرتے یا نہ کرتے مگر سیدہ اس بار تو خاصی پریشان ہو گئیں۔

”رحمن! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“

”لو اتفاق دیکھو کہ مجھے بھی آج تم سے بہت اہم بات کرنی ہے۔ چلو ایسا کرو، پہلے تم بات کر دو۔“ رحمن نے مسکرا کر اخبار ایک جانب رکھ کر سیدہ کو دیکھا تو وہ کہ پریشان نظر آ رہی تھیں۔

”ہائیں تم تو پریشان لگ رہی ہو کیا بات ہے؟“ رحمن اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”اور کوئی پریشانی نہیں بس فرمان کا مسلسل انکار پریشان کر رہا ہے۔ کہیں خواہنا است وہ۔“

”ہاں کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا؟“ زاہدہ بیگم نے سوالیہ نگاہوں سے بہو کو دیکھا۔  
 ”نہیں تو مجھے اعتراض کیوں ہونے لگا مگر امی جان میں تو صرف شہزاد کی وجہ سے کہہ رہی ہوں کہ شہزاد  
 بہت سلجھا ہوا لڑکا ہے اور مومنہ بہت تیز طرار لڑکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتا نا پڑے۔ آپ سوچ کر بات  
 کریں میرا خیال ہے کہ مومنہ کسی طور پر بھی شہزاد کے لیے موزوں نہیں۔“  
 زاہدہ بیگم جو ایک طرح سے مکمل طور پر تیار ہو گئی تھیں۔ مومنہ کے لیے پروین کی باتوں سے واقعی سوچ میں  
 پڑ گئی تھیں شہزاد بہت خاموش طبع تھے جب کہ مومنہ بہت شوخ اور تیز تھی۔  
 ”کیا سوچ رہی ہیں پھوپھو جان؟“ حمیرا کچن کی طرف جاری تھی۔ زاہدہ بیگم کو یوں سوچوں میں گم دیکھ  
 کر وہ رک گئی۔ اور اُن کے قریب بیٹھ گئی۔

”وچنا کیا ہے بیٹی! آئیہ چاہتی ہے کہ اس کے چچا کی بیٹی مومنہ کو شہزاد کے لیے دیکھ لوں جب کہ پروین  
 کہہ رہی تھی کہ مومنہ خاصی تنگ مزاج اور شوخ ہے۔ شہزاد کے مزاج کے مطابق لڑکی ہونی چاہیے کچھ میں نہیں  
 آ رہا کہ کیا کروں۔“

”ویسے پھوپھو جان! بھابھی کی بات بالکل درست ہے۔ میں نے اُس لڑکی کو نہ تو دیکھا ہے اور نہ اس کے  
 مزاج سے اشا ہوں۔ اس لیے میں اس لڑکی کی مخالفت بھی نہیں کروں گی لیکن پروین بھابھی درست کہہ رہی ہیں  
 کہ شہزاد کی شادی کا معاملہ اُن پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ وہ خود اپنی پسند سے اپنے مزاج کے مطابق لڑکی پسند کریں،  
 اس سے کہہ دوں کہ شہزاد پر اپنی مرضی مسلط نہ کریں تو زیادہ بہتر ہے اور میرے خیال میں شہزاد شوخ لڑکی کو پسند بھی  
 نہیں کریں گے۔“

”پسند تو اسے جو آئی تھی۔ وہ تو مل نہیں سکتی۔ اس کی منگنی تو اپنے تایا زاد فرمان سے ہو گئی ہے۔“  
 ”بھئی تو ہماری زندگیوں کا المیہ ہے پھوپھو جان کہ یہاں کسی کو سبب آرزو نہیں ملتا۔ بہر حال اس معاملے  
 میں آپ شہزاد کی رائے اور پسند کو ضرور اہمیت دیں۔ پہلے اُن سے بات کریں پھر آگے بڑھیں۔“  
 حمیرا ایک گہرا سانس لے کر اٹھ گئی۔ اس وقت عذرا بیگم آگئیں۔

”آداب امی جان!“ وہ جلدی سے ماں کی طرف بڑھیں۔  
 ”جیتی رہو۔ سہاگ سلامت۔ کیسے آئیں بیٹی! خیر تو ہے ناں۔ گھر میں سب کا کیا حال ہے۔“  
 زاہدہ بیگم بیٹیوں کو اپنے گھر دیکھ کر خوش تو بہت ہوتیں مگر فرائی فکر لاحق ہو جاتی کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ  
 وہ مزہ کی طرف سے ہر وقت فکر مند رہیں۔

”امی جان! سانس تو لینے دیں۔ ایک دم اتنے ڈھیر سارے سوالات شروع کر دیے ہیں۔ آپ نے  
 کل نئے نئے سے جس دل چاہا، ملنے کو تو چلی آئی۔ ویسے آپ کدوں پریشان لگ رہی ہیں۔ کیا بات ہے؟“ وہ  
 اُن کے قریب بیٹھ گئیں۔

”پریشان کیا ہوتا ہے شہزاد کے لیے سوچ رہی ہوں کہ اب اس کا گھر بھی بس جائے تو سکون آ جائے۔“  
 ”تو دیکھ لو کوئی لڑکی آپ نے؟“ عذرا بیگم درمیان میں بولیں۔  
 ”میں بڑھیا اب کہاں خاک چھانوں گی۔ تم لوگوں کو چاہیے کہ دیکھو۔ آئیہ مومنہ کے لیے کہہ رہی ہے۔“  
 ”کیا۔ کیا وہ مومنہ۔ تو بہ کریں۔ آئیہ بھابھی تو بس یہی چاہتی ہیں۔ اُن کے خاندان کی ساری

گی۔ اس لیے اس بار بھی جب فرمان نے مزید مہلت مانگ لی تو ایک ذومعنی سی مسکراہٹ اُن کے لبوں پر آگئی  
 ”ویسے فرمان کہتا کیا ہے؟“ عذرا بیگم نے تہہ کیے ہوئے کپڑے الماری میں رکھ کر شوہر کو دیکھا، انہم  
 نے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر بیوی کو دیکھا اور پھر کتاب دیکھنے لگے۔

”کہنا کیا ہے۔ کہتا ہے بس ایک سال کی بات ہے۔ تعلیم ختم ہو جائے تو وہ فوراً آ جائے گا۔“  
 لیٹین احمد کی یہ دلیل ان کو مطمئن نہیں کر پائی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بولیں۔  
 ”آپ مانیں یا نہیں مانیں دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔“  
 ”کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟“ لیٹین نے تلخی نگاہوں سے اُن کو دیکھا۔

”مطلب کیا ہوتا ہے بھئی، ظاہر ہے فرمان جو ان جہان ہے آ کر کب تک۔“  
 ”عذرا بیگم سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔ فرمان ایسی کوئی حرکت نہ کر ہی نہیں سکتا جس سے خاندان کی ناموری  
 حرف آئے اور تم ایسے کسی خدشے کا اظہار ہی بی جان یا آغاسی کے سامنے نہ کر بیٹھنا۔ دونوں بہت حساس  
 رہے ہیں فرمان کے معاملے میں۔“ لیٹین احمد بیوی کی عادت جانتے تھے۔ اس لیے تسبیہ کر رہے تھے۔  
 ”مجھے تو کوئی ضرورت نہیں بات کرنے کی لیکن لیٹین امکانات پر غور کرنا ہی دال میں مندی ہوتی ہے۔“



مرد ہو یا عورت اُس کی زندگی میں ایک بار ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے کہ کوئی انجانی سی بے وفا سی ہستی  
 جان سے قریب ہو جاتی ہے، خواہ اس ہستی سے کتنی تلخیاں وابستہ ہوں۔ وہ اس جذبہ محبت کے سرور میں کھو  
 جاتا ہے۔ کسی دوسرے کے خیال کو بھی اس کے ساتھ نہیں ملاتا۔

شہزاد کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ عابی کے مقابلے میں کسی دوسرے کے خیال کو لاتا ہی نہیں چاہتا  
 جب کہ آجکل پھر ان کے لیے لڑکیوں کی تلاش ہو رہی تھی بڑی اور چھوٹی بھابھی بڑے ذوق شوق سے لڑکا  
 دیکھ رہی تھیں۔ آئیہ بھابھی کی خواہش تھی کہ اُن کے چچا کی بیٹی سے کر لیں اور وہ دے دے الفاظ میں سامنے  
 ذکر بھی کر چکی تھیں۔

”دینی امی جان جو بھیا کی شادی میں براجک رہی تھی سرخ کپڑوں میں۔ آپ نے اُس کے بارے  
 مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ چچا جان کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے، مومنہ۔ آپ کو پسند بھی آئی گی  
 آئیہ نے مومنہ کے بارے میں بتا تو ہوئے کہا تو زاہدہ بیگم ذہن پر زور ڈالنے لگیں۔

”اچھا! وہ وہاں۔ ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔ مجھے واقعی بری پسند آئی تھی مگر یہ لڑکا مانے تو۔“  
 ”امی جان! آپ بات تو کریں شہزاد سے۔ لڑکی تو میرا ہے ماشاء اللہ۔ شکل و صورت، تعلیم، بلیقہ منط  
 نہیں ہے اس لڑکی میں۔ میں کہتی ہوں۔ آپ دباؤ ڈالیں شہزاد پر۔“

آئیہ بیگم چاہتی تھیں کہ کس طرح مومنہ کا رشتہ آج اور اسی وقت شہزاد سے طے ہو جائے۔  
 ”ہاں لڑکی تو اچھی ہے۔ میں شہزاد سے بات کروں گی۔ خدا کرے مان جائے۔“  
 ”اچھا امی جان! میں آپ کے لیے سوپ گرم کر کے لاتی ہوں۔“  
 آئیہ بیگم فوراً اٹھ کر سوپ گرم کرنے چلی گئیں۔ پروین بھابی آگئیں۔  
 ”بھابی! یقیناً مومنہ کی بات کر رہی ہوں گی۔“ وہ سانس لے پاس بیٹھ گئیں۔

”مگر میں اس گھر میں آجائیں یاد ہے آپ کو چھوٹے بھائی اور بہنوں کے لیے بھی کتنا انہوں نے کہا تھا اور سب اسی تک مزاج ہیں۔ اُن کے خاندان میں آپ کی الحال شہزادی کی شادی کے بارے میں کچھ مت سوچیں۔ ہو کہ ہے جو وہ چاہتا ہے، وہ ہی اُسے مل جائے۔“

عذرا بیگم کی بات پر زائدہ بیگم حیرانی سے اُن کو دیکھنے لگیں۔

”کیا کہہ رہی ہو بیگم بیٹی؟ خدا سلامت رکھے فرمان میاں کو، ایسی بات کیوں کی تم نے؟“

”امی جان! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ میں نے کیا بات کی ہے۔ اصل میں چکر یہ ہے کہ فرمان کا باہر ایسا لگتا ہے کہ بہت کم امید ہے کہ وہ یہ رشتہ نبھائیں گے جب بھی شادی کے لیے لکھا جاتا ہے وہ بہانے بناتے شرم دیتے ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے انکار کر دیا کہ فی الحال وہ شادی نہیں کر سکتے جب تک تعلیم مکمل نہ ہو جائے۔“

”تو اس سے یہ مطلب تو نہیں لیا جاسکتا کہ وہ شادی کریں گے ہی نہیں۔ درست تو کہہ رہے ہیں فرمان میاں جس مقصد کے لیے گئے ہیں۔ پورا کر کے ہی شادی کریں گے ناں۔“

”امی جان! آپ بہت بھولی ہیں۔ نہیں سمجھیں گی دیکھیے گا شہزاد کس قدر خوش ہوگا یہ سن کر آپ کیا جانیں شہزاد اس لڑکی کو کتنا چاہتا ہے۔ آپ کو تو دعا کرنی چاہیے کہ فرمان وہیں شادی کر لیں اور عالی شہزاد کی ہوجاں اور صرف عالی نہیں، اس کے حصے کی ڈھیر ساری جائیداد بھی۔“ عذرا بیگم کی آنکھیں چمک اٹھیں یہ سوچ کر کہ

”ہائے خدا نہ کرے۔ عذرا کیسی بری باتیں کر رہی ہو۔ اللہ فرمان کو ہدایت دے اور وہ بن ماں باپ کی بچی کو کوئی دکھ نہ دے۔“

”آپ تو کوئی بات سمجھ ہی نہیں پاتیں۔ بھلا اس میں کسی کا قصور تھوڑی ہے۔ اب فرمان بھی انسانہ جوان ہیں کیا خبر وہاں کوئی پسند جائے تو۔“

”مت کرو ایسی باتیں عذرا! اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے۔ فرمان کو ہدایت دے۔“

زائدہ بیگم عذرا بیگم کو تنبیہ کرتی ہوئی اُنھیں گئیں اور منع کر گئیں کہ شہزاد سے وہ بات نہ کریں مگر عذرا بیگم ہی شہزاد سے بات کرنے کے لیے تھیں۔ پھر بھلا وہ بات کیوں نہ کرتیں۔

شہزاد کے آتے ہی ان کے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ جو نیم دراز ہاتھوں کا تکیہ بنائے عالی کے با- میں سوچ رہے تھے۔ اُن کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔

”آداب آپا جان! آپ کب آئیں؟ وہ تھوڑا سا جھک گئے۔“

”جیتے رہو۔ ابھی ابھی تو آئی ہوں۔ کتنے روز سے تمہیں دیکھا تھا۔ بیٹھو تو تمہیں خوشخبری سناؤ۔“

”خوشخبری۔ کیسی خوشخبری؟“ شہزاد حیرانی سے ان کو دیکھنے لگے۔

”خوشخبری یہ کہ فرمان مسلسل شادی سے انکار کر رہا ہے۔ اس بار بھی اس نے لکھا ہے کہ وہ فی الحال بالکل نہیں کر سکتا۔“

”تو آپا! اس میں میرے لیے خوشی کا کونسا پہلو نکلتا ہے۔ ٹھیک ہی کہا ہے۔ فرمان نے، وہاں پہنچتی ہوئی ہی اتنی سخت ہے کہ اس دوران انسان دوسری کسی بات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تعلیم کے بعد کر لیں گے شادی بھی۔ مگر کی تو بات ہے اور آپ تیار ہی نہیں کہ عالی فرمان کو بہت پسند کرتی ہے۔“

میں ہی شہزاد کے دل سے اٹھی۔

”تو آپا! اس میں میرے لیے خوشی کا کونسا پہلو نکلتا ہے۔ ٹھیک ہی کہا ہے۔ فرمان نے، وہاں پہنچتی ہوئی ہی اتنی سخت ہے کہ اس دوران انسان دوسری کسی بات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تعلیم کے بعد کر لیں گے شادی بھی۔ مگر کی تو بات ہے اور آپ تیار ہی نہیں کہ عالی فرمان کو بہت پسند کرتی ہے۔“

میں ہی شہزاد کے دل سے اٹھی۔

”اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ آسیدہ بھابی مومنہ کے لیے کہہ رہی ہیں اور امی جان تیار بھی ہیں۔ وہیں کرلو۔“

”کیا۔ کہا۔ آپ! آپ منع کر دیں امی جان کو۔ نہیں شادی کرنی مجھے۔ خواہ مومنہ ہو یا کوئی اور۔ عالی نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب کوئی لڑکی نہ میرے دل کی آجڑی ہستی آباد کر سکتی

ہے اور نہ گمراہوں میں کسی کے ساتھ انصاف کر سکتا ہوں۔ اس لیے معذرت کر لیں امی جان سے، پلیز مجھے نہ کیا جائے۔“

شہزاد قطعی فیصلہ کرتے ہوئے باہر نکل گئے اور پھر جب ان کا یہ اہل فیصلہ سنا دیا گیا تو آسیہ بھابی بڑی ناراض ہوئیں اور الزام حمیرا اور عذرا بیگم پر لگایا گیا کہ ان دونوں نے مومنہ کا رشتہ شہزاد سے نہیں ہونے دیا۔ خصوصاً وہ حمیرا سے اُلجھ پڑی تھیں۔

میں سب جانتی ہوں۔ تم نے مومنہ کا رشتہ کیوں نہیں ہونے دیا۔ آخر بچپن کی محبت ہے شہزاد کی اور ہوتے کہاں دیکھ سکتی ہو؟“

آسیہ بیگم کے منہ سے نکلتے شعلوں نے حمیرا کو راگھو کر کے رکھ دیا مگر اس نے تحمل کا دامن نہیں چھوڑا۔ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بھابی جان! مجھے اس سے انکار نہیں کہ شہزاد کو میں نے چاہا ہے، بچپن سے چاہا مگر اس وقت تک جب تک شہزاد کی بیوی نہیں بنی تھی۔ شہزاد کی بیوی بن کر میں صرف ان کی بیوی اور ان کی چاہت ہوں۔ باقی تو جذبے، تمام لوگ اب شہزاد کے سامنے قانونی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ یہ صفائی بھی مجھے پیش کرنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ مگر مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے کہ شہزاد اب میری زندگی سے نکل چکے ہیں۔ ان کو حق حاصل ہے کہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کریں۔ مجھے آپ سے یا مومنہ سے کوئی عناد نہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں میں نے شہزاد بات کی ہے۔ یہ ان کا قطعی اپنا فیصلہ ہے اور پھر انہوں نے صرف مومنہ ہی سے نہیں شادی کرنے سے ہی انکار دیا ہے، تو اس میں میرا کیا قصور ہے بھلا؟“ حمیرا کے دل پر چوٹ پڑی تھی۔ اس بات سے وہ رو ہانسی ہو گئی تو فاطمہ بیگم بھی دیں آگئیں۔

”بھابی جان! آپ اسے کیوں گھیر کر بیٹھی ہیں۔ شادی نہ کرنے کا فیصلہ شہزاد کا اپنا ہے اس طرح تو مجھے بھی پھر ناراض ہونا چاہیے۔ کیونکہ میں نے بھی اس کے لیے ایک لڑکی دیکھی تھی۔ مگر اس نے صاف انکار دیا۔ اب میں کس کو قصور وار ٹھہراؤں۔ آپ کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے گی حمیرا سے؟“

عذرا بیگم نے بڑھ کر حمیرا کو ساتھ لگایا تو باوجود مضبوط کے بہت تار آنسو اس کے آنچل میں جذب ہو گئے۔ ”ہاں بھئی، تم لوگ حمیرا کا ساتھ نہ دو گئی تو کیا ہمارا دو گئی۔ آخر کو ماموں کی بیٹی ہے۔ میں سب جاؤں ہوں۔ اندر ہی اندر جو کچھ پک رہی ہے ناں، سب جانتی ہوں۔ ہماری مومنہ کو رشتوں کا کال ہے کوئی وہ وقت نہ سوجا کہ جیسا شہزاد ہے خوب رو سنا۔ ویسی پیاری سی لڑکی ہونی چاہیے۔ ورنہ۔“

”بھابی! میرا خیال ہے۔ اس قصے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ باتوں باتوں میں بات بڑھ جاتی ہے۔ بات تو ہے کہ مومنہ مجھے بھی پسند نہیں۔“

عذرا بیگم بات ختم کرنے کی غرض سے بولیں مگر آسیہ بیگم کو ان کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ ”یہ کہنا کہ تمہیں پسند نہیں۔ شہزاد کو درمیان میں کیوں لاتی ہو۔ اس گھر میں تو اب تک تمہاری ہی حکمرانی ہے۔ ہر کام تمہاری ہی پسند سے کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ تو گویا بھرتی کے لیے ہیں۔ کوئی حق ہی نہیں رکھنے کی نند بھادج کی یہ بات شاید اب شدت اختیار کر جاتی اگر شہزاد کے آنے کی اطلاع نہ مل جاتی۔“

”بھابی جی آئے ہیں۔ خیریت تو ہے ناں۔ ابھی چند دن قتل ہی تو ہو کر گئے ہیں۔“

حمیرا کہتی ہوئی جلدی سے دوپٹہ درست کرتی آگئی۔ شہباز زاہد بیگم کے پاس بیٹھے تھے۔ ”آداب بھائی جی۔“ حمیرا نے سر کو تھکا دیا۔

”بھئی رہو، کیسی ہو۔ یہ تم کمزور کیوں ہو رہی ہو؟“

شہباز اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر حیرانی سے بولے۔ بہزاد اور کلیل ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ جیسے کہہ رہے ہوں تمہارے گھر میں بھی ہماری بہن ہے۔ مگر ہمیں تو اتنی بھی اجازت نہیں کہ ڈھنگ سے اس کا حال ہی پوچھ لیں۔

”نہیں تو بھائی جی! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں، بھابی کیسی ہیں؟ ان کی طبعیت اب کیسی رہتی ہیں؟ وہ کافی کمزور ہو گئی ہیں، آپریشن کے بعد۔“

حمیرا بھابی کی بات کے اثر کو کم کرتی ہوئی بولی، تو ان کے چہرے پر ناگوار سے تاثرات ابھر آئے۔ ”بالکل ٹھیک ہے۔ امی جان کچھ بیمار ہیں، کہہ رہی تھیں کہ تمہیں ساتھ لیتا آؤں، تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“

شہباز کی یہ سدا کی عادت تھی۔ جو بات کہنی ہوتی، دوسروں کے جذبات و احساسات کا خیال کیے بغیر کہہ دیتے۔ یہ بات شہزاد کو بالکل پسند نہیں آئی تھی اور ان کے چہرے کے بدلنے رنگ حمیرا دیکھ چکی تھی۔ لیکن حاملہ چونکہ ماں کی بیماری کا تھا۔ اس لیے وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی، آخر اسے پہلے اس نے شوہر کو دیکھا۔ باقی سب بھی خاموش تھے، منہ کی وجہ سے سب ہی شہباز سے ڈرتے، شہباز ان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے۔ شہزاد اٹھ کر اندر چلے گئے تو حمیرا بھی آہستگی سے ان کے پیچھے چلی آئی۔ اور منتظر لگا ہوں سے ان کو دیکھنے لگی۔

”شہزاد! لگتا ہے آپ کو بھابی جی کی بات پسند نہیں آئی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میں خود اس حق میں نہیں کہ دوسرے روز والدین کے گھر جاؤں مگر امی جان بیمار ہیں تو۔“

”دیکھو حمیرا! مجھے کوئی اعتراض نہیں تمہارے جانے پر۔ مگر اتنا بتا دوں کہ ممائی جان بیمار نہیں ہیں بات مجھ پر ہے لیکن پھر بھی تم چلی جاؤ۔ وہ کہیں یہ نہ سوچیں کہ ہم بدلے لے رہے ہیں۔“

”بہنہ! ایسی بات نہیں، شہزاد! اگر اتنی سمجھ ہوتی بھابی جی میں تو کبھی ایسی حرکت نہ کرتے، شک تو مجھے بھی پڑا ہے کہ امی بیمار نہیں بات کچھ اور ہے اگر آپ خوشی سے اجازت دیں تو چلی جاؤں تاکہ حالات کا جائزہ لے لوں۔“ حمیرا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اب جو مقاصد اس کے پیش نظر تھے وہ بھی نہیں سکتی تھی۔

”میں نے تو ویسے ہی کہہ دیا ہے۔ چلی جاؤ جتنے دن چاہو رہو آؤ۔“

شہزاد کھڑکی کی طرف رخ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔ حمیرا ان کی پشت سے اندازہ نہ لگا پائی کہ آیا وہ ناراض ہے یا نہیں۔ آہستگی سے چلتی ان کے سامنے آگئی۔

”ایسے جانے کو کہیں گے تو میں ایک قدم بھی نہ اٹھاؤں گی، خواہ کوئی جان سے مار دے؟“

”اچھا بھریے کہوں کہ جاؤ۔“ شہزاد بنجیدہ ہو گئے۔



کو برباد ہونے نہیں دوں گی۔“

”یہ برباد کرنے سے کیا مراد ہے تمہاری؟“ شہباز نے بڑے تھکے انداز میں میرا کوڈ دیکھا۔

”اس سے میری کیا مراد ہے یا کیا مطلب ہے۔ شاید آپ سمجھ رہے ہوں لیکن اگر نہیں سمجھ رہے تو میں

آپ کو سمجھا دوں گی۔ لیکن وقت آنے پر، ابھی نہیں۔“ حمیرا نے معنی خیز انداز میں بھائی کو دیکھا۔

”حمیرا! دیکھو، میری بات مان جاؤ، چاہو تو مجھ سے دو گنا پیسہ لے لو مگر وہ زمینیں مجھے دے دو۔

تمہارے کسی کام کی نہیں۔ مگر تمہارا شہر میں ہے اور یہیں تم نے رہنا ہے، پھر کیوں فضول ضد لگا رکھی ہے اس

سے کس کس کا بھلا ہو گا تمہیں کیا خبر۔“ شہباز بڑے بے چین تھے، اپنی بات منوانے کے لیے۔

”کس کس کا بھلا ہو گا؟ ذرا میں بھی تو سنوں کہ میری اس قربانی سے کس کس کا بھلا ہو گا؟“ حمیرا نے جیکھی

نگاہوں سے سے تلخ لہجے میں شہباز احمد سے کہا تو وہ نگاہیں کترا کر رہ گئے۔

”اصل بات یہ ہے کہ حمیرا! کہ تمہاری زمینیں عالم شاہ کے گاؤں سے ملتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ زمینیں تم

اس کے ہاتھ فروخت کر دو۔ وہ منہ مانگے دام دینے کو تیار ہے۔ اس طرح۔ تمہیں اچھی قیمت مل جائے گی۔

اور اس کا گاؤں وسیع ہو جائے گا۔“

”اور آپ کا گاؤں مختصر ہو جائے گا۔ اسے کتنی فکر ہے اپنے گاؤں کو وسیع تر کرنے کی۔ اور آپ۔

ہونہہ عالم شاہ، اس کو تو میں قبر بنانے کے لیے بھی جگہ نہ دوں، ذلیل انسان۔ اگر وہ میری زمینوں کے

عوض اتنا ہی سونا یا اس سے دو گنا سونا بھی دے تو میں تم بھی اپنی پاک زمین کا سودا نہ کروں بھائی جی! آپ سُن

رکھیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔ میں مر کر بھی اپنی زمینوں کا سودا نہیں کروں گی، وہ بھی عالم شاہ کے ہاتھ جو انسان سے

زیادہ وحشی ہے۔“

حمیرا کو پہلے ہی یقین تھا۔ شہباز کے منہ سے عالم شاہ کا نام سُن کر حمیرا کو آگ لگ گئی۔ وہ بولے گئی جو منہ

میں آیا، مگر شہباز برداشت نہ کر سکے۔

”حمیرا! تم حد سے بڑھ رہی ہو، عالم میرا بہترین دوست ہے اور تم۔“

”اب میں آپ کو کیا کہوں بھائی جی! آپ کی غیرت کو کیسے جگاؤں۔ وہ بات بھول گئے آپ جب اس

عالم شاہ نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ آپ نے پھر بھی اس گھٹیا انسان سے دوستی کر رکھی ہے۔“

حمیرا اس قدر غصے میں تھی کہ جوش میں یہ بھی بھول گئی کہ وہ سسرال میں ایسی بات کر رہی ہے کیا خبر بہن زاد

سُن لیں۔

”اوہو۔ تم ابھی تک اسی کیر کو پیٹ رہی ہو۔ یہ یاد نہیں تمہیں کہ اس نے گھر آ کر معافی مانگی تھی۔ کہ اس

کے آدمیوں سے بھول ہو گئی۔ غلط فہمی میں ایسا ہوا تھا۔ ان کا شکار کوئی اوتھی مگر سامنے تم آ گئیں تو۔“

”بچوں والی باتیں نہ کریں بھائی جی! شکاریوں کے نشانے اتنے کچے نہیں ہوتے کہ اتنے غلط ہو جائیں

اور فرض کریں نشانہ غلط ہو گیا اور اصل شکار بچ گیا اور مجھ پر قدرت نے مہربانی فرمائی، اگر اصل شکار آ جاتا

تو۔“

”حمیرا! یہاں تمہارا لیکچر سننے نہیں آیا، مجھے ہاں ناں میں جواب دو۔“

شہباز نے درمیان میں حمیرا کو ٹوک کر سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ تیسرا کر مڑی۔

”تمہیں خود سے خدا کو دہ بھی مسکرا کر، اب اتنا بھی ظلم نہ ڈھاؤ مجھ پر، میں تو تمہیں جاننا

اجازت نہیں دے سکتا اس لیے جب بھی جانا ہو خود ہی چلی جایا کرو۔“

بہن زاد کی بات پر حمیرا سس پڑی۔ ”آپ کا یہ جنون کب کم ہو گا۔“

”یہ جنون کبھی کم نہیں ہو گا۔ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ تم جو چاہو کرتی رہنا۔“

”اور آپ کا کیا خیال ہے کہ میں آپ کی اس محبت کے سحر سے آزاد ہو سکتی ہوں۔ میں بھی نہیں

گی۔ ابھی جا کر کہہ دیتی ہوں بھائی جی سے۔“ اور پھر بہن زاد رو کر کہہ گئے۔ مگر حمیرا نے شہباز کے

جانے سے انکار کر دیا۔

”مگر وہ انی جان۔“ شہباز کا سارا منصوبہ ہی فلاپ ہو رہا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر بھائی جی بہن زاد کو چند روز کے لیے اسلام آباد جانا ہے، ہو سکتا ہے، ان کو میری ضرورت

پڑ جائے تو۔“ حمیرا کی اس بات پر سب حیرانی سے حمیرا کو دیکھنے لگے۔

”حمیرا! یہ بہن زاد کا اسلام آباد کا پروگرام کب بنا؟ کیوں اور کس سلسلے میں جا رہا ہے؟“ جمیل

حیرت سے حمیرا کو دیکھا۔

”جی تفصیل تو فی الحال مجھے بھی معلوم نہیں۔ ابھی کہہ رہے تھے ان کو ضروری کام سے اسلام آباد

ہے۔“ حمیرا نے کچھ اتنے اعتماد سے کہا، سب کے ساتھ شہباز کو بھی یقین آ گیا۔

”اچھا جب بہن زاد اسلام آباد سے ہوا ہے تو ضرور آنا ضرور رہا ہوا۔“

شہباز اٹھتے ہوئے پو۔ لے تو اور تو کوئی شاید نہیں سمجھا مگر حمیرا خوب اچھی طرح سمجھ گئی کہ کیا بات کرنا

کس لیے آئے ہیں۔

”تو بھائی جی، آپ بات کریں ناں۔ بات کے لیے وہاں آنا ضروری تو نہیں؟“

حمیرا کا لہجہ سخت ہو گیا وہ خوب سمجھتی تھی۔ کہ وہ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ اب جب حمیرا نے

سامنے پوچھا تو شہباز سب کو دیکھ کر تھوڑا سا کسمسا کر رہ گئے۔ سب ہی آہستہ آہستہ اٹھ گئے۔ تو شہباز

ٹپٹنے لگے پھر حمیرا کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

”دیکھو حمیرا! تم میری چھوٹی بہن ہو۔ میری بات مان لو۔ ایک بار میری عزت رکھ لو۔ میں تمام

احسان مند رہوں گا۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔“ شہباز بڑی لجاجت سے بول رہے تھے۔ حمیرا نے گوا

لے کر ان کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

”بھائی جی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی اپنی جاگیر کم تو نہیں کہ آپ میرا حصہ بھی لینا چاہتے

میں نے ایک بار کہہ دیا ہے میں اپنا حصہ نہیں دوں گی۔ پھر آپ کی عزت میرے ہی حصے سے کیوں وہ

ہے۔ یہ جاگیر میرا سہارا ہے بھائی جی! اور کوئی اپنا سہارا کھو یا نہیں کرتا۔ میں معذرت خواہ ہوں۔“

سخت اور مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔

”حمیرا! تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ تمہیں دولت اور جاگیر اتنی پیاری تو نہیں تھی۔“

”واقعی بھائی جی! مجھے دولت اور جاگیر کی اہمیت کا پہلے کبھی اندازہ ہی نہیں تھا کہ کیا اہمیت رکھتی

ان کے بغیر تو انسان کچھ بھی نہیں۔ یہ ہوتب بھی انسان برباد ہو جاتا ہے۔ اور نہ ہوتب بھی۔ لیکن میں

جس کے نام اُن کے پاکیزہ جذبے ہوتے ہیں۔ بس میں بھی چونکہ جناب کا دیوانہ رہا ہوں، اس لیے ایک ایک خبر رکھتا تھا کہ جناب کیا کر رہی ہیں۔“ بہزاد نے شونی سے حیرا کو دیکھا۔

”مگر کیسے، آپ تو ہمارے گھر آیا ہی بہت کم کرتے تھے۔ آپ کو کون ساری خبر دیتا تھا۔“ حیرا کی حیرانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

”بتاؤں گا وہ بھی بتاؤں گا۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ آخر تمہیں اپنی جاگیر سے اتنی والہانہ محبت کب سے ہو گئی۔ کہ تم اس کو چھوڑ نہیں سکتیں۔ دفع کرو تمہاری بلا سے، وہ عالم شاہ لے یا کوئی اور تمہیں اب کون سا دہاں جا کر رہنا ہے۔ کیوں ضد کر رہی ہو۔ شہباز بھائی میڑھے انسان ہیں۔ منزہ آپ کو پہلے ہی تنگ کر رکھا ہے۔“

”میں منزہ آپ کے۔“ حیرا تیزی سے بول گئی۔ مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گئی۔ اور گہرا سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔

”بہزاد! آپ کو نہیں معلوم کہ اپنی یہ زمین مجھے کس قدر عزیز ہے، خدا کی قسم میں اس کی ایک بالشت بھی کسی کو نہ دوں گی۔ اور وہ بھی عالم شاہ کو اس گھنیا انسان کا تو میں اپنی پاک زمین پر سناہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اب وہ آپ کو آلہ کار بننا کر مجھے رام کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن خدا را آپ مضبوط ہو جائیں۔ اگر آپ جھک گئے ناں تو۔ تو بہزاد باقی کچھ نہیں بچے گا۔ میں آپ کو پہلے سے بتائے دے رہی ہوں، یوں نہیں بچے گا۔“

”سیر!“ یہ ہو گیا ہے تمہیں، اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو میں کیوں کچھ کرنے لگا۔ تمہاری چیز ہے اگر نہیں، بتاؤ! تمہیں کوئی تم سے زبردستی چھین نہیں سکتا۔“

بہزاد نے بڑھ کر حیرا کے ہاتھ تھام لئے جو مڑی روح روئے جاری تھی۔

”بہزاد! آپ وعدہ کریں کہ آپ نہ خود ان کی بات مانیں گے اور نہ ہی مجھے مجبور کریں گے۔“

”نہ ان۔۔۔ ہاتھ تھامے بچوں کی طرح وعدہ مانگ رہی تھی۔ وہ مسکرا دیے۔

”وعدہ بالکل پکا وعدہ، وہی ہوگا جو تم چاہو گی۔ میری طرف سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”شکر یہ، بہزاد! آپ تو میری ڈھال ہیں۔“ حیرا نے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے۔



”نہیں ہرگز نہیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں اپنی زمین کا بالشت بھر کھڑا بھی اس کیسے انسان کو دوں۔“ حیرا سوچ کر لومیری بات مان لینے میں ہی تمہارا فائدہ ہے، ورنہ تم جانتی ہو میں کئی نیز می آنگلیوں سے تم کا لے کا ہا رہوں۔“

”بے ہمتی تو میں بھی نہیں بھائی جی! چلئے آپ چاہتے ہیں تو میں عدالت میں رو برو آ جاؤں گی۔ اچھا آئندہ نسلوں کو بھائی کی محبت کا پتا چل جائے گا کہ ایک بھائی دولت کی ہوس میں بہن کو عدالت تک لے آیا ہے تو ایسا ہی سہی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ خدا کی قسم میں اپنی زندگی ہار دوں گی۔ مگر اپنی زمین نہیں ہاروں گی۔“ حیرا پر عزم اور مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔ اور شہباز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ انسان کو ایسی ضد نہیں کرنی چاہیے۔ جس کے نتیجے میں بعد میں اسے تمام عمر پچھتا پڑے میں سب جانتا ہوں۔ تمہارے اس انکار کے پیچھے کون ہے ورنہ شادی سے قبل تو تمہیں دولت جاگیر سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس وقت تو یہ۔۔۔

”وقت وقت کی بات ہوتی ہے بھائی جی! بلا شہباز شادی سے قبل مجھے ان چیزوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ اب ہوا ہے تو کیوں نہ قدر کروں ان کی اور ہر پیچھے ہاتھ کا سوال تو یہ صرف آپ کی غلط فہمی ہے۔ بہزاد! سوائے میرے کسی چیز سے دلچسپی نہیں، اور ان کا حکم ہو تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“ بہزاد کا ذکر کرتے ہوئے حیرا کی نگاہیں عقیدت سے جھک گئیں۔

”ہوں تو یہ کہو ناں۔ کہ سب کچھ بہزاد ہی ہے، دیکھ لوں گا۔ خیر، تمہاری مرضی میں اب چلتا ہوں۔“ شہباز نے خیال انداز میں بولے آنکھوں میں کچھ سوچ کر ہی چپک اُبھر آئی تھی! جس سے حیرا خوفناک ضرور ہو گئی تھی، مگر اہمیت دینا نہیں چاہتا تھی۔

”وہیے بھائی جی! آپ آتے ہی بات کر دیتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ امی کی بیماری کا کہہ کر ناں سب کو پریشان کر دیا آپ نے۔“ حیرا اچھے ہوئے لہجے میں بولتی باہر نکل گئی۔ پھر شہباز کو لا کھ سب نے روکا مگر وہ نہیں رُکے اور چلے گئے۔

”کہہ کیا رہے تھے شہباز بھائی؟“ بہزاد ہاتھوں کا تکیہ بناتے ہوئے بولے۔

”وہی اپنا حصہ میرے نام کر دو۔“

”ان کے نام یا عالم شاہ کے نام؟“ بہزاد کا لہجہ تو سادہ سا تھا۔ مگر حیرا کو جانے کیوں عجیب سا لگا۔ دھڑک ان کو دیکھنے لگی۔

”اس کا مطلب ہے آپ نے ساری باتیں سن لی ہیں۔ کہ عالم شاہ نے مجھے۔“

”ہاں عالم عالم شاہ تمہیں پسند کرتا تھا اور ایک بار اس نے تمہیں اغوا کرنے کی گھنیا حرکت بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تمہاری بہادری سے مات کھا گیا تھا۔“

بہزاد ساری تفصیل بتا رہے تھے۔ اور وہ جبرانی سے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ کہ ان کو کیسے یہ سب معلوم ہوا تھا۔ تعلیموں میں فہمی اُتر آئی۔

”آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا، کیسے یہ سب پتا چلا۔“ حیرا کا حلق خشک ہو گیا۔

”جو چاہنے والے ہوتے ہیں ناں حیرا! بڑے بے چہین ہوتے ہیں اور اس کی بل بل کی خبر رکھتے ہیں

”بہن! یعنی تمہارا بہنوئی۔“ عالم شاہ نے انتہائی ناگوار سے لہجے میں بہن! ادکا نام لیا۔

”خیر تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ تو ہو ہی جائے گا دوسری شرط منظور ہے کہ نہیں۔“ عالم شاہ مڑ کر شہباز کو دیکھنے لگا۔

”جب ایک بار کہہ دیا تو پھر بار بار اصرار سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”اچھا یار! ناراض کیوں ہوتے ہو؟ دکھانا کھائیں۔“ دونوں ہاتھ دھوئے چلے گئے۔

”رشید ادھر آؤ ذرا جلدی سے۔“ رشید جو کھانے کے کمرے میں جا رہا تھا، نورین کی آواز پر ادھر ہی آ گیا۔ جو پردے کے پیچھے کھڑی آہستگی سے اس کو پکار رہی تھی۔

”کیا بات ہے بی بی؟“

”اندر کیا باتیں ہو رہی تھیں، اندر آ جاؤ اور ساری تفصیل بتاؤ۔“ نورین بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

”قسم سے بی بی جی، مجھے کچھ بھی خبر نہیں۔ باؤ جی نے تو مجھے پہلے ڈانٹ کر کمرے سے نکال دیا تھا۔ غفور سے پوچھ کر بتاؤں گا۔“ آپ کو ہر بات۔“

”نہیں رشید خدا کے لیے یہ غضب نہ کرنا، یہ معاملہ میرے اور تمہارے درمیان ہی رہنا چاہیے، میں نہیں چاہتی کہ یہ بات کسی تیسرے کے کانوں تک جائے۔“ نورین گھبرا گئی۔

”بی بی! آپ بالکل فکر نہ کریں غفور میرا جگری یار ہے۔ وہ ادھر کی بات ادھر لگای نہیں سکتا۔“ رشید نے غفور پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نہہ نہیں۔ رشید کوئی دوست، دوست نہیں ہوتا مجھے کسی پر اعتماد نہیں، قسمت ہی خراب تھی کہ ماں باپ آگے پیچھے ایسے کے پاس چھوڑ گئے، وہ ایسا ناگ ہے جو کسی وقت بھی ڈس سکتا ہے، اور تمہیں معلوم ہے، اب کیا ہو رہا ہے، رشید میں مر جاؤں گی، کچھ کرو بھائی ایک تم ہی تو ہو جس پر مجھے اعتماد ہے، خدا اور رسول کے بعد تم ہی میرا سہارا ہو کچھ کرو۔“

نورین بے بسی سے رو پڑی، رشید کی آنکھیں بھی بیگم گئیں رشید کی عمر عالم شاہ جتنی تھی، اور اُس نے ہوشی عالم حلی میں سنبھالا تھا۔ اس کے سارے خاندان نے اس گھر کا نمک کھایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ نورین نے کیسے بھولوں کی سچ پرورش پائی تھی۔ اتنے ناز و نعم میں پلی بڑھی تھی اور والدین کے بعد تو گویا سارے خواب ہی بکھر گئے تھے۔

”بی بی! آپ کیوں روتی ہیں میں آپ کا بھائی ہوں۔ مرتے دم آپ کا ساتھ دوں گا۔ میں خود ہر بات آپ کو بتاؤں گا آپ فکر نہ کریں۔“

”کیا بات بتاؤ گے نمک حرام۔“ رشید جیسے ہی باہر نکلا عالم شاہ سے ٹکرا گیا۔

پہل مچی ہے مچھلی کی طرح ورنہ آج۔ خیر وہ نہ سہی البتہ اس کی جاگیر تو حاصل کر کے رہوں گا۔ اُس نے بھی لگا رکھی ہے۔ مگر میں نے بھی شہباز کو ہڈی ڈال کر اس کے پیچھے لگا دیا ہے۔ شہر سے ہو کر تو آیا ہے اور دیکھو کیا ہے؟

”گلتا ہے اس کو ہڈی تم نے بڑی قیمتی ڈالی ہے۔ جو یوں پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔“ سلطان خان نے معنی انداز میں کہا تو عالم شاہ تیز لگا ہوں سے اُسے گھور کر رہ گیا۔

اچھا یار! میں اب چلتا ہوں ویسے بھی تمہارا خاص دوست آیا ہوا ہے اب ہم جیسوں کو یہاں رہنا چاہیے پھر ملیں گے یار۔“ سلطان گہری نگاہوں سے دیکھتا زیر لب مسکراہٹ لیے اٹھ گیا۔

”اوئے تجھے کتنی بار سمجھایا ہے کہ جب کوئی یا اور بیٹھا ہو تو شہباز کا نام نہ لیا کرو۔ خاموشی سے اسے کمرے میں بٹھا دیا کرو۔ مگر عقل ہو تب ناں، خبردار جو آئندہ ایسا ہوا۔“

عالم شاہ نے رشید کو دو تین ہاتھ جڑتے ہوئے کہا، اور شہباز احمد کے پاس آ گیا۔

”اسلام و علیکم میرا یار اتنے دن کے بعد آیا یقیناً شہر گیا ہو گا کیا بنا؟“ عالم شاہ شہباز احمد سے بغل گیر ہوئے بولا۔

”عالم یار کبھی تو ہماری توقعات سے کہیں زیادہ میٹھا ہے حیرا کسی صورت نہیں مان رہی۔“ شہباز احمد شکست خوردہ سے لہجے میں بولے تو عالم شاہ نے غصے سے مٹھیاں سمجھ لیں مگر اس نے کہا نہیں کیا۔

”تو پھر شہباز یار کیا کیا جائے، میں بھی تو مجبور ہوں، میرا شرائط جو پوری کرے گا، میں تو اسی کو ابھرا گا۔ ابھی سلطان خان بھی آیا ہوا تھا وہ اپنا پورا گاؤں دینے کو تیار ہے۔“

”کیا سلطان خان۔“ عالم آج کے بعد اس خبیث انسان کا نام بھی میرے سامنے نہ لیتا اور اگر تھا اس کی بات مان لی تو یاد رکھو میں اتنا اچھا دوست نہیں ہوں جتنا اُردن ثابت ہوں گا۔“

شہباز احمد پیش میں کھڑے ہو گئے تو عالم شاہ بھی ان کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اسی لیے تو میں کہتا ہوں شہباز ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست ہی رہیں دشمن نہ بنیں۔ جانی ہوگی۔ اپنی بہن کو رام کر دو ہر طریقے سے، تمہیں طریقے معلوم نہیں تو میں بتاتا ہوں۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“ شہباز کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کو دیکھنے لگے۔

”حیرا خود کچھ نہیں۔ اس کے پیچھے جس کا ہاتھ ہے ناں“ اسی کو قابو میں کرنا ضروری ہے، وہ ماٹا سب ٹھیک ہے ورنہ۔ ورنہ تم تو جانتے ہی ہو کہ۔“

عالم شاہ حیرا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ وہ کتنی باہمت اور بہادر ہے اور اسی بہادری کی وجہ سے وہ حال میں نہیں آسکتی تھی۔ اور یہی وہ جلن تھی، جس کی وجہ سے وہ ایک عرصے سے جل رہا تھا اور اسی جلن کی طرف ختم کرنا چاہتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح حیرا کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ اور اسی لیے اس نے اسی میں انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”نہیں عالم شاہ میں جانتا ہوں حیرا میری بہن ہے۔ میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ خود بخود رہی ہے۔ ورنہ بہن! ادے میری بات ہوئی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اس کو تو کوئی اعتراض نہیں بس حیرا خود



”رشید! مجھے لگتا ہے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔“ نورین رو ہانسی ہو گئی۔

”آپ کا یہ بھائی آپ کو جان پر کھیل کر بھی ہر طوفان سے بچالے جائے گا۔ آپ ڈکھی نہ ہوں۔“

”تمہارا خلوص اپنی جگہ بہت معتبر ہے رشید! اور نہ بچ جانو، میرا تو ہر رشتے پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے، جب میرے رشتے ہی اس قدر بودے اور کھو کھلے نکلے ہیں تو۔“

”آپ تو بڑی کمپی ہیں بی بی! لیکن میں بھی یہ جانتا ہوں کہ خلوص کے رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ بچے اور معتبر ہوتے ہیں۔ میں سب جانتا ہوں کہ آپ کتنی منتوں، کتنی مرادوں اور راتوں کو جاگ کر مانگی جانے والی دعاؤں کا شمر ہیں۔ بڑے باؤجی تو آپ کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے، اور بڑی بی بی تو ایک بل کے لیے بھی آپ کو گودے نہیں اتارتی تھیں۔“

”مت زخموں پر نمک پاشی کرو رشید! اتنی محبتیں مجھ سے روتھ گئیں اور ایک ناقدر بھائی ہے جسے نہ مجھ سے محبت اور نہ میری زندگی عزیز اربانوں کا خیال۔ بے حس انسان، اباجی ہوتے، امی ہوتی تو۔ تو آج میں اتنی تنہا ہوتی رشید۔ ان بلند فصیلوں میں کتنی بے امان ہوں۔ کتنی غیر محفوظ ہوں۔ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ اب جو قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ میرا دل اس کے بارے میں سوچ سوچ کر دھل رہا ہے۔ کاش میں اباجی، امی کے ساتھ۔“

”اللہ نہ کرے بی بی! اس طرح کی باتوں سے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں بہت بڑا ہوں۔ واقعی آپ کا ملازم ہوں جو آپ کا بھائی ہونے کا درجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ٹھیک ہے، میں آپ کا بھائی نہ کبھی ملازم ہی کہیں، پر خدا کی قسم نمک حلال ملازم جان پر کھیل جایا کرتے ہیں۔ مالک کے لیے، میں۔ میں آپ کو ان فصیلوں سے نکال کر لے جاؤں گا بی بی! آپ فکر نہ کریں، بس حالات کی ڈور میرے ہاتھ آئے دیں۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو رشید! تم واقعی میرے بھائی نہیں ہو۔ بھائی سے بہت بلند تر ہو۔ تم تو اس قفس میں رہا جھونکا ہو، جس سے مجھے زندگی کی نوید ملتی ہے۔ خدا کے لیے تم نہ ٹھہ جانا۔“

نورین نے چہرہ صاف کر کے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ کو ایک بات بتاؤں بی بی!“ رشید نے آہستگی سے کہا تو نورین سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”مجھنی بار جب میں شہر گیا تو۔ تو احمد صاحب مجھے شہر میں ملے تھے۔“

رشید بتاتا رہا اور نہیں جانتا تھا، احمد کے نام کی بے شمار ٹیسس اسے بے دم کر گئیں ہیں۔ وہ کھڑکی کی طرف رخ مڑ کر کھڑی ہو گئی، اور چاہنے کے باوجود۔ کچھ نہ پوچھ سکی۔ رشید خود ہی بولی پڑا۔

”آپ کا حال پوچھ رہے تھے۔ وہ خود بھی بہت کمزور لگ رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ بیمار رہے ہیں اور ٹائڈا لگے سینے ان کی شادی بھی ہے۔ کاش۔ بڑے باؤجی اور بی بی زندہ ہوتی تو اتنے ہیرا سے لڑ کے کا رشتہ کبھی اٹھ سے نہ جانے دیتے پھر۔“

رشید نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل پر قیامت ٹوٹی ہوئی ہے اور ضبط کرنا اتنا مشکل ہو رہا ہے۔

”رشید! تم جواب۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ آواز کی کپکپاہٹ وہ چھپانہ پائی۔ رشید خاموشی سے ہر گھل گیا تو نورین اوندھے منہ بستر پر گر گئی کتنی ہی دیر وہ اربانوں کی قبر پر نوحہ کن کن رہی۔ قلب حزیں میں آج اوردی ہوئی شام اترا آتی تھی۔ سردی کے باوجود اسے ٹھنک کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ آن کر دی اور کھڑکی کھول کر سیاہ آسمان پر نکلے تاروں کو دیکھنے لگی۔ اسی ساعت احمد دردین کر سامنے آ گیا۔ وہ خود کو نشاط

رشید سر تا پا کانپ رہ گیا۔ بات کی آخری کڑی عالم کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اور وہ اسی کڑی کے سہارے بات کرتے تک پہنچ سکتا تھا۔ مگر اس نے بھی قسم کھالی تھی خواہ چھری اتر جائے۔ وہ کوئی بات نہیں کرے گا۔

”کوئی بات نہیں باؤ! وہ تو بی بی کی سبیلی ہاجرہ کی بات ہو رہی تھی۔ میں نے بی بی سے کہا کہ آپ فکر نہ کرو! میں ہاجرہ بی بی کی ہر بات آپ کو بتایا کروں گا۔ ہاجرہ بی بی کی شادی جو ہونے والی ہے۔“

”اف خدا تیرا شکر۔“ اندر کھڑی نورین خدا کا شکر بجالا رہی تھی۔ اس کی تو جان ہی اٹک کر رہ گئی تھی! جانے رشید کیا کہہ دے، اور رشید بھی یہ بات کہہ کر پرسکون سا ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ عالم شاہ کو یقین دلانے کا کامیاب ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن یاد رکھو اور کوئی بات نورین تک پہنچی تو تیری خبر نہیں۔“ عالم نے ایک جھٹکے سے رشید گریبان چھوڑتے ہوئے غزا کر کہا۔ ”باؤجی! میں نے کیا بات بتائی ہے۔ مجھے کسی بات کی خبر ہی کیا ہے۔“

رشید دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ بلا آسانی سے ٹل گئی۔

”تم لوگوں کے بے خبر رہنے ہی میں تم لوگوں کی عافیت ہے۔ چل اب جا اور سلطان خان کو کہہ کر آؤ! میں نے اسے اُسے ڈیرے پلایا ہے۔“

”اچھا بی بی! مگر۔ رشید کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔

”مگر کیا؟“ جاتے جاتے عالم نے مڑ کر دیکھا۔

”وہ جی میری لتاں پیارے۔ آج میں نے اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے، اگر آپ کریم کو بھیجنا تو۔“ رشید نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ عالم کچھ دیر سوچتا رہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ جاؤ کریم کو بھیج دو میرے کمرے میں۔“

عالم کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ رشید پھر نورین کے پاس آ گیا۔ جو بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔

”بی بی! آپ کیوں اتنی پریشان ہوئی ہیں۔ اللہ مالک ہے۔“



وہ فائل اس کی طرف بڑھائے کھڑا تھا اور نورین حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔  
”یہ نوٹس میرے لیے آپ نے بنائے ہیں۔“

”جی ظاہر ہے، آپ کے لیے بنائے ہیں۔ ورنہ میرے پاس تو سوشلائز جی اور معاشیات نہیں۔“  
”پھر آپ نے یہ نوٹس کیسے بنائے، نہ آپ نے لیچر انٹینڈ کیے اور نہ۔“ وہ حیرانی سے پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ تو وہ مسکرائے لگا۔

”دماغ سے بنائے ہیں۔ لیچر انٹینڈ نہیں کیے تو کیا ہوا۔ کتابیں تو موجود ہیں ناں۔ بس دماغ کو اور ہاتھوں کو استعمال کیا اور آپ کے نوٹس بن گئے۔“ وہ ایسے کہہ رہا تھا، جیسے بہت آسان ہو، اور وہ اسے بے یقینی سے دیکھے جا رہی تھی۔

”اور آپ نے اپنے لیگرام کی تیاری نہیں کی۔“ نورین کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”جی نہیں، پہلے آپ کے نوٹس ضروری تھے۔“ کوکرنا ضروری تھا۔ اب کروں گا اپنا کام۔“ احمد اس کی پھیلی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”لیکن آپ یہ سب میرے لیے کیوں کر رہے ہیں؟“

بالآخر وہ اس سے پوچھ ہی بیٹھی۔ احمد سینے پر ہاتھ باندھ کر سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تو یکبارگی نورین کا دل دھڑکا اٹھا۔ پلکوں کی چلن لرز کر گئی۔

”یہ جو کیوں ہے ناں مس نورین! میں نے بھی اپنے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ کیوں تو ہوتا ہے کیا جواب ملا؟ اس کا شوخ لہجہ جو جھل ہو گیا تو وہ پھر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”جواب یہ ملا کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی چلوگ کرتے ہیں، بے لوث ہو کر، وہ بڑے عظیم ہوتے ہیں۔ مگر میرے دل نے کہا کہ تم عظیم نہیں ہو، کیونکہ اس میں تمہاری غرض شامل ہے۔ تم اپنے دل کے ہاتھوں“ اپنے دل کی خواہش کے ہاتھوں اور جذباتوں سے مجبور ہو کر کرتے ہو۔ اس لیے تم عظیم نہیں۔“

اسے گہری شوخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے احمد نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس عام سے نوجوان میں جانے کیا بات تھی کہ اس کی یہ باتیں دل کو اچھی لگتی لگیں۔ اس کی گہری شوخ نگاہیں اس کے دل کے تاروں کو چھیر جاتیں۔ تو اس کے قدموں میں اعتماد آ جاتا، اور پھر یوں ہوا کہ وہی شہر کے ماحول سے گھبرا جانے والی نورین شہر کی فضاؤں میں سانس لینے لگی تو یہ فضا میں ہی عزیز تر ہو گئیں۔ ان چار سالوں کی رفاقت نے زندگی ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ مگر ان کے قریبی دوستوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے کرنے کے بعد نورین کا دل تو چاہتا تھا احمد کے ساتھ ہائیڈروکسی میں ایڈمیشن لے لے، مگر عالم شاہ نے اسے واپس بلا لیا۔ وقت رخصت لب تو خاموش رہے مگر آنکھوں میں پھیلنے کا جمل کی دھار کو وہ احمد سے نہ چھپا سکا، جو خود بھی بہت دکھی ہو رہا تھا۔

”نورین! میں امی ابو کو لے کر گاؤں آؤں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔“

”احمد! امیرا تعلق انسانوں کو ایسی بستی سے ہے جہاں لڑکی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ ان کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔ وہاں فیصلے صادر کئے جاتے ہیں۔ رائے یا پسند نہیں پوچھی جاتی۔“ اپنی روایات اور بھائی کو سختی کو بھائی تھی، اسی لیے یاس و آس کی سی کیفیت میں بول رہی تھی۔

آفریں وادیوں میں دیکھنے لگی۔ جب وہ ضد کر کے شہر پڑھنے گئی تھی۔ شہر کے سب سے اچھے کالج میں اس کا کام ہوا تھا۔ شہر کے باسی بہت تیز اور شوخ لگے تھے اسے۔ اس کے کالج کے تمام لڑکے لڑکیاں جن کا شہر سے تعلق نہ تھا بہت شوخ تھے۔ ایڈمیشن کے بعد تو سب نے بہت تنگ کیا تھا، اور وہ ٹھہری سدا کی کم گو۔ وہ کبھی ہوتی رشتی باپ میں اس نے بار بار تعلیم ترک کر دینے کا ارادہ کیا۔ اور ایک بار تو اس نے پختہ ارادہ کر کے اپنی ایک دوست لڑکی دیا تھا کہ وہ اب کالج نہیں آئے گی۔ کیونکہ اس روز ایک لڑکے نے خاصی بدتمیزی کی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ برداشت نہ ہو سکی تھی۔ اس روز وہ کالج کے آفس سے فارغ ہو کر کورڈر میں آئی۔ جو اس وقت خالی تھا۔ اسی بلڈ زرا اعتماد سے چل رہی تھی۔ ورنہ تو شہر آ کر اس کا جو تھوڑا بہت اعتماد تھا۔ وہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ جلدی جلدی لڑکھا کر ہوشل پہنچ جاتا چاہتی تھی۔

”سنیے۔“ مردانہ آواز پر اس کے قدم وہیں جم گئے۔ ایک لڑکے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس کا مطلقاً ہو گیا۔ ہاتھوں میں نمی آ گئی۔

”سنا ہے، آپ کالج چھوڑ رہی ہیں۔“ وہ سانس: ابڑ کرتا ہوا بولا۔

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی کہ یہ کون ہے، اسے کیونکر خبر ہوئی۔

”جی لیکن آپ کون؟ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

”کہ میں کون ہوتا ہوں، پوچھنے والا، یہ ہی کہنا چاہتی ہیں ناں آپ محترمہ! بندے کو آپ کا کلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

”جی لیکن میں نے تو آج تک آپ کو نہیں دیکھا۔“ اس کی خوبصورت آنکھوں میں حیرت اور نا اطمینان کے سائے لہرائے گئے۔

”آپ نے نہیں، لیکن میں تو آپ کو دیکھتا رہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے۔ کہ آپ کی پلکوں کی یہ چلن وقت گری ہی رہتی ہے۔ کبھی اٹھے تو ہوتا چلے کہ کون کیا ہے، کہاں ہے۔“

گہری نگاہوں کے حصار میں نورین کا چہرہ تپ رہا تھا۔ شوخ لہجے کی ٹھنڈک اتر رہی تھی۔ مگر وہ اسے بھی نہ پوچھ پائی کہ وہ کیوں نہیں چاہتا وہ کالج چھوڑ دے۔ وہ خود ہی بولا۔

”دیکھئے مس نورین! میں جانتا ہوں کہ آپ کا ذکر سے آئی ہیں اور ضرورت سے زیادہ حساس ہیں مگر یہ کوئی بات نہ ہوئی کہ آپ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یہاں آئی ہیں اور یہاں کے ماحول نے علم کی پیاس بجھائے بغیر ہی چلی جائیں تو میرے نزدیک تو یہ اچھی خاصی بری ہے جو کہ آپ کو کھینچا چاہیے۔“

وہ عام سا نوجوان اسے بتا رہا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ کیوں روک رہا ہے؟ بھی جانے کیوں اس نے اس کی بات مان لی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ کیسے ایسا ہوا، ورنہ تو وہ مصمم ارادہ کرتا واپس جانے کا۔ یہ تھی اس کی احمد سے پہلی ملاقات۔ پھر یہ ہونے لگا کہ وہ جہاں بھی ہوتی احمد کی نگاہیں حصار میں ہوتی۔ وہ ہر معاملے میں اس کی مدد کرتا۔ اسے نوٹس تیار کر کے دیتا۔ مگر اس طرح کہ کسی کو گمان نہ گزرتا۔ نورین کے دل میں احمد کے لیے بہت عزت و احترام تھا۔

”نورین! یہ نوٹس ہیں۔ سنبھال کر رکھیے گا۔ راتوں کو جاگ کر بنائے ہیں آپ کے لیے۔“

”اور اگر تم سے تمہاری پسند پوچھی جائے تو کیا جواب ہوگا تمہارا؟“ احمد شوخ ہو گیا۔

”تو ظاہر ہے کہہ دوں گی۔ مجھے لڑکا بالکل پسند نہیں۔“ وہ بھی شوخ ہو گئی۔

”کس دل سے کہہ رہی ہو، یہ بھی بتا دو اور اگر واقعی کوئی ایسی بات ہو گئی نا تو۔۔۔ تو نورین باقی بچے کا۔ سب ختم ہو جائے گا۔“

احمد ایک دم سنجیدہ ہو گیا تو وہ گہرا مٹی۔ یہ احمد ہی تو تھا جس سے مل کر اسے زندگی سے پیار ہو گیا تھا۔

”آپ تو ابھی سے ہمت ہارے دے رہے ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔“ اور پھر نورین نے دیکھا کہ

اپنے والدین کو لے کر آیا تو اس کے بھائی اور برادری نے گویا اس بات کو اپنی توہین جانا۔ عالم شاہ آپ سے

ہو گیا۔ کہ اس کنگے کی یہ اوقات کہ میری بہن کا جو کئی مربعوں کی مالک ہے۔ رشتہ لے کر آ گیا۔ نذر زندگی

کی سوکھی ذکر یوں سے گویا محل تعمیر ہو جائیں گے۔ میری بہن کے لیے۔ خاندان میں برادری میں، گاؤں

اتنے اچھے رشتے ہیں تو پھر شہر میں کرنے کی کیا تنگ ہے۔ اور دوسری وجہ تھی کہ اگر اس کے ساتھ کر دیا۔ تو لوگ

ہی سمجھیں گے کہ لڑکی شہر پر مبنی تھی کہ عشق کرنے۔ بدنامی الگ ہوگی۔ صاف انکار کر دیا۔ یہ بھی نہ سوا کا

تو گاؤں کی ہر اچھی لڑکی پر نظر رکھتے ہیں، تو بہن نے اگر کسی کو پسند کر لیا تو کیا قیامت آگئی۔ مگر عالم شاہ کے

اتنادماغ تھا ہی نہیں، جوانی گہری بات سوچ سکتا۔ اسی لیے تو اس نے بڑی آسانی سے احمد اور نورین کی چاہ

اپنی ہمت دھری کی قبر میں اتار دیا تھا۔ اس پرستم نے نورین کو دوسرے گاؤں بھجوادیا گیا۔ تاکہ ردو لے ہوئے

اپنی تنہائی کی بستی سے اٹھتا دھواں بھی نہ دیکھ سکیں۔ سوائے اس تحریر کے جو اس کے اشکوں میں دھل کر آئی

نورین نے احمد سے معذرت کی تھی۔ کہ اس کے والدین کی توہین ہوئی۔ یوں ایک پیار کی کہانی حسب

صحتوں کی لحد میں اتر گئی۔

نورین پر اس بات کے بعد باقاعدہ پہرے لگادے دیے گئے تھے۔ کہ وہ اس قفس سے کہیں آزاد فضا

نہ نکل جائے مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ نورین کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا ہے جو اپنے والدین اور بھائیوں کی عزت

اپنی چاہتیں اپنے ارمان قربان کر دیا کرتی ہیں۔ قفس کی ان فصیلوں کے اس پار احمد جانے کس حال میں

اور کوہم سفر بیٹا چکا تھا کہ نہیں اور نہ ہی احمد کو نورین کی کوئی خبر تھی۔ آج رشید نے اس کا نام لے کر زخموں پر

چھڑک دیا تھا۔ کہ وہ کراہ رہی تھی۔ بچہ بستہ ہواؤں سے زخاں سرد ہو گئے تھے مگر دل میں بھڑکنے والی آگ

کو جھلسا رہی تھی۔ اس نے تھک کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے اور آ کر لیٹ گئی۔



آغا ہاؤس میں زندگی اپنی پرانی ڈگر پرست روی سے جانب منزل تھی۔ کوئی خاص بات یا کوئی

رومانی ہوئی تھی کہ یکسانیت کے شکار ذرا ہنوں کو سکون آتا۔ اب تو سب کی نظریں فرمان پر لگی تھیں۔

لوٹ کر آئیں اور کب عالی کے فرض۔۔۔ سبکدوش۔ ہوں۔ عالی خاموشیوں کے سمندر میں وقتی ہی جا رہا

اور سیدہ محض عالی کی وجہ سے دکھی رہتیں۔ ورنہ وہ خود بہت خوش تھیں۔ رحمان ان کا بے حد خیال رکھتے، ان

سی پریشانی پر پریشان ہو جاتے اور ان کی پریشانی کو فوراً دور کرنے کی کوشش کرتے اور فرمان والی ایسی

کہ وہ وقت سے پہلے دور نہیں کر سکتے تھے اور فرمان کی واپسی میں ابھی ایک سال پڑا تھا۔

”وطن اپنا ہے آپ کو، عالی کی عمر لگی جا رہی ہے اور فرمان ہیں کہ پلٹ ہی نہیں رہے۔“

”سیدہ بیگم یہ بات غلط ہے، سبھی، اول تو عالی کی کوئی ایسی خاص عمر نہیں ہوگی۔ بچی ہی تو ہے ابھی۔ بائیس

مال کی کیا عمر ہوتی ہے اور جناب فرمان کے تو اب اچھے بھی پائیس گے۔ ایک سال رہ گیا ہے، آنے میں اور

تے ہی ہم ان کو سہرا باندھ دیں گے اگر کہو تو ایر پورٹ پر ہی سہرا باندھ دیں۔ کیوں کیا خیال ہے۔“

رحمن سیدہ کو دیکھ کر مسکرائے تو وہ بھی مسکرائے لگیں بھلاوے کی سب باتیں دوسروں کو تو بھلا سکتی تھیں۔

خواب بھی دکھا سکتی تھیں، مگر عالی کے ویران آگن میں بھڑکی سیاہ شام ایسی اتری تھی کہ جانے کا نام نہیں لے

ہی تھی۔ وہ پہرہوں یا دود کی چھاؤں تلے ٹھنسی ماضی کے درپچوں میں جھگتی رہتی۔ جہاں وہ اور فرمان ایک

تھا ہوتے۔ کھیل رہے ہوتے۔ مسکرا رہے ہوتے۔ مگر اب تو یہ سب خواب ہوا اور وہ ان ہی خوابوں کی وادی

میں رہنا چاہتی تھی اور رہتی تھی۔ اس کی زندگی اس کی سوچوں کا محور صرف فرمان ہی تھے ان کے متعلق سوچتی رہتی

اور ان سوچوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ سر میں شدید درد کا دورہ اٹھا جو سب کو پریشان کر گیا۔ ڈاکٹر نے بھی اس درد کو سوچوں

کا اثر قرار دیا تھا۔ مزید یہ کہ آئندہ یہ دورہ نہیں پڑنا چاہیے۔ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔

”یہ سارا قصور فرمان کا ہے۔ جا کر ایسا بیٹھا ہے کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ کہ کلیوں کی لڑکی کو منتظر چھوڑ آیا

وہ۔ سیدہ تم کیوں رو رہی ہو عالی ٹھیک ہے۔“

ڈاکٹر آئے پہلے فرماؤ گزردہ دار ٹھہرایا اور پھر سیدہ کو منع کرنے لگیں، جو عالی کی حالت دیکھ کر رونے لگی

نہیں۔ غدا بیگم منہ بنا کر باہر نکل گئیں۔ البتہ قدسیہ بانو عالی کے لئے دودھ گرم کر کے لے آئیں۔ جواب پہلے

سے بہت محسوس کر رہی تھی۔

”عالی لو شاباش دودھ کے ساتھ دوا لے لو۔ میں نے لقمان سے تمہارے بھائی سے کہہ دیا ہے۔ وہاں

بائیں، اور فرمان کو کانوں سے پکڑ کر لے آئیں اور لا کر عالی کی عدالت میں پیش کر دیں۔ تاکہ عالی اسے عمر بھر

کے لیے اپنی زلفوں کا آئینہ بنا لے اور کہیں نہ جانے دے۔“

قدسیہ بانو کی بات پر سب ہی مسکرا پڑیں۔ مگر عالی لچکی گئی، اُس نے کھل میں منہ چھپا لیا۔

”میں بھابھی جان ایسا نہیں نہ کیا کریں۔ وہ آہستگی سے بولی۔

”اچھا ہم یہ باتیں بھی نہیں کر سکتے، اور خود محترمہ ان کو یاد کر کے بیمار ہو کر پریشان کر دیتی ہیں ہمیں۔“

قدسیہ بانو نے پیار سے اس کے سر پر چیت لگائی۔

”اسکی تو کوئی بات نہیں بھابھی! آپ لوگ خود ہی ہر بات کو سامنے سے منسوب کر دیتی ہیں تو اس میں میرا کیا

فصل ہے؟“ عجب آلود لہجے میں وہ بولے گئی۔

”ارے بھی تمہیں اس سے منسوب کر دیا تو بات منسوب کرنے میں کیا حرج ہے، چلو اب دوا کھا

کر لیٹ جاؤ۔“ قدسیہ بانو دوا سے چھرا کھٹھ گئیں۔ اب صرف سیدہ کمرے میں رہ گئیں۔

”عالی کیا سوچتی رہتی ہو میری جان۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ رحمن بتا رہے تھے کہ فرمان چند ماہ تک آجائیں

گناہ اللہ میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری مانگ میں افشاں سجاؤں گی۔ فرمان کے نام کا جو مہر سجاؤں گی۔“

”آجا جان آپ۔ آپ لوگ کیوں ایسا سمجھتے ہیں کہ میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف فرمان کے متعلق

ہی ہے۔ خدا نے واحد پر میرا کامل ایمان ہے جو وہ بہتر سمجھے گا۔ وہ میرے لیے کر دے گا۔ اس میں پریشان

خواب بنے گی۔

شکر سج او، بے وفا، کسور۔ یہ وہ خطابات تھے جو فرمان بیڈ پر لیٹے مریم کے نام کر رہے تھے جو شاید اس سک سے نا آشنا اور وہ چاہت کی انجانی راہوں پر وہاں تک پہنچ گئے، جہاں سے واپسی کے تمام راستے بانی پر لکیر کی مانند غائب ہو جاتے ہیں اور فرمان اس گھڑی کو کوس رہے تھے، جب وہ یہاں آئے تھے اور اگر اب ہی ملے تھے تو ضروری تھا کہ اس دشمن جاں سے ملاقات ہوتی اور اگر ملاقات ہوگی تھی۔ تو کیا لازم تھا، کہ محبت بھی ہوئی ایسے تو نہیں ہوتا، بے شمار لوگ زندگی میں آتے ہیں مگر ہر کسی سے اتنی محبت کہاں ہوتی ہے کہ انسان اس کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔ وہ تو آج تک عشق کی اس چش ہی سے نا آشنا تھے، جس نے اب ان کی روح کو جھلسا دیا تھا وہ بھی اس بے وفا سے جس کو کچھ خبر ہی نہیں تھی۔

”تو مجھے کیا پڑی ہے کہ اس کی یاد میں تڑپتا ہوں۔ اب میں اس کے بارے میں ہرگز نہ سوچوں گا، یعنی حد ہوگی کہ ہم مریم آپ کے لیے اور آپ فرمائیں کیا۔“  
فرمان جو گزشتہ بے شمار ساعتوں سے مریم کے خیالوں کے جنگل میں بھٹک رہے تھے۔ ٹھک آ کر لائٹ آف کر کے کبل میں ٹھس گئے۔

”مگر اب دقت بھی تو بہت کم رہ گیا۔ بمشکل چند ماہ رہ گئے ہیں، مریم پھر دور ہو جائے گی، پھر بھلا یہ دل کہاں زندہ رہ جائے گا۔ نہیں ایسا نہیں ہوتا چاہیے مریم۔“  
دل کی اتھاہ گہرائیوں سے انہوں نے مریم کو پکارا۔ یہ خیال ہی دھکی کر گیا تھا۔ کہ مریم سے جدا ہونا ہوگا۔ اس خیال نے تو شہر یاروں میں تاریکی کے سائے پھیلا دیے تھے۔ مگر وہ وضعدار تھے، خواہ وہ اس مسئلہ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ جب مریم ہی کو۔ احساس نہیں تو پھر کیا ضرورت ہے اس طرح کرنے کی۔ وہ گہری سی سانس لے کر سونے کی کوشش کرنے لگے تو اسی وقت فون کی تیلر دلی۔

”ہیلو فرمان! میں مریم بول رہی ہوں۔“ آواز کے رننے دل کی چٹانوں پر بہنے لگے تو لطیف سا احساس ہو لگا کہ کدو میں اتر گیا۔ جی میں آیا کہہ دیں کہ تعارف کی کیا ضرورت ہے۔ بہار تو اپنا تعارف آپ ہوا کرتی ہے۔ مگر کج ادائی اگر اس کی خوشی تو اپنی وضعداری ان کو بڑی عزیز تھی۔  
”جی تو کیا آج پھر آپ کی مانوجھت سے کوئی گئی ہیں۔“ فرمان کے لہجے میں ڈاسری تھی کی آمیزش تھی۔ جواب میں وہ ٹھٹھکا کر فون پر پڑی۔

”جی نہیں، آج تو میں نے کسی اور ہی بات کے لیے فون کیا ہے۔“ خوبصورت آواز کی ٹھٹھک دل کے ناپوں پر الوی گیت چھیڑ گئی۔ مگر وہ بڑے ضبط سے بیٹھے تھے۔ جب کہ کان کی نشاط آگئیں لفظ کے خطر تھے۔  
”جی فرمائیے، لیکن جو کہتا ہے ذرا جلدی۔ اتنی رات ہو گئی ہے، نیند خت آ رہی ہے۔“ فرمان بوجھل آواز تاکر۔ بولتا کہ نیند کا تاثر قائم کر سکیں۔

”اچھا تو سات بجے ہی آپ کی اتنی رات ہو جاتی ہے کہ گہری نیند آگئی آپ کو۔“  
”سات بجے ہیں ابھی، خیر، آپ بتائیے آپ نے یہ زحمت کیوں کی؟“ گھڑی پر نظر ڈال کر فرمان کچھ کہانے سے ہو گئے۔

ہونے کی کیا بات ہے، اور یہ سرکار دو تو کافی دنوں سے آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ آج کچھ زیادہ ہی ہو گیا اور سب۔“ وہ دوسروں کو تو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتی تھی مگر خود کو کیسے کرتی۔ اور یہ اعتراف بھی کیسے کرتی کہ یہ سہ پہا کی وجہ سے ہوا ہے اور پھر کرے بھی کیا۔ اس کی زندگی میں اور کیا ہے جس کے متعلق وہ سوچے۔ گو تھکے ہوئے تھک تو وہ کم گو تھی۔ مطلب کی بات کرتی۔ مگر کے زیادہ تر کام۔ وہ خود کرتی اور ویسے بھی قدسیہ بانو نے مصروف رکھنے کے لیے ڈھیر سارے کام اس کے ذمے لگا رکھے تھے اس کے علاوہ لی بی جان کے ڈھیر ہوتے جو صرف اسے ہی کرنے ہوتے۔ ان بے شمار کاموں کی ادائیگی میں وہ سب کچھ بھول جاتی۔ رات پر آتی تو سیاہ آسمان پر چمکتے ستاروں کی مسکراہٹ میں فرمان کی خمیرہ اتر آتی۔ وہ بس مگر سانس لے کر رہ جاتی۔ جدائیوں کے یہ رستے جانے کب ختم ہوں اور کب وصل کی گھڑی دہن بن کر آگن میں اترے، کبھی بھی انہیں گھراپ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب کسی کمزوری کا اظہار نہیں کرے گی، جو کوئی بھی واردات گزرتی ہے۔ ہر گز رتی ہے۔ اس میں کسی کا تصور نہیں تو وہ مزاحیوں دوسروں کو دے، اپنے چاہنے والوں کو اپنی ذات سے کیوں کرے اور ویسے بھی یہ دیوانگی ہی تو تھی کہ وہ اس کے لیے یوں تڑپتی تھی اور وہ اس سے کوسوں دور تھا۔ کبھی اُسے اس کا خیال بھی کبھی آتا ہے کہ نہیں۔

وہ اب مصروف رہنا چاہتی تھی اسی لیے اس نے ملازموں کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تو اسے ہوا کہ اس کے پاس بہت محدود علم ہے۔ اتنا محدود کہ وہ مزید علم کے چراغ آسانی سے نہیں جلا سکتی۔ اس نے نے عزیمت حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ کر کے بہت بڑے سکون اور مطمئن ہو گئی تھی۔ اب مسئلہ یہ اس خواہش کا اظہار کس طرح کیا جائے۔ جانے آ غامبی کا۔ رد عمل کیا ہو، اس لیے اس نے پہلے قدسیہ سے بات کی تو وہ ذومعنی انداز میں مسکرا پڑیں۔

”کیوں ابھی اب جبکہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چاہتی ہیں۔ تم نئے کام شروع کرنے لگی ہو۔“  
”نہیں بھائی جان! اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ جو فیصلہ میں نے اب کیا ہے، مجھے بہت پکارا چاہیے تھا بھلا علم بھی ختم ہونے والا تازہ ہوتا ہے۔ جتنا بچہ پیاس بڑھتی جاتی ہے۔“

”واہ بھئی واہ۔ ہماری عالی کو تو بولنا بھی آتا ہے۔ ارے بی بی! میں سب جانتی ہوں۔ جنہیں اب خیال کیوں آیا ہے پتا ہے نا کہ میاں صاحب باہر پڑھ کر آ رہے ہیں تو ان کے مطابق جنہیں بھی پڑھ لینا چاہا۔“  
”اللہ بھائی جان! ہم سے میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ یہ خیال تو اچانک ہی آیا۔ جب سے بچوں کو پڑھانا شروع کیا ہے تو سوچا میں مزید پڑھ لوں۔“ قدسیہ بانو کی بات پر عالی کی لولہا گئیں، اور جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کرتی ہوئی یہ لڑکی قدسیہ بانو کو بہت اچھی لگی۔

”مان لیا بھی، مان لیا، لیکن اجازت ملنا مشکل ہے۔ بات کر دیکھو بیویں سے۔ تم تو لاڈلی ہو، شاید جائیں۔ ویسے میرے خیال میں اب اجازت ملنا مشکل ہے۔ پہلے تم یہ بات کرتیں تو شاید مل جائیں، لیکن اب نہیں۔“  
”کیوں اب کیوں نہیں، اب کیا ہو گیا ہے؟“ عالی کتاب ایک طرف رکھ کر بولی۔

”اس لیے کہ اب جناب فرمان صاحب آنے والے ہیں۔ آ غامبی اب مزید پڑھنے کی اجازت کے بجائے دہن بنانا زیادہ پسند کریں گے۔ دیکھو ذرا فرمان کے نام سے کیسے دھتک اتر آتی ہے رخسار؟“  
قدسیہ بانو نے اس نے سرخ رخسار چھوئے اور مسکرائی باہر نکل گئیں۔ اور وہ پھر دھڑکتے دل کے

”اس لیے یہ زحمت کی ہے اتنی رات کو کہ یہ پوچھ سکوں آپ ناراض تو نہیں؟“  
مریم کے شوخ لہجے میں جانے کیا پنہاں تھا جو فرمان کو معتبر کر لیا۔ مگر وہ انجان بن گئے۔  
”کس بات پر ناراض ہونا تھا یہ بھی بتادیں۔“

”اس روز آپ گھر آئے تھے اور میں آپ سے نہیں ملی تھی۔“ وہ یاد دلاتی ہوئی بولی تو فرمان کھل  
ڈیروں کو پٹلیں کھل اٹھیں۔ تاہم انہوں نے وضعداری کا دامن نہ چھوڑا۔

”ارے تو آپ اتنی چھوٹی باتوں پر بھی سوچتی ہیں یقین کیجئے۔ مجھے تو خیال بھی نہیں آیا ناراض  
کی بات ہے۔ اور آپ کا کیا خیال ہے۔ میں وہاں آپ کے لیے جاتا ہوں۔ انسان کو اتنا خوش فہم بھی  
چاہیے کس مریم۔“

الفاظ تھے کہ پگھلا سیسہ۔ جس نے مریم کی سماعتوں کو مفلوج کر دیا۔ حدت ضبط سے اس کا نہ اعمال  
ریسوران کے ہاتھ میں لرز گیا۔

”فرمان صاحب! میں تو آپ کو کچھ اور ہی سمجھی تھی مگر۔ مگر آپ بھی۔“

آواز کی لرزش، الفاظ کی اداسی فرمان کو سب کچھ سمجھا گئی کہ مریم پر اس بات نے کیا اثر کیا ہے  
پکارتے ہی رہ گئے۔ مریم ریسیور رکھ کر لیٹ گئی، کتنی ہی دیر وہ روتی رہی۔ وہ رونا نہیں جانتی تھی۔ دوران  
اسے اتنی خوشیاں دے رکھی تھیں کہ وہ آنسوؤں کی لذت سے بے بہرہ تھی۔ کسی درد کی تک کیا شے  
جانتی تھی مگر آج اس فرمان نے اس کی اسلٹ کر دی تھی، جسے دیکھ کر ہی اس کے دل نے کواڑ کھول کر اسے  
تھا اور وہی اس کی شوخیوں کو کتنا غلط سمجھا تھا۔ وہ تو یہ سمجھی تھی کہ اس بات پر فرمان ضرور ناراض ہوں گے  
کے اصرار پر یہ کہیں گے کہ میں تمہارے لیے ہی تو آتا ہوں۔ تم ہی نہ ملو تو کیا فائدہ آنے کا۔ فرمان  
جانیں میں اپنی شوخیوں کو اوٹ میں چاہت کے ان رنگوں کو چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ کیونکہ میں غایب  
نہیں کرتی تھی، اور آپ۔۔۔ اچھا ہی ہے کہ پتا چل گیا ورنہ جانے کیا ہو جاتا۔

وہ تمام رات روتی رہی تو دوسری طرف فرمان بھی بہت بے مزہ ہو گئے تھے۔ تمام رات وہ نہ ملالہ  
انہوں نے کیوں ایسا کہا۔ حالانکہ ان کو خود یہ بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔ مگر جانے کیوں یہ جملہ زبان  
گیا تھا۔ یہ وہ الفاظ تھے جس سے کوئی بھی لڑکی ناراض ہو سکتی تھی اور پھر اس سے معذرت کے خیال  
سکون ہو گئے۔ اگلے روز سردی بہت تھی، مگر سے نکلنے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا، پول  
بستر میں پڑے تصور جاناں میں کھوئے رہیں مگر جاناں کو مٹنا زیادہ ضروری تھا۔ اس لیے وہ گرم کپڑے  
جاناں پر پہنچ گئے۔ مریم کافی دیر سے آنکھ داناں کے پاس بیٹھی کوئی کتاب۔ دیکھ رہی تھی۔ کہ تلی ہوئی  
فرمان نہ ہوں دل نے سرگوشی کی تو وہ اور محتاط ہو گئی، اور سامنے فرمان کو پا کر تلخ چہرے پر رخ سے  
آئے۔

”آؤں، اندر آنے کو نہیں کہیں گی مہمان کو۔“ فرمان نے گہری نظروں سے روشنی ہوئی مریم کو دیکھا  
شال میں چھپی ہوئی تھی، سردی کی وجہ سے چہرہ اور ناک سرخ ہو رہے تھے۔

”آپ میرے مہمان نہیں ہیں فرمان صاحب! اور نہ ہی آپ میرے لیے آئے ہیں۔ یہاں  
خوش فہمی کا شکار نہیں۔ اسی بوگھر پر نہیں آپ جا سکتے ہیں۔“ بھیکے لہجے میں الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس

سے بچتے آنسوؤں میں ڈھل گئے تو وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر اندر بھاگ گئی۔ فرمان پریشان ہو گئے۔  
اور کسی بھی بات کا خیال کیے بغیر اندر آ گئے۔ وہ آنکھ داناں کے قریب پڑی کرسی پر گری رو رہی تھی۔

”مریم یہ۔۔۔ یہ کیا بچکانہ حرکت ہے۔“ فرمان نے آنکھوں سے اس کے سر دھاتھا تھا۔  
”آپ جا سکتے ہیں فرمان صاحب اسی بوگھر پر نہیں۔“ وہ آنکھ داناں کے قریب سے بولی۔

”لیکن وہ تو ہے ناں، جس کے لیے میں آتا ہوں۔“ فرمان بھاری آواز میں بولتے اس کے سامنے والی  
کرسی پر بیٹھ گئے، وہ چہرے چھپائے ابھی بھی رو رہی تھی۔

”آئی ایم سوری مریم! میرا مطلب سوائے دل لگی کے اور کچھ نہ تھا۔“

فرمان کے پاس الفاظ نہیں تھے جن سے وہ سوری کرتے۔

”اور آپ کی یہ دل لگی کسی کی جان بھی لے سکتی ہے، یہ تو سوچ لیا ہوتا۔“

وہ شال سے چہرہ رگڑتے ہوئے بولی۔ گریہ وزاری نے اسے مزید حسن بخش دیا تھا فرمان اسے دیکھے  
گئے۔

”مریم! ویسے میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے یہ بات کر کے میرے اظہار کے دروازے کھول دیے  
ہیں۔“ فرمان کی بات پر مریم نے شکایت بھری نگاہ ان پر ڈالی اور پھر شعلوں کو دیکھنے لگی۔ دل کی عجیب کیفیت  
ہوئی تھی۔ کان اس اظہار کے شہر ہو گئے جو بات اس نے شروع سے فرمان کی آنکھوں سے پڑھی تھی۔ آج کان

وہ اظہار ان جذباتوں کو لفظوں کے پیرہن میں سننے کو بے چین ہو گئے مگر وہ بے نیاز بنی بیٹھی رہی۔

”مریم! ایک عرصے سے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اپنے تمام جذباتوں کو عیاں کر دینا چاہتا تھا مگر۔۔۔ مگر جب  
اس کا موقع آیا ہے تو الفاظ گو تکے ہو گئے ہیں۔ میں جن جذباتوں کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے لیے تو الفاظ کو  
انہو کثیر لپی بے معنی ہے تو میرے پاس تو الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود ہے۔ صرف یہ کہوں گا کہ میری زندگی کا نام

مریم ہے اور اگر مریم نہ ملی تو زندگی بھی نہیں رہے گی، خدا حافظ۔“

اور وہ گنگ بیٹھی رہ گئی۔ فرمان تیز تیز قدم اٹھاتے باہر چلے گئے۔ جانے والے کے نقش پا اسے کتنا معتبر کر  
گئے تھے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دیر تک ہلے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی۔ جو فرمان کے جانے کے بعد سے

اب تک بل رہا تھا۔ بعض لمحے زندگی میں کتنے اہم ہو جاتے ہیں۔ جن کے دامن میں پھول بھی ہوتے ہیں، اور  
خار بھی اور بامراد ہوتے ہیں وہ جن کے دامن میں خوشیوں کے پھول مہکتے لگتے ہیں اور مریم کا دامن بھی چپکے سے

مہکتا لگتا تھا۔ یہ جذبہ بھی کیا چیز ہوتے ہیں انکا الاؤ۔ اگر ایک دل میں جلتا ہے تو پتیش دوسرے تک ضرور پہنچ جاتی  
ہے، اور پھر دودل ایک لے پر دھڑکتے ہوئے اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے واپسی نارسائی جان لیوا ہو

جاتی ہے فرمان بھی چپکے چپکے ایسی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ مریم واقعی ان کی زندگی بن چکی تھی۔ وہ اسے ہر قیمت پر  
مائل کرنا چاہتے تھے۔ اب تو واپسی کے دن بھی قریب آ رہے تھے، اس لیے وہ جلد از جلد مریم کو پر و پوز کرنا

چاہتے تھے لیکن عالی۔ عالی۔

فرمان جو لیٹے ہوئے تھے عالی کا خیال آتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اتنے عرصے میں پہلی بار ان کو عالی کا  
خیال آیا۔ جو پچھن ہی سے ان سے منسوب تھی۔ اور پھر باقاعدہ اس کے نام کی انگلی پھنڈائی گئی تھی، جب انہوں  
نے یہ انگلی پھنڈائی تھی تو ان کو کسی بات کا احساس ہی نہیں تھا۔ نہ وہ خوش تھے اور نہ ہی ناخوش۔ کوئی جذبہ بھی تو



مسعود بھی اٹھ کر ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تو فرمان نے عالی کے متعلق بھی بتا دیا۔  
 ”ہوں تو یہ بات ہے۔ اب تک تو تمہاری گاڑی ٹھیک ٹھیک جا رہی تھی۔ مگر اب کاٹنا بند کرنے کے لیے تمہیں  
 ذرا ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ اچھا یہ بتاؤ، عالی کیسی ہے۔“  
 ”عالی کیسی ہے؟“ فرمان مسعود کی بات پر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ وہ عالی کے حسن کو کس طرح لفظوں میں  
 بیان نہیں کر سکتے۔

”پتا نہیں یا مسعود میں نے تو آج تک کبھی اس لڑکی کو غور سے دیکھا نہیں۔ میرے دل میں نہ تو عشق سے  
 پہلے اس کے لیے دل میں کوئی جذبہ موجود تھا اور نہ ہی بعد میں کہ میں اسے دیکھتا۔ بس یہ ضرور ہے کہ وہ قدرت کا  
 حسین شاہکار ہے۔ اس لحاظ سے تو مریم عالی کے سامنے کچھ بھی نہیں۔“  
 ”مریم کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بازی جیت گئی ہے اور عالی پھر بھی ہار گئی۔ حیرت کی بات ہے ایک اتنی  
 حسین لڑکی جو کزن بھی، مہنگیتر بھی ہو۔ ہر وقت کا ساتھی بھی ہو اور پھر بھی تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی  
 احساس نہیں جگا۔“ مسعود کو بڑی حیرت ہو رہی تھی اس بات پر۔

”یقین جانو مسعود! والدین اور بہن بھائی محبت کے علاوہ بھی کسی جذبے کا وجود ہے۔ اس کا تو مجھے علم ہی  
 تھا اور نہ ہی میرے دل میں عالی کے لیے کوئی ایسا جذبہ موجود تھا۔ اگر میرا اس کے ساتھ تنگو نہ بھی ہوتا تو  
 میرے لیے کوئی فرق نہ پڑتا مگر مریم کو دیکھا تو لگا جیسے۔ اب میں وجود میں آیا ہوں، جانے کیسے درد دل وا ہوا  
 اور وہ کہیں ہو گئی تو احساس ہوا کہ یہ جذبے تو خود رو پودوں کی طرح خود ہی جنم لیتے اور ساری ہستی کو اپنی لپیٹ  
 میں لے کر کہیں کا نہیں چھوڑتے۔ آج میں زندگی کے سب سے کڑے امتحان میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ مسعود سمجھ  
 نہیں آتا کہ کیا فیصلہ کروں۔“ فرمان بہت اُلجھے ہوئے لہجے میں بولے۔

”یہ تو واقعی بہت مشکل بات ہو گئی۔ مریم سے شادی کی صورت میں تمہارے آغا جی۔“  
 ”آغا جی! مسعود آغا جی اس بات کے بعد مجھے زندگی میں کسی صورت دیکھنا گوارا نہیں کریں گے۔“  
 فرمان کے سامنے سارے حالات تھے۔ وہ سب جانتے تھے۔ اسی لیے مایوسی سے بولے۔

”تم فکر نہ کرو فرمان! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سارے والدین حکم نہ ماننے کی صورت میں ایسی ہی  
 دھمکیاں دیا کرتے ہیں۔ بعد میں ٹھیک ہو جاتے ہیں۔“ مسعود کتنی ہی دیر فرمان کو سمجھاتے رہے، بہلاتے  
 رہے۔ آج مسعود کا آجانا فرمان کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔

”یہ تو بتاؤ کہ مریم سے بھی رائے لی ہے کہ اکیلے ہی چلے جا رہے ہو محبت کی شاہراہ پر۔“ مسعود کو  
 اچانک ہی مریم کا خیال آ گیا۔

”مسعود! ضروری تو نہیں کہ رائے لفظوں میں ملبوس ہو کہ وہ خود کی صورت میں ہمارے سامنے آ جائے۔  
 کچھ باتیں محسوس بھی کر لی جاتی ہیں اور میں سب کچھ محسوس کر چکا ہوں۔“ فرمان کے تصور میں مریم کا شوخ سر پانچ  
 ٹکڑے کر کے لگا۔

”تو پھر جناب! میں ابو سے بات کرتا ہوں، وہ اکل ظہیر سے بات کریں گے، پھر دیکھیں، وہ کیا کہتے  
 ہیں، اور جیسا کہیں گے، ویسا ہی کر لیں گے، کیونکہ ٹھیک ہے ناں۔!“  
 مسعود جانے کے لیے اٹھ رہے تھے کہ فون کی تیل ہوئی، مسعود نے ہی ریسو کیا۔

عالی کے نام کا، دل کے سمندر میں نہ اُبھر سکا، نہ بچپن کی رفاقت اپنا وجود بنا سکی، اور نہ ہی محنتی کے بعد کوئی اصرار  
 جگا کہ وہ خود کو صرف عالی کی محبت کا اسیر سمجھتے اور نہ ہی ان کو یہ خبر تھی کہ ایک لڑکی مریم زندگی میں آئے گی اور ان  
 کا عنوان بن جائے گی۔ آغا جی! اف میرے خدا! آغا جی تو کسی صورت بھی یہ سب برداشت نہ کر پاؤں  
 گے۔ یہ سب کیسے ہوگا۔ اگر ایک مریم کو پالیتا ہوں تو سب کچھ چھن جا گا۔ ماں باپ، بہن بھائی اور  
 ملک بھی اور اگر ایک مریم کو چھوڑ دیتا ہوں تو انجانی گمشدہ راہوں کی دھول ہو جاتا ہوں۔ کیا کروں۔ خدا  
 کروں۔

فرمان سر قہارے بیٹھے تھے۔ وہ دورا ہے پر کھڑے منزل کے تعین میں بے منزل ہو رہے تھے۔ وہ  
 وقت صرف اور صرف اپنے اور مریم کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ یہ خیال قریب سے بھی نہیں بھٹکا کہ  
 یہ جو بچپن ہی سے ان کی محبت کی چٹا میں جل رہی ہے اور اس آس میں جی رہی ہے کہ فرمان اس کے ہم  
 کے رہیں گے۔ جب اس کو پتا چلے گا کہ کسی اور کے ہو گئے ہیں تو کیا وہ جی پائے گی تار سائی کا زہر اس کی گول  
 کاٹ کر نہیں رکھ دے گا۔ فرمان اپنی سوچوں میں اُلجھے اسی طرح بیٹھے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ  
 درست کرتے ہوئے اٹھ گئے۔ سامنے انکل اختر کا بڑا بیٹا مسعود تھا۔

”آؤ یا مسعود! اس وقت تو واقعی کسی مخلص دوست کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔“ فرمان مسعود کو دیکھا  
 بہت خوش ہوئے اس وقت وہ کسی کی ضرورت بھی محسوس کر رہے تھے۔

”کیوں خیریت تو ہے ناں؟ کوئی پکڑ تو نہیں؟“ مسعود آگ کی طرف ہاتھ کرتے ہوئے شونی  
 بولے۔

”خیریت ہی تو نہیں۔ میری بات غور سے سنو۔ اور مشورہ دو۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ اور پھر فرمان نے  
 مریم کے بارے میں سب کچھ مسعود کو بتا دیا۔ مسعود نے فرید کے بعد ان کا ایک اچھے دوست کی طرح ساتھ دیا۔  
 ”چھوڑو یا! اتنی ہی بات پر اتنی پریشانی۔ لڑکی کوئی غیر تو نہیں پاکستانی ہے۔ مسلمان ہے۔ والدین کو  
 لکھو۔ میرے خیال میں تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ ہاں اعتراض تو جب کرتے ناں کہ۔“

”تم میری بات سمجھتے نہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھی وہ لوگ نہیں مانیں گے۔ مجھے خود ہی۔ قدم اٹھا  
 ہے۔ خود ہی کرنا ہے۔

”تو اس میں بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ایسا کرتے ہیں اتنی ابو باقاعدہ مریم کو پرپوز کرتے  
 پھر شادی کر دیں گے تو مریم کے ساتھ جا کر والدین سے معافی مانگ لیتا۔ یہ والدین بڑی پیاری چیز  
 ہیں۔ اوپر اوپر سے رعب ڈالتے ہیں مگر اولاد کی خطاؤں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔ سینے سے لگائیں گے  
 پیاری بہو کو۔ مریم میں، کی کمی نہیں۔ میرے خیال میں وہ معاف کر دیں گے۔“

مسعود بڑے یقین سے لہجے میں کہہ رہے تھے فرمان کچھ دیر شعلوں کو دیکھتے رہے پھر کھڑکی سے باہر  
 کر باہر دھند میں ہلکے ہلکے منظر دیکھنے لگے۔ پھر گہرا سانس لے کر مسعود کی طرف منہ کر کے کھڑکی سے لپکا  
 کر کھڑے ہو گئے۔

”ان کی رحیمی سے تو مجھے انکار نہیں۔ مسعود ایک بات اور ہے ناں۔“  
 ”یا فرمان! تم تھکوں میں کیوں باتیں کر رہے ہو۔ ایک قسط میں سب کچھ کہہ ڈالو۔“

ہیلو فرمان ہیں؟“ مریم کی مترنم آواز گونجی۔

”جی میں بالکل فرمان ہی بول رہا ہوں۔“ مسعود نے فرمان کی آواز بنا کر خوشی سے فرمان کو دیکھا۔

”اچھا میں جانتی ہوں، مسعود بھائی بول رہے ہیں۔“ مریم فوراً آواز پہچان گئی۔

”بڑی تیز ہو، قسم سے ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔“

”میرا ذکر کون کر رہا تھا؟“ وہ جانتے ہوئے انجان بن گئی۔

”وہی جس کو فون کیا ہے تم نے۔ لو بات کرو۔ آؤ فرمان! بات کرو میں اب چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔“

مسعود نے ریسور فرمان کو قصداً اور خود چلے گئے، اس بات کے بعد یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔

لیے دونوں ہی کے دل دھڑک رہے تھے۔

”ہیلو کیسی ہو مریم؟“ سو باتیں سوچتی تھیں مگر کبہ صرف یہ ہی سکے۔

”بالکل پہلے جیسی“ وہ بھی اسی انداز میں بولی۔

”مریم! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”آپ نے سوال کیا کیا تھا کہ میں جواب دیتی۔“ وہ جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔

”اُس روز کیا ہوا تھا۔ کیا کیا تھا میں نے۔“ فرمان کو اس کے انجان پن پر تاء آ گیا۔

وہ آپ کی رائے یا آپ کی خواہش کا اظہار تھا۔ آپ نے میری رائے یا خواہش کب پوچھی تھی؟

کی بات معقول تھی، فرمان کی سمجھ میں آگئی۔

”تو اب کرو اپنی رائے یا خوشی کا اظہار۔“ فرمان کے جواب میں دوسری طرف سکوت پھیل گیا

فرمان بے چینی سے منہ پھرتے، جانے وہ کیا کہہ ڈالے اور امیدوں کی تاؤ ڈوب جائے۔

”ہیلو میرم! کیا میں تمہارے لیے اب تک اتنا ہی انجان ہوں کہ تم یوں سوچو میں ڈوب جاؤ۔“

فرمان خود ہی سکوت کی تہی چادر کو اتارتے ہوئے گویا ہوئے تو مریم جو اپنی بات کو مناسب الفاظ میں

کاسوج رہی تھی، سیدھی ہو گئی مترنم آواز کی لہروں میں سنجیدگی کا شہرہ آؤ گیا۔

”فرمان! جذبول کا اظہار تو آپ مرد ہو کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں تو پھر لڑکی ہوں جو اپنے با

اپنی فطری حیا کے سات پردوں میں چھپا کر رکھتی ہے تاکہ اپنے والدین کے حکم کی بجا آوری کر سکے میں

عام لڑکی ہوں فرمان! اور ازلو کی بھی ہوں، میرے والدین کی تمام تر خوشیاں صرف میری ذات سے وابستہ

اس لیے میں ان کے حکم کی تابع ہوں، مستقبل کے لیے انکا جو فیصلہ ہوگا۔ وہی میرے لیے معتبر ہوگا اور میر

ہے کہ اولاد والدین کے حکم، فیصلے کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہمیشہ خوش رہتی ہے۔“

وہ اتنی سنجیدہ، گہری بات بھی کر سکتی ہے، یہ تو فرمان کو آج اندازہ ہوا تھا۔ اس کے دونوں روپ نکلا

بھائے تھے، دونوں کے درمیان ایک بار پھر سکوت کی طغیح حائل ہو گئی۔

”نسو مریم! اگر تمہارے والدین کا فیصلہ میرے خلاف ہوا تو؟“ فرمان کی ڈری ہوئی آواز

توڑا۔

”تو وہ فیصلہ میرے لیے ان کی طرح معجز ہوگا۔“ ایک پھانس سی فرمان کے دل میں اتر گئی۔

”کیا سے“ سے کچھ احساس ہی نہیں مگر وہ یہ نہیں جان سکتے تھے کہ اس بے حس لڑکی نے یہ بات کبھی کسی دل

”مریم اگر فیصلہ میرے حق میں ہوا تو۔“ فرمان سب کچھ جانتے تھے اس کے احساسات کو سمجھتے تھے، پھر

بھی جانے کیوں اس کے منہ سے کوئی اقرار، کوئی لطیف بات سننا چاہتے تھے، وہ چاہتے تھے، مریم بھی بر ملا کہہ

دے کہ میں آپ کے بغیر جی نہ پاؤں گی یا اس کے مساوی کوئی دل کے تاروں کو جھینرنے والی بات کہہ دے۔

”فرمان آپ سمجھدار ہیں، سب سمجھتے ہیں کہ تاکہ کو دائیں طرف سے پکڑیں یا بائیں طرف سے، ایک ہی

بات ہے، یعنی میرے لیے والدین کے سب فیصلے معتبر ہیں، خواہ وہ کسی کے حق میں ہوں۔“

”مگر مریم کی بات کے کنگر فرمان کے لطیف احساسات کو ذہن پر پہنچا گئے مگر وہ مریم کے خیالات جان کر بے

مدخوش ہوئے تھے، مسعود نے ساری بات والدین کو بتا دی تھی اور کہا تھا کہ وہ مریم کو فرمان کے لیے پر پوز کریں۔

”میں تو بیٹا کوئی اعتراض نہیں بات کرنے میں، مگر فرمان غلطی کر رہا ہے، اس کے والدین یہ بات ہرگز

برداشت نہ کریں گے، اگر اس کی ممکن نہ ہوتی تو بھی ٹھیک تھا درگزر کے چانسز تھے مگر مگر بیٹے اب جب کہ اس کی

فرسٹ کزن اس کی منگیتر ہے تو پھر تو بات بگڑ جائے گی۔“

”ابو کچھ نہیں ہوگا۔ فرمان اپنی کزن کو بالکل بھی پسند نہیں کرتا۔ مریم کے معاملے میں وہ اس قدر امو مثل

ہو رہا ہے کہ وہ کچھ بھی کر گزرے گا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا ہے ابو! آپ کوشش تو کریں ناں اس کے والدین

باراض ضرور ہوں گے مگر وہ منالے کا سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

مسعود پوری دیانت داری سے دوستی کا حق ادا کر رہے تھے، اختر صاحب کی خود فرمان سے بات ہوئی تو

انہوں نے سمجھتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ وہ شادی کریں گے تو مریم کے ساتھ ورنہ کسی سے نہیں۔ انہوں نے اختر

صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے میں ان کے بزرگ کی حیثیت سے ان کی مدد کریں، اختر صاحب

جہاندید انسان تھے، ان کے پیش نظر تمام مرحلے تھے، وہ ان کو سمجھاتے رہے کہ ایسے موقع پر والدین کا ہونا

ضروری ہوتا ہے۔

”چچا جان! میں تو آج تک آپ کو اپنے آغا جی کی طرح سمجھتا رہا۔ ان کی سی عزت کرتا رہا۔ لیکن آپ

نے مجھے مسعود، محمود کا درجہ نہیں دیا، دیتے تو آج یہ الفاظ نہ کہتے۔“ فرمان کے کیوں پر ہلکوا آ گیا۔

”فرمان بیٹے! ویسے تو تمہاری اس بات پر مجھے افسوس ہونا چاہیے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم بہت

جذباتی ہو رہے ہو اور جذبات میں آ کر انسان بہت کچھ کر گزرتا ہے، ٹھیک ہے، جیسے تمہاری خوشی، ہم کل ہی ظہیر

صاحب کے ہاں جا میں گئے۔ اگر وہ مان گئے تو رسم بھی کر آئیں گے، کیوں اب تو خوش ہونا؟“

اختر صاحب نے مسکرا کر فرمان کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ جھینپ کر اٹھ گئے، اور جب اختر صاحب اور

ٹیکر اختر فرمان کا رشتہ لے کر گئیں تو انہوں نے وہی باتیں کیں۔ جو ان کے حسب توقع تھیں۔

”آپ کا اسی میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے اختر صاحب! اور جس بیٹے کی آپ بات کر رہے

ہیں۔ وہ تو ایسا نوجوان ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے بھی اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے سکتا ہوں۔“

ظہیر صاحب کچھ توقف کے لیے رُکے تو اس سے مل کر اختر صاحب شکر یہ کے ساتھ مزید بات آگے

بڑھاتے، ظہیر صاحب نے ”لیکن“ کا بڑھتا پھر سامنے رکھ دیا، اور دودل ڈول گئے۔

”لیکن اختر صاحب بات اصول کی ہے کہ فرمان بیٹے کے والدین ماشاء اللہ حیات ہیں، بڑے بہن بھائی

ہیں، جب تک ان میں سے کوئی شریک نہ ہوگا۔ میں آپ کو کوئی بھی مثبت جواب نہ دے سکوں گا۔ اس کے لیے

دروازے پر دستک دی۔

”آجائیں مس سوزی! میں گرم بستر نہیں چھوڑ سکتا۔“ فرمان غالباً بستر میں تھے اور دروازہ کھلا تھا وہ آہستگی سے اندر آ گئی۔ ”میں سوزی! کافی لائی ہیں آپ۔“ مریم تم۔“

بات کرتے کرتے فرمان نے جو نمز کر دیکھا تو سامنے سوزی ک بجائے مریم کو رو برو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے فرمان کو اپنی بصارت پر شبہ ہونے لگا۔ وہ جسے خیالوں میں دیکھ رہے تھے، چشم تصور میں جو رو برو تھی وہ حقیقت میں بھی رو برو آ گئی تو حیرت و خوشی کے طے جلے احساسات کے ساتھ فرمان اسے دیکھ گئے۔

”کیا بات ہے مریم! ان جھیلوں میں طغیانی کیسی۔“ فرمان نے اسے شانوں سے پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”مت چھوئیں آپ مجھے فرمان میں، میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ آپ نے دھوکا دیا ہے مجھے۔“ وہ فرمان کے ہاتھ لگاتے ہی پھٹ پڑی تو فرمان بجلی کی تیزی سے پیچھے ہٹ گئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ مریم کو دیکھتے رہے جو سادوں بھادوں کے مینڈکی طرح برس رہی تھی۔

”میں اس بے عزتی کا تمہیں جواب دے سکتا ہوں، مگر پہلے وجہ بتاؤ۔ کیا بات ہے کیا فریب یا دھوکا دیا ہے۔ میں نے تمہیں۔“ فرمان کے چہرے پر تناؤ اور لہجے میں سختی عود کر آئی۔

”فرمان! یہ فریب کیا کم ہے کہ مجھ سے پہلے بھی آپ کی زندگی میں ایک لڑکی آ چکی ہے عالی۔“ ”اف! خدا یا تو یہ بات ہے؟ مریم۔“ روئے ہوئے بولی تو فرمان یوں بولے گویا منوں جو بھان کے دل پر سے اُتر گیا ہو، انہوں نے پھر مریم کے شانوں پر دباؤ ڈال کر کرسی پر بٹھا دیا اور خود وہیں قائلین پر بیٹھ کر اسے روتا ہوا دیکھتے رہے، انہوں نے اسے رونے دیا۔ چپ نہیں کرایا۔ اس کے آنسوؤں سے جانے کیوں اُن کو سکون مل رہا تھا۔ اس کے آنسو اس بات کی دلیل تھے کہ وہ فرمان کو بڑی شدت سے چاہتی ہے۔

”گلتا ہے اگر اس سلاب پر بند نہ باندھا گیا تو تم تو بہہ جاؤ گی اور میں رہ جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں چلو شباش جلدی سے چہرہ صاف کر ڈال گلتا ہے مس سوزی کافی لے کر آ رہی ہیں۔“

فرمان خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور مریم بھی چہرہ مڑنے لگی، مس سوزی نے ہلکے سے دستک دی اور گرم گرم کافی کے گگتہا کر جلدی چلی گئیں، یوں جیسے وہ زیادہ دیر دونوں کے درمیان دیوار نہ بننا چاہتی ہوں۔ آنسوؤں کی روانی میں گو کہ فرق آچکا تھا مگر جب وہ گہری لگی لیتی تو نازک وجود لرز جاتا۔ خفا خفا ہی روتی ہوئی مریم اس وقت کو بہت پیاری، بہت عزیز لگی، وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے اس کے قریب چلے آئے، نیچے نیچے اس کے گھٹنوں پر دھرے سر دھاتا اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور اس کی ہانسی پکوں کو دیکھنے لگے۔

”دیکھو مریم! ہمیں ایک زندگی میں ایک ہی محبت کا قائل ہوں اور وہ محبت بھی میں نے تمہارے نام کر دی ہے، عیاری عالی کا تو میری زندگی میں کوئی دخل ہی نہیں، خدا پر ایمان ہے تو یقین کرو عالی میری فرست کزن ہے اور مجھ سے منسوب ہے۔ مگر میں نے آج تک نہ منگی سے پہلے اور نہ بعد میں اس کے نام کی کوئی کک دل میں محسوس کی اور اگر مجھے اس سے محبت ہوتی تو مریم میرا دماغ خراب ہے کہ میں والدین کا نافرمان بننا۔ بہن بھائیوں کا دل دکھانا۔ وہ عیاری میری زندگی میں آئی ہی نہیں۔ تم اگر میری زندگی میں نہ آتیں تو شاید میں عالی کے ساتھ ساری زندگی بڑی اچھی طرح گزار دیتا اور کسی عروسی، کسی تنگی کا مجھے احساس نہ ہوتا لیکن اب، اب مریم

میری معذرت قبول کر لیجئے گا، اور جس وقت ان کی طرف سے کوئی آ گیا۔ میں بنی ان کے حوالے کر دوں گی سمجھ لیں کہ اس وقت تک مریم میرے پاس فرمان کی امانت ہے۔“ ظہیر صاحب نے گویا اپنا حتی فیصلہ سنا دیا۔ ”لیکن انکل! یہ زیادتی ہے، اگر اس کے والدین تیار نہ ہوں اور آپ بھی اپنی ضد پر آڑے سے پہنچا آپ کو پتا ہے کہ یہ جان پر کھیل جائے گا۔ آپ کو نہیں معلوم جذبات میں آ کر انسان کیا کر گزرتا ہے۔“ مسعود کو تنگ انداز میں ہی کرتی رہ گئیں مگر وہ بھی بات کرنے سے باز نہ آیا۔

”مسعود بیٹا! تم جو ان صرف جذبات سے کام لیتے ہو اور ہم لوگوں کے پیش نظر ہر بات ہوتی ہے، کب اعتراض یا انکار ہے، فرمان کے گھر سے کوئی بھی آ جائے تو میں تیار ہوں۔ دیکھو بیٹے! تم لوگ ابھی بچے نہیں سمجھتے، باہر جو ہم جیسے پاکستانی مقیم ہوتے ہیں ناں تو ان کے متعلق دیں میں بسنے والوں کی رائے کیا مناسب نہیں ہوتی۔ میں یہ بات مناسب نہیں سمجھتا کہ فرمان کے گھر والے یہ کر لڑکا اکیلا دیکھ کر قابو کر لیا ہے، پتا چاہتا ہوں اس کے گھر سے کوئی آئے اور خود سب کچھ کریں۔ وہ کہیں تو ہم وطن واپس چلے جائیں گے مگر یہ شرط دینی رہے گی۔“

مسعود اور محمود نے بہتری کوشش کی ان کو مٹانے کے لیے جانے کہاں کہاں سے دلائل لے کر آئے مگر صاحب شس سے مس نہ ہوئے، مریم سے بات ہوئی تو اس نے بھی یہی کہا۔

”لو! انہیں خبر نہیں۔ وہ کس قدر اموئل ہو رہا ہے۔ کچھ کر بیٹھا تو روتی رہو گی تمام عمر۔“ ”مسعود بھائی! ٹھیک ہے مگر میں بھی یہ بات پسند نہیں کروں گی کہ فرمان مجھے اپنے گھر والوں پر مسلط دیں۔ کم از کم کوئی تو ان کے گھر سے ہو جسے ڈھال بنایا جاسکے۔“ مریم بھی اپنے ابو سے پوری طرح متفق تھی۔

”ڈھال تو تمہاری بھی کوئی نہیں بنے گا۔ سب ہی عالی۔ میرا مطلب ہے۔“ اب چاہے مطلب کچھ بھی ہوتا۔ مریم عالی کے نام پر اس طرح چوکی جیسے تیزی سے چلتے ہوئے گھوڑا چابک مار دی جائے تو رہ نہ جاتا ہے۔

”مسعود بھائی! یہ عالی کون ہے اور فرمان سے اس کا کیا رشتہ ہے؟“ مریم کی آواز کسی گہرے کونچا آتی ہوئی محسوس ہوئی، چہرے پر تاریک سائے ٹھہرنے لگے، مسعود بڑی طرح چھس گئے، ان کا تو خیال تھا کہ فرمان اسے عالی کے متعلق بتا چکے ہوں گے، مگر مریم کے انداز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ بے خبر ہے، اور پھر انداز نے عالی کے متعلق مریم کو بتا دیا۔

”لیکن مریم! تم یقین جانو، فرمان اسے بالکل پسند نہیں کرتے، وہ صرف تمہیں چاہتے ہیں۔ تمہیں پانچ کے لیے تو سب کچھ چھوڑنے کو بھی تیار ہیں۔ پلیز تم ان کو غلط نہ سمجھنا۔ دیکھو، میری اچھی بہن! اول میلائی کہ فرمان کی طرف سے، وہ بالکل بے قصور ہے، اسے کوئی سزا نہ دینا۔“ مسعود اسے سمجھا رہے تھے اور وہ اندازے پکسل رہی تھی، یہ احساس۔ اذیت دینے کے لیے کیا کم تھا کہ اس سے پہلے بھی کوئی لڑکی فرمان کی زندگی میں آ چکی ہے۔ وہ برداشت نہ کر سکی اور زندگی میں پہلی بار وہ فرمان کے گھر آ گئی۔ مس سوزی نے بڑے اچھے طریقے سے اسے خوش آ لہجہ کہا۔

”فرمان کمرے میں ہے، تم جاؤ، میں دونوں کے لیے کافی بناتی ہوں۔“ فرمان کے کسی بھی مہمان کے لیے کافی بنانا مس سوزی اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ مریم نے آہستگی

”مریم! اجہاری ہم باتیں مجھے مزید الجھاری ہیں۔ پلیز، جو بات کرنی ہے، کھل کر کرو۔“  
فرمان دونوں ہاتھوں میں سر قدام کر بیٹھ بیٹھ گئے۔ مریم ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر قالین پر ہی بیٹھ گئی۔  
”ہمارے مذہب میں ایک سے زائد شادی کی اجازت ہے ناں فرمان۔“  
”مریم! فرمان نے چونک کر مریم کو دیکھا جو بات وہ سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مریم نے کتنی آسانی سے کہہ ڈالی لڑکی ہو کر۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو مریم۔“ فرمان اپنی سماعتوں پر شبہ ہونے لگا۔  
”جی فرمان! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے، ہم دونوں ایک ساتھ ایک اچھی جی اور خوشحال زندگی گزار سکتے ہیں۔ آپ عابی کو خط لکھ کر اس کی رائے معلوم کر لیں۔ میں ہر قسم کے سمجھوتے کے لیے تیار ہوں۔“  
مریم بولے جاری تھی اور فرمان بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے وہ جواتی شوخ تھی۔ اتنی لالباہی سی تھی۔  
”دقت کتنی بلند لگ رہی تھی۔ اتنی قدر آدمی کی شخصیت ماند پڑ گئی تھی۔ اس نے وہ فیصلہ کیسے کر لیا تھا جو عورت کر سکتی نہیں کر سکتی۔ اپنی محبت میں تقسیم، وہ منگ رہ گئے۔“

”مریم جو بات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ تم نے کہہ ڈالی۔“ فرمان کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا۔  
فرمان یہ بات سوچنا کرنا اور برداشت میری موت کا عمل تھا۔ لیکن میں نے انسان بن کر سوچا ہے عورت ان کر نہیں آپ فکر نہ کریں۔ ہم تینوں اچھے دوستوں کی طرح زندگی گزاریں گے، آپ عابی کی رائے تو معلوم کریں۔“

”مریم! خدا چاہے تو زور نہیں مگر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتی۔“  
فرمان نے مریم کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے قلم لیے تو ایک فاتحانہ دلفریبی مسکراہٹ اس کے لبوں پر  
”میری بات تو درمیان ہی میں رہ گئی۔“ مریم نے بھرپور دہائی کرائی۔

”عابی۔ عالی بہت مختلف لڑکی ہے مریم! میری خوشی کے لیے اس نے آج تک جھوٹ بھی بولا ہے اور میری خطائیں اپنے نام لکھوائی آئی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ میرے لیے سب کچھ کر سکتی ہے۔“  
اپنے متعلق عالی فرمان کے خیالات جان لیتی تو شاید زندگی میں کسی اور خوشی کی طلب گار نہ رہتی۔  
”اس حد تک کو آپ اسے جانتے ہیں، پھر بڑی کہتے ہیں اسے چاہتے نہیں۔“

مریم کا لہجہ بہت سادہ سا تھا جس میں نہ طنز کی کرواہٹ تھی اور نہ ہی حسد کی بو۔  
”چاہتا الگ تہہ ہے اور چاہتا الگ عمل، جیسے میں تمہیں دیوانگی کی حد تک چاہتا ہوں مگر تمہیں جانتا نہیں تھا کہ تم اندر سے اتنی عقیم ہو، اتنی بڑی ہو اور عابی کو نہیں چاہتا مگر جانتا ہوں کہ اس کا کیا فیصلہ ہوگا۔ وہ میری فحش کے لیے سب کچھ گوارا کر سکتی ہے۔“ فرمان پورے اعتماد سے کہہ رہے تھے۔

”پھر کیا کرنا ہے؟“ مریم جو ہر قسم کے حالات سے سمجھوتا کرنے کو تیار تھی، الجھ کر رہ گئی۔  
”میں نے رحمان بھائی کو بلائے کا سوچا ہے، خط میں ان کو تمام صورت حال لکھ دی ہے، وہ آکر جو مشورہ دینا گے، دیکھ لیں گے، اگے جو اللہ کو منظور۔“  
”اور اگر نہیں؟“ سیرامی پٹا کاٹ دیا تو؟“

ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اب تم میری زندگی میں آ گئی ہو، تم اگر مجھ سے شادی کرنے سے انکار بھی کر دو تو میرا بھی عابی سے شادی نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ وہ میرے لیے بہت محترم ہے، میں یہ بات ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ میرے دل میں تو تمہاری محبت ہو اور میں کھوکھلے نظروں سے اسے بھلاتا رہوں اس لیے کہ میں سنا نہیں ہوں، اب تمہیں اختیار ہے جو چاہو فیصلہ کر لو۔ میں نے تو اپنی کشتیاں جلا ڈالی ہیں۔“

فرمان نے ایک گہری نظر اس کے چہرے پر ڈالی جواب شفاف تھا ہر قسم کے خیال سے سوچ سے فراہم نے آہستگی سے مریم کے ہاتھ چھوڑ دیے اور رخ پھیر کر کھڑے ہو گئے، مریم کچھ دیر ان کی چوڑی پشت دیکھ رہی، پھر آہستگی سے اٹھ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”سوری فرمان! مجھے پہلے بھی آپ پر اعتبار تھا۔ اس سارے ڈرامے میں، سب سے مظلوم کردار تو میں ہی کا ہوا تھا۔“ وہ ہنسی آواز میں بولی تو فرمان اس کی طرف گھوم گئے۔

”پھر کیا کیا جائے مریم، میری تو خود کچھ نہیں آ رہا۔ میری تو ہر سوچ کا دروازہ تم پر کھلتا ہے اور تمہارا بند ہو جاتا ہے، میں کبھی اتنا جذباتی ہو جاؤں گا کہ میری سوچ صرف ایک ہستی تک محدود ہو جائے گی، یہ سب کبھی نہیں سوچا تھا کہ اب تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔“

”میں آپ کو بتاؤں۔ آپ کیا کریں“ مریم بڑے پُر سکون انداز میں بولی تو فرمان سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

”میں جتنی کوشش ہوں مریم!“ فرمان صوفے پر اس کے برابر بیٹھ گئے تو مریم ایک نظر ان پر ڈال کر کہنے لگی  
”میں طرف رخ کر کے کھڑی ہو گئی، جیسے کچھ چھپانا چاہتی ہو۔“

”آپ۔ آپ پاکستان جا نہیں اور۔ اور؟“ الفاظ اس کے حلق میں ایسے انک گئے جیسے روانی سے پانی کے آگے بند باندھ دیا گیا ہو۔ فرمان اس کے مقابل آ کر اس کے چہرے کو پڑھنے لگے جہاں ہمیشہ ان کی عیاں تھیں۔

”اور عابی سے شادی کر کے یہاں لے آئیں“ اس نے اس روانی سے کہا جیسے کوئی بچہ کڑوی دوا اس جلدی پی لیتا ہے کہ پیسے بغیر گزارہ نہیں تو تامل سے کیا حاصل۔

”مریم میرا خیال تھا کہ تم نے میری بات پر اعتبار کر لیا ہے۔ ٹھیک ہے، مریم! میں تمہیں اپنے ساتھ پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں اتنا کمزور نہیں ہوں مریم! تمہیں ایک خواب سمجھ کر بھلا بھی سکتا ہوں۔ لیکن دکھ صرف یہ ہے کہ میرے جذبے میں اتنی صداقت نہیں تھی کہ تم اعتبار کرتیں۔ کتنی آسانی سے تم نے اتنی بڑی بات ڈالی۔“ فرمان بری طرح برہم ہو گئے تھے۔ مریم نے دھندلی آنکھوں سے فرمان کو دیکھا۔

”ہونہہ آسانی سے“ زہر کو آسانی سے پیار جاتا ہے فرمان! آپ کیا جانیں۔ یہ فیصلہ میں نے کیا سے کیا ہے، لیکن میں بھی لڑکی ہوں فرمان، میں تو اس عرصے کی محبت میں بھی کوئی بڑا فیصلہ نہیں کر سکتی تو وہ مجھے عشق کی جانے کون سی منزل پر ہو کہ اس کی برداشت سے باہر ہو یہ سب۔“ مریم نے برہم سے فرمان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کیا جانتی ہو تم مریم میں تو خود فیصلے کی صلیب پر لٹکا ہوا ہوں۔“ فرمان بے بس سے ہو گئے۔

”آپ عابی کو یہاں لے آئیں۔ میں یہاں آپ دونوں کی فحش ہوں گی۔“



”ایسا نہیں ہوگا۔ ان کو میری زندگی بہت عزیز ہے اور میری زندگی۔“

”کافی دیر ہوگئی ہے، میں چلتی ہوں۔“ مریم فرمان کی بات، درمیان سے کاٹ کر اٹھ گئی۔

”اگر پسند کریں تو میں چھوڑ آؤں۔“ فرمان نے دروازہ کھولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”مشکل۔ تو یہ ہے کہ۔“ باقی کی بات وہ کہہ نہ پائی فرمان مریم کو چھوڑ کر آئے تو ابھی سوچیں ہی

ساتھ تھیں۔ مریم نے زندگی میں آکر بڑی بڑی کردی تھی۔ آغا جی تو کسی صورت بھی نہیں مانیں گے، اس معاملہ میں تو وہ عالی کی بات بھی نہیں مانیں گے۔

”خدا یا میری مدد فرما۔ میں نے کوئی ناجائز خواہش نہیں کی۔ پسند کا ساتھی اپنانا چاہتا ہوں اور اپنی

تیری ذات واحد نے بھی اجازت دے رکھی ہے، مگر یہ انسان جن کو نے والدین کا رتبہ دے رکھا ہے

نہیں۔ معاف کرنے کا ظرف نہیں رکھتے، خدا یا میرے نصیب میں مریم کو لکھ دے۔“

وہ کتنی ہی دیر خدا کے حضور دعائیں کرتے رہے پھر اٹھ کر رخصت کر خط لکھنے بیٹھ گئے۔

فرمان کے آنے کے دن قریب آ رہے تھے تو گھر میں جیسے زندگی مسکرانے لگی تھی۔ فرمان کے آنے

کے مطابق انہیں فروری کے آخر تک وطن واپس پہنچ جانا تھا۔ ہر کوئی خوش اور مصروف تھا۔ البتہ عذرا بیگم

اندر ہارسی گئی تھیں کراہیوں نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ عالی کے چہرے پر ابھی سے حیا کی سرخیاں

لگی تھیں۔ آنے والے طوفان سے بے خبر خوش اور شاداں تھی، انتظار کی منزل اب تمام ہوا چاہتی تھی۔

”اب تو آغا جی سے پڑھائی کے سلسلے میں بات کرنا ہی فضول ہے اب تو وہ ہرگز نہ مانیں گے۔ اب

جی کا سامنا بھی کرتے ہوئے شرم آتی ہے، فرمان آجائیں گے تو میں ملنے کمرے میں قید ہو جاؤں گی۔

اب جلدی سے لوٹ آئیے۔ انتظار کی شاہراہ پر چلتے چلتے میں تھک گئی ہوں۔“

اور پھر وہ خوابوں کی نشاۃ فریں وادیوں میں نکل گئی جہاں وہ تھی اور فرمان تھے، وہ جانے کب تک

خیالوں میں کھوئی رہتی۔ نرسین نے بے دردی سے اسے خوابوں کے نل سے کھینچ لیا۔

”کیا بات ہے نرسین؟“ وہ بڑی بے مزہ ہوگئی۔

”آپ کو بی بی جان نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔“

”آف میرے خدا! بی بی جان نے کہا تھا۔ سر میں تیل ڈال دو۔ میں بھول ہی گئی۔ تم چلو،

ہوں!“ پھر وہ جلدی جلدی اپنے بال سمیٹ کر گلابی لبادے میں لپی بی بی جان کے کمرے میں آگئی مگر

حیران رہ گئی، بی بی جان زیورات کے ڈبے کھولے بیٹھی تھیں۔

”آؤ عالی! میری بیٹی! میرے فرمان کی دلہن۔“ بی بی جان نے اسے پاس بلا کر ساتھ لگا لیا تو ڈھیر سا

آنچل کی طرح اس پر پھیل گئی، فرمان کی دلہن والے لطیف احساسات کا جھربا بن کر دل کی وادیوں میں

”دیکھو بیٹی! زیورات بن کر آ گئے ہیں، کوئی تبدیلی کرنی ہو تو بتا دو۔ میرا فرمان آنے والا ہے۔

آتے ہی میں اپنی بیٹی کو دلہن بناؤں گی۔“

بی بی جان کے انگ انگ سے محبت ٹپک رہی تھی۔ مارے خوشی کے وہ بے حال ہوئی جاری تھیں

یہ سب دیکھ لیتے تو شاید اپنی ہر خوشی ان بھوتوں پر نچھاور کر دیتے، عالی کو تو شرم ہی اتنی آ رہی تھی، اسے تو فرمان

نام کی ہر چیز سے یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ خود ان چیزوں میں اسے پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

ابھی ہی نہیں مکمل پاری تھیں۔

”بی بی جان! سب ٹھیک ہے، لایئے آپ کے سر میں تیل ڈال دوں۔“

وہ جیسے ہی الماری سے تیل کی شیشی لے مڑی، دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، پھر ساتھ ہی شہزاد اندر

داخل ہوئے، پہلی نگاہ عالی پر پڑی، جس کے چہرے پر انتہائی بھاروں کا نور اُترا ہوا تھا۔ کتنی ہی دیر نگاہیں

اطلاقیات کی خلاف ورزی کرتی رہیں۔

”ارے شہزاد بیٹا! آؤ۔“ بی بی جان کی ان پر نظر پڑی تو ڈبے ایک طرف کر کے بولیں۔

”آداب بی بی جان! مردانے میں کافی دیر سے آیا ہوا تھا۔ جانے سے پہلے سوچا آپ سے دعائیں

چلوں!“ وہ کن آنکھوں سے عالی کو دیکھتے ہوئے سونے پر بیٹھ گئے۔

”جیسے رہو بیٹے! اللہ اپنی امان میں رکھے، تمہیں معلوم ہے ناں۔ میرا فرمان آ رہا ہے۔“

بی بی جان ان کو ایسے بتا رہی تھیں، جیسے فرمان کا آنا شہزاد کے لیے بڑی خوشی کی خبر ہو۔

”جی یہ تو چہرے پر نکمری دھک ہی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ جن میں آمد بہاراں ہے۔“

شہزاد نے ایک حسرت بھری نگاہ عالی پر ڈالی جو اس کی موجودگی کی وجہ سے سُٹتی ہوئی تھی۔

”شہزاد بیٹے! یہ دیکھو فرمان کی دلہن کے زیورات ہیں۔“ اشتیاق اور محبت میں بی بی جان یہ بھی بھول گئیں

کہ عالی بھی وہیں موجود ہے، وہ جڑ بڑ ہو رہی تھی۔

بی بی جان! زیورات کا اپنا تو کوئی حسن نہیں ہوتا وہ تو دلہن کا حسن پڑاتے ہیں، وہ دلہن فرمان کی ہو یا۔“

قلب حیز کی حسرتیں زخمی لچے میں لفظوں کی صورت ڈھل کر یوں تک آ گئیں انہوں نے ایک گہری نگاہ ان صبیح

رخساروں پر ڈالی جن پر فرمان کی چاہت کے رنگ نکمرے ہوئے تھے۔ ایک حسرت بھر شہزاد میں ڈھل گیا۔

خدا نصیب کرے ان کو دائمی خوشیاں

ندم وہ لوگ جو ہم کو اداس رکھتے ہیں!

”خدا کرے عالی تمہارے اس حسین چہرے پر زندگی کی سحر، یوں ہی مسکراتی رہے۔“ شہزاد کے دل کی

گہرائیوں سے یہ دعا نکلی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ارے بیٹھو بیٹے! نہ کھانا نہ پینا نہ کچھ بات کی۔“

”شکریہ بی بی جان میں نے عرض کیا تھا ناں کہ میں مردانے میں کافی دیر سے آیا ہوا تھا۔ وہیں کھا پی

ہے یہاں تو آپ سے دعائیں لینے آیا تھا۔ اب چلتا ہوں۔“ وہ بیٹھوں کو دبائے باہر آ گئے، اب وہ کیسے بتاتے

کہ ماؤں کی اوٹ میں وہ دیک کی عید حاصل کرنے آئے تھے۔

”ہکھور، چلم رکھ کر ذرا بیگم صاحبہ کو بلالایا۔“

”جی بہتر۔“ ہکھور چلم رکھ کر بی بی جان کو بلالایا۔

”جی حکم آغا صاحب!“ بی بی جان صوفے پر بیٹھتے ہوئے تابعداری سے بولیں۔

”حکم کیسا جت! عرض یہ ہے کہ آپ کے صاحب زادے آ رہے ہیں۔ کیا سوچا ہے آپ نے؟“

بات کر کے آغا جی پھر حذر گز گز کرنے لگے۔

مبارک سلامت کے شور سے کمرہ گونج گیا، سب بے حد خوش تھے، سیدہ چپکے سے عالی کے پاس آئیں جو دھڑکتے دل کے ساتھ پنہاں کھوئی ہوئی تھی۔

”مبارک ہو میری بہن! تیرے سپنوں کے دلہن بننے کے دن مقرر کر دیئے گئے ہیں پتا ہے اپریل کی پچیس تاریخ ہے۔ خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے میری جان۔“

سیدہ نے لڈو عالی کے منہ میں ڈال کر اسے ساتھ لگایا، جس روز سے تاریخ طے ہوئی تھی، گھر میں جیسے جشن بھار کا سا سماں تھا زور و شور سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں، سب سے زیادہ آغا جی، بی بی جان اور سیدہ خوش تھے ان لوگوں سے تو خوشی سنبھالنے نہیں سنبھال رہی تھی، جیسے جیسے دن قریب آتے جا رہے تھے ارمانوں کی دیار نگین تر ہوتی جا رہی تھی، رنگوں کی اس برسات میں عالی ارمانوں کی سچ پر دلہن بنی تصورات میں خود کو فرمان کا خنجر پاتی۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں فرمان سے بے شمار شکوے کر ڈالتی خط نہ لکھنے کا شکوہ جلدی نہ آنے کا شکوہ، پھر خود ہی ان کی مجبور یوں کا خیال کر کے معاف بھی کر دیتی۔ وہ ابھی سے فرمان کے آنے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں محسوس ہو گئی تھی۔ سب چیزیں اس کی پسند اور مرضی کی بن رہی تھیں۔

”رحمن فرمان کی واپسی کے دن اتنے قریب آ رہے ہیں۔ مگر اس نے آنے کی کوئی اطلاع نہیں دی تاریخ اور دن نہیں بتایا اور یہاں سے بھی میرے خیال میں اسے شادی کی تاریخ نہیں بتائی گئی، ایسا نہ ہو کہ موصوف شادی والے روز بھی غائب ہوں۔“ سیدہ اس بارے میں چونکہ بہت سوچتی تھیں اس لیے ان کو اُلٹے سیدھے وہم ستاتے رہتے اور وہ اپنے زندگی کے ساسی سے اظہار بھی کر دیا کرتیں۔

”ارے نہیں سیدہ! یہ کچی باتیں تمھاری ہیں۔“ فرمان کے آنے کی تاریخ بھی طے ہے۔ گھبراؤ مت۔ ہم دونوں بھائی بھلا تم دونوں بہنوں سے بچ سکتے ہیں۔“ رحمن ٹائی کی ٹاٹ لگاتے ہوئے شوخی سے بولے تو سیدہ شرمانگین اور جس تاریخ کو فرمان نے آنا تھا۔ سب لوگ ارمانوں کی شاہراہ پر خوشیوں کے دیپ جلائے راہوں میں کلیاں بچھائے منتظر تھے، مارے خوشی کے رستے ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عجیب سا سماں ہو رہا تھا۔ رحمن بھی انہماک سے ذرا جلدی اٹھ گئے کہ پھر اتر پورٹ بھی جانا تھا۔

”صاحب آپ کی ڈاک۔“ اور عین اس وقت جب وہ اٹھ رہے تھے، ملازم نے ڈاک لا کر رکھ دی پہلی نظر جو پڑی وہ فرمان کا خط ہی تھا۔ رحمن نے۔ بجلی کی سی تیزی سے چاک کیا اور نظریں سطور پر دوڑنے لگیں۔ ایک بار، دوبار، تین بار حتیٰ کہ دس بار۔ الفاظ تھے کہ اپنی اصل حالت میں موجود تھے، جب کہ رحمن نہ تو ان الفاظ کو دیکھنا چاہتے تھے، اور نہ ہی پڑھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کئی بار خط اس لیے پڑھا کہ شاید ایک بار نظریں دھوکا کھا گئی ہوں اور انہوں نے غلط پڑھا ہو مگر اب پتا چلا تھا کہ نہ تو ان کی نظروں نے دھوکا کھایا ہے اور نہ ہی خط کا نفسِ مضمون بدلا ہے ہاں تحریر یہی تو تھی۔

محترم بھائی جان آداب!

مجھے معلوم ہے کہ آج کل آپ لوگ میری آمد کے منتظر ہوں گے، مگر بھائی جان میں بے حد مجبور ہوں سمجھ لیں کہ جن کیفیات سے آپ آج سے چند سال پہلے گزر چکے ہیں، میں بھی ان ہی کیفیات سے گزر رہا ہوں۔ مریم میری محبت بن کر میری زندگی میں آئی ہے اور اس طرح کہ میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر

”خدا وہ مبارک گھڑی تولائے، آغا صاحب کبھی کے چراغ جلاؤں گی میں تو۔“ بی بی جان خوشی سے آواز میں بولیں۔

”میں نے ان کے استقبال کے بارے میں نہیں پوچھا۔ شادی کے متعلق بات کر رہا ہوں۔“

”تو سوچنا کیا ہے، اس ماہ کے آخر تک تو وہ آ رہا ہے، اگلے ماہ کے وسط یا آخر کی کوئی مبارک تاریخ لیں۔ اللہ خوشیاں نصیب کرے میرے بچوں کو۔“ ان کا رواں رواں دعا گو ہو گیا۔

”اچھا تو پھر آج رات کو سارے بچوں کے ساتھ مشورہ کر کے کوئی تاریخ مقرر کر لی جائے گی! تیاریاں مکمل رکھیں، یہ نہ ہو کہ وقت پر کوئی کمی رہ جائے، یہ ہمارے دونوں چھوٹے بچوں کی شادی ہے، ہم انہیں ارمان نکالنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اپنے مرحوم بھائی اور بھابھی کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں سب انتظامات خود دیکھ رہی ہوں۔“

رات کو کھانے کے بعد سب لوگ آغا جی کے کمرے میں جمع ہو گئے۔

”ہوں قد سیرہ بیٹی! لقمان بیٹے! کیا پوزیشن ہے؟ انتظامات کیسے ہیں؟“

گھر کے تمام امور کے نگراں چونکہ لقمان احمد اور قد سیرہ ہی تھے، اسی لیے آغا جی نے پہلا سوال ان ہی سے کیا۔

”آغا جی! انتظامات تو اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہیں آپ خود دیکھ لیں اور جو کمی بیشی ہو تاوا قد سیرہ! بانو انتظامات کی تفصیل بتا رہی تھیں۔“

”ٹھیک ہے عذرا بیٹی تم کیوں خاموش ہو؟“ آغا جی کو سب کا خیال رہتا کہ کون کیا کر رہا ہے کیا سوچا رہا۔

”آغا جی! میرے پاس کوئی ایسی خاص قابل ذکر ذمہ داری نہیں جو میں نبھاؤں۔ یہ ہے کہ گھر کا کام لگاتے لیتی ہوں ملازمین کے ساتھ۔“ عذرا بیگم کا کچھ لہجہ ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ میری حیثیت تو ملازمین کی طرح ہے جو بتا دیا کرو یا۔ ان کا لہجہ اور بات سب نے نوٹ کی تھی مگر اس خوشی کے موقع کو کوئی بھی بے مزہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”اچھا خیر، چھوڑو بیٹی! یہ بتاؤ کہ شادی کی تاریخ کیا رکھی جائے؟ آغا جی ان کا موڈ سمجھ گئے تھے۔ اتنا اہم کام ان کو ہی سونپ دیا۔

”سب سے پوچھ لیں جو بھی رکھ دیں۔ وہ ابھی بھی شاکی لہجہ میں بول رہی تھیں۔“

”عذرا بیٹی! میں نے پوچھا ہے اور تاریخ وہی رکھی جائے گی جو تم کرو گی۔“

آغا جی کے گیمبر لہجے میں ہلکی سی خنکی آ گئی تھی۔ یسین احمد نے غور کر عذرا بیگم کو دیکھا تو وہ کچھ گھبرا گئیں۔

اہم ذمہ داری تھی۔ اس لئے سوچنے لگی۔

آغا جی! میرے خیال میں اگلے ماہ کی پچیس تاریخ مناسب رہے گی۔ اگر سب متفق ہوں تو۔“

”کیوں بھی سب متفق ہیں ہاں، کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں؟“ آغا جی نے سب کی طرف دیکھا۔

”ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں لڑی والوں سے پوچھ لیں۔“ قد سیرہ بانو نے مسکرا کر سیدہ اور رحمن کی طرف دیکھا جو ان کی بات پر ہنس پڑے تھے۔

”ہمیں لڑکے والوں کی کسی بات پر اعتراض نہیں۔ انتہائی مناسب تاریخ دی ہے بھابھی جان۔“

سیدہ نے اس طرح خوش دلی سے مسکرا کر کہا۔

”اچھا بھئی، پھر سب کو مبارک۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رضا سے نوازے آمین۔“

سکتا۔ میں نے اس کے ساتھ شادی کا فیصلہ کیا ہے، میں جانتا ہوں کہ میرے اس فیصلے سے قیامت آجائے گی۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے مریم کو عابی کے متعلق بتایا ہے، وہ کہتی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہ سکتی ہیں۔ بھائی جان اس طرح کی دل ٹوٹنے سے بچ جائیں گے۔ دو شادیاں کرنا شرعاً گناہ ہے نہ قانوناً جرم۔ یہ ایک پروپوزل ہے، جیسے ماننا نہ ماننا آپ لوگوں کے اختیار میں ہے، میں نے اپنا فیصلہ آپ کو سنا دیا ہے، اور مر کر ہی اسے چھوڑ سکتا ہوں۔ زندگی میں نہیں، بھائی جان ان کی شرط ہے کہ میرے گھر سے کوئی آئے تو جب ہاں کریں گے تو بھائی جان آپ کو خدا کا واسطہ، آپ کو میری قسم، آجائیں اگر نہیں آئیں گے تو میری لاش کو کندھا دینے کے لیے تیار رہیے گا۔ یہ نہ ڈانٹا لگ ہیں نہ دمکی۔ اس لیے کہ میں دوغلی زندگی نہیں گزار سکتا اور یہ بات بھی واضح کر دوں کہ اگر مریم نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ اپنی پسندی شادی کرنا میرا حق ہے، جو قانون اور مذہب نے دیا ہے، اس لیے آپ لوگ بھی اسے تسلیم کر لیں۔ میرے اس فیصلے سے آنے والی قیامت کی تباہ کاریوں سے بھی میں آشنا ہوں، آغا جی کے غصہ اور فیصلوں سے بھی مجھے باخبر ہوں۔ مجھے دیس نکال لیا جاسکتا ہے، عاق کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مجھے کسی چیز کی پروا نہیں۔ آغا جی کو میری خوشی کا خیال رکھنا پڑے گا۔ اور پھر میں عابی سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ مریم بہت عظیم لڑکی ہے، یہ تجویز بھی اسی نے دی ہے بس۔ بھائی جان آپ کو میری ذرا بھی پروا ہے اور میری جان عزیز ہے تو چلے آئیے دن۔

ورنہ کے بعد باقی کچھ نہیں بجا کرتا۔ آپ بہت عظیم انسان ہیں کہ والدین کی خاطر اپنی محبت سے دست بردار ہو گئے۔ مگر میں بہت چھوٹا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے، اول تو میں ضد کرتا ہی نہیں۔ کروں تو جان دے کر بھی پوری کروانا جانتا ہوں، بھائی جان! خدا کے لیے دیر مت کیجئے، کسی نہ کسی بہانے آجائیے، اگر ہو سکے تو اس سلسلے میں عابی کی رائے بھی معلوم کر آئیے گا۔ تاکہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو، ایک بار پھر آپ مجھے زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو آجائیے ورنہ۔ امید ہے آپ ضرور آئیں گے میں اپنے دکھ کا اظہار نہیں کر سکتا جو مجھے آغا جی اور بی بی جان کی گستاخی کر کے ہو رہا ہے۔ باقی رہی عابی تو وہ بے حد عظیم ہے، وہ مجھے ضرور معاف کر دے گی، وہ معاف کرنے کا وصف رکھتی ہے، بس آپ لوگوں کو ظرف بڑا کرنا پڑے گا۔ میں کوئی ناجائز بات نہیں کر رہا۔ اگر مریم میری زندگی میں نہ آتی تو عابی کے ساتھ شادی سے میں کب منکر تھا مگر۔ مگر پلیز بھائی جان اب آپ کو میری زندگی اور خوشیاں عزیز ہیں تو پہلی بار فرصت میں یہاں پہنچ جائیں۔ اس گستاخی کے لیے معافی چاہوں گا۔ اجازت دیں۔ آپ کی آمد کا شدت۔۔۔ منتظر۔ خدا حافظ۔

آپ کا بھائی  
فرمان

یہ خط تھا کہ زلزلہ جس نے جسم کی عمارت کو ڈھانا شروع کر دیا تھا۔ الفاظ تھے کہ برچھیاں جودل میں اتر گئیں۔ وہ اتنی خشکی کے باوجود پسینے میں نہا گئے، صوفے پر ڈھیر ہو گئے۔ کتنی ہی دیر لمبی لمبی سانسیں لیتے رہے، وقت نے ایسے کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا کہ اگر فرمان کے حق میں فیصلہ کرتے تو باقی سب برباد ہو جاتے، اور سب کو بچاتے تو جان سے عزیز بھائی کو کھود دیتے یہ کیا ہو گیا تھا مگر میں تو خوشیوں کے چراغ جل رہے تھے۔ ”فرمان تم نے یہ کیا کر دیا میرے بھائی۔ تمہیں معلوم ہے کہ کیا قیامت آئے گی۔ گھر میں ڈرا دل بڑا کر لینے تو۔ تم اس قیامت کو روک سکتے تھے، آغا جی کے غضب سے کیونکر بچ گے اور وہ معصوم لڑکی جو تصورات میں بے شمار جہ خود کو تمہاری دہن کے روپ میں دیکھ چکی ہے، تم نے سب کے شکوک کو حقیقت کا روپ دے دیا ہے، فرمان میں سیدہ کو کیسے بھلاؤں گا۔ کس منہ سے تسلی دوں گا۔ میں جو تمہاری طرف سے قسمیں کھا کر اسے مطمئن کیا کرتا تھا۔ اب اسے کیا منہ دکھاؤں گا۔ بی بی جان کیسے یہ صدمہ برداشت کر پائیں گی۔ فرمان وہ تو جنہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے مایہ آب کی طرح تڑپ رہی ہیں۔ فرمان! میرے بھائی! خدا تمہیں سلامت رکھے، میں تمہارے احساسات کو سمجھ رہا ہوں۔ فرمان یہ کیا ہو گیا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں، میں اس قیامت کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔ فرمان۔“

رحمن صوفے پر گر کر بے دم سے پڑے ابھی سے خود کو اس طوفان میں گھرا ہوا محسوس کر رہے تھے، جو فرمان کی بات سے آنے والا تھا۔ رحمن میں پسینے کی سکت بھی نہیں رہی تھی وہ سوچ رہے تھے اب کیسے امیدوں کے ان چراغوں کو گل کریں جو فرمان کی آمد پر روشن ہیں، وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے، کہ ایسے بھی مرحلے زندگی میں آئیں گے، وہ فرمان کی مجبوری بھی سمجھ رہے تھے۔ اپنی محبت سے دست بردار ہو جانا کوئی معمولی عمل نہیں ہوتا کہ انسان آسانی سے اس بیل صراط کو پار کر جائے، اس کے لیے تو بہت بڑا ظرف چاہیے تھا، اور جو فرمان کے پاس نہیں تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ فرمان اول تو کوئی ضد نہیں کرتے تھے اگر کرتے تو اسے پورا کر کے ہی دم لیتے۔ خواہ اس میں کوئی خوش ہوتا یا ناراض ہوتا اور یہ تو پھر ان کی محبت کا معاملہ تھا۔ وہ کسی صورت اس سے دست بردار نہیں ہو سکتے تھے اور مریم ان کو رحمن کے جانے پر ہی مل سکتی تھی۔ فرمان نے ان کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ سوچ سوچ کے ان کے دماغ کی رگیں تن گئی تھیں۔ ان کا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر ان اٹھتے ہوئے حالات کو سمجھانے کا کوئی سراہا تھا نہیں آ رہا تھا۔ وہ بمشکل اپنی جگہ سے اٹھے پانی کا گلاس پیا اور کرسی پر بیٹھ کر تیل بھائی اور ملازم کے آنے سے پہلے چہرہ صاف کرنے لگے۔

”جی صاحب!“ وہ مؤدب ہاتھ باندھ کر کھڑا تھا۔

”دیکھو شریف! میں ایک بے حد ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ گھر سے فون آئے تو کہہ دینا۔ میں ضروری کام سے آیا ہوں اور رات کو بہت دیر سے گھر آؤں گا پریشان نہ ہوں۔ اچھا رہنے دو، میں خود گھبراتا کرتا ہوں۔“ رحمن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا کریں۔ وہ کس سے فرار۔ چاہتے تھے گھر والوں سے یا خود سے، ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ گھر میں سب منتظر ہوں گے کہ فرمان کو لینے جاتا ہے۔ انہوں نے کچھ سوچ کر گھر کا نمبر ڈائل کر دیا۔ ”نیلو لقمان بھائی! وہ فرمان کا آفس میں فون آیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ اسے چند دن اور ڈکنا پڑ گیا ہے، اس لیے وہ آج نہیں آ رہا۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، دیر سے آؤں گا۔ فکری کوئی بات نہیں۔“ رحمن لقمان بھائی کا کوئی جواب نہ بنے بغیر ریسہ روک کر باہر نکل گئے، یوں جیسے وہ آ کر ان کی چوری پکڑ لیں

”مردوں کا زمین تمہارے نام۔ تمہارا نام باقی رہے گا تو پھر ناں، اوئے اشرف میرے کپڑے تیار ہو مجھے ہیں کہ نہیں۔“

سلطان خان دور تک الیاس خان کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا پھر اشرف کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے کپڑے لے کھڑا تھا۔

”ان کو یہاں رکھو اور وہ فاطمیں لے کر آؤ زمین کی۔“ سلطان خان نے کپڑے لے کر ایک طرف رکھ دیے مگر اشرف ہنوز اپنی جگہ کھڑا رہا سلطان نے گھور کر اسے دیکھا۔

”اب کیا ہے، کس معجزے کا انتظار ہے تمہیں، بہرے ہو گئے ہو کیا؟“

”نہیں خان جی! یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ نے عالم شاہ کے نام ساری زمین کر دی ہے، اور بڑے باؤ جی کو اس کی خبر بھی نہیں ان کو معلوم ہوگا تو حویلی میں طوفان آ جائے گا اور، اور خان جی میرا دل اب بھی دکھی ہو رہا ہے۔“

اشرف کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ سلطان خان کو غصہ نہیں آیا وہ مسکرا پڑا۔

”اوپا گل انسان! تو نے اپنے خان کو اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے، دیکھ تو سہی تیرا خان عالم شاہ کی زمین اپنے نام کیسے کراتا ہے۔ بس ذرا اس کی گردن میرے ہاتھ آ جائے تو بٹنے نہیں دوں گا اسے کسی طرف۔“

سلطان خان نے دانت چس کر کہا اور تیار ہونے چل دیا۔



مجھے تو یہ کیا جواب دے پائیں گے، فرمان کے نہ آنے کی خبر نے سب کے خوشی سے چمکتے چہروں کو دیران کھنکھناتے دلوں میں بے شمار داہموں نے آن جگہ بنائی، کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سیدہ کو پورا یقین تھا کہ اس نے مذاق کیا ہے، خود ہی اکیلے جائیں گے اور فرمان کو ساتھ لے کر آئیں گے، سر پر اند دینے کے لیے۔

”لقمان بیٹے! اس سے پوچھنا تو تھا کہ فرمان کیوں نہیں آ رہا۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں۔“ بی بی جان کو لہجہ کی ٹھٹھکی لاحق ہو گئی۔

”بی بی جان! آپ لوگ نہیں جانتے۔ بڑے مسئلے ہوتے ہیں باہر کے کوئی مجبوری ہو گئی ہو ورنہ تو ہر پروگرام طے تھا۔ میری خود فرمان سے بات ہوئی تھی۔“

لقمان نے ماں کو تسلی دی مگر تسلی کہاں ہو رہی تھی۔ دل بے قرار تھا۔ طرح طرح کے دوسے دس دس تھے، آغا جی اس بچکانہ حرکت پر خامسے برہم تھے کہ جب صبح سے پتا نہیں تھا تو آنے کا شوشا کیوں چھوڑا مگر ان کے سامنے بولنے کی کس کی مجال تھی۔ وہی مگر جس میں رخصت کے فون سے قبل زندگی مسکرا رہی تھی۔ ایک دھڑکنے کا گھر بھرا یز پورٹ جانے کو تیار تھا۔ اب سب مر جھائے بیٹھے تھے، ان سب سے دور اپنے کمرے میں عابی دل کی ہستی میں اترتی گہری شام کو اترنے سے نہ روک سکی، اک اک کھلی بن کھلے مر جھائی۔ چلوں! منڈیروں پر اشکوں کے چراغ جلنے لگے۔

”فرمان! آپ کو باہر کی ہوائیں اتنی راس آگئی ہیں کہ آنے کی دل نہیں چاہ رہا چلے آئیے، فرمان! آئیے، اب انتظار کی سکت باقی نہیں رہی۔“ عابی نے تھک کر سر رینگ پر سر ٹیک دیا۔

رخصت نے سارا دن گھر سے باہر گزارا تھا ان میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ گھر جائیں وہ مر جھل ہوئے چہرے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔



”باؤ جی! آپ کو باؤ جی عالم نے بلایا ہے۔ اکرم آیا ہے جی ان کا پیغام لے کر۔“

”ٹھیک ہے، اسے کہو آ جائیں گے، اب تم جاؤ۔ اکرم کو کھانا کھلا کر بھیجنا۔“

سلطان خان نے اشرف کو فارغ کر دیا اور خود الیاس خان کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”کیوں مان گئے ناں استاد! ہار گئے ہو شرط۔ نکالو شرط کے پیسے، سلطان خان نے فاتحانہ انداز میں

الیاس خان کی طرف بڑھایا جو منچوں پر تاؤ دے رہا تھا۔

”یہ معمولی شرط ہے میرے یار! ابھی تو صرف عالم نے تمہیں بلایا ہے اور کیا خبر کس لیے بلایا ہے؟“

تمہاری اس روز ہوگی جس روز تم نورین کو بیاہ کر اس حویلی میں لاؤ گے۔“

”وہ دن بھی دور نہیں میرے یار! بول اسے بیاہ لایا تو۔“ سلطان نے بڑے وثوق سے کہا۔

”اول تو یہ نامکن ہے اگر ایسا ہو ہی گیا تو میں شرط لگاتا ہوں کہ اپنے حصے کی تمام زمینیں تمہارے

دوں گا۔ اور اگر تم شرط ہار گئے تو تمہاری زمین میرے نام ہو جائے گی۔ یہ شرط مردوں کی شرط ہے، مگر ناگنا

اس سے، کیونکہ اس سے جا ہی آئے گی، اب تم ہونے والے سسرال جانے کی تیاری کر میں چلا ہوں!“

خان جیسے سے لہجے میں بولتا اٹھ کھڑا ہوا۔ تو سلطان خان بھی کھڑا ہو گیا۔



”اُدھر سے اور غفور، یہ۔ یہ فائر کی آواز کیسی تھی؟“

عالم شاہ اور سلطان خان گھبرا کر باہر بھاگے، جہاں سب رشید کے گرد جمع تھے۔

”اوئے یہ تو اپنا رشید ہے۔ اُف خدا یا یہ کیا ہو گیا۔“

”میں نے منع بھی کیا تھا۔ مت گولی چلاؤ مگر تمہیں تو۔“ عالم شاہ کے محافظ آپس میں الجھ رہے تھے۔

”اویہ کیا کر دیا تم لوگوں نے اندھے ہو، جانتے نہیں کہ کس پر فائر کرنا ہے اور کس پر نہیں، اب تم شاد کچھ کیا

رہو۔ فضل جلدی سے گاڑی نکال، اس کا خون زیادہ بہہ گیا تو کام خراب ہو جائے گا۔ چلو سلطان یا، تم بھی۔

میرا خیال ہے۔ آپریشن تو ضرور ہوگا۔“

عالم شاہ نے اسی وقت بیہوش، خون میں لت پت رشید کو گاڑی میں ڈالا جس نے وفاداری کی سربھگتی تھی،

بندر کمرے میں نورین بری طرح گھبرا رہی تھی۔ فائر کی آواز نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ ایک دم ہی حویلی میں

سنا جھا گیا تھا۔ وہ آہستگی سے یوڑھی میں آگئی۔ پھر اس نے ساری حویلی دیکھ ڈالی مگر کوئی ملازم نظر نہ آیا۔ مانی

نوراں بھی جانے کہاں گئی تھی، ایک تو حویلی کی ہولناکی اور پر سے فائر کی آواز نے اسے وحشت زدہ کر دیا تھا۔

”مانی نوران! غفور رشید! کہاں ہو تم سب۔ کہا ہو گھبرا گھر میں؟“ وہ صو نے پر گر گئی۔

”غفور۔ غفور یہ کیا ہوا ہے؟ یہ فائر کی آواز کیسی تھی۔ بتاؤ، یہ تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے، غفور مت چھپنا مجھ

سے۔ بتاؤ، بھائی جی تو ٹھیک ہیں؟“

نورین کی نظر غفور پر پڑی جو منہ لٹکائے کھڑا تھا اور شاید رو کر آیا تھا مگر نورین کے سامنے آنکھیں صاف کر

ڈالیں۔ نورین تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

”باؤ جی تو بالکل ٹھیک ہیں جی، پر۔“ غفور کے حلق میں الفاظ انکٹ گئے۔

”پر۔ پر کیا غفور جلدی بتاؤ۔ تمہیں معلوم ہے، میں اب کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔“

نورین کا دل انجانے خدشات سے دھڑک رہا تھا۔

”وہ جی رشید کو گولی لگ گئی ہے اور۔“ غفور دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

”رشید کو گولی لگ گئی، وہ نہیں غفور نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے غفور۔ وہ۔ وہ ہی تو میرا آخری سہارا ہے۔

میرا خدا اسے مجھ سے نہیں چھینے گا۔ کہاں ہے وہ؟ غفور بچ بتاؤ، رشید کو گولی کیوں اور کس نے ماری۔ اس نے کسی کا

کیا باؤ تھا کیوں؟ کیوں؟“

نورین کے دل پر چوٹ پڑی تھی۔ رشید تو اسے کسی صورت بھی بھائی سے کم نہ تھا۔

”گولی اس کی ٹانگ میں لگی ہے بی بی۔ اور وہ باؤ جی کے محافظ نے چلائی تھی۔“

”کیوں کیا باؤ تھا اس نے اس ظالم کا؟“ نورین کی ہچکچاہٹ بندھ گئیں۔

”غلط فہمی میں ایسا ہوا بی بی! انہوں نے قسم کھا کر کہا ہے کہ یہ سب شبہ میں ہوا۔ وہ رشید کو کوئی چور سمجھے تھے۔

رشید نے بھی منہ ڈھانپ رکھا تھا اور بھاگ بھی رہا تھا۔ وہ کچھ اور سمجھے اور گولی چلا دی۔ اب رشید کو باؤ جی شہر لے

گئے ہیں۔“

وہ تمام رات اس نے بڑی بے قراری سے گزاری تھی۔

پورے گاؤں میں بات پھیل چکی تھی کہ عالم شاہ کی حویلی میں فائر ہوا ہے اور رشید زخمی ہوا ہے۔ طرح

”آؤ سلطان خان بڑا انتظار کراتے ہو، بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے، بہت سے مشورے کر

ہیں اپنے یار سے، غفور دروازہ بند کر کے جاؤ اور خبردار جو کوئی اس کمرے کے آس پاس پھٹکا بھی۔

عالم شاہ، سلطان خان کے ساتھ صو نے پر بیٹھ کر غفور کو ہدایت دینے لگا وہ جی اچھا کہہ کر باہر نکل گیا۔

”رشید آج بڑے اہم فیصلوں کی رات ہے، تم کسی طرح نورین بی بی کا خیال رکھو۔ اکرم نے بتایا

سلطان نے اپنی ساری زمین عالم کے نام کر دی ہے اور وہ اسی رات نورین کا ہاتھ بھی مانگے گا۔“ غفور نے

کچھ رشید کو آن بتایا۔

”میں خود ان کی باتیں سنوں گا تم بی بی کے کمرے کے پاس ہی رہنا۔

رشید چلا گیا تو غفور نورین کے کمرے کے سامنے بیٹھ گیا۔

”رشید۔ رشید۔“ اندر سے نورین کی آواز آئی تو غفور اندر گیا۔

”رشید کہاں ہے غفور۔“ نورین غفور کو دیکھ کر بولی تو غفوری نے ماری بات بتادی۔

”خدا یا میری مدد فرما میں بالکل تنہا ہوں مدد فرما۔“ نورین سر تھام کر رستہ پر بیٹھ گئی۔

”اچھا وہی بہن زاد تمہارا رقیب روسیہ کیا کرتا ہے اسے۔“ سلطان خان نے کپ ایک طرف رکھے

پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بس اسے اتنی اذیت پہنچاؤ کہ اسے دیکھ کر اس کو چاہنے والی اس کی بیوی تڑپ تڑپ

اور وہ شہری کچھ کیزا اسے زمین میرے نام کرنے پر مجبور کر دے۔“ بہن زاد واقعی عالم شاہ کا رقیب روسیہ تھا

اس کا نام لینے ہوئے عالم کا حلق تک کڑوا ہوا جاتا تھا۔

”کب تک یہ کام چاہیے تمہیں؟“ سلطان اٹھتے ہوئے بولا۔

”کہو تو آج ہی قدموں میں لاپھیٹوں چلوں کل ہی سہی۔“ سلطان خان دروازے کی طرف بڑھا تو

بڑی مشکوں سے روشن دان سے کان لگا بے بیٹھا تھا۔ وہ وہاں سے سر پٹ بھاگتا کہ نورین کو خبر کر کے بہن

لے لے کچھ کر سکے، وہ چہرہ ڈھانپنے والا ان سے بھاگ رہا تھا کہ فائر کی آواز آئی اور رشید ڈھیر ہو گیا۔

کی ضرورت ہے۔ میں ابھی منگادیتی ہوں۔“

”شاہدہ، رشید میرا بھی دیر ہے۔ مگر نہ کہہ کر، میں بھائی جی سے کہہ کر تم دونوں کے شہر جانے کا بندوبست کروا دوں گی۔“ اور پھر نورین نے عالم شاہ سے اس سلسلے میں بات کی۔

”اچھا ٹھیک ہے، تم ان دونوں کو کہہ دو۔ تیار ہو جائیں رات کو غفور کے ساتھ لیکن غفور تو۔ اچھا غفور تو نہیں۔“

”خفا چلا جائے گا ان کو لے کر۔“ عالم شاہ نے پہلے غفور کا نام لیا پھر کچھ سوچ کر فریغے کو کہہ دیا۔

”غفور! میں ذرا شہباز کے ڈیرے جا رہا ہوں۔ حویلی کا خیال رکھنا ہے، کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ دے دے تو تمام ملازم ہی اشارے پر دم دیتے مگر غفور اور رشید سب سے زیادہ قابل اعتبار تھے اسی لیے وہ جہاں جاتا ان کو ہی ہدایت دیتا۔

”باؤجی! سلطان خان آرہے ہیں۔“

”اوہ اسے بھی ایسے ہی وقت آیا تھا۔“ شاہاڈاسے میں آتا ہوں۔“ عالم شاہ کا اس وقت کسی اور سے ملنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا اس نے ناگواری سے شال شانوں پر ڈالی اور ہنٹک میں آ گیا۔

”گلتا ہے میرا راکھیں اور جا رہا تھا۔“ سلطان اس کو تیار دیکھ کر بولا۔

”ہاں! شہباز کے ہاں جا رہا ہوں۔“ لہجے میں اکتاہٹ نمایاں تھی۔

”شہباز۔ یا رسوا تو میں بھی ہوں۔“ سلطان خان کو عالم شاہ کی بات پر غصہ تو آیا تھا مگر بی گیا۔ اور عالم شاہ کو بھی اس کی بات نہیں بھائی تھی دل تو چاہا کہ کھرا سا جواب دے کر ابھی طبیعت صاف کر دے مگر تحمل سے کام لیا ہی پڑا۔

”دیکھو یار، میں نے بہن کی شادی کرنی ہے اور اس کے لیے حق مہر میں جو لکھواتا ہے، تمہیں اس کی خبر ہے۔“ عالم شاہ نے جیسے نظروں سے سلطان خان کو دیکھا۔

”یہ لو، دیکھ کر تسلی کر لو۔“ سلطان خان کو دیکھا۔

”یہ لو، دیکھ کر تسلی کر لو۔“ سلطان خان نے فائل عالم شاہ کی طرف بڑھا دی۔

”کیا ہے یہ؟“ عالم شاہ نیلے رنگ کے کوروالی فائل کو دیکھ رہا تھا۔

”حق مہر کی ادائیگی کا ثبوت۔ کھول کر دیکھو، سب کچھ تمہاری بہن کے نام کرنے کو تیار ہوں۔ ابھی ہاں کر دو، میں ابھی اسے ہر شے کا مالک بنائے دیتا ہوں۔“

”کیا لکھا سلطان خان؟“ عالم شاہ گنگ سا ہو گیا چند تپے تو اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا بات کرے۔ سلطان خان نے اس کو جواب کر دیا تھا اس کو سلطان خان سے ایسی حماقت کی قطعی امید نہیں تھی اور نہ ہی اتنا مصلحتی کا ہو سکتا ہے کہ سب کچھ لڑکی کے نام کر دے اسی لیے اس نے یہ شرط رکھی تھی۔ کیا خبر تھی اس کو کہ سلطان خان اس حد تک گڑبڑ جائے گا کہ اس کو بات بنانا مشکل ہوگا۔

”عالم شاہ کیا بات ہے حیران ہو کہ پریشان؟ تمہاری تو یہی شرط تھی ناں کہ جو بھی اپنی تمام جائیر مہر میں تمہاری بہن کے نام کر دے گا۔ تم اس کی شادی اسی سے کرو گے۔“

سلطان خان کی آواز پر عالم شاہ سوچوں کے جنگل سے باہر نکل آیا۔ اب وہ سلطان کو یہ کیسے بتاتا کہ یہ تو شہباز احمد کو دھمکانے کے لیے تھی ورنہ تو وہ کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ تاہم اب سلطان کو کوئی جواب بھی نہ تھا وہ

طرح کی باتیں بن رہی تھیں۔ گاؤں میں شاہ عالم کی شہرت ویسے بھی اچھی نہ تھی۔ نورین سب کو مطمئن کر تھک گئی تھی، مگر رشید کی بوڑھی ماں اور بہن کی حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی جو تب سے مایہ سب آ کر طرح تڑپ رہی تھیں۔

”ہائے میرا بچہ، میرا رشید، بی بی پتا کرواؤ میں مر جاؤں گی۔“ ماسی نے نورین کے آگے ہاتھ پائے۔

ماسی کو تسلی دے کر نورین اٹھی۔ غفور کو بلایا۔

”غفور! گاڑی نکالو! میں چلتی ہوں شہر۔ تم بھی چلو، مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی اردیے مجھ! خود گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ خدا خبر ہی کرے چلو جلدی کرو۔ یہ مجھے کیا دیکھ رہے ہو جلدی کرو۔“

”بی بی دیکھ یہ رہا ہوں کہ آپ کیا غضب کر رہی ہیں۔ باؤجی تو میری جان نکال دیں گے۔ انہوں نے مجھے بھی تاکید کی تھی کہ آپ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں اور آپ تیار ہو رہی ہیں نہ بی بی یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔“

عالم سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اچھا تو پھر تم چلے جاؤ اور جلدی سے خبر لے کر آؤ۔ کچھ احساس نہیں بھائی جی کو کہ اس کی ماں بہن لڑکے لیے تڑپ رہی ہوں گی۔“

”لیکن بی بی! انہوں نے کہا تھا آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔“

”غفور! اگر بھائی جی تمہارے مالک ہیں تو میں بھی ان کی بہن ہوں۔ میں تمہیں حکم دیتی ہوں ابھی وہ وقت نکل جاؤ شہر کی طرف اور خبر لے آؤ۔

نورین کے لہجے میں پہلی بار حاکمانہ جلال آیا تھا۔ اس نے پہلی بار ملازم سے اتنے رعب سے بات کہی۔

”ٹھیک ہے بی بی میں جانتا ہوں آپ باؤجی سے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں بات کر لوں گی بھائی سے، جلدی جاؤ۔ بھائی جی آگئے۔ بھائی جی کیا حال ہے؟“

نورین غفور سے جانے کو کہہ رہی تھی کہ اچانک عالم شاہ اندر داخل ہوا۔ نورین کے ساتھ شاہدہ بھی اس کی طرف بڑھیں۔ ماسی نوران اور شاہدہ نے خبر سننے کے لیے سانس روک لیے۔

”ٹھیک ہے رشید! گوئی نکالنے کے لیے آپریشن کرنا پڑا۔“

”آپریشن۔ چھوئے گاؤجی! آپریشن۔“ ماسی بیہوش ہونے کو تھی ان سیدھے سادے لوگوں نے آپریشن کا نام موت سے کم نہیں ہوتا اور ماسی تو پھر ماں تھی رشید کی۔

”ہاں آپریشن کامیاب ہوا ہے فکر کی ضرورت نہیں ماسی گھبراؤ نہیں۔ نورین اس کو لے جاؤ اور صبح ضرورت کی چیز بھی دے دو۔ رشید چند روز بعد ہی آئے گا۔“

عالم شاہ سے توقع تو تھی مگر اس نے بڑے سکون سے ماسی نوران کو تسلی دی تھی۔ نورین ان دونوں کمرے میں لے آئی جو آپریشن کا سن کا زیادہ بے قرار ہو گئی تھیں۔

”ماسی! گوئی کو نکالنے کے لیے آپریشن ضروری تھا۔ خدا کا شکر ہے، کامیاب ہو گیا تھا تم لوگوں کو“

فائل میز پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”سلطان تو میں حیران ہوں اور نہ ہی پریشان۔ ابھی میں جواب نہیں دے سکتا۔“

”عالم شاہ! شہباز تمہاری شرط پوری نہیں کر سکتا۔ اس کی بہن پڑھی لکھی ہے وہ ہر گز بھی اپنی جاگیز حوالے نہیں کر سکتی اور پھر شہباز چار بچوں کا باپ ہے شاہ۔“

”وہ دس بچوں کا باپ بھی ہو، تب بھی فرق نہیں پڑتا۔ بس وہ میری شرط پوری کر دے تو میں اس دیکھنا کیا مزا چکھاتا ہوں۔ آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ صوفی کی پشت پر عالم شاہ کی گرفت مضبوط ہے۔ میں چلتا ہوں۔ شہباز۔ اگر تمہاری شرط پوری نہ کر سکا تو۔“

”یہ فائل لیتے جاؤ سلطان خان۔“ عالم شاہ نے آگے بڑھ کر وہ فائل سلطان کے ہاتھ میں تھما دی۔ خیرنگا ہوں سے اس کو دیکھتا باہر نکل گیا۔ اور شاہ عالم بھی شال کا پلو شانے پر ڈال کر شہباز کے ڈیرے پر شہباز اس کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

”عالم شاہ تم، آؤ یار، بڑے دنوں بعد پھر لگاؤ؟“ وہ اس کی پذیرائی کو آگے بڑھے۔

”آنا ہی پڑا یار! یاری نبھانا کوئی آسان بات نہیں؟“ عالم شاہ شہباز سے بغل گیر ہو گیا۔

”مہربانی یار! میں تو بس بچوں میں گھر کر رہ گیا ہوں۔ چھوٹا بہت بیمار رہا ہے۔ اس لیے بس اٹھ سکا۔“ شہباز عالم کے ساتھ بیٹھ گئے۔

”اچھا تو یہاں بچوں کی آیا گیری ہو رہی ہے اور میں وہاں خستہ ہوں۔ یار! مرد کی کوئی زبان بگڑے۔“

عالم شاہ کو یہ سن کر غصہ آ گیا تھا وہ تو کچھ اور ہی سمجھا تھا کہ شہباز بہن کو راضی کر رہے ہوں گے انا میں، اس لیے خامے چھپتے ہوئے لچھے میں بولا۔

”میں زبان سے پھر اتنی نہیں یار۔“

”پھرے نہیں مگر میں بھی مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ تم جانتے ہو کہ میں اتنے لوگوں میں تمہیں اہمیت دے رہا ہوں کہ مجھے تم پر اعتبار ہے اور۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہو یار! تمہارا یہ یا تمہارے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائے گا۔ تمہارے آٹا پہلے میں شہر جانے کا سوچ رہا تھا۔ آخری بار حیران سے بات کروں گا بعد میں اپنی سزاؤں گا۔“

”شہر جا کر اپنا وقت برباد کرنے سے کچھ حاصل نہیں دوست! میں نے اس کا حل سوچ لیا ہے اگر سے متفق ہو تو۔“ اور پھر عالم شاہ نے وہ حل بھی بتا دیا۔

”نہیں عالم! ڈر لگتا ہے یار۔“ شہباز گھبرا سہ گئے۔

”یہ یہ وہ راستہ ہے جس سے تمہاری بہن کو گھبرا جاسکتا ہے ورنہ تو جعلی کاموں میں خطرہ ہی ہے بہن پڑھی لکھی ہے۔ وہ مقدمہ بھی کر سکتی ہے اور میں ایسا نہیں چاہتا۔ تم ہاں کر دوں۔ باقی۔۔۔ کام ختم آج بھی نہیں آئے گی۔“

عالم شاہ دانت پیس پیس کر جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کے لیے یہ سب کہہ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے عالم شاہ! لیکن احتیاط لازم ہے کہیں۔“

”تم گھری نہ کرو شہباز! دیکھنا دعائیں دو گئے مجھے، بس اب تم میرا کام دیکھنا۔ کیا یاد کرو گے کس عقلمند سے ملے پڑا تھا۔“

عالم شاہ تو محوہ دے کر چلا گیا تھا اور شہباز سوچ میں پڑ گئے تھے کہ عالم شاہ جو کہہ کر گیا ہے وہ کربھی رہے گا اور پھر اب اس بات کے سوا چارہ بھی تو نہیں رہ گیا۔

”اچھا جیسے کواں کی ضد کی سزا ملی ہی چاہیے میں بھی تو دیکھوں! کب تک ضد کا راگ الاپے گی۔“ پھر شہباز یہی سوچ کر مطمئن ہو گئے۔



زندگی میں پہلی بار رحمن اتنے ڈسٹرب ہوئے تھے۔ اپنا معاملہ تھا تو وہ ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئے مگر فرزان نے تو مصالحت کے تمام دروازے بند کر دیے۔ اپنا اکل اور حتیٰ فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ ان کے اس فیصلے بلی میں مل رہے تھے جب فرمان کا خط آیا تھا وہ اتنے بے چین تھے سوچ سوچ کر ان کے دماغ کی رئیس اپنے گلی تھیں۔ وہ گھر جا کر کیا تائیں گے۔ سب کی سوالیہ نگاہوں کا کیسے جواب دے پائیں گے۔ یہی سوچ کر ان کا دماغ شل ہو گیا تھا مگر اب گھر جا کر کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ سارا دن ہو گیا تھا ہر گھومتے ہوئے۔ اب گھر جانا بھی ضروری تھا۔ گھر جانے سے پہلے وہ خود کو فریش رہے تھے۔ وہ کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان میں تو اتنی بہت نہیں تھی کہ وہ سب کو مطمئن کر لے ان کے دماغ میں تو پہلے ہی آندھیاں چل رہی تھیں۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ کتنی ہی دیر خود کو لڑنے کی کوشش کرتے رہے۔

”السلام و علیکم الاذن میں داخل ہو کر انہوں نے بلند آواز میں کہا بتاؤ بی جوش کو وہ خود ہی محسوس کر کے رہ سیدہ قدیر جو بچوں کے ساتھ گئی ہوئی تھیں ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”آپ اکیلے آگئے؟“ سیدہ رحمن کے ہاتھ سے بریف کیس لیتی ہوئی مایوسی سے بولیں۔

”کیوں تو کیا ایک مدد بیگم کو لے کر آتا؟“ رحمن نے بڑے شوخ سے انداز میں سیدہ کو دیکھ کر کہا۔

”ہمارا خیال تھا کہ رحمن! کہ ہو سکتا ہے تم نے فون پر جھوٹ کہا ہوا اور فرمان کو لے کر آ جاؤ۔“

قدیر بانو کی آواز میں بھی مایوسی چھپی ہوئی تھی۔ رحمن کے دل پر چوٹ سی پڑی کہ اب وہ اتنے چاہنے لگے انتظار کو کیونکر ختم کریں، مگر وہ کچھ بھی غاہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”مانا کہ مجھے سر پرانزد دینے کا شوق ہے۔ مگر کاش کہ آج بھی میں اپنا یہ شوق پورا کر سکتا۔ خیر آپ لوگ تو اس ہوئے ہیں، جیسے خدا نخواستہ فرمان۔“

”صاحب آپ کو اتنا بھی بلارہے ہیں۔“ کھوڑی آواز پر رحمن خود کو تیار کرتے آگے بڑھ گئے۔

فرزان پر ڈالی تو رحمن بڑھ کر آگئے۔ آغا بی! ایسی ہی نگاہوں سے دیکھتے کہ انسان سب کچھ اگلے پر مجبور بات نہ اس وقت ان کو پتہ نہ تھا۔ وہ فرمان کو ایک موقع اور دینا چاہتے تھے واپسی کا اسی لیے اس سے قبل وہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”ہوں تو کیا فرمایا ہے صاحب زادے نے؟ کب تشریف لائیں گے؟ اس کو کچھ احساس نہیں کہ گھر والے

کس قدر پریشان ہوں گے۔ اسے اتنی عمر و مدداری کی جرأت کیسے ہوئی۔“  
آغا جی کی بے جلال لڑک دار آواز نے کمرے کے سکوت کو پاش پاش کر دیا۔

”جی آغا جی وہ دراصل کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ بیسیوں بہانے سوچ کر آئے تھے کہ آغا جی ان سے مل جائیں گے مگر اب جموٹ کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

”رحمن! کچھ چھپانے کی کوشش کر ہے ہو ہم سے۔“ آغا جی غصے میں کھڑے ہو گئے۔

”نہیں آغا جی وہ دراصل بات یہ ہے کہ فرمان ایک پیپر میں مل ہو گیا ہے اس نے کہا تھا کہ تم بتاؤ اس لیے وہ کلیئر کر کے لوٹ آئے گا۔“

دلیل خاصی معقول تھی رحمن کو تو یقین تھا کہ آغا جی اعتبار کر لیں گے۔

”کیوں مل ہوا ہے؟ وہ تو آج تک مل نہیں ہوا۔ پھر اب کیوں ہوا کہیں وہ بہانہ بازی تو نہیں کر آغا جی نے کھوجتی نگاہوں سے رحمن کو دیکھا۔ تو ان کے ہاتھوں میں نئی اترا آئی۔

”جی نہیں آغا جی! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ خود بہت شرمندہ تھا۔ اصل میں وہ بیمار ہو گیا تھا۔ اب پیپر اچھے نہ ہوئے تھے جس کی وجہ سے۔“

”فرمان میرا بچہ بیمار رہا ہے۔ کیا ہو گیا تھا میرے بیٹے کو؟ رحمن اب کیا کیسا ہے میرا بیٹا؟

بی بی جان فرمان کی بیماری کا سن پر پریشان ہو گئیں تو رحمن پھر گڑبگڑائے کہ اب ماں کو مطمئن کیے کے بے قرار دلوں کو مطمئن کرنا کتنی مشکل بات ہوتی ہے۔ اس کا تو ان کو اب اندازہ ہو رہا تھا کہ فرمان نے کہا میں ڈال دیا تھا۔

”کوئی خاص بیمار نہیں ہوا تھا بی بی جان وہ، بس ذرا اٹھنڈک گئی تھی اب تو بالکل ٹھیک ہے۔“

”میں صدقے“ میرا بیٹا پرانے دیس میں اکیلا پڑا ہے۔ کوئی اس کی خبر گیری کرنے ولا نہیں۔

پرچوں کو۔ چلا آتا جانے کیا شوق ہو رہا ہے اسے۔ باہر رہنے کا۔ رحمن بیٹے! اسے فون کر کے کہہ دو کہ تم نہیں چاہیے۔ فوراً چلا آئے۔“ بی بی جان بری طرح تڑپ اٹھی تھیں۔

”صالح بیگم! اس طرح جذباتی نہیں ہوتے۔ اب جہاں اتنا عرصہ گزارا ہے۔ چند روز اور سہی۔

اسے تسبیہ کر دو کہ قاتل تو ایک دن بھی وہاں نہیں رہ سکتا۔“  
”جی بہتر آغا جی بہت بہتر میں اسے خط بھی لکھ دوں اور فون بھی کر دوں گا۔ آپ مطمئن رہے آ

اور بی بی جان آپ دعا کریں۔ اس کے لیے پریشان نہ ہوں۔“  
رحمن والدین کو تو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوئے تھے کہ نہیں البتہ خود مزید بے قرار ہو گئے تھے

داری عبور کر کے جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہونے لگے سامنے سے عالی آ گئی۔  
”آداب بھائی جان!“ عالی نے دھیمی سی آواز میں سر جھکا کر کہا تو رحمن کے قدم جہاں تھے

گئے۔ کلیوں سے زیادہ نازک پھولوں سے زیادہ خوبصورت لڑکی کو فرمان نے ٹھکرا دیا تھا۔ یہ تو کالج کی طرف کرپوں بکھر جائے گی کہ اپنا وجود کھو بیٹھے گی۔ فرمان! تم میں تو اتنا حوصلہ ہے مگر میں اس معصوم لڑکی کو

پاؤں لگا کر جس کی محبت میں تم جس کے نام کی انگوٹھی پہن کر تم نے پلکوں سے۔ جس کے انتظار کی

بہا تھا رکھنے کے سوا۔

”جی جی رہو۔ جیتی رہو۔ رحمن عالی سے لگا ہیں نہ مل پائے فوراً آگے بڑھ گئے۔

عالی کے لیے ان کے چہرے کی تحریر کر پڑھنا آسان نہ تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔  
آج کی رات رحمن پر بہت بھاری تھی۔ اتنی بھاری تو اپنی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے بھی نہیں گزری تھی۔

رحمن نے جموٹ سے دوسروں کو تو کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا مگر خود کو کیسے کرتے۔ مارے ندامت کے وہ سوئی ہوئی سیدہ پر بھی نگاہیں ڈال سکتے تھے۔ اور پھر عالی کا معصوم چہرہ بار بار انکھوں میں گھوم رہا تھا۔ رات کا جانے

کون سا پھر تھا کہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ اٹھ کر کمرے میں ٹھٹھکے لگے پھر بالکنی میں آ گئے۔ فرمان نے ان کو کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا ان کے اعصاب مثل ہو رہے تھے وہ اکیلے ہی اس جگہ میں بس رہے تھے۔

کون تھا جس سے وہ اپنی سوچیں شیئر کرتے۔ اس سے مشورہ لیتے کس طرح اپنے گھر کی طرف آنے والے طوفان کا رخ موڑ دیتے۔ الجھی تھی کا کوئی سراہا تھا نہیں آ رہا تھا۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونک ڈالے تھے کہ ہند

سے دم کھٹنے لگا تھا وہ قیامت کی تباہ کاریاں ابھی سے دیکھ رہے تھے وہ تو کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے سیدہ کی آنکھ کھل گئی رحمن کو یوں پرینک سے ٹیک لگائے دیکھ کر وہ گھبرا گئیں اور تیزی سے ان کی طرف بڑھیں۔

”رحمن کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟

سیدہ پریشانی سے بولیں تو رحمن چونک کر مڑے۔

”ارے نہیں سیدہ طبیعت بالکل ٹھیک ہے میں ٹھیک ہوں تم فکر نہ کرو۔“

”اتنے سگریٹ رحمن! کیا بات ہے آپ پریشان ہیں کیا؟“ سیدہ نے ایش ٹرے کو دیکھا جو سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ رحمن گھبراہٹ سے گئے ان کو خبر تھی سیدہ سے چچا نہیں چھڑایا جاسکتا۔

”ہاں میں بہت پریشان ہوں سیدہ! انہوں نے گویا ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔

”کیوں کیا بات ہے رحمن! جس نے آپ کو اس حد تک پریشان کر دیا۔“ سیدہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی پریشان ہو گئیں۔

”کوئی ایسی خاص بھی نہیں بس آفس پر اہم ہے“ رحمن سیدہ سے لگا ہیں کترا گئے۔ وہ اب کیسے بتاتے کہ کیا پریشانی ہے کیا مسئلہ درپیش ہے ان کو۔

”آفس کی پر اہم خبر تو ہے۔“ سیدہ مزید فکر مند ہو گئیں۔

”ہاں سیدہ ایک مسئلہ آنا پڑا ہے۔ دعا کرو۔ وہ سلجھ جائے ورنہ۔“ رحمن نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔  
”رحمن! مجھے تو گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ آپ جاب چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اللہ کا کرم ہے۔ اپنا بڑا

انتہا چھاپے آپ کو جاب کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ آپ کی ضد تھی کہ آپ جاب کریں گے۔ دفتر میں تو ایسے ہی ہوتا ہے لوگ مخالف ہو جاتے ہیں۔ دفع کریں اب بھی جاب کو۔“

”نہیں سیدہ! یہ تو حالات سے فرار ہو گاناں اور پھر دفع کرنے کے باوجود میری جان نہیں چھوٹ سکتی۔“

”رحمن آپ، آپ آغا جی کو، لقمان، یسین بھائی کو بتائیں ناں۔ اکیلے کیوں لڑ رہے ہیں۔“

”نہیں سیدہ! ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ پہلے میں خود لڑنا چاہتا ہوں ورنہ پھر بتانا ہی پڑے گا آخر میں اکیلا کہاں تک مقابلہ کر سکتا ہوں۔“



”رحمان ایک گہرا سانس لے کر صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔ سیدہ بھی کشن گود میں رکھے ان کے پاس چہرے کی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ رحمن اٹھ بیٹھے۔“

”سیدہ تم میری تیاری رکھنا شاید مجھے امریکہ جانا پڑے اسی سلسلے میں۔ میں اپنی ہر کوشش کر کے دیکھتا ہوں امید تو کم ہے۔ شاید وہ مان ہی جائے اور طوفان ختم جائے آنے سے قبل۔“

رحمن گہرے لہجے میں اچھے الفاظ بول رہے تھے، سیدہ کی کچھ باتیں نہیں آ رہا تھا بس پریشان ہو رہی تھی۔  
”تو کیا معاملہ اتنا گڑبڑ ہے کہ آپ کو امریکہ جانا پڑے گا۔“

”ہاں سیدہ میری کامیابی کی دعا کرنا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس امتحان میں کامیاب کر دے۔“  
رحمن گاؤں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے پھر رحمن تو شاید سو گئے تھے مگر باقی کی ساری رات سیدہ

آنکھوں میں کاٹ دی وہ رحمن کی اس پریشانی کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ جو اس قدر سخت تھی کہ انہیں رحمن کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ خدا سے دعا میں کرنے لگیں، رحمن تھا ہی اس آگ میں جل رہے تھے۔ فرمان

اپنی قسم دی تھی کہ کسی اور کو خبر نہ کریں انہوں نے رحمن کو چاروں طرف سے باندھ رکھا تھا وہ ابھی رحمن کو سمجھا چاہتے تھے کہ اس روز آفس میں پھر فرمان کا فون آ گیا رحمن الجھ کر رہ گئے۔

”بھائی جان! آپ اب تک خاموش کیوں ہیں؟ جواب دیں مجھے۔“ فرمان بے قراری سے پوچھ رہے تھے۔

”فرمان! تم اتنے جذباتی تو کبھی نہ تھے۔ مجھے کچھ مہلت تو دو سوچنے کے لیے۔“ رحمن کے لہجے میں چارگی تھی۔

”میری زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے اور آپ سوچنے کی مہلت مانگ رہے ہیں۔ بس میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“  
آپ مجھے اپنا فیصلہ سنائیں۔ بعد میں، میں اور میرا کام۔“ فرمان نے انتہائی ضدی لہجے میں کہا تو رحمن مرنے

بیٹھ گئے۔  
”فرمان تم صرف جذباتی ہو رہے ہو اور کوئی بات نہیں۔ فرمان خدا کے لیے سوچ لو نظر ثانی کر ڈالو۔“

فیصلے پر کچھ بات نہیں بنے گی۔“  
”نظر ثانی کا مطلب ہوتا ہے، پیچھے مڑ کر دیکھنا اور میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لیے بھائی

پتھر کا ہونا نہیں چاہتا۔ میں جینا چاہتا ہوں، اپنی چاہت کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔“  
فرمان کے لہجے میں ضد کے ساتھ بغاوت کی بو بھی تھی۔ سب کچھ گزر ار نے کی چٹکی تھی۔

”فرمان تم ایسے تو نہ تھے تمہیں اس لڑکی کا ذرا خیال نہیں آ رہا۔ جس نے بچپن سے آج تک تمہارے

کے علاوہ دوسرا نام سنا ہی نہیں کیا۔ یہ اس بے گناہ لڑکی کے ساتھ زیادتی نہیں؟“  
”تو میں اس بے گناہ لڑکی کو کب چھوڑ رہا ہوں۔ وہ تیار ہو جائے تو میں اسے ہمیشہ خوش رکھوں گا۔“

میری وہی شرط ہے۔ میں مریم کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ عالی سے بات تو کر کے دیکھیں میرا خیال مان جائے گی۔“  
یہ فرمان نے یونہی کہہ دیا تھا ان کو یقین تھا عالی ہر گز اس بات پر تیار نہیں ہوگی۔ وہ دست بردار

”اچھا فرض کرو، عالی یہ بات مان بھی جاتی ہے مگر آغا جی یہ قطعی پسند نہیں کریں گے فرمان لوٹ آؤ خدا کے لیے لوٹ آؤ۔ قیامت ہی تو آ جائے گی تمہیں آغا جی کا اچھی طرح پتا ہے۔ وہ۔ وہ۔“

رحمن کی ہر ممکن یہی کوشش تھی کہ وہ فرمان کو باز رکھ سکیں باوجود اس کے کہ وہ ذاتی طور پر فرمان کے حامی تھے۔

”رحمن بھائی یوں بھانے کیوں بنا رہے ہیں۔ آپ نہیں آنا چاہتے یا نہیں آ سکتے تو صاف کہہ دیں میرا کوئی

زور تو ڈی ہے۔ آپ لوگوں کو اپنی خوشی عزیز ہے ناں۔ میں خواہ تمام عمر روتا ہی رہوں۔ ٹھیک ہے آپ آنا نہیں چاہے اور مریم کے والدین آپ کے بغیر ہاں نہیں کریں گے۔“ خیر نہ آئیں آپ بھی لیکن بعد میں روئے گا

بھی نہیں اگر میری خوشی پوری نہیں ہو سکتی تو میں واپس نہیں آؤں گا یہ میرا قطعی اور آخری فیصلہ ہے۔“  
فرمان کے لہجے کی سختی اور ہٹ دھرمی نے رحمن کو بوکھلا دیا۔

”ہیلو فرمان! میری بات سنو۔ اچھا دیکھو، کوئی حماقت مت کرنا۔ میں کوشش کرتا ہوں آنے کی۔“  
رحمن جلدی سے ہارے ہوئے لہجے میں بولے کہ وہ فون بند کر کے کوئی حماقت نہ کریں۔

”رحمن بھیا! آپ نے عالی سے بات کی تھی اس سلسلے میں؟“ فرمان سرد لہجے میں پوچھ رہے تھے۔  
”نہیں ابھی تک تو نہیں۔“

”کیوں نہیں کی؟ میرے لیے ایک ایک ہل بھاری ہے بھیا! اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ابھی نہیں کی۔ بھیا

میں نے آپ کو ہر بات اس لیے بتادی کہ آپ بھی ان کیفیات سے گزر چکے ہیں۔ اس لیے آپ میرے درد کو سمجھ سکتے ہیں مگر آپ ہی ناصح بن گئے ہیں تو۔“ بھیا آپ عالی طرف تھے کہ آپ نے قربانی دے دی مگر میں خود میں اتنا

حصول نہیں پاتا کہ مریم کو سونہرے پاؤں گا۔“  
فرمان بے بس ہو گئے تھے وہ واقعی مریم کے بغیر خود کو ادھورا سمجھتے تھے اسے کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے

تھے۔ اور رحمن بھی پریشان تھے۔ اس سچویشن کو سنبھالنا ان کو بہت مشکل لگ رہا تھا۔  
”فرمان! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پہلے عالی سے شادی کر لو پھر وہاں جا کر مریم سے کر لینا۔ آغا جی کو نہ

بتا دیا جائے۔ میرے خیال میں تو یہ صورت بہتر ہو سکتی ہے۔“  
”انجھنوں کی تاریکی میں یہ خیال جگنو بن کر چکا تو وہ جلدی سے بولے۔“

”پہلیے میں ایسا ہی کرنے کو تیار ہوں۔ آپ پہلے عالی سے اس سلسلے میں بات کر لیں۔ تاکہ جب آغا جی کو

اصل صورت حال معلوم ہو تو عالی بات کو سنبھالے۔ مجھے یقین ہے وہ ہر گز انکار نہیں کرے گی۔ میری خوشی کی

ناظر وہ سب کچھ قبول کر لے گی۔“ فرمان کے لہجے میں اعتماد ہی اعتماد تھا۔ عالی یہ سب جان لیتی تو اپنی چاہت

انہیں سب کچھ اس اعتماد کی نذر کر دیتی۔

”بھونہ فرمان عالی کی محبت نے کتنا اعتماد بخشا ہے تمہیں۔ اور تمہاری بے حسی نے اس سے انتظار کا حق بھی

محرم کیا۔“ رحمن یہ بات صرف سوچ کر رہ گئے کہ نہ پائے۔

”اچھا فرمان! یہی ہی تمہاری ضد ہے تو میں پہلے عالی سے بات کرتا ہوں۔ مجھے بھی یقین ہے تمہارے

احد کی ناؤ ڈوبے گی نہیں بلکہ ساحل مراد حاصل کرے گی۔“

”آمین۔ آمین خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔ بس آپ اب دیر نہ کریں آج ہی عالی سے بات کریں

میں دو روز بعد آپ کو پھر فون کروں گا اچھا خدا حافظ بھائی جان۔“

فرمان نے تودل کی گہرائیوں سے آئین کہتے ہوئے فون رکھ دیا تھا مگر رجن ریسور کو اب بھی خالی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کو فرمان کے رویے پر دکھ ہو رہا تھا۔ فرمان کو عابی تو کیا کسی کا بھی خیال نہیں۔ والدین انہوں نے ذکر بھی نہیں کیا پھر وہ اپنے زمانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ وہ بھی اس حد تک جذباتی ہو گیا کہ گھر چھوڑ دینے کو تیار تھے۔ مگر اب ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ عابی سے بات کرتے۔ وہ جو دیوانگی کی بجائے فرمان کو چاہتی چلی آ رہی ہے۔ اس کی چٹکیں پر جلتے انتظار کے دیپ کیونکر بجھائیں گے مگر وہ اچھے ہوئے رہے۔ فرمان کی محبت ان کی دی ہوئی دمکی یہ سب باتیں ان کو بہت پریشان کر رہی تھیں۔ یہ جتنی کہ وہ اپنی پریشانی شیر بھی نہیں کر سکتے تھے کسی سے، سوچ سوچ کر ان کے دماغ کی رگیں بھی پھٹنے لگیں۔ دونوں ہاتھوں سے سر دبانے لگے۔

”رجن لائیے، میں دبا دوں۔ کیا بہت درد ہے؟ آپ پریشان بھی تو بہت رہنے لگے ہیں دفع کریں۔ کو اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے۔ آپ کو جواب کی ضرورت ہی کیا ہے۔“

”کاش سیدہ یہ جاب چھوڑی جاسکتی۔ سیدہ اب تو حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ پیچھے گڑھا اور آگے ہے۔ بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔“

”آپ آغا جی سے، بھائیوں سے مشورہ کیوں نہیں کرتے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ بہتر رائے دیں۔“

”نہیں سیدہ! لگتا ہے کہ امریکہ جانا ہی پڑے گا۔ معاملے کو سلجھانے کی پوری کوشش کروں گا ورنہ مجبوری کیا کر سکتا ہوں۔“

رجن نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔ سیدہ گہری نیند سوچکی تھیں مگر رجن سپاٹ بے خواب آنکھوں آسمان پر تاروں کو دیکھ رہے تھے اور خود میں ہمت پیدا کر رہے تھے کہ عابی سے بات کس طرح کریں۔ یہ فکا کر خشکی کے باد جو ان کے ہاتھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ اتنے مضبوط مرد تھے مگر ان میں اتنی طاقت نہیں ہو پا رہی کہ ایک چاہنے والی کے انتظار کے دیپ بجھا دیں۔ یا اس کو یہ بتائیں کہ تم جس کی محبت کی آگ میں اب تک رہی ہو وہ تمہیں کسی دوسری لڑکی کے صدقے میں اس کے کہنے پر قبول کر رہا ہے۔ مگر بات کرنا بھی تم تھا۔ کیونکہ اگلے روز فرمان نے پھر فون کرنا تھا اور پھر وہ کیا جواب دیتے۔ مشکل تو یہ بھی کہ وہ کسی کو بھی غلطی سے فون کرے فرمان کو بھی حق بجانب سمجھ رہے تھے۔ قصور تو کسی کا نہیں تھا مگر ان کو معلوم تھا کہ سزا سب کو ملنے والی انہوں نے ایک نظر گہری نیند سوئی سیدہ پر ڈالی اور سلیپر پہن کر آسکتی سے باہر آ گئے۔ ان کے اور بچوں کمروں کے درمیان ایک راہ داری حائل تھی۔ جو اتنی طویل تو نہ تھی کہ یہ فاصلہ صدیوں پر محیط ہو جاتا اور ان کے پاؤں من من کے بھر کے ہو جاتے۔ عابی کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کئی بار ہاتھ کانپتے آتی رات کے کمرے میں جانا انہیں اتنا مناسب بھی لگ رہا تھا۔ مگر مجبوری تھی یہ ہی ایک وقت تھا جس میں وہ عابی سے کر سکتے تھے۔ ان کے لرزاتے ہاتھوں کی ہلکی دستک تھی۔ عابی نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا اور اسے اٹھی دل میں دوسرے جنم لینے لگے کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ رجن نے جب سے رومان نکال کر صاف کی اور پھر دستک دی تو اسی وقت دروازہ کھلا گیا۔ رجن کو پس پریشانی حال میں دیکھ کر عابی کا دل اٹھا۔

”بھائی جان آپ خیریت تو ہے نا؟“ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔

”ہاں گڑیا! میں اندر آ جاؤں۔“ رجن کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آئی دوسروں کے ناگ بھن بھلائے عابی کی طرف بڑھے تو اسے دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ رات کے اس پہر رجن اس کے کمرے میں آنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

”بھیا! اس وقت اتنی رات گئے؟“ گھبراہٹ کے مارے عابی کے لبوں سے بات نہیں نکل رہی تھی وہ یوں ہی دروازے پر بازو پھیلائے آنکھوں میں خوف کے لرزاں سائے لیے کھڑی تھی۔

”ہاں عابی! اس وقت اتنی رات گئے۔ اس لیے کہ گڑیا رات کا سیزن سنسنی کی طرح وسیع ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی قیامت کو بڑے سے بڑے طوفان کو اپنے دامن میں اس طرح چھپا لیتی ہے کہ ہونے والی حرکتی کریمیں یہ نہ جان پائیں کہ رات کے سینے میں کیا کچھ دفن ہے۔ مجھے اندر آنے دو عابی۔“

دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ بولتے رجن نے عابی سے پھیلے بازو ایک طرف کر کے دروازہ بند کر دیا۔ عابی وحشت زدہ نگاہوں سے ان کو دیکھے جا رہی تھی۔ رجن نے ایک نظر اس کو دیکھا تو ان کا جی چاہا اس کو مل سی لڑکی کو کوئی دکھ دینے والی بات نہ بتائیں اور فرمان کو اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیں۔ انہوں نے گہرا سانس لیا اور عابی کی طرف بڑھے تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔

”تمہاری یہ گھبراہٹ یہ پریشانی بھابھ عابی! مگر آج میں تم سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ کہنے کے لیے میرے پاس الفاظ ہیں نہ ہمت مگر عابی بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو تسلیم کرو نہ کرو وہ اپنی جگہ حقیقت ہی رہتی ہیں۔ قیامت کی جاہ کار یاں کتنی ہی سخت کیوں نہ ہوں ان کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔“ رجن اپنے پاس وہ الفاظ نہیں پار رہے تھے۔

”میں۔ میں سمجھ نہیں پا رہی بھیا! عابی کی گھٹلی گھٹلی سی آواز سکوت کو مرتعش کر گئی۔

”میں اب تک نہیں سمجھ پایا تو۔ خیر عابی آج تم میری چچا زاد بہن ہو، نہ میں تمہیں اپنی بیوی کی بہن سمجھ کر بات کروں گا آج میں ایک باپ بن کر اپنی بیٹی سے بات کروں گا۔ ہاں عابی تم میری بیٹی ہی تو ہو۔ چھوٹی بہنیں بیٹیاں ہی ہوتی ہیں گڑیا۔“

”میرا دم گھٹ جائے گا بھیا! آپ جو کہنا چاہتے ہیں۔ جلدی سے کہہ ڈالیے۔ آپ کی بات کی تمید ہی سے آنے والے طوفان کی شدت کا اندازہ ہو رہا ہے۔“ عابی پھٹ پڑی۔

”تو پھر دل تمام لو عابی بات معمولی نہیں ہے۔ رجن دوسری طرف رخ موڑ کر کھڑے ہو گئے تو عابی نے واقعی دونوں ہاتھوں سے دل تمام لیا خود کو کسی بڑی بات کے لیے تیار کرنے لگی۔

”وہ بات شاید خیر فرمان کی موت کی نہ ہو تو باقی سب قبول ہے، سب گوارا ہے بھیا! اعتبار کریں۔“ عابی کے منہ سے الفاظ بچتے پانی کی طرح بہہ گئے زندگی میں پہلی بار۔ کسی کے سامنے اس نے یوں فرمان کا نام لیا تھا۔ اور اب اس کی ساتیں کسی منحوس خبر کے لیے تیار تھیں۔

”تو پھر سنو عابی کہ۔“ الفاظ ایک بار پھر حلق میں اٹک گئے۔

”بھیا یوں قطرہ قطرہ زہر مت اڑھیلیں ایک ہی بار گوں میں اندھیرا بھر دیں۔“

عابی سمجھتی تھی کہ بات کوئی ایسی ہی ہے اسی لیے وہ خود کو جانکشی کی کیفیت میں محسوس کر رہی تھی۔

”مریم۔ ہاں عالی مریم۔ فرمان کی زندگی میں شدید محبت بن کر داخل ہوئی ہے، اور وہ حیثیت اختیار ہے کہ فرمان کی رگ جان ہو گئی ہے، وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور وہ کہہ رہا ہے کہ۔“  
 رخصت ہو کر رہے تھے لب تو دل رہے تھے، مگر عالی کی ساتھیوں مظلوم ہو کر رہ گئی تھیں۔ دل کی ہستی میں پر  
 آندھی چلی تھی۔ سب ہی کچھ تہہ دہالا ہو گیا تھا۔ وہ تو خزاں رسیدہ بچے کی طرح بے وقعت ہو کر ڈول رہی  
 ۔ درد تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ وہ صوفے پر گرتی چلی گئی۔ رخصت بن دیکھے بھی اس ہستی نا تو اس پر نونہا  
 قیامت کے اثرات دیکھ رہے تھے۔ ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ مڑ کر اسے دیکھتے جو ہاتھ کی گھرائیوں میں  
 جا رہی تھی۔

”عالی خدا گواہ ہے میں اس قدر نادام ہوں کہ تمہاری طرف دیکھنے کی سکت بھی نہیں رکھتا مگر عالی یہ بھی  
 ہی جانتا ہے کہ میں کس قدر ڈسٹرکٹ ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو وہ خود کو ختم کر سکتا  
 دوسری بات اس نے یہ کی ہے کہ مریم کہتی ہے کہ اگر تم پسند کرو تو فرمان پہلے تم سے شادی کرے اور بعد میں  
 سے، مریم کا خیال ہے کہ تم دونوں بہت اچھی دوستوں کی طرح فرمان کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی ہو، فرمان بھی  
 ہی کہتا ہے کہ اگر تم تیار ہو جاؤ تو فرمان آ کر تم سے شادی کرنے کو تیار ہے، بعد میں مریم سے۔ عالی میری بھو  
 فیصلے کے لیے آزاد ہو جاؤ جو چاہو فیصلہ کرو میں اپنی رائے اور مشورے کی دیوار کھڑی نہیں کرتا چاہتا۔ تم جو چاہو  
 کر سکتی ہو لیکن اگر فرمان کی بات مان لی گئی تو عالی اس طوفان کو روکا تو نہیں جاسکتا مگر اس کی شدت کو کم کر  
 کیا جاسکتا ہے، تم حقار ہو جاؤ جو چاہو فیصلہ کر سکتی ہو یوں انسان لمحوں میں بھی فیصلہ کر سکتا ہے، اور بعض دفعہ تو  
 ہی گزر جاتی ہے، بہر حال تمہارے پاس رات کے دو پہر ہیں تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر جو بھی فیصلہ کر دے گی  
 قابل قبول ہوگا، مجھے تم سے مثبت فیصلے کی توقع ہے، اس لیے عالی کہ چاہنے والوں کے دل بہت بڑے ہوتے  
 ہیں ہر انسان کی زندگی میں ایسے جذباتی موڑ ضرور آتے ہیں۔ جو جذبات کے اس بل صراط کو عبور کر لیتا ہے  
 منزل پالیتا ہے جس امتحان سے میں گزر چکا ہوں۔ وہ آج تمہیں اور فرمان کو درپیش ہے خدائے دونوں کا  
 امتحان سے نکالے دے فرمان کو تم پر اندھا اعتماد ہے۔ اسی اعتماد کے سہارے اس نے کہا ہے کہ تم کوئی مثبت فیصلہ  
 ہی کرو گی میں۔ میں چلتا ہوں عالی! بیٹا تم یہ نہ سمجھنا میں آگ کے اس سمندر میں تمہیں دھکیل کر خود کو نہ  
 سو جاؤں گا میں بھی تمام رات اس کی تش اپنے دل میں محسوس کرتا رہوں گا۔“

بو جھل آواز میں بولتے رخصت کے مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں کہ گزر جانے والی قیامت نے کیا جلا  
 چائی ہیں۔ وہ تو ابلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں ڈال کر ساعت کو مظلوم کر گئے تھے وہ پھرانی بے نور آنکھوں  
 جلتے ہوئے پردے دیکھتی رہی۔ سینے میں دل کی جگہ گویا بے حس و حرکت پھر آن پڑا تھا۔ روح تو رخصت کے ساتھ  
 رخصت ہو گئی تھی۔ اب تو مٹی کا ڈھیر صوفے پر بے جان پڑا تھا۔ جس میں اب اتنی جان بھی نہیں تھی کہ درد و آزار  
 بند کر لیتی چاروں طرف سے گھٹا ٹوپ اندھیروں نے گھیر لیا تو عالی کا دم گھٹنے لگا۔ درد سوا ہو گیا تو وہ چیخ اٹھی۔ جی  
 کیا کہ گئے تھے رخصت یہ ہوائیں کیا سرگوشیاں کر رہی تھیں کہ۔ کہ اس کا فرمان بے وفا ہو گیا اس کی زندگی میں  
 مریم گئی۔ ہاں مریم اس کی بہت مین کراتی مستحبر ہو گئی کہ وہ اس کے طفیل اسے بھی قبول کرنے لگا۔

”نہیں فرمان نہیں تم۔ تم صرف میرے ہو۔ میرے لیے دنیا میں جیسے گئے ہو۔ فرمان۔ خدا کی قسم میں  
 بہت چاہا ہے تمہیں۔ میں۔ میں مر جاؤں گی فرمان لوٹ آؤ صرف عالی کے بن کر۔ کہہ دو یہ سب مذاق ہے۔“

بچپن کے اس مذاق کی طرح جو تم اکٹرا کیا کرتے تھے بعد میں ہنس دیا کرتے تھے۔ ہاں فرمان تردید کر دو۔ رخصت بھیا  
 کی بات کی، کہہ دو انہوں نے غلط فہمی ہے جھوٹ کہا ہے۔ نہیں یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اپنی عالی سے بے وفائی  
 کر دو جس کا عشق اب جنوں کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ فرمان۔ فرمان۔ کون ہے وہ ناگن مریم جس نے میرے  
 زمرانوں کو ڈس لیا ہے، فرمان کیا میرے جذباتوں میں اتنی بھی پائیداری نہ تھی کہ تم پر اثر انداز ہو سکتے نہیں فرمان  
 مت تو جین کر میری پائیزہ چاہت کی قسم سے میں مر ہی تو جاؤں گی۔ نہیں میں تمہیں مریم کے لیے آزاد نہیں چھوڑ  
 سکتی۔ فرمان تم پر صرف عالی کا حق ہے، مریم کون ہوتی ہے، تمہیں مجھ سے چھیننے والی میں تمہیں ہر حق سے محروم کر  
 سکتی ہوں اس لیے کہ میرے آغا جی میری ڈھال ہیں۔ میں۔ میں فرمان کو تم سے چھین لوں گی میں تم جیسی ناگن کو  
 ختم کر ڈالوں گی ہاں۔ ختم۔“

عالی نے بال نوچ لیے چوڑیوں سے بھری کلاٹیاں دیوار سے دے ماریں۔ ٹوٹا ہوا کالج رگوں کو چیرتا  
 مڑ رہا تو دیواروں کے لہو میں رنگ گیا ایسا جنوں سوار ہوا کہ اس نے سارا کمرہ تہہ بالا کر دیا۔ اس کے اختیار  
 میں ہوتا وہ ساری دنیا کو ہنس نہ سکتی تھی۔ کراہنے لٹنے کی خبر دے کر دیتی۔

”نہیں مریم ہرگز نہیں میں تمہیں اپنے ارمانوں کو ٹوٹنے کی اجازت نہیں دوں گی میں چھین لوں گی فرمان  
 کو، فرمان پر صرف میرا حق ہے تم کیا جانو مریم، عالی کی اس گھر میں کیا حیثیت ہے، میرے ایک اشارے پر  
 فرمان میرے ہو سکتے ہیں لیکن لیکن یہ کیسے ہوا میں نے تو فرمان کو دل کی بہت عین گھرائیوں میں چھپا رکھا تھا۔ کسی  
 اور نے کیسے اسے پالیا کیسے۔ کیسے مریم کی رسائی فرمان تک ہوئی کیوں کر ہوئی۔“

اس نے زور سے سر میز سے ٹکرایا تو میز کا کوتا پیٹانی کو زخمی کر گیا مگر آج ہر زخم دل کے زخم سے مات کھا  
 گیا ہر درد دل کے درد کے سامنے بے وقعت ہو گیا۔ کیا تم تھا کہ وہ اس قیامت میں اکیلی گھری تھی۔ کوئی بھی اس  
 کے دکھوں میں شریک نہ تھا۔ جنوں میں اس نے جانے کیا کچھ توڑا کہاں کہاں چوٹ آئی۔ کہاں سے خون بہا  
 اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ وہ بے دمی ہو کر بستر پر آگری۔ بند کھڑکی کے شیشوں میں اماؤں کی رات جھکتے تارے اس  
 کی بے بسی پر فوج کھنکھاتے تھے۔ کسی رات آئی تھی کہ جس۔ اس کی زندگی میں تاریکیاں پھیلا دی تھیں۔ عالی کے  
 انہوں میں فرمان کی تصویر آگئی جس میں منگنی کے بعد فرمان مسکرا رہے تھے صرف شفاف چہرے پر کتنا نور کتنی  
 مصیبت تھی۔

”فرمان یہ کیا کر دیا آپ نے! خدا کی قسم بہت چاہا ہے آپ کو، کیا میرے جذبے اتنے بے اثر تھے کہ ان  
 کی تپش آپ تک نہیں پہنچ پائی۔ میں اکیلی ہی عشق کی منزلیں طے کرتی اس موڑ پر پہنچ گئی ہوں جہاں سے واپسی کا  
 کوئی راستہ نہیں لکھا کتنے کھنکھاتے ہیں آپ فرمان۔“

کتنا چاہا ہے ذرا غور تو کر

اتنے تو ہم اپنے بھی طلبگار نہ تھے

”اوہ مریم تم میری محبت لوٹ کر مجھے ہی خیرات دے رہی ہو اپنی محبت کا صدقہ اتارنا چاہتی ہو، بھیک دینا  
 چاہتی ہو تم مجھے نہیں تمہیں نکال کر دوں گی فرمان صرف میرے ہیں۔ ہاں صرف میرے۔“ وہ دونوں  
 کانوں ہاتھ رکھ کر اتنی زور سے چلائی جیسے مریم کو سنانا چاہتی ہو پھر وہ نیچے میں سر دے کر جسم خشک بن گئی۔

”فرمان آپ نے بہت ستم ڈھایا ہے نہ کیا ہوتا ایسے نہ میرے ارمانوں کا خون اپنے سر لیا ہوتا فرمان“

فرمان کا نام ٹیس بن کر قلب حزیں میں بیوست ہو رہا تھا۔ رات کی تاریکی اسے زخم زخم کرتی سحر کی طرز بڑھ رہی تھی۔ اور درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ عالی بے حال ہو چکی تھی۔ وہ چور چور تھی موزن نے اللہ اکبر کہہ کر مسلمانوں کو جگایا تو عالی لڑکھرائی ہوئی اٹھی وضو کیا اور خدا کے حضور گر گئی۔

وہ سجدے میں گری تڑپتی رہی سر اٹھایا تو ایک گوند سکون سا، پہلو میں اتر آیا مگر آپس لب سوزاں پہاڑ تڑپ رہی تھیں۔ ساری رات ہی تو ہو گئی تھی بے وفا کی آگ میں جلنے ہوئے، اب تو کچھ بھی باقی نہیں تھا انکھوں کی موسلا دھار بارش بھی اس آگ کو کھٹکا نہیں کر پاتی تھی۔ سحر کی کرنیں پھیل رہی تھیں اور گزر جانے والی رات اپنے دامن میں ایک بڑی قیامت کو چھپا کر لے گئی تھی، جس کی جابجائی سے صرف عالی آشنا تھی اور زخم زخم ساری رات گزر گئی تھی مگر وہ تو کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اور اسے معلوم تھا۔ رخصت اس کا فیصلہ سننے پہنچ جائیگا تو وہ کیا جواب دے گی۔

”سوری فرمان۔ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اس لیے کہ آپ میرے ہیں آپ پر صرف میرا حق ہے نہ کوئی کتنی خوش نصیب ہے مریم نہ صرف آپ کی چاہتوں کی حقدار نہ تھی بلکہ آپ کی زندگی کی ضمانت بھی بن گئی تھی میں تم سے تمہاری ساری خوشیاں چھین لوں گی اس لیے کہ فرمان پر صرف میرا حق ہے ہاں صرف میرا حق ہے۔ جارا حانہ سوچوں نے ہمت دی تو عالی کا نقد قلم لے کر بیٹھ گئی ہاتھ لرزتے رہے دل کا خون قلم سے ٹپک کر کا جگر کا شمار ہوا۔ ”خدا حافظ میرے فرمان“ مگر چیرتا ہوا آخری جملہ کا نقد پر ثبت ہو گیا انکھوں کی برسات سے تڑپا جگہ سے بگڑ گئی تھی۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹپک لگائے ابھی بھی جسم اٹک رہی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک تو اس نے جلدی سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس کو معلوم تھا رخصت ہوں گے، پھر بھی ان کے سامنے کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی پیشانی کے زخم کو آنکھوں نے چھپا لیا زخمی کلاٹیاں البتہ راز دل کہہ رہی تھیں۔

”آجائیں بھیا!“ بھئی آواز کی لرزش رخصت۔ سہجی نہ رہ سکی وہ اس کے سامنے آ گئے۔

”ان آنسوؤں کو مت چھپاؤ مجھ سے عالی! میں تو تمام رات ان کی تپش میں جلتا رہا ہوں۔ دل کھول کر اپنی بے نصیبی پر، یہ تو آنے والی قیامت کی ابتدا ہے بیٹے، جس نے فی الحال مجھے اور تمہیں بے قرار کیا ہے اور بھر کے رو۔

رخصت نے اسے ساتھ لگایا تو ان کے اپنے بے شمار آنسو عالی کے ریشمی بالوں میں جذب ہو گئے اور عالی بے حال ہو گئی رات سے کسی ہمدرد کا شانہ چاہیے تھا جس کے ساتھ لگ کر وہ اپنے لٹ جانے کا سوگ منائی تھا کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ عالی اپنے اس مہربان سے بھائی کے سامنے پھیل گئی جو ہر رشتے سے اسے تھے کافی دیر بعد وہ راز سنبھلی تو الگ ہو کر چہرہ صاف کرنے لگی۔

”رخصت بھیا! فیصلہ تو رات ہی کو ہو گیا تھا مگر۔“ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے کہ حلق میں پھر آنسو گولا اٹک گیا۔

”ہاں کہو عالی مجھے یقین ہے تم نے یقیناً کوئی مثبت فیصلہ کر لیا ہو گا یہاں بیٹھ کر اطمینان سے مجھے رخصت نے اسے شانوں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھالیا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئے۔

”بھیا! فیصلے سے آپ کی مراد اگر مریم کی بات مان لینا ہے تو یہ مجھ سے نہیں ہو سکا میں نے فرمان مریم کو سوچ دیا ہے آپ۔ آپ فرمان سے کہہ دیں کہ وہ مریم کو اپنا لیں میں میں!“ بے شمار آنسوؤں کا سیلاب بند توڑتا ہوا رخساروں پر پھیل گیا۔

”لیکن عالی تم۔“

”یہ جذبوں کی جنگ تھی بھیا اور میدان میں کوئی جیت جاتا ہے اور کوئی ہار جاتا ہے اور میں یہ جنگ ہار گئی ہوں اور ایک اچھے حریف کی طرح اپنی ہار تسلیم کر کے جیت کا سہرا مریم کے ہر باندھنا چاہتی ہوں میں تو خود مریم کے جذبوں کی صداقت کی قائل ہو گئی ہوں جن میں اتنی پاکیزگی اتنی صداقت تھی کہ انہوں نے فرمان کو جیت لیا۔ اور پھر جب قدرت مریم کے ساتھ ہے تو میں دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جینے سے روکنے والی کون ہوں میں ان کی چاہتوں ان کی عنایتوں اور خوشیوں میں حصہ دار بننے کا حق نہیں رکھتی آپ وہاں جائیں اور ان دونوں کی شادی کر دیں بھیا!“

وہ کسی کمپیوٹر کی طرح بے سوچے سمجھے بولے گئی۔ حالانکہ گزری شب کی کسی ساعت میں بھی اس نے ایسا نہیں سوچا تھا کہ وہ فرمان سے دست بردار ہو جائے گی کہ وہ تو فرمان کو مریم سے چھین لینے کا عزم رکھتی تھی۔ یہ پھر کیا ہو گیا کہ مریم آپ ہی آپ جیت گئی اور اس نے مریم کی جیت تسلیم بھی کر لی تھی۔

”عالی ایک ہاں پھر سوچ لو تم بہت بڑا فیصلہ کر رہی ہو۔ تمہیں شاید آنے والی قیامت کا اندازہ نہیں۔ سوچ لو میری بہن پھر سوچ لو۔“ رخصت نے عالی کی طرف دیکھا جو پرسکون تھی کسی قافلے کے اس اسیر کی طرح جس کی تمام متاع لٹ جاتی ہے تو اسے مزید کسی چیز کے لٹ جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ پرسکون ہو جاتا ہے اور عالی کے پاس بھی لٹا دینے کو کچھ نہیں بچا تھا اس لیے پرسکون تھی۔

”نہیں بھیا! مت تو ہن کریں آپ میری، جو میرا کبھی بھی نہیں ہو سکا نہ ہونا چاہتا ہے تو میں اتنی گری ہوئی نہیں ہوں کہ خود کو اس پر مسلط کر دوں۔ ان کو زبردستی مقید کر لوں اور مریم کی بخشی ہوئی بھیک کو آنکھوں سے ہٹا کر سر پر سجالوں، فرمان پر پہلا حق میرا تھا اور جب میں ان کو جیت نہیں سکی تو جو جیت گئی ہے، اس کی خوشیاں کیوں پال کر دوں۔ مجھے فرمان اور مریم کا فیصلہ قطعی منظور نہیں۔ میں۔ میں فرمان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں بھیا آپ جائیں، ان دونوں کی خوشی پوری کر دیں پلیز۔“

عالی پھر رخصت کے ساتھ لگ کر رہ پڑی تو وہ ایک گہرا سانس لے کر اس نازک سی لڑکی کو دیکھ کر رہ گئے۔ جس نے اپنی قوت برداشت سے بڑھ کر فیصلہ کر ڈالا تھا۔

”اچھا بیٹا جیسے تمہاری مرضی خوش رہو۔“ رخصت نے اس کے آنسو صاف کیے اور ہاتھ نکل گئے۔

”ہونہ ختم رہوں۔ فرمان کے بغیر فرمان کو کھو کر تو خوش رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا فرمان آپ سدا خوش رہیں۔ ایک ٹوٹا ہوا دل یہ ہی دعا دے سکتا ہے۔“

وہ جانے کب تک وابستہ غم رہتی کہ سیدہ آگئیں، مگر بے ترتیب عالی یوں دل گرفتہ سی، ان کے دل پر چوٹ پڑی، وہ تڑپ کر آگے بڑھیں۔

”عالی کیا بات ہے، کیا ہوا یہ سب کس نے کیا ہے او، اور یہ تم پریشان کیوں لگ رہی ہو۔“

آج کی عالی کل کی عالی سے قطعی مختلف تھی جسم و جان آنکھیں زندگی کے نور سے عاری شدت گریہ سے



اور بے خوابی سے سوچ رہی تھیں سیدہ نے اس کا چہرہ چم لیا۔

”کچھ نہیں آیا، رات کو بڑی شدت سے طوفان آیا تھا تاں سب کچھ جا کر گیا۔“ وہ نیم بے ہوشی میں بولا۔  
”کیسا طوفان کوئی طوفان نہیں آیا تھا اور۔ اور یہ زخم کیسے ہیں۔ کیسے آئے ہیں۔“

سیدہ نے وحشت زدہ نگاہوں سے اس کی پیشانی اور کلائیوں کے زخموں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”بہت گہرے زخم ہیں آپ اب بھی نہ بھرنے والے بہت جان لیوا اور، اٹھ رہا ہے آپ۔ آپ مجھے درد کے سمندر سے نکالو ورنہ میں ڈوب جاؤں گی آپ۔ آپ۔“

وہ ماں جیسی بہن کے گلے لگ کر پھٹ پڑی وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پریشان ہو رہی تھیں۔ اس کے یہ زخم حالت کرے گا جاڑ پین ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

”عابی! میری جان! کچھ تو بتاؤ۔ کیا ہوا ہے؟ کیسے یہ زخم آئے ہیں، کمرہ اٹکا کیوں ہو رہا ہے۔“ انہر نے اس کی زخمی پیشانی پر ہلکی ہلکی تھپتھپائی تو دل کا غبار کم ہونے کے باعث وہ سنبھل گئی۔

”سوری آپ! آپ کو ناحق پریشان کر دیا وہ رات کو سرد کا پھر دورہ پڑا تھا تاں تو۔ مجھے خود پر اختیار نہیں۔ سب کچھ تہہ بالا کر کے رکھ دیا میں نے، چوڑیاں ٹوٹ گئیں تو زخم آ گئے اور یہ پیشانی بھی اس طرح زخمی ہو گئی۔ شکستہ لہجے میں زخموں کی وضاحت کر رہی تھی مگر سیدہ اصل وجہ تک نہیں پہنچ پائی تھیں۔

”عابی تو تم نے کسی کو بتایا کیوں نہیں، اتنی تکلیف خود ہی برداشت کرتی رہیں؟“  
”تکلیف تو مجھے تھی، یہ درد کا دیکھنا مجھے تمہاری محسوس کرنا ہے تو میں دوسروں کو بے آرام کیوں کروں آپ۔“

”آغا جی سے کہتی ہوں، تمہارے اس درد کا کوئی مستقل علاج کرا نہیں۔“  
”نہیں آپ! پاسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں کسی علاج کی ضرورت نہیں بعض مرض لا علاج ہوتے ہیں۔

کی دوا کی جائے تو بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور اب تو میں ٹھیک ہوں بس کمزوری ہے ذرا آپ فکر مند نہ ہوں۔ وہ دل سے اٹھتی ٹیسوں کو دباتی ہوئی بولی۔ ان ٹیسوں کو تو اب تمام عمر ہی سہنا اور دیا تھا۔



رحمن افسردگی سے بیٹھے تھے آفس کے کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا اسی لیے وہ آفس کے ایک کونے کی فیرویل پارٹی میں بھی شریک نہ ہوئے تھے دل بہت بوجھل ہو رہا تھا، اسی وقت فرمان کا فون آ گیا اس کا نام نہیں چاہ رہا تھا فرمان سے بات کرنے کو۔

”ہیلو بھائی جان! آپ نے عابی سے بات کی تھی۔“ فرمان کے لہجے سے بے چینیاں عیاں تھیں۔  
”ہاں کی تھی۔“ رحمن گھیسر لہجے میں بولے، مزید بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

”سمجھتا! پھر اس نے کیا کہا؟ آپ تو سکون سے سوچ رہے ہیں اور میرے دل پر قیامت گزر رہی ہے۔“ فرمان جلدی سے سنتا چاہتے تھے عابی نے کیا کہا ہے، ان سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔

”اپنے دل پر گزرنے والی قیامت کا بڑی جلدی احساس ہو گیا تھیں۔ دوسروں کے دلوں پر جو قیامت ٹوٹ گئیں ان کا تمہیں کچھ احساس نہیں۔ بہر حال عابی نے فیصلہ مریم کے حق میں دے دیا ہے، وہ تم سے بدتر

بردار ہو گئی ہے اور میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا تیار ہو تو مکمل ہے، بس آفس کے چند کام ختم آ جاؤں گا۔“

”اچھا بھیا! جلدی آنے کی کوشش کیجئے گا۔ میں بے چینی سے آپ کا منتظر ہوں گا۔ خدا حافظ۔“  
فرمان نے جلدی کی تاکید کر کے فون بند کر دیا تو رحمن کے دل پر چوٹ کی پڑی فرمان کتنا بے حس ہو گیا تھا کہ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ عابی نے یہ فیصلہ کیا کس طرح ہے، کس طرح ٹوٹ کر نکھری ہے وہ کیا قیامت ٹوٹی ہے اس، اپنی محبت کسی اور کے حوالے کرتے ہوئے کیا گزرتی ہے فرمان تم اس امتحان سے گزرتے تو پتا چلتا۔ رحمن نے آفس کے کام کی وجہ سے امریکہ جانے کا اعلان کر دیا تھا لہذا گھر میں کوئی اور وضاحت نہیں کرنی پڑی۔ البتہ بی بی جان خوش ہو گئی تھیں۔

”بیٹا! اب فرمان کو ساتھ لے کر ہی آنا۔ اب تو آنکھیں ترس گئی ہیں اس کی صورت کو دیکھنے کے لئے۔ اس لئے بیٹا اسے ساتھ لے کر آنا ورنہ تو وہ بہانے ہی بنتا رہتا ہے۔“

”جی بی بی جان! اگر وہ فارغ ہوا تو ہم ساتھ ہی آ جائیں گے۔ دعا کریں میں جس کام سے جا رہا ہوں وہ ہو جائے۔“

”رحمن آپ اس قدر پریشان ہیں، مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں جانے کیوں، آپ چھوڑ دیں یہ جاب۔“ سیدہ کو نہ مرنے نہ مرنے کا دم سہا رہا تھا۔

”ہاں سیدہ! اب یہ ہی کرنا پڑے گا اگر معاملہ سنبھل نہ سکا تو۔“  
کبھی کبھی تو رحمن کی طرح غمراہ جاتے، وہ اکیلے اس طوفان میں گھرے ہوئے تھے، ان کی یہ خواہش اور

کوشش تھی کہ زندگی کی رشتوں کی یہ بنا ڈوب نہ جائے، ساحل مراد حاصل کر لے جس کی امید نہ ہونے کے برابر تھی۔ عابی کو دیکھتے تو جی چاہتا فرمان کو کھینچ لائیں۔ دوسری طرف فرمان کو بھی حق بجانب سمجھ رہے تھے، جس رات وہ جا رہے تھے عابی نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھایا۔

”یہ یہ فرمان کو دے دیجئے گا۔ رحمن بھیا اور تو کچھ نہیں دے سکتی مگر فرمان اور مریم کے لئے بہترین مستقبل کی دعا تو دے سکتی ہوں تاں۔“ مجھے فرمان سے کوئی شکوہ نہیں بھیتا آپ۔ آپ ان کی شادی کر کے آئیے گا۔ میں

تو اس بات پر خوش ہوں کہ کسی کو تو منزل ملی۔ اور بھیتا فرمان کو روکنے یا سمجھانے کی کوشش مت کیجئے گا۔ کیونکہ جاننا ہے پلٹ آنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو پھر روک کر بھرم توڑنے سے بہتر ہے، بھرم ہی رہنے دیا جائے، اور مجھے بھی خوشیوں کی بجائے غم نہیں چاہئے بخشی ہوئی زندگی سے موت بہتر ہے۔ خدا حافظ بھیتا۔“

اس سے قبل کہ وہ پھل کر بہہ جاتی وہ اندر آگئی بالکل خالی ہاتھ تھی داماں واپس لوٹ آئی اب تک تو انتظار کے سہارے جی رہی تھی، اب تو فرمان نے وہ آس بھی چھین لی تھی اب کیا رہ گیا تھا اس زندگی میں۔



فرمان رحمن کے آنے کی خبر سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ ارا مانوں کو دلہن بنانے کی آس زندہ ہو گئی تھی۔ مریم کے خیالوں میں کھوئے فرمان کو یہ گمان تک نہ گزرتا کہ وہ لڑکی جو انہیں بچپن سے دیوانگی کی حد تک چاہ

رہی ہے۔ اس نے اپنی موت کا فیصلہ کیا مگر کیا ہوگا جدائی کی صلیب پر کس طرح اپنی ناتمام تہنوں کو چڑھایا ہوگا، ان کو یہ سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ آج رحمن نے آنا تھا اور فرمان کی خوشی قابل دید تھی مس سوزی نے پہلی بار

ان کو اتنا خوش دیکھا تھا۔  
”مس سوزی آج میں بے حد خوش ہوں، میرے بھائی آ رہے ہیں۔“

”ہوں مسٹر فرمان! میں سب جانتی ہوں بھائی کے آنے کے خوشی اس لئے ہو رہی ہے مگر وہ آکر تو شادی بنائے گا ٹھیک ہے ہاں“ مس سوزی مسکرائیں تو فرمان جھینپ گئے۔ انہیں پورٹ جانے سے پہلے نے مریم کو گون کر دیا تھا۔

”ہیلو مریم! بھائی جان آ رہے ہیں، تیار ہو جاؤ اسی بیٹے میں دہن بنا کر لے آؤں گا خدا حافظ۔“

”تو یہ ہے فرمان تو بہت ہی بے صبر ہے ہو رہے ہیں۔“ ڈھیر ساری شرم نے مریم کو آن گھیرا تو وہ سپنوں میں کھو گئی۔

”بھائی جان! آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، میں تمام عمر نہیں اتار سکتا آپ نہ آتے تو میرا مان ڈر جاتا۔“ فرمان کتنی ہی دیر رخصت کے گلے لگ رہے۔

”تم غلام بھی تو اتنے ہو کہ ستم ڈھاتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ دوسرا سے برداشت بھی کر پائے گا اگر ایسا دمکلی دیا جی کہ سب کچھ ٹھکانا ہے۔“ رخصت کے محبت بھرے لہجے میں محبت کے ساتھ شکوہ بھی تھا ڈاکٹر۔

”یہ صرف دمکلی نہیں تھی بھیا آپ نہ آ کر دیکھتے، کیا ہوتا۔“

فرمان گھبر بولتے ہوئے بولے ان کو اپنی خوشی میں یہ جاننے کی بھی فرصت نہیں تھی کہ رخصت کے ڈاکٹر میں کیا عروسی ہے۔ پھر دونوں بھائی تمام رات جاگتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ رخصت نے ایک ناکامی پھر کر دیکھی۔

”فرمان! اتنا جذباتی فیصلہ نہ کرو لوٹ آؤ۔ کچھ باقی نہیں بچے گا۔“

”میری واپسی میری موت کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ بھیا منظور ہے تو۔“ فرمان کے لہجے میں ڈاکٹر کی سی سختی تھی، رخصت ہار گئے۔

”اچھا بتاؤ، کیا کرتا ہے مجھے، کون لوگ ہیں وہ؟“

”بھیا! وہ کوئی غلط لوگ نہیں ہیں میرا انتخاب بہترین ہے۔ مریم میری ہم مذہب ہے، ہم وطن ہے خاندان سے ہے۔ پھر آپ۔“

”تم تو بچوں والی بات کرتے ہو فرمان یہ تمام باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر عالیٰ نہ ہوتا تو کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔“

”میں سب سمجھتا ہوں بھیا! اگر مریم میری زندگی میں نہ آتی تو مجھے بھی عالیٰ سے انکار نہیں تھا مگر بھیا میری واپسی ممکن نہیں۔“ وہ اٹل لہجے میں بولے۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری خوشی، یہ خط عالیٰ نے تمہارے لئے دیا ہے۔“ رخصت کبل اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگے تو فرمان خط لے کر آتش دان کے قریب آ کر بیٹھ گئے فرمان سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو کس نام سے پکاروں کیا رشتہ دوں۔ کیونکہ رشتہ میں نے جوڑ لیا تھا، وہ تو کچا دھا کا ثابت ہوا ٹھٹ گیا۔ آج میں آپ سے وہ باتیں کرنا چاہتی ہوں فرمان

وہ اقرار کرنا چاہتی ہوں جو اگر آپ کو بالائی تو تمام عمر نہ کرتی۔ فرمان میں تو خود نہیں جانتی تھی کہ میں جو آپ کی خطائیں اپنے نام لکھواتی ہوں تو کیوں؟ اس کے پیچھے کیا طاقت ہے اور جب اس بات کا شعور آیا تو میں عشق کی اس منزل پر تھی کہ جہاں پانا اور کھانا اہمیت نہیں رکھتے۔ مجھے آپ سے اور مریم سے کوئی شکوہ نہیں شکایت نہیں، یہ تو جذبات کی جنگ تھی جس میں مجھے مات ہوئی اور میں نے اسے قبول کر لیا ہے اس لئے مریم جی کر آج جب میں فرمان کو آپ کے سپرد کر رہی ہوں تو مجھے فرمان کو کھونے کا اتنا دکھ نہیں جتنا اس بات کا غم ہے کہ میں آج تک ایسے جذبات کی آبیاری کرتی رہی جن میں کوئی صداقت نہ تھی کوئی پاسنداری نہ تھی۔ اس آگ میں اتنی بھی تپش نہ تھی کہ اتنے قریب رہے والے فرمان کے جذباتوں پر بھی برف پگھلا سکتے۔ میں تو آپ کے جذباتوں کی قائل ہو گئی ہوں جنہوں نے فرمان کو اس حد تک دیوانہ بنایا ہے کہ وہ آپ کے بغیر جینا نہیں چاہے۔ آپ تو ان کی زندگی کی ضمانت بن گئی ہیں۔ مریم جی۔ اپنی اور فرمان کی زندگی میں شریک ہونے کی دعوت دے کر آپ ہر بازی جیت لیتا چاہتی ہیں۔ لیکن تمہاری سی تو میرے بھی نام کر دیں ناں۔ آج اگر وقت مجھے یہ اختیار دیتا تو مریم مجھے بھی اپنے طرف کی بلندی خاطر کرنے کا موقع مل جاتا لیکن خبر آپ کو آپ کی جیت مبارک اور اس پیشکش کا شکر یہ لیکن میں آپ دونوں کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ جو میرا کبھی بھی نہیں تھا۔ میں اس پر حق کیوں جتاؤں، ہر کسی کو حق ہوتا ہے۔ وہ اپنی پسند کی زندگی پسند کے ساتھی کے ساتھ گزارے، میں آپ دونوں پر مسلط ہونا اپنی تو بہن سمجھتی ہوں، ایک طرف ہی کسی محبت کی ہے۔ میں نے فرمان سے، میں اپنی محبت کی تو بہن۔ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ دونوں کوئی زندگی مبارک ہو۔ اچھی امیدوں سے شادی کریں۔ میں آپ دونوں کی محبت بھری زندگی کے لئے دعا گو ہوں گی۔ فرمان یہ سب ہرگز نہ کہتی مگر۔ یہ سب اس لیے کہہ ڈالا کہ نبھانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے اور آپ کی امانت بھی لوٹا نہ سکوں۔ آج پر سکون ہوں۔ خدا کرے آپ مریم کی سنگت میں ہمیشہ خوش رہیں۔ آمین۔ خدا حافظ فرمان۔“

”عالیٰ عالیٰ تم تو ہار کر بھی جیت گئی ہو۔ لیکن عالیٰ خدا گواہ ہے میں نے دانستہ کچھ نہیں کیا۔ تمہارے جذبے مجھے نہیں جیت سکے اور مریم کی کم عمری کی سنگت جیت گئی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں، مجھے معاف کر دینا۔“ غلامت کے احساس سے فرمان کی ساری خوشی ماند پڑ گئی۔ یہ خط انہوں نے مریم کو تھا دیا تو مریم خط پڑھ کر رو پڑی۔

”عالیٰ میں تو اپنی نظروں میں آپ ہی گر گئی ہوں، تم تو ہار کر بھی ہر بازی جیت گئی ہو فرمان آپ لوٹ جائیں اتنی اچھی لڑکی کھونے کے قابل نہیں۔“

”کب میں لوٹ بھی جاؤں تو وہ مجھے قبول نہیں کرے گی مریم! میں اس لڑکی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”جب اس حد تک اسے جانتے ہیں تو تو فرمان آپ اس کی محبت کے سحر سے کوئی بچ گئے۔“

”بس بس تمہارے وہ مات کھانسی ہے مریم! جذباتوں پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔ یہ تو آزاد چھٹی ہوتے ہیں۔ اپنی

کا آغاز کریں، رخصت بننا اسی لئے آئے ہیں۔“

”کاش میں عالی کے لئے کچھ کر سکتی۔“ مریم لڑکی تھی اسے عالی کے دکھ کا پورا احساس ہو رہا تھا۔ جب کبھی بھی اس نے یہ سوچا کہ فرمان اس سے چمن جائیں گے تو اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ حالانکہ زہر کیسے پیا ہوگا۔

رجن جس کام کے لئے آئے تھے اسے جلد از جلد کر کے واپس جانا چاہتے تھے، اس سلسلے میں صاحب کے ساتھ ظہیر صاحب کے ہاں باقاعدہ رشتہ لے کر گئے۔

”چچا جان آپ کی شرط تھی کہ فرمان کے گھر سے کوئی آئے تو جب آپ ہاں کریں گے۔ میں فریادیں بھائی ہوں، باپ کی جگہ ہوں۔ اس لئے میں آپ سے التماس کروں گا کہ آپ مریم کو ہماری بیٹی بنادیں۔“ کو عجیب سا لگ رہا تھا کہ تمام بزرگوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کو یہ کردار ادا کرنا پڑ رہا تھا۔

”رجن بیٹے! فرمان بیٹی کی تربیت اور خوبیوں ہی سے لگتا ہے کہ آپ لوگ کتنے اچھے خاندان کے ہیں مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی اس گھر کی بہو بنے گی۔“ ظہیر صاحب رک گئے۔

”دیکھو بیٹا! ہماری اکلوتی بیٹی ہماری تمام خوشیوں اور چاہتوں کا واحد مرکز ہے، ہمیں اس رشتے سے نہیں مگر دکھ اس بات کا ہے میری بیٹی ایسے گھر جا رہی ہے جہاں بہت سی نفرتیں اور مخالفتیں اس کا استقبال کریں گی۔“ ظہیر صاحب کو یہ دکھ تھا کہ ان کی بیٹی کی ناقدری ہو رہی ہے، مخالفتوں میں جا رہی ہے۔

”آپ کا کہنا بھی بجا ہے خالہ جان! میں وقت سے پہلے کسی بات کی ضمانت بھی نہیں دے سکتا۔ آپ قدر اچھے ہیں۔ یقیناً آغا جی کو بے حد خوشی ہوئی۔ اس خاندان سے تعلق قائم کر کے لیکن جیسا کہ آپ جانتے کہ ہماری کزن عابدہ، ذوق فرمان کی گھٹتی ہے، لیکن فرمان نے اس سے شادی سے انکار کر دیا ہے تو ہم کو فرمان اور مریم کو ان کی پسند کی زندگی گزارنے دیں۔ یہ دونوں اس وقت تک آپ کی شفقتوں کی چھاؤں رہیں گے جب تک وہاں کا موسم ان کے موافق نہیں ہو جاتا، رہا فرمان کا سوال تو یہ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”ظہیر صاحب اور بھابھی صاحبہ اب سوچ بچار میں زیادہ وقت نہ لیں، رخصت میاں کو واپس بھی جائے کوئی مناسب تاریخ دیکھ کر رسم نکاح ادا کر دیں۔“

رجن نے اختر صاحب کو اشارہ کیا تو انہوں نے نکاح کی بات شروع کر دی۔

”اچھا رجن میاں اب تم اتنی دور سے آئے ہو تو ہمیں ہر بات منظور ہے۔“

”شکر ہے چچا جان مہربانی کہ آپ نے فرمان کو اپنی فرزندگی میں قبول کر لیا ہے۔“

پھر مبارک سلامت کے شور میں تاریخ بھی طے ہو گئی۔ مسود اور محمود نے فرمان کو چھین چھین کر باک کر دیا تھا۔ اور وہ جھینپے جا رہے تھے۔

”اب سمجھے یہ امریکہ میں آکر پڑھنا تو فقط بہانا تھا اصل مقصد تو مریم کو پانا تھا۔“ مسود نے لہو فرمان کے منہ میں غلوںس دیا۔ پھر رجن مریم سے ملنے گئے تو اس نے شمال میں خاک لیا۔ مارے حجاب کے وہ ان کو سلام بھی نہ کر پائی۔

”مبارک ہو مریم خدا کرے تم دونوں سدا خوش رہو، فرمان سے کوئی بھی شکایت ہو تو فوراً مجھے خالہ دوکانوں میں سرکردوں کا گارے بھی تم روکیوں رہی ہو۔“ رجن اس کی بچکیوں کی آواز سن کر اس کے سامنے

”جیسا! آپ جانے میرے بارے میں کیا خیال کریں کہ میں کیسی لڑکی ہوں۔ جس نے فرمان کو سب سے مار کر دیا۔ یقیناً جانے بھیا میں، میں۔“

”تم ایسی لڑکی ہو مریم کہ کوئی بھی لڑکا سب کچھ کر سکتا ہے تمہارے لئے بس اگر درمیان میں وہ مسئلہ نہ ہوتا تو جنہیں پتا چل جاتا کہ ہم وہ جوہری ہیں جو میرے کی پہچان بھی رکھتے ہیں اور قدر بھی اتنی کرتے ہیں کہ سر پہ تاج میں چاہتے ہیں تم نے ایسی بات کیوں سوچی بیٹا! فرمان کو کبھی کوئی معمولی چیز پسند نہیں آئی اور تم معمولی چیز ہو سکتی ہو جو فرمان کی پسند ہی نہیں، اس کی زندگی بن گئی ہو۔ واہموں میں نہ پڑو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو گئے گا۔ آسو پوچھ لو مریم۔“

اور پھر رجن نے خود ہی اس کا چہرہ صاف کر دیا۔ تو وہ سکون ہو گئی۔ مقررہ تاریخ پر فرمان کی محبت دلہن بن گئی۔

”آؤ خوش آئید مریم! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس دلہیز کو پار کرانے کے لئے تمہاری ساس تمہاری بلائیں آہوئی آگے بڑھتی اور ہمیں بھابھی بھابھی کہہ کر چھین تیں غار ہوتیں، مگر بد قسمتی سے میں ہی اب سب کچھ سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

فرمان نے بڑھ کر مریم کا استقبال کیا مس سوزی نے اور بیگم اختر نے ان کا جملہ عروسی تیار کیا تھا۔

”مریم! آج میں کس قدر خوش ہوں کوئی میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ محبت یوں دلہن بن کر میری زندگی میں آ جائے گی۔“ مریم کا گھونگھٹ اٹھائے فرمان اس کے خیرہ کر دیئے اس حسن میں کھوئے ہوئے تھے۔

”مریم۔ تم۔ تم چپ کیوں ہو، کوئی بات کرو ملن کا کوئی گیت گاؤ کیوں اُداس ہو، کیا بات ہے۔ مریم تم کیوں نہیں ہو۔“

فرمان کی محبت پر مریم نے آنکھیں کھول کر فرمان کو دیکھا یہ احساس کتنا لطیف تھا کہ خوب صورت سا بچہ والا شخص اس کا ہو چکا ہے۔

”جو خوشی میری زندگی ہو۔ فرمان میں اس پر خوش نہ ہوں گی لیکن یہ سوچ رہی ہوں انسان کی زندگی میں کبھی کبھی کوئی بڑی خوشی آتی ہے، وہ اپنے ساتھ دکھ کا ایک پرسوز احساس بھی لے کر آتی ہے، انسان کو ہر دکھ احساس سے پاک خوشی کیوں نہیں ملتی آج۔ آج میں خود کو عالی کا مجرم تصور کر رہی ہوں، وہ کیا سوچتی ہوگی کہ۔“

”ہاگ رات کے سارے خواب عالی کی وجہ سے بیک گئے تھے۔“

”اس بات کا مجھے بھی احساس ہے مریم! مگر دیکھو ناں! اس میں ہمارا قصور بھی کیا ہے۔ یہ ہوتا ہی ہے وقت میں ہر کوئی خوش نہیں رہ سکتا اور پھر میں تمہیں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں اگر ہمارا ملاپ نہ بھی ہوتا تو عالی سے شادی نہ کرتا۔ اس لئے مریم کو میں خود کو اس کی اتنی پاکیزہ محبت کے قابل نہیں سمجھتا۔ اب تو یہ ہی ہے تمام مراحل کے احسان سہلے بے ہیں۔“

مریم۔ میں۔“

باہر سے کسی دھماکے کی آواز آئی تو دونوں چونک گئے۔



ساتھ رونے لگی تو رحمن اُنھ کو اس کے قریب چلے آئے۔

.....! میں بہت بُری ہوں۔ میری وجہ سے آپ کے گھر میں اتنا انتشار پیدا ہوا ہے۔ میں بہت شرمندہ

ہوں۔“ ”آرے مریم! اتنی بکھدار ہو کر بچوں والی باتیں کر رہی ہو۔ یہ تو قدرت کے فیصلے ہوتے ہیں اور ان فیصلوں کو ہم انسان رد نہیں کر سکتے ہیں۔ بس یہ ضرور ہے کہ اپنی کم ظرفی کی وجہ سے کھلے دل کے ساتھ اسے قبول نہیں کرتے۔ آغا جی سخت بھی ہیں اور اصول پرست بھی۔ لیکن، عالی والہ مسئلہ نہیں ہوتا تو انہیں پسند کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔“

البتہ اب وہ کسی صورت اس شادی کو قبول نہیں کریں گے۔ تم حلال نہ کرو۔ کبھی نہ کبھی تو برف پگھل ہی جائے گی۔“

”بھائی جان آپ مجھے لے چلیں۔ میں آغا جی کے قدموں میں گر کر بھائی مانگ لوں گی۔“

”نہیں مریم! تم نہیں جانتیں کہ وہاں کیا قیامت آئی ہے۔ پہلے میں حالات کا جائزہ لے لوں پھر کچھ سوچوں گا۔ فرمان! مریم میری بہن ہے، میری بیٹی ہے۔ اس کو ہمیشہ خوش رکھنا۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

رحمن خود بھی جانتے تھے کہ ان کچھ کھلی تیلیوں سے کسی کو بہلایا نہیں جاسکتا۔ رحمن کو اکیلے اس طوفان کا سامنا کرنا تھا۔ جہاز میں بھی رحمن سوچ رہے تھے کہ کسی طرح بتائیں گے۔ جیسے جیسے فاصلے سن رہے تھے، گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ٹیکسی گھر کے میں گیٹ پر رکی تو پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ کیونکہ بتانا تو ہر صورت میں تھا۔ ان کو اکیلا دیکھ کر بی بی جان کا دل کچھ گھبرا گیا اور جب رحمن نے لرزتی آواز میں فرمان کی شادی کا دھماکا کیا تو سارے کمرے پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کوئی آواز نہ نکلی۔ یوں جیسے الفاظ بھاپ بن کر اڑ گئے ہوں۔

آغا جی کی اپنی لاشی پر گرفت اتنی مضبوط ہو گئی کہ خون رسنے لگا۔ چہرہ محض ضبط سے سرخ پڑ گیا۔ بی بی جان قریب قریب بے ہوش ہو چکی تھیں۔ سیدہ بیگم کو یوں لگ رہا تھا جیسا بھی دم گھٹ جائے گا۔ آغا جی لرزتے قدموں سے اٹھے اور رحمن کی طرف بڑھے۔ رحمن کا خلق خشک ہو گیا۔

”جس میں یہ سب شروع سے معلوم تھا ناں؟“ آغا جی کی بھاری آواز نے کمرے کو لرزادیا۔

”نہیں تو آغا جی۔“ رحمن نے خشک حلق کوڑھ کر تے ہوئے کہا۔

”مجھوت مت بکورو رحمن! ہمیں تو اسی وقت کھٹکا ہوا تھا، جب تم نے اچانک امریکہ جانے کا کہہ دیا تھا۔“

آغا جی کے جلالی سے سب کا پتہ گئے۔

”آغا جی وہ..... وہ اس نے مجبور ہی بہت کیا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں نہ آیا تو وہ خود کشی کر لے گا۔“

”تو مر جانے دیا ہوتا۔ ایسی ناخلف اولاد کا مرجا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مجھے شک ہی نہیں یقین تھا کہ وہ اتنی کمزوری کی حدود کو ضرور چھوئے گا۔ مر گیا فرمان آج سے ہم سب کے لئے۔“

”خدا کے لئے آغا صاحب! ایسا نہ کہیں اسے معاف کر دیں۔“ بی بی جان تڑپ کے آگے بڑھیں۔

”سوال نہ پیدائیں ہوتا صالح بیگم! اولاد مجھے اپنے اصولوں اور وعدوں سے عزم نہیں۔ وعدہ بھی ان

فرمان گھبرا کر باہر نکلے۔ دیکھا مس سوزی بیڑھیوں سے گری بے ہوش پڑی تھیں۔ فرمان ان کے پاس اسپتال گئے۔ ٹریٹ منٹ کے بعد گھر لے آئے۔ مس سوزی فرمان سے شرمندہ ہو رہی تھیں کہ ان کی سہاگ رات خراب ہوئی۔

”کوئی بات نہیں مس سوزی! خدا کا شکر ہے آپ کو کوئی سیریس چوٹ نہیں آئی۔ ہم تو گھبراہٹ میں تھے۔“ فرمان نے کہا۔

رحمن کو بہت دن ہو گئے تھے۔ اب وہ واپسی کی تیاری کر رہے تھے اور خود کو آئندہ آنے والے لمحے لئے بھی تیار کر رہے تھے۔ مریم بہت اچھی لڑکی تھی۔ اتنے سے دنوں میں ان کی اتنی خدمت کی کہ ان کے میں ہوتا وہ اسے بڑے اعزاز کے ساتھ لے کر جاتے مگر ان کو معلوم تھا مریم ایک دھماکا ثابت ہو گیا۔ اسے ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہیں کرے گا۔

”پھر فرمان آئندہ کے لئے سوچا ہے تم نے؟“ رحمن نے سوچوں میں گم فرمان کو دیکھا۔

”میں نے کیا سوچنا ہے بھئی! آغا جی کا فیصلہ تو مجھے معلوم ہے۔ وہ اب مجھے کسی صورت معاف نہیں کرے گا۔ بی بی جان تو ماں ہیں۔ بیٹے سے لگا ہی لیں گی۔ باقیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال کوشش کریں کہ بہتری کی کوئی راہ نکل آئے۔“

”پھر تم کیا پاکستان آؤ گے؟“

”میں آپ کے جواب کے فوراً بعد آ جاؤں گا اور اگر آجی نے معاف نہ کیا تو یہیں رہوں گا۔“

”جس میں کچھ احساس ہے، بی بی جان تمہاری یاد میں کس طرح تڑپتی ہیں۔ تمہاری خدائی کی گناہ گن کر کاٹی ہیں۔ انہوں نے۔ اب ان کو تمہارا انتظار ہے کہ تم میرے ساتھ آؤ گے۔ ارے مریم تم بھلا ہو۔ کیا بات ہو گئی۔“

مریم جو بڑی دیر سے خاموشی کے ساتھ دونوں بھائیوں کی باتیں سن رہی تھیں، اچانک عیاں



کے ساتھ جو اپنی اولاد کو میری جھولی میں ڈال کر دل میں حسرتیں لئے چلے گئے۔ صالحہ بیگم بے سحر لوم بیٹوں کو ختم دیا تھا۔ چوتھا تھا ہی نہیں۔

”آپ باپ ہیں۔ آپ اس قسم کے مسئلہ نہ فیصلے کر بھی سکتے ہیں اور برداشت بھی کر سکتے ہیں۔ میں ہوں۔ میں اپنے فرمان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ آغا صاحب خدا کے لئے رحم کریں میری مستاجر پر رحم کریں۔ ماں کی مستاجر اصول پرست باپ کی عدالت پر رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔

”صالحہ بیگم! میرے فیصلے حتمی اور اٹل ہوتے ہیں۔ یہ تم جانتی ہو۔ اس عمر میں تم نے اس ناممکنہ خاطر ہونا ہے تو میرے طرف سے اجازت ہے۔ تم اپنے بیٹے کے پاس رہ سکتی ہو لیکن یاد رکھو، پھر تمہارا گھر اور بچوں سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔“

”آغا جی نے مضبوط لہجے میں اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ ان کی اس بات پر یلین احمد اور لقمان احمد چاہتے تھے مگر اس وقت آغا جی کا جلال عروج پر تھا۔ کسی کی مجال تھی کہ اونچی سانس بھی لے۔ اس کے بعد جی، رجنن کی طرف بڑھے۔

”اب تم یہ بتاؤ، تمہیں اتنا اختیار کس نے دیا کہ تم میرے بغیر اپنا بڑا فیصلہ کرو۔“ آغا جی کا ہاتھ غلامی مگر پھر بشکل پیچھے آگیا۔

”میں..... آپ کا گناہ گار ہوں آغا جی! مجھے اس گستاخی کو سزا ملنی چاہیے آغا جی۔ اس نے عالی شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی بات نہ ماننے کی صورت میں خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ میں انتہائی پر تھا۔ میرے لئے اتنا بڑا فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ آغا جی اس نے اتنا مجبور کیا تھا اور کہا تھا کہ کسی کو نہ بتاؤں۔ رجنن کسی بچے کی طرح ڈرے سبے اپنی صفائیاں پیش کر رہے تھے۔

”اور تم اتنے سعادت مند ہو کر اس کا حکم ماننے چل گئے۔ والدین کا تو وجود ختم کر دیا تم دونوں نے آغا جی کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔

”آغا جی! ٹھیک ہے۔ فرمان نے گستاخی کی ہے مگر لڑکی بڑے سا مجھے پاکستانی خاندان کی ہے۔“ کوئی ضرورت نہیں اس لڑکی کے حسب و نسب کے بارے میں بتانے کی۔ وہ کسی شاعری خاندان سے بھی کرتا۔ مجھے تب بھی ناقابل قبول ہوتی۔ ارے میری عالی میں کیا کی تھی کہ اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ معصوم سعادت مند بچی، میں کس طرح نکال چکا ہوں! اس کا اس کے سامنے۔ ارے فرمان! میں بھی مجھنا دیتا ہوں کہ تم بھی اولاد کے صدمے اٹھاؤ۔ تم نے میرا سر جھکا دیا۔“

بیٹے کی بددعا کیں دیتے ہوئے آغا جی کی آواز کانپ گئی۔ وہ بستر پر گرے گئے۔

”نکل جات میرے کمرے سے سب لوگ۔ تمہا چھوڑ دو مجھے آج میرا بیٹا مر گیا ہے۔ مجھے تمہارا جنازہ چلے جاؤ۔“

آغا جی کے حکم پر سب باہر چلے گئے۔ مگر میں واقعی ایسے سوگ کی سی کیفیت تھی جیسے ابھی ابھی کسی اٹھایا گیا ہو۔ بی بی جان اپنے کمرے میں بے حال ہو رہی تھیں۔ سیدہ بیگم نے الگ رجنن کا دامن پکڑا دیا۔

”رجنن! آپ نے کس جنم کا بدلا لیا ہے مجھ سے۔ یہ بھی وہ پریشانی؟ کتنا ڈراما کیا ہے رجنن! آپ نے آپ کو بھائی عزیز لکھا۔ میری معصوم بہن آپ کی کیا لگتی تھی کہ آپ کو اس کا درد ہوتا۔ رجنن کتنے غلام

مجھے کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ آپ بھائی کے ساتھ کیا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ فرمان خدا تجھے کبھی خوش نہ کرے۔ رجنن! آپ کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آپ نے مجھے بہت برا دھوکا دیا ہے۔ میری معصوم بہن کس گناہ کی سزا دی گئی ہے۔ وہ تو اسی بے وفا کے نام کی مالا جیتی رہتی تھی۔ کس ناگن نے میری بہن کی رانوں پر ڈاکا ڈالا ہے۔ اس چیل کو خدا کبھی معاف نہ کرے۔“

سیدہ تڑپ رہی تھی اور رجنن سر جھکائے تادم کھڑے تھے۔ سیدہ مسلسل مریم کو کوس رہی تھیں۔ جس نے ان کی بہن کی خوشیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

”میری عالی یہ صدمہ کس طرح برداشت کر پائے گی۔ میرا بس چلے تو اس چیل کا خون کر دوں جس نے میری معصوم بہن کی خوشیاں لوٹی ہیں۔“

رجنن نے بتایا نہیں کہ وہ اس ہل صراط سے گزر چکی ہے۔ وہ چاہتے تھے اچھا ہے دل کی بھڑاس نکال دے۔

”رجنن! آپ نے میری زندگی کے ساتھی ہو کر تباہی وادھوکا دیا ہے مجھے میں آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ میں کبھی نہیں۔ آپ کو کیا خبر کہ میری عالی فرمان کو دھوکا لگائی کی حد تک چاہتی ہے۔ اس کا کیا بنے گا۔ وہ تو مر جائے گی۔ میری بہن کی خوشیاں لوٹنے والی چیل، خدا تمہیں کبھی کوئی خوشی نصیب نہ کرے۔“ سیدہ مسلسل بے گناہ مریم کو کوس رہی تھیں۔ جو بالکل بے خبر تھی اس بات سے۔

”مجھے تو گھر بھر ہی اس سازش میں شریک لگتا ہے۔ جو ہنگامہ آغا جی نے اب کھڑا کیا ہے، اسے واپس لانے کے لئے کرتے، اسے سختی سے حکم دیتے تو کیسے نہ وہ آتایا اس کی جرأت ہوتی کہ وہ ان کے ختم سے سرتابی لگتا۔ یہ سب کی بھگت ہے، ڈراما ہے۔ میرے سامنے سرخرو ہونے کے لئے درندہ۔“

”سیدہ تمہیں آغا جی کے متعلق ایسی باتیں سوچنے ہوئے شرم آتی چاہئے۔ انہوں نے تم دونوں بہنوں کی خاطر اولاد کو عاق کر دیا۔ ان کی خوشیاں قربان کر دیں۔ تم بھی ان کی طرف سے بدگن ہو۔ ٹھیک ہے۔ میں تصور دار ہوں۔ مجھے تم جو چاہو کہہ سکتی ہو مگر آغا جی کو کیوں الزام دیتی ہو۔ جنہوں نے بیٹا تک قربان کر دیا۔“

رجنن اتنی دیر سے سیدہ کی باتیں ان کا حق سمجھ کر برداشت کر رہے تھے۔ سیدہ نے آغا جی کے غلوں پر شبہ کیا تو وہ چپ نہ رہ سکے۔ سیدہ مسلسل روئے اور بولے جا رہی تھیں۔

”دیکھو مانا کہ یہ بہت زیادتی ہے۔ فرمان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تمہا مگر اب۔“

”فرمان نے تو جو کرنا تھا رجنن کر لیا مگر..... مگر جو آپ نے کیا۔ میں اسے نہیں بھول سکتی۔ آپ ان میرے اعتماد کو پکڑنا چور کر دیا ہے۔ رجنن! خدا کی قسم بہت مان تھا مجھے آپ پر، بہت بھروسہ تھا۔ آپ نے تو میرا بزم عشق تو زبیا ہے رجنن۔“

”سوری سیدہ۔ بخدا تم میری شکست اور مجبوری کا اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ ایک طرف سب کا خوف تھا۔ دوسری طرف بھائی کی زندگی۔ میں کیا کرتا۔ وہ کتنا ضدی ہے، اتنا تو تمہیں بھی پتا ہے۔ مجھے مجبوراً یہ سب کرنا پڑا۔“

”نور! دیکھو، یہ جو بندھن ہوتے ہیں، آسمانوں پر ملے ہوتے ہیں۔ جس کے ساتھ لکھا ہو، ہو جاتا ہے۔ انسان اگر خود اسامند ہو جائے تو معاف کر سکتا ہے۔ درگزر، معافی وہ فعل ہیں جن سے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ہماری عالی میں خدا کا شکر ہے کہ کسی چیز کی کمی نہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ ہے اس کے لئے۔“

”مگر رحمن! انسان جسے چاہے، وہ ہی نمل سکے تو کتنا بڑا اخلا پیدا ہو جاتا ہے زندگی میں۔“

”ہاں سیدہ وہ غلام میرے اندر بھی ہے مگر.....“

سیدہ کی بات کے جواب میں انہوں نے آہستگی سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”یہ خوشخبری آپ ہی عالی کو سنا ڈالیں۔ مجھ میں ہمت نہیں اسے نکھر تادیکھوں۔“

سیدہ نے کہا تو رحمن جاتے جاتے پلٹ آئے اور سیدہ کو شانوں سے تھام کر بٹھادیا۔

”اسے سب معلوم ہے سیدہ۔“

”کیا..... کیا اسے معلوم ہے؟“ ایک اور دھماکا رحمن نے کیا تو وہ جھج پڑیں۔

”ہاں، فرمان نے سب سے پہلے اسے بتایا تھا اور اس سے رائے لینے کے بعد یہ سب ہوا اور عالی

زبردستی مجھے وہاں بھیجا کہ کہیں تاخیر کی وجہ سے وہ کوئی منفی قدم نہ اٹھائیں۔“

”ہاں میری بہن، میری معصوم بہن۔ تو اکیلی ہی سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ مجھے ہوانہ لگنے لگی

”عالی بہت اونچی چیز ہے سیدہ! وہ ان چھوٹی باتوں سے بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بچی کا مالی

ہو۔ جس حوصلے سے وہ یہ قیامت خیز گئی ہے ناں کوئی اور ہوتی تو شاید گزر گئی ہوتی۔“

حادثہ نیا تھا زخم بھی تازہ اس لئے ہر کوئی کراہ رہا تھا۔ آغا جی نے عالی کو پاس بلا کر اس کے آئے

باندھ دیے۔ تو وہ تڑپ اٹھی۔

”آغا جی۔ خدا کی قسم۔ اب مر گئی ہوں۔ اب بکھری ہوں۔ کسی قدر بد نصیب ہوں میں کہ میرے

میرے باپ نے ہاتھ جوڑ دیے ہیں آغا جی۔ آغا جی ایسا کرنے سے پہلے گولی مار دیتے تو میں سمجھتی آ

میرے والدین سے کیا وعدہ پورا کر دیا مگر اتنی اذیت نہ دیتے۔ میرے مردہ والدین کو اور میری زخمی د

عالی نے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے۔

”میری بچی تمہیں کیا خبر۔ میں کس قدر ماتم ہوں، تجھ سے اور اور تیرے والدین کی روح سے۔“

واقعی تیرے قابل نہیں تھا۔ میری بیٹی اس نے تمہیں ٹھکرا کر تمہاری توہین کی ہے۔ میری توہین کیے۔ تم

تاحیات معاف نہیں کروں گا۔ آغا جی لرزیدہ لہجے میں بولے۔

”آغا جی! فرمان نے مجھے نہیں میں نے فرمان کو ٹھکرایا ہے۔ میں ان اسے اس کے ساتھ کی وہ ایک

کے صدقے میں دی گئی تھی۔ لوٹا دی گئی۔ میں نے ٹھکرایا ہے فرمان کو آغا جی۔“

اور پھر اس نے زخم زخم لہجے میں وہ واردات جو قلب حزیں پر گزری باپ کی طرح مہربان آغا

گو کھنڈا کر دی۔ جسے سن کر ان کو مزید غصہ آ گیا۔ گھر میں سب نے ہی اسے ساتھ لگایا۔ اس کے دکھ

میں محسوس کیا مگر جب سیدہ نے سینے سے لگایا تو عالی کے صبر کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ ماں جانی کے سینے

کر زخم رو پڑے تھے۔ ایک ایک تنہا تین کر رہی تھی۔

”آپا..... آپا! خدا کی قسم بہت چاہتا تھا فرمان کو..... مگر.....“

وہ راز جواب تک دل کے نہاں خانوں میں مدفون تھا اب یوں پرترہ بکھرا گیا۔

”دفع کر میری جان۔ تیرے لئے لڑکوں کی کمی ہے۔ بھول جا اسے۔ وہ تیری چاہت کے

تیرے قابل۔ اس لئے اللہ نے پیچھا چھڑا دیا۔ مجھے تو مارا ہے رحمن نے ذرا جو ہوا لگ جاتی ناں پہلے

بھئی کسے کرتا وہ شادی۔ رحمن کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ سیدہ کو آ جا کے رحمن پر ہی تاؤ آ رہا تھا۔

”نہیں آپا! رحمن بھیتا ہے قصور ہیں۔ انہوں نے تو قدم قدم پر میری رائے لی ہے۔ میں نے ہی ان کو بھیجا

تھا۔ اس لئے آپا کو فرمان میرے نہیں رہے تھے۔ تو مجھے کیا ضرورت تھی پیچھے پڑنے کی۔ ٹھیک ہے جب میر

ے ہی جذبول میں شدت اور صداقت نہ تھی تو کسی بھروسے پر اپنا حق جتاتی۔ اس کو حق ہے، وہ جسے چاہے سے

بیار کرے۔ میں یہ صدمہ اس کی خوشیوں کا صدمہ کچھ کر قبول کرتی ہوں۔“

”تم کرتی ہو ناں قبول لیکن میں تو کسی کو معاف کرنے کو تیار نہیں۔ نہ آغا جی کو اور نہ فرمان کو نہ کسی اور کو یہ

سب کی جی بھگت ہے۔ عالی نہیں جانتیں۔

”نہیں آپا خدا کے لئے آغا جی کے لئے ایسا نہ سوچو۔ وہ تو ہمیں سب سے زیادہ چاہتے ہیں! عالی

اپنے زخم پیئے ہوئے بہن کو تبھار ہی تھی۔

”ان چاہتوں کے راز مجھ پر فاش ہو چکے ہیں۔ میں بھی جان گئی ہوں سب کچھ۔ فرمان کا جرم اتنا بھونا

نہیں کہ جس عاق کر دینے کی سزا اس کے لئے کافی ہوئی۔“ سیدہ بیگم کی صورت میں بھی ان کو معاف کرنے کو تیار

نہیں تھیں۔

”آپا تو اس سے بڑھ کر فرمان کے لئے اور سب کے لئے کیا سزا ہو سکتی ہے۔ کہ زندگی ہی میں ایک

دوسرے کے لئے مر گئے۔ میں آغا جی کو یہ ظلم کرنے نہیں دوں گی۔ میں جرم کی اپیل کروں گی۔ وہ فرمان کو سینے

سے لگائیں گے انشا اللہ۔“

عالی کو فرمان کے عاق کر دینے کا بے حد دکھ تھا۔ وہ تو خود کو بی بی جان کے سامنے مجرم تصور کرتی کہ اس کی

جہت وہ اپنے لاڈلے بیٹے سے جیتے جی جدا کر دی گئیں۔

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گی عابی۔ فرمان کو یہ سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔“ سیدہ زہرا آلود لہجے میں بولیں۔

”مت کرو آپا! ایسی باتیں۔ جو میری تفریح میں تھا مجھے مل گیا۔ میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں۔ کسی سے کوئی

شکایت نہیں ہے۔ پھر آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔“

عالی زخموں سے چور چور گئی مگر پھر بھی اعتدال میں تھی جبکہ سیدہ کے لئے یہ سب برداشت کرنا مشکل ہو رہا

تھا۔

”بہت بُرا کیا ہے فرمان نے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اتنی اچھی، پیاری لڑکی کو اس نے ٹھکرا دیا۔ وہ

لڑکی تو جو گلے لے کی تمام عمر کا۔“ قد سیدہ بانو کو بہت دکھ تھا عالی کا۔

”وہی حق ہے بات تو یہ ہے بھابی جان! میں تو فرمان کے ق میں ہوں۔ ٹھیک ہے عالی کے ساتھ تو زیادتی

ہوئی ہے لیکن خطا وافر مان بھی نہیں۔ آخر وہ بھی انسان تھا۔ لڑکی خوبصورت ہوگی۔ پسند آگئی تو کرنی۔ آغا جی ان

سے تو بس فوراً اتارنا ہی فیصلہ کر ڈالا۔“ اس نئی صورت ال سے غدار بیگم خاصی خوش اور مطمئن تھیں۔

”خیر، آغا جی نے فرمان سے جاتے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی گڑھ بڑھ کی تو اس گھر میں تمہارا ٹھکانا

مطلوب ہے۔ سو جتنی ہوں کیا وہ لڑکی عالی سے زیادہ خوبصورت ہوگی جس نے فرمان کی توجہ اپنی جانب کر

لی۔“ قد سیدہ بانو مریم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”ظاہر ہے اچھی ہی ہوگی۔ رحمن بتا تو رہے تھے۔ بہت اچھا خاندان ہے۔ میرے خیال میں تو آغا جی کو

”بی بی جان! کیوں بدھگونی کی باتیں کرتی ہیں۔ خدا فرمان کو سلامت رکھے۔ آج نہ سہی کبھی نہ کبھی تو لوٹ کر آئے گا۔ آغا جی اسے ضرور معاف کر دیں گے۔“

قدسیہ بانو نے بڑھ کر بی بی جان کو ساتھ لگا لیا جن کی ممتاز پ رہی تھی۔

”سب لوٹے گا۔ کب معاف کریں گے وہ اسے۔ اس وقت جب میں نہ رہوں گی۔ ارے اتنے سال ہو مجھے ہیں اپنے چاند کو دیکھے ہوئے۔“

”خدا نہ کرے بی بی جان! یاوی کی باتیں نہ کریں۔ پتا ہے۔ لقمان کہہ رہے تھے فرمان کو فون کریں گے کہ چند روز کے لئے آ کر مل جائے۔ مریم کو بھی ساتھ لے آئے پھر ہم سب کو شش کریں گے کہ آغا جی کو منا لیں۔ مجھے یقین ہے۔ آغا جی مان جائیں گے۔“

”ہائیں۔ میرا فرمان۔ میرا بچہ واپس لوٹ سکتا ہے۔ وہ آ سکتا ہے تو پھر جلدی کرو۔ میرے بچو! تم لوگ کیا جانو میرے اندر کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔“

قدسیہ بانو کی بات نے جیسے بجھ دیے میں تیل ڈال دیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”کیوں نہیں بی بی جان! واہ کمال کرتی ہیں یہ تھوڑی ہے کہ آغا جی نے کہ دیا تو فرمان اب تمام عمر آئیں گے ہی نہیں۔ رات کو نینیں نے بھی یہ ہی پروگرام بنایا تھا۔ آپ فکر نہ کریں انشاء اللہ فرمان کو جلد ہی لانے کی کوشش کریں گے۔ وہ مریم کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔“

عذرا بیگم نے بھی یقین دہانی کرائی تو جیسے بی بی جان کی بغضیں تیز چلنے لگیں۔

”اللہ تم لوگوں کو خوش رکھے۔ دل میں ٹھنڈی سی پڑ گئی ہے۔ اللہ تم لوگوں کی زبان مبارک کرے۔ میرا بچہ ساتھ زندگی کے لوٹ آئے تو تمام عمر تم لوگوں کو دعا کیں دوں گی۔“ بی بی جان کے انگ انگ سے دعائیں پھوٹ رہی تھیں۔

”ہونہ میں بھی دیکھوں گی فرمان اس گھر میں کیسے آتا ہے۔ میری بہن کی قاتل کو دلہن بنا کر کیسے اتارتا ہے اسے گھر کے انگن میں۔ اپنے دل پر ہاتھ پڑے تو تب ہی پتا لگتا ہے۔ اب تو یہ بڑھ کر بول رہی ہیں۔ ان کے کیچے پر ہاتھ پڑتا تو پھر یہ ایسی فراغ دلی دکھائیں تو میں دیکھتی۔ کسی کے دامن میں آگ لگی ہو تو انسان بڑی سہولت سے ہاتھ تپ لیتا ہے۔ جب تپسا نے دامن تک پہنچو تو چل جاتا ہے۔ میں بھی دیکھ لوں گی سب کو۔“

سیدہ جو بی بی جان کے لئے سوپ کے کرائی تھیں..... عذرا، قدسیہ بانو کی باتیں سن کر باہری ٹھہر گئیں۔

”عذرا بی بی! تم چلی جاؤ ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ بچے چھوٹے ہیں۔ ڈرائیور سے کہو۔ قدسیہ، عذرا کو چھوڑ آئے ہمارے بہن شہر ہو چکی ہیں۔“

”جی بہتر۔“ قدسیہ بانو اچھیں تو سیدہ سوپ لیے اندر آ گئیں۔

”بھائی جان! آپ یہاں بیٹھ کر بی بی جان کو سوپ پلائیں۔ سیدہ آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ عذرا بیگم نے سوپ کا پیالہ قدسیہ بانو کے ہاتھ میں دیا اور خود پیندہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر آ گئیں۔ سیدہ چہرے سرختی لئے مڑی رہیں۔

”کہہ بھی چکیں بھائی جان! آپ کو پتا ہے۔ مجھے اتنا کام کرنا ہے۔ آغا جی کا چلم گرم کروانا ہے اور سیدہ نے کام کو اٹھا لے۔“

معاف کر دینا چاہیے تاکہ فرمان اپنی دلہن کو گھر لے آئے۔

”وہ عذرا تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ٹھیک ہے وہ لڑکی بھی اچھی ہوگی۔ اچھا خاندان ہو مگر عابی کا حق تو مارا گیا ہے ناں اور یہ بات آغا جی کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اللہ اس لڑکی دے۔ ایسی ہمت والی لڑکی کو صبر دے۔ ایسی ہمت والی لڑکی ہے کہ مجال ہے جو کچھ ظاہر کیا ہو۔“ قدسیہ ساری ہمدردیاں عابی کے ساتھ تھیں۔

”چلیں جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب اتنا سوگ منانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ عابی کے لئے رشتوں کی ہے۔ ایک رشتہ تو گھر میں موجود ہے۔“

”گھر میں اب کون سا رشتہ موجود ہے عذرا؟“

قدسیہ بانو، عذرا بیگم کا مطلب نہیں سمجھیں تو حیرانگی سے ان کو دیکھنے لگیں۔

”کیوں بھابھی جان میرے شہزاد۔ میں کوئی کی ہے؟“

عذرا بیگم تو روز اول ہی سے یہ چاہتی تھیں مگر فرمان کی وجہ سے خاموش تھیں۔

”ارے ہاں اس طرف تو دھیان ہی نہیں گیا۔ لوادر کیا چاہیے۔ ماشاء اللہ شہزاد تو خوب بچے گا ہاں ساتھ۔ چاند سورج کی جوڑی رہے گی اور شہزاد تو آغا جی سے لے کر سیدہ تک سب کو پسند ہے۔“ قدسیہ بانو کو خود شہزاد بہت پسند تھا وہ خوش ہو گئیں۔

”تو پھر بھابھی جان بات کریں بی بی جان سے میں اپنے منہ سے بات کرتی اچھی نہیں لگتی۔ میں تو اس لئے چاہتی ہوں کہ میرا شہزاد عابی کو بہت چاہتا ہے۔ پہلے تو وہ فرمان کی وجہ سے خاموش ہو گیا تھا مگر اب نے یہ موقع دیا ہے تو آپ ضرور کوشش کریں۔“

”کوشش کیا میرے خیال میں تو کسی کو بھی اس رشتے پر اعتراض نہیں ہوگا۔ پہلے جب تم نے بات نہ کی بی بی جان نے یہ ہی کہا تھا کہ اگر فرمان سے ملے نہ ہوتی تو کر دیتی میں۔ اب تو قدرت کی طرف سے ایسا تو کسی کو انکار نہیں ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔“

”کوشش کیا میرے خیال میں تو کسی کو بھی اس رشتے پر اعتراض نہیں ہوگا۔ پہلے جب تم نے بات نہ کی بی بی جان نے یہ ہی کہا تھا کہ اگر فرمان سے ملے نہ ہوتی تو کر دیتی میں۔ اب تو قدرت کی طرف سے ایسا تو کسی کو انکار نہیں ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔“

قدسیہ بانو کی یقین دہانی بیگم کو خوش کر دیا اب وہ شہزاد کو یہ خوشخبری سننے کو بے چین تھیں۔ کل تو وہ جا ہی نہیں سکتی تھیں مگر اتفاق سے فون آ گیا کہ زائدہ بیگم نے بلایا ہے۔

”پھر کیا حکم ہے بی بی جان! جاؤں کہ نہ جاؤں؟“ عذرا بیگم ساس سے اجازت مانگ رہی تھیں۔

”جاؤ بی بی! جانے بہن نے کیا بات کرنی ہے۔ جاؤ شاباش۔“

”لیکن بی بی جان آپ کی طبیعت بھی تو خراب ہے میں کیسے جاسکتی ہوں۔“ فرمان کی وجہ سے جان کی طبیعت ان دنوں بہت خراب تھی۔

”ارے کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ یہ سانس کو ذور بڑی مضبوط ہے۔ نہیں ٹوٹے گی۔ ہمیشہ کے لئے پھر دیکھا اور میں زندہ ہوں۔“ بی بی جان پھر سننے سے ادھر گئیں۔

”اوہو بھئی! تو کر لینا سارے کام۔ بات یہ ہے کہ یہ بتاؤ، میرے شہزادے کے بارے میں تمہارا کہنا ہے۔“

”شہزاد بہت اچھا لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ خود بھی ہے اور سعادت مند بھی مگر۔۔۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر اگر مگر کی کیا ضرورت ہے۔ تم فکر مند کیوں ہوتی ہو۔ گھر کا لڑکا ہے تو ذرا نہ غور چھان پھنگ۔ شہزاد عالی کو چاہتا بھی تو بہت ہے پھر کس بات کا انتظار ہے۔ تم ایک بار ہاں کر دو۔“

”ارے بھابی جان! اس بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ شہزاد تو مجھے خوب بہت پسند فرماں تا قدرے نے تو میری چاندی بہن کی قدر ہی نہیں کی۔ شہزاد سے چاہتا تو ہے ناں۔“ سیدہ جو کچھ عذرا کی طرف سے متفر ہو گئی تھیں اب ساری کدورت جاتی رہی۔

”ارے کوئی ایسا دیا چاہتا ہے سیدہ! اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا کو عالی نہیں تو کوئی بھی نہیں اتنی جان تو اس کی طرف سے فکر مند ہی رہتی تھیں۔ دیکھو اللہ کے ہر کام میں بہتری اور مصلحت ہوتی ہے۔ نے اگر دھوکا دیا تو اللہ نے شہزاد کو پہلے سے موجود رکھا۔ تم غلڑ کر اب۔“ عذرا بیگم بہت خوش تھیں کہ کڑیاں آپ ہی آپ ملتی جا رہی تھیں۔

”بھابی جان! اس رشتے پر کسی کو اعتراض نہیں ہو گا مگر عالی نہیں مانے گی۔“

”اے سمجھنا تمہارا کام ہے اور پھر شہزاد میں کیا کمی ہے۔ تم اسے نیک دہرہ سمجھاؤ اور جب آغا کی کاظم تو اسے بھی کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو بھابی جان میں تو اس کی فکر میں گھلتی جا رہی ہوں۔ بچپن سے جس کے چنے رہی تھی وہی بے وفا نکلا اور اس کے ارمانوں کی سیج پر کسی اور چڑیل کو ڈھن بنا کر بٹھا دیا۔ خدا کبھی خوش نہ اسے سیدہ نے ایک بار پھر صدق دل سے فرمان اور مرہم کو بد عادی۔

”چلو چھوڑو سیدہ۔ جس کے جو مقدر میں ہوتا ہے مل جاتا ہے۔ تم عالی بے بات کر دو میں اتنی جان بات کرتی ہوں جا کر۔ تاکہ وہ خود بات آگے بڑھائیں۔ اور اللہ نے چاہا تو اس عید پر ہم عالی کو ڈھن ملے۔“ عذرا بیگم چشم تصور میں عالی اور شہزاد کو ڈھن دہلہا کے روپ میں دیکھ رہی تھیں۔

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بھابی جان! کہ میری عالی بھی ڈھن بنے۔“

”آمین۔ انشاء اللہ ہماری عالی جان سی ڈھن بنے گی۔“



عذرا جب سے میکے آئی تھیں بہت خوش تھیں۔ یہ باتوں تو سب نے کی تھی مگر شہزاد نے کچھ نہ محسوس کیا۔ ”آپی آپ اس قدر خوش کس بات پر ہیں؟“

”بھئی خوشی کی بات ہے۔ فرمان نے شادی کر لی ہے۔“

”شادی کی بات خوشی کی ضرور ہے لیکن آپی عالی کے حوالے سے افسردہ کر دینے والی بات بھی تو آپ کو معلوم ہے کہ عالی فرمان کو۔۔۔“ شہزاد اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

”ارے چھوڑو بھئی۔ یہ لڑکیاں شادی سے پہلے تاج محل بناتی ہیں۔ سپنوں کے۔ پھر کسی سے بھی شادی جائے تو تمام عمر اس کی خدمت میں گزار دیتی ہیں؟“

”نہیں عالی عام لڑکی نہیں ہے۔ عالی جیسی لڑکیاں جیسے چاہتی ہیں ناں آپی اس کی یادوں کے سہارے بھی زندگی بسر کر لیا کرتی ہیں۔“

”شہزاد کے چشم تصور میں شہزادیوں کی سی آن بان والی عالی اتر آئی۔

”نہیں شہزاد سب لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ عالی اہم تھیں اس لئے لگتی ہے کہ تم اسے چاہتے ہو۔ اور جس کو انسان چاہے، وہ اس کے لئے اہم ہوتا ہے۔“

”نہیں آپی! عالی میری چاہت نہیں، میری دیوانگی ہے۔ ایسی دیوانگی جس نے شعور و ادراک کے درمچہ پروا کر دیے ہیں۔“ شہزاد جذب سے بول رہے تھے۔

”بس اب تم دیکھ لو۔ تمہارے جذباتوں میں کتنی چٹائی تھی کہ راستہ آپ ہی آپ صاف ہو گیا۔“

”کیا مطلب آپی؟“ شہزاد حیرانی سے مڑے۔

”مطلب یہ کہ تمہاری منزل تمہاری عالی تمہارے سامنے ہے۔ قدم بڑھاؤ اور اپنالو۔“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

بس اب اتنا بھی معصوم بننے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے فرمان نے، بااں شادی کر لی ہے تو اب عالی کی شادی بھی کرنی ہے کہ نہیں اور عالی کے لئے تم سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ نہیں ہو سکتا۔“ عذرا نے پیار سے بھائی کو دیکھا۔

”آپی جان کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“

”کیوں، کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔ تمہاری خواہش نہیں تھی عالی کو ڈھن بنانے کی۔“

”تمہی آپی جان۔ زندگی نے ایک ہی یہ تو خواہش کی تھی۔ میں نے اس عالی کا خواب دیکھا تھا جو صرف میری ہو۔ اس کا دل صرف میرے لئے دھڑکے۔ اس کی پلکوں میں صرف میرے سنے تھیں۔ اس کی آنکھوں کی

قدیں صرف مجھے دیکھ کر روشن ہوں۔ جو آزاد ہو۔ خفقان ہو۔ اپنے فیصلوں کی آپ مالک ہو۔ ایسی عالی مجھے قبول نہیں جو ہارن ہو پیسے۔ تھکی ہو پیسے۔ بے بس ہے۔ ایک ایسی زخمی ہرنی کی مانند جسے شکاری زخمی کر کے جال میں پھنسا کر چلا گیا ہے۔ ہرنی کو درندوں کی صورت موت نظر آتی ہے تو وہ بے بسی سے آنکھیں موند لیتی ہے کہ

موت تو اس کا مقدر۔“ شہزاد بڑے گہرے گھیسرے لہجے میں بول رہے تھے۔

”تو تم ہرنی کی بے بسی کا نظارہ کیوں کر رہے ہو۔ بڑھ کر اسے پناہ میں لے لو۔ اس کے زخموں پر اپنی محبت کے پھلے رکھ دو۔ احسان مند ہو گی تمہاری۔“

عذرا بیگم نے بھی اسی اصطلاح میں بات کی تو وہ ذمہ نگاہوں سے ان کو دیکھنے لگے۔

”یہ ہی تو مجھ سے نہیں ہو سکتا آپی! کہ میں اس کی بے بسی سے فائدہ ہی تو نہیں اٹھا سکتا۔ اس وقت زخمی بھی ہے مجبور بھی۔ وہ جو فیصلہ بھی کرے گی اس میں اس کی سعادت مندی تو ہو سکتی ہے مگر دل کی خوشی شامل نہیں ہو سکتی اور آپی جن فیصلوں میں دل کی رضا شامل نہ ہو۔ وہ زبردستی کے سودے ہوتے ہیں اور محبتوں کے سفر میں،

شہزادیتوں کا قائل نہیں۔“ شہزاد نے دل سے اٹھنے والی ایک گہری ٹوپ کے ساتھ کہا۔

”ارے ہو۔ آئے کہیں سے فلاسفر۔ اب تمہاری سنی کس نے ہے۔ اپنی تو سمجھ میں تمہارا فلسفہ آتا نہیں اور نہ دماغ خراب کر دے۔ میں نے تو دیریں کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔ ارے حد ہو گئی۔ عالی جیسی لڑکی جسے نے



اسے اور کیا چاہئے۔“

”ایک بات بتائیں آپ؟“ شہزاد بڑی سی نگاہوں سے ان کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”سو باتیں پوچھو۔“

”یہ آپ کو واقعی عالی سے اس لئے دلچسپی ہے کہ میں اسے چاہتا ہوں یا پھر اس کی جائیداد میں اضافہ؟“

”ہے آپ.....؟“

”کیا فضول بات ہے شہزاد! یہ بھی کوئی کرنے والی بات ہے۔“

”فضول بات نہیں ہے آپ! میں جانتا ہوں۔ عالی میں آپ کے لئے کیا کشش ہے؟“

”ارے معلوم ہے تو ہوا کرے۔ میں کوئی اپنے لئے تو کچھ نہیں چاہتی اور ظاہر ہے کہ جائیداد عالی!

ہے۔ وہ تو اُسے ہر حال میں دیں گے۔ خواہ اُس کی شادی کہیں بھی ہو۔“

”ارے بھئی بہن بھائی میں آتے ہی کیا بحث چھڑی؟“

زاہدہ بیگم نماز سے فارغ ہو کر ادھر ہی آ گئیں۔ شہزاد اٹھ کر باہر نکل گئے۔

”امی جان! دیکھئے یہ شہزاد بھی تو اُلٹی باتیں کرتا ہے۔ عالی کہاں تو اتنی پسند تھی کہ ہر قیمت پر جاہل!

چاہتا تھا اور اب جبکہ عالی مل سکتی ہے تو اپنا فلسفہ بگھار رہا ہے۔“

”نبی بات کیا ہے۔ مجھے بات تو بتاؤ۔“

”آپ بتائیں آپ کو ہے انکار عالی کے رشتے سے؟“

خدا نہ کرے۔ مجھے کیوں انکار ہونے لگا۔ اس سے بڑھ کر کوئی لڑکی ملے گی ہمیں۔ میں تو کبھی ہول!

جی اور صاحب سے بات کر لوں جا کر، آخر شہزاد کو کیوں اعتراض ہے۔“

”اُسے عالی کے ساتھ ملنے والی جائیداد پر اعتراض ہے۔“

”تو ٹھیک ہے نبی! ہمیں جائیداد کی ضرورت بھی کیا ہے۔ خدا کا دیا ہوا سب کچھ تو ہے۔ ہم غلام!

گے، آغا جی، ہمیں صرف لڑکی چاہیے۔“

”یہ کیا بات ہوئی امی جان۔ ہم اُن سے کسی بات کا تقاضا تو نہیں کریں گے۔ یہ تو وہ جائیداد ہے!

اور عابدہ کے والدین اُن دونوں کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں۔ سیدہ کو شادی کے بعد اس کا حصہ مل گیا۔ اب!

ہے عالی کی جہاں ہوگی، اُس کا حصہ بھی اُس کے ساتھ جائے گا۔ اس میں نہ کوئی غلط بات ہے نہ قابل مذمت!

یوں شہزاد بگڑ رہا ہے۔“

”غذا بیٹی! یوں پہلے ہی کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو۔ ابھی اُن سے رشتے کی بات بھی نہیں ہوئی۔!

بھائی صاحب اور بہن جی کی کیا رائے ہو؟“

”واہ امی جان! آپ بھی شہزاد والی بات کر رہی ہیں۔ میں سیدہ سے بات کر کے آئی ہوں۔ شہزاد!

بھی اس گھر میں سب کو پسند ہے۔ اب تو بس رسمیں ادا ہونی رہ گئی ہیں ورنہ شہزاد کا رشتہ مجھے کد!

”اچھا نبی! دیکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ حتیٰ فیصلے تو اُس کی ذات واحد ہی کرتی ہے۔“

زاہدہ بیگم بیٹی کو مطمئن کر کے مغرب کی نماز کے لئے کھڑی ہو گئیں۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔

لئے سردی میں بھی اضافہ ہو گیا تو شہزاد نے باہر نکلنے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور لحاف میں لپٹے لپٹے آتش دان!

اٹنے چھوٹے چھوٹے شعلوں کو دیکھنے لگے۔ عذرا آپ نے آ کر ایک بار پھر دل کے بند کو اتر کھول دیئے تھے اور زندگی نے آج ان کو وہ چوائس دی تھی کہ ناقص آرزوئیں دلہن بن کر اُن کے من آگن میں اترنے کو تیار نہیں مگر کیا ستم تھا کہ وہ اُن کا استقبال کرنے کو تیار نہ تھے۔ مگر اپنی بڑھنے والی چاہت عالی کے قدموں میں کلیاں نہیں بچھا سکتے تھے۔ عالی اُن کی زندگی کی اولین خواہش تھی اور وہ خواہش آج جب پوری ہو رہی تھی تو دل سیکینڈ چوائس بننے کو تیار نہ تھا۔

”نہیں عالی! مجھ سے خود پر یہ ستم نہ ہوگا عالی! بہت خود غرض ہوں۔ میں اپنے جذباتوں کے معاملے میں، خدا کی قسم عالی! اس دل میں تمہارا بہت احترام ہے۔ بہت چاہت ہے تمہاری میں اپنی خودی، اپنی انا تمہاری ایک نگاہ پر قربان کر سکتا ہوں لیکن عالی! خدا کی قسم جب یہ خیال آتا ہے کہ تمہارا دل فرمان کی چاہت میں دھڑک چکا ہے تو میری رگوں میں اندھیرے اترنے لگتے ہیں۔ میں جلا دینا چاہتا ہوں، اپنے جذباتوں کا اپنے ارمانوں کا نہیں عالی! تمہیں کھو کر توجی سکتا لیکن اس اذیت کے ساتھ اپنا نہیں سکتا کہ تمہارا دل فرمان کی محبت کی آماجگاہ رہا ہے۔ آئی ایم سوری عالی! اسے تم میری خود غرضی کو، محبت کی انتہا کہہ لو، فرمان سے حسد کا نام دے لو۔ میں شروع سے اپنی چیزوں کے بارے میں ہٹتی رہا ہوں۔ جو چیز میری ہوتی تھی وہ صرف میری ہوتی رہی ہے۔ کسی دوسرے کا میں اس پر سایہ بھی نہیں پڑنے دیتا اور عالی تم تو میری زندگی تھیں۔ میری محبت تھیں۔ میں تمہارے لئے سیکینڈ چوائس بن جاؤں، نہیں عالی۔ یہ بہت اذیت ناک عمل ہے۔ میں اس میں پورا نہیں اتر سکتا ہو رہی جان شہزاد۔“

جانے کتنی رات بیت گئی تھی۔ شعلوں کی تپش پر نرم پھلوار جانے کب پڑنی شروع ہو گئی۔ کمرہ سرد فضا کی نذر ہو گیا۔ آنکھیں موندیں تو نم پلکیں تمام سبب بیان کر گئیں۔



”لو بھئی، سیدہ اللہ مبارک کرے۔ میں امی جان سے بات کر آئی ہوں۔ وہ اس جھوٹا انشاء آغا جی سے بات کرنے آئیں گی۔“

عذرا بیگم نے آتے ہی لٹو سیدہ کے منہ میں ٹھونٹے ہوئے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن بھائی جان پہلے بی بی جان اور آغا جی سے اُن کی رائے پوچھ لیتے۔“

”یہ تمہارا ڈر نہ گیا بچوں والا۔ ارے بھئی جو کچھ کرنا ہے آغا جی اور بی بی جان نے ہی تو کرنا ہے ناں۔“

”اچھا بھائی جان۔ میں عالی سے بات کرتی ہوں۔ اُسے منانا بھی مشکل ہے۔“

”ہاں سیدہ اُسے سمجھاؤ۔ میں اُسے اس لئے زور نہیں دے رہی کہ شہزاد میرا بھائی ہے بلکہ اس لئے کہ اب اس کی عمر بے شادی کی اور اچھے لڑکے ملنے آسان نہیں۔“

”ارے بھئی نہیں بھائی جان! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ بڑے غلوں ہیں۔ میں ابھی اُس سے بات کرتی ہوں۔“ سیدہ عالی کے کمرے میں آ گئیں۔

”ارے آپ آپ اس وقت۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟ عالی نے اپنی انٹر کی کتابیں اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے تھے۔ وہ پرائیویٹ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ دل کے زخموں کو سینے کے علم کا سہارا لے لیا تھا۔

”بات تمہاری زندگی تمہارے مستقبل کی ہے میری جان تو خاص بات کیوں نہ ہوگی۔“  
سیدہ نے محبت سے عالی کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا تو ایک پھسکی سی مسکراہٹ عالی کے لبوں پر آگئی۔  
”کیسی زندگی؟ کیسا مستقبل۔ یہ سب تو فرمان کی طرح ایک یادیں بن گیا ہے۔“

”خدا نہ کرے، بھول جاؤ۔ اس ہر جانی کو جس نے تمہاری قدر نہ جانی۔ اُس بے وفا کے علاوہ کون ہے۔ وہ زندگی جس پر تمہارا حق ہے۔ اُس کی خوشیوں پر تمہارا حق ہے۔“

”آپ ایسا سوچ سکتی ہیں آپ۔ پتا ہے آپ میری سوچ کا نقطہ آغاز بھی فرمان ہیں اور اختتام بھی ہیں۔ فرمان کے علاوہ بھی زندگی کا کوئی روپ ہے۔ کوئی نام ہے، ہوگا مگر میں اس سے آشنا نہیں اور نہ ہی چاہتی ہوں۔“

”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو عالی! میں تمہیں زندگی ایک بے وفا کی خاطر ضائع کرنے نہیں دوں گی۔ ایک بھیا تک خواب سمجھ کر بھلاؤ کیونکہ میں اور باقی سب تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے انتخاب شہزاد ہے۔ شہزاد ہر لحاظ سے اچھا اور تمہارے قابل لڑکا ہے۔ بڑی بات یہ کہ وہ تمہیں بہت ہے۔ عذرا بھائی کی یہ خواہش ہے۔“

”بس آپ! اُمرنے کے لئے انتہائی زہر کافی۔ آپ میں انسان ہوں، کوئی کارنس پر رکھا ہوا شومیں ناں جب چاہے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ دیا۔ آپ! مجھے شہزاد کی اچھائی سے انکار ہے اور نہ اُن کے وقار سے اختلاف۔ بس میری خجوری یہ ہے کہ فرمان کے بعد سوچ کے سناڑے دروازے بند ہو جائے پھر میں تمہیں شہزاد فرمان سے کہیں زیادہ خیر و اور وفادار انسان ہے۔ تمہیں شہزاد کے حق میں فیصلہ دینا ہے یا خوشی بھی ہے، حکم بھی اور فیصلہ بھی۔ اچھی طرح سوچ کر مجھے جواب دے دینا۔ تمہیں اس کم ظرف انسان پر زندگی برباد نہیں کرنے دوں گی۔ ساری رات تمہارے پاس ہے۔ صبح مجھے بتا دینا۔ شب بخیر۔“

سیدہ اپنا فیصلہ، اپنا حکم اُسے سناتی ہوئی باہر نکل گئیں تو عالی بستر پر گر گئی۔ اُس نے تو سوچا بھی نہ تھا بھی ہو سکتا ہے۔ فرمان کے علاوہ کوئی اور بھی اُس کی زندگی میں داخل ہو سکتا ہے۔  
وہ تمام رات عالی نے کانٹوں پر گزاری۔ جذبات سے پرے ہو کر بھی اُس نے اس بات پر سوچا واقعی ہر لحاظ سے اچھا تھا مگر پھر بھی وہ خود کو تیار نہ کر سکی۔ سب مجبوریوں کو بھی اُس نے سوچا مگر جب بھی شہزاد کے حق میں فیصلہ دیا تو اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے سیدہ کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔  
”آپ! خدا کے لئے مجھے مجبور نہ کرو۔ میں نے اب تک زندگی فرمان کے نام پر گزاری ہے۔ مردانہ کے نام پر چاہتی ہوں۔ آپ! کوئی ایسی انہونی خواہش تو نہیں ہے جسے پورا نہ کیا جاسکے۔“

”عالی مت کرو ایسی باتیں۔ مجھے فرمان سے مزید نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ میرا بس چلے گا ہاتھوں سے فرمان کے ارمانوں سے بجائے گھر میں آگ لگا دوں۔ جس نے تمہیں سوائے اٹھکوں کے دیا۔ سیدہ کو فرمان سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔ اُس کا خیال ہی اُن کے لئے اذیت کا باعث بن جاتا تھا۔ واقعی اختیار میں ہوتا تو وہ فرمان کی خوشیوں کو بھسم کر دیتیں۔“

”خدا کے لئے آپ میرے سامنے فرمان کے لئے ایسی باتیں نہ کریں۔“

”کیوں نہ کروں۔ کوئی خوشیوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں اُس نے تمہارے قدموں میں۔“  
”خوشیاں تو مقدروں کا کھیل ہوتی ہیں آپ۔“

”کیوں ہم رہ گئے ہیں مقدروں کے ہاتھوں کھلوانے کے لئے۔ زندگی پر، زندگی کی خوشیوں پر ہمارا بھی حق اور اب میں یہ حق چھین کر رہوں گی۔ شرافت کی زبان سمجھ نہیں آتی۔“  
”آپ! یہ کیا ہوتا جا رہا ہے آپ کو؟“

”راغ خراب ہوتا جا رہا ہے میرا عالی۔ ہمیں کتنی خوشیاں ملی ہیں۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے والدین چھوڑے۔ بلاشبہ آغا جی نے ہر کی کو پورا کرنے کی کوشش کی مگر اندر جو خلا تھا، عمر کے ساتھ بڑا ہوتا گیا۔ محرومیاں بڑھتی گئیں۔ عالی! سوچو ذرا تمہاری ان باتوں سے ہمارے والدین کی روح کو کتنی اذیت ہوتی ہوگی کہ تم ناکام مرد زندگی بسر کرو۔ وہ بھی ایسے کم ظرف گھٹیا انسان کے نام پر جو اس قابل بھی نہیں۔“

سیدہ خود بھی جذباتی ہو گئیں تھیں، عالی کو زلادیا۔  
”آپ! پلیز مجھ پر یہ ستم نہ ڈھاؤ۔“

”پھر وہی بات عالی! آغا جی اس رشتے کو منظور کر چکے ہیں اور بہت خوش ہیں۔ اس جعد کو خالد جان آرہی ما اور شاید ساتھ ہی رسم بھی ادا ہو جائے۔ اپنے ذہن کو صاف کر دو اُس کے گھٹیا خیالوں سے۔ وہ شہزاد کی جونی مارا بھی نہیں۔“

”پلیز آپ! ایسا نہ کہیں۔ عالی کسی صورت بھی فرمان کی توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ تڑپ کر اُس نے یہ دے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔“

”اچھا تو ٹھیک ہے۔ مجھے آغا جی نے بلایا ہے۔ میں تمہاری رضا مندی دے دوں گی۔“ سیدہ اٹھ کھڑی ہوئی تو عالی تڑپ اٹھی۔

”نہیں آپ! میرا دل نہیں مانتا! جب بھی ایسا سوچتی ہوں تو مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پلیز آپ۔“

پہلی بہن ہیں۔ میری ماں جانی ہیں، میرے دل کو اپنے دل میں محسوس کرتی ہیں۔  
”تمہاری بہن ہوں۔ اس لئے تو تڑپ رہی ہوں، ورنہ کسی کو کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ اس گھر میں بھی سب تک آغا جی اور بی بی جان کا دم ہے تب تک سب کچھ ہے۔ بعد میں کون کسی کو پوچھتا ہے اور ہمارا اُن کے لادہ کون ہے۔ چلو شاہ شام نہ بھولو۔ اس طرح تو زندگی میں ہوتا ہی ہے۔ زندگی کسی ایک کے نام پر۔ تو نہیں ان کی جاسکتی ماں اٹھو شاہ شام۔“

سیدہ نے آگے بڑھ کر اُس کا چہرہ صاف کیا اور باہر نکل گئیں۔

آغا جی عالی کے کھلے بہت فکر مند تھے مگر جب سے شہزاد کے بارے میں اُن کو بتایا تھا، گویا منوں بوجھ اُن کے کندھے سے ہٹ گیا تھا۔

”شہزاد! میرے مثل نو جوان ہے۔ سیدہ بی بی بخدا! ہمیں تو اپنی اپنا بچاؤ اولاد سے بڑھ کر اعتماد ہے اُس پر۔ وہ ہمیشہ ہماری بی بی کو ہمیشہ خوش رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے مرحوم بھائی بہن کے سنا۔ عزت کے ساتھ ہمیشہ اُن کے ساتھ رہیں۔ صالحہ بیگم بہن جی جعد کو ایسی رہی ہیں۔ عید کے بعد کی کوئی مبارک تاریخ نہ لیں گے۔“

آغا جی بہت خوش تھے۔ شہزاد تو اُن کو شروع ہی سے پسند تھا اب تو اور بھی عزیز ہو گیا۔  
 ”جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ شادی جلدی کر دی جائے۔ ہماری اس بیٹی کی شادی میں فریاد  
 تاخیر ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کرے۔“  
 شہزاد کے رشتے نے سب کو خوش اور مطمئن کر دیا تھا۔ احساسِ ندامت میں کچھ کمی ہوئی تھی۔ آغا جی  
 چلتا تو وہ ابھی اسی وقت دونوں کی شادی کے فرض سے عہدہ برآہ ہو جاتے۔ انہوں نے ابھی سے سب کو  
 جاری کر دی تھیں۔

”قدسیہ بیٹی! ہماری سب سے پیاری بیٹی کی شادی ہے۔ اس میں سارا جگ شریک ہوگا۔ میں نام  
 کے تمام ارمان نکالنا چاہتا ہوں۔ انتظامات بہت اچھے ہونے چاہئیں۔ تم مجھے میری بیٹی کے زہرا  
 ملبوسات کی فہرست بنا کر دے دو۔ میں ہر خریداری اپنی نگرانی میں اپنی خوشی سے کرنا چاہتا ہوں۔  
 ہماری بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھئے۔“  
 خوشی سے آغا جی کی آواز بے قابو ہو رہی تھی۔  
 ”آغا جی آپ فکر نہ کریں۔ وہ دن تو آنے دیں۔ انشاء اللہ یہ شادی عرصے تک لوگوں کو یاد رہے گی۔  
 کام بہت اچھے ہوں گے انشاء۔“ قدسیہ بانو نے یقین دہانی کرائی۔  
 ”صالحہ بیگم۔ زہرا بہن کا استقبال بہت اچھا ہونا چاہیے۔ آج تک وہ اس گھر میں بیٹی کی ماں کی جگہ  
 سے آئی ہیں۔ اب تو وہ بیٹی کی ماں بن کر آئیں گی۔ ہمارے سر اُن کے سامنے جھکے ہونے چاہئیں۔“

بیٹی کو مانگنے آ رہی ہیں۔“  
 جمعہ میں تین دن باقی تھے کہ تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں۔ آغا جی خود ہر کام کو دیکھ رہے تھے۔  
 انہوں نے اپنی نگرانی میں درست کرائی تھی۔ ہر کوئی خوش اور شاد ہوا تھا۔ عذرِ انجیم کے تو دل کی مراد اُن کی  
 تو اُڑی اُڑی پھر رہی تھیں۔ مرادوں کی ڈولی میں جگہ جمعہ آیا تو ایک بار پھر آغا جی کی خوشی کی نظر لگ گئی۔  
 یہاں زہرا بہن بیگم کا انتظار ہو رہا تھا وہاں اُن کو بہزاد کے اغوا کی روحِ فرسا خبر نے ادھ موا کر دیا۔  
 اغوا نے سب کو ہراساں کر دیا تھا۔ زہرا بہن بیگم کو بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ بہنوں کا رورور کرنا  
 بھائیوں نے جال بچھا دیا تھا۔ ایک الگ کونے میں حمیرا گم مسمی بیٹی شوہر کی اس گمشدگی پر غور کر رہی تھیں۔  
 ”شاہین! سکون دیکھا ہے چہرے پر ورنہ جس کا شوہر لاپتا ہو جائے وہ اتنی پرسکون ہو“ آپ  
 شروع ہی سے حمیرا سے خار کھاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ حمیرا ہی کو دیکھ رہی تھیں۔  
 ”ارے نہیں بھابھی! پرچی لکھی لڑکی ہے اور پڑھے لکھے لوگوں میں حوصلہ زیادہ ہوتا ہے۔“  
 ”تف ہے ایسے حوصلے پر شوہر کی خبر نہ ہو اور بیوی کا سکون دیکھنے کے لائق ہو۔“  
 ”میرا بیٹا! میرا بچہ! آیا کر نہیں۔ کہاں چلا گیا۔ کون لے گیا میرے بیٹے کو۔ ارے جاؤ کوئی میرے  
 لے کر آؤ۔ زہرا بہن بیگم ہوش میں آتے ہی بہزاد کے بارے میں پوچھتیں۔  
 ”امی جان! دعا کریں بہزاد انشاء خیریت سے لوٹ آئیں گے۔ میں سب سمجھ رہی ہوں۔“  
 ہے۔ ایک بار میرے اس وہم کو کفر مہونے دیں پھر دیکھیں گے۔“  
 حمیرا نے سانس کو سہلے لگایا۔ کلیں بھائی وغیرہ نے شہر کا کونا کونا چھان مارا تھا مگر بہزاد کا سراغ

فاجیر اندر ہی اندر لوٹ رہی تھیں۔ انجانے دوسرے اب ناگ بن کر ڈسنے لگے تھے مگر سوائے صبر کے چارہ  
 کیا تھا اور اُن کا یہ سکون، یہ صبر بھی دوسرے لوگوں کے شکوک کو ہوا دے رہا تھا۔ مگر حمیرا ان تمام باتوں سے بے  
 باز بہت کچھ سوچ رہی تھیں۔ تمام امکانات پر غور کر رہی تھیں اور نتائج یہ سوچ رہی تھیں۔ ان کو بہت بڑے فیصلے  
 کرنے تھے۔ اس اغوائے اُن کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔  
 چوتھے دن جب صبر کی انتہا ہو گئی تو دشمن بہزاد کو زخمی حالت میں چھوڑ گئے۔ بہزاد میں اگر کچھ باقی تھا تو وہ  
 ہاس کی ڈور تھی ورنہ ظالموں نے مار مار کر بھر کس نکال دیا تھا۔ وہ بے ہوش تھے اور کچھ بتانے کے قائل نہ تھے  
 اُن کے کوئی کاروائی بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔  
 ”ظالموں نے چھوڑا کر دیا میرے بچے کا۔ خدا کبھی معاف نہ کرے ان ظالموں کو۔“  
 ”امی جان خدا کا شکر ادا کریں، جان بچ گئی ہے ورنہ ظالموں نے کس تو کو کوئی بھی نہیں اٹھا رکھی تھی۔“  
 سب ہی دل کی بھڑاس نکال رہے تھے مگر حمیرا خاموش تھی۔ وہ بہزاد کے ہوش میں آنے کی منتظر تھی جو  
 ہائی امیدداشت کے وارڈ میں تھے اور حمیرا بے تاب تھیں یہ جاننے کے لئے کہ اُن کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہے؟  
 ناؤٹک ہی نہیں یقین تھا کہ اس اغوا میں اُنکا بھائی اور عالم شاہ ملوث ہے اور کیوں، یہ بھی جانتی تھیں اس لئے  
 وہ کتنی کاروائی کے لئے بہزاد کے ہوش میں آنے کی منتظر تھیں۔  
 بہزاد کو ہوش آچکا تھا مگر ابھی اس قائل نہ تھے۔ شہزاد وغیرہ پولیس میں رپورٹ کرنا چاہتے تھے مگر حمیرا نے  
 فیصلے سے روک دیا۔  
 ”ہاں یہ کیوں کرنے دی گی بھائی کا کارنامہ جو ہے۔“  
 ”اس طرح بات کرنے کی ضرورت نہیں بھابھی! میں جانتی ہوں کہ اس میں میرا بھائی ملوث ہے۔ میں  
 کیا بات کی منتظر ہوں۔ میں اپنے بھائی کو پولیس سے سزا نہیں دلوانا چاہتی، خود ایسی کڑی سزا دینا چاہتی ہوں کہ  
 وڑپ کر رہ جائے۔“  
 حمیرا نے مضبوط لہجے میں کہا اور بہزاد کے لئے سوپ لے کر اندر آ گئیں۔ بہزاد اب کافی حد تک ٹھیک  
 دیکھتے تھے۔ انہوں نے ایک نظر حمیرا پر ڈالی اور ناراضگی سے منہ دیواری طرف کر لیا۔  
 ”بہزاد کو کوئی اور سزا تجویز کریں۔ آپ کی بے زنجی تو میری جان لے لے گی۔ خدا کی قسم میں سب کچھ  
 داشت کر سکتی ہوں مگر آپ کی بے زنجی نہیں۔“  
 حمیرا جواتے دنوں سے برداشت کر رہی تھیں بہزاد کے قدموں میں جھک پڑیں۔ بہزاد کا دل وڑپ کر رہ  
 یا۔ مگر وہ نرم پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اب اس تنازعے کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔  
 ”بہت کر دیا کبھی یا نہیں حمیرا بیگم۔ میں نے تمہیں کتنا چاہا، منتوں اور مرادوں کے بعد حاصل کیا تھا تو اس  
 نہ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ تم دنیاوی دولت سے اتنی محبت کرتی ہو کہ شوہر کی زندگی بھی داؤ پر لگانے کو تیار ہو سکتی ہو۔“  
 بہزاد۔ بہزاد یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ حمیرا شوہر کی اس بات پر وڑپ اٹھی تھیں۔  
 ”کوئی مشکل بات نہیں کہہ دی میں نے تمہیں، اپنی جاگیر، اپنی زمین مجھے سے زیادہ عزیز ہیں ناں تو اب  
 ناؤٹک سے لگائے، روادار تمہارا بھائی مجھے یوں زخمی کر رہا ہے گا۔ بالآخر تمہاری ضد اور تمہارے بھائی کے  
 فکری اندر میری زندگی اوجھل گئی۔ بھلا کسی کا کیا جائے گا۔“

”بہزاد! آپ کو یقین ہے ناں کہ وہ لوگ شہباز بھائی وغیرہ کے تھے“ حمیرا کی منھیاں بند ہو گئیں۔  
”جی ہاں اور آپ کے نام پیغام دیا تھا کہ اگر ان کی بات نہ مانی گئی تو اس حرکت کو نرطریہ سمجھا جائے۔  
حملہ آخری بھی ہو سکتا ہے۔“

”دوسرا حملہ واقعی آخری ہوگا۔ بہزاد اور شکست کا زخم ان کو ہی دھوتا پڑے گا۔ بہزاد آپ کو کچھ نہیں  
آپ کچھ بھی نہیں جانتے کہ مجھے اپنی جاگیر کیوں عزیز ہے۔ لیکن اب بات میری برداشت سے بڑھ گئی۔  
جاگیر جو فساد کی جڑ ہے، جسے آپ میری کمزوری سمجھتے ہیں، بہزاد میں اپنی تمام جائیداد، تمام جاگیر کا  
صدقے میں دے دیتی ہوں لیکن میں شہباز علی اور عالم شاہ کو ان کے کردہ عزائم میں مرکز بھی کامیاب ہو  
دوں گی۔ یہ میرا خود سے عہد ہے۔ یہ رہے کاغذات میں نے پہلے ہی تیار کر کے رکھ چھوڑے تھے۔ اب  
کو آگ لگا دیں یا ان کردہ انسانوں کے حوالے کر دیں۔ مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے جو کرنا ہے اب  
گزاروں گی۔“

حمیرا نے اپنی تمام جاگیر کے کاغذات بہزاد کے سامنے پھیلا دیے تو وہ محبت پاش نگاہوں سے  
دیکھنے لگے۔

”میں مصلحتوں کو تو نہیں جانتا، مگر یہ فیصلہ تم۔ یہ خاصی دیر میں کیا ہے۔ تم مجھے غلط نہ سمجھا حمیرا! وہ  
اپنی جان کی خاطر یہ سب کہا ہے تمہیں نہیں معلوم، اُنکے عزائم کتنے کردہ ہیں۔ اگر یہ مادی دولت دے کر  
بچائی جا سکتی ہے تو کیا یہ سودا منہ بگاڑے۔“ بہزاد نے حمیرا کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

”جانتے تو آپ کچھ نہیں بہزاد، بہر حال! آپ فکر نہ کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا، بس مجھے آپ  
چاہیے بہزاد اور کچھ نہیں“ حمیرا نے بہزاد کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لئے۔

”مجھے تم پر اندھا اعتماد ہے حمیرا، تم جو کرنا چاہتی ہو کرو۔“  
”شکر یہ بہزاد! اب مجھے آسانی رہے گی۔“

حمیرا نے فائیں اٹھا کر الماری میں رکھیں اور باہر آ گئیں۔ بہزاد بستر پر لیٹ رہے تھے کہ دروازہ  
دستک ہوئی۔

”جی آئیے!“ بہزاد بستر پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”حمیرا ابھی! آپ! حمیرا! بہزاد سے عمر میں چھوٹی تھیں مگر جب سے وہ بہزاد کے گھر میں آئی تھیں  
بڑوں کی طرح احترام کرنے لگے تھے اور وہ یوں آج پہلے بار ان کے کمرے میں آئی تھیں۔ بہزاد کھڑے  
”میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا آپ کو شہزاد؟“

”ارے نہیں، آپ آئیے بیٹھیں، کیا پسند کریں گی۔ آج پہلی بار میرے کمرے میں آئی ہیں۔“  
”کچھ نہیں شہزاد! مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔ آپ کا ساتھ چاہیے بولے دیں گے میرا ساتھ۔“

اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو شہزاد کچھ نہ سمجھ سکے۔  
”اگر اس مدد اور ساتھ کی وضاحت کر دیں تو فیصلہ کرنا میرے لئے آسان ہو جائے گا“ شہزاد نے

ہوئے کھوجتی نگاہوں سے حمیرا کو دیکھتے ہوئے بولے۔  
”خیال رہے شہزاد، چاہنے والوں کو بہت مان ہوتا ہے۔“

”سما مطلب!“ شہزاد کے لئے حمیرا کی ذومعنی باتیں سمجھ سے بالاتر تھیں۔  
”مطلب ایسا مشکل نہیں ہے شہزاد! آپ کو یاد ہے ناں کہ میں نے آپ کے کہنے پر قربانی دی اور آپ کے  
”نواب یہ جتانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“ شہزاد نے کڑی نگاہوں سے حمیرا کو دیکھا۔

”اس لئے شہزاد! کہ اب مجھے پھر آپ کی محبت، آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔“  
”حمیرا یہ کیا بکواس ہے، تمہیں اندازہ ہے کیا کہہ رہی ہو تم؟“ شہزاد نے بھی تمام آداب احترام بالائے  
اپنی رکھ دیا۔

”محبت، محبت ہوتی ہے شہزاد! بھلائے نہیں بھولتی۔ میرا اب بھی آپ پر حق ہے شہزاد اور آپ کو میرا حق  
ہا ہوگا۔“

”حمیرا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، قبل اس کے کہ میں آپ سے باہر ہو جاؤں، نکل جاؤ میرے کمرے  
میں مجھے معلوم نہیں کہ تم اندر سے اتنی کمزور لڑکی ہو۔ میں تو تمہیں ایک چنان سمجھا تھا مگر تم تو لڑتا پتہ نکلیں۔ اپنی  
کمزوریوں پر اختیار نہیں تھا تو کیوں میرے معصوم بھائی کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسا یا۔“ تم وغصے سے  
بڑا کڑا حال تھا۔ اُن کا بس چلتا تو حمیرا کو اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیتے۔

”حمیرا! حمیرا یہ کیا کر دیا تم نے! کیا اسی لئے تم مجھے اعتماد میں لے رہی تھیں، تم اتنی کمزور نکلیں حمیرا  
مجھے جھوٹی محبت میں الجھائے رکھا، نہیں حمیرا! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ بہزاد جو  
راجلال لدی کو نکلے تھے شہزاد کے کمرے سے حمیرا کی آواز سن کر رک گئے۔

وہ بڑی مشکل سے کچھ کچھ کچھ اعتماد پر چلتے اپنے کمرے میں آ گئے، سب کچھ تو ختم ہو گیا تھا، کیا بچا تھا  
فی۔ وہ تو حمیرا کو کوئی اور ہی مخلوق سمجھتے تھے، پھر یہ کیا ہو گیا۔ وہ آکر بے دم سے بستر پر گر گئے تھے۔

”میں یہ کرنا چاہتی ہوں شہزاد! آپ نے تو مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔“  
حمیرا جو اتنی دیر سے شہزاد کی باتیں اور رویہ برداشت کر رہی تھیں، اب بکھر گئیں۔

”حمیرا! حمیرا آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ دیری سوری! مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی، میں تمہاری باتوں کا کچھ اور ہی  
طلب کچھ بیٹھا تھا۔ مجھے معاف کرو حمیرا! میں نے تمہارے خلوص اور پاکیزگی پر شبہ کیا لیکن۔“ شہزاد نے بڑی  
لڑا محضرت کر رہے تھے۔

”نہیں شہزاد! اس میں قصور آپ کا بھی نہیں، اس انداز میں بات شروع کرنا بھی میری مجبوری تھی، بس  
ب اللہ تعالیٰ میں ہمارے اس مقصد میں کامیاب کرے۔“

”حمیرا تم اکیلی ہی پریشان ہوتی رہیں، شروع ہی سے بتا دیتیں تو آج یہ حالات نہ ہوتے لیکن اب بھی  
شاہد میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

شہزاد دل میں اب شرمندہ ہو رہے تھے کہ انہوں نے حمیرا کو غلط سمجھا۔  
”اب تک خاموش رہنا میری مجبوری تھی شہزاد! لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں شہباز اور عالم شاہ کو ان  
کے کردہ عزائم میں کامیاب ہونے نہ دوں گی“ حمیرا کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا ان دونوں کے نام لے کر۔

”حمیرا میں۔۔۔۔۔ میں ہر قربانی کے لئے تیار ہوں، تم فکر نہ کرو۔ میں ہر طرح تمہارے ساتھ ہوں۔“



قدم اٹھانا چاہو، جلدی کرو، ایسا نہ ہو کہ ہماری قربانی رائیگاں چلی جائے۔

”نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

حمیرا نے پُر عزم لہجے میں کہا اور باہر آگئیں۔ کمرے میں آئیں تو بہن زاد دیوار کی طرح رخ کر کے بن گئے۔

”بہن زاد! مجھے معلوم ہے آپ جاگ رہے ہیں لہذا میری طرف مت کریں اور باتیں کریں۔“

”کاش سو گیا ہوتا تو شاید بچ جاتا اور بھراب کہنے سننے کو کیا رہ گیا ہے؟“ ایک ٹیس سی بہن زاد کے اٹھنے پر حمیرا کچھ چونک سی گئیں مگر اس وقت وہ کسی اور بات کو اہمیت دیتا نہیں چاہتی تھیں۔ اُن کے فرشتہ خیزہ تھی کہ وہ باتیں جنہوں نے کچھ دیر کے لئے شہزاد کو بدظن کر دیا تھا، بہن زاد کے دل میں بھی وہی باتیں تیزو اتر چکی ہیں۔

”بہن زاد! میں چند روز کیلئے گاؤں جانا چاہتی ہوں۔“

”تو چلی جاؤ! اجازت لینے کی ضرورت ہے؟“

بہن زاد کا روٹھا سا، اکھڑا لہجہ بھر حمیرا کو چونکا گیا۔

”آپ نے پوچھا نہیں کہ کیوں جانا ہے، کتنے روز کے لئے جانا ہے؟“

”اب میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا، وہ مکمل طور پر ناراض تھے۔“

”میں خود ہی بتائے دیتی ہوں کہ غذات شہباز کے منہ پر مارنے جانا ہے۔“

”کسی بھی مقصد کے لئے جاؤ۔ مجھے کوئی غرض نہیں۔“

اب حمیرا پوری طرح سمجھ چکی تھی کہ ضرور کوئی بات اُن کے کانوں میں پڑ چکی ہے، مگر ابھی وہ کوئی وضاحت نہیں کرنا چاہتی تھیں، خاموش ہی رہیں۔

اگلے روز شہزاد اور حمیرا جانے کو تیار تھے۔ جب دونوں تیار ہو کر کھڑے تھے تو بہن زاد نے دونوں پر ایسی نگاہ ڈالی جس میں دکھ، اذیت اور شکوے بول رہے تھے۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولے، خاموشی سے ہاتھ دھو گئے۔

”شہزاد! ہم شعلوں سے کھیلنے جا رہے ہیں۔ اس جنگ کو ہم جیت بھی سکتے ہیں اور ہار کے گناہ امکانات ہیں۔ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں لیکن پچھتاوے کا مار جن بہت کم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زندگی کا مقام پر کسی موڑ پر آپ پچھتا سکیں اور آپ کو مجھ سے گلہ ہو۔“

”حمیرا! یہ تم تمام نیکیوں کا سہرا ہے ہی سر کیوں باندھنا چاہتی ہو، کوئی نیکی کسی دوسرے کے ہاتھ کا۔ کسی کی زندگی، کسی کا مستقبل بچانا عبادت ہے حمیرا! تم کیوں نہیں چاہتیں کہ میں یہ عبادت کروں۔ زندگی کے ہر مقام پر تم مجھے ثابت قدم پاؤں گی اور پھر اس میں تمہارا کیا فائدہ ہے۔ مسئلہ تو ہماری اپنی ہے۔ قربانی تو تم دے رہی ہو اپنے بھائی کی“ شہزاد نے عقیدت بھری نظروں سے حمیرا کو دیکھا۔ مزاحیہ پریشان تھیں۔ بھائی کو دیکھ کر اُن سے لپٹ گئیں۔

”شہزاد! مجھے بچاؤ میرے بھائی! میں لٹ رہی ہوں مجھے بچاؤ۔“

”آپ حوصلہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا، میں آیا کس لئے آیا ہوں، مجھے پتا ہے کہ کیا ڈرنا ہے۔“

”ہاں مگر میں۔“

”شہزاد! آپ کا ان حالات میں یہاں رہنا مناسب نہیں، آپ شہر چلے جائیں اور وہیں انتظار کریں۔“

”اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”بہت احتیاط سے حمیرا، کہیں کھیل بکڑ نہ جائے۔“

”آپ بے فکر ہو کر جائیں شہزاد، اللہ ہمارا مددگار رہے۔“

”یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو تم لوگ؟“

شہباز علی کافی دیر سے سمجھ میں نہ آنے والی باتیں سن رہے تھے، بول ہی پڑے۔

”میں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی بھائی جی! یہ میرا اور میرے دیوار کا مسئلہ ہے اور آپ کو تو اس سے مطلب ہے۔“

”یہ یہی ہیں نا، آپ کا سب کچھ یہ لہجے جتن منائے اپنی جگہ کا کر آپ نے بہن کے حصے پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔“

زہرا آدھ لہجے میں کہتے ہوئے حمیرا نے اپنی زمینوں کے کاغذات شہباز کی طرف اُچھال دیے۔

”کیا... کیا... کیا حمیرا! کاغذات ہیں واقعی؟“

شہباز علی کاغذات پر کسی بھوک کی جھل کی طرح جھپٹے۔

”ہاں اچھی طرح دیکھ لیں۔ اصلی ہیں جعلی نہیں ہیں آپ کی طرح۔“

حمیرا نے نفرت بھری نظروں سے بھائی کو دیکھا جو تصور میں ہی اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔

”شکر یہ... شکر یہ میری بہن! انگوٹیا مانگتی ہو، آج تم جو انگوٹگی پاؤ گی۔“

شہباز کی فیاض بادشاہ کی طرح خوش ہو کر بولے تو ایک عجیب سی مسکراہٹ حمیرا کے لبوں پر آگئی۔

”نہیں جی آپ جیسا مطلق، کو کمال شخص بھلا مجھے کیا دے سکتا ہے۔“

حمیرا اٹھ کر باہر آگئیں مگر منہ کی سسکیوں پر قدم رک گئے۔

”بھائی جان یہ کیا؟“ منہ بے حال ہو رہی تھیں۔

”حمیرا! یہی تو ایک دیواری تھی۔ میری بربادی کو بچانے کے لئے وہ بھی تم نے گرا دی تو.....؟“

”خدا پر بھروسہ رکھیں بھائی! خدا کی ذات کھلا انصاف کرتی ہے، خدا پر بھروسہ رکھیں۔ یہ بتائیں رفیق! آج آیا ہے کہ نہیں؟“

”نہیں کئی روز سے اُس کی طبیعت خراب ہے، وہ نہیں آرہا، کیوں اُس سے کام ہے؟“

”بہت ضروری کام ہے، آپ دعا کریں، میں خود اُس کے گھر جا رہی ہوں۔“

”حمیرا! تم یہ سب کیا کر رہی ہو، میری آنکھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

”آج آئے گا، سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا بھائی جان! بس دعا کریں آپ۔“

حمیرا نے بڑی سی چادر لٹائی اور رفیق کے گھر آگئیں، اُسکے حواس ہی کم ہو گئے حمیرا کو دیکھ کر۔

”آپ..... آپ حمیرا بی بی، آپ اور ہمارے فریب خانے پر جی، کہاں بٹھاؤں جی آپ کو؟ مارے خوشی اور حیرت کے رفیق کو بٹھانے کے لئے جگہ نہیں مل رہی تھی۔“

”میں سسکی بیٹھ جاتی ہوں اپنی اماں کے پاس۔ اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہے تو ابھی جا کر عالم شاہ کے ملازمہ شکر کو بلا لاؤ، بہت ضروری کام ہے۔“

”اجماعی اشدائ تو بی بی کی خدمت کر، میں ابھی گیا اور ابھی آیا جی۔“

رفیق ماں بہن کو خدمت کی تاکید کرتا، بھانسا ہوا شاہ پور گیا، واپسی پر رشید بھی اُس کے ساتھ گیا۔

”رشید بھائی! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ یوں کہہ لو کئی زندگیوں کو بچانا ہے تم نے ساتھ دو گے میرا؟“

”بی بی! میں تو ایک عرصے سے خود آپ سے ملنا چاہتا تھا جی جب آپ کے شوہر کو اغوا کیا گیا تھا بھی آپ سے ملنا چاہتا تھا مگر مجھے گولی لگ گئی تھی جی، اس لئے میں آپ کی مدد نہ کر سکا اور اب بھی آپ کے آپ کا بھائی.....“

”میں تمہارے بارے میں جانتی ہوں رشید، اگر تم جیسے مفلس انسان بھی دنیا میں نہ ہوں تو انسانیت موت آپ مر جائے۔ تم کسی بھی طرح مجھے نورین بی بی سے ملو اور پھر دیکھو خدا کیا کرتا ہے کون جیتا ہے ہارتا ہے۔“

”آپ اس کی فکر نہ کریں جی، میں آپ کی ہر طرح مدد کروں گا جی۔ نورین بی بی کے لئے تو میں دے دوں گا، اُن کو بر باد نہیں ہونے دوں گا۔ آپ بتائیں کب ملتا ہے؟“

”آج اور اسی وقت“ حیرا جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ جسم اور چہرے کو اس طرح چھایا کر لیا کہ ہونٹے، عالم شاہ کی حویلی میں قدم رکھ کر حیرا کا جی چاہا کہ اس خبیث انسان کو مار ڈالیں۔

”احتیاط سے بی بی! عالم شاہ سامنے سے آ رہا ہے۔ رشید نے اُن کو کھٹک کر دیا۔“

”اوئے رشید! کہاں تھے تم؟ میں نے کتابلا یا دیر یہ کون ہے؟“

عالم شاہ حیرا کو سر سے ٹھیک دیکھتے ہوئے بولے۔ اگر اُن کو گمان بھی گزر جاتا کہ یہ وہ حیرا ہے؟

عجب میں وہ آج رہے رہے ہیں تو جانے پھر اُن کا کیا رد عمل ہوتا۔

”باؤ جی..... یہ بانی نورین بی بی کی شہر کی سبکی ہیں جی، ملنے آئی ہیں۔“

”شہر کی سبکی مگر اُس کی تو کوئی سبکی نہیں“ عالم شاہ نے پھر حیرا کے ڈھکے ہوئے سرے پر کود لیا۔

”جی آپ نہیں جانتے! اصل میں میری شادی ہو گئی تھی اور میں ملک سے باہر چلی گئی تھی، اب وہاں ہوں تو اپنی عزیز سبکی سے ملنے چلی آئی ہوں۔“

حیرا نے آواز بدل کر کہا۔ اُنہیں تو یوں لگ رہا تھا کہ وہ جیسے کسی خطرناک مجرم سے ملنے آئی ہیں۔

لے اتنی جھان بین ہو رہی ہے۔

”ٹھیک ہے رشید، ان کو لے جاؤ اور نورین بی بی سے کہنا جلدی فارغ ہو جائیں۔ ٹھیک آٹھ بجے آجائیں گے۔“

عالم شاہ حیرا کو کھوجتی نکالوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ رشید حیرا کو لے کر نورین بی بی کے پاس آیا جہاں وہ جسم اٹک بنی ہوئی تھی۔ رشید نے تعارف کرایا تو نورین حیرا سے لپٹ کر روئی جیسے ہو کر بعد بہن سے ملی ہو۔

”حیرا بھائی! آپ کو خدا کا واسطہ مجھے بچالیں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ باجی میں خدا اور رہا۔“

سر آپ کو بہن کہتی ہوں۔ مجھے بچالیں۔ میں تمام عمر آپ کے قدموں میں گزار دوں گی یا آپ مجھے درالامان پہنچا دیں۔ میں اس درندہ صفت بھائی سے بچنا چاہتی ہوں۔ ماں باپ مر گئے تو بھائی نے میری قیمت لگا دی اور بولی گانے والوں میں ایک آپ کا بھائی ہی ہے۔ نورین حال سے بے حال ہو رہی تھی۔

”حاصل کر نورین! اللہ تعالیٰ جب کسی کی مدد کا ارادہ فرماتا ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بتاؤ میں جو کرنا چاہتی ہوں تم اُس سے شفق ہو؟“

”آپ مجھے کہیں بھی لے جائیں، کچھ بھی کریں لیکن اس جہنم سے نکال دیں باجی، میں آپ کی ادنیٰ ملازم بن کر رہ جاؤں گی۔“

”نہیں تم..... پھولوں جیسی لڑکی تو دل میں چھپا کر رکھنے کے قابل ہو۔ یہ بتاؤ تم عدالت میں اپنے بھائی کے رویے کے بارے میں بیان دے سکو گی؟“

”باجی میں دنیا کی ہر عدالت میں یہی کہوں گی کہ یہ میرا بھائی نہیں میرا قاتل ہے، دشمن ہے میرا جس نے میری قیمت لگا دی۔ مجھے لمحہ اذیت دی۔ میں اس کے سامنے سے بھی دور جانا چاہتی ہوں۔ پلیز کچھ کریں۔“

آپ جو کہیں گی میں آنکھیں بند کر کے کروں گی۔ ایک بار مجھے اس جہنم سے نجات دلا دیں۔ احسان مند ہوں گی۔“

”ایسا ہے تو نورین تم میری بہن ہو۔ آج سے میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گی۔ یہ بتاؤ حویلی کی کوئی ایسی عورت یا لڑکی جس پر اعتماد کیا جاسکے؟“

”ہاجرہ بی بی..... ہاجرہ نورین بی بی کی پکی سبکی ہے جی اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔“

”جی باجی ہاجرہ پر تو اعتماد کیا جاسکتا ہے۔“

تو پھر رشید اسے کسی طرح بلالاکا سے اس طرح لانا کہ عالم شاہ کی نظر اس پر ضرور پڑے اور جب واپس دو غرض حویلی سے نکلتے تو وہ کوئی شبہ نہ کرے۔“

اور اتفاق سے جب رشید ہاجرہ کو لے کر آیا تھا تو عالم شاہ ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔

”یہ ہاجرہ ہے جی وہ شہر والی بی بی نے بلایا ہے، اس سے کام ہے۔“

رشید نے خود ہی وضاحت کرتے ہوئے کہا تو وہ شانے اچکا کر نورین کو جلدی فارغ ہونے کا کہہ کر نکل گئے۔

”ہاجرہ آج حیرا دوسری پر آزمائش کا وقت ہے، بول پوری اترے گی نا؟“

”نورین یہ جان حیرا دوسری میں چلی جائے تو مجھے سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہوگا۔ تو بے فکر رہو، اللہ تجھے بچھڑائے گا۔“

”تو پھر ہاجرہ تمہیں اس کمرے میں اُس وقت تک نورین بن کر رہنا ہوگا جب تک ہم دونوں گاؤں کی حد باہر نہ جائیں، ٹھیک ہے نا اور رشید تم نے نہیں رہتا ہے۔“

”جو حکم بی بی! آپ سے التجا ہے کہ ہماری جانیں بے شک چلی جائیں مگر آپ ہماری بی بی کی حفاظت کچھ۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“ رشید رو پڑا۔

”تم فکر نہ کرو رشید! میں نے نورین کو بہن کہا ہے اور ایک بہن اپنی بہن کی حفاظت کیوں نہ کرے گی!“  
 ”رشید، حاجرہ! میرے لئے دعا کرنا میں زندہ رہی تو تم لوگوں کو بھی اپنے پاس بلا لوں گی“  
 رشید اور حاجرہ سے ہنچرتے ہوئے نورین کو ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی جگر نوج رہا ہو۔  
 حمیرا بڑی احتیاط کے ساتھ نورین کو لے کر سیدی شہر روانہ ہو گئیں اور طے شدہ پروگرام کے تحت ہفت روزہ سے شہزاد کو فون کر کے بلایا۔ اتفاق سے وہ فون بہزاد نے بھی سن لیا، اس لئے وہ بھی اس طرح وہاں پہنچے کہ  
 خبر نہ ہوئی۔

”سنویر! وہ جو کہہ رہا ہے، اس میں کیا اور ہے؟“

”پتا نہیں صاحب! لگتا ہے کوئی چوری کی شادی کا چکر ہے، اپن کو تو ایسی ہی لگ رہا ہے“

”چوری کی شادی“۔ یہ تو چلا گیا مگر بہزاد کرسی پر گرتے چلے گئے۔ ایک ٹیس سی ریڈ کی بڑی کوکھ  
 وہ مردہ قدموں سے بمشکل اس کمرے تک آئے جہاں سے ایک مولوی صاحب نکل رہے تھے۔ بہزاد  
 وحشت زدہ ہو کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ اندر کا مبہم مضران کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس سے قبل کہ بہزاد  
 گرتے، شہزاد اور حمیرا نے بڑھ کر انہیں تمام لیا۔

”بہزاد! اگر آپ کو پتا چل ہی گیا تو یہاں بیٹھ جائیے۔ داستان الم سن لیجیے، اسکے بعد جو سزا بھی  
 میرے لئے تجویز کریں گے، سر تسلیم خم ہوگا۔“

اور پھر شہزاد اور حمیرا نے سب کچھ بہزاد کے گوش گزار کر دیا تو بہزاد عداوت کے سینے میں شرابور ہو گئے۔  
 ”حمیرا! حمیرا! یہ سب مجھ سے کیوں چھپایا؟ تمہیں کیا خبر، اس عرصے میں، میں کتنی بار جیسا مر اہوں۔  
 میری بہن کا معاملہ تھا۔ مجھے کیوں بے خبر رکھا گیا۔ میں کس قدر عداوت محسوس کر رہا ہوں۔ پتا ہے میں نے کہا  
 سوچ لیا تھا، تمہاری اس حرکت سے شکر کرو میں نے خودکشی نہیں کر لی، آخر کیوں چھپایا تم نے؟“ بہزاد یوں لے  
 سانس لے رہے تھے جیسے بڑی طویل ڈور سے آئے ہوں۔ ”یہ ہماری مصیقتیں تھیں بہزاد! اور پھر اگر نورین کا  
 عام پر پہلے سے لے آتے تو کوئی بھی نورین کو قبول نہ کرتا۔ اس لئے شہزاد نے کہا کہ نکاح کر کے سب کو فخر  
 جائے۔ میں بہت خوش ہوں کہ میں نے جو ارادہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے کامیاب کیا اور اگر شہزاد ساتھ نہ دیتا  
 میں کچھ بھی نہ کر سکتی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں بھابی! آپ نے احسان کیا ہے ہم پر۔ اگر آپ ہمت نہ کرتیں تو ہماری  
 برباد ہو جاتی اور نورین جیسی معصوم لڑکی بھی برباد ہو جاتی۔“

”حمیرا بھابی آپ نے جو احسان مجھ پر کیا ہے میں مر کر بھی نہیں چکا سکتی۔ مجھے بے سہارا کو سہارا دیا ہے  
 لوگوں نے۔“ نورین احسان تلے دلی جا رہی تھی۔

”یہ میرا فرض تھا نورین بہن!۔ اگر منوں ہوتا ہے تو شہزاد کی ہوجس کے تعاون سے یہ سب ہوا۔“  
 ”ان کے لئے تو میری جان ہر وقت حاضر ہے بھابی! تمام عمر ان کی خدمت کرتے گزار دوں گی۔“ نورین  
 نے پہلی بار خود سے شہزاد کو دیکھا تو اپنی قسمت پر رونا کرنے لگی۔

”نورین بہن تم اب ہماری عزت ہو۔ میں تمہیں بڑی عزت کے ساتھ گھر لے کر چلوں گا۔“ بہزاد  
 بڑھ کر نورین کے سر پر چار سے ہاتھ پھیرا۔

”اب تو آپ ناراض نہیں بہزاد؟“ حمیرا نے بڑھ کر بہزاد کے ہاتھ تمام لیے۔  
 ”نہیں حمیرا! مجھے تم پر فخر ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ تم مجھے مل گئیں۔ مجھے معاف کر دینا تمہیں غلط  
 سمجھا۔“ بہزاد بہت عداوت محسوس کر رہے تھے۔  
 ”اب آگے کا سوچیں۔ ہمیں ابھی بہت سی باتیں درپیش ہیں۔“  
 ”اللہ مالک ہے۔ شہزاد، فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔“  
 حمیرا نے بڑھ کر نورین کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔

حوالی میں دو عورتیں آئی تھیں اور دو سی چلی گئی تھیں۔ شہزاد علی نکاح کے گواہ لے کر پہنچ چکے تھے مگر  
 نورین تیار نہ تھی۔ رشید بہانے مانگا کر تھک گیا تھا۔ اب تو عالم شاہ کو شک ہونے لگا تھا۔  
 ”اوئے یہ کیا چکر ہے۔ نورین تیار ہوئی کہ نہیں۔“  
 ”وہ می لبی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ لٹی ہیں۔“  
 ”ہٹ پیچھے۔ میں خود دیکھتا ہوں۔“ عالم شاہ نے دھکا دے کر رشید کو پیچھے کیا تو کمرے میں نورین کے  
 بجائے حاجرہ کود کھڑا عالم شاہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔  
 ”اوئے رشید!۔ تمک حرام اندر آ۔“



”زندگی دوستی سے پیاری ہوتی تو رشید۔ اب تک“ ہاجرہ بے ہوش ہی ہو گئی۔ پھر عالم شاہ نے اپنی سی ریش کر ڈالی۔ اُن کے زخموں پر نمک پاشی تک کر ڈالی مگر زندگی ناز کرنے لگتی ہے ایسے باوقافوں کو جس پر جوشی زبان ہو جائیں۔

”اوائے بتا۔ میں بخش دوں گا“ اب عالم شاہ بھی تھک گیا تھا۔

”نہیں عالم شاہ۔ خون وہ تیرا تھی مگر بہن میں نے اُسے سمجھا۔ میں نے اپنی بہن کو اس قید سے آزاد کر دیا ہے۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

رشید نے اُکھڑتی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا تو عالم شاہ ہاجرہ کی طرف بڑھا۔

”دیکھ ہاجرہ! تو عورت ذات ہے اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال کر اور بتا دے نورین کہاں اور کس کے پاس مٹی ہے، بتا دے ورنہ تیرے بڑھے ماں باپ کہاں تھانے کے چکر لگائیں گے۔ تیری عزت پر الگ حرف آئے گا۔ بتا دے۔“

”عالم شاہ! عشق میں نفع نقصان تو نہیں دیکھا جاتا نا۔“

زخموں سے بخور ہاجرہ نے بمشکل کہا تو عالم شاہ پاگل ہو گیا اور پھر دوغائر ہوئے اور نورین کی دوستی امر ہو گئی۔ دو باوقاف انسان..... نورین کی خوشیوں کے چراغ اپنے لبو سے روشن کر کے خود فنا ہو گئے تھے۔ گولی کی آواز سے ساری حویلی کانپ اُٹھی تھی۔

”ہاجرہ..... اوائے رشید اے امیرے یار تیری ماں بہنیں مرجائیں۔ باؤجی! یہ آپ نے کیا ظلم کمایا ہے“ غورا جو گولی کی آواز سن کر آیا تھا، رشید اور ہاجرہ کو خون میں لت پٹ دیکھ کر رونے لگا۔ تو عالم شاہ نے ایک نکلے سے اُسے گریبان سے پکڑ کر اُٹھایا۔

”اوائے! میں نے تجھے ان کی لاشوں پر رونے کے لئے نہیں بلایا۔ ان کے پاس ٹھہر۔ میں شہباز کے پاس جا رہا ہوں اور خبردار تاجو حویلی کے دوسرے ملازم کو خبر ہونے دی تو“ عالم شاہ نے پستول ایک طرف پھینکا اور چہرے پر مزید گھبراہٹ طاری کر کے وہاں سے چلا گیا جہاں شہباز چار گواہوں کے ساتھ فطرت تھے۔ وہ اس خاموشی کا مطلب نہیں سمجھ پائے تھے کہ اتنے میں پریشان حال عالم شاہ اندر آیا اور شہباز کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔

”یار عالم خیریت تو ہے ناں۔“

”تم خیریت کی بات کرتے ہو یار، میں تو لت گیا۔ برباد ہو گیا ہوں۔“

عالم شاہ قائلین پر گر کر گر کر گڑ گڑانے لگا تو شہباز پریشان ہو گئے۔

”عالم شاہ! کیا بات ہے؟“

بات کیا ہوتی تھی یا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا، یار شہباز! میں کس منہ سے کہوں کہ نورین مگر سے غائب ہو گئی ہے“

”نورین مگر سے غائب ہو گئی ہے“ شہباز کے ہاتھ میں پکڑی چھڑی گر گئی۔

”ہاں یار! پتا نہیں کیسے، میں نے تو پہرے بھی خفت لگا تے جانے کہاں چلی گئی۔“

”بہن مگر سے غائب ہو گئی اور تمہارا یہ اطمینان بہتم زندہ کیسے ہو اب تک۔ عالم شاہ کہیں کوئی ڈرامہ تو

”بتا اوائے نمک حرام کہاں ہے نورین جلدی بتا ورنہ..... اس میں جتنی گولیاں ہیں اُن تباہوں کا بچہ میں، جلدی بول۔“

عالم شاہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ رشید کے گریبان پر گرفت سخت ہو گئی کہ اُس کی آنکھیں پھٹ پھٹ گئیں۔ چہرے پر اطمینان تھا۔

”بول۔ بول۔ رشیدے ورنہ میں تیرے کلوے کلوے کر کے کتوں کے آگے ڈال دوں گا“ کئی زوردار ہاتھ رشید کے چودہ طبق روشن کر گئے۔

”ہاجرہ بول، ورنہ وہ حشر کروں گا کہ شاہ پور کی پشتیں یاد رکھیں گی، میں کہتا ہوں بول، کہاں ہے نورین؟“ نے ہاجرہ کی چوٹی کو کئی بل دے کر اس طرح چھوڑا کہ دیوار سے ٹکرا کر اُس کی پیشانی کو کیا خون کا لہو پھوٹ پڑا اور وہ بے دم سی ہو گئی۔

”ہاجرہ!“ رشید تڑپ کر اُس کی طرف بڑھا مگر عالم شاہ نے درمیان ہی میں اُسے لات مار کر زمین ہٹا دیا۔

”بولو نمک حرامو! کہاں گئی نورین ورنہ چھڑی اُدھیر دوں گا۔“

عالم شاہ غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔ اُس نے ہاجرہ اور رشید کو لبو لبہاں کر دیا مگر دونوں شے سے کنارہ ہوئے۔ امتحان دوستی کا تھا، قربانی اُن کی عزیز از جان نورین نے مانگی تھی تو پھر اس جان کی کیا وقعت تھی۔ رشید زخم زخم تھے مگر وہ اپنے لبو سے وفا کے چراغ جلاتا چاہتے تھے، اپنی فدیہ پر قربان ہو کر دوستی کو امر کر دینا چاہتے تھے۔

”عالم شاہ! تم چاہے قید بھی بتا دو، تو تم ہم سے نورین کا پتہ نہیں پوچھ سکتے، ہاجرہ زندگی موت کی امان ہوتی ہے، ہمت نہ ہارنا۔ دیکھ ہاجرہ امتحان کڑا ہے۔“

رشید لبو لبہاں ہاجرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔



”نہیں“ شکوک کے ناگوں نے ایک دم سر اٹھایا۔

”اتحادیہ الزام نہ لگا دیار۔ تقدیر میرے ساتھ ایسا کھیل بھی کھیل سکتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔“

”وہ آخر کہاں جا سکتی ہے۔ ملازموں سے پوچھو۔ حویلی میں دیکھو۔ سارے گاؤں میں تلاش کیا گئی وہ“ جانے کیوں شہباز کو یہ ڈرامہ بازی لگ رہی تھی۔

”کیسی باتیں کرتے ہو شہباز میرے عزت گھر سے چلی گئی اور میں ڈھنڈورا پیٹوں اُس کے چہرہ کا“ عالم شاہ کی آواز بلند ہو گئی، پھر خیال کر کے آہستہ ہو گئی۔

”تو کیا تم ہار بیٹھے ہو؟ کیا بتاؤ گے خاندان اور گاؤں والوں کو؟ کیا جواب دوں گے کہ کہاں گئی شہباز؟“ عالم شاہ! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتاؤ۔ یاد رکھو شہباز کے ساتھ دھوکہ مضہم نہیں ہوگا، تمہیں اس شہباز نے سب کچھ یاد پڑا لگایا ہے اور میں خالی ہاتھ نہیں لوٹوں گا۔“

شہباز چلی نے رخ اور سونہ لہجہ میں ایک ایک لفظ چپا کر کہا۔

”یار! کیسی باتیں کرتے ہو ایسے وقت میں جب میری عزت کا جنازہ کھل چکا ہے۔ تمہیں اپنی بڑی بجائے دوست کا ساتھ دینے کے طعنے مار رہے ہو، کچھ تو کر شہباز میری مدد کرو۔“

اب کی باری عالم شاہ کے لہجے میں حقیقی دکھ کی جھلک نظر آتی تھی۔

”پھر کیا سوچا ہے تم نے کیا کیا جائے؟“ شہباز چلی کچھ سوچ کر عالم شاہ کے پاس بیٹھ گئے۔

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا یار تم یہ بتاؤ کیا کروں؟“ عالم شاہ بے بس نظر آ رہا تھا۔

”وہ کہاں جا سکتی ہے، تمہیں کچھ تو اندازہ ہوگا۔ شہر میں وہ کس کے پاس تھی۔ کسی پر تو شبہ ہوگا۔“ دیکھو کے انداز میں جرح کر کے بولے۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا یار۔ پر یہی معلوم کرنے کے لئے میں نے ان دونوں حراموں کو بھی ختم کر دیا۔“ ایسے نکلے کہ جان دے دی مگر زبان نہیں کھولی۔ میں بھی اس دنیا کا کوتاہ چھان ماروں گا اور اُس لوہا بغاوت کی ایسی کڑی سزا دوں گا کہ دوسری لڑکیوں کو بھی عبرت حاصل ہو جائے گی۔ میں اُسے کسی صورت میں نہیں کروں گا۔“ ایک بار پھر عالم شاہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

”ہوں تو..... عالم شاہ یہ ہاجرہ اور رشیدہ“ شہباز نے ان دونوں کی طرف توجہ دلائی۔

”ہن کی بات چھوڑ دو یار دیا آئیں گے، دوسرے ان کو میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے سے بھول ہوئی۔ کیسے ایک عورت برقع میں آئی جو حاجرہ تھی پھر، ہاجرہ برقع میں اور ہاں دو عورتیں برقعے میں حویلی سے نکل گئیں مگر اندر دیکھا تو ہاجرہ موجود تھی اور نورین غائب۔ اس کا مطلب ہے۔ نورین اُسی عورت کے ساتھ ہے۔ مگر وہ کون تھی اور نورین اُس کے ساتھ کیوں گئی؟ کہاں گئی؟ ظاہر ہے نورین کی مرضی شامل تھی تو اُس ساتھ گئی۔“

تمام واقعات پھر سے عالم شاہ کے ذہن میں متحرک ہو گئے تو اُس کی تمام حسیات بھی بیدار ہو گئیں اس جہاں کھیل میں دو وفادار انسانوں کی جانیں اور بہتا ہوا خون بے وقعت ہو کر رہ گیا۔ دوزخ کی گلیاں ختم ہو گئیں عالم شاہ کو پردائیں تھیں۔ وہ تو صرف نورین اور اُس برقع پوش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”تم نے اُن دونوں کو مار کر جلد بازی کا ثبوت دیا ہے۔ اب کہاں سے اور کیسے پتہ چلے گا کہ وہ عورت

نہی اور کہاں گئی ہیں یہ دونوں؟“

عالم شاہ سے زیادہ تو شہباز پریشان تھے کیونکہ انہوں نے تمام جاگیر کے کاغذات عالم شاہ کے حوالے کر دیے تھے اور جس کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا، وہ وعدے گئی تھی۔

”ان کو مار دینا ہی بہتر تھا۔ ان ملک حراموں کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا ہے مجھے، موت کو گلے سے لگا لیا مرنے سے کچھ نہ بھونے۔“ عالم شاہ کو پھر غصہ آ گیا۔

”پھر بھی تم نے جلد بازی کی ہے۔ اب بھلا نورین کا سراغ کس طرح مل سکتا ہے..... خدا جانے وہ کون کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور کہاں گئی ہے۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ نورین اور اُس عورت کا سراغ نہ لگاؤں تو میرا نام بدل دینا، کہاں جائیں گی مجھ سے غ کر“ عالم شاہ نے میز پر مکارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔



”بہن! آپ گاڑی تو لائے ہوں گے ناں؟“ حمیرا نے نورین کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں محترمہ! جس قدر میں ڈپر سیں تھا کہ خود ڈرائیور کرتا تو یہاں موجود نہ ہوتا، تم دونوں نے بہت تک کیا مجھے۔ یا تو میں پاگل ہو جاتا یا پھر۔“

”خدا نہ کرے بہن! کیسی باتیں کرتے ہیں، بس یہ ہم سب کا امتحان تھا..... جیسے تیسے ہم کامیاب ہو گئے۔ خدا کا شکر ہے“ حمیرا نے دل میں خدا کا شکر بجالا دے ہوئے کہا۔

”ہم تو جیسے تیسے کامیاب ہو گئے مگر اب اصل امتحان تو نورین کا ہے۔ نورین میری بہن! تم جس طرح سے ہماری زندگی میں آئی ہو، یہ طریقہ بھولی انا اور خوداری رکھنے والوں کی نظر میں پسندیدہ نہیں۔ اس لئے تمہیں ہمارے گھر میں یہ پذیرائی تو نہیں مل سکی گی جس کی کہ ایک دلہن حق دار ہوتی ہے۔ تمہیں بھائیوں کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اُمید ہے تم۔“

بہن! نے سر جھکائے خاموش کھڑی نورین کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ اُن کو دیکھنے لگی۔

”میں جانتی ہوں بھائی جان! میں نے ایک جہنم سے آزادی پائی ہے۔ درد مندوں سے آزادی پائی ہے اور یہ آزادی جو مجھے وحشیوں کے جنگل سے انسانوں کی جنت میں لے آئی ہے تو اس کی خاطر مجھے سب کچھ قبولی ہے۔ سب کچھ گوارہ ہے اور پھر جہاں حمیرا جیسی بہن اور آپ جیسا بھائی..... اور ان جیسا جیون ساتھی ہوگا تو میں رعایت کے طوفان کا مقابلہ کروں گی۔“ نورین نے جھپکی آواز کے ساتھ شہزاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

جب یہ لوگ سنی زندگی کی ابتدا کرنے لگے پھر تو حسب توقع ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

”اچھا تو یہ بھڑکی پک رہی تھی اتنے دنوں سے، ہونہ خوب عزت بڑھائی ہے لاڈلی بہن نے سسرالی کی ہونہ تو کھو کر رہ گئی۔“ یہ آہیں بھائی جی جن کو دل کی ہڑاس کا لہجہ ملحوظ تھا۔

”یہ سب میرا قصور ہے ورنہ شہزاد تو بے قصور ہے“ شاپین بھائی بھی حمیرا سے غلام کھاتی تھیں۔ اصل میں جبرِ عظیم یا تو تھی اور ہر کام سوچ سمجھ کر کرتی اور گھر میں اُس کے فیصلوں کو اویست بھی دی جاتی تھی۔ تب ہی یہ دھڑل اس سے چڑھ کر تھیں، مگر وہ کسی بات کی پروا کے بغیر پرسکون اور مطمئن رہتیں۔ نہ وہ کسی کی صفائی پیش

کرتی، اس وقت بھی وہ اپنے مخصوص انداز میں خاموش سب کی کڑوی کسلی باتیں سن رہی تھیں۔ سہسہا  
خضر تو عذرا بیگم کو تھا جن کی سسرال میں بیٹی ہو گئی تھی۔

”حمیرا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نے آخر کس جہم کا بدلہ لیا ہے۔ سسرال میں میری ناک کڑوا  
دی۔ میں کیا منہ دکھاؤں گی آغا جی کو، سیدہ کو، عابی کو“

عذرا بیگم کو سسرال میں بے عزتی کا خیال ستا رہا۔ سب نے اس کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ حمیرا کو مصافحہ  
نہیں دے رہے تھے۔ نورین سر جھکائے سب کچھ سن رہی تھی۔ اُس نے کب ایسا سوچا تھا کہ زندگی میں ایسا  
بھی آئیں گے کہ وہ یوں گالی بن جائے گی۔ بوجھ بن جائے گی۔ دل کا درد بھونک کر آہستہ آہستہ آنکھوں سے  
رہا تھا۔

”شہزاد بیٹے! مجھے تو بڑا مان تھا تم پر۔ حمیرا نے تو واقعی بہوؤں کا سا سلوک کیا ہے میرے ساتھ  
خاندان کی عزت کا پاس رکھ لیتے۔ ہم کیا جواب دیں گے کہ کھان تو شہزاد کے رشتے کے لئے بے چین تھا  
اپنی پسند سے خود ہی کر لایا۔ ارے بیٹے تم ایک بار اپنی پسند کے بارے میں بتا دیتے تو کیا ہم انکار کر دیتے۔  
آغا بھائی کو کیا جواب دوں گی۔ مارے عداوت کے میرا تو سر جھکا جا رہا ہے۔ بیٹے تم اس قدر فرما کر میرا راز  
میں“

زاہدہ بیگم کی آواز گھٹ گئی تو شہزاد آہستگی سے آگے بڑھا اور اُن کے پاؤں تھام کر بیٹھ گیا۔

”خدا کی قسم! امی جان یہ زندگی آپ کی عزت اور تابع داری میں قربان کر دیتا کہ آپ کی بیٹی اور امی  
کے برباد ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ شہزاد نے بھی خواب میں بھی یہ گناہ نہیں کیا کہ وہ ایسا سوچ سکے جس سے  
ہاں نہ رنجیدہ ہو۔ بھائی بہنوں کی ڈھال ہوا کرتے ہیں اور امی جان اور منزہ آپ کی کبھی اپنا گھر بچانے کے  
ڈھال کی ضرورت تھی تو بتائیے میں انکار کیسے کرتا۔ اگر پھر بھی گناہ گار ہوں تو پھر ہر سزا کے لئے تیار ہوں  
چاہے سزا دیں۔“ شہزاد نے سر جھکا لیا تو زاہدہ بیگم سمیت سب چونک گئے۔ شہزاد اٹھ کھڑے ہوئے۔

”امی جان! آپ سب نے تو آتے ہی حملہ کر دیا۔ وضاحت کا موقع بھی نہیں دیا۔ قصہ کچھ یوں ہے  
لڑکی نورین ہے اور شہباز کے دوست عالم شاہ کی بہن ہے۔ وہی عالم شاہ جو حمیرا پر غلط نظر رکھتا تھا اور ایک بار  
نے حمیرا کو اغوا کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور جب وہ حمیرا کو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا تو وہ مجھے جھکنڈوں  
آیا اور وہ اس قدر بے غیرت ہو گیا کہ اُس نے حمیرا کے حصے کو نیچا دکھانے اور حمیرا کی جاگیر حاصل کرنے  
لئے شہباز بھائی کے سامنے اپنی بہن کو پیش کر دیا اور ان کو نورین کے ساتھ شادی کا لالچ دے دیا۔ یہ بات ہم  
معلوم تھی اسی لئے وہ اپنی جائیداد ہر حال میں شہباز سے لینا چاہتی تھی اور وہ لے آئی تاکہ ہماری بہن  
اُجڑنے سے بچ جائے اور ہم حمیرا کو غلط سمجھتے رہے۔ میرا اغوا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔“ میرے چھوکر

پر حمیرا نے کاغذات شہباز کو دے دیے اور پھر شہزاد کے ساتھ کوئی مشورہ کر کے گاؤں چلی گئی اور نورین  
ملاقات کی۔ نورین تو پہلے ہی والدین کے بعد بھائی کے ستم کا نشانہ بن چکی تھیں۔ بن کر زندگی ختم کر دینا چاہتی تھی۔  
حمیرا اپنی تو یہ آئندہ کے بارے میں کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر حمیرا کے ساتھ آگئی اور..... اور امی جان ایسے  
آپ کے سامنے کوئی جرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنی کھڑی ہے، اگر یہی ہماری مدد نہ کرتی تو آج اس کی  
آپ کی اپنی بیٹی اُجڑ کر آپ کے پاس آئی ہوتی۔“

شہزاد نے بہت غصہ غصہ کر جذب کے ساتھ ساری بات بتائی تو ماں بہنوں کے دل تو صاف ہو گئے کیونکہ  
بیٹی اور بہن کا مسئلہ تھا مگر آئیہ بھابھی کو حمیرا اور شہزاد کی یہ ادا بھر بھی نہیں بھائی تھی۔

”خیر! اب ایسی بھی قیامت نہیں آئی تھی اس شادی کے بغیر بھی منزہ کے گھر کو اُجڑنے سے بچایا جاسکتا

آئیہ بھابھی نے بھی غصے سے شہزاد کی آؤٹ میں کھڑی نورین کو دیکھا اور اس وقت خود کو بالکل بے  
بھیر رہی تھی جو ان سب پر مسلط کر دی گئی ہو۔

”بھابھی جان، نورین میری بیوی ہے۔ آپ کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔ اسے تھوڑی سی عزت تو دلہنوں  
دے دیں“ شہزاد جو اتنی دیر سے خاموش تھا، نورین کی حمایت میں بولا تو ان دونوں نے منہ بتا لیا۔

”بہنہ بیوی ڈولی میں جگ کر آئی ہے ناں۔ بڑے برائی لینے گئے تھے ناں اس کو۔“

”بھابھی جان! جب لینے والا خود اسے لے کر آیا ہے تو کسی برائی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں  
آتا۔ نورین میری عزت ہے اور اس گھر میں اس کا وہی مقام ہے جو آپ تینوں کا ہے“ پہلا موقع تھا کہ شہزاد  
پہلے یوں کے سامنے تلخ کلامی کی تھی۔

”پہلو اس نے آئی ہی تمہیں زبان تو عطا کر دی“ شاہین بھابھی نے اپنی بات کی داد لینے کے لئے آئیہ  
کی طرف دیکھا۔

”جو کچھ بھی ہو، اس میں سب سے مظلوم کر دار نورین ہی کا ہے، بھابھی جان اور آپ اس کو کوئی بات نہیں  
بٹھیں، اس لئے کہ۔“

”اس لئے کہ اس کو لانے میں اہم کردار تھا رہا ہے۔“

آئیہ بھابھی نے حمیرا کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی تو وہ دکھ سے اُن کو دیکھنے لگی۔

”کیا ہاں مجھے اعتراف ہے اس بات کا۔“

نورین گھر سے بھاگ کر نہیں آئی جو آپ لوگ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ نورین کو میں اس کے والدین کی  
لئے شہزاد کی عزت بتا کر عزت سے لے کر آئی ہوں اور۔“

”اچھا تو اب مقدمے بازیاں بھی خود ہی بھگتتا“ آئیہ بھابھی نے پھر بات کاٹی، اس تمام عرصے میں عذرا  
اور زاہدہ بیگم خاموش بیٹھی سن رہی تھیں کیونکہ اُن کی بیٹی منزہ نے نورین کی مخالفت کرنے کا حق چھین لیا تھا۔ البتہ  
لینے کے بعد کی انتہا ہو گئی تھی۔ کھڑے کھڑے پاؤں بھی شل ہو رہے تھے، ضبط کے بند ٹوٹ گئے تو وہ زاہدہ بیگم  
قدموں میں آگری۔

”امی! والدین کے بعد یہ گھر میں اور..... اب آپ سب کے قدموں میں، میں یہ محسوس کر رہی ہوں گویا  
میرا اس میں اپنی شاخ سے جھڑنے والا وہ پتا ہوں جس کا مقدر ررا ہوں کے دھول ہوا کرتی ہے۔ میں نے یہ کب  
تھا کہ میں اس بے وقعت ہو جاؤں گی کہ دوسروں کے لئے گالی بن جاؤں گی، جو والدین کے لئے بھول گئی،  
میں نے دھول بتا دیا تھا اور تقدیر نے اس دھول کو آپ کے قدموں میں جگہ دی ہے تو خدا کے لئے مجھے یہیں  
بٹھ دیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں آپ کے بیٹے کی زندگی میں حادثاتی طور پر لانی گئی ہوں۔ میں نے کب ایسا  
تھا کہ میں کسی پر مسلط کر دی جاؤں گی۔ اب جبکہ یہ سب کچھ ہو ہی گیا ہے تو امی جان مجھے اپنے قدموں میں

رہنے دیجیے۔ میں اس جہنم میں دوبارہ نہیں جاؤں گی۔ آپ ہمیں ماموں تو احسان مند رہیں گی وہ میرا درعدہ ہے جس نے اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لئے اپنی بہن کو دودھ پر لگا دیا، شہباز اگر شادی شدہ نہ ہو تو میں اپنے ہی بھائی جیسے دوسرے انسان کی قید کو کب کبھی مگر میں منورہ باجی کے بارے میں سن چکی تھی کہ بارے میں ماموں میں نہیں چاہتی تھی کہ میری بھج سے ایک عورت کا ہنسا بستا کھڑا کر جائے۔ میں تو خدا دعا میں کیا کرتی تھی کہ کوئی ذریعہ بن جائے کہ ایک بے گناہ کا گھر کبھی نہ آجڑے اور میں بھی اس قید پالوں۔ اور اللہ کی ذات سبب اسباب ہے کہ..... حیران بھائی کو اسی دلیل انسان کی فرشتہ صفت بہن پرمانہ لئے رحمت کا فرشتہ بن گئیں۔

نورین زائدہ بیگم کے قدموں میں گری بے حال ہو رہی تھی۔ وہ آہستگی سے انہیں اور نورین کو لیا۔ ساتھ ہی ان کے بے شمار آنسو نورین کے بالوں میں جذب ہو گئے۔

”نورین بیٹی! جو کچھ ہوا بخدا مجھے ان حالات کا علم نہیں تھا اس لئے غصہ آ گیا تھا۔ ہمیں خبری نہ تھی ہمارے بیٹی پر کیا کیا قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ شہباز کے رویے کو ہم اس کی عادت سمجھتے رہے۔ والدین کی وفات کے بعد تو شہباز بے لگام ہو گیا ہے۔ ہمیں تو کوئی خبر ہی نہیں کہ اندر ہی اندر

ہے۔ حیران اور شہزاد نے جو کیا بہت بھڑکایا، اللہ تعالیٰ ان کو سسکی رکھی اور نورین بیٹی جو احسان تم نے ہے، اس کے بعد تمہاری جگہ میری قدموں میں نہیں، تم نے میری بیٹی کو آجڑے سے بچایا۔ اس لئے آج میری بیٹی ہو۔ تم کسی خاندان سے بھی تعلق رکھتیں، ہمارے لئے اتنی ہی مقدم ہوتیں اور آسیدہ شاہین کا نام سن لو۔ آج تم نے بعد نورین سے کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔ عذرا تم اپنی سب سے چھوٹی بھابی کو یہاں تک زائدہ بیگم نے نورین کو ساتھ لگا کر پکارا کہ وہ گویا دنیا میں آگئی۔

”حیران! میرے شہزاد کی دلہن اتنی روکھی چمکی نہیں ہونی چاہیے۔ اسے ارمانوں سے دلہن بناؤ۔ عذرا بیگم نے آہستگی سے نورین کو اپنے ساتھ لگا کر حیران کے حوالے کر دیا کہ اسے دلہن بنادیں۔ ساتھ آسیدہ اور شاہین بھابی بھی منہ مٹائی باہر نکل گئیں۔

”کیا سوچ رہی ہو عذرا بیٹی؟“ زائدہ بیگم نے افسردہ سی ہنسی عذرا بیگم کو دیکھا۔ ”مکی امی جان کہ انسان کیا سوچتا ہے اور ہوتا کیا ہے، کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ منورہ پر ایسے مکی آجائیں گے۔“

”ہاں میری یہ بیٹی کچھ غنڈے نصیب لے کر پیدا ہوئی ہے“ زائدہ بیگم نے آہ بھری۔ ”ایسا نہ کہیں امی جان منورہ آپ بہت اچھی قسمت والی ہیں۔ تب ہی تو یہ اتنا کچھ ہو گیا کہ نہ چاہے بھی سب کچھ قبول کرنا پڑا ہے۔ اب شہباز بھائی اور عالم شاہ سے میں خود نمٹ لوں گا“ شہزاد نے منہ نہ میں کہا۔

”وہ تو سب درست ہے مگر میں اب آغا جی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ سیدہ سے نظریں کیسے ملاؤں گی؟ کریں گے کہ خود ہی اتنا اصرار کیا، سب کچھ باغ دکھائے اور عذرا بیگم کو تو بس یہ شرمندگی کھانے جا رہے ہیں“ اس میں کسی کا کیا قصور ہے بیٹی۔ ہمیں کب معلوم تھا کہ تقدیر ہمارے ساتھ کیا کرنے والی بھائی بہت سمجھ دار ہیں۔ صورتحال جان لینے کے بعد وہ ناراض نہیں ہوں گے، تم خواہ مخواہ ملال نہ کرنا۔

”بھو! آج سچہ بھی بھر ہوگا، انشاء اللہ۔“

زائدہ بیگم ہماز کے لئے اٹھ گئیں۔ اب کمرے میں شہزاد اور عذرا بیگم رہ گئے تھے۔ شہزاد ہاتھوں کو آپس لٹکائے بیٹھا تھا۔ عذرا بیگم کو اس پر ترس آ گیا۔

”شہزاد اعلیٰ ایک بار پھر تمہاری زندگی سے نکل گئی۔“

عالی کے نام پر ایسی نرس شہزاد کے دل میں ابھی کدو کراہ اٹھا۔

”عالی میری زندگی میں آئی ہی تھی۔ البتہ یہ ذکر ضرور ہے کہ یہ زندگی جو میں نے عالی کے نام کر رکھی وہ حادثاتی طور پر نورین کے نام کرنا پڑی، ورنہ آپ سچ چاہیے آپ! اتنا تو میں عالی کو کھو کر نہیں ٹوٹا تھا جتنا ان کے ساتھ شادی کر کے ٹوٹا ہوں۔ اگر تقدیر اتنا بے بس نہ کرتی۔ بہن کا معاملہ نہ ہوتا تو عالی کے سوا اس کی میں کوئی دوسری لڑکی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ ورنہ شادی پر جو میری کیفیت ہے، آپ سے زیادہ کون جان سکتا۔ میں نے کوئی خوشی سے تو نورین کو قبول نہیں کیا۔ اس میں سوائے مجبوری اور مصلحت کے کوئی جذبہ نہیں۔“

شہزاد لہجہ نرم زخم تھا۔ زندگی میں پہلی بار عالی کو چاہا اور اتنا کہ وہ رگ و جان ہو گئی مگر اس کا حصول اتنا ہی لہو لہا اور جب یہ حصول ممکن ہوا تو یہ سب کچھ ہو گیا۔ شہزاد اپنے کمرے میں آیا تو کمرے کو دلہن کی طرح سجا کر حیران رہ گیا۔ وہ تو عالی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ نظریں نیچی۔ ہوتی تو بیڈ پر نورین دلہن بن کئی بیٹھی تھی۔ وہ سر آؤ بھر کر رہ گیا۔ کتنا ارمان تھا کہ یہ کمرہ جلد عروسی بنے اور پھولوں کی سج پر عالی ارمانوں کی دلہن بنی اس کی لہو لہا۔ سب کچھ ہوا مگر سچ پر عالی کی بجائے نورین اس کی شہتر تھی۔ جانے کیوں دل بھگ گیا۔ وہ آگے نہیں ماموں کی لئے مڑ گیا۔

”شہزاد!.....“ نورین نے آہستگی سے شہزاد کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تو شہزاد مڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ دلہن لہو لہا میں نورین بہت خوبصورت لگ رہی تھی مگر آنکھوں سے سادہ بہرہا تھا۔ شہزاد شرمندہ ہو گیا۔

”آپ نے بھی منہ موڑ لیا تو میں کہا جاؤں گی شہزاد؟“

”نورین نورین! تم جانے کیا سمجھیں، میں تو..... ہاں تو میں جھمیں رونمائی میں دینے والی انگوٹھی بھول آیا ہوں لیکن جارہا تھا۔“

جلدی میں یہ مناسب جھوٹ بھی کام آ گیا مگر نورین سب کچھ سمجھتی تھی، اس لئے اس کے چہرے پر شک نہیں ٹھہری۔ وہ شہزاد کا بازو پکڑ کر لے آئے اور صوفے پر بٹھا کر خود قالین پر شہزاد کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر لگی۔

”شہزاد! آپ کے شفاف چہرے پر جھوٹ چھائی نہیں۔“

”اے اے! اے سوری نورین! شہزاد نے ندامت سے نورین کو دیکھا۔

”اس کی ضرورت نہیں شہزاد! میں جانتی ہوں کہ حیران باجی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہاں اپنے جلد میں میں اپنے ارمانوں کی سچ پر آپ عالی کو دیکھنا چاہتے تھے لیکن تقدیر نے مجھے آپ پر مسلط کر دیا۔ لیکن شہزاد! عرف میں بھی میں کہ اپنی خوشی کی خاطر خود غرض ہو جاؤں اور آپ کے ارمانوں کی قاتل بن جاؤں۔ مجھے اسے خدا کی اور قسم ہے سہاگ کی اس قسم کی۔ آپ عالی کو دلہن بنا کر لے آئیے، خدا کی قسم! اتمام عمر اس کی ملازمہ بن کر رہوں گی۔“ اس کی لیکن میں آپ کو افسردہ نہیں ہونے دوں گی۔ پلیز آپ مجھے پر اعتبار کر کے تو

”صالیہم انجانے ہماری اس بیٹی کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ ایک اور اچھا رشتہ تھا۔ وہ بھی تقدیر کے اس بل کی غیر ہو گیا۔“

”واقعی آپ درست کہہ رہے ہیں۔ شہزادہ بہت اچھا بچہ تھا مگر جو ہماری بیٹی کی تقدیر۔ عذرا تو بہت روٹی ہے۔ عانی نامک رہی تھی۔ اب بھلا اُس کا بھی کیا تصور ہے۔ خیر اچھے لوگ بہت ہیں دنیا میں۔ میں نے ملے اُس سے کہہ رکھا ہے کہ اچھے رشتے بتائیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ قدیرہ کے خاندان میں ایک اچھا رشتہ ہے۔ اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔“

”یہم جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو بہت دیر ہو گئی۔ اس عمر میں تو بیٹی کو اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔ بخدا ہم تو نور سے بھی لگا ہیں نہیں ملا پائے۔“ آغا جی ندامت بھرے لہجے میں بولے۔

”آپ فکر نہ کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد ہم اس فرض کو ادا کریں گے۔“

یہ کہتے ہوئے صالہ یسکم کے دل میں ہوک اٹھی۔ یہ عانی ہی تو تھی جو اُن کے فرمان کی امانت تھی جن کو وہاں لہن کے روپ میں دیکھنے کی تمنا ہی رہی۔ سب سے زیادہ دکھ سیدہ کو ہوا تھا۔

”ہائے میری بہن کی قسمت! اتنا اچھا رشتہ تھا۔ شہزادہ جیسا لڑکا اب کہاں ملے گا؟“

”سیدہ کیوں نا امید کی باتیں کرتی ہو۔ ٹھیک ہے شہزادہ اچھا لڑکا تھا عانی کے لئے لیکن اللہ مسبب الاسباب ہے۔ دیکھنا شہزادہ سے اچھا شہزادہ ملے گا عانی کو“ رحمن بڑی دیری سے سیدہ کو سمجھا رہے تھے جو مسلسل روتے جا رہی تھیں۔

”نہ ملے گا آپ لوگوں کو خیال ہوتا تو جرأت تھی فرمان کی وہ وہاں شادی رچا کر بیٹھ جاتا۔ ظاہر ہے ہاپنے بیٹے بھائی کی خوشی میں خوش ہیں۔ ہمارا کیا ہے۔“

سیدہ، سیدہ خدا کے لئے مت کرو جاہلوں ایسی باتیں بجانے تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو، سب کے خلوص بڑھ کر نہ لگی ہو، سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ حقیقت کیا ہے۔“

بہلی بار رحمن طیش میں آئے تھے، وہ بھی سیدہ کی جلی کٹی باتوں سے تنگ آ کر۔

”میں جانتی ہوں حقیقت کیا ہے۔ زندگی تو میری بہن کی برباد ہوئی ہے ناں“ سیدہ روئے جا رہی تھیں کہ ہالہ اندر آئی۔

”رحمن بھیا! آپ کو یا سین بھائی ملار ہے ہیں۔“

”اچھا تم ذرا اپنی بہن کو سمجھاؤ اس کا تو“ رحمن غصے میں باہر نکل گئے۔

”کیا ہوا ہے آپ کو آپ؟“ عانی نے اُن کا شانہ چھوا تو وہ اُس سے لپٹ گئیں۔

”تمہارے لئے نصیبوں کو رو رہی ہوں میری بہن، بھانجے خدا نے کیا لکھ چھوڑا ہے تیرے نصیبوں میں۔“

”اوہو میری آپا کو شہزادہ کی شادی کا صدمہ ہوا ہے۔ پہلے فرمان کی شادی پر رونا پڑا، اب شہزادہ کی شادی پر اُپ رہ رہی ہیں۔ نمئی بات ہے آپا بہت نمئی بات۔ اس لئے کہ شادیوں پر رونا نہیں ہنسا چاہیے، خوش ہونا چاہیے“ سائے نے اُن کے آنسو صاف کئے۔

”اُسے ایسی شادیوں کو تو میں آگ لگا دوں جن میں میری بہن کے سہرے کے پھول نہ کھلیں۔“

دیکھئے۔“

نورین احسان مندی کے بوجھ سے اتنی جھکی ہوئی تھی کہ سر بھی نہیں اٹھا سکتی تھی اسی لئے تو اُس دن کی دلہن ہو کر وہ فیصلہ کیا تھا جو عورت کبھی بھی نہیں کر سکتی، اس وقت جو شہزادہ کے دل کی کیفیت تھی وہ عانی کو کھو تو وہ پہلے ہی چکا تھا، اب وہ زندگی جو اُس کی محبت کے نام کر دی تھی، وہ بھی کھوئی تو درد کا یہ آباد ہو گیا، میسوں کو دہاتے ہوئے اُس نے نورین کے ہاتھ تمام کر سونے پر بٹھا دیا اور خود کھڑا ہو گیا۔

”حمیرا بھابھی نے جو تمہیں بتایا نورین! وہ سو فیصد سچ ہے، عانی ہی میری زندگی میں آئے ہیں۔“

تھی جسے میں نے دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے لیکن پانہ سکا، کیونکہ اُسے چاہتا تو میرے اختیار میں تھا۔“

میرے اختیار میں تھا۔ اور اُسے نہ پانے کا روگ تو ایسا ہے کہ ساتھ ہی جائے گا۔ لیکن تم میری عزت اور تمہاری عزت میں، اختیارات میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں جو شکایت نہ ہو البتہ تمہیں گھر میں تھوڑی بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

شہزادے غبار غبار چہرے کے ساتھ نورین کو دیکھا۔

”مجھے آپ جیسا سامنے مل گیا ہے تو اور کسی کی مخالفت کی پروا نہیں اور پھر یہ وقتی مخالفت ہے۔ ہو جائے گا۔ میں سب کو راضی کر لوں گی۔ سب ٹھیک ہو۔“

”چلو کچھ دنوں کی بات ہے پھر ہم باہر چلے جائیں گے“ شہزادے نے اپنے بازو پر رکھے ہوئے ہاتھ تمام لیے۔

”مگر کیوں شہزادہ! ہم باہر کیوں چلے جائیں۔ میں امی جان کی محبتوں کے سائے تلے رہنا چاہتی ہوں۔“

نورین بے چین ہو گئی کیونکہ ایک عرصے کے بعد کسی صورت میں اُسے اپنی ماں کی جھلک نظر آنی لگی۔

”یہ امی جان ہی کا فیصلہ ہے اور حمیرا بھابی کا بھی یہی خیال ہے کیونکہ عالم شاہ اور شہباز بھائی کی کڑا جوابی کاروائی کا خدشہ ہے۔“

”شہزادہ! کرنے دیں اُن کو کاروائی۔ میں دنیا کی ہر عدالت میں اپنے بھائی کو شکست دے دوں گا۔“

پڑوسی لکھی عاقل، بالغ لڑکی ہوں۔ میں اپنا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ بھائی جی اتنی مظلومہ نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ میں شہباز سے نفرت کرتی ہوں اور مجھے اس کا انکار ہے، جو حق ہمیں مذہب اور قانون نے دیا ہے، انسان کیسے روک سکتے ہیں، آپ فکر نہ کریں۔“

ہو جائے گا۔“ نورین نے یقین دہانی کرائی۔

”لیکن نورین ہمیں کچھ عرصے کے لئے جانا پڑے گا باہر۔“

”جیسا آپ کا حکم۔“ نورین نے سر جھکا لیا۔

فرمان کی شادی کے بعد ”آغا والا“ میں یہ دوسری اُداس شام اُتری تھی کیونکہ فرمان کے بعد لڑکا تھا جس پر آغا جی کو اندھا اعتماد تھا۔ یہ رشتہ ایسا تھا کہ اس میں کسی پھان پھک کی ضرورت نہیں تھی۔

بھی نوٹ لگتی تو آغا جی سر تمام کر رہ گئے۔



”جی ہاں احساس ہے۔ اگر آپ بات نہیں کر سکتیں تو میں خود بخود کر دوں گی۔“

”تم ایسی کوئی حقاقت نہیں کرو گئی، آغا جی کیا سوچیں گے۔“

اور پھر آغا جی کی کوششیں بار آور ہو گئیں اور انہوں نے ڈاکٹر ظفر کو عابی کے لئے پسند کر لیا۔ مگر میں بھی پریشان نہ ہوا۔ سیدہ بھی خوش ہو گئیں لیکن عابی ہتھے سے اُکھڑ گئی۔

”آپا میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے شادی نہیں کرنی پھر بھی۔“

”اور تمہارا کیا خیال ہے ہم تمہاری اس نادانی کو قبول کر لیں گے اور تمام عمر اُس بے وفا کے نام پر مزار کی اجازت دے دیں گے۔ ظفر بہت اچھا لڑکا ہے۔“

”مجھے کسی کی اچھائی برائی میں کوئی شبہ نہیں آپا۔ بس میرا دل نہیں مانتا شادی کرنے کو۔“

”عابی میری جان مت کرو ایسی باتیں۔ یہ ساری باتیں افسانوں، قلموں میں تو اچھی لگتی ہیں مگر حقیقی زندگی میں ان کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں اس لئے کڑی کی شادی ہو جاتا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ایک تحفظ مل جاتا ہے، ابنا ایک گھر ہوتا ہے، شوہر کا سپارا ہوتا ہے۔ شادی نہ ہونے سے لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں کہنا ہے اس میں کیا کئی کئی، کیا خرابی تھی کہ شادی نہ ہوئی۔ اس لئے میری جان سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ عمر کا سورج ڈھلے لگے تو کوئی نہیں پوچھتا۔“ سیدہ اُسے سمجھا رہی تھی اور وہ خاموشی سے سر جھکائے سن رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب نکالے پڑھی اور کھڑی ہو گئی۔

”کیا زندگی کا مقصد صرف شادی کرنا ہی ہے، کیا تحفظ صرف شوہر ہی دے سکتا ہے نہیں آپا! یہ تو کمزور ہمارے ہیں جو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتے ہیں لوگ..... باتیں بناتے ہیں تو بنایا کریں۔ ہمارے اپنے ضمیر تو مطمئن ہیں ناں اور پھر شادی تو خوشی کا نام ہے اور جس شادی سے خوشی نہیں ہوتی، اُس سے کیا فائدہ اور پھر جب آپ ہیں، آغا جی ہیں تو مجھے کسی اور سہارا کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

”عابی زندگی کا سوا دایسے مفروضوں پر نہیں کیا جاسکتا، کتابیں پڑھ کر وہی فلسفہ بولنے لگی ہو، حقیقت کی دنیا ملنا آؤ اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ آغا جی تمہارے فیصلے کے منتظر ہیں۔“

”آپا آپ تو میری بہن ہیں۔ کیوں زچ کر رہی ہیں مجھے، وہ رو ہانسی ہو گئی۔“

”اس لئے کہ عابی میں بہن ہوں جو دکھ مجھے تمہارا ہے اور کسی کو نہیں اور میں تمہیں ناکام اور نامراد نہیں دیکھ سکتی تھی۔“

”آپا فرمان کے ساتھ جینا میرا مان تھا اور اُن کے نام پر مرنا بھی میری آرزو ہے، ایک تو پوری نہ ہوئی، دوسری تو ہونے دو۔“

”تم تو پاگل ہو گئی ہو“ سیدہ ناراض ہو کر باہر نکل گئیں تو عابی تکیہ بھگونے لگی۔

”فرمان کیسے لوگ ہیں یہ میرے ساتھ جینا آپ کو گوارہ نہیں ہوا اور آپ کے نام پر مرنے یہ لوگ نہیں دیتے۔ میں کیا کروں“ وہ تکیہ دیر بے حال ہوئی رہی۔ پھر کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔

”پیارے آغا جی آداب! آج جو مسئلہ آپ کو اور مجھے درپیش ہے، اُس پر میں آپ کے سامنے آکر آپ سے بات نہیں کر سکتی۔ آغا جی میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کس طرح اور کن الفاظ میں آپ کی خدمت میں عرض کروں کہ میں شادی کے لئے تیار نہیں۔ بلاشبہ آپ کا انتخاب ہر بار لا جواب ہوتا ہے مگر میں خود کو کسی دوسرے

”سہارے کے پھول کھانا تو قدر کی بات ہے آپا اور پھر جب میرے ہاتھ میں وہ لکیریں نکلیں تو آپا ہلکان ہوتی رہتی ہیں۔ آپ تو ہر وقت مجھے خود سے جدا کرنے کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں، آپ کو چاہئے کہ میں قلعی میدان میں کیا مہر کے سر کر رہی ہوں جناب میرا بی۔ اے کا زلٹ آگیا ہے اور میں ہاں ہوں۔ کھلائیے مٹھائی، بہن کے پاس ہونے پر۔“

اُس نے بہن کا موڈ بحال کرنے کے لئے ایسی باتیں کرنا شروع کر دیں مگر سیدہ کو وہ بد نصیب رہی تھی جس کا رشتہ ہوتے ہوتے رہ جاتا تھا۔

”عابی اگر ہمارے والدین زندہ ہوتے تو تمہارے ساتھ آیا تو نہ ہوتا ناں“ سیدہ نے عابی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ہونا ضرورت ہوتا آپا! اللہ پریش جو کچھ لکھا ہے وہ نہ تو مٹ سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے۔ آپ باقی رہتی ہیں، سب سے بدگمان ہوتی ہیں۔ یہ سب تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اللہ سے تو بندہ نہیں لڑ سکتا۔ آپ رحمن رحیم سے ناراض نہ ہوا کریں اور نہ ہی آغا جی اور بی بی جان کو غلط سمجھا کریں، ہمارے اپنے بھی بد ہوتے ناں تو وہی کچھ کرتے جو یہ دونوں کرتے ہیں۔“

پھر کتنی دیر عابی بہن کو سمجھاتی رہی، مطمئن کرتی رہی اور اپنے طور پر مطمئن کر کے آگئی۔ کمرے میں کتنی دیر خالی لگا ہوں سے آسمان کی دستوں کو دیکھتی رہی۔ زندگی میں ایسے بھی مرحلے آئیں گے، یہ بھی کہا نہ تھا۔ سوچا تو یہ تھا کہ فرمان کی سنگت میں زندگی پھولوں کی بیج پر گزر جائے گی اور پتا بھی نہیں چلے گا کہ انہوں میں موت آجائے گی مگر خوابوں کی تعبیر اتنی اٹھ ہوئی تھی کہ آنکھوں نے خواب دیکھنا ہی چھوڑ دیئے۔ خوابوں کی اس راہ گزر پر شہزاد کا تو گزر رہی نہیں تھا پھر وہ ملتا نہ ملتا، کیا فرق پڑتا تھا۔ آغا جی اور بی بی جان کوششیں نہ ہو گئی تھیں اور کئی رشتے دیکھے بھی تھے مگر کسی نہ کسی وجہ سے مسترد کر دیئے جاتے۔

جبکہ عابی ان تمام باتوں سے بے نیاز قلعی مہر کے سر کرنے میں مصروف تھی۔ پرائیویٹ انٹر کرنا بعد بی۔ اے بھی پرائیویٹ کر لیا تھا اور اب ایم۔ اے بھی کرنا چاہتی تھی لیکن سیدہ نے سختی سے روک دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے عابی۔ اب پڑھنے کی پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ ایم۔ اے کر لیا تو لوگ کہیں گے کہ بہت عمر ہو گئی۔ اکثر لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے اور پھر تمہیں کوئی ملازمت کرنی ہے۔“

”پلیز آپا! امت کریں ایسی باتیں، نہیں کرنی مجھے شادی وادی کہہ دیں آپ آغا جی سے بھی مجھے نہیں کرنی، مت وقت برباد کریں اپنا۔ میں نے تو صرف فرمان کو چاہا، اُس کے نام پر ہی مرنے والی تھی۔ عابی نے سختی سے کہا تو سیدہ کو رونا آگیا۔

”مت نام لو میرے سامنے اُس ہرجائی کا وہ تمہاری پاکیزہ چاہت کے قابل نہیں۔ آئندہ میرے اُس کا نام نہ لینا“ سیدہ نے نفرت سے کہا۔

”اور آپ بھی سن لیں کہ آپ میں نے زندگی اُسی کے نام کی ہے۔ جیوں گی تو اُس کے نام اور مرنا اُسی کے نام۔ آپ بھی سن لیجئے اور آغا جی سے بھی کہہ دیجیے میرے دل میں کسی دوسرے کی تمنا نہیں۔“

فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”عابی تمہیں کچھ احساس ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو“

کے لئے تیار نہیں کر پائی.....

اس لئے آغا جی! میں آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ دیتی ہوں..... آپ کی محبتوں اور شفقتوں کا دھار ہوں کہ مجھے مجبور نہ کیا جائے..... آغا جی! مجھے پتا ہے کہ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ آغا جی! یہ تو ہوگا، میری خوشی اور مرضی کے خلاف ہوگا..... آپ نے آج تک کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جس میں میری خوشی و رضا شامل نہ ہو اور آغا جی! زندگی کے اتنے بڑے فیصلے میں جب میری خوشی اور رضا شامل نہ ہوگی تو وہ فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔

آغا جی! میری خوشی یہ ہے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی بلکہ کوئی تعمیری کام کرنا چاہتی ہوں، شادی ہوں کہ آپ اپنا فرض پورا کرنا چاہتے ہیں۔

روزِ شہر خدا کی عدالت میں، میں اپنے والدین کو بتا دوں گی کہ آپ نے کتنی سچائی سے اپنے فرائض کئے ہیں۔ میں آپ کو ان کے سامنے شرمندہ ہونے نہیں دوں گی۔ آپ نے ہمیشہ میری بات مانی ہے۔ اب بھی میرا مان رکھ لیجیے۔ میرا دل قطعی شادی کے لئے تیار نہیں ہے اور آپ جانتے ہیں کہ زبردستی کے فیصلے غلط ہوتے ہیں۔ خدا کے لئے آغا جی مجھے زندہ درگور نہ کیجیے ورنہ میں مر جاؤں گا۔ میں نے زندگی میں ایک خواہش کی ہے وہ بھی پوری نہ ہوئی۔ تو..... فرمان کے نام پر جینے اور مرنے کی پہلی اور آخری خواہش میری، پوری کر دیجیے۔ امید ہے کہ آغا جی آپ بیٹی کی زندگی کو اس شادی پر ترجیح دیں گے۔

آپ کی بد نصیب و گستاخ بیٹی..... عالی

”فرمان یہ آپ نے مجھے زندگی کے کن استحقاقوں میں ڈال دیا ہے کہ میں بے شرم بن کر آغا جی کے ہاتھ آگئی ہوں“ خط لکھ کر عالی کتنی ہی دیر دیتی رہی۔

عالی کے خط نے تو آغا جی کی کمری توڑ دی تھی۔ عالی نے تو فیصلہ کرنے کا حق بھی چھین لیا تھا۔

”خدا نے بزرگ و برتر! میں نے تو بڑی صداقت سے اپنے فرائض ادا کرنا چاہے تھے۔ نیوٹن نے تو ہی جانتا ہے۔ آقا! میں نے تو بھائی کی اولاد کی محبت میں اپنے تختِ جگر کو کاٹ پھینکا مگر یہ کیا ہو رہا ہے۔ دنیا والوں کو کیا جواب دوں گا۔ کس کس کو عالی کی خواہش کا بتاؤں گا۔ لوگ مجھے تو جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ خدا واحد بنا! میں کیا کروں۔ کیسے مناؤں اس لڑکی کو جبکہ تیرا بھی حکم ہے کہ زبردستی جائز نہیں ہے۔ میری تو کچھ گناہیں نہیں آ رہی۔“ آغا جی مسلسل خدا کے حضور گڑ گڑا رہے تھے۔ وہ بہت ڈکھی ہو رہے تھے۔

”آپ دل چھوٹا کیوں کرتے ہیں آغا جی! وہ تو بچی ہے، جذباتی ہو رہی ہے، آپ بلا کر سمجھا دیا جائے گی۔“ بی بی جان نے آہستگی سے اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”صالحہ بیگم! ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کریں۔ دنیا والے تو باتیں بنائیں گے کہ جائیداد کو رکھنے کی خاطر دونوں لڑکیوں کا اپنے ترکوں کے ساتھ کیا۔ جب لڑکے نے انکار کر دیا تو لڑکی کی دوسری بیٹی اسے لئے نہیں کی کہ دولت جائیداد باہر چلی جائے گی اور بیگم ہم یہ گھنایا باتیں برداشت کر سکیں گے۔ بیٹی، اس بے وفانا بخاری کی خاطر زندگی برباد کرنا چاہتی ہے“ آغا جی بے چینی سے منہل رہے تھے۔

”گھبراہٹیں نہیں آغا صاحب۔ سب اُسے سمجھا رہے ہیں۔ وہ مان جائے گی اور اگر نہ بھی مانے تو ہم

میں اب اس کی بات تو نہیں مان سکتے نا“

”نہیں بیگم! اس کے ساتھ زبردستی نہیں ہوگی۔ یہ عمر بھر کے فیصلے ہیں جن میں زبردستی نہیں ہونی چاہیے۔ میں تو زبردستی کا قائل نہیں، عمر بھر کے فیصلے پسند کے ہونے چاہئیں“ آغا جی کی اس بات پر صالحہ بیگم نے دلی گناہوں سے شوہر کو دیکھا۔ اُن کا بی چاہا کہ پوچھیں کہ اگر زبردستی کے قائل نہیں، عمر بھر کے فیصلوں میں پسند کو ترجیح دیتے ہیں، تو میرے بیٹے نے ایسا کونسا ناقابلِ گناہ کر دیا تھا کہ آپ نے اُسے جلا وطن کر دیا۔ میری ممتاز کو بیٹے کی جدائی کی آگ میں جھلنے کے لئے چھوڑ دیا مگر وہ کچھ بھی نہ کہنے پائیں۔

..... پھر تمام گھر والوں نے طرح طرح کے دلائل، تجربات و مشاہدات کی روشنی میں سمجھایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سیدہ بے حال ہوئیں مگر عالی نہ مانی۔ تنگ آ کر عالی آغا جی کی پناہ میں آگئی۔

”آغا جی! اچھا لیجیے مجھے۔ یہ لوگ مجھے جینے کا حق بھی نہیں دے رہے آغا جی۔ آج میرے اپنے والدین ہوتے تو کوئی مجھ پر زبردستی نہ کرتا، میں کسی پر بوجھ نہ ہوتی۔“

”خاموش ہو جاؤ عالی میری بیٹی، ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا اور میں خود کو ختم کر ڈالوں گا کہ میری پرورش اور میری محبتوں میں اتنی کمی رہ گئی تھی کہ تمہیں اپنے والدین یاد آ رہے ہیں۔ بیٹی شرمندہ مت کرو۔ میں اپنی ہی گناہوں میں گر جاؤں گا۔ ٹھیک ہے تم جینا چاہتی ہو تو جیو۔ میں دنیا و آخرت کا ہر عذاب سہجے کو تیار ہوں۔ تیار ہوں ہر سزا کے لئے کیونکہ مجرم بہر حال میں ہی ہوں ناں میرا نہ بیٹا تو فرمانی کرتا اور نہ آج مجھے تم سے شرمندہ ہونا پڑتا لیکن میری بیٹی، میرے خلوص و میری محبت پر شبہ نہ کرنا۔“

آغا جی، عالی کو ساتھ لگائے بچوں کی طرح رو پڑے۔ اسکے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی۔ سب اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہے۔ سیدہ کو تو جیسے عالی کی شادی کا روگ لگ گیا۔ وہ اس کا ذمہ دار صرف فرمان ہی کو سمجھتی تھی کہ نہ وہ بد وفا کرتا اور نہ اُن کی بہن بے مراد رہتی۔



”کیا کیا بات ہے فرمان! ایوں چپ چاپ کیوں ہیں، کس کا خط ہے؟“ مریم نے فرمان کا شانہ ہلایا۔

”زمن بھائی کا ہے، لکھا ہے کہ عالی نے تمام عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”اوہو یہ تو بہت بُرا ہوا ہے۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے“

”ہاں ایک بے وفا انسان کے لئے اُسے عمر بھر کا جوگ نہیں لینا چاہیے“ فرمان نے گہرا سانس لیا۔

”یہ سب میری وجہ سے ہوا، نہ میں آپ کی زندگی میں آئی اور نہ آپ کے ساتھ یہ سب ہوتا۔“

”خدا کے لئے مریم ایسا مت کہو کہ خود کو کوئے بیٹھ جانا۔ پہلے ہی بیماری سے اٹھی ہو، یہ سب تو تقدیر کے مکمل ہیں اور خدا کی قسم! میں آج تک اپنے فیصلے پر پچھتا یا نہیں۔“

”آپ نہیں پچھتاتے فرمان! لیکن تقدیر نے مجھ سے تو انتقام لیا ہے ناں، فرمان میرے دو بیٹے سال سال بھر کے ہو کر مجھ سے چھڑ گئے، اگر خدا نے اُن کو لے لی لینا تھا تو دیا کیوں تھا۔ آپ کو پتا ہے فرمان، یہ عالی کی آئیں ہیں۔ یہ آغا جی اور بی بی جان کی بددعا میں لگی ہیں ہمیں، آپ ہمت کر کے آغا جی سے معافی مانگتے لیتے ہیں اُن کے پاؤں پر جاتی تو شاید میرے بچے نہ مرنے، ہے نا فرمان نہیں مرنے ناں۔“

نورین کی آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ نورین بڑے اعتماد سے شہزاد کے پہلو میں کھڑی تھی۔  
 ”نورین! اہم کہاں دفع ہو گئی تھی۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گا“ عالم شاہ جنونی انداز میں نورین کی طرف  
 بھاگتا ہوا اور میاں میں آ گیا۔

”سوچ سمجھ کے عالم شاہ، نورین اب میری بیوی ہے، اس لئے اس سے بات احتیاط سے کرنا۔“  
 ”شہزاد! شہزاد! تم نے یہ گھٹیا حرکت کی ہے نورین کو تم بھگا کر لے گئے“ شہباز شہزاد کی طرف بڑھے۔  
 ”جی نہیں! نورین شہزاد کے ساتھ نہیں، آپ کی بہن حمیرا کے ساتھ گھر سے گئی تھی“  
 ”حمیرا کے ساتھ“ شہباز علی کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔  
 ”جی ہاں! حمیرا کے ساتھ اس روز جو ملی میں وہی آئی تھی مجھے لینے اور میں اس جہنم سے ان کے ساتھ اپنی  
 مرضی اور فٹالے ہوئی تھی۔“

”اچھا اب میں سمجھا کہ حمیرا کی اس چال کو پہلے کیوں نہیں سمجھ پایا۔ اسی لئے اس نے اپنے حصے کے  
 کاغذات میرے حوالے کر دیئے تھے۔ حمیرا نے بہن ہو کر میرے ساتھ یہ کیا میں۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں  
 کروں گا۔ میں بھی کہوں کہ اتنی آسانی سے کاغذات لکھ دیئے گئے تھے، دیکھ لوں گا حمیرا میں تمہیں بھی“ شہباز نے  
 بڑبڑ سے مکاناتے ہوئے کہا۔ عالم شاہ الگ شعلے اگل رہا تھا۔  
 ”نورین! تمہیں شرم نہ آئی خاندان کی عزت کو کد لگاتے ہوئے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں  
 کس نے اتنی جرأت دی کہ اپنی پسند سے شادی کرو۔“ عالم شاہ غصے میں بھڑک کر نورین کی طرف بڑھ رہا تھا۔  
 ”نورین! جو کہنا ہے، جلدی کہو، میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔“

”جی بہتر..... بھائی جی۔ آپ اس قابل تو نہیں کہ آپ کو بھائی جیسا سار جہ دیا جائے مگر یہ خدا کی طرف سے  
 ہے۔ میں تو آپ کی قید میں بے بس پرکٹی چڑیا تھی۔ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میری فریاد سن لی اور مجھے  
 بال پر عطا کئے تمیرا بہتی کی صورت میں، کتنی عجیب بات ہے بھائی شیطان اور بہن رحمت کا فرشتہ ہے۔ بہر حال  
 حمیرا باجی نے مجھے عزت کی زندگی کی نوید دی تو بھلا میں کیسے انکار کر دیتی۔ آزادی کے بُری لگتی ہے۔ میں اپنی  
 فحش سے حمیرا باجی کے ساتھ گئی اور اس شادی میں اپنی رُو، اور خوشی کا اظہار کر دیا۔“

”یقیناً تمہیں کس نے دیا کہ تم اپنی زندگی کے فیصلے ریتی پھرتی پھر“ عالم شاہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔  
 ”یقیناً مجھے میرے مذہب نے دیا۔ پھر مجھے کسی کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ پھر میں عاقل ہوں، بالغ ہوں اور  
 اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا شعور رکھتی ہوں اس لئے میں نے شہزاد سے شادی بھائی ہوش و حواس کی ہے اور اپنی  
 پسند اور فٹالے سے ہے اور میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ عدالت سے رجوع کرنے کی غلطی نہ کیجیے تو بہتر  
 ہوگا کیونکہ میں ہر عدالت میں یہ کہوں گی کہ میں نے یہ شادی اپنی پسند سے کی ہے اور اگر آپ نے مزید کچھ کیا تو  
 میں آپ پر بھی مقدمہ کر سکتی ہوں کہ آپ نے کس طرح میرے حصے کی جاگیر مضم کی ہے۔ میری شادی تو ہو چکی  
 ہے میری رضا سے۔ اگر آپ نے عدالتی کارروائی کرنی ہو تو خود بھی تیار رہیے کیونکہ میں بھی اپنی جائیداد کا مطالبہ  
 کر سکتی ہوں۔“

نورین اتنے جوش اور اعتماد سے بول رہی تھی کہ عالم شاہ کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی چڑیا سادل  
 رکھنے والی معصوم لڑکی ہے۔

اوپر تلے دو بیٹوں کی وفات نے اور ایک سال میں والدین کی وفات نے مریم کے ذہن پر گہرا اثر کیا  
 اس کی پچیس ہی خشک نہیں ہو پا رہی تھیں۔

”مریم! یہ سب تمہارا اہم ہے۔ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے اور جس کی جتنی زندگی لکھی ہو  
 ہو جاتی ہے۔ میرے آغا جی اتنے بھی سخت نہیں ہیں۔ وہ ہماری شادی پر ہرگز معترض نہ ہوتے اگر درمیان میں  
 عالی نہ ہوتی تو۔“

”ہاں عالی کی تو ساری بات ہے فرمان، جانے دو، وہ آپ کو کتنا چاہتی ہے کہ اس بے وفا کی کے بارے  
 آپ کے نام پر زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ چاہنے والوں کی آہوں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ جب ہی تو ہم اب  
 بے مراد ہیں۔ فرمان خدا ہمیں اولاد دے کر چھین لیتا ہے، کیا ہے یہ سب“ مریم بُری طرح کھرجی۔

”تمہارا کیا خیال ہے مریم عالی مجھے بدعا کیں دیتی ہوئی، ہرگز نہیں۔ یہ تو ہماری اپنی تقدیر ہے کہ ہم  
 اپنی گستاخیوں کی سزاں رہی ہے کہ خدا کو یہی منظور ہے۔ مبرک کرو۔ اللہ ہمیں ضرور زندگی والی اولاد سے نوازا  
 گا۔ رحن بھائی نے لکھا ہے کہ میں عالی کو خط لکھوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ شادی کے لئے تیار ہو جائے۔“

”ایسا ہو سکتا ہے فرمان، عالی ضرور مان جائے گی۔ آپ اُسے ضرور خط لکھیں بلکہ ہم خود چلتے ہیں۔  
 عالی کے بیروں میں پڑ جاؤں گی۔ وہ میری بات مان جائے گی۔ اگر وہ کہے کہ تو میں آپ کو اس کے حوالے  
 کر دوں گی۔ آپ سے دست بردار ہو جاؤں گی فرمان۔ آپ نہیں جانتے کہ میں کتنی اذیت میں ہوں“ مہتابا  
 ماری مریم دو بیٹوں کی جدائی میں دیوانی سی ہو گئی تھی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا مریم، تم دو اکھا کر لیٹ جاؤ، اگر ضرورت پڑی تو ہم خود چلے جائیں گے۔  
 رحن بھائی سے مشورہ کر چکا ہوں۔“

فرمان نے مریم کو مطمئن کر کے لینا دیا اور خود خط لکھنے بیٹھ گئے۔



شہباز اور عالم شاہ میں ٹھن چکی تھی کیونکہ شہباز کا خیال تھا کہ عالم شاہ نے اُن سے پرانی دشمنی کا بدلہ  
 ہے نورین کا چکر دے کر کاغذات قبضے میں کر لئے ہیں اور لڑکی کو خود ہی غائب کر دیا ہے۔

”یاد رکھو عالم شاہ! اگر لڑکی تم نے خود غائب کی ہے تو یہ بات تمہیں بہت پہنچی پڑے گی۔ میں کچھ نہ  
 دیکھوں گا۔ اگر وہ لڑکی نہ ملی تو بات مقدمہ بازی تک آ جائے گی۔“

”شہباز مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں ایسا کیوں کرنے لگا جبکہ میرا مقصد بھی پورا ہو گیا تھا یعنی کاغذات لی گئے  
 تھے، پھر میں ایسا کیوں کرتا“ عالم شاہ ہنسی ملی بنا ہوا تھا۔

”اور تم جانتے ہونا کہ کاغذات تمام جاگیر کے تمہیں کس لئے دیئے ہیں۔ اگر تم دو دن تک حاضر نہ  
 کر سکتے تو شرافت سے میری جائیداد کے کاغذات میرے حوالے کر دینا اور نہ میں اتنا اچھا دوست نہیں ہوں  
 نہ اذیت ہوں، سمجھتے تم۔“

”شہباز! اہم خواہو ہی گرم ہو رہے ہو یا ر! میری بہن مگر سے غائب ہے اور تم بھی مجھ پر الزام لگا  
 ہو، خیر فکر نہ کرو، میں دیکھنا اُسے ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”میں سب جانتا ہوں کیوں شادی کی ہے اُس نے تمہارے ساتھ اور تمہاری زبان پر جائیداد کا نام لگایا ہے۔ تم نے تو ایسا کبھی سوچا نہ تھا اور نہ ہی جائیداد کا نام لیا تھا۔ ہونہہ میں سمجھ گیا ہوں حمیرا بیگم نے بھی بدانتظامی کرنا نہ لگایا ہے کہ اُدھر بھائی کو جائیداد کے کاغذات دے کر فارغ کر دیا اور اُدھر تمہیں اُڑا کر لے گئی تاکہ اپنے کاغذات واپس لے سکے۔ لیکن نہیں حمیرا بیگم، میں یہ خواب پورا نہیں ہونے دوں گا، میں سب جان گیا ہوں۔“

عالم شاہ اب تو بہن کی شادی کو بھول کر جائیداد کی فکر میں لگ گیا تھا اور یہ سب حمیرا کی ڈرامہ بازی سمجھتا تھا۔

کتنے چھوٹے لوگ ہیں آپ کہ جائیداد اور جاگیر کے علاوہ آپ لوگوں کی سوچ بلند ہوتی ہی نہیں۔ ایک انسان کے مقابلے میں آپ لوگ زمین کو اہمیت دیتے ہیں جس زمین میں بالآخر انسان کو دفن ہو جاتا ہے۔“

”تم چپ رہو۔ میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔“

”بھائی جی! یہ میرے شوہر ہیں اور آپ کے بہنوئی ہیں اور ان کی عزت کرنا آپ پر فرض ہے کیونکہ ہمارے خاندان میں دامادوں کی بہت عزت کی جاتی ہے۔“ نورین شہزاد کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

”ہونہہ! بہت زبان چل نکلی ہے، کاٹ نہ ڈالوں تو عالم شاہ نام نہیں۔“ عالم شاہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے، نورین نے ویسے ہی ہاتھ کاٹ کر رکھ دیئے تھے۔ اب تو وہ عدالت سے بھی رجوع نہیں کر سکتا تھا۔

”اچھا تو ہم کب عدالت میں حاضر ہو جائیں، ذرا جلدی کرو بیجے گا بھائی صاحب کیونکہ ہمیں باہر جانا مہنگا ہے۔“

ورنیک کام جلدی ہو جائیں تو بہتر ہے۔

شہزاد نے مڑ کر عالم شاہ کو دیکھا۔

”میں کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے۔“ عالم شاہ چیخ پڑا۔

عدالت میں جانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو پھنس کر رہ گیا تھا۔ شہزاد نورین کا ہاتھ پکڑا اور لے آیا تو غصہ روتا ہوا آ گیا۔

”دوست کی قبر پر فاتحہ نہیں پڑھیں گی بی بی!“

”کیا کہہ رہے ہو کہاں ہیں رشید اور ہاجرہ؟ میں اُن کے گھر جا رہی ہوں۔“

”آئیے میں آپ کو اُن کے گھر لے چلتا ہوں۔“ اور پھر غصہ ان دونوں کو ہاجرہ اور رشید کی قبروں پر لے آیا۔

”یہ ہیں جی ان کے نئے گھر جو ان کی دوستی نبھانے پر دیئے گئے ہیں۔“

”رشید میرے بھائی۔ ہاجرہ میری جان، میری سکھی، میری دمساز۔“

نورین اُن دونوں کی قبروں پر گر گئی۔



فرمان گھبرا کر باہر نکلے۔ دیکھا مس سوزی سیر جیوں سے گری بے ہوش پڑی تھیں۔ فرمان ان کو لے کر ہسپتال گئے۔ ٹریٹ منٹ کے بعد گھر لے آئے۔ مس سوزی فرمان سے شرمندہ ہو رہی تھیں کہ ان کی وجہ سے ان کی سہاگ رات خراب ہوئی۔

”کوئی بات نہیں مس سوزی! خدا کا شکر ہے آپ کو کوئی سیریس چوٹ نہیں آئی۔ ہم تو گھبرا ہی گئے تھے۔“ فرمان نے کہا۔

رحمن کو بہت دن ہو گئے تھے۔ اب وہ وہی سی تیاری کر رہے تھے اور خود کو آئندہ آنے والے طوفان کے لئے بھی تیار کر رہے تھے۔ مریم بہت اچھی لڑکی تھی۔ اتنے سے دنوں میں ان کی اتنی خدمت کی کہ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ اسے بڑے اعزاز کے ساتھ لے کر جاتے مگر ان کو معلوم تھا مریم ایک دھماکا ثابت ہوگی۔ کوئی بھی اسے ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہیں کرے گا۔

”پھر فرمان آئندہ کے لئے سوچا ہے تم نے؟“ رحمن نے سوچوں میں گم فرمان کو کہا۔

”میں نے کیا سوچنا ہے بھئی! آغا جی کا فیصلہ تو مجھے معلوم ہے۔ وہ اب مجھے کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔ بی بی جان تو ماں ہیں۔ سینے سے لگا ہی لیں گی۔ باقیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال آپ کو شش کریں کہ بہن کی کوئی راہ نکل آئے۔“

”تم پر تم کیا پاکستان آؤ گے؟“

”میں آپ کے جواب کے فوراً بعد آ جاؤں گا اور اگر آغا جی نے صاف نہ کیا تو یہیں رہوں گا۔“

”تمہیں کچھ احساس ہے، بی بی جان تمہاری یاد میں کس طرح تڑپتی ہیں۔ تمہاری جدائی کی گھڑیاں مگر

میں کو کن ہیں انہوں نے۔ اب ان کو تمہارا انتظار ہے کہ تم میرے ساتھ آؤ گے۔ ارے مریم تم کیوں رورہی ہو؟“

مریم جو بڑی دیر سے خاموشی کے ساتھ دونوں بھائیوں کی باتیں سن رہی تھیں، اچانک ہی ہچکیوں کے



ساتھ رونے لگی تو رحمن اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے۔

”بھائی جان.....! میں بہت بُری ہوں۔ میری وجہ سے آپ کے گھر میں اتنا انتشار پیدا ہوا ہے بہت شرمندہ ہوں۔“

”ارے مریم! اتنی سمجھدار ہو کر بچوں والی باتیں کر رہی ہو۔ یہ تو قدرت کے فیصلے ہوتے ہیں اور فیصلوں کو ہم انسان رد نہیں کر سکتے ہیں۔ بس یہ ضرور ہے کہ اپنی کم ظرفی کی وجہ سے کھلے دل کے ساتھ اسے نہیں کرتے۔ آغا جی سخت بھی ہیں اور اصول پرست بھی۔ لیکن عابی والا سسٹم نہیں ہوتا تو انہیں پسند کی شادی پر اعتراض نہیں تھا۔“

البتہ اب وہ کسی صورت اس شادی کو قبول نہیں کریں گے۔ تم ملال نہ کرو۔ کبھی نہ کبھی تو برف مچل جائے گی نا۔“

”بھائی جان آپ مجھے لے چلیں۔ میں آغا جی کے قدموں میں گھر کر معافی مانگ لوں گی۔“

”نہیں مریم! تم نہیں جانتیں کہ وہاں کیا قیامت آئی ہے۔ پہلے میں حالات کا جائزہ لے لوں پھر سوچوں گا۔ فرمان! مریم میری بہن ہے، میری بیٹی ہے۔ اس کو ہمیشہ خوش رکھنا۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیکہ جائے گا۔“

رحمن خود بھی جانتے تھے کہ ان کو کھلی تسلیوں سے کسی کو بہلایا نہیں جاسکتا۔ رحمن کو اکیلے اس طوفان کاہل کرنا تھا۔ جہاز میں بھی رحمن سوچ رہے تھے کہ کس طرح بتائیں گے۔ جیسے جیسے فاصلے سمٹ رہے تھے گھر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ نیکی گھر کے مین گیٹ پر رکی تو پاؤں سن من بھر کے ہو گئے۔ کیونکہ بتانا تو ہر صورت ملنا ان کو اکیلا دیکھ کر بی بی جان کا دل سمجھ گیا اور جب رحمن نے لرزتی آواز میں فرمان کی شادی کا دھماکا کیا تو سارے کمرے پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کوئی آواز نہ لگی۔ یوں جیسے الفاظ بھاپ بن کر اڑ گئے ہوں۔

آغا جی کی اپنی لاشی پر گرفت اتنی مضبوط ہو گئی کہ خون رے لگا۔ چہرہ ہڈت ضبط سے سرخ ہو گیا۔ بی بی جان قریب قریب بے ہوش ہو چکی تھیں۔ سیدہ بیگم کو یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی دم گھٹ جائے گا۔ آغا جی لرزنا قدموں سے اٹھے اور رحمن کی طرف بڑھے۔ رحمن کا حلق خشک ہو گیا۔

”تمہیں یہ سب شروع سے معلوم تھا نا؟“ آغا جی کی بھاری آواز نے کمرے کو لرزادیا۔

”نہیں تو آغا جی۔“ رحمن نے خشک حلق کو ترک کرتے ہوئے کہا۔

”جھوٹ مت بکورو رحمن! میں تو اسی وقت کنکا ہوا تھا، جب تم نے اچانک امریکہ جانے کا کہہ دیا تھا۔ آغا جی کے جلال سے سب کانپ گئے۔“

”آغا جی وہ..... وہ اس نے مجبور ہی بہت کیا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر تمہیں نہ آیا تو وہ خودکشی کر لے گا۔“

”تو مرجانے دیا ہوتا۔ ایسی ناخلف اولاد کا مرجاننا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مجھے شک ہی نہیں یقین تھا کہ وہ کیننگی کی حدود کو ضرور چھوئے گا۔ مرگیا فرمان آج سے ہم سب کے لئے۔“

”خدا کے لئے آغا صاحب! ایسا نہ کہیں، اسے معاف کر دیں۔“ بی بی جان تڑپ کے آگے بڑھیں۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صالح بیگم! اولاد مجھے اپنے اصولوں اور وعدوں سے عزیز نہیں۔ وعدہ بھی کے ساتھ جو اپنی اولاد کو میری جھولی میں ڈال کر دل میں حسرتیں لئے نچلے گئے۔ صالح بیگم! سمجھ لاؤ تم نے“

”بچوں کو جنم دیا تھا۔ چوتھا تھا ہی نہیں۔“

”آپ باپ ہیں۔ آپ اس قسم کے سنگدلانہ فیصلے کر بھی سکتے ہیں۔ اور برداشت بھی کر سکتے ہیں۔ میں مان میں اپنے فرمان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ آغا صاحب خدا کے لئے رحم کریں میری متا پر رحم کریں۔“

”آپ کی متا ایک اصول پرست باپ کی عدالت پر رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔“

”صالح بیگم! میرے فیصلے حتیٰ اور اٹل ہوتے ہیں۔ یہ تم جانتی ہو۔ اس عمر میں تم نے اس نا بھار بیٹے کی خاطر ہونا ہے تو میری طرف سے اجازت ہے۔ تم اپنے بیٹے کے پاس رہ سکتی ہو لیکن یاد رکھو، پھر تمہارا بھی اس عمر اور بچوں سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔“

آغا جی نے مضبوط لہجے میں اپنا حتیٰ فیصلہ سنایا۔ ان کی اس بات پر سبین احمد اور لقمان احمد کچھ کہنا چاہتے تھے مگر اس وقت آغا جی کا جلال عروج پر تھا۔ کسی کی کجالی بھی کہ اوچی سانس بھی لے۔ اس کے بعد پھر آغا جی رحمن کی طرف بڑھے۔

”اب تم یہ بتاؤ تمہیں اتنا اختیار کس نے دیا کہ تم میرے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کرو۔“ آغا جی کا ہاتھ فضا میں ہلایا مگر پھر مشکل نیچے آ گیا۔

”میں..... آپ کا گناہ گار ہوں! عابی! مجھے اس گستاخی کی سزا ملنی چاہیے آغا جی۔ اس نے عابی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی بات نہ ماننے کی صورت میں خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ میں انتہائی پریشان تھا۔ میرے لئے اتنا بڑا فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ آغا جی اس نے اتنا مجبور کیا تھا اور رہا تھا کہ کسی کو نہ بتاؤں۔“

رحمن کسی بچے کی طرح ڈرے سمے اپنی صفائیاں پیش کر رہے تھے۔

”اور تم اتنے سعادت مند ہو کر اس کا ہر حکم مانتے چلے گئے۔ والدین کا تو وجود ختم کر دیا تم دونوں نے۔“

آغا جی کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔

”آغا جی اٹھیک ہے۔ فرمان نے گستاخی کی ہے مگر لڑکی بڑے اچھے پاکستانی خاندان کی ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں اس لڑکی کے سبب و نسب کے بارے میں بتانے کی۔ وہ کسی شاہی خاندان کی لڑکی سے بھی کہیں مجھے تب بھی ناقابل قبول ہوتی۔ ارے میری عابی میں کیا کی تھی کہ اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ میری معصوم سعادت مند بیٹی، میں کس طرح نکلا ہوں اٹھا پاؤں گا اس کے سامنے۔ ارے فرمان! میں بھی تمہیں بدوہ دتا ہوں کہ تم بھی اولاد کے صدے اٹھاؤ تم نے میرا سر جھکا یا ہے۔“

بیٹے کو بدوہ عا کیں دیتے ہوئے آغا جی کی آواز کانپ گئی۔ وہ بستر پر گرے گئے۔

”نکل جاؤ میرے کمرے سے سب لوگ۔ تمہا چھوڑ دو مجھے آن میرا بیٹا مر گیا ہے۔ مجھے تمہارے دوہ جانا۔ چلے جاؤ۔“

آغا جی کے حکم پر سب باہر چلے گئے۔ گھر میں واقعی ایسے سوگ کی سی کیفیت تھی جیسے ابھی کسی کا جنازہ اٹھایا گیا ہو۔ بی بی جان اپنے کمرے میں بے حال ہو رہی تھیں۔ سیدہ بیگم نے الگ رحمن کا دامن پکڑا تھا۔

”رحمن! آپ نے کس جنم کا بدلا لیا ہے مجھ سے۔“ رحمن وہ پریشانی؟ کنکا تو انا کیا ہے رحمن! آپ نے آغا جی کو بھائی عزیز لکھا۔ میری معصوم بہن آپ کی کہا کرتی تھی کہ آپ کو اس کا درد ہوتا۔ رحمن کتنے سنگدل بن گئے۔ آپ مجھے کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ آپ بھائی کے ساتھ کیا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ فرمان خدا تجھے“

خوش نہ رکھے۔ رحمن آپ کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آپ نے مجھے بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ میرا بہن کو کس گناہ کی سزا دی گئی ہے۔ وہ تو اسی بے وفا کے نام کی مالا جیتی رہتی تھی۔ کس ناگن نے میری بھاری مانوں پر ڈاکا ڈالا ہے۔ اس چیل کو خدا کبھی معاف نہ کرے۔“

سیدہ تڑپ رہی تھی اور رکن سر جھکائے نام کھڑے تھے۔ سیدہ مسلسل مریم کو کونسی رہی تھیں۔ حرم کی بہن کی خوشیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

”میری عابی یہ صدمہ کس طرح برداشت کر پائے گی۔ میرا بس چلے تو اس چیل کا خون کروں ہم میری معصوم بہن کی خوشیاں لوٹی ہیں۔“

رحمن نے بتایا نہیں کہ وہ اس پل صراط سے گزر چکی ہے۔ وہ چاہتے تھے اچھا ہے دل کی بھڑاس کا۔ ”رحمن! آپ نے میری زندگی کے ساتھی ہو کر اتنا بڑا دھوکا دیا ہے مجھے۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں سکتی۔ رحمن کبھی نہیں آپ کو کیا خبر کہ میری عابی فرمان کو دیوانگی کی حد تک چاہتی ہے۔ اس کا کیا بے گارہ جائے گی۔ میری بہن کی خوشیاں لوٹنے والی چیل، خدا تمہیں کبھی کوئی خوشی نصیب نہ کرے۔“ سیدہ مسلسل گناہ میریم کو کونسنے دے رہی تھیں۔ جو بالکل بے خبر تھی اس بات سے۔

”مجھے تو گھر بھر ہی اس سازش میں شریک لگتا ہے۔ جو بنگامہ آغا جی نے اب کھڑا کیا ہے، اے بلا نے کے لئے کرتے، اسے سختی سے حکم دیتے تو کیسے نہ وہ آتایا اس کی جرأت ہوتی کہ وہ ان کے حکم سے کرتا۔ یہ سب ملی بھگت ہے، ڈراما ہے۔ میرے سامنے سرخرو ہونے کے لئے ورنہ.....“

”سیدہ تمہیں آغا جی کے متعلق ایسی باتیں سوچتے ہوئے شرم آتی چاہئے۔ انہوں نے تم دونوں کو خاطر اولاد کو حاق کر دیا۔ ان کی خوشیاں قربان کر دیں۔ تم بھی ان کی طرف سے بدظن ہو۔ ٹھیک ہے۔ مگر دار ہوں۔ مجھے تم جو چاہو کہہ سکتی ہو مگر آغا جی کو کیوں الزام دیتی ہو، جنہوں نے بیٹا تک قربان کر دیا۔“

”رحمن اتنی دیر سے سیدہ کی باتیں ان کا حق سمجھ کر برداشت کر رہے تھے۔ سیدہ نے آغا جی کے ظلم کیا تو وہ جب نہ رہ سکے۔ سیدہ مسلسل روئے اور بولے جا رہی تھیں۔“

”دیکھو مانا کہ یہ بہت زیادتی ہے۔ فرمان کو ایسا نہیں کرتا چاہیے تھا مگر اب.....“

”فرمان نے تو جو کرتا تھا رحمن کر لیا مگر..... مگر جو آپ نے کیا۔ میں اسے نہیں بھول سکتی۔ آپ میرے اعتماد کو چکنا چور کر دیا ہے۔ رحمن! خدا کی قسم بہت مان تھا مجھے آپ پر، بہت بھروسہ تھا۔ آپ نے تو مان ہی توڑ دیا ہے رحمن۔“

”سوری سیدہ۔ بخدا تم میری شکش اور مجبوری کا اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ ایک طرف سب کا خدا دوسری طرف بھائی کی زندگی۔ میں کیا کرتا۔ وہ کتنا خدائی ہے، اتنا تو تمہیں بھی پتا ہے۔ مجھے مجبوراً یہ پتا لیکن دیکھو یہ جو بندھن ہوتے ہیں، آسمانوں پر طے ہوتے ہیں۔ جس کے ساتھ لکھا ہوا ہے جاتا ہے۔ اتنا تھوڑا سا بلند ہو جائے تو معاف کر سکتا ہے۔ درگزر معافی وہ فعل ہیں جن سے تمام مسائل حل ہو جاتے۔ ہماری عابی میں خدا کا شکر ہے کسی چیز کی کمی نہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ ہے اس کے لئے۔“

”مگر رحمن! انسان جسے چاہے وہ ہی نڈل سکے تو کتنا بڑا اخلاقیہا ہو جاتا ہے۔ زندگی میں۔“

”ہاں سیدہ وہ خلا تو میرے اندر بھی ہے مگر.....“

سیدہ کی بات کے جواب میں انہوں نے آہستگی سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”یہ خوشخبری آپ ہی عابی کو سنا ڈالیں۔ مجھ میں ہمت نہیں اسے بکھرنا دیکھوں۔“

سیدہ نے کہا تو رحمن جاتے جاتے پلٹ آئے اور سیدہ کو شانوں سے تمام کر بٹھا دیا۔

”اے سب معلوم ہے سیدہ۔“

”کیا..... کیا اسے معلوم ہے؟“ ایک اور دھماکا رحمن نے کیا تو وہ چیخ پڑیں۔

”ہاں فرمان نے سب سے پہلے اسے بتایا تھا اور اس سے رائے لینے کے بعد یہ سب ہوا اور عابی ہی نے بدلتی مجھے وہاں بھیجا کہ کہیں تاخیر کی وجہ سے وہ کوئی منفی قدم نہ اٹھائیے۔“

”ہائے میری بہن۔ میری معصوم بہن۔ تو اکیلی ہی سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ مجھے ہوانہ لگنے دی۔“

”عابی بہت اونچی چیز ہے سیدہ! وہ ان چھوٹی باتوں سے بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بچی کا حامی و ناصر جس حوصلے سے وہ یہ قیامت ٹھیل گئی ہے ناں کوئی اور ہوتی تو شاید گزر گئی ہوتی۔“

جادو پڑا تھا، غریبی بازو اس لئے بر کوئی کر رہا تھا۔ آغا جی نے عابی کو پاس نکلا کر اس کے آگے ہاتھ

نڈھکے۔ تو وہ تڑپ اٹھی۔

”آغا جی۔ خدا کی قسم۔ اب مر گئی ہوں۔ اب بکھری ہوں۔ کسی قدر بد نصیب ہوں میں کہ میرے سامنے

رہے باپ نے ہاتھ جوڑ دیے ہیں آغا جی۔ آغا جی ایسا کرنے سے پہلے گولی مار دیتے تو میں سمجھتی آپ نے

میرے والدین سے کیا وعدہ پورا کر دیا مگر اتنی اذیت نہ دیتے۔ میرے مردہ والدین کو اور میری زخمی روح کو۔“

الانے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے۔

”میری بچی تمہیں کیا خبر۔ میں کس قدر نام ہوں، تجھ سے اور تیرے والدین کی روح سے۔ وہ ناخبر

آتی تیرے قابل نہیں تھا۔ میری بیٹی اس نے تمہیں ٹھکرا کر تہاری توہین کی ہے۔ میری توہین کی ہے۔ میں اسے

احیات معاف نہیں کروں گا۔“ آغا جی لرزیدہ لہجے میں بولے۔

”آغا جی! فرمان نے مجھے نہیں میں نے فرمان کو ٹھکرایا ہے۔ میں نے اسے اس کے ساتھ کی وہ بھیک جو

میں نے اس کے صدمے میں دی گئی تھی۔ لوٹا دی تھی۔ میں نے ٹھکرایا ہے فرمان کو آغا جی۔“

اور پھر اس نے زخم زخم لہجے میں وہ واردات جو قلب حیز پر گزری باپ کی طرح مہربان آغا جی کے گوش

نوا کر کر دی۔ جسے سن کر ان کو مزید غصہ آ گیا۔ گھر میں سب نے ہی اسے ساتھ لگایا۔ اس کے دکھ کو اپنے دل

میں محسوس کیا مگر جب سیدہ نے سینے سے لگا لیا تو عابی کے صبر کے تمام بند ٹوٹ گئے۔ ماں جانی کے سینے سے لگ کر

فرمان پڑے تھے۔ ایک ایک تنہا بین کر رہی تھی۔

”آپا..... آپا خدا کی قسم بہت چاہتا تھا فرمان کو..... مگر.....“

وہ راز جواب تک دل کے نہاں خانوں میں مدفون تھا اب لیوں پر تڑپ کر آ گیا۔

”نہیں گمیری جان۔ تیرے لئے لڑکوں کی کمی ہے۔ بھول جا اسے۔ وہ تیری چاہت کے قابل تھا نہ

تیرے قابل۔ اس لئے اللہ نے بیچا چھڑا دیا۔ مجھے تو مارا ہے رحمن نے ذرا جو ہوا لگ جاتی ناں پہلے تو..... تو میں

بکھری بیٹھ کر..... وہ شادی۔ رحمن کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ سیدہ کو آج کے رحمن پر ہی تاؤ آ رہا تھا۔

”نہیں! آپا! رحمن بہت بے قصور ہیں۔ انہوں نے تو قدم قدم پر میری رائے لی ہے۔ میں نے ہی ان کو بھیجا

ایسی ہمت والی لڑکی ہے کہ مجال ہے جو کچھ ظاہر کیا ہو۔“ قدسیر بانو کی ساری ہمدردیاں عالی کے ساتھ

”ابھی جڑ ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب اتنا سوگ منانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ عالی کے لئے رشتوں کی کیا

لہ ہے۔ ایک رشتہ تو گھر میں موجود ہے۔“

”گھر میں اب کون سا رشتہ موجود ہے عذرا؟“

قدسیر بانو، عذرا بیگم کا مطلب نہیں سمجھیں تو حیرانگی سے ان کو دیکھنے لگیں۔

”کیوں بھابھی جان میرے شہزاد۔ میں کوئی کی ہے؟“

عذرا بیگم کو روز ازل ہی سے یہ چاہتی تھی مگر فرمان کی وجہ سے خاموش تھیں۔

”ارے ہاں اس طرف تو دھیان ہی نہیں کیا۔ لو اور کیا چاہیے۔ ماشاء اللہ شہزاد تو خوب بچے گا عالی کے

ف۔ چاند سورج کی جوڑی رہے گی اور شہزاد تو آغا جی سے لے کر سیدہ تک سب کو پسند ہے۔“

قدسیر بانو خود شہزاد بہت پسند تھا وہ خوش ہو گئیں۔

”تو پھر بھابھی جان بات کریں بی بی جان سے میں اپنے منہ سے بات کرتی اچھی نہیں لگتی۔ میں تو صرف

بالتے چاہتی ہوں کہ میرا شہزاد عالی کو بہت چاہتا ہے۔ پہلے تو وہ فرمان کی وجہ سے خاموش ہو گیا تھا مگر اب تو خدا

نہیہ سوچ دیا ہے تو آپ ضرور کوشش کریں۔“

”کوشش کیا میرے خیال میں تو کسی کو بھی اس رشتے پر اعتراض نہیں ہوگا۔ پہلے جب تم نے بات کی تھی تو

بی جان نے یہ ہی کہا تھا کہ اگر فرمان سے ملے نہ ہوتی تو کر دیتی میں۔ اب تو قدرت کی طرف سے ایسا ہوا ہے

کی کو لگا نہیں ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔“

قدسیر بانو کی یقین دہانی نے عذرا بیگم کو خوش کر دیا اب وہ شہزاد کو یہ خوشخبری سنانے کو بے چین تھیں اور آج

ناؤں جا رہی تھیں کتنی کتنی کھراپا سے فون آ گیا کہ زائدہ بیگم نے بلایا ہے۔

”پھر کیا حکم ہے بی بی جان! جاؤں کہ نہ جاؤں؟“ عذرا بیگم ساس سے اجازت مانگ رہی تھیں۔

”جاؤ بی بی جانے بہن نے کیا بات کرتی ہے۔ جاؤ شاباش۔“

”لیکن بی بی جان آپ کی طبیعت بھی تو خراب ہے میں کیسے جا سکتی ہوں۔“ فرمان کی وجہ سے بی بی جان

الہیت ان دنوں بہت خراب تھی۔

”اوسے کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ یہ سانس کہ ڈور بڑی مضبوط ہے۔ نہیں ٹوٹے گی۔ میرا بچہ

شکے کے لیے چھڑ گیا اور میں زندہ ہوں۔“ بی بی جان پھر نئے سرے سے ادھر کھٹکیں۔

”بی بی جان! کیوں بدگھوٹی کی باتیں کرتی ہیں۔ خدا فرمان کو سلامت رکھے۔ آج نہ کسی کبھی نہ کبھی تو

مٹا کر آئے گا۔ آغا جی اسے ضرور معاف کر دیں گے۔“

قدسیر بانو نے بڑھ کر بی بی جان کو ساتھ لگایا جن کی متاثر رہی تھی۔

”کب لوٹے گا۔ کب معاف کریں گے وہ اسے۔ اس وقت جب میں زندہ ہوں گی۔ اسے ساتے سال ہو

گئے ہوں اپنے چاند کو دیکھ گئے ہوں۔“

”خدا نہ کرے بی بی جان! ایسی باتیں نہ کریں۔ چاہے۔ نقصان کہہ رہے تھے فرمان کو فون کریں گے

تھا۔ اس لئے آپا کہ فرمان میرے نہیں رہے تھے۔ تو مجھے کیا ضرورت تھی پیچھے پڑنے کی۔ ٹھیک ہے ہر

عی جذلوں میں شدت اور صداقت نہ تھی تو کس بھروسے پر اپنا حق جتاتی۔ اس کو حق ہے، وہ جسے چاہتا

کرے۔ میں یہ صدمہ اس کی خوشیوں کا صدمہ سمجھ کر قبول کرتی ہوں۔“

”تم کرتی ہونا قبول لیکن میں تو کسی کو معاف کرنے کو تیار نہیں۔ نہ آغا جی کو اور نہ فرمان کو نہ

سب کی ملی جھکت ہے۔ عالی تم نہیں جانتیں۔“

”نہیں آپا خدا کے لئے آغا جی کے لئے ایسا نہ سوچو۔ وہ تو ہمیں سب سے زیادہ چاہتے ہیں

اپنے زخم پیسے ہوئے بہن کو سمجھا رہی تھی۔

”ان چاہتوں کے راز مجھ پر فاش ہو چکے ہیں۔ میں بھی جان مگنی ہوں سب کچھ۔ فرمان کا ٹھہرا

نہیں کہ بس عاق کر دینے کی سزا اس کے لئے کافی ہوگی۔“ سیدہ بیگم کسی صورت میں بھی ان کو معاف کر

نہیں تھیں۔

”آپا تو اس سے بڑھ کر فرمان کے لئے اور سب کے لئے کیا سزا ہو سکتی ہے کہ زندہ ہی

دوسرے کے لئے مر گئے۔ میں آغا جی کو یہ ظلم کرنے نہیں دوں گی۔ میں جرم کی اپیل کروں گی۔ وہ فرمان

سے لگا لیں گے انشاء اللہ۔“

عالی کو فرمان کے عاق کر دینے کا بے حد دکھ تھا۔ وہ تو خود کو بی بی جان کے سامنے مجرم تصور کرتی

وجہ سے وہ اپنے لاڈلے بیٹے سے جیتے جی بخدا کر دی گئیں۔

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گی عبا بی۔ فرمان کو یہ سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔“ سیدہ زہرا آلود لہجے میں بولی۔

”مت کرو آپا! ایسی باتیں۔ جو میری تقدیر میں تھا مجھے مل گیا۔ میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں۔ کی

حکایت نہیں ہے۔ پھر آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔“

عالی رخصتوں سے چھوڑ چکی تھی مگر پھر بھی احتیاط میں تھی جبکہ سیدہ کے لئے یہ سب برداشت کرنا مشکل تھا

”بہت بُرا کیا ہے فرمان نے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اتنی اچھی پیاری لڑکی کو اس نے

لڑکی تو جوگ لے لے کی تمام عمر کا۔“ قدسیر بانو کو بہت دکھ تھا عالی کا۔

”ویسے حق بات تو یہ ہے بھابھی جان! میں تو فرمان کے حق میں ہوں۔ ٹھیک ہے عالی کے ساتھ

ہوئی ہے لیکن خطا اور فرمان بھی نہیں۔ آخروہ بھی انسان تھا۔ لڑکی خوبصورت ہوگی۔ پسند آتی تو کر لیا

نے تو بس فوراً تباہ فیصلہ کر ڈالا۔“ اس نئی صورت حال سے عذرا بیگم خاصی خوش اور مطمئن تھیں۔

”خیر، آغا جی نے فرمان سے جاتے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ کی تو اس گھر میں

مشکل ہے۔ سوچتی ہوں کیا وہ لڑکی عالی سے زیادہ خوبصورت ہوگی جس نے فرمان کی توجہ اپنی جانب

قدسیر بانو مریم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”ظاہر ہے اچھی ہی ہوگی۔ رخصتیتا تو رہے تھے۔ بہت اچھا خاندان ہے۔ میرے خیال میں

معاف کر دینا چاہیے تاکہ فرمان اپنی ذہن کو گھر لے آئے۔“

”وہ عذرا تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ٹھیک ہے وہ لڑکی بھی اچھی ہوگی۔

نہے مگر عالی کا حق تو مارا گیا ہے ناں اور یہ بات آغا جی کی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اللہ اس

فرمان ہندو نے تو میری چاندی بہن کی قدر ہی نہیں کی۔ شہزاد اسے چاہتا تو ہے ناں۔“ سیدہ جو کچھ دیکھ کر قبل  
فرمانی طرف سے متفر ہو گئی تھیں اب ساری کدورت جاتی رہی۔

”ارے کوئی ایسا ویسا چاہتا ہے سیدہ! اس نے تو شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ عالی نہیں تو کوئی بھی  
نہیں۔ اب جان تو اس کی طرف سے فکر مند ہی رہتی تھیں۔ دیکھو، اللہ کے ہر کام میں بہتری اور مصلحت ہوتی  
ہے۔ فرمان نے اگر دھوکا دیا تو اللہ نے شہزاد کو پہلے سے موجود رکھا۔ تم فکر نہ کرو اب۔“ عذرا بیگم بہت خوش تھیں  
کہ ساری تڑپاں آپ ہی آپ ملتی جا رہی تھیں۔

”بھابی جان! اس رشتے پر تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا مگر عالی نہیں مانے گی۔“  
”اے سمجھانا تہا ازا کام ہے اور پھر شہزاد میں کیا کی ہے۔ تم اسے نیک و بد سمجھاؤ اور جب آغا جی کا حکم ہوگا  
اسے بھی کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو بھابی جان میں تو اس کی فکر میں گھلتی جا رہی ہوں۔ بچپن سے جس کے سنے دیکھ  
نے میں ہی بے وفا لکھا اور اس کے ارمانوں کی سچ پر کسی اور چیز کو دھن بٹا کر بٹھا دیا۔ خدا کبھی خوش نہ رکھے  
سے سیدہ نے ایک بار پھر صدق دل سے فرمان اور مریم کو بد عادی۔

”پلو چھوڑ وسیدہ۔ جس کے جو مقدر میں ہوتا ہے مل جاتا ہے۔ تم عالی سے بات کرو میں انی جان سے  
نہ کرتی ہوں جا کر۔ تاکہ وہ خود بات آگے بڑھا سکیں۔ اور اللہ نے چاہا تو اس عید پر ہم عالی کو دھن بنا دیں  
نہ۔“ عذرا بیگم چشم تصور میں عالی اور شہزاد کو دھن دولہا کے روپ میں دیکھ رہی تھیں۔  
”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بھابی جان! کہ میری عالی بھی دھن بنے۔“  
”آمین۔ انشاء اللہ ہماری عالی چاندی دھن بنے گی۔“



عذرا جب سے میٹھے آئی تھیں بہت خوش تھیں۔ یہ بات نوٹ تو سب نے کی تھی مگر شہزاد نے کچھ یادہ ہی  
نہیں کیا۔ ”آپ آئی آپ اس قدر خوش کس بات پر ہیں؟“

”مجھے خوشی کی بات ہے۔ فرمان نے شادی کر لی ہے۔“  
”شادی کی بات خوشی کی ضرور ہے لیکن آپ عالی کے حوالے سے افسردہ کر دینے والی بات بھی تو ہے۔  
ہو کہ معلوم ہے کہ عالی فرمان کو۔“ شہزاد پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

”ارے چھوڑو بھی۔ یہ لڑکیاں شادی سے پہلے تاج محل بناتی ہیں سپنوں، کے پھر کسی سے بھی شادی ہو  
اسے تو تمام عمر اس کی خدمت میں گزار دیتی ہیں؟“

”نہیں، عالی عام لڑکی نہیں ہے۔ عالی جیسی لڑکیاں جسے چاہتی ہیں ناں آپ ان کی یادوں کے سہارے  
نہ زندگی بسر کر لیا کرتی ہیں۔“

شہزاد کے چشم تصور میں شہزادیوں کی سی آن بان والی عالی اتر آئی۔  
”نہیں شہزاد۔ سب لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ عالی! اہم تمہیں اس لیے لگتی ہے کہ تم اسے چاہتے ہو۔ اور  
نہیں آئی! عالی میری چاہت نہیں، میری دیوانگی ہے۔ ایسی دیوانگی جس نے شعور و ادراک کے درجہ پر

کہ چند روز کے لیے آ کر مل جائے۔ مریم کو بھی ساتھ لے آئے پھر ہم سب کوشش کریں گے کہ آغا جی  
سکیں۔ مجھے یقین ہے۔ آغا جی مان جائیں گے۔“

”ہائیں۔ میرا فرمان۔ میرا بچہ! وہاں لوٹ سکتا ہے۔ وہ آ سکتا ہے تو پھر جلدی کرو۔ میرے بچاؤ  
کیا جانو میرے اندر کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔“  
قدسیہ بانو کی بات نے جیسے بجھے دیے میں تیل ڈال دیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”کیوں نہیں بی بی جان! واہ کمال کرتی ہیں یہ تھوڑی ہے کہ آغا جی نے کہہ دیا تو فرمان اب تمام  
گے ہی نہیں۔ رات کو تین نے بھی یہی پروگرام بنایا تھا۔ آپ فکر نہ کریں انشاء اللہ فرمان کو جلد ملے گا۔  
کوشش کریں گے۔ وہ مریم کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔“  
عذرا بیگم نے بھی یقین دہانی کرائی تو جیسے بی بی جان کی بنیاض تیز چلنے لگیں۔

”اللہ تم لوگوں کو خوش رکھے۔ دل میں شغف کی پڑ گئی ہے۔ اللہ تم لوگوں کی زبان مبارک کرے،  
ساتھ زندگی کے لوٹ آئے تو تمام عمر تم لوگوں کو دعا میں دوں گی۔“ بی بی جان کے انگ انگ سے دعا لیتا  
رہی تھیں۔

”ہونہ میں بھی دیکھوں گی فرمان اس گھر میں کیسے آتا ہے۔ میری بہن کی قاتل کو دھن بنا کر کیسے  
اسے گھر کے آگن میں۔ اپنے دل پر ہاتھ پڑے تو بے پنا لگتا ہے۔ اب تو یہ بڑھ بڑھ کر بول رہی ہیں  
کے کیلے پر ہاتھ پڑتا تو پھر یہ ایسی فراغ دلی دکھائیں تو میں دیکھتی۔ کسی کے دامن میں آگ لگی ہو تو ان  
سجوت سے ہاتھ تپ لیتا ہے۔ جب تپ اپنے دامن تک پہنچے تو چل جاتا ہے۔ میں بھی دیکھ لوں گی سب  
سیدہ جو بی بی جان کے لئے سوپ لے کر آئی تھیں..... عذرا، قدسیہ بانو کی باتیں سن کر باہری لہجہ  
”عذرا بیٹی۔ تم جلی جاؤ۔ ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ بچے چھوٹے ہیں۔ ڈراؤ رے کہو۔ قدسیہ، عذرا کو بھنا  
ہماری بہن ہنسر ہو گی بیٹی کی۔“

”جی بہتر۔“ قدسیہ بانو انھیں تو سیدہ سوپ لیے اندر آ گئیں۔

”بھابی جان! آپ یہاں بیٹھ کر بی بی جان کو سوپ پلائیں۔ سیدہ آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔  
بیگم نے سوپ کا پیالہ قدسیہ بانو کے ہاتھ میں دیا اور خود سیدہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر آ گئیں۔ سیدہ چہرے پر  
کھڑی رہیں۔

”کہہ بھی چکیں بھابی جان! آپ کو پتا ہے۔ مجھے اتنا کام کرنا ہے۔ آغا جی کا حکم کرم کرنا ہے۔  
نے کئی کام مٹوا ڈالے۔“

”اوہو بھئی! تو کر لینا سارے کام۔ بات یہ ہے کہ یہ مٹاؤ، میرے شہزاد کے بارے میں تھمنا  
ہے۔“

”شہزاد بہت اچھا لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ خود بھی ہے اور سعادت مند بھی مگر.....“  
”اگر ایسا ہے تو پھر اگر مگر کیا ضرورت ہے۔ تم فکر مند کیوں ہوتی ہو۔ گھر کا لڑکا ہے نہ ذرا  
چھان پچھان۔ شہزاد عالی کو چاہتا بھی تو بہت ہے پھر کس بات کا انتظار ہے۔ تم ایک بار ہاں کر دو۔“

”ارے بھابی جان! اس بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ شہزاد تو مجھے خود بہت  
ہے۔“



وا کر دیے ہیں۔“ شہزاد جذب سے بول رہے تھے۔

”بس آپ تم دیکھ لو۔ تمہارے جذباتوں میں کتنی جھنجھالی تھی کہ راستہ آپ ہی آپ صاف ہو گیا۔“

”کیا مطلب آپ؟“ شہزاد حیرانی سے مڑے۔

”مطلب یہ کہ تمہاری منزل تمہاری عالی تمہارے سامنے ہے۔ قدم بڑھاؤ اور اپنالو۔“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

بس اب اتنا بھی معصوم بننے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے فرمان نے وہاں شادی کر لی ہے تو اب

شادی بھی کرنی ہے کہ نہیں اور عالی کے لئے تم سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ نہیں ہو سکتا۔“ عذرا نے پیار سے

دیکھا۔

”آپ جان کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“

”کیوں، کیا نہیں خوشی نہیں ہوئی۔ تمہاری خواہش نہیں تھی عالی کو دلہن بنانے کی۔“

”تھی آپی جان۔ زندگی نے ایک ہی یہ تو خواہش کی تھی۔ میں نے اس عالی کا خواب دیکھا تھا۔“

میری ہو۔ اس کا دل صرف میرے لیے دھڑکے۔ اس کی پلکوں میں صرف میرے چہرے تھے۔ اس کی آنکھ

قد ملیں صرف مجھے دیکھ کر روشن ہوں۔ جو آزاد ہو۔ خود مختار ہو۔ اپنے فیصلوں کی آپ مالک ہو۔ اس کا

قبول نہیں جو ہماری ہوئی ہے۔ تھکی ہوئی ہے۔ بے بس ہے۔ ایک ایسی زخمی ہرنی کی مانند جسے شکاری زخمی

جال میں پھنسا کر چلا گیا ہے۔ ہرنی کو دردندوں کی صورت موت نظر آتی ہے تو وہ بے بسی سے آنکھیں بند

کے کہ موت تو اس کا مقدر ہے۔“ شہزاد بڑے گہرے گھبرے لہجے میں بول رہے تھے۔

”تو تم ہرنی کی بے بسی کا نظارہ کیوں کر رہے ہو۔ بڑھ کر اسے پناہ میں لے لو۔ اس کے زخموں پر ہاتھ

کے پھائے رکھ دو۔ احسان مند ہوگی تمہاری۔“

عذرا بیگم نے بھی اسی اصطلاح میں بات کی تو وہ دکھی نگاہوں سے ان کو دیکھنے لگے۔

”یہ ہی تو مجھ سے نہیں ہو سکتا آپی! کہ میں اس کی بے بسی سے فائدہ ہی تو نہیں اٹھا سکتا۔ اس کا

بھی ہے مجبور بھی۔ وہ جو فیصلہ بھی کرے گی اس میں اس کی سعادت مندی تو ہو سکتی ہے مگر دل کی خوشی

ہو سکتی اور آپی جن فیصلوں میں دل کی رضا شامل نہ ہو۔ وہ بزدلی کے سوا ہوتے ہیں اور محبتوں کے

میں بزدلیوں کا قائل نہیں۔“ شہزاد نے دل سے اٹھنے والی ایک گہری تڑپ کے ساتھ کہا۔

”ارے بھو۔ آئے کہیں سے فلاسفر۔ اب تمہاری سخی کس نے ہے۔ اپنی تو سمجھ میں تمہارا فلسفہ

اور نہ دماغ خراب کرو۔ میں نے تو وہ ہیں کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔ ارے حد ہو گئی۔ عالی جیسی لڑکی

اے اور کیا چاہیے۔“

”ایک بات بتائیں آپ؟“ شہزاد بڑی تنکسی سی نگاہوں سے ان کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”سو باتیں پوچھو۔“

”یہ آپ کو واقعی عالی سے اس لئے دلچسپی ہے کہ میں اسے چاہتا ہوں یا پھر اس کی جائیداد میں

ہے آپ۔“

”کیا فضول بات ہے شہزاد! یہ بھی کوئی کرنے والی بات ہے۔“

”فضول بات نہیں ہے آپی! میں جانتا ہوں۔ عالی میں آپ کے لئے کیا کشش ہے۔“

”ارے معلوم ہے تو ہوا کرے۔ میں وئی اپنے لئے تو کچھ نہیں چاہتی اور ظاہر ہے جائیداد عالی کا حصہ

ہے۔ آج ہی وہ تو اسے ہر حال میں دیں گے۔ خواہ اس کی شادی کہیں بھی ہو۔“

”ارے جی بہن بھائی میں آتی ہی کیا بحث چھڑ گئی۔“

زادہ بیگم نماز سے فارغ ہو کر ادھر ہی آگئیں شہزاد اٹھ کر باہر نکل گئے۔

”امی جان! دیکھیے یہ شہزاد بھی تو اتنی پسند تھی کہ ہر قیمت پر حاصل کرنا

چاہتا تھا اور اب جبکہ عالی لک سکتی ہے تو اپنا فلسفہ بگھار رہا ہے۔

”نبی بات کیا ہے۔ مجھے بات تو بتاؤ۔“

”آپ بتائیں آپ کو ہے انکار عالی کے رشتے سے؟“

خدا نہ کرے۔ مجھے کیوں انکار ہونے لگا۔ اس سے بڑھ کر کون سی لڑکی ملے گی ہمیں۔ میں تو کہتی ہوں بہن

امی اور بھائی صاحب سے بات کر لوں جا کر آخر شہزاد کو کیوں اعتراض ہے۔“

”اے عالی کے ساتھ ملنے والی جائیداد پر اعتراض ہے۔“

”تو ٹھیک ہے بیٹی! ہمیں جائیداد کی ضرورت بھی کیا ہے۔ خدا کا دیا سب کچھ تو ہے۔ ہم منع کر دیں گے۔

آج ہی کو کر ہمیں صرف لڑکی چاہیے۔“

”یہ کیا بات ہوئی امی جان۔ ہم ان سے کسی بات کا تقاضا تو نہیں کریں گے۔ یہ تو وہ جائیداد ہے جو سیدہ

اور عابدہ کے والدین ان دونوں کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں۔ سیدہ کو شادی کے بعد اس کا حصہ مل گیا۔ اب ظاہر

ہے عالی کی جہاں ہوگی اس کا حصہ اس کے ساتھ جائے گا۔ اس میں نہ کوئی غلط بات ہے نہ قابل مذمت کیوں

شہزاد کر رہا ہے۔“

”عذرا بیٹی! یوں پہلے ہی کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو۔ ابھی ان سے رشتے کی بات بھی نہیں ہوئی۔ کیا خبر

بھائی صاحب اور بہن جی کی کیا رائے ہو۔“

”واہ امی جان آپ بھی شہزاد والی بات کر رہی ہیں۔ میں سیدہ سے بات کر کے آئی ہوں۔ شہزاد یہ بھی

انگڑ میں سب کو پسند ہے۔ اب تو بس رکیں ادا ہونی رہ گئی ہیں ورنہ شہزاد کا رشتہ تو سمجھیے کہ۔“

”ابھائی دیکھیں گے۔ اللہ بہتر ہی کرے گا۔ جتنی فیصلے تو اس کی ذات واحد کرتی ہے۔“

زادہ بیگم بیٹی کو مطمئن کر کے مغرب کی نماز کے لئے کھڑی ہو گئیں۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔ اس

لئے سردی میں بھی اضافہ ہو گیا تو شہزاد نے باہر نکلنے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور لحاف میں لیٹے لیٹے آتش دان میں

آگ جلنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے ہٹھلول کو دیکھنے لگے۔ عذرا آپی نے آ کر ایک بار پھر دل کے بند کو اکھول دیے تھے اور

نہی نے آج ان کو وہ جو اس دی تھی کہ تمام آرزوئیں دلہن بن کے ان کے من آنگن میں اتارنے کو تیار تھیں

لیکن تم آج ان کو وہ ان کا استقبال کرنے کو تیار نہ تھے۔ اپنی طرف بڑھنے والی اپنی چاہت عالی کے قدموں میں

پڑ گئی تھی۔ پھر اس نے کو تیار نہ تھا۔

”نہیں عالی! نہیں مجھ سے خود پر یہ ستم نہ ہوگا عالی! بہت خود غرض ہوں۔ میں اپنے جذباتوں کے معاملے

میں خدا کی قسم عالی اس دل میں تمہارا بہت احترام ہے۔ بہت چاہت ہے تمہاری میں اپنی خودی۔ اپنی ہمت ایک نگاہ پر قربان کر سکتا ہوں لیکن عالی خدا کی قسم جب یہ خیال آتا ہے کہ تمہارا دل فرمان کی چاہت میں چکا ہے تو..... تو میری رگوں میں اندھیرے آترنے لگتے ہیں۔ میں جلاد بن جاتا ہوں۔ اپنے جذباتوں کا ارمانوں کا۔ نہیں عالی میں تمہیں کھوکھو کر تو جی سکتا ہوں لیکن اس اذیت کے ساتھ اپنا نہیں سکتا کہ تمہارا دل فرمان کی محبت کی آماجگاہ رہا ہے۔ آئی ایم سوری عالی اسے تم میری خود غرضی کہولو محبت کی انتہا کہلو فرمان سے حسد دے لو۔ میں شروع سے اپنی چیزوں کے بارے میں پٹی رہا ہوں جو چیز میری ہوتی تھی وہ صرف میری ہوتی ہے۔ کسی دوسرے کا میں اس پر سایہ بھی نہیں پڑنے دیتا اور عالی تم تو میری زندگی تھیں۔ میری محبت تھی تمہارے لیے سینڈ چوائس بن جاؤں۔ نہیں عالی یہ بہت اذیت ناک عمل ہے۔ میں اس میں پورا نہیں سوری جان شہزاد۔“

جانے کتنی رات بہت گئی تھی۔ شعلوں کی چشم برزخ پھوار جانے کب پڑنی شروع ہو گئی۔ کرہ رطل نذر ہو گیا۔ آنکھیں موندیں تو نم لپٹیں تمام سبب بیان کر گئیں۔

”لو بھئی، سیدہ اللہ مبارک کرے۔ میں انی جان سے بات کر آئی ہوں۔ وہ اس جمعہ کو انشاء اللہ خدا سے بات کرنے آئیں گی۔“

عذرا یتیم نے آتے ہی لڑو سیدہ کے منہ میں بھونٹے ہوئے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن بھابھی جان پہلے بی بی جان اور آغا جی سے تو ان کی رائے پوچھ لیتے۔“

”یہ تمہارا ڈرنا نہ گیا بچوں والا۔ ارے بھئی جو کچھ کرنا ہے آغا جی اور بی بی جان نے ہی تو کرنا ہے پھر مجھے معلوم ہے ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تم عالی کی رائے لے لو باقی کسی اور کی تو فکری نہ کرو۔“

”اچھا بھابھی جان میں عالی سے بات کرتی ہوں۔ اسے منانا بھی مشکل ہے۔“

”ہاں سیدہ اسے سمجھاؤ۔ میں اسے لئے زور نہیں دے رہی کہ شہزاد میرا بھائی ہے بلکہ اس لئے کہ اب کی عمر ہے شادی کی اور اچھے لڑکے ملنے آسان نہیں۔“

”ارے آپ آپ اس وقت۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟“ عالی نے اپنی انٹری کتاب میں اٹھا کر ایک رکھتے ہوئے کہا۔ وہ۔ برا بیویٹ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ دل کے زخموں کو سینے کے لئے علم کا سہارا لے۔

”بات تمہارا زندگی کی مستقبل کی ہے۔ میری جان تو خاص کیوں نہ ہوگی۔“

سیدہ نے محبت سے عالی کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا، تو ایک پھینکی سی مسکراہٹ عالی کے لبوں پر آ گئی۔

”کیسی زندگی۔ کیسا مستقبل آپ۔ یہ سب تو فرمان کی طرح ایک یاد ہی بن گیا ہے۔“

”خدا نہ کرے بھول، جاؤ۔ اس ہر جان کو جس نے تمہاری قدر نہیں جانی۔ اس بے وفا کے“

زندگی ہے۔ وہ زندگی جس پر تمہارا حق ہے۔ اس کی خوشیوں پر تمہارا حق ہے۔“

”آپ ایسا سوچ سکتی ہیں آپ! پتا ہے آپ میری سوچ کا نقطہ آغاز بھی فرمان ہیں اور اختتام بھی۔“

گئے۔ بلاشبہ آغا جی نے ہر کسی کو پورا کرنے کی کوشش کی مگر اندر جو خلا تھا وہ عمر کے ساتھ بڑا ہوتا گیا۔ عمر بڑھتی چلی گئیں۔ عالی! سوچو ذرا تمہاری ان باتوں سے ہمارے والدین کی روح کو کتنی اذیت ہوتی ہوگی کہ نہ ناکام کام و نامراد زندگی بسر کرو۔ وہ بھی ایسے کم ظرف گھٹیا انسان کے نام پر جو اس قابل بھی نہیں۔“

سیدہ خود بھی جذباتی ہو گئی تھیں عالی کو بھی رُلا دیا۔

”آپا۔ پلیز مجھ پر یہ ستم نہ ڈھاؤ۔“

”بھروسہ ہی بات عالی۔ آغا جی اس رشتے کو منظور کر چکے ہیں اور بہت خوش ہیں۔ اس جعد کو خالہ جان آتی ہیں۔ اور شاید ساتھ ہی رسم بھی ادا ہو جائے۔ اپنے ذہن کو صاف کر دو اس گھٹیا کے خیالوں سے۔ وہ شہزادہ کی دھول بھی نہیں۔“

”پلیز آپا ایسا نہ کہیں۔“ عالی کسی صورت بھی فرمان کی توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ تڑپ کر اس نے سیدہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اچھا تو ٹھیک ہے۔ مجھے آغا جی نے بلایا ہے۔ میں تمہاری رضامندی دے دوں گی۔“ سیدہ آنکھوں کی ہوئیں تو عالی تڑپ اٹھی۔

”نہیں آپا! میرا دل نہیں مانتا جب بھی ایسا سوچتی ہوں تو مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پلیز آپا! آپ میری بہن ہیں۔ میری ماں جاتی ہیں، میرے درد کو اپنے دل میں محسوس کرتی ہیں۔“

”تمہاری بہن ہوں۔ اس لئے تو تڑپ رہی ہوں ورنہ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس گھر میں بھی جب تک آغا جی اور بی بی جان کا دم ہے۔ تب تک سب کچھ ہے بعد میں کون کسی کو پوچھتا ہے اور ہمارا دل کون کون ہے۔ چلو شاہباش منہ دھولو۔ اس طرح تو زندگی میں ہوتا ہی ہے۔ زندگی کس ایک کے نام پر۔۔۔ تو کب تک جاسکتی ناں! غمو شاہباش۔“

سیدہ نے بڑھ کر اس کا چہرہ صاف کیا اور باہر نکل گئیں۔

آغا جی عالی کے لئے بہت فکر مند تھے مگر جب سے شہزاد کے بارے میں ان کو بتایا تھا گویا منوں بوجھ کے دل پر سے ہٹ گیا تھا۔

”شہزاد بے مثل نوجوان ہے۔ سیدہ بیٹی بخدا ہمیں اپنی ناہنجار اولاد سے بڑھ کر اعتماد ہے اس پر۔“ انشاء اللہ ہماری بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے مرحوم بھائی بہن کے سامنے عزت کے ساتھ سرخرو کرے آمین۔ صالحہ بیگم بہن جی جعد کو آ رہی ہیں۔ عید کے بعد کی کوئی مبارک تاریخ رکھ لیں گے۔“

آغا جی بہت خوش تھے شہزاد تو ان کو شروع ہی سے پسند تھا اب تو اور بھی عزیز ہو گیا۔

”جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ شادی جلدی کر دی جائے۔ ہماری اس بیٹی کی شادی میں شہزاد کی ضروری تاخیر ہوئی ہے۔ اللہ ہمیں معاف کرے۔“

شہزاد کے رشتے نے سب کو خوش اور مطمئن کر دیا تھا۔ احساسِ ندامت میں کچھ کمی ہوئی تھی۔ آغا جی چلتا تو وہ ابھی اسی وقت دونوں کی شادی کے فرض سے عہدہ برآ ہو جاتے۔ انہوں نے ابھی سے سب کو بدلہ جاری کر دی تھیں۔

”قد سیدہ بیٹی۔ ہماری سب سے پیاری بیٹی کی شادی ہے۔ اس میں سارا جگ شریک ہوگا۔ میں اپنے“

کے تمام ارمان نکالنا چاہتا ہوں۔ انتقامات بہت اچھے ہونے چاہئیں۔ تم مجھے میری بیٹی کے زیورات اور ہبسات کی فہرست بنا کر دے دو۔ میں ہر خریداری اپنی نگرانی میں اپنی خوشی سے کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ ہماری بیٹی کو بہت خوش رکھے۔“

خوشی سے آغا جی کی آواز بے قابو ہو رہی تھی۔

”آغا جی آپ فکر نہ کریں۔ وہ دن تو آنے دیں۔ انشاء اللہ یہ شادی عرصے تک لوگوں کو یاد رہے گی۔ سب کام بہت اچھے ہوں گے انشاء اللہ۔“ قد سیدہ بانو نے یقین دہانی کرائی۔

”صالحہ بیگم۔ زاہدہ بہن کا استقبال بہت اچھا ہونا چاہیے۔ آج تک وہ اس گھر میں بیٹی کی ماں کی حیثیت سے آئی ہیں۔ اب وہ بیٹی کی ماں بن کر آئیں گی۔ ہمارے سران کے سامنے جھکے ہونے چاہئیں۔ وہ ہماری بیٹی کو ملتے آ رہی ہیں۔“

جعد میں تین دن باقی تھے کہ تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ آغا جی خود ہر کام کو دیکھ رہے تھے۔ پوری کوٹھی انہوں نے اپنی نگرانی میں درست کرائی تھی۔ ہر کوئی خوش اور شاداں تھا۔ عذرا بیگم کے تودل کی مراد برآئی تھی۔ وہ نوازی آؤی پھر رہی تھیں۔ مرادوں کی دلی میں جگ کر جعد آیا تو ایک ایک بار پھر آغا جی کی خوشی کی نظر لگ گئی۔

یہاں زاہدہ بیگم کا انتظار ہو رہا تھا وہاں ان کو بہزاد کے اغوا کی روح فرسا خبر نے ادھو موا کر دیا۔ بہزاد کے اغوا نے سب کو ہراساں کر دیا تھا۔ زاہدہ بیگم کو بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ بہنوں کا ردور کو بڑا حال تھا۔ بھائیوں نے جال بچھا دیا تھا۔ ایک الگ کوٹے میں حیرانگہ صحنہ میٹھی شوہر کی اس گمشدگی پر غور کر رہی تھیں۔



نورین وفا کی قبروں پر بے حال ہو رہی تھیں۔

”میر کر نورین! ممبر کے سوا اب کیا چارہ ہے؟ شہزاد نے اس کو سہارا دے کر اٹھانا چاہا۔“

”کیسے ممبر کروں شہزاد آپ کو کیا خبر کہ یہ دونوں میرے لیے کیا تھے، یہ دونوں میرے غلوں کے رشتے تھے جنہوں نے خون کے رشتوں کو مات دے کر دوستی کے رشتے کو زندہ کر دیا ہے۔ رشید میرا وہ بھائی جس نے اپنے غلوں سے میرے ہر رشتے کی کمی کو پورا کیا۔ میری مثال بنا رہا۔ اور۔ اور ہاجرہ تو میرا پر تو تھی، میری ہم

راز، میری بہن!۔“ نورین شہزاد کے ساتھ لگی رو رہی تھیں۔

”باؤ جی نے بڑا ظلم کمایا ہے بی بی۔ پہلے دونوں کو مار مار کر ہلان کر دیا۔ آپ کا پوچھتے رہے، مگر جب انہوں نے نہیں بتایا تو۔ تو گولی مار دی۔ رشید کی ماں تو جی پاگل ہو گئی ہے اور ہاجرہ کا بڑا حباب بھی ہر وقت ہاجرہ کو

ڈاکٹر رہتا ہے۔ اور پتا ہے بی بی باؤ جی نے ان معصوموں پر کیا الزام لگایا ہے کہ۔ کہ رشید نے ہاجرہ کو بھانے کی کوشش کی تھی تو اس نے ہوائی فائر کیے مگر گولی ان دونوں کو لگ گئی۔“

غور نے مزید جلتی پرتیل چھڑک دیا تو نورین کی ردھل کر رہ گئی۔

”نہیں عالم شاہ! ذلیل، کینے، تو میرا بھائی نہیں۔ درندے ایک تو ان کی جان لی۔ اور پرے گندا الزام نہیں لگاؤ اس درندے کو معاف نہیں کروں گی۔ میں اسے عدالتوں میں ٹھیکٹ ٹھیکٹ کرادوں گی، میں اسے قانون تو معاف کر سکتی تھی۔ مگر اپنے ان معصوم بے گناہ پیاروں کا خون نہیں معاف کروں گی۔ نہیں کروں گی۔“

”خوصلے سے کام لو نورین۔ عالم شاہ جیسے انسان قابلِ رحم ہوتے ہیں، جن کے پاس دردور کھنے والا دل نہ

ہو۔ دماغ میں اچھی سوچ نہ ہو تو، اس سے بڑھ کر بد نصیب کون ہوگا۔ ایسے لوگوں کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ چلیں۔ رات ہو رہی ہے اور ہمیں آج ہی گھر واپس جانا ہے۔“

”جی بی بی! یاد دہانی ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ کون سا ان بد نصیبوں نے واپس آ جانا ہے۔ آپ باہر، اب سوائے صبر کے، ہم کبھی کیا سکتے ہیں۔“

غفور بھی اپنے آنسو صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”غفور آج سے وفا کی ان نشانوں پر بھتوں کے دیے ضرور روشن کیا کرتا۔“

نورین شہزاد کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”اچھا جی! جیسا آپ حکم جی۔ پر جی اپنے بھائی سے ہوشیار رہیے گا۔ وہ انسان نہیں درندہ ہے۔“

”تم فکر نہ کرو غفور۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بال و پر عطا کر دیے ہیں۔ اب میں اس عالم شاہ سے ایک ایک کا حساب لوں گی۔ میں رشید کی ماں سے ملنا چاہتی تھی، مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ کیسے سامنا کر سکتی ہوں کہ

کا بیٹا اور چاچا کی بیٹی ہاجرہ مجھ پر ہمارے ہو گئے۔ مجھے اس ذلیل انسان کے۔ اتنا کر جانے کی امید ہوئی تو۔ تو خود قربان ہو جاتی۔ پر ان معصوم جانوں کو ضائع نہ ہونے دیتی۔“

نورین ایک بار پھر پکڑ گئیں اور ہاجرہ کی موت نے ان کی روح کو زخمی کر دیا تھا۔ مگر آکر بھی نورین بہن اداس اور دکھی رہیں۔

”شہزاد میں۔ میں عالم شاہ سے اپنا حصہ لینا چاہتی ہوں۔ میں اپنی جاگیر اس سے چھین کر رہوں گی۔ مگر ایک پائی بھی اس کے پاس نہیں رہنے دوں گی۔“

”نورین آج تو تم نے یہ بات کہہ دی ہے۔ آئندہ جائیداد اور جاگیر کا لفظ بھی تمہاری زبان پر نہیں آئے گا۔ اس لیے کہ اس آگ نے کئی زندگیوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کر ڈالا ہے۔ تمہیں کس چیز کی کیا یہاں پر۔“

اتنے دنوں کی رفاقت میں پہلی بار شہزاد کے چہرے پر تڑاؤ آیا۔ لہجے میں سختی آئی، جس سے نورین کو ان کی طرح اندازہ ہو گیا کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے۔

”شہزاد خدا کی قسم۔ مجھے دولت، جائیداد کی کوئی طلب نہیں۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے روپ میں اللہ دولت دی ہے کہ کسی اور چیز کی طلب ہی باقی نہیں رہی۔ میں تو صرف اس بھائی سے، اور رشید کا انتقام لینا چاہتی ہوں۔ اپنی محرومیوں کا حساب کتاب کرنا چاہتی ہوں۔“

”دیکھو نورین۔ سارے حسابات اللہ پر چھوڑ دو۔ وہی بہتر انصاف کرنے والا ہے۔“

”بے شک اللہ ہی بہتر انصاف کرنے والا ہے، جیسا آپ کا حکم شہزاد۔ میں آج کے بعد ایسی کوئی بات نہیں کروں گی جو آپ کو پسند نہ ہو یا آپ کا دل دکھائے۔“

نورین کی اس تابعداری پر شہزاد نے ان کو دیکھا۔

”شکر یہ نورین۔ اب تم تیاری شروع کر دو۔ ہم لوگ کچھ عرصے کے لیے کینڈا جا رہے ہیں۔“

”مگر شہزاد!“

”دیکھو نورین۔ اس گھر میں تمہارے ساتھ تیسرے درجے کا سلوک ہو رہا ہے۔ آئیے بھابھی اور شہزاد

بھائی ہم تینوں کے ساتھ تمام سزائیں قبول، سب گوارا ہیں اور پھر یہ تو وقتی مخالفت ہے۔ وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گی، پھر اسی جان تو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ ان کے سینے سے لگ کر تمام پیاس ہی بجھ جاتی ہے، مگر آپ بھی بہت چاہتی ہیں کاش کہ منزہ باجی آسکتیں۔ تو کتنا اچھا ہوتا مگر۔“

”نہیں شہزاد بھائی نے تو پابندی لگا دی ہے ان پر عمر بھر کے لیے وہ یہاں نہیں آسکتیں۔ منزہ کے ذکر پر شہزاد افسردہ ہو گئے۔

”نہیں شہزاد! ایسا نہیں ہوگا، ساری دشمنیاں ساری نفرتیں وقت کے بہاؤ کے ساتھ بہہ جاتی ہیں اور باقی صرف محبت رہ جاتی ہے اور انشاء اللہ۔ ایسا وقت ضرور آئے گا جب منزہ باجی یہاں آزادی کے ساتھ آیا جائے کریں گی۔“

”آمین۔“ نورین کی پر خلوص دعا پر شہزاد کے دل کی گہرائیوں سے آمین نکلی۔ کیونکہ جس بہن کے لیے انہوں نے اتنی بڑی قربانی دے ڈالی تھی۔ وہ اسے رائیگاں ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے، حیران کی اتنی بڑی جرأت کے بعد شہزاد علی نے حیرانے تمام تعلق توڑ لیے تھے اور منزہ کو تمام عمر کے لیے ماں اور بہن بھائیوں سے جدا کر دیا تھا۔ ماں نے بیٹی کی جدائی کا ٹھہر دل پر رکھ لیا تھا، صرف اس لیے کہ وہ اپنے گھر میں آباد رہ سکے، بیٹیوں کو سودا آباد رہنے کی دعائیں دینے والی مائیں یہ نہیں جانتیں کہ بعض اوقات بیٹیوں کو اس آبادی کے لیے کیا کیا قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ بل پل جینا اور مرنا پڑتا ہے، کہنے کو منزہ شہزاد کی پسند بن کر اس حویلی میں اتری تھیں، مگر ان کو سکون کا کوئی لمحہ یاد نہیں تھا، اور اب جبکہ ان کی راتوں کو جاگ کر مانگی گئی دعائیں رنگ لاتی تھیں کہ نورین والا بھوت اتر تو شہزاد ہر وقت اس بات کا طعنہ بھی انہی کو دیتے رہتے۔

”یہ سب تمہاری نحوست سے ہوا ہے، ہر وقت کا رونا اچھا نہیں ہوتا۔ چتا بھی ہے، ہماری ساری جائیداد ادا ہو گئی ہے۔“ شہزاد سارا غصہ منزہ پر ہی اتار رہے تھے۔

”میں نے کب کچھ کیا ہے، کچھ کہا ہے شہزاد؟ میں تو قسمت پر شاکر ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔ قدرتی طور پر ایسا ہوا ہے۔ آپ کی اپنی بہن۔“

”ہاں ہاں۔ میں جانتا ہوں، یہ سب میری بہن کا کیا دھرا ہے اور اس نے بھی یہ کیوں کیا۔ تمہارے لیے صرف تمہاری خاطر اس نے بھائی کو ذلیل کیا۔“

”یہی تو میرے رب العزت کا کرم ہے کہ اس نے حیران کو اتنی ہمت عطا کی ورنہ تو۔“

منزہ نے اس طرح کہا جیسے خود سے مخاطب ہوں۔ شہزاد کیا جانیں کہ حیران کو یہ ہمت ان ہی کی نوازش سے ملی تھی، جو انہوں نے اپنے رب کے حضور گڑ گڑا کر مانگی تھیں۔

شہزاد علی بہت جھنجھلاہٹ کا شکار تھے۔ ندامت الگ تھی ان کی حالت ایسے شکاری کی سی ہو رہی تھی جس نے ہاتھ سے شکار کسی نے چھین لیا ہو۔ اور جب اس میں ہاتھ اپنی بہن کا ہو تو غصہ آنا لازمی امر ہوتا ہے دوسری جھنجھلاہٹ یہ تھی کہ عالم شاہ کے پاس ان کی تمام جائیداد کے کاغذات عالم شاہ کے پاس رہنے کا جواز ہی نہیں تھا اور اصرار عالم شاہ تھا کہ ہر بار جب جاتے حویلی سے غائب ہو جاتا۔ ٹال مٹول سے کام لیتا۔

”اور نفی۔“ کچھ سوچتے ہوئے شہزاد علی ایک دم ہی اٹھ کر بولے۔



”حاضر ہوں باؤجی۔“ رفیق موڈ بکھڑا تھا۔

”غوث سے کہو جیب نکالے۔“ یہ کہہ کر شہباز نے دیوار سے بندوق اتاری تو منہ دل قائم رکھیں۔ ایک دم کھڑی ہو گئیں۔

”شہباز کہاں جا رہے ہیں؟“

”جہنم میں۔“ شہباز غزا ئے۔

”اگر عالم شاہ کی طرف جا رہے ہیں شہباز تو خدا کے لیے احتیاط سے دو چار آدمیوں کو ساتھ لے جائیں۔ وہ خطرناک انسان ہے۔“ منہ منت بھرے لہجے میں بولیں۔

”کیوں اتنا ہی بزدل سمجھ لیا ہے اگر حمیرا نہ درمیان میں آتی تو سب کو دیکھ لیتا میں بھی۔ ہٹ جاؤ پیچھے آج کوئی نہ کوئی فیصلہ کر کے ہی آؤں گا۔“

شہباز تیزی سے باہر نکل گئے تو منہ دعا میں ہی کرتی رہ گئیں۔

”عالم شاہ!“ شہباز سیدھے عالم شاہ کے کمرے میں چلے آئے۔ تو وہ ان کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوہ۔ میرا ریا یا نہ سلام نہ دعا۔ آہٹھ۔ بڑے غصے میں ہو۔“

”برداشت کی ایک حد ہوتی ہے عالم شاہ اور میں نے جو اس حد کے گزر جانے کے باوجود صبر کیا ہے اس میں صرف بچپن کی دوستی کا لحاظ تھا مگر لگتا ہے یہ لحاظ میں نے ہی نیا ہے۔“ اور مجھے ہی نقصان اٹھانا پڑا۔

شہباز کو دھوکا دینا اتنا بھی آسان نہیں کہ آسانی سے نکل لو گئے۔

شہباز بڑے غصہ اور جوش میں بول رہے تھے۔ عالم شاہ آہستگی سے چلا ان کے قریب آیا، اور ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر صوفے بٹھا دیا۔

”اور یارا! کیوں غصہ کرتے ہو۔ میں تو ایک بار اہوا انسان ہوں۔“

عالم شاہ نے اپنے لہجے میں بناوٹی دکھ شائل کرتے ہوئے کہا۔

”عالم شاہ! یہ ہار ہم دونوں کی مشترکہ ہے، حمیرا کی جائیداد کے کاغذات واپس کر دو۔ تمہاری بہتری میں ہے کہ بات دوستی ہی میں منٹ جائے، ورنہ یاد رکھو میں۔ اتنا اچھا دوست نہیں جتنا برا دشمن ثابت ہوں۔“ شہباز اسے نیکی سے دیکھتے کھڑے ہو گئے تو وہ بھی ان کو دیکھتا کھڑا ہو گیا۔

”لو دوست فیصلہ تو تم نے خود ہی کر دیا کہ اگر ہمارے مشترکہ ہے تو نقصان بھی مشترکہ ہی ہونا چاہیے۔ نہیں۔“ عالم شاہ نے عجیب سے انداز میں ان کو دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ شہباز نے عالم شاہ کو گھورا۔

”او دیکھ ناں یارا۔ میرے اور تمہارے درمیان ایک فیصلہ ہوا کہ نورین کی شادی تمہارے ساتھ ہوگی۔ اس لیے تمہارے حصے کی جائیداد نورین کے نام ہوگی۔ جو تم نے کر دی۔ لیکن بد قسمتی سے تمہاری نورین کے ساتھ شادی نہیں ہو سکی۔ وہ بھی تمہاری ہی بہن کی غلطی کی وجہ سے، لیکن میں نے تمہارے کاغذات

کر دیے۔“

”اور حمیرا کے کاغذات۔“ شہباز نے عالم شاہ کی پشت کو گھورا جو بات کرتے کرتے آگے بڑھتا تھا، ان کی بات پر واپس آ پلٹا۔

”بے اصولی کی بات نہ کرو شہباز۔“ عالم شاہ نے رعوت بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا بے اصولی کی بات ہے، حمیرا کی جائیداد کاغذات میرے حوالے کر دو ورنہ؟“

”نہ۔۔۔ یاروں میں ورنہ نہیں آیا کرتا شہزاد۔ اور اگر آجائے تو نسلیں برباد ہو جایا کرتی ہیں۔ اس لیے ذرا حوصلے سے میری بات سنو۔ وہ کاغذات اب تمہیں نہیں مل سکتے۔“

عالم شاہ نے پہلے دھمکے لہجے میں پھر انتہائی سخت اور کٹیلے لہجے میں صاف انکار کر دیا۔

”عالم شاہ! میری بہن کی جائیداد کے کاغذات واپس کر دو۔ میں کہتا ہوں مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ شہباز بھی طیش میں آ گئے۔

”بہت بھولے ہو تم۔ قانون سے لڑنا چاہتے ہو؟“

”کیا بکواس ہے یہ۔“

”نہ تو سیدھی باتیں تمہاری سمجھ میں آ رہی ہیں اور نہ ہی قانون کو تم جانتے ہو۔ دیکھو شہباز حمیرا کی جائیداد قانونی طور پر میرے نام ہے اور پھر جو چیز میرے نام ہے وہ میں تمہارے حوالے کس طرح کر سکتا ہوں۔“

”عالم شاہ!“

”حوالی بھری پڑی ہے ملازمین سے۔ آہستہ بات کرو شہباز۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری دوستی ملازموں کے سامنے تماشائے۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تم نے حمیرا سے اس کی جائیداد میرے نام خود کروائی تھی اور اب۔“

”عالم شاہ! وہ جس مقصد کے لیے کروائی تھی۔ وہ ہی پورا نہیں ہوا تو تم جائیداد کے حق دار بھی نہیں رہے۔ شرافت سے کاغذات واپس کر دو۔“

”میرے گریبان سے ہاتھ ہٹا لو شہباز۔ میں اپنی فطرت کے خلاف تمہیں مواقع فراہم کر رہا ہوں، کیونکہ بات ابھی تک میری برداشت کی حدود میں ہے۔ تمہارا مقصد پورا ہوا ہے۔ یا نہیں۔ میں اس بات کا ذمہ دار نہیں۔ اور ویسے بھی میں قانونی طور پر حمیرا کی جائیداد کا حق دار ہوں اور پھر حمیرا میری معصوم بہن کو ورثہ کر لے جانے کی مجرم بھی ہے، اس لیے میں اس کی جائیداد کا حق دار ہوں۔“

”تمہاری بہن اپنی مرضی سے گئی ہے وہ تم جیسے درندہ مفت بھائی کی قبر میں نہیں رہ سکتی تھی، اسی لیے وہ تمہیں اپنی مرضی سے چھوڑ گئی، اور اپنی پسند سے شادی کر لی۔“

”تو چلو یوں ہی سہی۔ وہ خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔ حمیرا نہ سہی اس کی جائیداد تو مجھے مل گئی ہے۔“

”عالم شاہ! میں تمہارا خون پی جاؤں گی، جو تمہاری گندی زبان پر میری بہن کا نام بھی آیا تو۔“ حمیرا کا نام کن کر شہباز کی رگوں میں خون کھول گیا۔

”اچھی بات! اب بہن کی غیرت جاگے۔ اور جب تم نورین کی خاطر اسی بہن کو تنگ کرتے تھے۔ اس دھاری جائیداد سے مجبور کر کے میرے نام کر دی۔ تب کیا تھا۔ اسی جائیداد کو میرے نام کروانے کے لیے تم نے اپنے بہنوئی کو اغوا کر دیا، اور اب جبکہ نورین نہیں ملی تو بہن کی محبت اور جائیداد یاد آ گئی۔ سچ بتاؤ۔

”نہیں اور۔“ حمیرا کی جائیداد دے کر لڑکی تو نہیں؟“

”عالم شاہ!“ شہباز کا ہاتھ پوری توت سے اٹھا مگر عالم شاہ اسی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا، اور لنگتی ہوئی

بندوق اٹھائی۔

”شہباز! میری یہ بندوق بڑی بے لحاظ ہے۔ دوست دشمن نہیں دیکھتی۔ بس چل پڑتی ہے۔ لیکن اگر اندھی ہے۔“ عالم شاہ کٹاری سے بولا۔

”عالم شاہ شرافت سے کاغذات میرے حوالے کر دو، ورنہ بندوق میری بھی اندھی ہی ہے۔“ شہباز نے بندوق تان لی۔

”حمیرا نے مجھے تھپڑ مارا تھا کی کمینوں کے سامنے مجھے بے عزت کیا تھا، اس وقت سے حمیرا میری ضد بن گئی تھی، وہ تو ہاتھ سے پھسل گئی، مگر اس کی جائیداد تو آپ ہی آپ میرے نام ہو گئی ہے، تمہارا کیا خیال ہے کہ اتنا ہی بے وقوف ہوں کہ آئی نعت کو ٹھکرادوں گا۔“

”عالم شاہ!“ اس سے قبل کہ شہباز کے ہاتھ ٹرانسگر تک جاتے عالم شاہ کی بندوق کی گولی شہباز کو لگ گئی، وہ زخمی ٹانگ کے ساتھ قالین پر گر پڑے، عالم شاہ آہستگی سے چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

”دیکھا میں نے کہا تھا ناں کہ یہ کم بخت بڑی بے لحاظ ہے، دوست دشمن نہیں دیکھتی، لیکن یہ شکر ہے کہ میرا حکم مانا اور گولی تمہارے سینے کے آ پار ہوئے کے بجائے ٹانگ میں لگ گئی اور پھر میں اتنا عالم ہی نہیں کہ تمہاری بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر دوں۔ غمورے اور غمورے۔“

عالم شاہ نے شہباز کا سر جھٹکے سے چھوڑ دیا، اور بلند آواز سے غمورے کو آواز دی۔

”عالم شاہ! میں تجھے نہیں بخشوں گا۔“ شہباز نے بمشکل کہا۔

”اچھا بابا نہ بخشا۔ پہلے جا کر ٹانگ تو کٹواؤ۔ گولی کا زہر پھیل گیا تو میں ایک اچھے دشمن سے محروم ہو جاؤں گا، جو کہ میں نہیں چاہتا۔ بڑا مزہ آتا ہے جب دشمن اپنی ہی ٹکر کا ہوتو۔“ عالم شاہ نے سفاکی سے کہا۔

”خون۔ باؤجی آپ نے ان کو بھی۔؟ غمورے شہباز کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

”اوئے ہر کسی کے لیے مرنے لگ جایا کرو۔ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ آسانی سے مرنے والی چیز نہیں لے جاؤ اسے اور کہہ دو اس کی بیوی سے کہ اسے باندھ کر رکھے ابھی تو یہ صرف ٹانگ سے گیا ہے اگر باز آنا۔“

جان سے بھی جاسکتا ہے۔“ غمورے نے بمشکل بے ہوش ہوتے شہباز کو سہارا دے کر جیب میں ڈالا۔

”اوئے غمورے! کیا کیا ہے ہمارے باؤجی کو عالم شاہ نے ہمارے باؤجی پر گولی چلائی ہے۔ میں اتنا خون پی جاؤں گا۔“ غمورے شہباز کو زخمی دیکھ کر جوش میں آ گیا۔

”عالم شاہ انسان نہیں ہے غمورے! بہتری اسی میں ہے کہ ان کو جلدی سے ہسپتال لے جاؤ۔ زخم بھلا جائے چلو، میں بھی چلتا ہوں، عالم شاہ کا پیغام بھی دیتا ہے بی بی کو۔“

غمورے بھی جیب میں بیٹھ گیا۔ جیسے ہی شہباز کو سہارا دے کر حویلی لایا گیا، مزرہ سارے پردے اٹھا ملازموں کے سامنے بھاگتی آئیں۔

”شہباز۔ شہباز میں نے منع بھی کیا تھا۔ اس کتے کے منہ نہ لگیں مگر۔“

”او کچھ نہیں ہوا مجھے۔ ٹھیک ہوں اندر جاؤں۔“

شہباز نے بمشکل کہا اور پھر بے ہوش ہو گئے۔

”بی بی، عالم شاہ نے کہا ہے کہ۔“

”میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ آگ لگے ایسی جائیداد کو جو عذاب جان بن جائے، کہہ دو جا کر اپنے مالک کو اس میں انسانیت نام کو نہیں۔ نہیں چاہیے ہمیں کچھ بھی۔ دے دیا صدمہ میں نے حمیرا کی جائیداد کا۔ اس بے ہوشی نے تو بھائی کی خاطر کیا کیا۔ قربانیاں نہیں دیں۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ بی جائیداد اس کے اکلوتے بھائی کی جائیداد بن جائے گی۔ جاؤ کہہ دو۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ آئندہ وہ ہماری طرف آنکھ بھی نہ اٹھائے۔“

مزرہ نے غصے اور دکھ میں یہ سب کہہ دیا تھا اگر شہباز ہوش میں ہوتے تو وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکتی تھیں۔



”عالمی۔“ سیدہ نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تو عالمی نے کتاب پر سے نظر ہٹا کر سیدہ کو دیکھا جو بیان کم اور غصے میں زیادہ تھیں۔

”کیا بات ہے آپ پریشان ہیں۔“ عالمی نے کتاب بند کر دی۔

”ہاں بھی ہے آغا جی کی طبیعت خراب ہے۔“

”آغا جی کی طبیعت خراب ہے اور مجھے خبر ہی نہیں۔“ عالمی فوراً کھڑی ہو گئی۔

”جہیں اپنی ان کتابوں سے فرصت ملے تب ناں، ہر وقت ان ہی سے چپکلی رہتی ہو۔“

عالمی نے ایک خاموش نگاہ پر ڈالی اور بولی کچھ نہیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھی وہ گھما پھرا کر بات اس کی شادی ہلے نہیں گی، اور وہ اس موضوع سے اس طرح خوف کھانے لگی تھی جیسے موت ہو۔

”عالمی تمہیں کچھ احساس ہے کہ ہمیں باپ کی کمی کا احساس نہ ہونے دینے والے آغا جی، صرف تمہاری جگہ سے کتنے دکھی ہو گئے ہیں۔ ان کو کوئی بیماری ہے تو صرف تمہاری وجہ سے ہے۔ وہ ہر وقت تمہارے بارے میں فرم رہے ہیں۔“

سیدہ گرم لہجے پر چوٹ مارنے کا موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ وہ عالمی کی بڑی بہن تھیں اور ہاتھ میں عالمی اپنے گھر میں آباد ہو جائے، مگر عالمی ان تمام کمزوریوں کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ عالمی نے ایک گھبراہٹ سے عالمی کے گھر میں آئے اور دل میں اٹھنے والے درد کو چھپائے آغا جی کے کمرے کی طرف آ گئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ کمرے میں ہوائے شہر کے جوان کے پاؤں دبا رہا تھا اور کوئی نہ تھا۔ وہ آہستگی سے اندر آ گئی، اور اشارے سے شہر کو

دیکھنے لگا۔ اور خود پاؤں دبانے لگی۔ آغا جی کو کافی بخار تھا۔ بخار کی حدت سے پتھر جلال چہرہ سرخ تھا۔ عالمی نے ڈیڑھ گھنٹہ کی دیکھتی رہی۔ اس شفیق انسان نے کبھی نہ باپ کی کمی محسوس ہونے دی اور نہ ماں کی ہر خواہش کی

کوشش کی تھی۔ مگر جب زندگی کی اہم خواہش پوری کرنے کا وقت آیا تو تقدیر کے ہاتھوں ہار گئے، اور اس کی محبت میں اپنے سخت جگر کو کاٹ کر پھینک دیا۔

”آغا جی۔!“ وہ ان کے پیروں پر سر رکھ کر رونے لگی تو اسی وقت آغا جی جاگ گئے۔

”کون۔ عالمی! میری بچی! کسی نے کچھ کہا میری بیٹی کو۔ ادھر آؤ میری بیٹی تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔“

آغا جی نے لرزتے ہاتھوں سے عالمی کو ساتھ لایا تو طوفان میں اور شدت آ گئی۔

”نہیں آغا جی! میں اس قابل نہیں۔ میں آپ کی اتنی محبتوں کے لائق نہیں رہی۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیا۔ میں آغا جی! میں ہی آپ کی بیماری کا سبب ہوں۔ آغا جی میں نے آپ کو دکھی کر دیا۔ میں آپ کی

اولاد میں۔ سب سے زیادہ گستاخ ہوں۔ آغا جی۔ میں خود کو لعنت ملامت کرتی ہوں۔ بہت سوچتی ہوں۔ لیکن خدا کی قسم آغا جی! میرا دل نہیں مانتا اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ اتنے دھمی آپ میری شادی نہ کر سکتے ہیں۔ جتنا کر کے ہو جائیں گے لیکن آغا جی! میں نے سوچ لیا ہے کہ میں خود پر ہر واردات برداشت کر لوں گی۔ کو دیکھی نہیں کر سکتی۔ آغا جی آپ کی محبتوں کا یہ حاصل تو نہیں کہ میں آپ کو دکھ دوں۔ آپ کو لوگوں کی بات نشانہ بنے دوں۔ اتنی تو خود سہ نہیں ہوں میں آغا جی، مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہے۔

اس نے ہار کر سر آغا جی کے آگے جھکا دیا تو انہوں نے اس کے جھکے سر کو چوم لیا۔

”عابی! میری بچی میری بیٹی، مجھ سا کون خوش نصیب ہوگا، جس کی اولاد اتنی سعادت مند ہے۔ شادی جہاں غم خداوندی ہے وہاں ماں باپ کی اولین خواہش بھی ہوتی ہے، کہ ان کی بیٹی اپنے گھر میں ہو، اور آج جب تم نے سر تسلیم جھکا دیا تو مجھے شادی رمرگ ہو جانا چاہیے، مگر بیٹی مجھے تمہارا یہ فیصلہ قبول نہیں لیے بیٹی کہ میں جانتا ہوں تم نے یہ فیصلہ اپنی خوشی سے نہیں بلکہ حالات سے تنگ آ کر میری خاطر گھر والوں لوگوں کی باتوں سے گھبرا کر کیا ہے، نہیں۔ میں وہ فیصلہ قبول نہیں کر سکتا۔ اور جس فیصلے میں میری بیٹی کی رشتہ شامل نہ ہو۔

”آغا جی۔ آغا جی۔“ وہ بس ان کے سینے سے لگی یہی کہے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں جاری آنکھوں میں جاری تھا۔ یادداشت کا، آغا جی سمجھ نہیں پائے تھے۔

”آغا جی! میں کتنی بری ہوں کہ آپ کی اتنی محبتوں کے جواب میں آپ کا حکم بھی نہیں مان سکتی آپ۔ کوئی کڑی سزا دیں۔“ اس نے آغا جی کے ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”کڑی سزا تو میں ان لوگوں کو دوں گا جنہوں نے میری بیٹی کو رلایا یا تنگ کیا ہے۔ بتاؤ کس نے۔“ آغا جی نے اس کا ہتھکرا پراٹھا۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا آغا جی، سب محبتوں کے مارے ہیں۔ میری محبت ہی میں تو یہ سب کہے ہیں۔“

”ہمیں نقد یہ کہ یہ فیصلہ قبول کرنا پڑتا گیا ہے۔ بیٹی پھر تمہیں مورد الزام کیوں ٹھہرائیں۔ ہماری ابیہ خاندانی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے کہ کوئی بیٹی باپ کے گھر ہی میں رہ گئی ہو، خیر اس میں بھی کسی کا قصور نہیں تھا کہ تم۔ ایم۔ اے کے پرائیویٹ امتحان کی تیاری کر رہی ہو۔ کس مضمون کی تیاری کی ہے۔“

اس وقت آغا جی کے دل پر جو واردات گزری تھی۔ وہ ہی جانتے تھے عابی کی بات مان کر گویا انہوں نے ہر کا پیالہ پیا تھا۔ مگر اب یہ سب ان کو تنہا ہی برداشت کرنا تھا۔ وہ عابی کی خوشی کے خلاف کوئی کام کر سکتے تھے۔

”جی آغا جی! پندرہ دن رہ گئے ہیں امتحانات میں، اور میں اردو میں ایم۔ اے کر رہی ہوں۔“

”جی آغا جی! میں نے وہ لڑکی ہوں، جس نے خاندان کی ہر ریت کو توڑا ہے۔ مگر آغا جی میں نے یہ سب سہا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے حصے میں علم کے اتنے خزانے لکھ چھوڑے ہیں کہ مجھے کسی کی بات اور بات کی طلب نہ کی۔ اور یہ سب تو آپ کی محبتوں کا ثمر ہے آغا جی ورنہ میں کیا چیز تھی۔“

”نہیں بیٹی! اصل میں ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنے چھوٹے ذہن سے کچھ سوچ رہا ہوتا ہے۔“

”جی آغا جی! میں نے وہ لڑکی ہوں، جس نے خاندان کی ہر ریت کو توڑا ہے۔ مگر آغا جی میں نے یہ سب سہا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے حصے میں علم کے اتنے خزانے لکھ چھوڑے ہیں کہ مجھے کسی کی بات اور بات کی طلب نہ کی۔ اور یہ سب تو آپ کی محبتوں کا ثمر ہے آغا جی ورنہ میں کیا چیز تھی۔“

اور خدا نے پاک کچھ اور فیصلہ کر دیتا ہے اور انسان کے حق میں بہتر۔ وہی ہوتا ہے جو اللہ کرتا ہے۔ میں نے لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تو نہیں، بس اس حد تک تعلیم کا حامی ہوں جس سے لڑکی کو زندگی گزارنے کا پتہ چلے جائے۔ بلاشبہ تم نے پرانی ریتوں کو توڑا ہے مگر زیادہ تعلیم حاصل کرنے والی تو ایسی بغاوت ہے کہ اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن۔“

دوسری بغاوت کا سوچ کر آغا جی پھر دھکی ہو گئے مگر وہ عابی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

”ہاں تو پھر ایم۔ اے کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“ وہ سہارے سے بیٹھتے ہوئے بولے۔

”آغا جی میں دیے سے دیا جانا چاہتی ہوں۔ لیکن آپ کی اجازت سے۔“

”یعنی پھر بننا چاہتی ہو۔“ آغا جی نے حقد کی نال منہ سے لگائی۔

”جی۔“ عابی نے مختصر سا جواب دیا۔

”کیوں؟“ آغا جی نے نال ایک طرف رکھ کر وضاحتی انداز میں اسے دیکھا۔

”اس لیے آغا جی کہ خود شناسی کا یہ ہی تو ایک عمل ہے، جس میں انسان زندگی کے اسرار و رموز جان لیتا ہے۔ مجھ لیتا ہے تو ہر حقیقت واضح ہو جاتی ہے، زندگی کو خود بھی، بہتر طور پر سمجھا سکتا ہے اور دوسروں کو بھی سمجھا سکتا ہے۔ میں بھی زندگی کو سمجھنا، سمجھا چاہتی ہوں۔ اور یہ سب آپ کی اجازت اور خوشی سے ہی ممکن ہو سکتا ہے؟“

”اللہ تمہیں تمہارے نیک مقاصد میں کامیاب کرے۔ خود شناسی کے لیے تم نے بڑا مناسب رستہ اختیار کیا ہے اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔“

آغا جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر صدق دل سے دعا دی۔ تو اس نے دل کی گہرائیوں سے آمین کہا اور ہلکے ہو کر لوٹ آئی۔ ایک بار پھر وہ کمزور لمحوں سے بچ گئی تھی۔

”خدا! میری مدد فرماتا۔ مجھے ثابت قدم رکھنا۔ میرا اعتماد آغا جی پر بحال رکھنا۔“

عصر کی نماز کے بعد وہ دیر تک دعائیں مانگتی رہی۔ پھر کھڑکی کھول کر ڈوبے سورج کا نظارہ کرنے لگی۔

”عابی! مجھے کچھ کہنا ہے تم سے۔“ سیدہ، اس کے برابر بیٹھ گئیں تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں جانتی ہوں آپ! آپ نے کیا کہنا ہے۔“

”تو پھر عابی دیکھو ناں۔“

”کیا آپا، بار بار ایک ہی بات۔ ایک بات کا جب فیصلہ ہو چکا ہے تو اور پھر جب آغا جی نے میری بات مان لی ہے تو پھر آپ۔“ عابی روز روز ایک ہی موضوع سے زچ ہو گئی تھی۔

”ہارمانی ہوئی آغا جی نے۔ میں نے نہیں۔ میں تمہیں یوں زندگی سے دور بے گل نہیں دیکھ سکتی۔ تم نے تو ہر بات میں زالی کی ہے۔ ایک تو شادی اتنی لیٹ، پھر تعلیم دیکھو عابی ایک خاص حد تک کوئی ساتھ دیتا ہے تمہارہ جاؤ۔“

”نہیں آج کی نہیں آج کے بعد کی سوچو۔ آئندہ زندگی کے بارے میں سوچو۔ زندگی کا ستر تنہا کیونکر کاٹو گی۔“

”نہیں بیگم پہلے تو عابی کی بات پر غصہ میں آگئیں۔ ان کی بات پر عابی کے چہرے پر تناؤ آ گیا۔“

”کیوں آپا! کیوں تمہارہ جاؤں گی کیا آپ مجھے کاٹ کر پھینک دینے پر مجبور ہو جائیں گی۔“

اور اگر آپ وقت کے ہاتھوں ایسا کرنے پر مجبور ہو جائیں تو۔ تو بھروسہ رکھیے۔ کہ اس وقت تک میں اپنی

۱۔ کہ عذرا بیگم کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

”اچھا تو سمجھتی رہو گناہ۔ ایک دن آئے گا کہ خود ہی میری بات پر یقین آجائے گا۔“

بعض اوقات کسی ایک انسان کی بھول سارے خاندان کو درہم برہم کر دیتی ہے اور فرمان سے بھی ایسی ہی بھول ہوئی تھی جو بھول ہو کر بھی بھول نہیں تھی مگر اس بھول نے سارے خاندان کو بھیجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ فرمان تمام گھٹن کر گھر نہیں آسکتے تھے، اور نہ ہی ماں کی ممتا کی آگ بجھ سکتی تھی۔ فرمان کی اس سزا میں شاید کسی آجاتی اگر باپ شادی کر لیتی نہ خانی نے شادی کی اور نہ ہی فرمان کی خطا معاف ہوئی اور شدید فرمان کی کسی کو اتنی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہوئی بھی تو قابلِ برداشت تھی۔ مگر بی بی جان تو ماں تھیں۔ ماں کی ممتا تو ہر وقت ہی فرمان سے لیے رہتی تھی تو کہہ کر جن اور یسین احمد کی کوششوں سے فرمان اور مریم دوبارہ زلیہ بیگم کے ہاں اگر ان سے مل چکے نہ خیرات کی پیاس بجھنے کے بجائے مزید بڑھ جاتی۔

”رُحْمَنِ بَیٹے! اب کب آئے گا فرمان؟“ بی بی جان مجبور ہو کر رُحْمَن سے پوچھتیں۔

”بی بی جان! آپ اتنی جلدی بے چین ہو جاتی ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی تو آئے تھے۔ وہ لوگ۔“

یسین احمد کی اس بات نے بی بی جان کو بہت دکھ دیا تھا۔

”طین بیٹے میں ماں ہوں اور ماں۔ ایک ہل کے لیے بھی اپنے بچے کو خود سے جدا نہیں کرتی اور تم نے نکلتی امانی کہہ دیا کہ ابھی پہلے سال تو آیا تھا۔ تم کیا جانو بیٹا۔ یہ ایک سال ایک صدی بن کر گزر رہے مجھ پر۔“

”بی بی جان! آپ بھی درست ہیں اپنی جگہ مگر یہ تو سوچیں کہ اگر آغا بی کو خبر ہو گئی پھر ایک ہنگامہ نہ کرے۔ اٹھ کھڑا ہوگا۔ پھجلی بار بھی جب مریم اور فرمان آئے تھے۔ اور آپ ذکیہ آپا کے ہاں رہنے کو چلی گئی تھیں تو سیدہ نے بڑا چونک کر پوچھا تھا کہ اب بی بی جان بیٹی کے ہاں رہنے کیوں چلی جاتی ہیں۔ اور آپ کو یہاں کر سیدہ اس معاملے میں کس حد تک جذباتی ہے۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو ایسا ہنگامہ کرتی کہ حد نہیں۔“

رحمن نے بی بی جان کا ہاتھ تھام کر ساری بات ان کو سمجھا دی۔

”ارے تو کیا ہو جاتا۔ کر لیتے وہ جو کرنا تھا۔ بے فکر تو کر دیا میرے بچے کو۔ اس سے بڑھ کر یہ۔“

اب ہم کسی اچھی سعادت مند لڑکی ہے، میری بچی میری منتیں کر رہی تھی۔ پاؤں پڑ رہی تھی۔ کہ کسی طرح اسے سہرا لے جاؤں تو وہ سب کے پاؤں پڑ جائے گی، سب سے معافی مانگ لے گی، مگر میں اسے کیسے لے جاتی میرا

تقاری کیا ہے کسی بات پر۔“ لی لی جان کو مریم کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

”واقعی مریم بہت اچھی لڑکی ہے، اگر عابی والا مسئلہ نہ ہوتا تو یقیناً آغا جی کو بھی اتنی اچھی لڑکی کو بہو بنانے میں تامل نہ ہوتا۔ مگر اب مجبوری ہے، عابی کے شادی نہ کرنے کے فیصلے نے آغا جی کو مزید برہم کر دیا ہے۔ مگر کیا کیا نہ ہو سکتا ہے۔“

”ما بھئی جان عالی کا اس میں کوئی تصور نہیں۔ وہ تو بہت کوشش کرتی ہے کہ آغا جی فرمان و معاف نہ کر۔ آغا جی ہی سمجھتے ہو گئے ہیں۔ رہا شادی نہ کرنے کا فیصلہ تو اس کے لیے بھی عالی کو مجبور کیا۔ چکا ہے۔ جب وہ ی تیار نہیں تو پھر زبردستی سے کیا حاصل۔“ رحمن نے جلدی سے وضاحت کی کہ کہیں بی بی جان کے

ذات کی اتنی پختہ عمارت تعمیر کر چکی ہوں گی کہ۔۔۔ کہ۔۔۔

”عابی۔ عابی تم کیا بھگتی ہو، میں تمہیں خود سے جدا کر کے سکتی ہوں۔ تم نے کیسے آسانی سے یہ  
ڈالی عابی! میں تمہاری بہن ہوں۔ تمہیں آباد یکناس چاہتی ہوں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں تو  
میں آباد ہو جاؤں گی اور تم بے مراد رہو گی۔“ سیدہ اس کی بات پر تڑپ اٹھیں اور انہوں نے عابی کو ہاتھ لگا کر  
”اور میں نے کب ایسا سوچا تھا آپا کہ میری شاخ مراد اتنی بے شرم ہو گی کہ ایک پھول بھی اس پر  
پائے گا۔“ عابی ٹوٹے لہجے میں بولی۔ پھر جلدی سے اس نے آنسو خشک کر لیے۔

”آپا! کچھ میں جانتی ہوں کہ میں نے یہ انتہائی کڑا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے آپ لوگوں کو سب کچھ پہنچا ہے لیکن آپا، مگر میں نے اسے چاہا ہے۔ میرے تمام بند بے اسی کے نام ہیں۔ فرمان کے نام پر زلفا میری زندگی کی سب سے بڑی اور آخری خواہش ہے آپا۔ اور کوئی خواہش تو میری بھی پوری ہونی چاہیے۔ خواہش کرنا میرا حق ہی نہیں، یوں ترستے رہنا ہی میرا مقدر رہے۔“

”عابی! میری جان، کاش تو اتنی بد نصیب نہ ہوتی۔ کیا قیامت ہے کہ میں تیرے ہاتھوں میں بند ہوں اور نہ سہاگ کا فاضل تیرے سر پر دے سکتی ہوں۔ تو ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اگر تم زندگی اسی بے پرواہ پر جیتنا چاہتی ہو تو۔ تو میں کچھ کہوں گی، اس ناقدرے نے بڑی قدر کی ہے ناں تمہاری۔“

آپا کتنی ہی دیر بولتی رہیں، روتی رہیں۔ فرمان کو کوستی رہیں اور وہ خاموشی سے ان کو تہہ بالا رہی۔ کیونکہ ان کے درد کا درماں نہیں تھا اس کے پاس۔

”آپا۔! میں بھی ایک عام سی لڑکی تھی۔ میرے بھی خواب تھے، خواہش تھی کہ میری ٹی ہو۔“ میرے ہاتھوں میں بھی فرمان کے نام کی مہندی لگے۔ اس کے نام کی افشاں میری مانگ میں اترے۔ اپنا گھر ہو۔ میں اور فرمان ہوں۔ جہاں پر۔ مگر۔ مگر جب فرمان ہی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔“ عالی نے سر جھپالیا۔

عابی امتحانات میں مصروف تھی۔ آغا جی کے منع کرنے کے بعد کسی نے اس موضوع پر عابی سے: کی تھی۔ عذرا بیگم کو گھدبند ضرور ہوئی رہتی، وہ سیدہ سے اکثر اس موضوع پر بات کرتیں۔

”ویسے سیدہ آغا جی کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہوں نے عابی سے ہار کیونکر مان لی۔“

”بھابی جی۔ اور چارابھی کیا تھا۔ عالی خود ہی تو تیار نہیں ہوتی۔ زبردستی تو اب کرنے سے رہا۔“

”لو بھلا۔ زبردستی کی کیا بات تھی۔ وہ عابی کو مناسکتے تھے، اور میں نے سنا ہے کہ عابی ان کی پیار لیلا

سے مان گئی تھی۔ مگر آغا جی نے انکار کر دیا۔“

”جی انہوں نے کہا تھا کہ عالی مجبوری سے مانی ہے، اور یہ بات ان کو پسند نہیں کہ۔“

”ارے ہٹاؤ بھی۔ میں سب جھٹکتی ہوں کہ عالی کی شادی نہ کرنے میں کیا راز ہے؟“

”کیسا از جان۔ عالی ہیں مانی اور بس۔“ سیدہ نے اون سلامیاں ایک طرف رکھ دیں۔

”سیدہ! میری بات پر تمہیں اعتبار تو آئے گا نہیں۔ ورنہ یہ سارا چلر جائیداد کا ہے۔“

”ارے نہیں بھابھی جان اور لوی ہو لو اسکی بات سوہنی نہی جاسی ہے۔“ مرا عابی سے ایسا کہ دم دم مجھنا سمجھتے۔“

لڑنا میں کناہ مسمی ہوں۔



دل میں عابی کے لیے کوئی بات نہ آجائے، مگر وہ بھی سب جانتی تھیں۔

عابی امتحانات سے فارغ ہوئی تو سیدہ کو اللہ تعالیٰ نے پیارا سا بیٹا دے دیا۔ عابی کو اس قدر پیارا کیا کہ  
نے گود میں لے کر رکھا۔

”آپا یہ بچہ تو مجھے دے دیں۔“ عابی نے اس کے نرم رخساروں پر لب رکھ دیے۔

”سارے ہی تمہارے ہیں عابی۔“ سیدہ نے مسکرا کر کہا۔

”ایسے نہیں آپا۔ یہ مجھے لکھے کر دیں۔ میں اسے پالوں گی۔ میں اس کی پرورش کروں گی، یہ تو لگتا ہے  
نے آپ کو میری خاطر دیا ہے، مجھے دے دیں۔“

عابی کے لہجے میں جانے کون سی خواہش چھپی ہوئی تھی کہ جسے محسوس کر کے سیدہ کا دل خون ہو کر  
دل سے فرمان کے لیے آہ کے ساتھ ایک اور بدعا نکل گئی۔

”جیسے تمہاری خوشی میری جان، ہاں شاید اللہ تعالیٰ نے یہ مجھے تمہارے ہی لیے دیا ہے۔ لوائی لائو  
سنبالو۔“ سیدہ نے آنسوؤں کو بے شکل روکتے ہوئے بیٹا عابی کو دے دیا۔

”شکریہ۔ شکریہ۔ آپا میں یہ آپ کا احسان نہیں بھولوں گی۔ رحمن بھیا آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں۔  
نے بے ساختہ بچہ کو ساتھ لگاتے ہوئے رحمن کو دیکھا۔

”کیسا اعتراض، میری بہن۔ فرمان نے جب تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی تو میں ذاتی طور پر اس کا رد  
کرنا چاہتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ جان سے بڑھ کر کوئی چیز تمہارے نام کر دوں تو شاید کچھ ہو جھ کم ہو جائے اور  
جب اللہ نے یہ موقع دیا ہے تو اعتراض کیا۔ یہ تمہارا ہی ہے۔“

رحمن نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو خوشی سے عابی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔  
”تو عابی تم نے اپنے بیٹے کا نام کیا سوچا ہے؟“

سیدہ نے ایک دم ہی عابی کے بیچ چہرے پر پھیل جانے والے متاع کے نور کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”ہمایوں۔ کیوں کیسا نام ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔ چھوٹا اور خوبصورت۔“

ہمایوں کو پا کر عابی تو جیسے خود کو بھول گئی، ہر وقت اسی میں لگی رہتی۔ ہمایوں کو بیٹا بنالینے والی ادلہ عذرا  
کو نہیں بھاتی تھی۔ ان کے خیال میں عابی نے یہاں جانب داری سے کام لیا تھا۔ کہ اپنی ہی بہن کے بیٹے کو

لے لیا۔ جبکہ دوسرے بچے بھی تھے۔  
”ارے عذرا۔ اس میں۔ گھلے کی کیا بات ہے، قدرتی سی بات ہے کہ ہمایوں اس کی لگی بہن کا بیٹا ہے۔“

پھر سچی بات ہے کہ ہمایوں ہے بھی بہت پیارا مجھے خود بہت اچھا لگتا ہے۔“  
سادہ دل کی قدسیہ بانو نے کبھی اور انداز میں سوچا ہی نہیں تھا کہ ان کو کسی بات میں کوئی غلط بات نظر آتی

”ارے بھابھی جان۔ خدا جانے یا تو آپ جان بوجھ کر بھولی بنتی ہیں یا پھر واقعی ہیں مگر میں سب  
ہوں عابی بے حساب جائیداد کی مالک ہے، اسے بھی تو جائیداد کے لیے وارث چاہیے تھا۔ سو سیدہ نے

اور نہ کیا ہمارے آپ کے بچے نہیں تھے، پیارے نہیں تھے کہ عابی ان میں سے کسی کو گود لے لیتی تھی کیوں  
جائیداد وہ اپنے ہی بھانجے کے نام کیوں نہ کرتی۔“

”عذرا بیگم۔ تم بھی قسم سے ایسی دور کی کوڑی لاتی ہو کہ بندہ حیران رہ جاتا ہے۔ خدا جانے عابی

دل میں یہ بات ہے بھی کہ نہیں۔“

قدسیہ بانو کو عذرا بیگم کی اتنی چھوٹی بات پسند نہیں آتی تھی۔

”چلیے، مان لیا کہ عابی کے دل میں نہیں۔ سیدہ اور رحمن کے دل میں تو ہوگی ناں۔ تب ہی تو فوراً بیٹا  
حوالے کر دیا۔ ورنہ کون دیتا ہے اپنا بچہ۔“

”عذرا بیگم تاحق کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔ اول تو مجھے ایسی کوئی بات نہیں لگتی اور اگر ہے تو اس میں ایسی کیا  
بری بات ہے، آخری کو عابی اور اس کی جائیداد پر سیدہ کے بچوں ہی کا حق ہے، کیونکہ یہ وہ جائیداد ہے جو ان

راؤن بہنوں کو ان کے والدین کے ورثے سے ملی ہے۔ ان کی جائیداد میں بھلا ہمارے بچوں کا کیا حصہ ہو سکتا  
ہے۔ اصل حقدار تو سیدہ کے بچے ہی ہیں۔“

قدسیہ بانو نے تو بڑی کوشش کی کہ عذرا بیگم کے دل سے یہ بات نکل جائے، مگر عذرا بیگم جن کی شروع ہی  
نے نظر عابی کی جائیداد پر پڑی۔ اسی لیے وہ شہزاد کے ساتھ عابی کی شادی کروانا چاہتی تھیں۔ مگر قدرت کو یہ بھی

ظہور نہ ہوا تھا۔ اب جو عابی نے سیدہ کے بیٹے کو گود لے لیا تو وہ قتلہا لگئیں۔  
♥.....♥.....♥

”مریم کیا سوچ رہی ہو اتنی دیر سے۔“

فرمان جو کانی دیر سے مطالعے میں مصروف تھے اور سوچوں میں گم مریم کو بھی دیکھتے جا رہے تھے جو بہت  
کڑور ہو گئی تھیں۔ یہ وہی شوخ سی مریم تھیں جس کی شوخ اداؤں کے وہ اسیر ہو کر بے گھر دبے وطن ہو گئے تھے

مریم نے پلٹ کر ان کو دیکھا اور اٹھ کر ان کے قریب آ گئیں۔  
”کیا سوچتا ہے فرمان۔ اب رہا ہی کیا ہے سوچنے کے لیے، میں نے کبھی بھی ایسی اجازت اور تہا زندگی کا

قد نہیں کیا تھا۔ فرمان کہ نہ والدین رہیں گے نہ سرال والے قبول کریں گے۔ فرمان بی بی جان کتنی اچھی ہیں  
بالکل میری اسی کی طرح کاش۔ کاش میں ان کے قدموں میں رہ سکتی۔ فرمان اگر ہم بہت کر کے آغا جی کے

مانے چلے جاتے ان کے قدموں میں گر جاتے تو وہ شاید ہماری خطائیں معاف کر دیتے ہے ناں فرمان۔“  
دل میں ہزاروں پچھتے ارمانوں کی کک لے لیے وہ بچوں کی طرح پوچھ رہی تھیں۔ فرمان ایک ٹھنڈی آہ بھر کر

”فرمان! ہر لڑکی کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ میں بھی بیاہ کر اپنے سرال جاؤں۔ میرے سرال  
الے مجھ سے جیسا بھی سلوک کریں میں اپنی محبت اور خدمت سے ان کے دل جیت لوں گی عذرا بھابھی، قدسیہ

عزیزہ بھابھی کتنی خوش نصیب ہیں کہ اپنے سرال میں ساس سر کی محبتوں کے سائے تلے رہ رہی ہیں۔ کاش  
میں بھی اس قابل ہوتی مگر مجھ سے بھی۔ نادانستی میں ایک محبت بھرا دل ٹوٹ گیا اس کی سزا بھی تو ملنی ہی تھی۔

”ایسا ممکن ہو سکتا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ آغا جی پسند کی شادی کے خلاف نہیں تھے، اور پھر جبکہ  
نہاں تو میں بھی اچھے خاندان سے ہے، بس اگر عابی شادی کر لیتی تو سارے مسئلے حل ہو جاتے۔“

عابی کے شادی نہ کرنے پر خود فرمان بھی بہت نادم تھے، وہ تو اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے نہ  
فرمان کی حمایت کر سکتے تھے، اور یہی مخالفت۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

”ہاں فرمان! یہ سب کچھ عالی کی آہوں کا نتیجہ ہے۔“

مریم کو وہم ہی نہیں پورا یقین تھا۔ یہ سب عالی کی آہوں سے ہوا ہے۔

”نہیں مریم! عالی اپنی جان پر کھیل کر بھی میری زندگی کے لیے دعائیں کرنے والی لڑکی ہے۔ مجھ ہی نہیں ہوئی کہ وہ تنہا ہی جنون کی اس منزل تک پہنچ چکی ہے، جہاں سودوزیاں کا احساس باقی نہیں رہتا۔ واقعی اس کی اتنی جاہت کے قابل ہی نہیں تھا۔ وہ بچپن ہی سے میری خطائیں اپنے نام لکھوا لیتی تھی، مجھ پر بھروسہ کرتی تھی مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھتی تھی ہے، لیکن میں میرا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ پھر مجھ پر سزاوارتھبر آہوں۔“ فرمان نے دکھ سے ہاتھوں میں سر قلم لیا۔

”فرمان! عالی اتنی اچھی ہے اگر آپ مجھے عالی سے ملوادیں تو۔ تو میں عالی کو ضرور شادی کر راضی کر لوں گی۔ اگر نہ مانی تو۔ تو میں آپ کو اس کے حوالے کر دوں گی۔ زبردستی اس کو دے دوں گی مگر یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ فرمان میں نے کیا حاصل کیا ہے۔ سوائے دکھوں کے۔ محرومیوں کے اگرچہ کی تو یہ زندگی اس کے سامنے ختم کر دوں گی۔ میں اب یہ زندگی برداشت نہیں کر سکتی۔ نہیں۔ نہیں۔“ مریم کی پھر طبیعت خراب ہونے لگی تو فرمان پریشان ہو گئے۔ مریم اس طرح ایسی باتیں کر کے کہہ کر دکھار ہو جاتیں تو ان کی سانسیں بری طرح اکٹڑنے لگتیں۔

”مریم! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم کیوں ایسا سوچتی ہو، میں نے تمہارے لیے ایک نرس کو رکھا ہے بھی پاکستانی ہے، بہت اچھی عورت ہے، اور وہ تمہارا بہت خیال رکھے گی۔“ فرمان نے سہارا دے کر مریم پر لٹا دیا۔

”کوئی نرس میرے درد کا درد ماں نہیں بن سکتی فرمان کوئی نرس نہیں۔“

”مریم تمہیں ضرورت ہے، وہ کل سے آجایا کرے گی۔ تمہارا دل بھی بہلا رہا کرے گا۔“

”اے! بہلانے والے کھلونے تو اللہ دیتا اور تمہیں لیتا ہے۔ فرمان یہ میری کم نصیبی ہے یا عالی کی آغا جی کی بد دعائیں۔ کچھ بھی ہے، لٹ تو میں گئی ہوں۔ مجھے تو ناکردہ گناہوں کی سزا مل گئی ہے۔ ماں! محرومیوں اور کم مانگی سے احساس نے مریم کو دوسری مرید بنا دیا تھا۔ فرمان پریشان ہو کر رہ گئے تھے۔

”مریم۔ بھلا ہر وقت مایوسی کی باتیں نہ کرتی رہا کرو۔ خدا کی ذات بڑی مہربان ہے، وہ انسان کو برداشت سے بڑھ کر دکھ نہیں دیتا۔“

اور واقعی جہاں انسان کی برداشت کی حد ختم ہو جاتی ہے، وہاں اللہ تعالیٰ اس کی آزمائش کو ختم کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے مریم کو ایک جیتی جاگتی پیاری سی گڑیا بیٹی عطا کر دی، مریم کو درد روز بعد ہوش آیا تھا۔ تو وہ بیٹی کو سنا کر رو پڑیں۔

”مریم! یہ کیا ناشکری ہے، خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے رد رہی ہو۔“

”فرمان! میرا تو رواں رواں۔ خدا کے حضور سجدہ ریز ہے، مگر مگر فرمان نجابانے کیوں مجھے اپنی غلطی کی لگ رہی ہے، جانے کیوں لگتی سی ہے۔ کہاں کی ہے۔“

وہ بیٹی کو ساتھ لگائے رو رہی تھیں فرمان نگاہیں کتر کر رہ گئے۔

”یہ صرف تمہارا وہم ہے مریم! دیکھو تو ہماری بیٹی کتنی پیاری، بالکل تمہارا عکس ہے۔ کیا نام رکھیں۔ بھلا اپنی لڑکا۔“ فرمان نے غم پکوں اور لرزتی آواز کے ساتھ بیٹی کو پیار کیا اور مریم کو دیکھنے لگے۔ جن کے آنسو تھے کہنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

”مریم! خدا کے لیے بند کرو یہ رونا دھونا۔ یہ سراسر خدا کی ناشکری ہے، بیٹی کیا سوچے گی کہ ماں کو میرے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ دے دوا سے اپنی ممتا کا کوئی نام۔“

فرمان نے دوبارہ بیٹی مریم کی گود میں ڈال دی تو وہ ان آنسوؤں کو خدا کی ناشکری تصور کرتے ہوئے ماف کرنے لگیں اور بیٹی کو دیکھنے لگیں۔

”شعاع۔“ فرمان شعاع ہے، میری بیٹی کا نام جس نے میری اندھی ممتا کو نور بخش دیا ہے۔ خدایا میری شعاع سے روشنی کی نوری ایسی شعاعیں پھونکیں جو نفرتوں کے تمام اندھیروں کو نگل لیں۔“

”آمین! انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ نفرتوں کی دھند بڑی ناپائیدار ثابت ہوگی۔ دیکھنا شعاع کی پیش سے یہ ماری دھند کیسے چھٹ جائے گی۔“

فرمان نے شعاع کے روئی جیسے گالوں پر لب رکھتے ہوئے کہا۔ مریم پر دواؤں کا اثر تھا۔ اس لیے وہ سو گئیں۔ فرمان شعاع کو اٹھائے آتش دان کے قریب پڑی ایزی چیئر پر لے کر آ گئے۔ کتنی ہی دیر وہ شعاع کو دیکھ رہے۔

”شعاع میری بیٹی۔ تمہیں اپنے والدین کی راہوں سے نفرتوں کی دھند کو ہٹانا ہے، میری جان ہم رہیں نہ رہیں مگر تمہیں ایک تھنہ زندگی نہیں دیں گے۔ مجھے یقین ہے آغا جی تمہیں سینے سے ضرور لگائیں گے اور جس روز تمہیں انہوں نے سینے سے لگایا تو ان کے دل سے میری نفرت بھی ختم ہو جائے گی، لیکن ان حیات بخش لمحوں کا انکار بہت کٹھن ہے۔ میری واپسی کے تمام راستے مسدود ہیں۔ میری جان شدید خدا نے تمہیں ہی میری واپسی کا ذریعہ بنایا ہے۔ میں خدا سے ناامید نہیں وہ مجھے ضرور معاف کر دے گا۔“

شعاع تھوڑا سا جاگی تو وہ اسے مریم کے پاس لے آئے جو دوا کے اثر سے بے خبر پڑی تھیں مگر اتنی گہری نیند میں گی چہرے پر بے چینی کے اثرات تھے۔

”مریم تمہاری بے ہوشی کا سہارا لے کر تمہیں تو شاید مطمئن کر دیا ہے مگر مریم۔ میں اپنے ہوش و حواس کو کیسے بہلاؤں۔ کیسے خود کو یقین دلاؤں۔ کاش اس تلخ حقیقت کو جاننے کے لیے میں ہوش میں نہ ہوتا۔ میں بے ہوش ہی ہوتا۔ خدائے پاک مریم کو تو یہ کہہ کر ٹال دیا ہے اس کا وہم ہے۔ مگر میں اس زندہ حقیقت سے میں کس طرح نہ موزوں میرے خدایا میرا گناہ تو اتنا بڑا نہیں تھا۔ جتنی بڑی سزا مجھے ملی ہے۔ آغا جی میری خطا اتنی بڑی ہے کہ قاتل معافی تو نہیں تھی، جس کی پاداش میں آپ نے احواری خوشیاں میرے نام کر دی ہیں۔ مجھے خبر نہ تھی کہ مجھے پا کر تمہیں اتنے دکھ ملیں گے تو خود تمام عمر تمہاری یاد میں تڑپ لیتا۔ مگر یہ احواری خوشیاں اور دمی نزلتیں تمہارے نام نہ کرتا۔ مجھے معاف کرو جانا مریم۔“

فرمان سونے ہوئی مریم کا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر پنجوں کی طرح چھوٹ پڑے آخر وہ بھی انسان بن کر یہ سب برداشت کرتے۔

”فرمان آپ، آپ رو رہے ہیں۔ کیا آپ کو بھی میرے جیسے وہم آنے لگے ہیں۔“

اچانک ہی مریم کی آنکھ کھل گئی، فرمان کو برسات میں بھیگا دیکھ کر دہل گئیں۔ فرمان بس ان کو دہل گئے۔ اب کیا بتاتے کہ وہ تو اسے وہم سمجھ کر ترپ رہی ہیں۔ جبکہ وہ حقیقت کو جانتے ہیں پھر بولیں کیوں نہ مگر مریم کی حالت ایسی نہیں تھی کہ کسی بھی اندھ ہٹاک حقیقت کا انکشاف کیا جاتا۔

”نہیں مریم ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو دکھ اس بات کا ہے کہ میں تمہیں کوئی پائیدار خوشی نہیں سکا۔ سوائے ادھوری خوشیوں کے اگر تم کسی اور کے آنگن میں کھلتیں تو شاید بہاریں تمہارا مقدر ہوتیں۔ مگر نے تو تمہیں دکھوں کی تپش کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔“ جانے کیوں آج فرمان بے حد دکھی ہو رہے تھے کہ انہیں احساس رلائے دے رہا تھا۔

”فرمان۔ فرمان مجھے معاف کر دیں۔ میں۔ میں اپنے پاگل پن سے آپ کو دکھی کرتی رہتی ہوں۔ خواہ قسم فرمان اگر میں کسی اور آنگن میں کھلتی تو شاید ایک بل بھی نہ جی پاتی۔ یہ ادھوری خوشیاں لوگوں میں خالصتیں۔ یہ دکھ، یہ سب ہماری محبت کے سامنے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرمان عالی تو آپ کو اب تک زندہ ہے ناں۔ فرمان میں آپ کو نہ پاسکتی تو بک کی مرگتی ہوتی، اگر یہی ہمارا مقدر رہے تو اب ٹھیک ہے۔ میں آئندہ آپ کو کچھ نہیں کہوں گی۔ یہ خوشی کیا کم ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ جو آپ کی آنکھوں میں آنسو آتے تو میں مرجاؤں گی۔ فرمان اس عداوت سے کہ آپ نے میرے لیے سب چھوڑا اور میں نے آپ کو رلایا۔“

مریم نے فرمان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے، دونوں جانے کب تک دکھوں کی بارش میں بھیجتے رہا شعاع پوری قوت سے رو پڑی تو دونوں ایک ساتھ بولے۔

”اب یہی ہے ہماری زندگی۔“

♥.....♥.....♥

”بی بی جان۔ لہذا کھلائیں تو آپ کو خوشخبری سناؤں!“

رحمن بی بی جان کے کمرے میں آتے ہوئے بولے تو انہوں نے تسبیح آنکھوں سے لگا کر ایک طرف ادا دی۔ اور گلاب جاسن جو کچھ دیر قبل یہ قدسیہ بانو دے کر گئی تھیں رحمن کے منہ میں رکھ دی۔

”اب بتاؤ کیا خوشخبری ہے، میرا بچہ فرمان آ رہا ہے ناں!“ بی بی جان کے لیے بس یہی خوشخبری تھی۔

”فرمان تو نہیں آ رہا۔ البتہ اللہ نے فرمان کو ایک چاندنی بیٹی عطا کی ہے، جس کا نام شعاع رکھا ہے۔“

دونوں نے مل کر۔

”اے اللہ تیرا شکر ہے تو نے میرے بچے کو بھی آباد کیا۔ خدا یا تیرا شکر کیونکر ادا ہو۔ ماشاء اللہ نام بھی بہ خوبصورت رکھا ہے۔ اللہ سلامت رکھے لیکن بیٹا بھی تم مجھے مجھے سے کیوں ہو۔ خوشی کی خبر سنا کہ مریم تو ٹھیک ناں۔“

”مریم اور فرمان دونوں بخیریت ہیں۔ بی بی جان مگر۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئے۔

”رحمن بیٹے صحیح بات بتاؤ کیا بات ہے۔“ بی بی جان بری طرح فکر مند ہو گئیں۔

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”کچھ نہیں بی بی جان یہی سوج کر افسردہ ہو گیا تھا کہ اگر آغا جی اس طرح نہ کرتے تو آج وہ لوگ یوں

”وہ جی اپنے سرال سے اپنے بیوی بچوں کو لے آیا ہے۔“  
 ”کتنے بچے ہیں اس کے؟“

”چار ہیں جی تین لڑکے اور ایک لڑکی۔“

”ہوں۔“ شہباز علی نے بڑے پر خیال انداز میں ”ہوں“ کہا۔

”اچھا تم جاؤ ایاز اور شیراز کو میرے پاس بھیج دو۔“

”بہتر جی!“ ریاض شانے پر کپڑا رکھتا ہوا ہار نکل گیا۔

”آپ نے بچوں کو بلایا شہباز۔“ مزنوہ بچوں کو لیے اندر آئیں۔

”ہاں۔“ ادھر آؤ پتر۔ میرے بازوؤں میں۔ عالم شاہ سمجھتا ہے، وہ میری ٹانگ زخمی کر کے جیت گیا ہے

اللہ سلامت رکھے۔ میرے بازوؤں کو یہ دونوں ہیں میرے بازو دیہ واپس لائیں گے۔ اپنی پھوپھو کی جائیداد۔“

شہباز نے چھوٹے چھوٹے ایاز اور شیراز کو ساتھ لگا کر پر عزم لہجے میں کہا تو مزنوہ اندر سے کانپ کر رہ

گئیں۔

”ایسا نہ سوچیں شہباز۔ نفرت اور دشمنی کو مت منتقل کریں میرے بچوں کی رگوں میں۔ مجھے بڑا خوف آتا

ہے۔“ مزنوہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”اچھا تو میرے بچے نہیں ہیں یہ۔“ شہباز نے مزنوہ کو گھورا۔

”ہیں کیوں نہیں مگر شہباز میں چاہتی ہوں کہ اب ان کی عمر اسکول جانے کی ہے اور گاؤں کا نہ تو ماحول

اچھا ہے۔ اور نہ ہی اسکول اچھے ہیں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ ان کو شہر بھیج دیں کسی اچھے اسکول میں۔“

”ہاں تم تو یہی ہی کہو گی تاکہ بچے شہر جائیں اور تمہارا ماں کے گھر آ جانا شروع ہو، لیکن میں تمہارا یہ خوب

پورا نہیں ہونے دوں گا۔“

”اس گھر میں آپ کی بہن بھی تو ہے شہباز۔“

”مر چکی ہے وہ۔ بہن میرے لیے اور تمہارا بھی کوئی نہیں ہے۔ اگر ان سے تعلق رکھتا ہے تو مجھ سے اور

بچوں سے ہر تعلق کو ختم کرنا ہوگا۔“

”الٹا باتیں نہ کریں۔ شہباز والدین تو لڑکی کے لیے اسی روز مر جاتے ہیں جب وہ اپنی بیٹی پرائے

لوگوں کے حوالے کرتے ہیں۔ اگر آپ نہیں چاہیں گے تو میں اس شہر میں رہ کر بھی ان سے نہیں ملوں گی۔ بس ماں

ہونے کی حیثیت سے میرے کچھ خواب ہیں، میں چاہتی ہوں میرے بچے میری جی میرے بہن بھائیوں کے بچوں کی

طرح پر کچھ لکھ کر معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکیں۔ آخر میرا بھی تو کوئی حق ہے ناں ان پر۔“

مزنوہ کی خواہش ہی میں اتنی حد تک تھی کہ لہجہ ان حسرتوں کا غماز تھا۔ شہباز علی متاثر سے ہو گئے، کچھ دیر

فہوشی سے سوچتا رہا۔

”ٹھیک ہے، ہمارے دو بیٹے ہیں۔ ایک بیٹا میرا ایک تمہارا۔ ایک کو تم اپنی خواہشوں کے سانچے میں

اعمال دو اور دوسرا میرا سہارا بنے گا کہ منظور ہے۔“

زندگی میں پہلی بار شہباز نے اتنے نرم لہجے میں بات کی تھی ان کو بھی کسی قابل جانا تھا۔ ان کے حق کو پہچانا

سب نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ عالی نے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد آغا جی کی اجازت

ایک مقامی کالج میں لیکچرر شپ اختیار کر لی تھی۔ اب اس کی زندگی کی محور ہمایوں اور اپنے فرائض کے گرد

تھا۔ فرمان کی چاہت اس نے بڑی اختیار سے دل کے کھاناں خانوں میں چھپا کر رکھ لی تھی، جب تمہا ہوتی تھی

کے تصور سے باتیں کر کے دل بہلا لیتی۔ مگر ہوی اسے اتنا مصروف رکھتا کہ کسی اور کام کے لیے وقت ہی نہ

سے ملتا۔ اسے اگر ہوی سے پیار تھا تو ہوی کو بھی اپنی اس پیاری خالہ جانی سے عشق تھا۔ اور عالی بھی اس کی

ایک اوپر جیتی تھی۔ ہوی سے عالی کی یہ محبت عذرا بیگم کو شروع ہی سے نہیں بھاتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ عالی

جائیداد ہوی کے نام ہو جائے گی۔ اور سیدہ نے بھی اسی لیے اپنا بیٹا دے دیا ہے جبکہ یہ بات وہ

بہنوں کے ذہنوں سے کوسوں دور تھی۔ ہوی سے عالی کی محبت۔ سیدہ کے دل میں مزید دکھ بھردیتی کہ عالی

محرومی کے باعث ہوتی کو بیٹا بنایا ہے۔ فرمان کے لیے ان کے دل میں مزید نفرت بڑھ جاتی۔ اور وہ ان کو کسی کام

جانتیں۔ لیکن عالی کے سامنے وہ کچھ نہ بولتیں۔ کیونکہ عالی سے اگر کوئی بات برداشت نہیں ہو سکتی تھی تو وہ فرمان

برائی تھی۔ جو وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”ہوی بیٹا چلو کھیل ختم اور کتابیں لے کر آؤ۔“

عالی لیکچر کی تیاری کے بعد ہوی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”عالی! ہوی کے علاوہ بھی تو اس گھر کے بچے ہیں تمہارے کچھ لگتے ہیں۔“

عذرا بھابی نے ذرا جمل کر کہا۔

”ارے بھابی جان۔ کیوں نہیں۔ ہوی راشو، اشعر باقی سب بھی میرے اپنے ہیں اور مجھے بے حد

ہیں۔ بھلا بہنوں اور بھائیوں کے بچے کے عزیز نہیں ہوتے۔ کیوں سوچی آپ نے یہ بات۔“ اس نے بڑا

عذرا بیگم کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

”تمہارے روپے سے ظاہر ہے، کہ جیسے ہوی ہی تمہارا سب کچھ ہے۔“

”یہ وہم ہے آپ کا۔ رہی بات ہوی کی تو۔ تو آپ جانتی ہیں کہ سیدہ آپ کے بھی بچے ہیں مگر جانے ہلا

میں کیا بات ہے کہ میں نے اسے ہی بیٹا بنایا۔“

عالی نے سادگی سے کہا کیونکہ وہ عذرا بیگم کے دل کی بات نہیں جانتی تھی۔

”اچھا خبر رہے دو۔ میرا شکوہ بھی تو فضول کا ہے بھلا۔ سیدہ اور ہمارے بچوں کا مقابلہ ہی کیا ہے۔“

”پلیز بھابی جان۔ ایسے فرق والی باتیں مت سوچا کیجیے۔“ عالی اداس ہو گئی۔

”عالی! رہنے دو! انہیں یہ تو ایسی ہی دل جلانے والی باتیں کرتی ہیں، بچوں کو پڑھا کر آغا جی کی بات

آنا۔“ قدیرہ بانو نے آکر بات ختم کر دی۔

شہباز علی، عالم شاہ کی گولی لگنے سے ایک ٹانگ سے تو محروم ہو گئے تھے مگر گزرتا ہوا ایک ایک

عالم شاہ سے دشمنی میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ دن رات جلتے رہتے۔ حیرا کی اتنی جائیداد جو وہ اپنی حماقت کے باعث

عالم شاہ کے سپرد کر چکے تھے، اب اسے واپس لینا چاہتے تھے۔ اور اس کے لیے انہوں نے بڑی دور تک سوچا

اور مضبوط منصوبہ بندی کی تھی، لیکن اس کے لیے وقت درکار تھا۔

”ریاض خبر ہے عالم شاہ کی۔“ شہباز نے ریاض کی طرف دیکھا۔



تھا۔ مزہ تو بے یقینی سے ان کو دیکھے گئیں۔ خوشی سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”شہباز میں ایاز کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں۔“ ان کی آواز لرز گئی۔

”جیسے تمہاری خوشی۔ لیکن ایک شرط ہے۔ ایاز ہوشل میں رہا کرے گا اور اس کی ثانی اور ماموں وغیرہ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“

گوکہ شرط کڑی تھی، مگر بیٹے کے بہتر مستقبل کے لیے ہر شرط منظور تھی۔

”جیسا آپ کا حکم شہباز۔“ آج شہباز نے پہلی بار ان کی منت کو تسلیم کرتے ہوئے بات کرنے کا حق تھا تو ایسے میں وہ ان کی کسی بات سے اختلاف کر کے گناہ نہ ہونا چاہتی تھیں۔



”ہوں بھئی۔ نواز کیا خبر ہے میرے یار شہباز کی۔“

عالم شاہ نے مونچھوں کو تاد دیتے ہوئے پوچھا۔

”اسے تو جی آپ مراد ہوا ہی سمجھیں! نہیں رہی جان اس میں۔“

”نہیں، نواز میدان جنگ میں دشمن کو کمزور سمجھنا۔ سمجھنے والے کی سب سے بڑی بے وقوفی اور غلطی ہوا ہے۔ میں شہباز کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسا شیر ہے جو زخمی ہو کر مزید خطرناک ہو جاتا ہے اور زخمی شہباز میں کرنا بڑی جان جو کھوں کی بات ہے۔ ویسے میری اطلاعات کے مطابق اس کا چھوٹا بیٹا ایاز شہر جا رہا ہے، کچھ صحیح ہے کہ غلط۔“ عالم شاہ نے تجسسی نگاہوں سے نواز کو دیکھا تو وہ شرمسار سا ہوا۔

”تمہاری ڈیوٹی یہ بھی ہے تاں کہ شہباز پر نظر رکھو۔ وہ کیا کرتا ہے اور۔“

”جی وہ باؤجی اصل میں۔“ نواز ہلکا کر رہ گیا۔

”بکواس بند کرو۔ اگر تمہاری سراغ رسانی کا یہی حال رہا تو ہو گیا کام!“

”نہیں باؤجی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا جی، اگر ہوا تو بے شک آپ نکال دیں۔“ نواز کو ایک دم پسینا آ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، اس دفعہ معاف کرتا ہوں۔ وہ بھی صرف تیرے باپ کی وجہ سے جس کی وفاداری اس جہاں کے ملازموں کے لیے مثال ہے۔ یہ بتاؤ، ہمارے بیٹے حارث، غیاث اور فیاض کہاں ہیں۔“

”وہ جی باغ گئے ہیں۔ غمخواری کے ساتھ۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم اب جاؤ۔“



آج میٹرک کا رزلٹ آیا تھا اور ہومی سمیت گھر کے بچے جو میٹرک میں تھے، عابی کے کمرے میں تھے کچھ لوگ خوش تھے اور کچھ ناشاد۔

”اشعر! میں نے کہا تھا کہ میرٹ لسٹ سے نہیں گرنا پھر!“ عابی نے اشعر کو دیکھا۔

”جی پھپھو! یہ کیلے کے جھٹکے سے پھسل گیا تھا۔“ جانے کہاں سے آواز آئی۔

”تمہارے جیسے اسپنڈ بریکر کے ہوتے ہوئے بھی۔“ عابی سمجھ گئی تھیں یہ کون بول رہا ہے۔

”خالہ جانی، میں تو میرٹ پر ہی آیا ہوں۔“ ہومی نے جلدی سے اپنی شوماری۔

”بڑی مشکل سے سیٹ ملی تھی میرٹ فلائٹ پر۔“ راشو نے اشعر کے کان میں کہا۔

”نہرے بازی عابی کو اچھی لگ رہی تھی۔ زیر لب مسکراتی وہ سب کے رزلٹ کا رد دیکھ کر سب ضرورت پڑی اور ہاتھوں کا استعمال کر رہی تھیں۔“

”پھپھو! اگر میں میرٹ لسٹ پر نہ آیا تو۔“ راشو کو فکر لاحق ہوئی۔

”تو پھپھو کے کالج میں چلے جاتا۔“ کسی نے مشورہ دیا۔

”بھٹ پاگل۔ میں کوئی لڑکی ہوں۔“ راشو نے اسے ٹھوڑا۔

”اے احمق! گر لڑکا کالج میں بھی لڑکوں کی بہتری جگہ ضرورت پڑتی ہے، چپڑا اسی کی۔ چائے بنانے والے

اسے کی۔“

عابی کو ہومی کی اس بات پر بے ساختہ ہنسی آگئی تو وہ اٹھ کر باہر آ گئیں۔ عابی کے کالج کی پرنسپل پھنسی پر

نہیں تو ان کی جگہ عابی کو پرنسپل کے فرائض ادا کرنے پڑے تھے۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق آفس میں

رجھکائے کوئی فائل دیکھ رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”آپ؟“



تھوڑا سا اس طرح بولنے پر کچھ بوکھلا سے گئے۔ شرمین کا ہاتھ دبا کر خاموش کیا۔ عالی بھی کچھ جھکی تھیں۔  
 ”آپ کی تعریف۔“ عالی نے مسکرا کر پیاری سی لڑکی کو دیکھا۔ شرمین نے لب کھولے ہی تھے کہ شہزاد بول

”یہ میری کل کائنات ہے عالی! میری بیٹی شرمین۔“

”ہاں! اللہ بہت پیاری ہے۔ آپ تو اسے ساتھ لاکر بھول ہی گئے تھے اگر یہ خود نہ بول پڑتی تو۔“  
 ”عالی! میں تو ان لمحوں میں ہمیشہ خود کو بھی بھول جایا کرتا ہوں۔“ شہزاد ایک نگاہ اس کے پردہ کار سراپے پر

ان کرچ ہو گئے۔  
 ”سوری! میں آپ کو عالی ہی کہے چار ہا ہوں حالانکہ یہاں آپ کو۔“

”ارے نہیں شہزاد! آپ مجھے عالی ہی پکار سکتے ہیں۔ میرے اپنے سارے مجھے عالی ہی کہتے ہیں اور  
 آپ بھی تو بہنوں ہی میں شامل ہیں۔“

انسان کی بعض خواہشات اتنی بے وقعت اور خواہشوں کی عمر ڈھل جانے کے بعد پوری ہوتی ہیں۔ آج  
 عالی نے اپنے لبوں سے ان کو اپنوں میں شمار کیا تو وہ اس خواہش کی تکمیل پر جشن بہاراں بھی نہ مٹا سکے سوائے آہ  
 بھرنے کے۔

”بہت شکریہ عالی!“ شہزاد نے ہلکے آسانی رنگ کی سرخ بارڈر کی ساڑھی میں خوبصورت سی عالی کو دیکھا  
 جس کا معصوم صحن بھی دل کے تاروں کو چھیڑ گیا تھا اور آج پر وقار حسن بھی۔  
 ”آئی! مجھے آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ آپ کی اتنی تعریفیں سنیں ہیں کہ حد نہیں اور سچ آپ کو آپ  
 کفریوں سے بڑھ کر پایا ہے۔“

شوخ شرمین عالی سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔

”اوہو بھی، ہمارا اتنی ڈھیر ساری تعریفیں کس نے کر ڈالیں؟“

عالی نے شوخ سی صدف کو دیکھا۔

”ڈیڈی نے۔“ شرمین نے جھٹ کہا تو عالی نے ایک نظر شہزاد کو دیکھا وہ دیوار پر لگی قائد اعظم کی تصویر کو  
 دیکر شاید اپنی جینپ مٹانا چاہ رہے تھے۔

”اچھا کیا منگاؤں آپ لوگوں کے لیے؟“

عالی نے اس بات کے تاثر کو ختم کرنے کے لیے میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ بھی منگا لیں۔ میرے خیال میں کافی بہتر رہے گی۔“ شہزاد تسکین گئے۔

”شہزاد! آپ کچھ خاص کام کی غرض سے آئے تھے؟“ عالی نے ایک قائل پرسائن کرتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاں آپ تو غرض ہی سے ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ اکثر سوالیوں کو خالی ہاتھ لوٹا دیا کرتی ہیں۔“  
 شہزاد کے لہجے میں ماضی کی تلخی اتر آئی۔

”یہ تو سوال کی نوعیت پر منحصر ہے ناں۔“ عالی سمجھ رہی تھیں کہ شہزاد کس بات کی بابت کہہ رہے ہیں۔

”قصہ مختصر یہ ہے کہ دو ماہ ہوئے ہیں پردیس سے لوٹے ہوئے۔ شرمین کے ایڈمیشن کا مسئلہ ہو رہا  
 تھا۔ شہزاد! آپ سے بات کی تو انہوں نے آپ کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ میں کنگول لیے ایک بار پھر حاضر

”آپ!“ عالی اپنی سیٹ سے کھڑی ہو کر شہزاد کو دیکھ رہی تھیں جو گندہ محبوبوں کی دھند سے  
 دیکھ رہے تھے۔ محرومی کا احساس ایک بار پھر نہیں بن کر ابھرا۔ وہ اسے دیکھے گئے۔

”ارے شہزاد صاحب بیٹھے ناں!“ عالی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ تجل سے ہو کر بیٹھ گئے۔  
 ہے آپ نے مجھے پہچان لیا۔ ورنہ تو۔“ شہزاد نے ایک نظر ڈال کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میری پہچان کی نظر کزور نہیں ہوئی شہزاد صاحب۔“ عالی نے چشمہ اتار کر میز پر رکھتے ہوئے اعتراف  
 کیا۔

”لیکن پھر بھی مجھے حیرت ہے۔ کیونکہ ماضی میں کبھی آپ نے مجھے نگاہ اٹھ کر نہیں دیکھا پھر بھی۔“  
 شہزاد کے لہجے میں حیرت سے زیادہ مسرت چھپی ہوئی تھی کہ جو کسی جوان دل کی دھڑکن ہوتی ہے۔  
 جسے چاہ رہا ہے وہ بھی اسے اسی قدر چاہے مگر ان کی یہ تمنا تو حسرت میں بدل چکی تھی۔

”ارے ایسی بھی بات نہیں۔ ایک تو تصویروں میں دیکھا تھا۔ آسا سامنا بھی ہوتا تھا اور پھر آپ ہالا  
 پیاری بھابھی عذرا کے بھائی ہیں۔“

”چلیے، آپ نے کسی حوالے سے تو یاد رکھا پہچانا۔“ شہزاد نے گہرا سا سانس لے کر کوٹ کی جیب سے  
 مگر یہ کیس نکالا مگر پھر ایک نظر عالی پر ڈالی اور پکٹ واپس رکھ دیا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں شہزاد صاحب؟“ عالی نے عینک دوبارہ لگاتے ہوئے پوچھا جو اس کے حسن کو  
 وقار بخش رہی تھی۔

”یہی کہ وقت بھی کیا انقلابی تبدیلیاں لاتا ہے انسان کی زندگی میں کہ انسان بالکل بدل کر رہ جاتا ہے۔  
 دیکھ رہا ہوں کہ کل کی چھوٹی موٹی سی عالی اور آج کی میڈم عابدہ آغا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”عالی۔ ڈیڈی! یہ وہی والی عالی ہیں ناں؟“  
 اس چونکا دینے والی آواز پر دونوں نے چونک کر شرمین کو دیکھا جو خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

ہو گیا ہوں۔“

شہزاد نے عالی کے ہاتھ سے کافی کاگ لیتے ہوئے کہا۔

”اچھی بات۔ شرمین! تمہارے پاس پری میڈیکل ہے یا۔“

”جی آئی میڈیکل ہے۔ مجھے تو کوئی خاص شوق نہیں مگر میڈیڈی کو مجھے ڈاکٹر بنانے کا بے حد شوق ہے۔“

”تم بھی سوچا۔ ہم بھی ان کی بات مان کر ایک احسان کر ہی ڈالیں۔“

شرمین نے پیار سے شہزاد کی طرف دیکھا جو اس کی بات پر مسکرا رہے تھے۔

”شاباش! اس کا مطلب ہے تم خاصی فرمایہ وار بنی ہو۔ شہزاد فی الحال تو ایڈمیشن میں ابھی نہیں آئے۔“

جیسے ہی ایڈمیشن اوپن ہوں گے میں انشاء اللہ آپ کو انفارم کر دوں گی۔“

یہ بات تو شہزاد کو بھی معلوم تھی کہ ایڈمیشن میں وقت چڑھنے پھر بھی نا جانے کون سا جذبہ یہاں تک نہ تھا۔ وہ کیا دیکھنا چاہتے تھے اور کیا دیکھ پائے تھے۔

”میڈم آج آپ کلاس نہیں لیں گی؟“ ایک طالبہ نے اندر جھانک کر پوچھا تو عالی کو نورانہ آگیا۔ رست و اوج پر نظر ڈالی۔ اس کے پیڑیڈ کا وقت ہو گیا تھا۔

”کیوں نہیں۔ آپ چلیں۔ میں آ رہی ہوں۔“

”اچھا۔ ہمیں بھی اجازت عالی! آپ کلاس لیں۔ ہم چلتے ہیں۔“

شہزاد کرسی پر دو ڈال کر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

”مجبوری ہے شہزاد! لیکن آپ ایڈمیشن کے لیے فکر مند نہ ہوں میں خود شرمین کا فارم لے لوں گی۔“

سمجھتیے کہ شرمین کا ایڈمیشن ہو گیا۔“

شرمین کے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے عالی نے شہزاد کو ایسے یقین دہانی کرائی جیسے وہ آئے ہی ایڈمیشن لیے ہوں۔

”آئی! جب تک ایڈمیشن نہیں ہوتا۔ میں آپ سے ملنے آ جایا کروں۔“

شرمین نے جاتے جاتے پلٹ کر عالی کو دیکھا تو عالی جو کوریڈور میں تھوڑا سا آگے نکل چکی تھیں۔ بات پر مسکرا کر مڑیں۔

یہاں نہیں۔ تم گھر آ جایا کرو۔ اپنے ڈیڈی کے ساتھ۔ تمہی کے ساتھ۔“

تھنکیو کیوٹ آئی۔“ شرمین نے الوداعی ہاتھ لہرایا۔

عالی اور فرمان کی داستان سے نئی نسل بھی آشنا تھی۔ اور سب ہی عالی کے حق میں فرمان کے تھے۔ جنہوں نے کوئی سی عالی کے ساتھ بے وفائی کی تھی اور سیدہ بیگم نے تو ہوی کو یہ باتیں کچھ اس انداز میں

تھیں کہ اس کے دل میں فرمان کے لیے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ باقی سب بچے بھی عالی کے حق میں تھے۔

ساتھ میں ان کو اپنے چچا سے بھی محبت تھی۔ اور وہ ان کو دیکھنا اور ملنا چاہتے تھے مگر گھر میں تو ان کا ذکر بھی نہیں

گوا کوئی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہو۔

”ہائے قسم سے کیا لگ رہی ہیں پھوپھو! لیکن کلر کے سوٹ میں۔ بیچ میں سو جتی ہوں۔ اب پھوپھو!

ہے جوانی میں تو حواسوں پر چھاتی ہوں گی۔“

صدف جو عالی سے ابھی مل کر آ رہی تھی۔ بولی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ وہ بوڑھی ہو گئی ہیں۔ ارے تم جیسی اب بھی ان کے آگے پانی بھرتی نظر آتی ہیں۔“

شرمین نے صدف سے حق دشمنی ادا کیا۔

”لیکن کاش! پھوپھو اور فرمان چچا کی شادی ہو جاتی۔“ فائزہ نے آہ بھری۔

”ہونہ! ہو کیسے جاتی۔ یہ ہوتے ہی ایسے ہیں۔ ہر جانی، بے عزت، بے وفا۔“ صدف نے کشن کھینچ کر

شرمین کو مارا۔

”میں نے کیا کیا ہے تارکول کی سڑک۔“ شرمین نے چڑ کر اس کے سانولے رنگ پر چوٹ کی۔

”صدف تمام مردوں کی بات کر رہی ہے چچا جان سمیت۔“ فائزہ نے صدف کی حمایت کی۔

”لو میڈی کو بھی زکام ہوا۔“ نوی نے نازی کی پٹیا کھینچی۔

”تم اپنی چونچ بند رکھو نوی!“ نازی نے نوی کو گھورا تو وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔

”پارہ! یہ مڑوں کے جیسے کو چھینا کس نے تھا؟“

”اس نے۔“ فرائز نے شرمین کی گود سے کشن اٹھا کر صدف کو دے مارا۔

”ان کو تم پر رہنے دو۔ بڑی آئیں وفا کی چٹلیاں۔ پہلے جوڑیر، ڈارلنگ ہوتا ہے۔“ بعد میں اپنے بچوں کا

ہاں بنا ڈالتی ہیں۔“

”ہاں بتاتے ہیں۔ اس لئے کہ تم جیسے ہوتے ہی ماموں بتائے جانے کے قابل ہیں۔“

صدف اور شرمین کا حملہ برداشت کر جاتی یہ کہاں ممکن تھا۔

”صدف! شرمین! یہ کیا ہر وقت میدان جنگ گرم رکھتے ہو۔ کبھی امن سے بھی رہ لیا کرو۔“

”امن! امن! راشو بھیا! یہ امن کس چڑیا کا نام ہے۔ ایسی دور میں رہ کر آپ امن کی بات کرتے ہیں۔“

بڑے بولے ہیں آپ بھی۔ کیوں بڑے بھیا۔“

بولی نے مڑ کر نوی کو دیکھ کر اسے فلفے کی داد چاہی۔

”شاباش! تمک جا رہے ہو شاگرد۔ ہاں تو حاضرین! آج کے اجلاس میں مس صدف نے وفا کے نام پر

لیکچر اور داد پیش کی جبکہ مخالف سمت سے راشو نے امن کی فاختہ اثرانی چاہی مگر تمام اراکین کو ان دونوں کی

نوکھل کوڑی کی نوکری میں ڈالنا پڑا۔ بھلا آج کے دور میں امن اور وفا کا کیا ذکر؟“

نوبلی کی بات پر راشو بھی بے حرا ہو گیا اور لڑکیوں نے واک آؤٹ کر دینا زیادہ مناسب سمجھا۔

”کس کم جہاں پارک۔“ کسی کو نے سے آواز آئی مگر وہ اس وقت جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

”ہائیں۔ ہائیں۔ یہ کیا ہوا کہ ہم آئے اور تم چل دیے۔ ارے کچھ ہم سے کہا ہوتا۔ کچھ ہم سے سنا ہوتا۔“

ہوئی ہاتھ میں ریکٹ پکڑے ان سب کو اندر لانا ہوا بولا۔

”نیری! مجھ میں نہیں آتا ہوی! جھیں اور دانی کو بے چاری شاعری کی ٹانگ تو ذکر کیا ملتا ہے؟“ نوبلی نے

نوکھل گھورا۔

”لیکن اس بات کو ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے کہ پڑے گئے تو سب کو سزا ہو جائے گی۔“

راشو نے اپنی دانش مندی سے ان کو بچانا چاہا۔

”ہوں تو یہ ٹھانھ ہیں۔ ابھی جا کر بتائی ہوں بی بی جان کو۔“

ٹوبہ جو ان سب کو کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ پردے کی اوٹ میں بی بی جان کی بات سن کر پلٹ گئی اور جس بات کا لڑکیوں کو خدشہ تھا۔ ہو کر رہی۔ کیونکہ تجویز ایسی تھی کہ بی بی جان آسانی سے اعتبار کر لیتیں اور وہ سب سے فلم دیکھ آتے مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ لڑکیاں لڑکوں کی کوئی کمزوری درگزر کر لیں اور لڑکے لڑکیوں کو بخش دیں۔ دونوں پارٹیاں ہی کھوج میں رہیں کہ کوئی کمزوری ہاتھ آئے تو پھر فیئر نہیں۔ کھانے کی میز پر لڑکیاں خوب چپ رہی تھیں۔

”راشو بھیا! آپ لوگ فلم دیکھنے جا رہے ہیں ناں۔ بی بی جان ہمیں بڑا مزے کا ڈراما دکھا رہی ہیں۔“ فائزہ نے آہستگی سے راشو کے کان میں سرگوشی کی تو صدف نے گھور کر اسے دیکھا کہ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ پھر سب ہی کھانے میں ایسے جٹ گئیں جیسے پھر نصیب نہ ہوگا۔

”لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔“ دانی نے شرعی کے کان میں سرگوشی کی۔ اور جب وہ لوگ کھانے کے بعد بی بی جان سے فلم کی اجازت لینے گئے تو انہوں نے فوراً اجازت دے کر ان لوگوں کو نہ صرف حیرت کے سمندر میں فوڈز بننے پر مجبور کر دیا بلکہ ان کے وہم کو یقین میں بدل دیا کہ دال میں کالا ہے۔

”ہاں بی بی! تم لوگ جاؤ اور ہوی کو میرے پاس بھیج دو۔“

”جی! سب کو رس میں بولے۔“

”ہاں بھئی۔ ابھی اس کی سزا میں چار دن باقی ہیں۔ جاؤ۔ اسے میرے کمرے میں بھیج دو۔“

”مگر بی بی جان! وہ تو اپنے کمرے میں دروازہ لاک کر کے پڑ رہا ہے۔“

”بی بی جان! اور کہہ رہا تھا کہ اگر کسی نے اس کو سزا سنبھال لیا تو وہ اس کا سر توڑ دے گا۔“

شرعی نے دانت پیس کر صدف کو دیکھا جو بی بی جان کے شانے دیا ہوتی بڑی سہمی گئی تھی۔

”اچھی بات ہے بیٹا۔ انٹرویو کے لیے اسے پڑھنا چاہیے۔ پر فائزہ حساب سمجھنے کو تھک رہی تھی۔ جاؤ فائزہ

بھائی کے پاس چلی جاؤ۔“ بی بی جان نے سسکراہٹ دبا کر کہا تو لڑکوں کا خون کھول گیا۔

”اس کو تو میں سمجھاؤں گا میٹھا اچھی طرح۔“

دانی نے فائزہ کی چوٹی اتنے زور سے کھینچی کہ وہ ہلہلا کر رہ گئی۔ لڑکے لڑکیوں کو کتنے ہوی کے بغیر ہی فلم

دیکھنے پڑ گئے۔ اور اپنی کھڑکی میں کھڑا ہوی ان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا۔

لوگوں کو کڑے بھی شرارتیں کر جاتے مگر اکثر لڑکیاں بڑوں کی شر پر لڑکوں کے ساتھ زیادتی کر جاتیں۔ اس

سے یہ لوگ بہت شک تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی ایسا قانون پاس کر دلائیں جس کے تحت لڑکیوں کو بھی سزا مل

سکے۔ یہی سوچ کر وہ بی بی جان کی عدالت میں حاضر ہو گئے۔

”کیا بات ہے!“ میرے بچوں نے آج پھر فلم دیکھنی ہے لیکن بیٹا! آج نہ تو اجازت ملے گی ورنہ ہی ہوی

کو سزا ملے گی۔“

ان کو نکال کر شاید بچتا رہے ہوں

محفل میں اس خیال سے پلٹ آئے ہیں وہ

دانی نے صدف وغیرہ کو دیکھ کر شرعی سے کہا۔

”ایک درخواست کروں دانی؟“

”عرض کرو فریادی۔“ دانی نے اکثر کارکردہ کرتے ہوئے فائزہ کو دیکھا۔

”یہ تم لوگوں کو بے چارے شاعروں کی رحوں کو تڑپا کر کیا ملتا ہے؟“

”کیا کریں فائزہ بی بی! جب تک ہم شغفی آپ ہیں بھر کر غلط شعروں پر ہمیں تو یہ لڑکیاں ہماری دغا بازی ہی کب کرتی ہیں اور پھر اپنا رستہ بھی کر لڑکے کے سامنے سے گزرتا ہے۔ کرنا پڑتا ہے بی بی! یہ سب کرنا پڑتا ہے۔“

دانی نے ایک آہ بھر کر بڑے ظلفیانہ انداز میں کہا تو بی بی کو فوراً ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

”شغفی آہوں پر حاضرین ایک لطیفہ آپ نذر ہے۔“

استاد شاگردے۔ سب سے زیادہ شغفی کہاں پڑتی ہے؟“

شاگرد۔ جناب کالج کے سامنے جہاں سے لڑکوں کا گزر ہوتا ہے۔“

ہوی نے کچھ یوں آہ بھر کر لطیفہ سنایا کہ لڑکیوں کو بے ساختہ ہنسی آگئی مگر لڑکے خاموش بیٹھے رہے۔

”یار! تم لطیفہ سنانے سے پہلے بتا دیا کرو کہ ہنسنا بھی ہے تو ہنس دیتے۔ عزت تو رہ جاتی تمہاری۔“

نے ہوی کے سر پر چڑھ لگائی۔

”کوئی بات نہیں۔ لطیفے کو سمجھنے کے لیے ضروری نہیں کہ اسی وقت سمجھ میں آجائے۔ فکر نہ کریں۔“

میں آجائے گا تو ہنس لیجے گا۔“ ناچہ نے مسکرا کر کہا تو ہوی اسے ایسے دیکھتا ہوا ٹھٹھکا ہوا جیسے وہ پہلی بار ہوی

”واہ بھئی واہ! اپنا دانی یار کوئی لڈو ڈھڈولاؤ۔“ بچی نے بولنا سکھ لیا ہے۔ دیکھ لیتا۔ ماشاء اللہ بڑا ناٹا

کرے گی جب زبانی میں۔“

یہ بات کہہ کر گویا ہوی نے اپنی برادری کی توہین کا بدلہ لے لیا۔

تمن بھائیوں کے ماشاء اللہ کافی نیچے تھے۔ مگر مجال ہے جو ان کے والدین کو ان کی کوئی فکر ہو۔ ان سب

تعلیم وغیرہ کو عالی دیکھتیں۔ اور ان کے دوسرے معاملات بی بی جان کے سپرد تھے اور دونوں بڑی سختی سے

کنٹرول میں رکھتیں۔ بی بی جان نے تو باقاعدہ ایک رجسٹر بنا رکھا تھا جس میں لڑکوں کے نام اور باہر جانے

کے اوقات کا درج تھے۔ اور جو ذرا بھی درج شدہ وقت سے اوپر اڈھر ہوتا۔ بی بی جان سزا دلاتی

دیتیں۔ باہر آنا جانا کم از کم ایک ہفتے تک بند ہو جاتا اور لڑکے گھر سے پار سے ہی برادری سے آکر

رہتی۔ خصوصاً ہوی کو جو باہر جا کر سب کچھ بھول جاتا تھا۔ اور آج کل بھی وہ زیر سزا تھا۔ سوائے کالج کے

آج نہیں سکتا تھا۔ ابھی اس کی سزا کے چار دن باقی تھے کہ بڑی اچھی ہوی کی پسندیدہ فلم چل پڑی۔ باقی

جا رہے تھے مگر ہوی پر سب کو ترس آئے جا رہا تھا۔ مگر بی بی جان سے اجازت کون لیتا بھلا۔

”آئیڈیا!“ دانی نے کچنی پر انگلی رکھ کر کہا۔ سب متوجہ ہو گئے۔

”دیکھو ہوی! تمہاری سزا تو یہ ہے ناں کہ اندر بیٹھ کر پڑھنا ہے تو اپنی آواز سب کے اور۔“

”نور دروازہ بند کر کے ملے جائیں گے یہی ہے ناں تمہارا گھساٹا آئیڈیا۔ خیر جیسا بھی آئیڈیا



”ویری گڈ شاباش لڑکی! اگر یہ تم نے مشورہ کیوں دیا۔ ہم لوگ تم لوگوں کو ہرگز لے کر نہیں جائیں گے سارا ایک خراب ہو کر رہ جاتا ہے۔“

شرعی کو صدف کی بات بڑی پسند آئی مگر فوراً ہی اس نے برا سامنہ بنا کر اسے جھڑک دیا۔

”اچھا ہم نہیں جائیں گے تو کوئی نہیں جائے گا۔“ مینا نے اکر کر کہا۔

”اوہو بھئی، کون کہاں جا رہا ہے؟ کیا معاملہ ہے؟ ہم بھی جائیں گے۔“ ہونی زار شاہ اور شعر ایک ساتھ اندر آتے ہوئے بولے۔

”ہونی بھیا آپ ہمیں ٹریٹ دے رہے ہیں۔“

”ہائیں! یہ خبر کب نشر ہوگئی، میں نے تو شام کے پانچ بجے سے نو بجے تک کی خبر سی سی بی میں مگر ایسی المناک فرمیں نے نہیں سنی۔“ ہونی، دانی اور شرعی کے درمیان فٹ ہو گیا تو تاجہ پھولی سانسوں کے ساتھ اندر آئی۔

”ہونی بھیا جلدی چلیے عالی پھو پھو کو جانے کیا ہو گیا ہے۔“

تاجہ کی آواز سنا سناؤں سے ٹکرائی تو ہونی اپنے حواس معطل محسوس کرنے لگا۔ وہ سب کو چھوڑ کر اندھا ہند ہالی کے کمرے میں پہنچا جہاں آغا جی سمیت سب ہی موجود تھے۔ سیدہ بے ہوش عالی کا سر گود میں رکھے مسلسل رو رہی تھیں۔

”اچی! اکیا ہوامیری خالہ جانی کو!“ ہونی کی آواز گویا حلق میں ہی پھنس گئی۔

”کچھ نہیں ہوا بیٹے، عالی کو سرد درد کا دورہ پڑتا ہے وہی ہے ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔“

رحمن نے ہونی کو سمجھایا مگر وہ کہاں سن رہا تھا۔ اس کی نگاہیں تو بے ہوش عالی کے چہرے پر تھیں اور اس کے ہاتھ میں عالی کے برف ہاتھ تھا۔ اس کے ہوش میں عالی کو درد کا شدید دورہ پہلی بار پڑا تھا اس لیے ہونی بہت اذیت زدہ لگ رہا تھا۔ اس زندگی میں عالی وہ ہستی تھی جس کی خاطر وہ جان بھی دے سکتا تھا اور جس سے اسے

جنون کی حد تک پیار تھا۔

”کہن! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

”بھئی! امی! کیوں ہوا ہے اتنا شدید سرد؟ کیا وجہ ہے؟“ ہومی حذت جذبات سے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔

بی بی جان نے ان کو دیکھا جو منہ پھلائے ان کے ارد گرد بیٹھ گئے تھے۔

”بی بی جان! ہم آپ سے ناراض ہیں۔“ شرعی بسور۔

”کیوں چند؟“ بی بی جان نے اس کے رخساروں کو چھوا

”اس لیے بی بی جان کہ آپ نے ہمارے لیے تو قانون بنا چھوڑے ہیں اور ان پر تینہ ہیں وہ نہیں

نہیں کہتیں۔ بلکہ کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اس روز صدف نے چپاٹی کی تپتی پھپھادی اور نہ سکا دیا پاگل باہر

پردوں میں جو تصادم ہوا۔ خدا کی پناہ۔ آغا جی سے شکایت کی گئی تو تبسم فرما کر کہنے لگے پچیاں تو شوخیان لڑنی

اچھی لگتی ہیں اور ہم ذرا سی بھی حرکت کر تپتیں تو مجرم بن جاتے ہیں۔“

”اور کیا بی بی جان! آپ نہیں جانتیں۔ یہ لڑکیاں کس قدر بدتمیز ہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے۔“

ناخن کس قدر بڑے ہیں اور پھر اوپر سے نیل پالش بھی لگاتی ہیں۔ اب بھلا کوئی نیل پالش کے ساتھ

ہے؟“ دانی کو جلدی میں یہی الزام مناسبت لگا۔

وہ سب لڑکیوں کے لیے کوئی سزا تجویز کرانے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے اور بی بی جان مگر ان

کے الزامات سن رہی تھیں۔

”ارے چند! ان بے چاری لڑکیوں کو کچھ مت کہا کرو۔ ایک تو یہ مہمان ہوتی ہیں اور دوسرے اور

کام کرتی ہیں۔ اور رہا فیشن کا سوال تو اس میں وہ آزاد ہیں۔ جیسا زمانہ ہوا اس کے مطابق وہ چلنے کا

ہیں۔ اور پھر نیل پالش لگا کر اگر وہ نماز پڑھتی ہیں تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو زیادہ بلند

ہے کہ اسے ہر حال میں یاد کیا جائے۔ اب بتاؤ بھلا تم میں سے کون کون نماز ادا کرتا ہے؟“

بی بی جان نے ان سب کو دیکھا تو وہ لوگ سر جھکائے لگے۔

”کس نے کہا تھا کہ یہاں آبرو گنوا آئے۔ ہم خود جوان سے نمٹ سکتے ہیں۔“

شرعی نے دانی کے زور سے چٹکی بھری تو یہ شریوٹی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہے بی بی جان۔ آج پتا چل گیا کہ آپ بھی ہماری نہیں۔ ہم آپ سے ناراض ہیں۔“

نے منہ بسور کر کہا تو بی بی جان کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

”ارے بیٹا! تم سب تو میری آنکھوں کا نور، دل کا قرار ہو۔ اب فکر نہ کرو۔ اب اگر کبھی بڑکیوں

غلطی سرزد ہوئی تو سخت سزا دوں گی۔“

”سچ بی بی جان۔ بی بی جان زندہ باد۔“

سب نے فلک شگاف نعرہ لگایا اور باہر نکل گئے۔

”یار! آج کہیں باہر جانے کو جی چاہ رہا ہے۔ چائیکز چلیں۔“ دانی نے مشورہ دیا۔

”لیکن یار چائیکز جانے کے لیے کسی کی جیب پر ڈاکا ڈالنا ضروری ہے۔“ بوبی نے نوبلی کی گودے

چھین کر سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

”گڈ! ویری گڈ! ڈاکا ڈالیں گے ہومی بھائی کی جیب پر۔“

”کیوں ان کی کوئی لائری نکل آئی ہے کیا؟“

”بالکل نکل ہے لائری۔ ارے بھی میڈیکل میں ایڈیشن کسی لائری سے کم تو نہیں۔“

ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عابدہ بیٹی کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ یہ شدید دورہ ان کو صرف اس وقت پڑتا ہے جب یہ بہت ڈسٹرب ہوتی ہیں، بہت سوچتی ہیں اور جب کسی غمناک احساس حدت اختیار کر جاتا ہے تو شدید دورہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آپ لوگ کوشش کیا کریں کہ یہ دورہ کریں۔ درد کا یہ شدید دورہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ فی الحال میں نے بہن کھرا نکشن لگا دیا ہے۔ ہوش میں رہیے دوائیں استعمال کرادیں اور ایک درخواست سیدہ بیٹی سے کہ اس قسم کے جذبات کا اظہار ان کے سامنے کریں کہ ان کا احساس محدودی بڑھ جائے اچھا آغا بی صاحبہ اجازت؟“

ڈاکٹر ظفر ان کو ہدایات دیتے اٹھے اور آغا بی کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ راشوان کا بیٹا کران کے پیچھے چل پڑا۔ آغا بی بھی اپنے کمرے میں آگئے باقی سب عابی کے کمرے میں تھے۔ بچوں کے یہ پہلا موقع تھا۔ اس لیے سب ہی سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ لڑکیاں چپکے چپکے اپنے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ ”نانا نہیں تھا، ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے، بند کرو یہ نوسے۔“ شرجی نے ان کو جھڑک دیا۔ ”شرجی! لڑکیوں سے بات کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے چلو جاؤ، سب اپنے اپنے کمرے میں۔“ رجن نے شرجی کو ڈانٹ دیا تو سب سر جھکائے وہاں سے آگئے۔ ہوی ہنزو عابی کے سر پر ہاتھ تھا۔ اس بار جب اس نے آنکھیں مسلیں تو رجن کو غصہ آ گیا۔

”ہوی یہ کیا بچپنا ہے۔ تم مرد ہو اور مردوں کو یہ کنزوریاں زیب نہیں دیتیں۔ عابی تمہیں ہی نہیں ہم پر عزیز ہے۔“

”ہونہ! عزیز ہوتی تو آج میری بہن یوں محرومیوں کے جنگل میں لہو لہان نہ ہو رہی ہوتی۔“ سیدہ قدرت کے اس فیصلے کو کبھی بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ ان کے نزدیک گزراں سب کی ورنہ یہ سب ہوتو فرمان ہرگز نا فرمانی نہ کرتے۔

”پلیز سیدہ! امت کیا کرو ایسی باتیں بچوں کے سامنے۔“ رجن نے سیدہ بیگم کو تنبیہ کی جو مسلسل تھیں۔

”ہر جائی بے وفا خود تو سکون سے زندگی بسر کر رہا ہے اور میری بہن کو روکی بنا ڈالا عمر بھر کے لیے۔“ ”کیا سکون سے زندگی بسر کر رہا ہے وہ جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ترستا ہے وطن اور گھر کے کاٹ کر پھینک دیا ہے آغا بی نے اسے اپنے وجود سے، تڑپ رہی ہے وہ مظلوم لڑکی اس گھر کی دلہن کو کچھ کے لیے گھریا سب رشتے ہونے کے باوجود بے نام و نشان زندگی گزار رہا ہے پھر بھی تمہیں شکوہ ہے صاحبہ بھی جذباتی ہو گئے۔“

”ہاں دیکھا، کبھی تکلیف ہوئی رجن صاحب! اسی طرح بہن بھائی کا دکھ ہوتا ہے۔ اپنے بھائی کا کس قدر دکھ ہے اور میری بہن۔“ سیدہ بیگم پھر رونے لگیں۔

”خدا گواہ ہے میں نے کبھی عابی کو کسی بہنوں سے کم نہیں جانا مگر تمہارے دل میں تو جانے کی چھائی ہے کہ کسی بات سے صاف نہیں ہو پارے۔“

عابی غنودگی کی کیفیت میں پڑی تھیں اور انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ ان کے پیارے آپس میں ان کی باتیں رہے ہیں۔

”رجن، سیدہ! یہ کیا بچوں کی طرح تم لوگوں نے لڑنا شروع کر دیا ہے۔ بچوں پر اس سے کیا اثر پڑے گا۔“ ”جی، جاؤ تم، اب عابی ٹھیک ہے۔“ قدیرہ بانو نے ہوی کو وہاں سے اٹھانا چاہا تو وہ کچھ دیر زخمی نگاہوں سے لڑکی کو دیکھ رہا پھر اس نے ایک نظر رجن پر ڈالی۔

”آئی بیٹ! ہم۔“ اگر اس شخص کی وجہ سے میری خالہ جانی کو کچھ ہوا تو میں کسی کو معاف نہیں کروں گا۔“ ہوی انتہائی تلخ اور گستاخی لہجے میں بولتا باہر نکل گیا۔

”دیکھا بی بی جان آپ نے! ہوی کس قدر گستاخ اور خود سر ہو گیا ہے۔ بڑوں کا لحاظ ہی نہیں رہا اسے اور یہ اس کی ماں کی تربیت کا اثر ہے۔“

رجن کو ہوی پر شدید تاؤ آ رہا تھا جو اتنی بڑی گستاخی کر گیا تھا اور یہ خود سری یقیناً اس کی ماں کی عطا کردہ تھی، جو ہفت ہوی کو فرمان کے خلاف بھڑکاتی رہتیں۔

”ہاں ہاں! میں ہی فساد کا سبب ہوں اور میری اولاد، ختم کر ڈالے ان قتلوں کو شاید آپ کے گھر میں سکون لائے اور آپ کا بچہ اہوا بھائی لوٹ آئے۔“

جواب میں رجن بھی ایسا ہی جواب دینا چاہتے تھے مگر قدیرہ بانو نے بڑھ کر رجن کو خاموش رہنے کا حکم دے کر وہ بڑی بھاد کی حکم عدولی نہ کر سکے۔

”سیدہ مت اپنا اور دوسروں کا خون جلایا کرو۔ اٹھو یہاں سے عابی ہوش میں آگئی تو تمہیں یوں بے حال لگا رہا پریشان ہو جائے گی، چلو شام، مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ جس لڑکی کے لیے تم جھگڑا کر رہی ہو اسے اپنے مندر سے بھی وسیع ظرف عطا کر رکھا ہے کہ اپنے جانی دشمن کو بھی معاف کر دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔“ ”ہونہ بد نصیب اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ ہمارے ماں رکھنے والا کون ہے جس سے ہم کچھ کہہ سکیں اپنے دکھ دکھا کر رکھیں۔“

سیدہ عابی کا کبیل درست کرتی اٹھ گئیں۔ ان کی ایسی جلی کئی باتیں سب کو راہ کرتے رکھ دیتیں سب کی تمل پرانی پیمبر دیتیں اور بی بی جان دل تمام کر رہ جاتیں جنہوں نے کبھی ان کو اپنی بیٹیوں سے کم نہیں جانتا تھا اس وقت وہ مزید دھمی ہو جاتیں۔ جب سیدہ ان کی اس قربانی کو بھی کوئی چال قرار دیتیں کہ فرمان کو محض لڑکے کے لیے جدا کیا ہوا ہے مگر یہ وہ دکھ تھے جو وہ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھیں، نہ سیدہ کو ان کی غلط باتوں پر کچھ کہہ سکتی تھیں اور نہ ان کی غلط فہمی دور کر سکتی تھیں۔

عابی کی اس بیماری نے ہوی کو ان کے مزید قریب کر دیا تھا۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ عابی کا خیال رکھنے لگا۔

”اسے خالہ جانی! آپ پھر بستر سے اٹھ گئیں۔ چلیے آئیے۔ یہ دیکھیے میں خود اپنے ہاتھوں سے آپ کے کپڑے کا جوس نکال کر لایا ہوں۔“

”ہوی! میری جان! اب! میں بالکل ٹھیک ہوں اور یہ تم نے خود ہاتھ گندے کیوں کیے۔“ عابی ہوی کو پیار لٹا کر اس سے دیکھتی ہوئی بولیں۔

”کوئی ٹھیک دیک نہیں ہیں آپ۔ آئینہ دیکھا ہے آپ نے۔ اور ابھی آپ کو کئی ہفتوں کے آرام کی ضرورت ہے۔ یہ لیجیے۔“ ہوی نے جوس کا گلاس ان کو دیتے ہوئے کہا۔

شہباز احمد کو شیراز سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ اور وہ اس کے چہرے سے پڑھ لیا کرتے تھے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کہہ نہیں پا رہا۔

”تاجی! ہم کسی ڈاکٹر سے علاج کراتے ہیں تو ڈاکٹر سب سے پہلے مرض کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے پھر علاج شروع کرتا ہے۔“ شیراز آہستگی سے چلتا ان کے پلنگ پر بیٹھ گیا تو شہباز احمد اس کی ہنسی کی بات کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

”نہیں سمجھائی جی! تمہاری اس بات کے پیچھے کیا راز ہے۔“

”تاجی مجھے صرف اس بات کا جواب دے دیں کہ عالم شاہ کے پاس حیرانچو بھوکا جاگیر کے کاغذ گئے تھے؟ کیونکہ ایسا قانونی کارروائی کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے ساری تفصیل بتائیں۔ تاکہ میں اپنی کارروائی کا آغاز کروں۔“

یہ بات شیراز نے اکثر سوچتی تھی اور بار بار چاہا تھا کہ تاجی اس بات کا جواب دیں مگر ایک تو وہ ہی پوچھنے کی ہدف نہ کر سکا اور دوسرے اس نے محسوس کیا تھا کہ شہباز احمد اس ذکر سے کتر اگر گزر جاتے ہیں۔ شیراز کی یہ بات سن کر شہباز احمد سنانے میں آگئے تھے۔ وہ خود کو بیٹے کی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا محسوس کر رہے تھے، وہ شش و پنج میں پڑ گئے تھے، کیونکہ اگر وہ یہ بات سچ بتا دیتے۔ تو ان کا ماضی بیٹے کے سامنے عیاں ہو جاتا۔ اور وہ بیٹے کے سامنے اپنے ماضی کو عیاں کر کے اس کی نگاہوں میں گرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور حیران جاگیر کے کاغذات واپس لینا بھی ان کی زندگی کا نصب العین تھا اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے شیراز کو خاص تربیت دی تھی۔ تاکہ وہ عالم شاہ کی عیارانہ چالوں سے لڑ کر کاغذات واپس لے آئے۔ مگر شیراز نے پہلا وار ان ہی پر کیا فتاوہ تذبذب کے عالم میں کچھ بھی نہ کہہ پارہے تھے۔

”تاجی! میں منتظر ہوں آپ کے جواب کا!“ شیراز نے وضاحتی نگاہوں نے انہیں دیکھا تو شہباز احمد نے کچھ فاصلے پر بیٹھی منترہ بیگم کو دیکھا جن کے چہرے پر بڑے سوال پر ہلکا سا طنز اور تلخ یادیں تاریک سا سایہ بن کر اٹھ گئی تھیں۔

”کیا اتنا جان لینا تمہارے لیے کافی نہیں کہ ہمارا غیرت، ہماری زمین ایک غیر شخص کے قبضہ میں ہے اور ہمیں ہر حال میں اپنی غیرت واپس لانی ہے۔ اس کے لیے جواز کی یا اس چھان بین کی ضرورت نہیں کہ وہ کیوں اور کیسے گئی مگر پھر بھی جب تم اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو اس کی تاریخ بھی بتا دوں گا۔“

شہباز احمد کے مضبوط لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ شیراز دوبارہ استفسار نہ کر سکا۔

”ٹھیک ہے تاجی! اب آپ فکر نہ کریں۔ عالم شاہ نے تین مگر بڑے کاری واری کیے ہیں۔ ہماری غیرت پر پلایہ تیرا بھوکا پھر غلط نگاہ ڈالی پھر زمین قبضے میں کی اور تیسرے آپ کو ایک ٹانگ سے محروم کیا اور میں بھی جب تک اس سے حساب بے باقی نہ کروں۔ جہن سے نہیں بیٹھوں گا۔“ شیراز نے مضبوط لہجے میں کہا۔ گرم شال کے ٹکڑے کو اپنے گرد لپیٹ لیا اور جبکہ کر پشادری سینڈل کا ہلکے بند کر کے باہر نکل گیا۔ مگر ڈیوڑھی میں منترہ بیگم کو دیکھ کر کہ گیا۔

”اُمی جان! کیا بات ہے۔ آپ روکیوں رہی ہیں؟“ شیراز ان کو سہارا دے کر ان کے کمرے میں لا کر ٹھک پڑھا تا ہوا بولا تو ان کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

”ہوی! میں واقعی ٹھیک ہوں۔ کل سے میں کالج جا رہی ہوں۔ امتحان ہونے والے ہیں۔ لڑکیاں ہوتی ہوں گی۔“

”ارے ہوتی ہیں پریشان تو ہوا کریں۔ خالہ جانی آپ کیوں پرواہ کرتی ہیں اتنی۔“

”ایسا نہ ہو ہوی! مجھے اپنے اس کام سے بہت محبت ہے۔“

”آپ کی محبتیں بھی تو بڑی عجیب ہیں خالہ جانی! آپ تو بس جسے چاہتی ہیں۔ زندگی اس کے ہم سفر دیتی ہیں۔ خواہ اسے کوئی پرواہ نہ ہو۔“

ہوی نے۔ عالی کے بچنے کے نیچے فرمان کی خوبصورت سی تصویر کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے سے کر دے۔

”آپ کو اس شخص سے اتنی ہی محبت ہے خالہ جانی کہ۔“

ابھی ہوی کی بات ادھوری ہی تھی کہ عالی نے مرکز خشکیں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”یہ شخص نہیں تمہارا چچا ہے ہوی! اور چچا باپ کی طرح ہوتے ہیں۔ میری تربیت میں کہاں کی رہی۔ بڑوں سے گستاخی کرنے لگے۔“ عالی کے لہجے میں دکھ نمایاں ہو گیا۔ ہوی آہستگی سے واپسی کے لیے مڑا۔ ہانپا نظر عالی پر ڈال کر آگے بڑھا مگر پھر وہیں رک کر مڑے بغیر بولا۔

”سوری خالہ جانی! یہ شخص آپ کو عزیز ہے۔ آپ اور جو آپ کو دکھ دے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔“

نفرتوں کا سارا زہر ہوی کے لہجے میں ہوتا ہوا عالی کے حلق کو کڑوا کر گیا۔

”نہیں ہوی! تمہارا قصور نہیں۔ آپ نے اپنا سارا زہر تمہاری رگوں میں اغریل دیا ہے۔ اف خدا یا۔ بیکار کیا۔ ہوی اور فرمان میری زندگی ہیں مگر ہوی میری شہرگ کو کاٹ ڈالنا چاہتا ہے۔ میں کیا کروں۔ خدا ہے کیا کروں۔“

افق کی گود میں آخری سانس لیتے سورج کی بغٹی کروں کو دیکھتے ہوئے عالی نے بے بسی سے سوجا سر پلنگ پر لٹکا دیا۔



زن اور زمین کو فتنہ اسی لیے قرار دیا گیا کہ ان کی ہوس میں انسان اکثر انسانیت کے مہرابت جاتے ہیں۔ دوستیاں جانی دشمنیوں میں بدل جاتی ہیں اور تسلیں تباہ کر دیا کرتی ہیں۔ شہباز احمد اور عالم شاہ ان ایسی ہی مثالی دوستی تھی، جسے زن اور زمین کی ہوس نے دشمنی میں بدل دیا تھا۔ دونوں نے بے دھڑک اپنی اپنی اہلیاں میں فتنل کر دیا تھا۔ شہباز احمد کی زمین عالم شاہ کے قبضے میں تھی اور وہ اسے ہر صورت میں واپس چاہتے تھے، اور اسی لیے تو انہوں نے شیراز کو خصوصی تربیت دی تھی۔ تاکہ وہ ان کی معذور ٹانگ کی جگہ بیٹھ سکیں۔ بن کر ان کا سہارا بنے۔

”شیراز چتر۔“ شہباز احمد نے پیار سے اپنے گہرے بیٹے کو دیکھا۔

”جی تاجی۔“ شیراز نے بندوق دیوار پر لٹکا تو ہوئے کہا جو اس نے شخص صفائی کے لیے اتاری تھی۔

”میں دیکھ رہا ہوں مگر! کہ تم کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ مگر پھر رہ جاتے ہو۔ ایسی کیا بات ہے بیٹے۔“

بی، ارادہ ہیں جی، تو ہمارے لیے تو عزت کی بات ہے ناجی۔“

نواز نے ایسے کہا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ آپ کو بھی عزت کرنی چاہیے۔ عالم شاہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئے، پھر کچھ وقف کے بعد اسی لہجہ میں بولے۔

”اچھا تو کوئی بچہ بھی ہیں کہ نہیں؟“

عالم شاہ اپنی بہن کے بارے میں اس طرح بات کر رہے تھے گویا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔

”ہاں جی ایک بیٹی ہے۔ اس کا نام شرمین ہے اور ڈاکٹری پڑھ رہی ہے۔ اور اپنے چھوٹے باؤ حارث کے ساتھ ہی پڑھتی ہے۔“

”ہوں کوئی لڑکا؟“ عالم شاہ بڑی دلچسپی سے ساری تفصیل پوچھ رہے تھے۔

”نہیں جی۔ کوئی لڑکا نہیں صرف ایک ہی بیٹی ہے۔“

”ہوں اچھا ہے۔“ عالم شاہ نے سکون کا گہرا سانس لے کر گویا خود کو تسلی دی۔ کیونکہ ان کے خیال میں اگر لڑکا بھی ہوتا تو ان کے لیے خطرناک بات ہو سکتی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ، اب آرام کرو، آؤ، غیاث شاہ میرے پاس تو بڑی اچھی خبر ہے۔ پر تمہارا منہ کیوں بنا ہوا تھا؟“ عالم شاہ نے غیاث شاہ کو دیکھا جو کسی بات پر ناراض تھا۔

”تاجی! میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ آپ نے آمنہ کو ماموں، مامی کے پاس کیوں چھوڑا ہوا ہے۔ کل میں گیا تھا تو رو پڑی تھی کہ مامی کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ کیا تک۔ چنانچہ اس کو وہاں رکھنے کی۔“ غیاث نے اپنی ناراضگی کی وجہ بتائی۔

”اچھا فاطمہ کو کیا تکلیف ہے آمنہ کو کہتے ہوئے؟ صرف آمنہ کی خاطر میں اس کے سارے کنبے کو پال رہا ہوں تو یہ صلہ دے رہی ہے۔ میں خود جا کر بات کرتا ہوں فاطمہ سے۔“

عالم شاہ کوتاہ آگیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے تو غیاث بھی کھڑا ہو گیا۔

”تاجی! کوئی ضرورت نہیں ہے مامی سے کچھ کہنے کی۔ آخر آپ آمنہ کو لے کیوں نہیں آتے، میں خود کل جا کر اسے لے آؤں گا۔“ غیاث نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

”نہیں غیاث پتر! آمنہ کو وہاں رکھنا میری مجبوری ہے۔“

”کیسی مجبوری ہے تاجی؟ کہ آمنہ باپ اور بھائیوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

آمنہ کو ماموں کے پاس رکھنے کی باپ کی تک بیٹوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”او غیاث پتر! کیوں نہیں سمجھتے تم لوگ۔ ماں تم لوگوں کی زندہ نہیں ہے۔ ارد گرد دشمنیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ آمنہ کی موجودگی، ہمارے پیروں میں بیڑی بن جائے، اور ہم کچھ نہ کر سکیں۔“

”تاجی! تو کیا ہم مر گئے ہیں کہ ایک بہن کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے، میں نے کہیں نہیں دیکھا کہ باپ اور بھائی اپنی دشمنیوں کے خوف سے اپنے گھر کی عورتوں کو دوسرے گھروں میں خوار ہونے کے لیے چھوڑ دیں۔“

مساب آمنہ کو وہاں نہیں رہنے دوں گا۔“

”اچھا پتر! جیسے تم لوگوں کی مرضی۔ ناراض تو نہ ہو۔ کل جا کے لے آنا آمنہ کو۔ میں تو صرف ایک خوف کی وجہ سے آمنہ کو۔“ عالم شاہ ادھوری بات چھوڑ کر پھر بیٹھ گیا۔ ”کیسا خوف ہے تاجی؟“ فیاض شاہ بھی اندر آتا ہوا بولا۔

”اے اب تو آپ کی اولاد اس قابل ہے کہ آپ، اپنے دکھ سکھ میں اسے شریک کریں۔“

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ

مناہیں کیا بات ہے۔ اگر تاجی کو ہر بات ہم سے کرنے اور منوانے کا حق ہے تو آپ کو بھی۔ آپ کی منہ



”بتاؤں گا۔ تم لوگوں کو ہی تو بتانا ہے۔ مگر اس بار ذرا حادثہ بیٹے کو آ جانے دو۔ اب تو کہانی شروع ہے۔“ عالم شاہ نے پر خیال انداز میں مونچھوں کو تودیتے ہوئے کہا۔

”فیاض پٹر!“ عالم شاہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ”اگر آتمہ کو تم لوگ حویلی لا چاہتے ہو تو شادی کرنی ہوگی تاکہ ایک عورت گھر میں آجائے۔ میں اپنی بیٹی کو نور بننے نہیں دینا چاہتا۔ یوں منظور عالم شاہ نے رضا مندی کے لیے فیاض شاہ کی طرف دیکھا۔

”اگر آتمہ کو گھرانے کی یہ شرط تھی تو آپ آج سے کئی سال پہلے میری شادی کر دیتے تاکہ ہمارے ہمارے پاس تورہ سکتی۔“ فیاض شاہ نے جھٹ شادی کی منظوری دے دی۔

”ٹھیک ہے، میں نے تمہارے لیے نادر خان کی بیٹی صوفیہ کو پسند کیا ہے، تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔“ فیاض شاہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر ایک نظر عالم شاہ کو دیکھا جس کا کوئی سانس اور کوئی قدم بغیر مقصد نہ ہوتا تھا۔ ویسے بھی صوفیہ اس کی دیکھی ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے رضا مندی دیدی۔

”چلو اللہ مبارک کرے۔ کل جا کر بہن کو لے آؤ تاکہ وہ بھائی کی شادی کی تیاری کرے پھر حادثہ آتے ہی کوئی تاریخ رکھ کر صوفیہ بیٹی کو گھر لے آئیں گے۔“

عالم شاہ کا یہ فیصلہ غیث اور فیاض شاہ دونوں کو بہت پسند آیا تھا۔



ہومی کو میڈیکل میں ایڈمیشن مل گیا تھا۔ اور وہ ابھی تک ٹریٹ دینے سے بچا ہوا تھا۔ کوئی نہ کوئی بہانہ ہی جاتا تھا۔ مگر یہ لوگ کہاں بخشے والے تھے۔ اور ہومی بھی تو ڈھیٹ بنا ہوا تھا۔ اس نے بھی کنجی کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے ٹریٹ دینے سے انکار کر دیا، اور پھر اس کا انکار اس پر شامت اعمال بن کر نواسے بن گیا۔

”اوہو! کیا وحشت ہے۔ کیوں پیٹ رہے ہو اس بے چارے کو۔“

عذرا بیگم نے ہومی کو دیکھا جو بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کرتا ہوا کبھی شرجی پر گرتا۔ وہ زور سے دھکا دیتا تو وہ بولی پر جا گرتا۔

”آپ نہیں جانتیں اسی جان! یہ اس صدی کا نائی گرامی کنجوس آدمی ہے۔“ شرجی نے ہومی کی بات سے مزوڑ دی تو اسے چھینکوں کا دورہ پڑ گیا۔

”کہتا تھا۔ دعا مانگو۔ مجھے میڈیکل میں ایڈمیشن مل جائے تو ٹریٹ دوں گا۔“ نوبلی نے ہومی کے کان زور سے کہنے۔

”تو تم لوگ کون سا میرے لیے دن رات تسبیح لیے کر بیٹھ۔ بیٹھ۔“

ہومی بات پوری نہ کر سکا اور صوفیہ پر بیٹھے راشو کی گود میں بے دم سا گر گیا۔

”کا کا سوچا۔ راشو کی گود میں سوچا۔“ اشعر نے ہومی کو بچوں کی طرح تھپتھپایا۔

”انتہائی بدتمیز ہیں آپ لوگ۔ ہمارے اتنے پیارے بھتیجا کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ انھیے ہومی بھئی، لیجیے، میں آپ کے لیے اسکو اکش بنا کر لائی ہوں۔“

صدف نے ان سب کو گھورا اور ہومی کا سراغ نہ کر سکا اس منہ سے لگا دیا۔

”ہونہ! آئیں چالوس کہیں کی۔“ بولی نے صدف کو گھورا۔

”زہر لگتی ہیں یہ سب مجھے تو۔“ شرجی کا جی چاھا صدف کا گلہ بادے۔

”ہم لوگ ظالم ہیں نہ لالچی تم لوگوں کی طرح ہمیں ہومی بھتیجا ٹریٹ سے زیادہ عزیز ہیں۔“

”اوہ بھئی واہ جاگے بھاگ ہماری ساعتوں کے کفرج بی بی کی آواز سننے کو مل گئی۔“

”دل و جگر کو مضبوط کرلو۔ اب ایسے حادثات تو روز ہوا کریں گے۔ کیونکہ وہ زمانے گئے جب ہم بے زبان ہوا کرتی تھیں۔ اب ہم اینٹ کا جواب پورے بلاک سے دیا کریں گے۔“ ساتھ ہی فرج نے کئی کئی لڑکوں کی طرف اچھال دیے۔

”ہومی! کیوں ڈھیٹ بنے ہوئے ہو ٹریٹ دے کر جان چھڑاؤ ان بدتمیزوں سے۔ ویسے بھی تم ان سب سے زیادہ دولت مند ہو۔“

عذرا بیگم کی بات میں چھپا ہوا طنز کوئی بچہ بھی نہ سمجھ سکا۔ ہومی لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر تائی جان میں۔ میں ٹریٹ ضرور دوں گا ان کو۔“

”دیکھا آگیا ناں۔ لائن پر۔ اصل میں ہم نے ڈاکٹر صاحب کو غلط سمجھا۔“

”ہاں! یہ بھول گئے کہ لڑکوں کے بھوت بھلا کبھی باتوں سے مانے ہیں۔“

لڑکے اپنی فتح پر بہت خوش تھے کہ وہ ہومی کو رام کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور سب پر دو گرام بنا رہے تھے کہ کہاں جانا ہے۔

”کچھ سنا تم گدھوں نے کہ میں ٹریٹ ضرور دوں گا لیکن۔ لیکن تم لوگوں کو نہیں اپنی بہنوں کو گھر کی سب لڑکیوں کو یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے گھامڑوں نے لے کر کس بل ڈھیلے کر دیے۔ یہ میری ناک اس جگہ پر تو نہیں تھی اور یہ میرے ہونٹ ہو ہی نہیں سکتے۔ خدا کی قسم میری آنکھیں میز می نہیں تھیں۔ یہ۔ یہ سب تم گدھوں کا کارنامہ ہے، ناں چلتا ذرا جہنم میں لے کر جاؤں گا تمہیں!“

ہومی نے بڑھ کر قدم آدم آئینے میں اپنا بڑا ہوا حلیہ دیکھا تو وہ لڑکوں پر بل پڑا۔ لڑکیاں خوش ہو رہی تھیں کہ ایک تو دشمنوں کو مات ہوئی۔ دوسرے کسی اچھی جگہ ٹریٹ بھی ملے گی۔

”نہیں یہ ظلم ہے۔ نہیں ہومی۔ تم انتہائی برے ضرور ہو سکتے ہو۔ مگر اتنے بھی نہیں کہ ہمارا پٹا بنی کاٹ دو۔“ شرجی مٹکھٹکھٹایا۔

”میں اس سے بھی ظالم ہوں۔ لڑکیو جمعہ کو تیار ہو جانا۔ ہم خوب انجوائے کریں گے۔“ ہومی نے جلتی پٹلتی ٹالٹے ہوئے کہا۔ لڑکیاں بھی خوب چپک رہی تھیں۔ ان کے سامنے ہی پر دو گرام بنانے شروع کر دیے تو لڑکے راکھ ہو کر رہ گئے۔

”پھر ہومی بھتیجا کہاں لے کر جائیں گے؟“ صدف نے اشتیاق سے پوچھا۔

”جہنم میں کیونکہ وہاں کی آب و ہوا تم لوگوں کو زیادہ سوٹ کرے گی۔“ شرجی نے ایک بھڑکتا ہوا شعلہ صدف کی طرف اچھالا۔

”تجربہ بول رہا ہے ناچہ۔“ جینا ناچہ کو کچھ کر مسکرائی۔

”بی بی! میرا نام تجربہ نہیں۔ نیل احمد ہے۔“ نوبلی انکڑا۔

”ہیں اچھا۔ ماشاء اللہ۔ بڑا اچھا نام ہے لیکن اگر کسی اچھی شکل کا ہو تو تو۔“ اور قریب تھا کہ نور نے اپنے حسن پر لگائے گئے اس الزام کو اتارنے کے لیے جوابی کارروائی کرتا۔ شرابی نے اشارہ کیا دیا۔ اور خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کی خاموشی ہرگز بے معنی نہیں تھی۔ اور نہ ہی وہ چین سے بیٹھ کر ہوتی کے ساتھ ٹریٹ از اتادیکھ سکتے تھے۔ اسی لیے سب کے دماغ دن رات کام کر رہے تھے۔

”آئیڈیا!“ سب سے پہلے شرابی ہی کے دماغ میں آئیڈیا چمکتا۔

”بکو۔“ بوبی نے بے زار سامنے بنا کر کہا۔ کیونکہ اسے بہت ملال تھا ہومی کی حرکت پر۔

”دیکھو۔ بی بی جان نے لڑکیوں کے خلاف بھی یہی قانون بنایا ہے کہ اگر لڑکیاں اپنا کام نہیں کریں گی۔ ہمارے کسی کام میں گز بڑ کریں گی تو ان کو بھی وہی سزا ملے گی جو ہمیں ملتی ہے۔ تم پر خلاف بھی ہم لوگ جرم ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ناں تو ہومی بھائی سمیت ان کا پروگرام غلط ہو گا۔ کیوں کیسا آئیڈیا ہے۔“ شرابی نے اپنے آئیڈیے کی تعریف چاہی۔

”نھیک ہے۔ اچھا ہے، اب دیکھتے ہیں کہ کیسے جاتی ہیں یہ بد تیز لڑکیاں۔“ اور پھر شرابی نے ٹولی بی بی جان کے کمرے میں موجودھی۔

”ہائیں! یہ کیا ہے نچے؟“ بی بی جان نے ڈھیر سارے میلے کپڑوں کو دیکھ کر بوندانی سے نہ بے رکھے تھے۔

”یہ۔ یہ ظلم کی داستان ہیں بی بی جان۔“ شرابی دردمبری آواز میں بولا۔

”مگر چاند! تو میلے کپڑے معلوم ہوتے ہیں ہوں، بد بو بھی آ رہی ہے۔“

بی بی جان نے نام سیکڑی۔

”جی بی بی جان! یہی تو ہم آپ سے کہنے آئے ہیں کہ اس گھر میں یہ اوقات ہے ہماری کہ لڑکیاں اپنا بات پر وہیاں نہیں دیتیں۔ بجال ہے جو کوئی کام کر دیں۔ اب دیکھیے، ہمارے کپڑے کتنے میلے ہوئے ہیں۔ ہماری المایوں میں کوئی دھلا ہوا کپڑا نہیں رہا۔ مگر بھال ہے جو لڑکیوں کے کانوں پر جوئیں رینگ جائیں۔ شوخی نے اپنی طرف سے بڑا جان دار الزام لگایا تھا جس پر لڑکیوں کو نازی سزا مل سکتی تھی۔

”جی بی بی جان! شرابی بالکل درست کہہ رہا ہے۔“ بوبی نے حریف کہا۔

”ہاں نچے! تم سب ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر گھر کے سارے کپڑے تو دھو بی۔ ہاں سے دھو بی۔ اس میں بھلا لڑکیوں کا کیا قصور۔“

بی بی جان لڑکیوں کو صاف بچا گئیں تو لڑکیوں کے منہ میں گویا کونین مچل گئی۔

”مگر بی بی جان! آخر ان پر بھی کوئی ذمہ داری ہے کہ نہیں۔ دھو بی کو کپڑے دینا تو ان کی ذمہ داری ہے۔“ بوبی نے پھر نکتہ اعتراض اٹھایا۔ نہیں بچے یہ ذمہ داری قد یہ بیٹی نے لے رکھی ہے۔ وہی کوئی کپڑے دھو بی کو دیتی ہیں۔“ بی بی جان زیر لب مسکراتی ہوئی لڑکیوں کا دفاع کر رہی تھیں۔

”بی بی جان! کوئی مصرف ان بے کار چیزوں کا بھی ہونا چاہیے ناں۔ آپ نے یہ ان کی ذمہ داری اگر ہماری شرٹس کے جن ٹوٹ جائیں تو وہ ٹانگ دیا کریں۔“ ٹولی کو جلدی سے یاد آیا کہ کیا کہنا ہے۔

”ہاں! اتنا تو لڑکیوں کو کام کرنا ہی چاہیے۔“

”تو سنو! یہ دیکھیے بی بی جان! ہماری ساری شرٹس کے جن ٹوٹ گئے۔ منت ساجت کر کے تھک گئے ہیں۔“

مگر بھال ہے جو ان پر اثر ہو سکی بات کا۔

”یہ دیکھیے شرٹس۔“ پھر کوئی نے ڈھیر ساری شرٹس بی بی جان کے آگے ڈال دیں تو ان کو ہنسی آگئی کہ لڑکیوں کو سزا دلوانے کے پتھر میں کتنی حماقتیں کر رہے ہیں۔

”اوہو بھئی، یہ لڑکیاں تو بہت بگڑ گئی ہیں۔ کیا سزا دی جائے ان کو۔ ویسے بیٹا یہ اتنی ڈھیر ساری قمیصوں کے جن ایک ساتھ نوٹ گئے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے بنوں کو کاٹا گیا ہے۔ دیکھو تو شرٹس کو بھی نقصان پہنچا ہے۔“

”جی بی بی جان! کیا کرتے۔ کھینچنے سے تو نوٹ ہی نہیں رہے تھے، مجبوراً بلیڈ۔“

”ہاں سر گیا۔“ بوبی تو اپنی حماقت میں بھانڈا پھوڑنے لگا تھا کہ شرابی نے اتنے زور سے اس کا پاؤں دبایا کہ وہ جی پڑا۔ بی بی جان سب کچھ سمجھ گئیں۔

”اچھا تو کیا سزا دی جائے لڑکیوں کو؟“ انہوں نے گویا ان کے دل کی بات کی۔

”زیادہ نہیں۔ ہم کوئی ظالم ہیں کہ ان کو سزا دلوا دیں۔“

شرابی نے ان سب کو اکٹھا کر دیکھتے ہوئے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

”نہیں بیٹا! قصور وار کو سزا ملنی ہی چاہیے۔ مگر بھلا کیا سزا دیا جائے؟“

”بس بی بی جان! جمعہ کو ان سب کو گھر سے باہر نہ جانے دیں۔ آپ دیں گی ناں سزا۔“ ٹولی نے بے یقینی سے بی بی جان کو دیکھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں بھئی۔ میری عدالت میں غلطی کرنے والے کو ضرور سزا ملے گی۔ تم سب مطمئن ہو کر جاؤ۔ لیکن آئندہ ذرا احتیاط برتنا۔ اس طرح جن توڑے جائیں تو قمیص خراب ہو جاتی ہے۔“

”جی وہ!“ بی بی جان نے مسکرا کر کہا تو وہ کان کھجانے لگے۔ وہ وہاں سے لیے پلٹے ابھی دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ بی بی جان نے پھر آواز دی۔

”جی بی بی جان!“ جانے کیوں خطرے کی گھنٹیاں ان کو قریب ہی سنائی دیں۔

”آج کیا دن ہے؟ ہاں منگل ہے، جمعہ میں تو ابھی تین روز باقی ہیں۔ لیکن تم لوگوں کی سزا آج سے شروع اور اتوار تک جاری رہے گی۔“

”جی!“ وہ سب بے ہوش ہونے کو تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔

”جی بیٹا میں نے کہا تھا ناں کہ میری عدالت میں قصور وار کو سزا ضرور ملے گی۔ لہذا قصور وار تم لوگ ہو۔ ایک تو اپنی بہنوں پر غلط الزام تراشی کی دوسرے اپنے کپڑوں کا تاس مارا اور آئندہ بلیڈ سے جن نہ کاٹنا۔ ناحق انہیں، خاص شرٹس خراب ہو جاتی ہیں۔ یہ میلے کپڑے چھوڑ جاؤ۔ دھو بی لے جائے گا اور سرخین کو میرے پاس بھیجنا۔ اب میں خود ان شرٹس کے جن ٹانگوں کی۔ اور تم لوگوں کی سزا برقرار رہے گی۔“

وہ لوگ نہ ملت سے سر جھکائے ایک دوسرے کو گھورتے کو تھے باہر آ گئے سارے منہ مسرور ہے تھے کہ اپنی شرٹس خراب آگ کیں۔ بی بی جان کے سامنے اعتبار الگ گنوا۔ اور سزا جولی وہ انتہائی نامناسب وقت پر ملی کیونکہ ان دنوں میں تو انہوں نے ڈھیر سارے پروگرام بنائے ہوئے تھے جو سب غارت ہو کر رہ گئے۔



”آئی۔“  
شرمین جو ہوی سے مخاطب تھی۔ عالی کو آتا دیکھ کر ان کی طرف بڑھی۔ شرمین عالی کو بے حد پسند کرتی تھی۔  
”جیتی رہو۔ کیسی ہو کیسا رہا پہلا اور دوسرا دن کا لڑی۔“  
”بہت اچھا آئی! بہت انجوائے کیا ہے۔ مگر ہوی فونگ کے خوف سے کا لڑی ہی نہیں گیا۔“  
”ہوی! یہ کیا سن رہی ہوں میں۔ میرا خیال تھا کہ سب سے زیادہ تم انجوائے کرو گے۔“ عالی نے حیرانی سے ہوی کو دیکھا۔

”خالد جانی! آپ جانتی ہیں جب لڑکیاں چھ چھوڑی حرکتیں کرتی ہیں تو مجھے اختلاج قلب ہونے لگتا ہے، ہل سے جاؤں گا۔“

ہوی فطرتاً خاصہ بد مزاج اور اکڑ قسم کا تھا۔ اسے گھر کے علاوہ دوسری لڑکیاں بہت بری لگا کرتیں۔ اور جب کوئی ایسی سیدھی حرکت کرتیں تو اسے بے حد غصہ آتا۔ شرمین کی بھی چند ایک عادت اسے ناپسند تھیں۔ مگر وہ سمجھتا تھا۔ کہ اسے شرمین کو منع کرنے کا حق نہیں۔ اس لیے خاموش رہتا۔

”اچھا جیسے تمہاری مرضی۔ تم لوگ باتیں کرو میں چلتی ہوں۔“  
عالی اپنا دوپٹہ سنبھالتی اٹھ گئیں تو شرمین نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔  
”آئی! آپ بھی بیٹھیے ناں۔ آپ مجھے بے حد اچھی لگتی ہیں۔“  
”ہائے کاش میں عالی پھپھو ہوتا۔“ دانی شرعی کے کان میں بولا۔  
”جھکس شرمین! شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔ شام صرف میری ہوتی ہے اور میں شام صرف اپنے ہاتھ کی گزارنا چاہتی ہوں۔ تم بیٹھو۔“

عالی، بڑی سے شرمین کے رخسار چھوتی باہر نکل گئیں۔  
”ہائے کتنی کیٹ ہیں آئی۔ سچ میرا تو جی چاہتا ہے۔ ان کو دیکھتی رہوں۔ تم سب کو ایک بات پتا ہے ناں؟“ شرمین۔ ایک دم ہی ان کی طرف مڑی۔  
”کوئی بات؟“ صدف اور ناجیہ ایک ساتھ بولیں۔

”کیا کہ میرے ڈیڑی آئی کو پسند کرتے تھے، اور ان سے شادی کرنا چاہتے تھے!“  
”ہاں! امی نے یہ بات بتائی تھی کہ ماموں جان عالی پھپھو کو چاہتے تھے، مگر پھپھو! فرح نے بات اور پیچڑی۔“

”ہائے کاش ایسا ہو جاتا کہ اگلے شہزاد سے عالی پھپھو کی شادی ہو جاتی۔ اگلے شہزاد بھی تو اتنے گریس فل نہیں کہ پھپھو کو فرمان چچا۔“

”سٹاپ!۔۔۔ بند کرو اس موضوع کو۔ ہمیں پر۔“

ہوی ایک دم چیخ پڑا۔ جہاں بھی فرمان کا نام آتا ہوی پڑی سے اتر جاتا۔  
”اب کا لڑی میں باقاعدہ کلاسز شروع ہو چکی تھیں۔ شرمین اپنی شوخی کی وجہ سے کا لڑی میں کافی پاپور ہو گئی تھی۔ لڑکے اس سے دوستی کرنا چاہتے تھے، مگر وہ ایک ادا سے گزر جاتی تھی۔ دوستی کے معاملے میں وہ بہت سمجھدار تھی۔ اور پھر ہوی ایاز کے ہوتے ہوئے اسے کسی اور سے دوستی کی طلب ہی محسوس نہ ہوتی۔ وہ زیادہ

ہوی کی میڈیکل کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں۔ فرسٹ ایر کورسٹ ایر فوٹ کے مراحل سے پڑتا ہے، ہوی خاصا گھبرا رہا تھا۔ حالانکہ پہلے ایک دو روز وہ نہیں گیا۔ مگر شرمین خاصی اینکوتھی۔ تیسرے روز خود اسے لینے پہنچ گئی۔ شرمین فطرتاً بہرہ باا۔۔۔ اور فطرتاً قسم کی لڑی تھی، اور کچھ اسے اپنی عذرا چھو پھوٹ بھی بہت تھا۔ اس لیے تقریباً روز ہی چلر لگا کرتے اور کچھ ہوی کی کلاس فیلو بھی تھی۔

”ہوی میں تمہیں اتنا بزدل تو نہیں سمجھتی تھی کہ فونگ کے خوف سے اتنے اچھے دن میں کر دو گے۔“  
”نہیں شرمین! یہ بات نہیں۔ اصل میں، میں لڑکیوں کی فونگ سے کتراتا ہوں۔ قسم سے اتنی بوگی لڑی کرتی ہیں کہ غصہ آ جاتا ہے۔ پتا ہے ایاز کا فون آیا تھا۔ اسے لڑکوں کے ہوسٹل کے بجائے لڑکیوں کے ہوسٹل بھیج دیا۔ اور جو درگت بنی خدا کی پناہ۔ شکر ہے، میں نہیں گیا۔ زہر لگتی ہیں لڑکیاں اس قسم کی پھپھو کی حرکت کرتی ہوئی۔“ ہوی نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”ایاز وہی ناں جو اس روز تمہارے ساتھ تھا سفید شرٹ میں۔“ شرمین ذہن پر زور ڈالتی ہوئی بولی۔  
”ہاں وہی۔ میرا اچھا دوست ہے۔ ہم لوگ شروع سے ایک ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ اس کے والدین گاؤں میں ہوتے ہیں۔ اور یہ شروع سے ہوسٹل میں رہا ہے۔“ ہوی نے ایاز کا تعارف کرادیا۔  
”اچھا مگر ہوی وہ لڑکیوں کے ہاتھوں بے وقوف بننے والا لگتا تو نہیں۔ خاصا الٹ اور اینکوتہ لگتا ہے۔ فوٹل کیسے بن گیا؟“

”ارے شرمین! لڑکوں کو بے وقوف بنانا کون سا مشکل ہے۔ چٹکیوں میں فوٹل بنایا جاسکتا ہے، ان لڑکوں کو۔“ صدف نے چٹکی بجا کر کہا تو شرعی کے آگ لگ گئی۔

”اچھا جی آپ کتنوں کو فوٹل بناتی ہیں دن میں؟“  
”جتنے گھر میں موجود ہوتے ہیں۔“ صدف کے بجائے ناجیہ مسکرائی۔

”اچھا تو پھر ہوی کل آرہے ہوں ناں کا لڑی؟ ویسے بھی اب فونگ کا زور خاصا کم ہو گیا ہے۔ اور پھپھو

تھک گیا کہ بائیک اڑاتا ہوا دھول میں غائب ہو گیا۔

مریم کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ شدید کھانسی کا ایسا دورہ پڑتا کہ لینے کے دینے پڑ جاتے ایک اور مہماں اور پھر جلا وطنی کی زندگی نے ان کو دے کی مریضہ بنا ڈالا تھا۔ فرمان اور شعاع ہمہ وقت ان کا خیال

تجربہ دن رات خدمت میں حاضر رہتے تو وہ شرمندہ ہو جایا کرتیں۔

”فرمان! مجھے چاہ کر مجھے پا کر آپ کو بھلا کیا ملا ہے۔ یہ محروم زندگی۔ جلا وطنی۔ خونی رشتوں سے جدا کی

انہرم کو ہر وقت یہ ہی خیال ستاتا کہ ان کی وجہ سے فرمان کو یہ سب دیکھنا پڑا۔

”مریم! میں تو خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھتا ہوں۔ جس انسان کو اس کی پہلی اولین محبت مل

ائے۔ اسے اور کسی چیز کی طلب نہیں رہتی۔ اور مریم گزرنے والے ہر بل نے بجائے ندامت یا بچھتاوے کے

برائی چاہت میں اضافہ کیا ہے۔ اور یہ احساس دلایا ہے کہ اگر میں تمہیں نہ پاتا تو شاید زندہ نہ ہوتا۔ تم فضول

نعمت سو جا کر۔ بڑی ظالم ہو تم سے، تمہیں میرا اور شعاع کا ذرا بھی خیال نہیں۔ بس جلدی سے تندرست

وجہ اور آج سے ایکس سال پہلے والی مریم بن جاؤ جس کی آنکھوں میں زندگی کو مسکراتا دیکھ کر میں نے زندگی کو

ات کرنا چاہا۔“ مریم کا ہاتھ تھا سے فرمان کتنی ہی دیر ایسی پیاری پیار مٹھی مٹھی باتیں کرتے رہے۔

”فرمان! آپ کی چاہتوں کا یہ اعتبار بھی حاصل نہ ہوتا تو میں تو مر گئی ہوتی!“ مریم نے عقیدت سے فرمان

کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے، تب ہی دروازے پر بلکی کی دستک ہوئی۔

”ابو! میں کھانا پیہیں لے آؤں۔ آج ہم اسی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔“

کھانے سے بھی ٹرائی گھسیتی ہوئی شعاع مریم کے بیڈ کے قریب آ گئی۔

”شعاع! میری بچی! میں تو تمہاری کوئی خدمت کر ہی نہیں سکی۔“

”اہی جان! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ خدمت تو مجھے آپ کی کرنی ہے آپ بس ٹھیک ہو جائیں۔ مجھے

دراؤ آپ کی ضرورت ہے۔“

شعاع نے پیار سے اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا کر مریم کے منہ میں ڈالا۔

”فرمان! اشعاع کو دیکھ رہے ہیں ناں آپ بالکل عالی کے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے، وہی چال

اعمال۔ وہی کم سنہی دی دھیمپن۔ وہی ہر وقت سر کوڑھانے پھرنے کا۔“ مریم نے سیاہ ڈوپٹے کے

بائیں شعاع کے چمکتے چہرے کو دیکھ کر کہا تو فرمان حیرانی سے ان کو دیکھنے لگے۔

”تم تو ایسے کہہ رہی ہو مریم۔ جیسے تم نے عالی کو دیکھا ہو۔“

”فرمان میں نے عالی کی اور عالی نے میری زندگی پر اتنے گہرے اثرات ڈالے ہیں کہ ہم لوگ ایک

ہرے کو بغیر عارف کے بھی پہچان سکتے ہیں۔ کیوں میں غلط کہہ رہی ہوں فرمان۔“

مریم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو فرمان ان کی بات سمجھ کر دکھ سے مسکرا دیے۔

”نیک مریم! تم درست کہہ رہی ہو۔ اب تم لیٹ جاؤ۔“

فرمان نے مریم کے کرزے ہاتھ سے گلاس کے کرزائی میں رکھ دیا۔

”فرمان! آپ سے ایک بات کہوں؟“ مریم نے لینے کی کوشش کی پھر نہ لیٹ سکیں۔

وقت ان کے ساتھ ہی گزرتی۔ حارث بھی اسی کالج میں ان کی کلاس میں تھا۔ چونکہ ہوی ایاز گروپ کا شاگرد

کے ذہین اور پڑھ لکھوں میں ہوتا تھا۔ اسی لیے حارث ان سے کچھ خاسا کھانے لگا۔ ویسے بھی اس کا گروپ بڑے

لڑکوں پر مشتمل تھا۔ کلاس میں اکثر بدتمیزیوں کا جاپا کرتے۔ اس روز بھی اتانوی کی کلاس میں سر پڑ حارث نے

ساری کلاس میں خاموشی طاری تھی کہ پیچھے سے کسی نے مرنے کی آواز نکالی۔ تو ساری کلاس ڈسٹرب ہو

گئی۔ سب مزمر کر پیچھے دیکھنے لگے۔

”سر! حکومت کو ایک میڈیکل کالج جانوروں کے لیے بھی بنانا چاہیے، تاکہ کتنے بلیاں اور مرغ وغیرہ

ڈاکٹر بن کر اپنی خواہشات پوری کر سکیں۔“

ایاز نے مڑ کر حارث کو گھورتے ہوئے کہا جو کسی شرمندگی کے بغیر گردن تان کر بیٹھا ہوا تھا۔

”حارث! اگر آپ کو کلاس نہیں لینی تو باہر جا سکتے ہیں، ساری کلاس کو ڈسٹرب نہیں کر سکتے، آپ جو پڑ

چاہتے ہیں، انہیں پڑھنے دیا کریں۔“

سر شاہد نے ذرا سختی سے کہا تو حارث کوئی وضاحت کے بغیر جیسوں میں ہاتھ ڈال کر جو ٹم جپاتا ہوا ہر ٹکل

مکيا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد ایاز لا بیریری جا رہا تھا کہ حارث سامنے آ گیا۔

”دیکھو ایاز! کمال میں رہنے کی کوشش کرنا۔ آئندہ اگر ایسی حرکت ہوئی تو ادھیڑ کر پھینک دوں گا کمال

تمہاری!“ حارث نے دانت چرس کر کہا۔

”جس روز تم میری کمال ادھیڑو گے ناں۔ اس روز میں بھی چوڑیاں اتا رہینگوں گا۔ کیا سمجھے۔“

ایاز نے اس کی بات سے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔ اور دور سے آتی شرمین کو ڈرا کر کہہ کر اس کی طرف

بڑھ گیا۔ پھر ہوی بھی آ گیا تو تینوں لا بیریری آ گئے۔ اب حارث کی نگاہیں اسارٹ سی شرمین کی پشت پر اٹھی

چھوٹی سی پوتی پر جمی تھیں۔ شوخی سی یہ قحلی حارث کو بھائی تھی، مگر وہ اب تک اس سے راہ و رسم بڑھانے میں

کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اوپر سے ایاز اور ہوی کے ساتھ اس کی دوستی الگ خون کھولتی رہتی۔ اس روز شرمین

کی کلاس لے کر کالج سے ہوشل جا رہی تھی۔ وہ قدرے دیر ان سڑک پر تیزی سے قدم بڑھا رہی تھی۔ کہ ایک

بائیک زن سے اس کے بے حد قریب سے گزری۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ بائیک دو بارہ واپس مڑی اور

کے قریب رک گئی۔

”اوہ تو یہ واقعی تم ہی ہو مجھے معلوم تھا ایسی حرکت کوئی اور نہیں کر سکتا!“

”ہوی سے تو تمہاری رشتہ داری ہے۔ یہ معلوم ہے مگر یہ ایاز سے کیا رشتہ ہے۔“

وہ بائیک پر بیٹھا جو ٹم جپاتا اس کے گلابی رخساروں کو دیکھ رہا تھا۔ جو دھوپ کی حدت سے چمک رہے تھے۔

”بس اتنی سی بات کے لیے تم نے خود کو پریشان رکھا۔ کالج میں پوچھ لیتے۔ بہر حال دوستی کا رشتہ ہے

تمام رشتوں سے بلند تر ہے۔“ شرمین نے اعتماد سے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔

”تو پھر ہم سے دشمنی کی وجہ؟“

”کوئی دشمنی نہیں لیکن دوستی کے بھی قابل کوئی کوئی ہوتا ہے۔“

شرمین نے اعتماد سے پھر پورے لہجے میں کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اور دور جاتی ہوئی سامنے بغیر ہر سے مل گئی۔

”ہونہ! دیکھ لوں گا تمہیں تو اچھی طرح۔“ حارث نے غصے سے جو ٹم جو منہ سے نکال کر دوڑ چکی اور



”ہاں مریم! سو باتیں کہو؟“ فرمان نے ان پر کھل درست کرتے ہوئے کہا۔

”فرمان! آپ مجھے تو میرے سسرال لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن وعدہ کریں آپ شجاع کو اس کی دوھیال ضرور لے کر جائیں گے۔ میں اپنی محرمیاں تو برداشت کر سکتی ہوں مگر اس کی زندگی کوئی تشنگی، کوئی محرومی برداشت نہیں کر سکتی۔ وعدہ کریں۔ آپ اسے اس گھر میں اس کا مقام دلائیں گے۔ وعدہ کریں ناں!“

بے شمار آنسو مریم کے چہرے سے ہوتے ہوئے گریبان میں جذب ہو گئے۔

”مریم کتنی باتیں کرتی ہو۔ میں شجاع ہی کو نہیں تمہیں بھی تمہارا حق دلاؤں گا۔ اس گھر میں تمہاری وہی حیثیت ہوگی جو آغا جی کی دوسری بہوؤں اور ان کے بچوں کی ہے۔ میں نے بھی ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ آغا جی باپ ہیں اور باپ اگر پتھر بن بھی جائیں تو دل کو دھڑکنے سے نہیں روک سکتے۔ ہاں مریم میں فیصلہ کر لیا ہے اب۔“

فرمان کئی روز سے جنگ کر رہے تھے اور واپسی کے فیصلے پر جنگ ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے مریم کا ہاتھ تھام کر پورے اعتماد سے یقین دہانی کرائی تو مریم کے کسلائے چہرے پر جیسے بہار سی اتر آئی۔ مگر پھر کچھ سائے چھانے لگے۔

”بعض فیصلے کتنے بعد از وقت ہوتے ہیں۔ فرمان کہ ان کے ہونے کی خوشی بھی نہیں ہوتی۔“ مریم انہوں نے سانسوں کے درمیان بمشکل تمام بول رہی تھیں۔

”ایہی جان! مایوسی کی باتیں نہ کریں۔ ہم سب جائیں گے آغا جی کے پاس اپنے سب رشتے داروں کے پاس الٹو کنٹھا آتا ہو گا ناں وہاں پر۔ ماشاء اللہ میرے اتنے ڈھیر سارے کزنز ہیں۔ میری پھپھو ہیں۔ آغا جی بی جان۔ ہم بھی ان کے ساتھ رہیں گے۔ اسی انشاء اللہ ضرور آپ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“ شجاع نے مریم کے چہرے پر چپکے ہوئے بال ہاتھوں سے ہٹائے تو مریم نے شدت جذبات سے شجاع کو ساتھ لگا لیا۔ فرمان افسردگی سے دونوں کو دیکھتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مریم کا، حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ زیادہ تر فرمان اور شجاع کو اپنے پاس بیٹھ رکھتیں۔ فرمان سے ہر وقت پرانی باتیں کرتیں۔ کس طرح ان کی پہلی ملاقات ہوئی، کس طرح دونوں نے دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنے۔ کیسے محبت میں وہ سو دو زبان کے احساس سے عاری ہوئے۔ مریم کوئی شے اور فرمان ان کی بگڑتی حالت کو دیکھ کر سب کچھ جان کر کبجہ کر اندر ہی اندر نوٹے ہوئے سنتے رہتے۔

”ابو! آج ابھی کی رپورٹس لانی ہیں ناں آپ نے؟“

شجاع نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا تو فرمان ڈھیروں دسو سے لیے اٹھ گئے۔

”ہاں بیٹے دعا کرنا کہ ڈاکٹر کی رپورٹس ہمیں زندگی کی نوید سنائیں۔“

فرمان نوٹے لہجے میں بولتے باہر نکل گئے۔ رپورٹس لے کر آئے تو آس و نواس کی ناؤ ڈوب چکی تھی ڈاکٹروں نے مکمل مایوسی کا اظہار کر دیا تھا۔ فرمان نوٹ پھوٹ گئے تھے، ان کی محبت بھری زندگی کا یہ سب کچھ سوچا تھا انہوں نے۔

”میں مریم! یہ زیادتی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں نے تمہارے لیے سب چھوڑ دیا اور تم مجھے

کر جانے کو تیار ہو۔ نہیں مریم! میں تمہیں یہ فاول کرنے نہیں دوں گا؟“

فرمان اپنے کمرے میں بلک رہے تھے کہ شجاع نے دروازہ کھینچا۔

”ابو! بوجلدی آئیں۔ دیکھیں! اسی جا رہی ہیں۔ لہ میری اسی۔ آپ کی مریم۔ البتہ دیکھیں تو۔“

شجاع کے حلق سے عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ فرمان بجلی کی سی تیزی سے مریم کے پاس آئے تو وہ آخری سانس تک رہی تھیں۔

”فرمان! بھلا کوئی عورت ایسی خوش نصیب ہوگی جیسی میں آپ سا۔ شوہر ملا۔ فرمان اب۔ اب میری شجاع کے لیے جینا فرمان۔ فرمان شجاع میری۔ میری جان۔ میری بیٹی۔ فرمان۔ شجاع۔ شجاع۔ لا! لا۔“ مریم نے کلمہ پڑھ لیا اور یوں محبت کا ایک باب ختم ہو گیا نہ تو فرمان کی محبت اور شجاع کی تڑپ مریم کو واپس لاسکی۔

”مریم۔ مریم۔ مریم مجھے نہیں جینا تمہارے بغیر۔“ فرمان دیوانے ہو گئے۔

”ابو۔ ابو۔ امی۔ امی!“ شجاع بے ہوش ہو کر فرمان کی ہانپوں میں آگری۔



مریم کی موت نے فرمان کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ غم کے طوفان میں صرف وہ تھے اور شجاع تھی۔ وہ تو اپنی بات مریم کے ساتھ ہی مرجانا چاہتے تھے اگر وہ تمہا ہوتے تو شاید مریم کو دنیا سے اکیلے نہ جانا پڑتا مگر جب شجاع پر نظر پڑتی جو ماں کے بعد زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی تو وہ تڑپ اٹھتے۔ شجاع، مریم کی کتنی راتوں کی ہاتھوں کا شرمیلی، مکر موت کے بے رحم ہاتھوں نے مریم کو شجاع کی خوشیاں بھی دیکھنے کی ہمت نہ دی۔ مریم کو لگے وہاں وہ چلے تھے مگر ان کا رخ ابھی تک تارہ تھا۔

ایسے میں جب وہ زندگی کی اتنی بڑی بازی ہار چکے تھے۔ ان کو \_\_\_\_\_ ایٹوں کی شدت سے کی محسوس ہوتی تھی۔ وہ رونے کے لیے ایٹوں کا شانہ چاہتے تھے مگر انہوں نے تو اطلاع بھی نہیں دی تھی کہ ان پر کیا بات ٹوٹ پڑی ہے اور اس وقت ان کو ان کی کتنی ضرورت ہے۔

”ابو! آپ آغا جی کو خط لکھتے تو سہی ہو سکتا ہے۔“

”نہیں شجاع! میری جان! تم نہیں جانتیں۔ ان لوگوں کو نہ میری خوشیوں سے دلچسپی ہے اور نہ ہی غموں کا احساس ہے پھر کیوں میں اپنے دکھان کو بتاؤں۔ میں نے کوئی ایسا گناہ تو نہیں کیا تھا کہ اتنی بڑی سزا ملتی مجھے۔“ فرمان نے سختی سے انکار کر دیا۔ جب سے مریم گئی تھیں۔ غم کو ابھی اپنے گھر والوں سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ جن کی ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث انہوں نے جلا وطنی کی زندگی گزاری اور مریم ان کی محبتوں کو اتنا غمیں اتر گئیں۔

”ابو! آپ آغا جی کو لکھیے ناں کہ ہم اکیلے رہ گئے ہیں۔ جن سے ان کی دشمنی تھی جن سے ان کو شکوے تھے وہ اب یہاں ہی چھوڑ گئیں۔ مجھے یقین ہے۔ اب ان کی ناراضگی ختم ہو جائے گی، وہ ہمیں معاف کر دیں گے۔“ شجاع چل گئی۔ اب وہ جلدی سے وہاں پہنچ جانا چاہتی تھا، جہاں خوشیاں تھیں، زندگی تھی۔ فرمان اس کا اٹکھ رہے تھے مگر اب ان کو کسی معافی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

”بیٹے! تمہاری خاطر میں اطلاع دے دیتا ہوں مگر تمہارے دکھ میں شریک ہونے کوئی نہیں آئے گا اور

اب اگر وہ معاف بھی کر دیں تو میں ان کی یہ حمایت ٹھکرا دوں گا۔“



مریم کی موت کی خبر نے آغا ہاؤس میں سب کو افسردہ کر دیا تھا۔ آغا جی دکھ کے ساتھ ساتھ مہم عداوت بھی محسوس کر رہے تھے۔

”اے خدا! مجھے معاف فرماتا۔ مجھ سے بہت بڑی کوتاہی ہو گئی۔ مریم بیٹی مجھے معاف کر دینا۔ چنانچہ تمہارا حق ندے سا۔ مگر بیٹی! میں کیا کرتا۔ انصاف کا ترازو وقت نے میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ بیٹے کو کمرے کے چھین سینے سے لگا لینا تو مردہ بھائی کو کیا جواب دیتا۔ مجھے انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے سب کرنا پڑا بیٹی! مجھے معاف کر دینا ورنہ تم لوگوں کا گناہ ناقابل معافی تو نہیں تھا۔ اے خدا! مجھے پرہیزگار آغا جی سیدے میں گرے کتنی ہی دیر روتے رہے۔ بی بی جان کی تو حالت ہی غیر ہو رہی تھی۔ انہوں نے تو اپنے بیٹے کی جاہت کو دل سے قبول کر لیا تھا اور وہ اس سے لے بھی چکی تھیں۔ مریم ان کو بالکل ہوا کا لہجہ ہی لگتی تھی۔ وہ کتنی بے قرار تھی اپنے گھر آنے کو۔ سب کے ساتھ رہنے کو کتنی آرزو تھی مریم کو۔“

”میری بیٹی! کیسی تڑپتی تھی اپنے گھر آنے کو۔ وہ تو سب سے معافی مانگنے کو تیار تھی مگر غالموں نے دروازے اس پر بند کر دیے تھے ہائے بیٹی۔“

”بی بی جان! حوصلہ کریں۔ اس بے چاری کی تقدیر میں یہ ہی لکھا تھا تو اور پھر خدا کے کاموں میں ہم کچھ کیسے دخلت کر سکتے ہیں۔ یہ دردہ بی بی لیجیے۔ آپ نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا۔“

قدیرہ بانو نے عذرا نیگم کی مدد سے بی بی جان کو سہارا دے کر دردہ پلانا چاہا مگر انہوں نے سختی سے انکار دیا۔

”لے جاؤ سب کچھ۔ میں نہیں جاتی کھانا چٹا چھوڑ کر۔ ارے میں تو میں سال سے بیٹے کی جگہ آگ میں جل رہی ہوں تو نہیں مری تو نہ کھانے سے کیا مروں گی۔ ہائے میرا بچہ پردیس میں روٹی ہو گیا۔ اس کے آنسو پونے والا نہیں۔ کوئی میرے بچے کا ہر دھمیں۔ کس کے گلے لگ کر دیا ہو گا میرا بیٹا۔“

بی بی جان نے سب کو رلا دیا تھا۔ سب ہی بی بی جان کی دل جوئی میں لگے ہوئے تھے۔

سیدہ بیگم کچھ دیر بیٹھی رہیں پھر اٹھ کر باہر آ گئیں۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سزا فرمان کو پالنا ساتھ زیادتی کے بدلے میں دی ہے۔

”بی بی جان! آپ جو صلے سے کام لیں۔ ہم نے بھی اب فیصلہ کر لیا ہے کہ آغا جی کچھ بھی کہیں۔ ہم انہیں اور شعاع کو بلارہے ہیں۔“

”جی بی بی جان! بھائی جان درست کہہ رہے ہیں۔ ہم نے پکا ارادہ کر لیا اگر فرمان نہیں آئے گا تو خدا جا کر اسے لے آؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔“

رحمن نے جلدی سے یسین احمد کی تائید کی۔ بی بی جان بے یقینی سے ان کو دیکھنے لگیں۔

”وہ۔ وہ نہیں مانیں گے۔ میں ان کو انہی طرح جانتی ہوں۔ ان کو اصول ہمیشہ ہی عزت دیتے ہیں۔“

”آس کی ناؤ ایک باہر مایوسی کے سمندر میں ڈوب گئی۔

”جی نہیں بی بی جان! اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب آغا جی کو ہماری بات ماننی ہوگی اور پھر جس بدلیہ

سے فرمان کو نکالا تھا۔ وہی نہیں رہی، پھر معاف نہ کرنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ آپ خود کو سنبھالیں۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ فرمان کو لے آؤں گا۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے میرے بیٹے، کہ مرنے سے پہلے تم چاروں بھائیوں کو پھر ایک ساتھ دیکھوں۔“

رحمن کے پراعناد لہجے میں کیے گئے وعدوں نے بی بی جان کے بچنے دیے میں پھرتیل ڈال کر روشن کر دیوں۔

”مگر مریم اور عالی کے درمیان روایتی سارقاتیت کا رشتہ تھا۔ مگر عالی نے کبھی مریم کے خلاف غلط انداز میں نہیں سوچا تھا۔ بلکہ مریم تو اس اعتبار سے بھی معتبر تھی کہ وہ اس فرمان کی محبت تھی، جو۔ اس کا سب کچھ تھا۔ آج وہ دھکی ہو گیا۔ تو وہ بھی سسک پڑی۔

”عالی۔ کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے اور یہ اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔ ہائیں تم رو رہی ہو۔“

سیدہ باتیں کرتی ہوئی، لائیٹ آن کرتی بالکونی میں عالی کے پاس پہنچ گئیں۔

”جی آپ! مجھے مریم کی وفات کا بہت دکھ ہوا ہے۔“

عالی نے آنسو صاف کرتے ہوئے دکھ سے کہا۔ سیدہ نے ایک نگاہ ان پر ڈالی پھر آگے بڑھ گئیں۔

”ہاں، کیا کیا جا سکتا ہے۔ موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

سیدہ کے لہجے کی لا پرواہی عالی کو کھولا گئی۔

”موت اور زندگی کا فیصلہ ہی نہیں، آپ! ہر فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور جس فیصلے کو وہ انسان کے حق میں بہز بھتا ہے، مگر آپ جیسے لوگ اس کی مصلحت کو نہیں سمجھتے۔ اور۔ اور۔“

”عالی! تم تو پاگل ہو۔ انسان جو بوٹا ہے۔ وہی اس کو کاٹنا پڑتا ہے۔ اور پھر کوئی کسی کو دکھ دے کر خوش نہیں کر سکتا۔“

سیدہ پرانی بات کے حوالے سے فرمان کو کسی صورت بھی معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔

”آپا پلیز اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دیں پلیز۔“ عالی زچ ہو کر بولیں۔

”ہاں چھوڑ دوں تمہیں اس بے وفا کی یاد میں جلتے اور اس کے دکھوں پر کڑھنے کے لیے۔ حالت دیکھو کیا ہو رہی ہے؟“

سیدہ نے عالی کے بال سنوارے۔

”میں ٹھیک ہوں آپا! آپ فکر نہ کریں۔“

عالی اس وقت بحث کے موڑ میں نہیں تھیں۔ اسی لیے خاموشی سے اندر آ گئیں۔

مریم کی وفات سے یہ ضرور ہوا تھا کہ اب گھر کے دروازے فرمان اور شعاع کے لیے کھلنے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ اور اسی امید نے بی بی جان کو زندہ کر دیا تھا۔

”بے چارے چچا جان! خدا کرے آغا جی مان جائیں۔ کتنے اکیلے ہو گئے ہوں گے۔“ نرم دل صدف اپنے چچا کے لیے دھکی ہو رہی تھی۔

”یہاں دھکی ہونے سے کیا فائدہ۔ وہاں جا کر دکھ میں شریک ہو تو بات بنے۔“

”ہوئی! کوئی وقت بھی ہوتا ہے طنز اور تنقید کا۔ تم تو ہر وقت چچا جان کے خلاف ایسے بولتے ہو، جیسے اہم شخص ہو۔ انسان کو کسی کے دکھ درد کا احساس کر لینا چاہیے۔“

بھی ہے آپ کو، کہ ان بیس سالوں کی قید میں میری بہن معصوم بہن کی جوانی کے بیس سال ہیں۔ اس کی تمہا نہیں آرزو نہیں ہیں، اس کا تو کسی کو بھی احساس نہیں۔ سب کو اپنے بھائی، اپنے بیٹے کی فکر ہے۔“

سیدہ فرمان سے حق دشمنی بڑی خوبی سے نبھاتی تھی۔  
”سیدہ! تمہیں تو سمجھانا پختہ سے سر پھوڑنا ہے۔ تم اب بھی الزام لگا رہی ہو، اس باپ پر جس نے صرف اور صرف عالی کی خاطر اپنے لخت جگر کو کاٹ کر پھینک دیا۔ اب بھی وہ ہے جس اور سنگدل ہیں جنہوں نے اپنے بچے کی جدائی کو اپنا مقصد سمجھ کر قبول کر لیا۔ مگر تمہیں ذرا احسان نہیں، ان کی قربانی کا۔ ہر وقت شعلے اگتی رہتی ہو۔“  
رحمن بھی غصہ میں آ گئے۔ اب ان سے سیدہ کی جلی کٹی باتیں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔

”تو کیا ضرورت تھی قربانی دینے کی۔ واپس ہی بلانا تھا جگر کوٹنے کو۔ سینے سے لگنا ہی تھا تو یہ نام نہاد قربانی کا دھوکہ دے چاہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسی وقت بلایا ہوتا۔ بے چاری مریم کے مرنے کا انتظار تھا۔ اس کی زندگی میں بلایا ہوتا تو وہ بھی سسرال کی بہادر کچھ لیتی۔“  
سیدہ کے کٹیلے لہجے سے پکٹتا ہر رحمن کے حلق کو کڑوا کر گیا۔

”سیدہ! تم انتہائی خود غرض اور احسان فراموش عورت ہو جسے نہ کسی کی محبتوں کا احساس ہے نہ کسی سے محبت۔“  
رحمن نے پہلی بار سیدہ سے سخت اور تیز لہجے میں بات کی تھی۔

”ہاں۔ ہاں ہوں میں خود غرض۔ کیا دیا ہے کسی نے ہمیں آج تک، ہمارا بھی کوئی اپنا ہوتا۔ کوئی سگا بہن بھائی ماں، باپ میں سے کوئی ہوتا تو دیکھتی کہ کیسے ہمارے حقوق تلف کیے جاتے ہیں اور میں سب جانتی ہوں اگر ہم دونوں ہمیں صاحب جائیداد نہ ہوتیں تو نہ آغا جی ہمیں پاس رکھتے اور نہ مجھے آپ کے قابل گردانتے۔ میں میں!!“

”سیدہ چپ ہو جاؤ ورنہ۔“  
رحمن پوری قوت سے چیخے۔ ان کا ہاتھ فضا میں لہرایا مگر عین اسی وقت ہوئی اندر داخل، وا۔  
”میری ماں اور خالہ اب اتنی بھی لاوارث نہیں رہیں ابو۔“

ہوئی نے آگے بڑھ کر رحمن کا اٹھا ہوا ہاتھ روکتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔  
”جاننا ہوں تمہاری ماں نے اپنا سارا زہرا ٹھیل دیا ہے تمہاری رگوں میں۔ اگر تمہاری ماں اور خالہ جانی لاوارث نہیں تو آجندہ گستاخی سے قبل یہ سوچ لینا کہ لاوارث تم بھی نہیں ہو۔ باپ دادا زندہ ہیں تمہارے۔“  
رحمن نے ایک جھٹکے سے ہوئی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور قہر بارنگا ہوں سے سیدہ اور ہوئی کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ دونوں ماں بیٹا خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”تمہیں اپنے ابو سے گستاخی نہیں کرنی چاہیے تھی بیٹا! ہم دونوں بہنوں کی تو قسمت ہی خراب ہے۔ تجھی ورنہ تو میری بہن ہوئی ناں۔ فرمان کو تو پھر سب کچھ مل رہا ہے مگر میری معصوم بہن کو تو جوانی کے بیس سال واپس نہیں مل سکتے ناں۔“ سیدہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”مٹی امی! مجھے واقعی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں ابو سے سواری کروں گا۔ مگر یہ بات میرے بس نہیں اچھی کہ خالہ جانی کی بات ہو اور میں چپ رہ سکوں۔ آخر کی کیا تھی خالہ جانی میں کہ اس شخص نے ان کو ٹھکرا لیا۔ ان کی تو بہن کی ہے چچا جان نے اور میں اپنی خالہ جانی کی تو بہن برداشت نہیں کر سکتا۔“

راشونے ہوئی کو سرنش کی تو ہوئی نے بڑی تلخی نگاہوں سے راشون کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے ایک انسان کی موت کا ہمیں بھی صدمہ ہے مگر جیسا کوئی کرتا ہے، ویسا ہی بھرتا ہے۔ دوسرا کی خوشیاں چھیننے والا خود بھی خوش نہیں رہ سکتا۔“

”ہوئی!“ اشعر نے تندی سے انداز میں ہوئی کو دیکھا تو اس نے ایک نظر اشعر اور راشون پر ڈالی اور جھپک سے باہر نکل گیا۔

”ہوئی کا رویہ بہت خراب ہوتا جا رہا ہے۔ ہر وقت چچا جان کے خلاف بولتا رہتا ہے۔ ٹھیک ہے ایک زیادتی ان سے ہو گئی۔ مگر اس کی سزا بھی تو ان کو کڑی مل چکی ہے۔ لیکن معاف کر دینے کا ظرف نہ تو بچہ جان سیدے کے پاس ہے نہ ہوئی کے پاس۔“

راشون کو سدا سے ہوئی کے اس رویے سے جو وہ فرمان کے بارے میں رکھتا تھا اختلاف رہتا تھا۔  
”ویسے اس میں ہوئی کا زیادہ قصور بھی نہیں۔ چچی جان ہی ایسی باتیں کرتی رہتی ہیں کہ اس کے دل میں چچا جان کی نفرت بڑھتی رہتی ہے؟“

”جی اشعر بھئی! حالانکہ عالی پھپھو تو اتنی اعلیٰ ظرف ہیں کہ وہ چچا جان کے خلاف ایک بات بھی سننا گوارا نہیں کرتیں اور ہوئی کو بھی سمجھانی ہیں مگر۔“  
یہ گفتگو مزید طویل ہو سکتی تھی اگر سامنے سے سیدہ بیگم آتی نہ دکھائی دیتیں۔

فرمان کو گھر واپس بلانے کی خواہش اب سب کے دلوں سے نکل کر زبانوں تک آ گئی تھی اور یہ بات ہی سہجہ کے لیے اذیت کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی صورت بھی اس شخص کو دوبارہ دیکھنا پسند نہیں کرتی تھیں اور تم یہ خاک فرمان کی واپسی میں سب سے زیادہ رحمن دلچسپی لے رہے تھے۔

”کب آ رہا ہے آپ کا بھائی؟“ سیدہ نے طنز سے بھر پور لہجے میں پوچھا تو رحمن نے ایک دھکی دی نگاہاں پر ڈالی۔

”تم تو ایسے کہہ رہی ہو سیدہ لہجے اس سے تمہارا کوئی رشتہ، کوئی تعلق ہی نہ ہو۔“  
”ہر رشتہ ہر تعلق اس نے خود توڑا ہے۔“ سیدہ رکھائی سے بولیں۔  
”چلو نہ سہی، اس سے تمہارا کوئی تعلق۔ مگر میرے حوالے سے تو اس کا ذکر ذرا خلوص سے کر لیا کرو مگر۔“  
والے سے وہ تمہارا دیر ہے۔“

رحمن کے لہجے میں گہرا دکھ نمایاں تھا۔ سیدہ کے لیوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔  
”شکریہ اس تعارف کا۔ اب تو بتا دیں میرے دیور صاحب کب تشریف لارہے ہیں۔“ سیدہ نے ایک ایک لفظ انتہائی نفرت سے چاچا کو کرا دیا۔

”سیدہ! خدا کے لیے اب تو بخش دو۔ اس بد نصیب کو، جس کو اس کے گناہ کی اتنی کڑی سزا ملی ہے کہ کسی کو نہ مل سکتی۔ بیس سال سے وہ جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ کیا اتنی برائی اس کے لیے کافی نہیں؟“  
رحمن آخر بھائی تھے۔ فرمان کے خلاف سیدہ کے منہ سے ہر وقت نکلتے شعلوں میں خود کو جھلتا ہوا محسوس کرنے لگے تھے۔

”بیس سال۔ بیس سال کتنی اہمیت کے حامل ہیں یہ بیس سال۔ اپنے بھائی کے حوالے سے کچھ احسا

جوش میں آکر ہوی نے باپ کا ہاتھ بھی روک لیا تھا اور گستاخی بھی کی تھی، مگر اب بے چین تھا۔ کہہ کر ان سے معافی مانگ لے، اسی لیے وہ اسٹڈی روم میں رحمن کے پاس چلا آیا۔

”ابو!“ اس نے آہستگی سے پکارا۔ رحمن نے کتاب سے نگاہیں ہٹا کر اسے دیکھا جو چہرے پر غماز لیے نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ انہوں نے خاموش رہ کر اسے بولنے کا موقع دیا۔

”ابو! ابو! ائم سوری، ابو! مجھے معاف کر دیں۔ مجھے بخانہ کیا ہو گیا تھا کہ۔“  
معدرت کے باقی الفاظ غدا امت کے باعث حلق میں اٹک گئے۔ رحمن نے نظر کا چشمہ اتار کر سائیز نکال رکھا۔ کرسی پر دباؤ ڈال کر کھڑے ہوئے اور ہوی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”جوش میں آ جانا تمہاری عمر کی مجبوری ہے ہوی۔! میں تمہیں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا، سوائے اس کے کہ تم تمہیں کو چکا ہوں۔ تم پر تمہاری ماں کا تسلط ہے۔ تم اپنی زبان نہیں۔ ماں کی زبان بولتے ہو۔ اپنے دماغ سے نکالے کے دماغ سے سوچتے ہو۔ جب پیدا ہوتے ہی عابی نے تمہیں گود لے لیا تھا تو یقین جاو اتنی خوشی مجھے تمہارا پیدائش کی نہیں ہوئی تھی جتنی خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ تم ایک ایسی عورت کی گود میں پرورش پاؤ گے جس کی دریا پاک اور سوچ بختی ہے جو اپنے قاتل کو بھی معاف کر دینے کا ظرف رکھتی ہے۔ مگر تم نے ثابت کر دیا کہ تم عابی کے نہیں سیدہ ہی کے بیٹے ہو۔ جاؤ بیٹے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں جاؤ، آرام کر۔ پھر۔“  
رحمن نے ہوی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر زری سے شہناز ہر ہوی کو پلایا۔

”سوری ابو! مگر بعض اوقات اختیار نہیں رہتا۔“ ہوی نے سر جھکاتے ہوئے اعتراف کیا۔  
”انسان کو اپنے جذبات پر، احساسات پر جب ہی اختیار ہوتا ہے بیٹے! جب اس کا ظرف بڑا ہو۔ اور ظرف کے معاملے میں تم تمہاری ماں بد نصیب واقع ہوئے ہو۔ بہر حال میں اب تم سے ناراض نہیں۔ جاؤ پدم جا کر۔ میڈیکل پڑھنا آسان بات نہیں جاؤ شاہناش۔“

رحمن نے اس کے گال چھتہ کر پیار سے کہا۔ اب واقعی وہ اس سے ناراض نہیں تھے۔ ہوی شرمندگی کی ایک نظر ان پر ڈالتا باہر نکل گیا۔ رحمن نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور آنکھیں موند کر کچھ سوچنے لگے۔ مگر دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو عابی کو اندر آنا دیکھ کر رحمن سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”ارے رحمن بھئی! آج آپ آفس سے جلدی نہیں آ گئے۔؟“ عابی کو حیرانی ہوئی۔  
”آج میں آفس گیا ہی نہیں۔ آؤ بیٹھو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

”کوئی خاص بات ہے کہ آپ مجھے ہوئے لگ رہے ہیں۔ ہوی بھی کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔“ عابی رحمن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی عابی! کہ شعلہ اور شبنم ایک ہی کوکھ سے کیسے جنم لے سکتے ہیں۔ ایک پامنا محبت اور دوسرا سراسر نفرت۔“

یہ بات کہتے ہوئے رحمن کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ سیدہ کے روپنے نے ان کو دکھی کر دیا تھا۔  
”میں سمجھتی نہیں بھئی!۔“ عابی زری سے بولیں۔

”عابی تم تو اپنے قاتل کو بھی معاف کر دینے کا ظرف رکھتی ہو۔ تمہاری بہن۔“  
سیدہ کے ذکر پر عابی کی نظریں جھک گئیں۔

”آپ کا یہ روپ میرے لیے بھی نیا اور اذیت ناک ہے بھیا! زیادہ اذیت کا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ہوی کو ہی اپنے رشتہ رنگ لیا ہے۔“ عابی کو اس بات کا۔ بے حد دکھ تھا کہ سیدہ نے ہوی کی رگوں میں فرمان کے لیے نفرت برسی تھی۔

”عابی! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“  
”آپ کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے بھئی! آپ بات تو کریں۔“ عابی نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”عابی! اور اصل ہمارا خیال ہے کہ فرمان کو واپس بلا لیا جائے کیونکہ اسے اپنے کیے کی بہت سزا مل چکی ہے۔ دوسرے اب وہ مریم کے بغیر تنہا اور دکھی ہو گا۔ اور پھر شعاع کے لیے ماں کے بغیر اس ماحول میں رہنا مناسب نہیں لگتا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔“

رحمن خاموش ہو کر عابی کو دیکھنے لگے جن کے چہرے کا رنگ اس بات پر مہتقر ہو گیا۔  
”بھیا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کی اس بات کے جواب میں کیا کہوں۔ آپ تو اب بیس سال جدائی برداشت کرنے کے بعد فرمان کو واپس بلا رہے ہیں ناں اور گزشتہ بے شمار لمحوں میں۔ میری سماعتوں نے فرمان کے قدموں کی چاپ سنی ہے اور اب۔ سوری بھیا! وہ۔“

عابی کھوئے ہوئے لہجے میں بولیں مگر پھر رحمن کا خیال کر کے جھینپ گئیں کہ ان کو ان کے سامنے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔

”میں۔ میں اس سلسلے میں خود آغا جی سے بات کروں گی۔ شعاع کو اب وہاں نہیں رہنا چاہیے۔ میں آج ہی آغا جی سے بات کرتی ہوں۔“ عابی نے پختہ لہجے میں کہا۔

”مگر عابی! تمہاری بہن تو ان دونوں کا نام بھی اور گھر میں سنا پند نہیں کرتی۔“  
”ان کو چھوڑیں بھیا! اب حق دار کو حق ملنا چاہیے۔“

اور اسی شام عابی آغا جی کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ انہوں نے اس معاملے میں چپ سادہ رکھی تھی۔  
”ارے عابی بیٹی! آؤ بیٹھ جاؤ اور کالج کیسا جا رہا ہے۔ ہماری بیٹی تو بڑی عالم فاضل ہو رہی ہے۔“ آغا جی نے اپنے قریب ہی عابی کو بٹھا لیا تو عابی نے ان کے شفیق ہاتھ تھام لیے۔

”کیا دیکھ رہی ہو بیٹا۔“ وہ مسلسل آغا جی کو دیکھ رہی تھیں کہ انہوں نے پوچھ ہی لیا۔  
”دیکھ رہی ہوں آغا جی کہ ایک باپ کی محبت پر اصولوں کی برف بیس سال گنتی پھیلی ہے تاکہ کوئی بات کی جائے۔“ عابی نے زری سے کہنا تو آغا جی کے چہرے پر کرب ناک سامنے لہر گئے۔ دکھ کی گہری شام میں سالوں پر چھائی تھی آواز آئی۔

”باپ کی محبت کے سورج پر کبھی برف نہیں جمتی بیٹا! ہاں جب ایک ایماندار اور با اصول باپ کہا تو میں وقت انصاف کا ترازو تھما دیتا ہے تو فیصلہ کرتے وقت وہ یہ نہیں سوچتا کہ کبھی میں کھڑا مجرم اس کا اپنا بیٹا ہے یا کوئی اور وہ اپنا فیصلہ سنا دیتا ہے۔ اور پھر جب مجرم بھی ایسا ہو کہ۔ کوئی عیب نہ ہوتے ہوئے بھی ہماری بیٹی کو لکھوا دے۔“ بات کرتے ہوئے آغا جی کے چہرے پر دعویٰ سختی، دعویٰ تناؤ آ گیا۔

”آغا جی! کوئی قانون مجرم کو اتنی کڑی اور لمبی سزا نہیں دیتا۔ ٹھیک ہے اگر گناہ کی سزا دی جاتی ہے تو معاف



کر دیئے کا حکم بھی تو آیا ہے۔“

”ہاں بیٹی! انصاف کر دیجئے تو انصاف پر حرف آجاتا۔ تربیت بے عمل ہو جاتی۔“

آغا جی چٹری کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ عالی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آپ نے پوری ایمانداری سے انصاف کیا آغا جی۔ آپ سرخرو ہیں۔ یہ بھی تو دیکھیے کہ سزا پہنچا جائے تو مجرم کو رہا کر دیا جاتا ہے۔“

عالی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر آغا جی کے ساتھ چل رہی تھی۔ جو چلتے چلتے بالکونی میں آگئے تھے۔ آغا نے اس بات پر مڑ کر عالی کو دیکھا۔

”جی آغا جی! آج سے تقریباً پچیس سال قبل ہیں عی فرماں کی خواہش کو اپنی درخواست میں لپیٹ کر لایا تھی۔ اور آپ نے نہ چاہے ہوئے بھی محض میری خاطر فرماں کو باہر جانے کی اجازت دے دی تھی اور آغا جی آغا جی میں عی پچیس سال بعد فرماں کی واپسی کی اجیل اس مان اور امید کے ساتھ لائی ہوں کہ آپ میرا مان رکھ لیں گے۔“

عالی کے ہیکلے مگر پر اعتماد لہجے میں جانے کیا تھا کہ آغا جی نے لرزتے ہاتھوں سے عالی کو ساتھ لگایا۔

”عالی بیٹی! میں ڈرتا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں۔ میرا انصاف اور میری قربانی بھی سیدہ بیٹی کو مطمئن نہیں کر سکی۔ میں سب جانتا ہوں۔ کمرے کی ان دیواروں میں بند میں گھر کے تمام حالات سے باخبر ہوں۔ سیدہ بیٹی شاید اب بھی فرماں کے آنے سے خوش نہ ہو۔ بیٹی اب بھی فیصلہ کرنا ہمارے لیے آسان نہیں۔“

آغا جی کو سیدہ کے رویے کے بارے میں علم تھا کہ اور کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے ان کے انصاف اور قربانی پر حرف آتا ہو۔

”آغا جی! آپ تو انانیت کے درجے سے عی گرم گئی ہیں۔ ان کا احساس مرچکا ہے۔ ان کی خاطر انصاف کے تقاضوں کو پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا۔ آپ دنیا اور دین کی نظریں سرخرو ہیں۔ آپ نے انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے ہیں۔ کوئی آپ سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ آپ تو تمام عمر بھی ایسا نہیں چاہیں تھی مگر اس میں آپ کا کافور ہے؟ بی بی جان کا کیا قصور ہے؟ جو بیس سال سے بیٹے کی جدائی کی آگ میں جل رہی ہیں۔ آغا جی میں آپ کو ایک آپا کی خاطر اب ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنے دوں گی، جو ایک بار پھر سب کو بے موت مار دے۔ اب بتائیں آغا جی کیا فیصلہ ہے آپ کا؟“ عالی نے سہارا دے کر ان کو بیڑ پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”عالی! میری بچی تمہارے سامنے میں ویسے ہی پانی ہو جاتا ہوں اور ویسے بھی اب میں خود سے لڑتا لڑتے تھک گیا ہوں۔ بیس سال سے میں اپنے فیصلے کی صلیب پر لٹک رہا ہوں۔ ایک باپ بیٹے کے لیے لکھتا اور تڑپا ہے کوئی کیا جانے، اگر خدا ابھی یہی چاہتا ہے تو میں ناشٹری نہیں کروں گا۔“

”آغا جی!“ عالی آغا جی کے ساتھ جا لگیں۔ عالی نے زندگی میں پہلی بار آغا جی کو یوں کمر دیا تھا۔ دونوں کتنی ہی دیر خوشی کے آنسو بہاتے رہے۔ کیونکہ وہ جدائی کے آنسوؤں کی دھند کے بعد فرماں کی آقا و فریب منظر دیکھنا چاہتے تھے۔ آغا جی کے اس فیصلے پر جہاں بھجے چرخوں میں زندگی مسکرانے لگی تھی۔ وہاں سنا کے تن بدن میں آگ بھی لگ گئی تھی۔

”ہونہ! اسب جانتی ہوں ان کی چال بازیوں کو۔ بس بہو کے مرنے کی دیر تھی کہ بیٹے پوتی پر۔“

کھول دیے گئے۔“

”سیدہ! امت جلا کر خاک کر دے۔ آغا جی تو اب بھی نہیں مان رہے تھے۔ یہ تو عالی نے ان کو بے شکل راضی کیا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔“ قدیرہ بانو ہمیشہ ان کو غلط بات پر ٹوک دیا کرتیں۔

”ارے رہنے دیں۔ میں سب جانتی ہوں۔ آغا جی نے صرف ہماری جائیداد کی خاطر میرا تو جیسے تیسے رخصت نکاح کر دیا اور عالی کا نہ کر سکے تو اس کی کہیں اور بھی نہیں ہونے دی کہ۔“

”سیدہ! کیوں گناہ گار ہوئی ہو، آغا جی کے غلوں پر شبہ کر کے انہوں نے تو سر توڑ کوشش کی تھی کہ عالی کی شادی ہو جائے مگر عالی نہیں مانی۔ اس میں ان کا کیا قصور؟“

”جی۔ آپ تو ایسی ہی حمایت کریں گی۔ آپ کی اپنی بہن ہوتی اور یوں حراماں نصیب رہتی۔ تب آپ کو بہن کا کہہ کر بہن کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ ویسے تو ہر بات میں آغا جی کا حکم چلتا ہے اور وہ ہر کسی سے اپنی بات منوالیتے ہیں تو کیا

بچی کہ عالی نہ مانتی۔ سر نہ جھکاؤ۔ نیت میں غلوں سے بھرتا تو پھر ناں۔ میں بھی دیکھوں گی فرماں اور اس کی بیٹی اس گھر میں کس طرح سکون سے رہتے ہیں۔ اس فرماں کو میں بھی ناگوں بننے چھاؤں گی، جس نے میری فرشتہ صفت بہن کو کھڑا کیا۔“

سیدہ کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ قدیرہ بانو نے دکھ سے انہیں دیکھا اور مزید کوئی بات کہنے کے بغیر اٹھ گئیں کیونکہ وہ انتقام میں سب کچھ بھلا چکی تھیں۔ گھر کے بچے بھی اس خبر سے بے حد خوش تھے۔ خصوصاً لڑکیوں کی کہیں جن میں اب شعاع بھی شامل ہونے آ رہی تھی۔

”ہائے فائزہ۔ کتنا حرا آئے گا شعاع آجائے گی تو۔“

صدف بڑے اشتیاق سے شعاع کا ذکر کرتی ہوئی فائزہ کے قریب بیٹھ گئی۔

”کیوں شعاع کوئی بارہ سالے کی چاٹ ہے کہ اس کے آنے سے زیادہ حرا آئے گا۔“ شربی وغیرہ بھی اوقات اندر آتے ہوئے بولے۔

”تہا نہیں شعاع ہوگی کسی؟“

”میں بتاتا ہوں۔ شعاع کیسی ہوگی۔ بھی اس کا سر جو ہے ناں۔ دوکانوں کے درمیان ہوگا؟“

”نہیں یار! کیا واقعی؟“ دانی معنوی حیرانی سے شربی کو دیکھتا ہوا بولا۔

”ہاں مارا یقین کرو۔ اس کی دو ٹانگیں اور دو ہاتھ ہوں گے۔“

”یار! کیسے یقین کروں۔ تم یہ جلیہ عی عجیب بتا رہے ہو۔ اب تم کہو گے کہ اس کی آنکھیں تھوڑی دو اور اٹھنے سے بچنے ہوں گی۔“

”واہ یارو بی! اپنی محبت میں رہ کر تو تجھے بھی زبان لگ گئی۔“

نوبی نے بوڑھے کرٹوبی کی پیشانی چوم لی۔

”ہاں تو باخبر ذرا رات سے معلوم ہوا ہے کہ بد قسمتی سے شعاع کی ناک ایک ہی ہے۔“

”صرف ایک۔ اوہو۔ خیر اب شعاع کے پیروں کی طرف آؤ۔“

نوبی کی آنکھوں میں پھر شرارت ناچنے لگی۔ شربی نے ایک شوخ نگاہ صدف پر ڈالی اور مکث جوابی حملے سے

بچے کے لیے دور ہٹ گیا۔

”ہاں بھئی شجاع کے حتم جانو۔ بالکل اپنی صدف پر گئے ہیں، یعنی کہ بالکل پیچھے کی جانب ہونے۔“ شرعی کا جملہ صدف کے آگ لگ گیا۔ مگر وہ کسی مصلحت کے تحت خاموش رہی۔

”بھئی ساتھیوں، اب ان اشاروں کی مدد سے آپ جان گئے ہوں گے کہ شجاع کیسی ہوگی۔“

”لو بھلا اب شرمانے کی کیا بات ہے۔ صاف صاف کہہ دو کہ بے چاری شجاع بھی ان کی طرح چل رہی ہے۔“ نوی کی اس بات پر بھی لڑکیاں چپ رہیں۔

”ویسے اطلاع عرض ہے کہ شجاع کے بارے میں پتا چلا ہے، وہ بے چہرہ کمزور دل اور نازک حواجز لیے آپ بھی شکوں کو اس کے سامنے آنے سے منع کیا گیا ہے۔“

صدف کا خیال تھا کہ اس ایک بات سے اس نے ان کی تمام بکواس کا بدلہ لے لیا ہے۔ سب لڑکوں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک ساتھ بولے۔

”اوہ۔ تو گویا یہ بات ہے کہ شجاع ہمارے جنس کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو جائے گی؟“

بیاری چڑیل۔ ”شرعی کا یہ کہنا غضب ڈھا گیا۔ لڑکیاں ہل پڑیں۔“

”ہاں ہم ہیں چڑیل۔“ کیچے چبا جائیں گی تم لوگوں کے۔“

صدف نے اپنا پہلا دار اپنے پرانے حریف شرعی پر کیا۔

”السلام علیکم ناظرین۔ چڑیلوں اور جنوں کے درمیان منہج شروع ہو چکا ہے۔ حتیٰ تو ناظرین میرے سامنے جن فوٹی اور چڑیل فائزہ ہے۔ شاباش فائزہ۔ ارے نہیں بھئی، اگر ایک آنکھ میں انگلی ماری ہے تو دوسری آنکھ بھی مارو۔ تاکہ ٹینس برابر ہو جائے۔ نہیں بھئی نازیہ۔ یہ غلط ہے بولی ناک تو پہلے ہی کسی سینڈ کوڑا ہے۔ اور ناظرین! چڑیل صدف، جن شرعی کی شدگ کا ڈانچا ہتی ہے، جیسے ہی اسے کامیابی ہوتی ہے۔ ہم آپ سب کو ضرور دکھائیں گے۔ اونہ بی بی نادیہ! فوٹی کے سر پر جو ڈھانی بال رہ گئے ہیں ناں۔ رہنے دو۔ دوسری آنکھ کے لیے۔ آخر ان کی سینڈلوں کا بھی کچھ حق ہے ناں۔ ان کے سر پر۔ بدتمیزوں بند کر دیے بلیو بازی کچا

آ رہے ہیں۔“

شرعی جو مٹری کر رہا تھا، یکدم آہستگی سے بولا۔

”مارے گئے یار! آج کل تو تو ہیں بھی بہت غصے میں۔“ بولی ڈر گیا۔

”تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ کہہ دیں گے۔ بلکہ ہم خود ان کے پاس چلتے ہیں اور ان کا دل دیکھیں گے کہ کتوت دکھاتے ہیں۔ ہائے مر گیا۔“ فوٹی نے فائزہ کو گھورا۔

”یار! کہاں رہ گئے ہیں چچا جان۔ سو جن کم ہونی جا رہی ہے۔“

شرعی کی خواہش تھی کہ آج وہ جو صدف کے ہاتھوں زخمی ہوا ہے تو اس کا نظارہ کوئی بڑا بھی کرے تاکہ لڑکوں پر لڑکیوں کے مظالم کی خبر ہو۔

”گئے ہیں۔“ اپنا زخمی ہاتھ جن پر نازی کے تیز دار ناخنوں نے زخم کر دیے تھے دکھاتا ہوا بولا۔

”بڑا افسوس ہوا میرے بھائی! لیکن زیادہ افسوس کا پہلو یہ ہے کہ بچا جان رحمن گھر ہی پر نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب ہے، تو تم نے بکواس کی تھی؟“ سب شانی پر ہل پڑے اور قبل اس کے کہ شانی کے پرے الگ ہوتے، اسی وقت یاسر و مگر پارٹی کے ساتھ آ گیا۔

”او یاسر! میرا یار، کہاں تھے اتنے دن سے!“ سب سے پہلے شرعی یاسر کی طرف بڑھا۔

”اندھ تھا۔“ شوخی شرارت یاسر کی رگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بایوں کہنا زیادہ مناسب تھا کہ یہ شرارت کا سو جہدی ہوتا۔

”اندھ تھے اکیلے کیا؟“ نوی بھی شوخی سے بولا۔

”نہیں اور بھی تھے اپنے بھائی بند۔“ یاسر بڑے فخر سے بولا۔

”ویسے کس دفعہ کے تحت تھے اندر آپ؟“ صدف نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو یاسر نے بڑے عجیب انداز میں بڑکھڑکھ کر بولا۔

”اچھا سوال کیا ہے بی بی نے بھئی، دیکھو بی بی! ہمارے نو جوانوں کی کوئی قدر ہی نہیں۔ لڑکوں کی ہمدردی کو لاپرواہی سے دیکھا جاتا ہے۔ وقوع کے روز میں، بہنوں کے ایک کالج کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ جبکہ بہنوں کے کالج ہیں۔ آپ ہی آپ لڑکوں کی راہ گزر میں آ جاتے ہیں، اور پچارے لڑکے اپنی ہمدردی سے مجبور ہو کر ہمدردی کرتے ہیں تو ان کو دھڑلایا جاتا ہے، بس جانو، میرے ساتھ یہ ہی ہوا۔ وہ اپنی دس بارہ

دھڑکن کے ساتھ بالکل تنہا جاری تھی اور تھی خوبصورت، میری رگ ہمدردی پھڑکی، سوچا۔ اسے گھر چھوڑ آؤں مگر دس راس نہ آئی، راستے میں اس کے پام جلی مل گئے۔ اس نے چھوٹے ہی شکایت داغ دی۔

”پام جلی اس کی خبر ملیں یہ گرو مندر سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔“ بے وقوف حالانکہ میں صدر سے اس کا پیچھا کر رہا تھا، مگر میری خاطر مدارت ہوئی، انہوں نے کی۔ پھر آگے پاس کر دیا اور پھر میرے بھائی چل سو چل

لے گئے۔ یاسر نے شری نے کی ایک تنگ کی۔

”لو وہ خاندان کی لڑکیاں تو گویا ایسی بد ذوق ہیں ناں کہ تم جیسے۔“

”آں۔ آں لڑکی! تو اس میں سیریس ہونے کی کیا بات ہے، ویسے سچی بات بتاؤں، اتنے بد ذوق ہم لوگ

نہیں، بہر حال کون سا موضوع زیر بحث تھا جس پر خیالات کا اعتبار آپ سب نے ہاتھوں سے کیا۔“

یاسر فائزہ کے حملے سے بچنے کے لیے بات بدلتا ہوا بولا۔

”تمہارے آنے سے پہلے تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا کہ تم آ گئے۔“

”خیر، شیطان کا ذکر تو نہیں ہو رہا تھا۔“ صدف نے منہ بنا کر شرابی کی نفی کی۔

”ہم لوگ پہلے شماع کا ذکر کر رہے تھے، پھر جنوں اور چڑیلوں کا تذکرہ آ گیا۔“ نبوی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

یاسر کو ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ کیونکہ یاسر کو تفصیل سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ تاکہ وہ جوابی کارروائی سو فف

”اوہ تو تم لوگ جنوں اور بھوتوں کا ذکر کر رہے تھے۔ ہائے اب کیا ہو گا۔ یہ غضب ہو گیا۔ تم لوگ

نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یاسر نے کچھ ایسے خوفناک شکل بنا کر آنکھیں پھیلا کر خوف کا اظہار کیا کہ لڑکیاں

گئیں، جو اس کا مقصد تھا۔

”ارے کچھ نہیں ہو گا۔ ان کی تو عادت ہے، خوف و ہراس پھیلانے کی۔“ صدف آہستہ سے بولا

قریب کھسکتی ہوئی بولی۔ یاسر نے شرابی وغیرہ کو نظروں ہی نظروں میں کچھ بھجایا۔

”ارے ہو گا کیسے نہیں، یہ جن برادری اچھی خاصی خطرناک ہوتی ہے جہاں ان کا ذکر ہونا ہر

جاتے ہیں اور ایک بات کا بدلہ لیتے ہیں۔ کیوں بولی۔“ یاسر نے تصدیق کے لیے بولی کیوں دیکھ

ماہر جنات ہو۔

”بالکل میں سو فیصدی متفق ہوں یاسر سے، ان کا انتقام بہت برا ہوتا ہے، ہر رنگ ہر روپ میں آ جا

کبھی انسان کی چیزیں اٹھا کر لے جاتے ہیں اور کبھی کبھی جب غصہ زیادہ آتے تو انسان کو ہی اٹھا کر

ہیں۔“ نبوی نے مزید غوث پھیلا یا۔ لڑکیوں کے چہرے متحیر ہونے لگے۔

”اور پھر حد تو یہ کہ کسی اجنبی کی صورت میں نہیں آتے۔ میری تمہاری صورت میں، یعنی اپنے

لوگوں کا روپ دھار کر آ جاتے ہیں۔ ویسی ہی حرکتیں کرتے ہیں، اور یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اصلی ہیں۔ تو بتو یہ اللہ میاں بچائے، ان کے انتقام سے۔“ یاسر نے کانوں کا ہاتھ لگائے، دوسروں نے بھی

تائیدی۔ لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی، چہرے پھینکے پڑ گئے مگر انہوں نے کوئی کمزوری ظاہر نہیں کی۔

”مگر ایسی ہی بات ہے تو وہ تم لوگوں سے بھی انتقام لے سکتے ہیں۔ تم لوگوں نے بھی۔“ صدف

طلق تر کرتے ہوئے اپنے خوف کو کم کرنے کی غرض سے کہا۔

”دیکھو لڑکی! اول تو لڑکوں کو کچھ کہتے نہیں۔ ان سے ڈرتے ہیں اور اگر ان کی قسمت، بڑی ہو

بیشیں تو تا کوں چنے چوادیے ہیں۔ کیوں یاسر۔“

ایسا کوئی مسئلہ ہوا یہ ایک دوسرے کی تائید نہ کریں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

”بالکل بالکل۔ ذرا احتیاط سے رہنا تم لوگ دیے ہی بے وقوف ہو، خصوصاً رات کو دروازہ

جلدی نہ کرنا۔ کیا خبر وہ میرا، شرابی، ہوی، راشو یا کسی بزرگ کا روپ دھار کر آ جائیں تو احتیاط ہی کرنا۔“

”خیر یہ سائنسی دور ہے، جنوں بھوتوں پر ہمیں یقین نہیں ہے۔“ اندر سے انتہائی خوف زدہ

باد جو صدف، فائزہ، منیرہ کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

”خیر نہ کرو یقین، وہ رہتے ہیں ہمارے ہی گھر میں۔“ شانی نے طلق میں تیل ڈالا۔

”ہمارے گھر میں، اپنے لان میں کونے میں بڑا سا پرانا درخت ہے ناں۔“

”تو کیا وہاں پر ہیں۔“ فائزہ کا سانس رکنے لگا۔

”جی، وہاں پر پورا خاندان آباد ہے۔ ہماری طرح ان کی بھی سوشل لائف ہے، انہیں جب ضرورت پڑتی

فانی ضرورت کی چیز اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ وہ جو تم ایک دفعہ کہہ رہی تھیں ناں کہ تمہارے شو نہیں مل رہے اور

ن کا بیڑی یا کس غائب تھا۔“

”تو کیا وہ لوگ لے گئے تھے؟“

”اور نہیں تو کیا۔ وہی لے کر گئے ہوں گے، ضرورت پوری ہونے پر کہ گئے ہوں گے۔“

”جل یا رارہ نہ دو، اب وہ قفسہ نہ بتانے بیٹھ جانا۔ فوت ہو جائیں گی یہ لوگ۔ رنگ دیکھو، ہلدی کی طرح

بہا ہے۔ مارے خوف کے؟“

یاسر نے ان سب کو دیکھا جن کے رنگ واقعی پیلے ہو رہے تھے، دل دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔

”نہن نہن نہیں تو۔ ہم کیوں ڈرنے لگے؟“

مدف نے لڑکھڑاتے ہوئے اپنا بہادری کا ک بھرم رکھا۔

”اچھا چلو، جاؤ اب، جو اس درست کرو، بس یہ یاد رکھنا کہ اس درخت کے نیچے احتیاط سے جانا۔ شام کے

اچانک چڑیلیں چہل قدمی کرتی ہیں۔“

ٹریٹل نے لا پرواہی سے کہا۔ وہ بچاری لڑکیاں جو چھپکلی کو دیکھ کر فوت ہو جایا کرتی تھیں۔ اتنے خوفناک

ان سے طرح خوف زدہ ہو گئیں۔ اپنے کمرے میں بھی آ کر وہ لوگ یہ ہی باتیں کرتی رہیں۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ میرا جو سرخ دوپٹہ کھویا تھا اور چند روز بعد مل گیا تھا۔ وہی لے گئے ہوں گے۔“

”واقفہ یاد کرتی ہوئی بولی۔

”اچھا تو تم سب، وہ لوگ ہمیں بے وقوف بنا رہے تھے، کوئی بھوت پریت نہیں۔“

مدف نے بڑی بہادری سے کہا۔

”نہیں صدف! میری ایک دوست بھی ایسے ہی واقعات بتا رہی تھی۔ کچھ نہ کچھ حقیقت ہے تو بات بنی ہوئی

میں انہیں چھوڑ دو، ان کا زیادہ ذکر نہیں کرنا چاہیے۔“

فانی نے اس ذکر کو ختم کرتے ہوئے کبیل گرد لپیٹ لیا۔ حالانکہ گرمی لگ رہی تھی وہ لگلائیٹ آف کر کے

کان کو شل کر کے نکلیں، کچھ بار بار الٹے سیدھے دہم آ رہے تھے، صدف کو فائزہ کا ہاتھ لگ گیا تو وہ جھج پڑی۔

سانس دھونکی کی طرح چلنے لگے، عین اسی وقت دروازہ بجا۔ سب ایک دوسرے سے پٹ گئیں۔ دروازہ

بھونک لگتا تھا آج دروازے کی چولیس ڈھیلی کر کے چھوڑے گا۔

”لگ۔ لگ کون ہے؟“ یہ ہمت بھی صرف صدف ہی کر پائی۔

”نہیں ہوں ہوی! فائزہ سے کام ہے، دروازہ کھولو۔“ پھر دروازہ کھولا گیا۔

کے حامی تھے۔

”کیوں مانتے ہو ان استاد۔“ یاسر نے سینٹان کر پوچھا۔

”میں گئے مگر وہاں گئے یاد احوال آگیا۔ کسی بیگنی ہلہاں بنی کھڑی تھیں ہندو تو ان کی زبانیں لکی چلتی ہیں کہ۔“

”پہلے کوئی تھیں ہندی تھیں ہندی تھیں ہندی تھیں ہندی تھیں۔“

”تمہارے زخموں کا حساب لے لیا ہے ناں۔ فکر نہ کرو، اب دیکھتے جاؤ، ان لڑکیوں کے ساتھ ہوتا کیا ہوا۔“

”اور اس سے قبل کہ یاسر آگے کچھ بولتا۔ زور سے دروازہ کھلا اور یاسر نوبی، دوانی، شرجی کے قدموں میں آگرا۔

”لو آپ۔“ نوبی رخصت کو دیکھ کر سہم گیا۔

”اسوں جان!“ یاسر بمشکل اٹھتا ہوا بولا۔

”یہ کیا بکواس ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے بہت قلمیں دیکھتے ہو، آئندہ۔ اگر قلم دیکھی تو یاد رکھنا۔ مجھ سے برا

لانا ہوگا۔ اور یہ لڑکیوں کو کون سے قصے سناتے رہتے ہو۔ وہ سدا کی جاہل اعتبار کر کے ڈرتی ہیں۔ خبردار جو

ہلکی الکی حرکت کی ہو تو۔“

ہلکے جھپٹے میں رخصت ان کی ساری مسرت اور خوشی جو لڑکیوں کی ڈانٹ سے حاصل ہوئی تھی۔ ملیا میٹ

کے یہ جاہد جا۔ سارے بے حواسے ہو کر قلعین پر آڑے تر جھمے لیٹ گئے۔



”صدف دروازہ نہ کھولنا۔ وہی ہوگا جن۔ ہوئی بھیا کاروپ دھار کر آیا ہوگا۔“ ناری نے صدف کو

سے پکڑ لیا تاکہ وہ دروازہ نہ کھول دے۔

”ارے مجھے تو چھپا دو۔ اس نے تو براہ راست میرا نام لیا ہے۔“ فائزہ بید کے نیچے چھپ گئی۔

”ہو! کیا مصیبت ہے صدف! دروازہ کھولو ضروری کام ہے۔“ اب کی بار ہوی نے زوردار ضرب لگائی۔

”ہائے اللہ! میں مر جاؤں، مجھے بچا لے اللہ۔ یہ جن میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گیا۔“ مارے خوف کے فائزہ

”ارے کیا ہو گیا۔ زندہ ہو کہ مر گئی ہو، سب لوگ۔ تاتیا جان دیکھیے، یہ لڑکیاں دروازہ نہیں کھل رہیں۔“

”کیا بد تیزی ہے دروازہ کھلو، کتنی دیر سے ہوئی کھڑا ہے۔“

”ہونہ! ہم جانتے ہیں تم جن ہو۔ ہم سب جانتے ہیں تمہاری دکھاری، چلے جاؤ یہاں سے ورنہ ہم

کوئی نہ ہوگا۔“ باقی سب تو یوں دم سادھے ایک دوسرے سے چٹنی کھڑی تھیں۔ صدف ہی ہمت کر کے بول پڑی۔

”یا اللہ ہوی! کچھ کرو بیٹا! کسی طرح دروازہ کھلو! کیا افتاد پڑی ہے ان پر۔“ رخصت پریشان ہو گئے۔

”جی اللہ جان! لگتی تو کوئی گزیرتی ہے۔ رکے میں روشن دان سے کود جاتا ہوں۔“

اور پھر ہوی واقعی بڑی مشکل سے اندر کودا تو جیسے غصہ لگ گیا۔ لڑکیوں نے حلق پھاڑ کر رونا اور چیخا شرا کرنا

اور مسلسل بھوت جن چڑ ملیں بکار رہی تھیں۔

”بد تمیز لڑکین نہ کرو یہ چیخ و پکار۔ کہاں ہے جن چڑیل؟“

ہوی نے فائزہ کو بیڈ سے گھسٹ کر باہر نکالا تو وہ بے ہوش ہو گئی۔

”یہ کیا بکواس ہے۔ صدف! فائزہ! ہوش میں آؤ!“ رخصت کو غصہ آگیا۔ یاسر وغیرہ کے لمبی یہ سنہری ہونٹا

ڈانٹ پڑوانے کا۔ بھلا وہ کھو کر بے وقوف کیوں بنتے۔

”اہل قصہ یہ ہے چچا جان! کہ یہ لڑکیاں کام تو کرتی نہیں، دن بھر نصاب کی کتابوں میں جاسی ہو

بھوتوں کی کہانیاں رکھ کر پڑھا کرتی ہیں، اور پھر طاری مٹی کر لیتی ہیں۔ تو یہ ہی ہوگا۔“

لڑکیوں کو اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ شرجی کی بات سمجھیں اور سنیں ورنہ آج سر کے ٹکڑے ہو جاتے۔

”ہوں تو یہ حال ہے، بزرگوں کی آنکھوں میں دھول جھوکی جا رہی ہے۔“

”ابو! ان کا بس چلے تو دھول تو کیا بجزی سینٹ بجائے نہ کیا کیا بزرگوں کی آنکھوں میں جھونکیں۔“ نوبی نے

بول رہا تھا۔

”چپ رہو تم۔ اور خبردار جو آئندہ میں ایسی دیکر بات سنوں اور نہ ہی ایسا کوئی ہنگامہ ہو، حد ہوگئی۔ ان ف

لڑکیوں نے آج تک اونچی سانس نہیں لی اور تم لوگوں کی آواز اتنی بلند تھی آئندہ ایسا نہ ہو۔“

رخصت نے لڑکیوں کو اچھا خاصا ڈانٹ دیا۔ اب لڑکیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ بھوت نہیں، اب بھلا جن

ڈانٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب بچاریاں کھیلنی ہوئی سر جھکائے کھڑی تھیں۔ مگر اندر سے خوف ہنوز باقی تھا۔

زندگی میں لڑکیوں کو ڈانٹ پڑنے کا پہلا واقعہ تھا۔ اسی لیے سب خوش اور مطمئن تھے، ورنہ تو گھر کے سب



”جی امی جان! میں جانتا ہوں کہ ہمارے نخیال والے شہر میں ہیں۔ مگر آپ نے آج تک مجھے ان کا پتا

”اپنا اور نہ“  
”اس لیے میرے بیٹے کو مجھے زبان بندی کا حکم ہے اور خلاف ورزی کی سزا وہ رکھی ہے کہ ایک عورت  
ہمارے میں کم از کم اس سزا کو داغ بنا کر اپنی بزرگی کی چادر کو داغدار نہیں کر سکتی۔ طلاق کے دھبے سے بچنے کے  
لیے میں نے آج تک زبان بند رکھی ہے، اس لیے چاند! اب میری زبان نہ کھلوادے، میں ان کو بھول چکی ہوں۔ تم  
میں نے مل کر کیا کرتا۔“

منزہ بیگم نے لرزاتے ہاتھوں سے گلاس تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔  
”نہیں امی! نہ آپ ان کو بھول سکی ہیں اور نہ ہم فراموش کر سکتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیے تو کس جرم کی سزا  
نا بدلتی ہے۔“

”اپنا گھر بچانے کے جرم میں بیٹا! اور اس گھر کو اجڑنے سے بچانے کے لیے اللہ نے حمیرا کو تمہاری پھوپھی  
بنا دیا تو اس سے بھی ہر تعلق توڑ لیا گیا۔ حمیرا کو خدا، بے شمار خوشیاں دے، نہ صرف اس نے میرا گھر اجڑنے  
کا کیا۔ بلکہ نورین کو بھی اس کے ظالم جابر بھائی سے نجات دلوائی تھی، کبھی سوچتی ہوں تو قدرت کے کاموں پر  
رات ہوتی ہے، وہی نورین جو میری سوکن بن رہی تھی، جس سے مجھے شدید نفرت تھی، اسی نورین کو جب قدرت  
نہیری بھابھی بنا دیا۔ دل میں اس کی محبت کا سمندر اٹھ آیا۔ کیا کیا بتاؤں بیٹے! میرا ماضی پر خار وادی میں دفن  
ہو کر رہی ہوں تو روح زخمی ہو جاتی ہے، میں نے اپنوں سے دور قید تنہائی میں زندگی گزاری ہے اور صرف تم  
میں کی خاطر۔ کیونکہ میں تمہارے باپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس نے صرف اپنی ایک خواہش کے لیے  
بہتر کردیا۔“ ”منزہ بیگم ایاز کے سامنے بکھر گئیں تو ایاز سے ماں کو سینا مشکل ہو گیا۔

”امی جان! آپ کے پاس ثانی جان کی، ماموں کی تصویریں تو ہوں گی ناں ذرا دکھائیں تو، کیونکہ میرا  
بچپن ان سے مل چکا ہوں۔ آپ سے ان کی شکل بھی ملتی ہے، میں نے ان سے اس لیے کفر نہیں کیا  
کہ پہلے آپ سے کفر نہ کر لوں۔“

ایاز کی تصویر میں شہزاد کا سراپا اتر آیا۔ جو شرمین کو ایک بار کالج چھوڑنے آئے تھے، بس رکی سی علیک  
ملک ہوئی تھی، جانے کیوں ایاز شہزاد کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ اور شہزاد میں اتنی کشش محسوس ہوئی تھی کہ ان سے  
انکار کرنے کو جی چاہا تھا۔ مگر وہ جلدی میں تھے۔

”جب حمیرا نورین کو شہر لے گئی اور شہزاد نے نورین سے شادی کر لی تھی۔ اسی وقت شہباز نے کہہ دیا تھا  
کہ میں بیکم میرے لیے مر گئی اور تمہارے بھائی، ماں، بہن تمہارے لیے مر گئے، بس اسی وقت انہوں نے تمام  
نصیحتیں بھلا دیں۔ لیکن شہزاد کے کالج کے زمانے کی ایک تصویر میں نے چھپا کر رکھ لی تھی۔ وہی دکھاتی ہوں۔“

”منزہ بیگم یہ میرا شہزاد ہے، سب سے چھوٹا بھائی، تمہارا ماموں۔“  
”میں نے پیار سے تصویر پر جی کر دآٹھل سے صاف کر کے ایاز کو دے دی۔“  
”جی امی! یہی ہے تو تھے وہ۔ وہ میرے ماموں جان ہیں۔ امی جان آج تک آپ نے کیوں نہیں بتایا ان کے  
سلسلے میں آپ کو خبر بھی ہے، شہر میں ماموں جان کتنی عزت اور وقار کے ساتھ رہتے ہیں۔ اودہ خدا یا۔ نہ جانے کیوں

ایاز حویلی آیا ہوا تھا اور منزہ بیگم بے حد خوش تھیں۔ بیماری کے باوجود اس کا سب کام اپنے ہاتھوں  
کر رہی تھیں۔

”آپ کو کب سے بخار ہے امی جان؟“ ایاز نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔  
”پتا نہیں بیٹا! کب سے ہے اور کب تک رہے گا۔ زندگی کا یہ بخار، بس تم ڈاکٹر بن جاؤ تو علاج کرانے  
گی، اپنے ڈاکٹر بیٹے سے۔“

زندگی کا ایک ہی توار مان پورا ہوا تھا منزہ بیگم کا کہ ان کا ایاز بیٹا ڈاکٹر بن رہا تھا۔ ورنہ تو شیراز کے مستقبل  
سے وہ مگر مند ہی رہتی تھیں۔

”واہ امی! میرے ڈاکٹر بیٹے میں ابھی تین سال باقی ہیں۔ جب تک آپ علاج ہی نہیں کرائیں گی۔  
اس بار میرے ساتھ شہر چلیے، میں آپ کا بہترین ڈاکٹر سے علاج کراؤں گا۔ ہومی میرا بہت اچھا دوست ہے۔  
آپ وہاں ٹھہر جائیے گا۔“

ایاز کی اس بات پر منزہ کتنی ہی دیر دوتی رہیں۔  
”امی جان! آپ روکیوں رہی ہیں؟ کس بات پر؟“ ایاز پریشان ہو گیا۔

”تمہارے دوست کے ہاں ٹھہرنے پر بیٹا۔“  
”اچھا آپ کو یہ بات پسند نہیں تو ہم کیسے ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے۔“

”یہ بات نہیں بیٹے، رونا تو اس بات کا ہے کہ اس شہر کے دروازے مجھے پر بند ہیں جہاں میرا بچپن  
ہے، میری ماں ہے، میرے بھائی ہیں۔ لیکن ہے مگر۔ مگر۔ میں ان کے لیے مرجی ہوں اور وہ میرے لیے  
ان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔“

ایک عورت کے لیے اس سے بڑھ کر سزا کیا ہو سکتی ہے کہ جیتے جی ہی اسے اس کی ماں اور بہن جانے  
سے اس طرح جدا کر دیا جائے کہ کوئی خبر تک ایک دوسرے کو نہ پہنچے۔

ان کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ یہ میرے ماموں ہی ہو سکتے ہیں۔ اور ان سے آپ کی شکل بھی تو ملتی ہے۔  
ایاز ماموں کی تصویر دیکھ کر بے حد خوش تھا کہ وہ باوقار خوبصورت سا شخص کوئی غیر نہیں اس کا ماموں  
”ہاں میری اور اس کی شکل کی وجہ سے اجنبی لوگ بھی نہیں بہن بھائی کی حیثیت سے پہچان لیا  
تھے، کیسا ہوگا۔ اب میرا شہزادہ؟“

منزہ بیگم کے دمکی لہجے میں دیدار کی حیرت تھی۔

”بہت اچھے، بہت خوبصورت، بہت اساتذہ اور باوقار، تو اس کا مطلب ہے شرمین میری۔“

”یہ شرمین کون ہے؟“ منزہ نے حیرت سے ایاز کو دیکھا۔

”شرمین میری کلاس فیلو بھی ہے اور شہزاد ماموں کی بیٹی ہے، اسی کو چھوڑنے تو وہ کالج آئے تھے۔“

انہوں میں شرمین کا دلکش سراپا اتر آیا۔

”اچھا تو کیسی ہے شرمین؟ میرے شہزاد کی بیٹی۔“ منزہ بڑے پیار سے پوچھ رہی تھی۔

جی تو چاہتا تھا کہ جیسی شرمین ہے جتنی خوبیاں اس میں ہیں وہ سب ماں کو بتا دے مگر جھجک کر وہ کہہ

”جی بس اچھی ہے، جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں، ویسی ہی ہے۔“

”نہیں بیٹے! تم کل سے کام لے رہے ہو، وہ یقیناً بہت خوبصورت ہوگی، میرے شہزاد کی طرح۔“

”ارے بھئی، یہ کیا ماں بیٹے میں بسی کا نفرنس شروع ہوگئی۔ ایاز مگر! ہم بھی تیرے کچھ لگتے ہیں۔“

احمد ڈیوڑھی سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے قریب آگئے۔ انہوں نے ایک گہری نظر محو پر ڈالی تھی

چہرے پر انوکھی خوشیوں کا عکس لہرا رہا تھا۔ انہوں نے گہری ”ہوں“ کی اور ایاز کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”اباجی اسی جان کی طبیعت بہت خراب رہتی ہے، میں نے سوچا ہے کہ ان کو شہر لے جا کر کئی علاج

سے علاج کراؤں، بہت کمزور ہوگئی ہیں۔“

ایاز نے فکرمندی سے منزہ کو دیکھا جو لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

”ہوں تو اسی لیے چہرے گلاب کھلے ہوئے ہیں، نہیں پتہ! یہ شہر نہیں جاسکتی۔“ شہباز احمد نے مثال

صاف انکار کر دیا۔

”کیوں تباہی آئی؟ کوئی جرم نہیں کیا تو۔ پھر ان کو نا کر وہ گناہوں کی سزا کیوں دے رہے ہیں؟“

ایاز خود میڈیکل کا طالب علم تھا اور ماں کی حالت کو سمجھ رہا تھا۔ اسی لیے وہ باپ سے الجھ چلا۔

”اسی لیے۔“ منزہ بیگم بھی لیے کہا تھا نہ شعور کے رستے پر ڈالو۔ اب دیکھو کیسے باپ کے سامنے بیٹا

کھڑا ہو گیا ہے۔“ شہباز احمد نے منزہ کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اباجی بڑا احسان ہے میری ماں کا کہ انہوں نے لہجے شعور کے رستے پر ڈالا تو میں یہ ان کو اپنی

سے اتنی گرفتہ حالت میں کیسے دیکھوں اور خدا نہ کرے کہ میں کبھی آپ کی گستاخی کروں۔ میں صرف یہ

کراہی کا مکمل چیک اپ کراؤں اور۔“

”ایسا یہاں بھی ممکن ہو سکتا ہے، جتنا چاہو۔ پیسہ لے لو اور بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو یہاں لے

طلاج کر دو۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پڑا۔ دو لیکن یہ شہر نہیں جاسکتی۔ سمجھے تم۔ اور اگر تم نے اپنے خیال

رابطہ کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

”مگر بیٹی! ایاز نے کچھ کہنا چاہا۔

”میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اگر میری بات نہ مانی تو نتائج کے تم ماں بیٹا ذمہ دار ہو گے۔“

شہباز احمد سفاکی سے اپنا فیصلہ سناتے بیساکھی زور زور سے بجاتے باہر نکل گئے۔

”تھا تھا ناں بیٹے! مت بات کرو، نہیں مرتی میں، بہت سخت جان ہوں۔ اب تک نہ مری تو اب کیا۔ تم

نہیں جی جلاتے ہو، اب اس بڑھاپے میں کیوں میرا مردہ خراب کرتے ہو جو ہو سکتا ہے یہیں پر کرو تمہیں کوئی

ضرر نہ ہے۔“

منزہ نے بے بسی سے سر تکیے پر لٹکا دیا۔

”نہیں ای! اب ہم اتنے بھی بے بس نہیں۔ آپ فکرنہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ایاز سوچتی آنکھوں

ماں کو دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

شہباز احمد نے شیراز کی تربیت اپنے من پسند انداز میں کی تھی۔ اور شیراز کو اپنی سوچوں اور خیالوں کے

ماں میں ڈھالا تھا وہ عالم شاہ سے ہر صورت میں اپنی بے عزتی کا بدلہ اور تعمیر کی جائیداد واپس چاہتے تھے

ملک ان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف عالم شاہ سے بدلہ لینا تھا اور ان کے پاس وہ ہمدھن شہباز تھا۔ جس کو

انہوں نے خوب اچھی طرح ٹرینڈ کر لیا تھا۔

”شیراز پتہ! کام کوئی آگے بڑھتا ہوا نظر نہیں آ رہا۔ کیا وجہ ہے۔“

شہباز احمد کی نال ایک طرف رکھتے ہوئے شیراز کو دیکھ رہے تھے، جس کی آنکھوں کی جواں چمک ہر چہچ

اور شہباز کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔

”تباہی! کہتے ہیں کہ کام بھلے دیر سے ہو مگر پائیدار ہو، محفل کا استعمال ہو اور میں بھی جذبات سے زیادہ

ملک اور محفل پر اعتماد کرتا ہوں، ویسے میری اطلاع کے مطابق عالم شاہ کے بڑے بیٹے فیاض شاہ کی شادی ملک

کا کھلی بیٹی نوبت کے ساتھ ہو رہی ہے، اور بڑی بات یہ کہ عالم شاہ کی اپنی بیٹی آمنہ جو کہ اس کے ماموں کے

ان کی ماں اب عالم شاہ سے حویلی لے آیا ہے، مگر آمنہ کو اس نے اپنی نہیں اپنے سالے کی بیٹی ہی ظاہر کیا ہے۔“

یہ معلومات جو شیراز نے بڑی محنت سے حاصل کی تھیں، شہباز احمد کو دے دیں، تو خوشی سے شہباز نے

بڑھ کر شیراز کو ساتھ لے لیا۔

”اور شاہ! امیرے شیر مگر! یہ ہوئی نہ مردوں والی بات۔ ہوں اچھا تو اس نے اپنی بیٹی کو اپنے ہی گھر

لے لیا۔ بیٹی کا کرک لیا ہے، بہت خوب، دیکھتا ہوں میں عالم شاہ تمہیں۔ ایک ایک کا حساب لوں گا۔“

شہباز احمد کے لیے یہ اطلاعات بڑی خوش کن تھیں اور وہ تھیں اور وہ شیرازی کی کارکردگی سے مطمئن بھی تھے۔



فیاض شاہ کی شادی ہوگئی۔ نوبت دہن بن کر آگئی تو آمنہ کو بھی اپنے باپ کے گھر آنے کی اجازت مل

گئی تھی۔ مصوم کم گئی آمنہ ماسی کے مظالم سہہ کر بالکل بدتم ہوگئی تھی۔ ماں ہوتی تو وہ کوئی شکایت بھی کرتی

مگر میں نے اس کی حالت دیکھی تو گھر لے آئے لیکن عالم شاہ کے لیے نورین والا حادثہ ایسا تھا کہ وہ اب

نہیں گھر کی کسی بیٹی کو رکھنا نہیں چاہتے تھے، اسی لیے پہلے نوبت کو بیاہ لائے تھے تاکہ تاریخ اپنے آپ کو

نورین ہائے نوبت معتدل حراج کی مالک بھی نہ زیادہ غصہ کرتی اور نہ ہی برتی لیکن اس سے بات کرنا بھی

مستطاب

”ہاں جی! اگر نورین پھپھو کی مرضی شامل نہ ہوتی تو کوئی عورت تو کیا مرد بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔“  
 ”ہاں جی! اس کی مرضی۔ اپنی مرضی سے وہ میری دشمن کے ساتھ گئی۔ ان سے رشتہ داریاں کر لیں۔ یہ  
 ات بھی اس نے بھائی کی کہ بھائی کے دشمنوں سے جا ملی۔ ارے ڈوب کر مر جاتی۔ مگر باپ بھائی کی عزت کو  
 بھائی۔ تم لوگوں کو کیا خبر میں نے اس ذلت کے ساتھ کس طرح زندگی گزاری ہے، کہنے والوں کی زبان روکی  
 ہے۔ بھلا۔ طرح طرح کی باتیں مجھے سختی اور برداشت کرنی پڑیں۔ اس نے میرے دشمنوں کا ساتھ دیا نہ  
 بہت کثرت کا خیال کیا نہ بھائی کا احساس کیا۔ اسی لیے میں نے آمنہ کو اس حویلی سے دور رکھا مگر تم لوگوں کی ضد  
 بچے سے اسے بھیاں لانا پڑا تو۔ یاد رکھو، میں اب تاریخ کو دہرانے کی کسی کو اجازت نہیں دوں گا۔ میں خود بھی  
 لے لے سکتا تھا۔ میں نے اب تک انتظار کیا ہے، کانٹوں پر سو یا ہوں۔ اب نہیں جیا جاتا بے غیرت بن کے تم  
 لوگوں کو ہر حال میں اپنی پھپھو کا بدلہ لینا ہے، جب تک تم لوگ شہزاد اور حمیرا کا سر میرے قدموں میں نہیں جھکا  
 پڑے، میں جین سے نہ جی سکوں گا نہ مر سکوں گا۔“  
 جذبات کی شدت سے عالم شاہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”آپ نے یہ بات ہی اب بتائی ہے، تہا جی اور نہ فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اس شہباز اور شیراز کو تو میں سمجھ ہی  
 لاگا۔“ غیث نے پختہ لہجے میں کہا۔  
 ”بڑے وقت پر آپ نے راز سے پردہ اٹھایا ہے تہا جی! سمجھ لیجئے کہ حمیرا۔ اور شہزاد آپ کے قدموں میں  
 بہ۔“  
 حادث کی سوچوں کو عنوان مل گیا تھا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ اس کے تیز دماغ نے تو ابھی سے کئی منصوبے  
 لے لے تھے۔

شاہ غیث پھر اسی دن کے لیے تو میں زندہ تھا کہ میرے شیر کب جوان ہوں، اور کب میری بے عزتی  
 بدلے لیں۔ بس میرا شہزاد اور حمیرا اور نورین ہیں اور میں ہر حال میں ان کو اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“  
 غیث کی اس بات نے دل خوش کر دیا تھا عالم شاہ کا۔ انتقام پھر سے جوان ہونے لگا تھا۔  
 ”آپ مگر یہ نہ کریں تہا جی! اب وہی وہاں جا کر آپ چاہتے ہیں۔“  
 غیث شاہ نے پراستاد لہجے میں یقین دلایا تو عالم شاہ کی طرف گھوم گئے جو جانے کن خیالوں میں  
 لہر رہے۔

”حادث شاہ۔ میرے پتر بس یہ خیال رکھنا ہے کہ تم لوگوں کی پھوپھی، تم لوگوں کی غیرت اس گھر سے  
 نکال دی ہے۔ اور دوسرے حمیرا کے پھپھو کی تکلیف تو میں اب بھی اپنے منہ پر محسوس کرتا ہوں۔“  
 بیچھری میں عالم شاہ کا ہاتھ پانے نہیں دھسا رہا گیا جس پر ماضی میں حمیرا نے بہت زور سے تھپڑ مارا تھا۔  
 ”کیا مطلب ابھی؟“۔ حادث دھیمے لہجے میں کئی کئی اس بات کو سمجھ نہ سکا۔  
 ”کچھ نہیں۔ میں شرمین کو نورین اور شہزاد کی بیٹی کو۔ اس گھر میں دیکھنا چاہتا ہوں، ان ہی سلاخوں میں  
 ٹوکر لگا رہا ہوں۔ جن کو اس کی ماں تو ذکر جلی گئی تھی۔“ عالم شاہ ایک ایک لفظ چبا کر بول رہے تھے۔  
 ”شرمین لاکھ کرانے باز سی۔ طرم خان سہی مگر۔ مگر تہا جی وہ اس گھر میں ضرور آئے گی۔ وہ پابند سلاسل  
 لہو کی۔ وہ میری بھی مقروض ہے۔“

آسان نہیں تھا۔  
 نضب پترا تمہیں پتا ہے، ہم تمہیں کیوں بھاہ کر لائے ہیں۔“  
 سوال خاصا عجیب بھی تھا اور تکلیف دہ بھی۔ تاہم نضب خاموش رہی۔  
 ”اس لئے کہ میری ایک بیٹی ہے، تم اس کی دیکھ بھال کرو، اس کا خیال رکھو۔“  
 ”تہا جی! آمنہ کون سا دودھ جیتی بچی ہے جو نضب کو اس کی دیکھ بھال کی تاکید کر رہے ہیں آپ۔“  
 شاہ کو یہی سے زیادہ بہن کا خیال آیا۔

”وہ دودھ جیتی بچی نہیں ہے، اسی لیے تو کہا ہے کہ اس کی دیکھ بھال زیادہ ضروری ہے، حادث پترا  
 تو کچھ خاندانی باتیں ہیں، وہ سب کے گوش گزار کرنی ہیں۔“ اور اتفاق سے اسی شام حادث بھی شہر سے آیا  
 حویلی میں دو عورتوں کی موجودگی نے اسے خوش کر دیا۔ ایک جو اس کی بہن تھی دوسری بھابھی۔  
 ”واہ اب حرا آئے گاناں گھر آنے کا۔ کوئی آنے پر خوش ہوگا اور کوئی جانے پر افسردہ، آمنہ بانی! اور  
 اتنا صدمہ گھر سے دور کیوں رہیں؟“ اس نے آمنہ کے ہاتھ تھام کر پاس بٹھالیا تو وہ اسے شفقت سے دیکھنے لگی  
 ”ہمارے خاندان کی عورت کی تقدیر مرد لکھتے ہیں بھائی! جو کہہ دیتے ہیں، کرنا ہوتا ہے۔ تہا جی!  
 مناسب جانا۔ ماموں جان کے ہاں رکھا۔ بھائیوں نے مناسب جانا۔ واپس لے آئے، نہ میری جانے!  
 مرضی تھی نہ آنے سے انکار۔“ آمنہ کی آواز دکھ کے کسی گھر سے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔  
 ”اوہو اب ایسی باتیں نہ کریں۔ اب تو آگئی ہیں ناں آپ۔“ حادث اس کے کرب کو محسوس کیا  
 لا پرواہی سے بولا۔ تو وہ دکھ سے مسکرا دی۔

رات کو عالم شاہ نے سوائے آمنہ کے سب کو اپنے کمرے میں جمع کیا۔  
 ”حادث پترا! تمہارے ساتھ کوئی لڑکی شرمین پڑھتی ہے۔“  
 عالم شاہ نے پہلا سوال حادث سے کیا تو وہ گڑبڑا سا گیا کہ ان کو شرمین کے بارے میں کیسے خبر ہوئی۔  
 ”جی تہا جی پڑھتی ہے، میری کلاس فیلو ہے وہ۔“ حادث کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔  
 ”جانتے ہو وہ کون ہے؟“ سب حادث کے ساتھ حیران تھے۔  
 ”کون ہے ا۔“ حادث کے بجائے غیث نے پوچھا۔  
 ”تم لوگوں کی پھوپھو نورین کی بیٹی شرمین۔ اسی نورین کی جیسے شہباز کی بہن حمیرا نے اغوا کیا اور پھر  
 نے اس سے شادی کر لی۔“

اور پھر عالم شاہ گزشتہ واقعات کو اسی طرح سے بتاتے رہے جو انہوں نے اس وقت محسوس کی تھی، سب  
 لیے یہ انکشاف انتہائی تکلیف دہ تھا۔  
 ”ابھی آج تک آپ نے ہم سے یہ بات کیوں چھپائی۔ میں شہباز اور اس کی بیٹیوں کو اب تک  
 کر چکا ہوتا۔“ جوش غیرت سے غیث کی نیس پھول گئیں۔  
 لیکن فیاض شاہ بیٹھا رہا۔ حادث کو یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ شرمین اس کی فرست کزن ہے  
 کے۔ بس منظر میں خواہ کیسے ہی حالات رہے تھے، اس سے اسے غرض نہیں تھی۔ وہ تو اکبر، مفرد شرمین  
 بارے میں سوچ رہا تھا۔

حادثہ شاہ پر خیال انداز میں بولا۔ اس کی نظروں میں وہ تمام واقعات گھوم گئے۔ جب شہزادہ حارث کی بے عزتی کی۔ اس پر ایاز اور ہوی کو فوج دی۔ آج عالم شاہ نے دل میں دُور راز اپنے بیٹے کو حوالے کر دیے تو خود بہت پرسکون اور مطمئن تھے۔ کیونکہ ان کو یقین تھا کہ ان کے بیٹے ان کی زندگی بھر اتریں گے۔ آئندہ جب اپنے ماموں کے گھر تشریف لے گئے۔ اس کا خیال تھا کہ باپ کے گھر پر تو اپنی زندگی بسر کرے گی، مگر یہاں تو آتے ہی فیصلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ کہ کبھی بھی اس کا دم کھٹے لگا۔



”باؤ جی! وہ ہاشم باؤ آئے ہیں۔“

”اوہ بے بیوقوف جلدی سے اسے بلا کر یہاں میرے کمرے میں ہی لے آ۔“

ہاشم کا نام سنتے ہی شیراز اچھل پڑا اور ہاشم کے استقبال کے لیے دروازے کی جانب بڑھا۔

”السلام وعلیکم۔ آ میرے یار۔ اتنے دنوں بعد، تجھے پتا بھی ہے کہ میں تیرے بغیر زیادہ دن نہیں رہ سکتا رہی۔“ شیراز بے قراری سے ہاشم سے لپٹ گیا۔

”مجھے پتا تھا کہ تم یہی کہو گے یار! تمہارے ہی کام میں اتنے دن لگ گئے۔ آخر غیاث شاہ سے دوستی رلی آسان بات تو نہیں۔“

”اچھا تو کیا تم کامیاب ہو گئے؟ مجھے یقین تھا کہ تم اس سے دوستی کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔“ شیراز اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔

”ہاں یار! کیا کرتا۔ دوستی میں یہ بھی کرنا پڑا کہ ناپسندیدہ شخص سے صرف تمہاری خاطر بات کرنی پڑی؟“

”اگر دوستی میں یہ سب کیا ہے تو احسان نہ جتاؤ۔ یہ بتاؤ۔ ہوا کس رخ کی ہے۔“ شیراز دلچسپی سے ہاشم کے قریب بیٹھ گیا۔

”بڑی اچھی خبریں ہیں۔ پہلی خبر تو یہ کہ غیاث اور فیاض شاہ اپنے محاذ پر بالکل چوکنے ہیں اور ہر وار کا جواب دے سکتے ہیں اور دوسری خبر یہ، تمہاری دلچسپی کی ہے کہ فیاض شاہ کی بیوی نضب اپنے چاچا کی بیٹی کی ٹائی میں شرکت کے لیے فوراً پور جا رہی ہے۔“

”تو اس میں میری دلچسپی کا کون سا پہلو ہے؟“ شیراز نے بڑا سنا منہ بنایا۔ ”تمہاری دلچسپی کا پہلو یہ ہے کہ عالم شاہ کی بیٹی اور غیاث کی بہن آئندہ بھی بھابھ کے ساتھ شادی میں جائے گی۔“

”کیا واقعی؟ لیکن یار! اس شادی میں ہم کیسے شرکت کر سکتے ہیں؟“

”شیراز! مایوسی سے بیٹھ گیا۔ اسے آئندہ سے اس لیے دلچسپی تھی کہ وہ اس کے حریف کی بیٹی تھی اور اس نے بہت کم سوچ رکھا تھا۔

”شرکت ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ لڑکے والے ہماری برادری کے ہیں اور ہمیں بھی شرکت کا دعوت دیا جائے۔ لہذا جہاں ہم وہاں تم۔“

”ہاشم نے شیراز سے گلے میں بائیں ڈال دیں، تو شیراز زور سے اس سے لپٹ گیا۔

”ارے بھارتا میرا یار۔ جانا کب ہے؟“

”بارہ تاریخ کو۔ لیکن دل جگر سنبھال کر ہی جانا۔“

”کیوں بہت خوبصورت ہے کیا وہ؟“

”یہ تو خبر نہیں کہ خوبصورت ہے یا نہیں۔ اگر ہے بھی تو کتنی، احتیاطا کہہ رہا ہوں کہ کہیں دل دل ہار بیٹھے تو

نضب جو چہ کیے ہوئے کپڑے الماری میں رکھنے آئی تھی۔ آئندہ کی چھکیوں پر چونک پڑی۔

”کچھ نہیں بھابھی! اس ٹیکنیک پانی پر ہی تو میرا اختیار ہے، جو کبھی کبھی استعمال کر لیتی ہوں۔ اور نہ

اپنے ناکرہ گناہوں کی سزا بھگت رہی ہوں، ہر بات پر پابندی، آنے جانے پر پابندی، اب تو مجھے بھی براہ

ہونے لگا ہے کہ میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے جس کی سزا مل رہی ہے۔“ بات ختم کر کے وہ پھر رونے لگی۔

”یہ بات نہیں آئندہ! کہ تم میں کوئی خرابی ہے اصل میں تمہاری پھوپھی کی وجہ سے یہ سب ہو رہا۔

تمہارے ساتھ انہوں نے بھی تو غلط حرکت کی تھی ناں۔ کہ گھر سے چلی گئیں۔ اور پسند کی شادی کر لی۔

خود سوچو۔ دودھ کا جلا چھانچو پھوپھ کیسے پیتا ہے۔“

نضب کو جو کہانی معلوم تھی، اس کی روشنی میں اس نے آئندہ کو سمجھنا چاہا۔

”پتا نہیں بھابھی کیا جھوٹ ہے اور کیا کج، کون غلط ہے اور کون صحیح لیکن اتنا تو اعتماد ہونا چاہیے کہ

پھوپھ تعلیم یافتہ تھیں۔ شعور اور ادراک کے دروازے وا تھے ان پر اور انہوں نے علم کی روشنی میں زندگی کی بہتری

راستہ تلاش کر لیا مگر۔ مگر میرے پاس تو علم کی روشنی بھی نہیں کہ بغاوت کے گھوڑے پر سوار ہو کر آزادی مان

کر لوں۔“

عالم شاہ نے آئندہ پر ہر قسم کی تعلیم کے دروازے بند کر دیے تھے کیونکہ نورین نے ان کی نظر میں تعلیم کا

استعمال کیا تھا۔

”ارے میری بہن! تم دل کیوں چھوٹا کرتی ہو۔ شادی ہو جائے گی تو پھر اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنا۔“

نضب نے اس کا موڈ درست کرنے کی غرض سے کہا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے، بھابھی زندگی اگر سلاسل میں پابند رہ کر ہی گزارنی ہے تو گھر تبدیل ہونا

سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خواہ وہ ماموں کا گھر ہو۔ باپ کا ہو یا شوہر کا، بات تو ایک ہی ہے ناں۔“

آئندہ کے زندگی لمحے سے لہو رسنے لگا۔ اس نے تو ہوش ہی مامی کی ڈانٹ پر نکار میں سنبھالا تھا۔ وہ

بڑے جاگیردار کی بیٹی ہونے کے باوجود چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے تڑپتی تھی، آہستہ آہستہ وہ زندہ انسان

لاش بنی چلی گئی۔ جو صرف سن سکتی تھی مگر بولنے کی، احتجاج کی اجازت نہیں تھی۔

”مت جلا کر حاکم روا تا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پتا ہے رات آدی آیا تھا۔ تپا کی طرف سے کہ میرے

چاچا جی کی بیٹی کی شادی ہے، اس لیے مجھے بلوایا ہے۔ پتہ نہیں ساتھ لے کر جاؤں گی دیکھنا کتنا حرا آئے

، کچھ دن تو اچھے گزر جائیں گے ناں۔ چلو اٹھو شاہجی منہ دھو لو۔“

نضب نے اپنے آئینے سے آئندہ کا آنسوؤں سے دھلا چہرہ صاف کر دیا۔ حالانکہ سر کی طرف سے نہ



سارا انتقام دھرا دے جائے گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہارا دل تھیلی پر دھرا رہتا ہے۔“ ہاشم نے شوخ نظر اور شیراز کو دیکھا۔

”خیر، اب ایسی بھی بات نہیں یا! ہاں یہ الگ بات ہے کہ حسن میری کمزوری ہے۔ پر یقین جان۔ تک میرا دل کسی لڑکی پر آیا نہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ اور آمنہ نے تو اپنے باپ کا ایک ایک پکڑا ہے۔“

عالم شاہ کے ذکر پر شیراز کا حلق تلخ ہو گیا۔ شیراز شادی پر جانے والے بالکل تیار تھا۔ عالم شاہ کی آپ ہی آپ راہیں کھل رہیں تھیں۔ تو وہ کیوں نہ آگے بڑھتا۔ مگر مزہ نہیں چاہتی تھیں، کہ شیراز کی شادی جائے کہاں عالم شاہ کے گھروالوں کو بھی ہوتا ہے۔

”بیٹے! کیا تمہاری شرکت بہت ضروری ہے اس شادی میں۔“

”جی امی! آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ کتنی ضروری ہے میری شرکت۔ کیوں تاجی؟“

شیراز نے تائید کے لیے شہباز احمد کو دیکھا جنہوں نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

”اور بے دے پتر۔ اس کو کیا خبر تم جاؤ اپنے کام کرو۔ یہ تو کبھی بھی نہیں سمجھ سکتی اور ہمارے قیام بھی یہی ہے کہ یہ نہ سمجھے، سمجھ گئی تو راہوں میں روڑے ہی انکائے گی ناں۔ اور کیا کرے گی۔“

شہباز احمد نے ایک حیرت منہ کی طرف اچھالا جو سیدھا ان کے دل میں پیوست ہو گیا۔

”ہاں! میں سمجھ رہا ہوں تو بہتر ہے، سمجھ میں آجی جائے تو کیا کڑی ہوں۔ ہو گا تو وہی جو تم باپ چاہے ہو۔“

”اچھا۔ اچھا۔ بس کر۔ اب یہ سارا کیا دھرا تیرے ہی بھائی کا ہے۔ بڑا عاشق تھا نورین کا اور بالآخر چٹائیوں کے تلے پڑتی تھی۔ پہلے میں عالم شاہ سے منٹ لوں پھر دیکھوں گا۔ اس شہزاد کو بھی۔“

شہزاد نے شہباز احمد کے ماضی میں جو رقیب رو سیاہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اس کے لیے وہ شہزاد کو کسی مصافحہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس شادی میں شرکت ہاشم کے لیے ضروری ہو گئی تھی۔ لڑکے والوں سے لگتا خاص قربت داری تو نہیں تھی۔ مگر شیراز کی وجہ سے وہ خاصا گر جوش تھا اور آگے آگے ہو رہا تھا۔ ان کی معلومات حاصل کی جا سکیں۔ اس وقت وہ ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں بنی سنوری لڑکیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ رنگین لمبوسات میں چمکتی ہوئی لڑکیاں اچھی لگ رہی تھیں۔ مگر شیراز کی نظر میں ایک کونے میں الگ تھا بیٹھی آمنہ پر بٹھری ہوئی تھیں۔ گھر سے بزرگ کے سوٹ میں اداس سی اپنی دنیا میں مگن آمنہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ شیراز کی محویت اس وقت ٹوٹی جب ہاشم کسی لڑکے کو پاس بلارہا تھا۔

”یار! یہ جو کونے میں لڑکی بیٹھی ہے کون ہے۔“

ہاشم نے بھی اس کے بارے میں پوچھا۔ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ یہی آمنہ ہو سکتی ہے۔

”وہ اچھا۔ آمنہ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ وہ بھاری نعب باجی کی نند ہے۔ آپ نے۔“

پوچھا؟“ آمنہ کے بارے میں بتانے کے بعد لڑکے نے وضاحت چاہی۔

”کچھ نہیں یا! میں کچھ اور سمجھا تھا تم جاؤ۔“ ہاشم نے اسے ٹال دیا۔

”تو کیا یہی آمنہ ہے۔“ جانے کیوں عجیب سا احساس ہوا۔ شیراز کو۔

”کیوں، مجھ سوچ میں پڑ گئے ہو، مانتے ہوں۔“

ہاشم نے شیراز کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”ہوں، مانتا ہوں۔“ شیراز بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”ارے دیکھو، ساری لڑکیاں باہر نکل گئیں۔ صرف آمنہ ہے کمرے میں۔“

”پھر؟“ شیراز نے اندر دیکھتے ہوئے مختصر کہا۔

”لیکن یا ہاشم۔“ شیراز ہچکچایا۔

”لیکن دیکھیں کچھ نہیں۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ جاؤ، انتقام لینا ہے تو آگے بڑھو۔ چلو۔“ اور پھر ہاشم نے شیراز کو اندر دھکیلا تو آمنہ جو جانے کن خیالوں میں مگن تھی۔ گھبرا کر باہر کی طرف بھاگنے لگی اس کا آنچل کیل کے ساتھ ایک گہلا دو پندرہ سے ڈھلک چکا تھا۔ وہ ہرٹی ایسی آنکھوں میں خوف کے سائے لیے شیراز کو دیکھ رہی تھی۔ شیراز کو جانے کیوں ترس آ گیا۔ وہ اس کا آنچل کیل کی قید سے چھڑانے کے لیے آگے بڑھا تو آمنہ جیچ پڑی۔

”نہیں، میری طرف مت بڑھو۔ میرے آنچل کو ہاتھ نہ لگاؤ۔“

آمنہ نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ شیراز نے ہاتھ بڑھا کر اس کا آنچل کیل سے چھڑا لیا۔

”ان ہاتھوں پر اعتبار کرنا سیکھو۔ آمنہ! یہ لو ان ہاتھوں نے تمہارا آنچل بحفاظت کیل کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔“

شیراز نے ایک بھر پور نگاہ اس کے خوبصورت چہرے پر ڈالی اور ہاتھ میں پکڑا اس کا آنچل اس پر اچھال کر باہر آ گیا آمنہ پھر کرات ہی اس واقعے کے بارے میں سوچتی رہ گئی، آنچل کا الجھنا اس کا اندر آ کر اس کا نام لینا انہوں پر اعتبار، وہ نگاہیں یہ ساری باتیں اس کی سمجھ سے بالاتھیں۔ وہ عرق آلود پیشانی لیے باہر نکل گئی۔

”جا یا! اس نے اندر دھکیلا تھا۔ آنچل کیوں چھوڑ دیا؟“ کم از کم اس وقت تک پڑے رکھتے، جب تک لگی اور تمہارے ہاتھ مجھے آنچل نہ کاٹ چکا تھا۔“

ہاشم نے آتے ہی شیراز کو ٹال ڈالا۔

”نہیں یا ہاشم! ایک تو عورت کا آنچل ہوتا ہی پاکیزہ اور مقدس ہے، اور دوسرے مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔“

”ترس نہیں تمہارا دل آ گیا ہے اس پر۔“ ہاشم نے اس کے سینے پر ہتھ مارا۔

”ہاں شاید۔“ شیراز نے گہرا سانس لے کر گویا شکست قبول کر لی۔

”شاید نہیں یقیناً۔“ تمہارا دل اس پر آ گیا ہے، بس تم لے چکے عالم شاہ سے انتقام۔ لے لیا تم نے سب

کھلا لیا، اپنی زمینیں جائیداد۔ کچھ شرم کرو، زمین عزت ہوتی ہے۔ اور اگر غیرت ہی کسی غیر کے قبضے میں ہو تو تم کو کون کا جگرایے۔ کہ اب تک برداشت کر رہے ہو۔ میری ہوتی تو اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے

میں اس کی لڑکی۔“

”بس! ہاشم آگے کچھ نہ کہنا۔ میری زمین، میری غیرت، عالم شاہ کو اپنی بیٹی کے ساتھ میرے حوالے کرنی

ہو سکتی۔“

شیراز کی غیرت پر چوٹ پڑی تو وہ تھلا اٹھا۔



”خدا یا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پتھر کو بھی جو تک لگی۔ میرا بچہ، میرا فرمان گھروٹ رہا ہے۔ اب جدائی کی گھڑیوں کو مختصر کر دے۔ میرا بچہ مجھ سے ملادے۔“

آغا جی نے گھر میں سب کے سامنے فرمان کو معاف کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اور خود اپنے ہاتھوں فرمان کو واپس آنے کا خط لکھا تھا۔ بی بی جان زیادہ وقت خدا کے حضور سجدے میں گزرا دیتیں۔ گھر میں سب خوش تھے۔ فرمان اور شعاع کی آمد پر، بس سیدہ ہی ایسی تھیں، جن کے دل پر اس خبر سے چھری چل گئی تھی۔ سہ سے تو ان دیکھی نفرت تھی اور یہی نفرت انہوں نے ہوی کی رگوں میں منتقل کر دی تھی۔ اس کے دل پر اپنے چچا اور شعاع کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

”ہونہہ! میں سب جانتی ہوں، اس کی مکاریاں۔ اب لڑکی جوان ہوئی ہے تو آ رہا ہے اسے کراچی کا خاندان کا کوئی اچھا سا لڑکا پھانسی سکے۔ میں تو مر کر بھی اپنے بیٹے کا رشتہ اس ڈائن سے نہ کروں گی۔ جس نے جلا دیا پ نے میری معصوم بہن کو رولایا ہے۔ اور مردہ ماں باپ کو تڑپایا ہے میرا تو خیال ہے، یہ سب کی ملی جلی ہیں کہ بہانے سے فرمان کو باہر بھجا۔ اس نے شادی کر لی تو میرے اور دنیا والوں کے سامنے سچا ہونے کے لیے عاق کر دیا۔ اب کہاں ہے آغا جی کا وہ غصہ۔ وہ عاق نامہ مجھے معلوم تھا، ایک دن ایسا ہی ہوگا۔ لغزش کا پلہ لے کر فرمان کے سارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔“

یہ خبر سیدہ پر۔ بھلی بن کے گری تھی۔ ان کے جومنہ میں آیا بولے گئیں۔

”سیدہ! خدا کے لیے آغا جی کی نیت پر شہ نہ کیا کرو۔ خواجہ خواہ میں گناہ گار ہوتی ہو۔ اچھا ہو۔ مال کہ انہوں نے فرمان کو معاف کر دیا ہے اور ہاشعاع کا سوال تو یہاں کا قح ہے کہ اس گھر کے کسی لڑکے سے الہا نصیب بندھے۔ خدا کو منظور ہوا تو یہی ہوگا۔ ورنہ نہیں۔ ایسی باتیں تو نہ کرو۔“

”واہ بھاجی! دوسرے کے گھر کو جلا دیکھ کرے انسان آگے بڑھ سکتا ہے مگر جب آگ اپنے گھر میں لگے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ پیش کیا چیز ہے۔ آپ کی بہن اجڑتی ناں پھر پتا چلتا۔ پھر میں آپ کی اعلا طری دی بخن۔“

”سیدہ! تم سے تو بات کرنا ہی گناہ ہے۔“

قدسیہ بانو نے مزید الجھتا ہے دھونی بھی اور اٹھ کر چلی گئیں۔ کتنی عجیب بات تھی۔ کہ فرمان کی آمد دروازہ پہلے کے لیے متضاد کیفیات لے کر آئی تھی۔ فرمان کی واپسی کے لیے عانی کی دھڑکتوں نے پہرہوں خدا کے حضور؛ زاری کی تھی۔ صدیوں پر محیط اس فاصلے کی راہوں پر انھوں کے چراغ جلائے تھے۔

اترتی ہوئی شام عالی کو آج بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ عالی کا جی چاہ رہا تھا کہ نو جوان لڑکیوں کی طرح مسکتا کھس آج انہوں نے ایک عرصے بعد آئینے میں اپنا روپ دیکھا۔ ڈھسلی سی چوٹی پشت پر ڈالی اور بالکل نئی آئینکس، اسی وقت یہی کسی کام سے ان کے پاس آیا تو عالی کا یہ ٹکرا روپ اسے بہت بھایا۔

”خالہ جانی! کیا بات ہے، آپ بہت مسرور لگ رہی ہیں۔“

ہوئی کی بات پر عالی نے ایک نظر ہوئی کو دیکھا۔ اب وہ اسے کیا بتائیں کہ اندر کہیں بھارتی لگی ہے۔  
 ”بس، ایسے ہی بے وجہ۔ خوش ہوں، اس خوشی کو میں ابھی کوئی نام نہیں دے سکی۔“ انہوں نے ہوئی سے  
 گل چھپتے جانے۔  
 ”تمہیں؟“ جانی اس بے وفا کی آمد پر تو خوش نہیں۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ ورنہ ایسا رنگ تو خالہ جانی سے

لگ سکتے تھے۔ مریم کا کچھ وہ لگا ہوں میں گھونسنے لگا تھا۔

”نہیں۔ آغاٹی اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ آپ نے آغاٹی، دل کے دروازے اس وقت کھولے ہیں، جب میرے دل کی دنیا اُجڑ چکی ہے۔ نہیں آغاٹی، میں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا، جس کی دلیلیز کوچہ کے لیے میری مریم تڑپتی رہی، ترستی رہی۔“

مریم کی تصویر تھا۔ فرمان جانے تک ایک یادوں کے کھنڈے جھل میں چھلکتے رہے اگر شعاع نہ جالتی۔

”ابو! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“

شعاع نے آگے بڑھ کر فرمان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں بیٹے ٹھیک ہوں، آج ایک مرے بھتیجے کا خط دیکھا ہے تو ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔

ابو! آغاٹی کا خط آیا ہے کیا لکھا ہے انہوں نے۔“

شعاع کی بے چین نظریں سطروں پر دوڑنے لگیں۔

”ہائے، ابو جان! ہمیں آغاٹی نے معاف کر دیا۔ ہم۔ ہم پاکستان جاسکتے ہیں، ابو! ہم پاکستان جانے کے۔ کتنا حرا آئے گا۔ ان سب کے ساتھ رہنے میں۔ ابو! پھر ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ اب دل میں رہا ہے۔ ابو!۔“ شعاع تو خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔ خط پڑھ کر، وہ تہوار چڑھ رہے تھے اسکا گلی تھی۔ وہ ان سب کو رہنا چاہتی تھی، جو اس کے اپنے تھے مگر دور تھے۔

”تمہیں بہت خوشی ہوئی ہے بیٹا یہ پڑھ کر؟“ فرمان نے شعاع کے چہرے سے خوشی کی شعاعوں کو پھونکنے دیکھ کر پوچھا۔

”جی ابو! آپ کو کیا خبر میں نے کتنی دعائیں کی تھیں اور۔ اور عقیقہ بھی کیا تھا، کہ آغاٹی ہمیں معاف کر دیں اور ہم بھی ان سب کے ساتھ مل کر رہیں۔“ خوشی سے شعاع کی آواز لرز گئی تھی۔ آج اسے ہوا چوری کیے جانے والے دلیقوں کا شرم لگ گیا تھا تو وہ خوش کیوں نہ ہوئی۔ فرمان چپ ہو گئے۔

”تم وہاں جانا چاہتی ہو شعاع؟“

”جی ابو! جلد از جلد جانا چاہتی ہوں۔ مگر یہ آپ نے کیا کہا۔ آپ نہیں جانا چاہتے کیا؟“ شعاع رک کر فرمان کو دیکھنے لگی، جن کے چہرے پر صدیوں کی محنتیں چھائی ہوئی تھیں۔

”نہیں بیٹے! میں شاید نہ جاسکوں؟“

”کیوں۔ کیوں ابو! اتنی دعاؤں کے بعد تو یہ گھڑی آئی ہے، اور آپ نہیں جا رہے۔ ابو! ہم نہ جائیں گے، اب تو آغاٹی نے معاف کر دیا ہے تو پھر یہ تیار ہونے کیسی۔“

شعاع الجھ پڑی۔ اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ بات ہرگز نہیں آئی تھی۔

”ہاں بیٹے! میں گھر لوٹ کر ضرور آؤں گا لیکن ابھی نہیں۔ مٹی بھی بھلا اپنے خیر سے جدا رہ سکتی ہے؟ ابھی نہیں۔“ فرمان سنبھل چکے تھے۔

”کیوں ابھی کیا ہے ابو!؟“ شعاع کی کیوں برفرا تھی۔

”اس لیے میری بیٹی کہ مجھے اپنے ایک دشمن کی تلاش ہے، جب تک وہ نہیں مل جاتا۔ ہر خوشی مجھے ہے۔ میں۔ میں اسے زندگی کے آخری دم تک تلاش کروں گا۔ اگر وہ اسی زمین پر ہے تو۔ تو اسے

لہیں۔“

فرمان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”دشمن۔ ابو! آپ کا ایسا کون سا دشمن ہے کہ جس سے آپ کو اس حد تک نفرت ہے۔“

شعاع نے فرمان کو پہلی بار جلال میں دیکھا تھا۔ اور کسی دشمن کا انکشاف اس کے لیے نیا تھا۔

”ہے ایک ذلیل نرس جس نے میرے اور مریم کے جگر کو کاٹ ڈالا ہے۔“

فرمان کا بس چلا تو اس دشمن کو چبا جاتے۔

”نرس؟ کون نرس لہ؟“ شعاع نے حیران نظروں سے فرمان کو دیکھا۔ تو فرمان گویا سنبھل سے گئے۔

”تم اسے نہیں جانتیں بیٹا۔ اسے میں نے مریم کی حار داری کے لیے رکھا تھا۔ اس نے تمہاری امی کی خدمت کی تھی۔ لیکن جب تم لوگ۔ میرا مطلب ہے تم پیدا ہوئیں تو وہ اپنی خدمت کے معاوضے کے طور پر ہمارے جگر کاٹ کر لے گئی۔ نہیں میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا، اسے نہیں چھوڑوں گا۔“

”آپ کی یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں لہ۔“

ان کی باتوں نے شعاع کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔

”ابھی تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم تیار کر لو۔ پاکستان جانے کی۔ مجھے امید ہے تم وہاں بہت ڈر رہو گی۔“

”آپ کے بغیر ابو!؟ آپ کے بغیر تو میری ہر خوشی ادھوری ہے۔“ شعاع باپ کے ساتھ لگ کر سسک

اٹکی۔

”میرا تم سے وعدہ ہے بیٹے! جب میری تلاش ختم ہوگی۔ میرا دشمن مجھے مل گیا تو۔ تو تمہاری خوشیوں کو دلا کر نے ضرور آؤں گا۔ تم وہاں بہت خوش رہو گی۔ اتنی بے شمار محبتیں ملیں گی۔ ڈیر سارے کزنز ہیں۔ آغاٹی لہا لہا جان۔ اور۔ اور عالی!“

فرمان رک گئے، جیسے بہتے پانی کے آگے بند ہا عہد دیا گیا ہو۔

”ہاں شعاع! وہاں تمہیں کچھ لوگوں کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑے گا اور جب مخالفتوں کی دھوپ تیز ہوئے تو۔ تو عالی کی محبت کی چھاؤں میں آ جانا۔ پرسکون ہو جاؤ گی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا دل اور ظرف عطا کیا ہے، جب پھر نے لگو تو اس کی گود میں پناہ لے لیتا۔ محفوظ ہو جاؤ گی۔“

فرمان کے دل میں عالی کے لیے ایسے کوئی جذبہ نہیں تھا جسے عرف عام میں محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر لمحہ ان کو عالی پر اندھا احسان تھا۔ اس کی محبت پر ایسا بھروسہ تھا کہ اتنا ان کو اپنی ذات پر بھی نہیں ہوا تھا۔

”تو وہاں۔ میں نے اپنی تمام جائیداد کے کاغذات تیار کر لیے ہیں۔ وہ سب تمہارے نام ہے۔“

”ابو! مجھے کچھ نہیں چاہیے سوائے آپ کے۔“ شعاع نے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے۔

”بیٹا! یہ دیکھنا ہے، اور اس کے قصص کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ میں بھی تمہارا ہوں، مگر یہ جائیداد تمہارے نام نہیں ہے جب تک میری تلاش ختم نہیں ہوتی، میں کچھ نہیں کر سکتا، دعا کرو، میرا دشمن جلد مل جائے، میں جلد اسے نکال دوں۔ لہا لہا جان کو کھلی دینا اور کہنا کہ اگر وہ بیٹے کی ماں ہیں تو میں بیٹی کا باپ ہوں۔ خدا وہ گھڑیاں نکالے گا۔ جب ایک ماں اور ایک باپ کی پیاس بجھ جائے۔ اپنے آپ کو کھڑو یا اکیلا نہ سمجھتا۔ میں زندہ ہوں۔

میں۔ میں اسے زندگی کے آخری دم تک تلاش کروں گا۔ اگر وہ اسی زمین پر ہے تو۔ تو اسے





رہی تھی۔ چاری امی، ابوسب بری طرح یاد آرہے تھے، اور پھر وہ آئندہ ملنے والوں کے بارے میں کہہ کر وہ لوگ کیسے ہوں گے۔ جانے اسے کس طرح اپنا نہیں۔ کیسی عجیبیں اور نفرتیں ہوں گی۔ جانے کون کسے پہچان پائے گی۔ وہ یہ ساری باتیں سوچ سوچ کر نزد ہورہی تھی، کتنا شوق تھا اسے اپنے جانے کا۔ انہوں سے ملنے کا۔ اب جب سب قریب تھا تو ہاتھوں میں گھبراہٹ سے نمی اتر آئی تھی۔ فلاحیت ایک گھنٹہ لیٹ تھی، سب کے منع کرنے کے باوجود بھی شرعی بولی اور نوبی ایر پورٹ پر آگئے۔ اور اب آنے جانے والوں پر فخرے کس رہے تھے، کچھ تو برداشت کر کے بڑھ جاتے۔ اور کوئی اگر مڑ کر ہاتھ دلا پر واپس کر بیٹھی بجائے مٹتے ایسے میں ایک لڑکی گھبراہٹ ہوئی ان کی طرف بڑھی۔

”بچے، پرواز کے بارے میں آپ کو کچھ علم ہے؟“

”ہائیں پرویز۔ جی ہم میں سے کسی کا نام پرویز نہیں۔“

شرعی نے بولی کو دیکھ کر آنکھ دبا کی۔

”سٹر امیں فلاحیت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“ لڑکی بلند آواز میں بولی۔

”بھائی میاں! لڑکی کچھ کہہ رہی ہے شاید!۔“ نوبی شوخی سے بولا۔

”ہاں بھئی! اونٹ تو بچے دکھائی دیتے ہیں۔ پر کیا کہہ رہی ہے خبر نہیں۔“ نوبی نے مسخرے پن سے کہا۔ تو لڑکی بولی۔

”بھائی امیں آپ سے جہاز کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“

”راشو بھئی! آپ کی بہن آپ سے کچھ پوچھ رہی ہے۔“

نہیں نے مسخرے پن سے لڑکی کو راشو کی طرف بھیج دیا تو راشو نے لڑکی کو ساری بات بتادی، وہ شکر یہ ادا کر دی۔

”ہاں آجاؤ۔ کسی دن بری طرح پٹ جاؤ گے۔“ راشو نے ان سب کو ڈانٹ دیا۔

جہاز لینڈ کر چکا تھا، سب دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھے۔ شعاع کی تو عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ وہ بے پروا ہو رہی تھی۔ جانے کون لینے آیا ہو۔ کیسے پہچان پائے گی۔

”ایسا کہو شرعی بولی اور بولی ایک طرف چلے جائیں۔ اور ہم دوسری طرف تاکہ شعاع کو ڈھونڈنے میں ملے۔“

”نہیں راشو بھئی! تصویر تو ایک ہے، آپ رکھیں گے کہ ہم۔“ شرعی نے مڑ کر کہا۔

”نہیں، ہمیں تو نقش حفظ ہو چکے ہیں۔ تصویر تم لوگ رکھو۔“

اشعر نے پھر شوخی سے راشو کو دیکھا۔ پھر شعاع کی تلاش میں نکل گئے۔

”وہ شرعی دیکھو۔ وہ لڑکی جس کے گلابی کپڑے۔“ ہاں۔“ شعاع۔ آؤ۔“ نوبی نے شعاع کو دیکھ کر کہا۔

”ہاں یار! ایسا ہیں۔ آؤ دیکھو۔“ اشعر اور راشو بھی اسی نظر نہیں پڑی۔

”وہ شعاع کی طرف بڑھے تو وہ اپنی طرف دو دو جوانوں کو بڑھتا دیکھ کر ٹھٹھکی گئی۔

”آپ۔ آپ لوگ کون ہیں؟ سہرے بھائی تو نہیں؟“

”شعاع گھبراہٹ، اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”کون بھائی۔ کیسا بھائی؟ لڑکی ہمیں تمہارے بارے میں ساری اطلاعات مل چکی ہیں۔ تم شعاع ہو

”کیا بد تمیزی ہے یار۔ اتنا خوبصورت رومینک۔ موڈ آیا ہوا ہے۔ مت ڈسٹرب کرو۔“ ہوی اکیلی مطالعے میں غرق بولا۔

”ہوی کے بچے ایذا خطرناک موڈ ہے۔“ اب کے اشعر نے کہا اور پاس پڑا کشن ہوی کی طرف اٹھ کر کشن رحمن کو جاگا۔ جو ہوی سے ناول لینے کو جھٹکے تھے۔ پھر کیا تھا۔ شامت ہی تو آگئی سب کی۔

”یہ تم میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہونا۔“ رحمن کا نزلہ ہوی پر گر رہا تھا۔

”جی نہیں۔ جی ہاں۔“ ہوی تو اس افتاد پر گھبرا گیا۔

”اسی لیے رومینک ناول پڑھے جارہے ہیں۔ رومینک موڈ پر سب کو روکا جا رہا ہے۔ ذرا میں۔“ رومینک موڈ دیکھوں۔“

ہوی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ بری طرح گھبرا گیا، کہ انہوں نے ناول پڑھ لیا تو لینے کے دیے پڑ جائے۔ اس نے، امداد طلب نظروں سے اشعر کو اور راشو کو دیکھا۔ راشو تیزی سے رحمن کی نظر بچا کر باہر نکل گیا۔ اور اس سے قبل کہ وہ رومینک موڈ پر آتے راشو پھر حاضر تھا۔

”وہ چچا جان! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

”ہاں، میں بھی تم لوگوں سے کچھ کہنے ہی آیا تھا مگر؟“ رحمن راشو کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”جی جی حکم چچا کیسے ناں۔“

اشعر نے موقع پا کر ناول ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ مارے ہنسی کے صدف کے پین میں پڑ رہے تھے کہ اب کیسے جھیکے پلے بنے ہوئے ہیں۔

”ہاں، میں کہنے آیا تھا کہ کل شعاع آ رہی ہے اور ہم لوگ تو بے حد مصروف ہیں، راشو، ہوی اور اشعر ایر پورٹ جا کر اسے ریسو کرو گے۔“

شعاع کے نام سے ایک حتیٰ ہی ہوی کے چہرے پر آگئی۔

”کیوں پھر میں بے فکر ہو جاؤں؟“ رحمن نے باری باری ان تینوں کو دیکھا۔

”سوری ابو! مجھے کالج جانا ہے۔ میں تو نہیں جاسکتا۔“ ہوی نے کورا جواب دے دیا تو رحمن دھکی ہوئے۔

”کوئی بات نہیں۔ اصل میں قصور میرا ہی ہے کہ تمہیں جانتے ہوئے بھی کہہ دیا۔ تم لوگوں کو نوکرا اعتراض نہیں۔“ رحمن نے اشعر اور راشو کی طرف دیکھا۔

”جی نہیں چچا جان۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہم چلے جائیں گے۔“ راشو کے اطمینان سے رحمن مطمئن ہو کر گئے۔ کیونکہ راشو اور اشعر گھر کے ذمہ دار لڑکے تھے۔

”بھئی، راشو کے علاوہ جو جانا چاہے، وہ چلے۔“ اشعر نے شوخی سے راشو کو دیکھا۔

”کیوں، میں ضرور جاؤں گا۔ میں چچا جان کے حکم سے سرتابی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ راشو جلدی سے بولا۔

”ہاں اور حکم بھی ایسا کہ جس میں دل کی خواہش کا زیادہ دخل ہو۔“

اشعر اسے بار بار چھیڑ رہا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ راشو نے ایک سے زائد بار شعاع کی تصویر دیکھ لی۔ جب سے اشعر اسے چھیڑ رہا تھا۔ راشو بھی مسکرا رہا تھا۔



شعاع کو فرمان نے بھیگی آنکھوں سے جہاز پر بٹھایا تھا۔ جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھی شعاع کو بھیگی

اور فرمان نامی شخص کی بیٹی ہو۔ اور ہر وٹن لے کر آئی ہو۔ بتاؤ کتنے کلو ہے؟“

”جی۔“ شعاع بولی کی اسے شرارت پر تقریباً بے ہوش ہو چکی تھی۔

”گندھے ہو ایک دم، شعاع ہاجی۔ شعاع ہاجی! ہوش میں آئے۔ ہم ہیں آپ کے بھائی۔ آئے ہیں۔“ بولی اور بولی پریشان ہو گئے۔

مگر شعاع کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسی وقت اشعر اور راشو بھی آ گئے۔

”السلام و علیکم شعاع! ہم آئے ہیں تمہیں لینے۔ ان بد تمیزوں نے یقیناً تمہیں کچھ کہا ہوگا۔ مگر

تو تمہارے اپنے ہیں۔“

اور پھر اشعر نے اسے یقین دلایا تب کہیں شعاع کو یقین آیا۔ اس دوران راشو ایک تک گلابی

لبی سہی شعاع کو دیکھے گیا۔

تم کو دیکھا تو نظریں یہ کہنے لگیں

ہم کو چہرے سے ہٹا گوارا نہیں

اشعر۔ اس کے کان میں گنگناٹا تو راشو جھینپ کر سیدھا ہو گیا۔ ایر پورٹ سے فراغت کے ہونے

کے درمیان چلتی ہوئی گاڑی کی طرف آگئی۔ اسے بے حد خوشی ہو رہی تھی، ان سب سے مل کر ادھر سے

شورخ ہاتھیں، اور آٹس کی نوک جھونک اسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔ پورج سے گاڑی کا بارن چلا باز

باہر نکل آئے۔



”خبردار! جو کسی نے چھوڑین کا مظاہرہ کیا ہو تو۔ تم لوگوں کی تو عادت ہے کسی پر مرنے کی۔“ ہوی

ب کو تنبیہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

”اور خود تصویر دیکھ کر ہی فنا ہو گئے تھے۔“

جانے کس کو نے سے آواز آئی۔ ہوی نے سنی مگر پھر بھی آگے بڑھ گیا۔ وہ شعاع کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا

شعاع سب سے باری باری مل رہی تھی۔ سب کی آنکھیں اٹکھار رہی تھیں۔ آغا جی کے گلے لگ کر تو شعاع

انہ کے ہند ہی ٹوٹ گئے۔ وہ روتی چلی گئی۔ شعاع کو دیکھ کر آغا جی کے سارے غم ہرے ہو گئے۔ وہ شعاع

پچھے رہے، ان کو لگا۔ جیسے فرمان ان کے سامنے ہوں۔ وہ اتنا جذباتی کبھی نہیں ہوئے تھے۔ جتنے اب ہو

رہے۔

”شعاع۔ شعاع میری بیٹی۔ میرے فرمان کی بیٹی۔“

”آغا جی۔ آغا جی۔“ رحمن نے بڑھ کر گرتے ہوئے آغا جی کو تمام لیا۔

شعاع کو دیکھ کر آغا جی اتنے جذباتی ہو گئے کہ ان کو خود پر اختیار نہ رہا۔ ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ وہ لاکھ اصول

ٹھکی۔ تھے تو باپ۔ آج شعاع کو تنہا دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکے اور اسے ساتھ لگا کر کتنی ہی دیر وہ روتے

بدلتے ان کی اتنی طبیعت بگڑی کہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ ڈاکٹر نے معاینہ کے بعد مکمل آرام کا مشورہ دیا تو آغا جی کو

ٹمک کرے میں پہنچا دیا گیا اور اب وہ غنودگی میں پڑے تھے۔

”گوست کا آغاز تو ہو گیا ہے۔ آگے خدا جانے۔“

نہو نے آہستگی سے خاموش کھڑی شعاع کو دیکھا جو اس صورت حال سے بہت پریشان ہو گئی تھی۔

لہذا اسے تنہا ہی لگا ہوں سے سیدھا کو دیکھا مگر وہ ہر بات نظر انداز کرتی باہر نکل گئیں۔

سب ہی بڑی چاہت سے پیش آئے تھے۔ سب ملے تو جانے کیوں محبتوں کے اس جہوم میں وہ خود کو تنہا سا

لگا رہنے لگی۔ ابھی فی الحال اس نے صرف ان سب کو دیکھا تھا۔ رشتوں کے ساتھ تعارف نہیں ہوا تھا۔ مگر

اتنا ضرور تھا۔ بزرگ خواتین قدیہ بانو اور مردوں میں رحمن نے کچھ اس طرح پیار کیا تھا کہ وہ مگنی۔ سیدہ بیگم کے چہرے پر پھیلے تاؤ کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ یہی نفرت کا وہ محاذ ہے جس کی نشاندہی کرنے کی تھی۔

شعاع باجی! اب ہماری طرف بھی آجائیے۔ یہاں بھی آپ کے پرستار آپ سے شرف ملاؤ گے لیے موجود ہیں۔“

شرابی بے تکلفی سے شعاع کا ہاتھ پکڑ کر بزرگوں کے جھرمٹ سے اسے نکال لایا اور کھینچ کر ان میں جہاں اس کے سارے کزنز موجود تھے لے آیا۔ سب نے کچھ اس انداز میں دانا نہ پن سے اس کا ذکر کیا کہ وہ جھینپ گئی۔

”شعاع! یہاں آ جاؤ۔“

”نہیں، شعاع باجی یہاں آ جائیں۔“

ہر کوئی اسے اپنی طرف منھ رخ رہا تھا۔ یہ سب شعاع کے لیے نیا بھی تھا اور مسرور کن بھی۔ وہ بہت زیادہ ”شعاع باجی آپ ہمارے پاس تشریف رکھیے۔ میں اس ریزگاری سے آپ کا تعارف کراتا ہوں۔ ہدایت شیدائیوں کے لیے یہ ہے کہ جس کا نام لوں، ادب سے آ کر ان سے ہاتھ ملا کر اپنا مودہ جائے۔“ دانی نے شعاع کو ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں، ہمیں اعتراض ہے۔“ بولی چیخا۔

”اچھا بیٹے، اپنی جگہ نہیں کسی دوسرے کی جگہ پر بیٹھ جانا۔“

”یہ بات نہیں۔ ہم زرا نے کو تعارف کرانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ دانی اپنے بہت زیادہ قد کی وجہ سے اکثر زرا فہلا تا۔

”سوری! کسی گدھے کو ہم بھی تعارف کی اجازت نہیں دے سکتے۔“

”یا وحشت! کیا مشکل ہے۔ ہر بات میں لڑنے لگتے ہو۔ شعاع تھکی ہوئی۔ اسے آرام بھی کرنا چاہی۔ جلدی۔ جلدی سے تعارف کرا دیتی ہوں۔“

حنا نے بڑا پن دکھاتے ہوئے جھگڑا ختم کرنا چاہا۔

”پر کیتھوں کتابا باجی! آپ تو تعارف کراتے کراتے خرچ ہو جائیں گی۔ پرسانوں کی۔“

بولی نے فی دی پروگرام کلیاں کے ایک کردار کی نقل اتاری تو شعاع بے ساختہ ہنس پڑی۔ تعارف کا سہرا ہر کوئی اپنے سر لیتا چاہتا تھا۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ شعاع اس دلچسپ صورت حال سے معظوظ ہوئی تھی۔ آخر میں صدف کی تجویز پر پرچیاں نکالی گئیں۔ جن میں یاسر کا نام آیا تو وہ اکثر تباہ ہوا کرتا تھا شعاع کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”جس کو جلنا ہو جل لے۔“ یاسر نے شرارت سے راشو اور اشعری طرف دیکھا کیونکہ وہی شعاع کے مقابلے کے تھے۔ دونوں مسکرا دیے۔

”جی تو شعاع باجی! سب سے بڑا۔ لقمان ماموں! آپ کے تایا جان ہیں۔ ان کے بڑے بچے اور فہیم ہیں۔ اس وقت گھر پر نہیں۔ بہر حال سارا رو بیٹھ جھا بھی، ان کی بیگمات ہیں۔ ان کے بارے میں

کہ پرانی بیویاں ہیں لیکن ایک بات ہے۔ ہیں بڑی زندہ دل۔ جب شغل میلہ لگاتی ہیں تو محلے کی لڑکیاں آتے ہیں۔“

”کومت۔“ شائلہ بھابھی نے یاسر کے ایک چپٹ لگائی اور شعاع کو ساتھ لگا لیا۔

”اور پھر یہ نادیہ، نازیہ ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اکثر اکیلے میں ملاقات ہو جاتی اور جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے!“

اس نے نادیہ اور نازیہ کی طرف دیکھا جو منہ پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

”ارے! اہلکھلوں کے نانا! نانیہ بندہ کس کھاتے میں جائے گا۔؟“

اشعر نے زور سے بول کر راشو کی طرف اشارہ کیا۔

”سم سے بڑے بے صبرے ہیں۔ خاص خاص چیزوں کا بعد میں تعارف ہوتا ہے۔ خیر شعاع باجی، یہ ہاموں کے سپوت ہیں پانچوں شرعی خوبیاں ان میں ہیں، ضرورت سے زیادہ شریف ہیں۔ شاعر

نواز میں سوز ہے مگر زرد نہیں۔“

”فکر نہ کرو بیٹے! اب آ جائے گا۔“ اشعر نے شوخی سے کہا۔ شعاع نے ایک نظر راشو کو دیکھا جو اسے ہی دانا تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔ ان سب سے مل کر، اوپر سے یاسر کا تعارف

انے کا دلچسپ انداز بہت بھار تھا اسے۔

”اور یہ بڑے ماموں کا آخری بیٹا عدنان میاں ہیں۔ یہ کیا چیز ہیں۔ آئندہ کہانی میں آپ کو پتا چلے گا۔“ شعاع باجی کو پانی پلایا جائے۔“

یاسر نے کچھ دیر ہاپے کی ایکٹنگ کی اور پھر کھڑا ہو گیا۔

”جی تو اس کے بعد۔“

”اور باغزو! میں کہیں جاؤں گی۔“

صدف اپنا تعارف گول ہونے پر چھ پڑی۔

”آپ بغیر ویزے کے جہنم میں جائیں گی۔ بہر حال اب ہماری یہ عزت رہ گئی ہے کہ ایسی ویسی چیزوں کا تعارف بھی کرا لیں۔“ شعاع باجی یہ راشو بٹھایا سے چھوٹی چل ہیں۔ یہ ایسی چیز ہیں کہ شرعی اور بولی جیسے بھی ان

”بیٹے میری مٹی سے تو گزرتا اب کی بار پلکیں اتار کر تھیلی پر بند رکھ دیں تو کہتا۔“ شرابی نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

”کچھ ہی ہیں آپ۔ اس گھر میں ایک معزز انسان کی عزت یہ ہے۔ ابھی تو یاسین ماموں کے بچوں کا تعارف ہی ہے۔ اللہ معاف کرے، خدا ایسے لائے سیدھے بچے کسی کو نہ دے۔ میرے ہوتے تو ایک ایک کا سر

لوٹے پر بٹھا کر تیر کراتا۔ وہ دیکھیں، وہ جو لمبوتری سی بے ہنگم سی چیز دیکھ رہی ہیں ناں! جو مسلسل حنا لگاتا رہے ہیں۔ ان کی اسی حرکت نے ان کو زمانے میں اچھا خاصا رسوا کر دیا۔ بڑے سپوت ہیں یسین

”کے کتابا باجی کی بد قسمتی کہ ان کے مگھیر ہیں۔ مگر اکثر لڑکیاں اس خوش فہمی میں ہیں کہ صرف وہی۔“

”اس کے بچے۔“ اشعر نے ایک زوردار گھونسا سر کو مارنا چاہا مگر وہ نیچے بیٹھ گیا اور مکا دانی کے جا لگا۔

ان لوگوں نے بھی بدلہ لے لیا۔ شعاع مسکراتی رہی۔ پھر یاسر نے مصنوعی آواز میں رونا شروع کر دیا۔  
 ”کیوں اب کیا ہوا؟ کیوں رورہے ہو۔؟“  
 ”روؤں تو کیا بھگڑاؤ الوں۔ ہر خوبصورت لڑکی کو میرا بزرگ بنا دیا جاتا ہے۔ ملکہ حسن عالی آنٹی کو آنٹی  
 ہوتا ہائی شعاع ہائی۔ ہائے میری قسمت۔ باقی کچھ بے کو جو مرضی کہہ لو۔“  
 اس نے باقی لڑکیوں کو دیکھ کر کہا اور پھر ایک دم اٹھ کر بھاگ گیا۔  
 ”کیوں شعاع کیسے لگے ہم لوگ تمہیں۔؟“ حنائے پیار سے شعاع کو دیکھا۔  
 ”بہت پیارے، اتنے اچھے حنا ہائی کہ اب احساس ہو رہا ہے کہ اتنی زندگی جو آپ لوگوں کے بغیر گزری  
 حنائے ہو گئی ہے۔ محبتوں کے اس لطیف احساس کو میں نے پہلی بار محسوس کیا ہے۔“  
 ”مہر آواز کی لہروں پر الفاظ ابھر کر سماعتوں میں اتر گئے۔  
 ”وہ کیا کہتے ہیں کہ ایسی آواز سن کر مندروں کی گھنٹیاں یاد آتی ہیں۔ ہے ناں۔“ اشعر نے شونی سے راٹھ  
 لکھا۔

”اشعر اسدھر جاؤ۔ کیوں بے موت مرنے چاہتے ہو۔“ راشونے ایک گھونٹا آہستگی سے اس کے شانے پر  
 شعاع خوش تھی۔ آغا تھی اور بی بی جان فرمان کی باتیں کرتے رہتے۔ بی بی جان تو ہر وقت اس سے فرمان  
 لیا نہیں پوچھتی رہتیں۔  
 ”بی بی جان میری خود کچھ میں نہیں آتا کہ اب کیوں نہیں آئے۔ آخر ان کا کون دشمن ایسا ہے کہ وہ اس کی  
 لاش کو زندگی پر فوقیت دیتے ہیں۔“

”خدا اسے اس کے مقصد میں کامیاب کرے۔ اس کا کلیجہ بھرا خدا ہو اور خدا میری ممتا کی آگ بھی  
 بجائے۔ میری بی بی میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم میرے پاس آؤ گی۔“  
 آغا تھی نے گھر میں یہ بات سب کے گوش گزار کر دی تھی کہ شعاع کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ وہ اب تک ان  
 لکبت سے محروم رہی ہے، اس لیے اب سب سے زیادہ اسی کا خیال رکھا جائے گا۔  
 ”ہاں تو ہوتا ہی تھا۔ ارے میں سب سمجھتی ہوں، ڈرامہ بازی ہے۔ کیسے سینے سے لگا لیا ہے پوتی کو  
 ہاں ہاں بڑا ہوا ہوئی ہوئی تو میں پوچھتی۔ میری بہن۔ کیا ہے۔ کس کو دکھا تھا اس کے زخموں پر تنک پاشی کے لیے  
 ہاں ہاں پوتی کو؟“

سیدہ بیگم شعاع کو کوس رہی تھیں اور اس کا آنا سسرال کا ڈرامہ تصور کر رہی تھیں۔ قدسہ بانوں نے سب  
 کو روک لیا۔ کچھ نہیں اٹھ کر چل دیں۔ شعاع کو پہلے ہی روز اندازہ ہو گیا تھا کہ سیدہ بیگم اس کے لیے دل میں کیا  
 فیصلہ رکھتی ہیں۔ اسے آئے دو روز ہو گئے تھے۔ نہ تو ہوا نظر آیا تھا اور نہ ہی وہ چاہنے کے باوجود عالی سے مل  
 سکی تھی۔ ایک دو بار صدف اور شفق سے کہا مگر وہ ٹال گئیں۔ اس روز وہ آغا تھی کے کمرے سے نکل کر راہ داری سے  
 لڑی تھی کہ تیزی سے آنے والے ہوا سے ٹکراتے ٹکراتے پہنچی۔ دونوں رک کر ایک دوسرے کو دیکھنے  
 لگیں۔ ہوا شعاع کو دیکھتا رہا، پھر ایک دم اس کے چہرے پر تباہ پیدا ہو گیا۔ آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا۔  
 ”اوہو تو کراؤ ہو گیا شعاع باجی! یہ ہی ہیں ہماری خاص چیز ہوا بھیا۔ اور ہوا بھیا! یہ شعاع باجی ہیں  
 ان کی ہوا۔“

”آپ خیال مت کیجیے گا شعاع باجی! یہ بڑی بد لحاظ قوم ہے۔ آپ آگے آئیے۔“  
 ”بس یاد رہے۔“ نوبی کھسک کر یاسر کے مزید قریب ہو گیا۔  
 ”یہ قوم ترقی نہیں کر سکتی جس میں ایسے جاہل لوگ ہوں۔ خیر، آپ سینے۔ وہ جو کونے میں راٹھ رہا  
 ساتھ سینے سے پیٹتے ہیں ناں۔ اشعر بھائی ہیں۔ حال ہی میں ان کو کچھ گیری کا مرض لاحق ہوا ہے۔“  
 ”شعاع! یقیناً تمہیں مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔“  
 اشعر نے اپنا بڑا سا ہاتھ شعاع کی طرف بڑھایا تو وہ جھجک گئی۔  
 ”شعاع باجی ہاتھ ملائیں۔ یہ ہاتھ چھو دیں گے۔ ان کی ضمانت میں دیتا ہوں۔“  
 ”بکو اس نہ کرو، شعاع میری چھوٹی بہن ہے۔“  
 اشعر نے بزرگانہ انداز میں وہی ہاتھ شعاع کے سر پر رکھ دیا۔  
 ”مہر یہ شفیق، افاق ہیں۔ گھبراہٹے نہیں۔ یہ آپ کو منہ نہیں چڑا رہی ہیں۔ ان کے منہ کی چھپ ہی لگی  
 جیسے کسی کو منہ چڑا رہی ہوں۔“

یاسر کا یہ کہنا تھا کہ شفیق اور افاق نے ل کر اسے سمجھنا شروع کر دیا۔  
 ”بہنوں چھوڑ دو۔ اس کے سائز کے کان تو مارکیٹ میں ملتے بھی نہیں۔“ نوبی نے کچھ کر یاسر کو چھوڑا  
 وہ باز کہاں آنے والا تھا۔

”سب سے چھوٹے شریل صاحب ہیں جن کی شرافت کی اس سے بھی نہیں دیتی۔“  
 پھر وہ شریکی کے حملے سے بچنے کے لیے شعاع کے پیچھے ہو گیا۔ وہ ہنس پڑی۔  
 ”اب مغلیہ خاندان یعنی رحمن ماموں کی باری ہے۔ بڑے جہانگیر بھائی اور حنا باجی ماموں جان  
 اور کچھوے کے بچے زیادہ لگتے ہیں۔ بے حد بے ضرر ہیں۔ ان کا عدم اور وجود اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کے بعد  
 آفت چیز ہے، اکثر، بد تمیز، دھانسو اور نہ جانے کیا کیا ہوی بھیا۔ ہم سب کی خوش بختی کہ اس مغل  
 ہیں۔ مگر ایک بات ہے۔ چیز وہ بڑی اچھی ہیں۔ خوبہ اور اسماٹ۔ ان کے بعد اپنا یہ یار باہر ہے۔“  
 باہر اور یاسر کی آپس میں خوب دوستی تھی۔ اس لیے اس نے اس کا تعارف اچھے الفاظ میں کر لیا۔  
 ”اور پھر یہ خاندان بھری چھوٹی گڑیا جس کے بارے میں ان کی بہنوں کا خیال ہے کہ یہ کھانسی کا  
 اور جاسوس ٹائپ کوئی چیز ہیں۔ واللہ اعلم! اب باری ہے ہماری بڑی خالہ جان اور آپ کی چھوٹی۔“

فائزہ ان کی بیٹیاں ہیں پھر شعیب اور ضیہ ہیں۔ اب کیا کہوں۔ خالہ جان اکثر آہ بھر کر کہا کرتی ہیں کہ  
 میرے کون سے گناہ تھے کہ مجھے ایسی اولاد ملی۔ اس کے بعد ہماری اماں کی باری ہے۔ ان کی ایک بیٹی ہے  
 اور دوسرا یہ شہزادہ گفام، خوب رو، وجہہ اور رخ روشن والا۔“  
 ”ناں۔ ناں بچے! حیرت انگیز ہم کرائیں گے۔“  
 شریکی اور بوبی نے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”شعاع باجی یہ وہ چیز ہے کہ شیطان بھی کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ اوّل نمبر کا پتھر باز ہے۔ لڑکیوں کو  
 بیٹیاں بھانا۔ سفندی آج ہیں بھرتا اور جواب میں بے بھاد کی جوتیاں کھانا۔ مگر بھر میں شرارتوں کو ختم دیتا ہے۔  
 ان ہی کے دائیں ہاتھ کے کارنامے ہیں۔“



”پھر میں کیا کروں، یہ اعزاز ہو گا تم لوگوں کے لیے۔ میرے لیے نہیں۔“

ہوی نے شرعی کو کھکا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔ ایک تیز نگاہ شعاع پر ڈالی اور آگے بڑھ کر ہر شرمندہ سا ہو گیا۔

”اصل میں ان کا موڈ آف تھا شعاع باجی اور نہ بڑے اچھے ہیں ہوی بھیا! وہ شرمندہ لچھے میں شعاع دکھ سے مسکرا پڑی۔

”کسی تو جیہد کی ضرورت نہیں میرے بھیا! میں سمجھ گئی ہوں۔“

ہوی سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اب وہ عالی آئی سے ملتا چاہتی تھی جسے اس کے ابو نے اس کے لیے ہر چھاؤں قرار دیا تھا۔ اس شام وہ اکیلی ہی عالی کے کمرے کو تلاش کرنے لگی۔ اتنی بڑی لکھی میں کمرے کی حساب تھے۔ ہر کمرے میں جھانکنا بھی مناسب نہ تھا۔ اس نے ملازمہ نرسن سے پوچھا تو اس نے ہائی دروازے پر لاکھڑا کیا۔

”یہ ہے جی عالی بی بی کا کمرہ میں جاؤں؟“ وہ اجازت مانگ رہی تھی۔

”ہاں جاؤ۔“ شعاع دروازہ کھلا پا کر اندر آ گئی۔ عالی اس وقت ایزی جیئر پر دروازہ چلی آئی خاموش بیٹھی چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ شعاع ان سے پوچھنا چلی پر کھڑی ہو گئی۔ ان کی نظریں اس پر پڑیں اور چونکیں نہ اٹھ کر اس کے قریب آئیں نہ اسے پاس بلایا۔ بس ایک ننگ دیکھے چلی گئیں۔ پھر شعاع نے ٹھہرا کہ ان کے چہرے پر تناؤ سا آتا گیا۔ وہ ہڈیاں انداز میں اس کی طرف بڑھیں تو وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔

”تم۔ تم شعاع ہوتاں۔ فرمان کی بیٹی۔ ہاں اسی فرمان کی جو۔ جو مجھے انتظار کی آگ میں جلتا ہوا۔ فرمان کہاں ہے۔ وہ کہاں کھو گیا؟“

عالی کو خود پر قابو نہیں رہا۔ وہ زور زور سے جھلانے لگیں۔ ساتھ ہی ان کے دماغ کی رینگیں لگیں۔ شعاع بری طرح گھبرا گئی۔ وہ عالی کو بمشکل بستر تک لائی۔ دوسری ٹیسوں کے باعث تڑپ رہی تھی۔

”خدا یا میں کیا کروں؟ یہ سب کیا ہو گیا۔ آئی یہ پانی پی لیجیے۔“

شعاع رو دینے کو تھی۔ اس نے گلاس عالی کی طرف بڑھایا۔ اسی وقت سیدہ اور ہوی اندر آئے۔

بمجمع ہو گیا۔

”عالی میری جان، میری بد نصیب بہن، میں کہاں سے لائیں تیرے لیے خوشیاں۔ ہمارے نصیب ہوتے تو ماں باپ ہی نہ مرنے سے اوپر اس ناگن کو لاٹھیا ہے، میری بہن کو کھردیوں کا احساس دلانے کے سیدہ بیگم نے عالی کا سر گود میں رکھ کر شعاع کو گھورا جو مجرم بنی کھڑی تھی۔

درو میں تڑپتے ہوئے عالی کو کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

”تم۔ تم کیا کرنے آئی تھی یہاں؟ ناؤ گیٹ آؤٹ۔“

ہوی خوشخوار انداز میں شعاع کی طرف بڑھا۔

”ہوش میں آؤ ہوی۔“

راشو ہوی اور شعاع کے درمیان آ گیا۔ شعاع دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔

”شعاع! جاؤ تم اپنے کمرے میں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ آئی کو ایسے دور سے پڑتے ہی رہتے۔“

مدف، اسے باہر لے جاؤ

اشعر نے شعاع کو صدف کے ساتھ کر دیا مگر جاتے جاتے ہوی نے ایک اور تیر اس پر اچھالا جو اس کے دل کے آر پار ہو گیا۔

”اور یہ بھی تو بتا دو کہ میری خالہ جانی کو یہ دورے ان ہی کی ماں اور باپ نے تجھے میں دیے ہیں۔“

حقارت اور نفرت سے بجھا تیر شعاع کو ادھ مو کر گیا۔ صدف، شفق وغیرہ کتنی ہی دیر اسے سمجھاتی رہیں۔

دل بھلاتی رہیں، مگر شعاع تو پاتال کی گہرائیوں میں خود کو محسوس کر رہی تھی۔ سیدہ بیگم اور ہوی کے انتہائی توہین آمیز رویے نے اسے توڑ ڈالا تھا۔

وہ نیچے میں سر دیے مسلسل رو رہی تھی۔ وہ خود کو بے حد اکیلا تصور کر رہی تھی۔ ہوی اور سیدہ بیگم کا رویہ اس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی جان پر یہ عذاب برداشت کر سکتی تھی مگر اپنی پیاری مرحومہ ماں کی شان میں للہ بات اس کی برداشت سے باہر ہوئی اور سیدہ بیگم اسے اور اس کی ماں کو ڈانٹا کرتی رہتی تھیں۔

”ابو! خدا کے لیے مجھے آکر لے جائیں۔ نفرت کا محاذ محبت کے محاذ پر سبقت لے گیا۔ بو! اے جانیں۔ کہاں ہیں آپ۔؟“

وہ تنہائی سے لپٹ کر شدت سے رو رہی تھی کہ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے دیکھا۔ عالی سفید ساڑھی میں کھڑی تھیں۔ وہ بہم گئی۔ عالی آہستہ چلتی اس کے قریب آ گئیں اور اسے ساتھ لگایا اور نہ جانے کیوں اس روز والے واقعے کے باوجود شعاع کو بڑا سکون ملا۔

”آئی! اُم سوری میری جان! میری شعاع۔ بیٹے میں کس طرح تمہیں یقین دلاؤں کہ اس روز نہ جانے کون کزور لے مجھ پر غاب آ گئے تھے۔ مجھے تو کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ جانے کیا وہی جابا ہی بک گئی۔ وہ تو بھلا ہو

مدف کا کہ اس مجھے میری غلطی کا احساس دلادیا کہ میں اپنی بیٹی کے ساتھ کیا کر بیٹھی ہوں۔ میں تو تم سے خود ملتا پاتی تھی۔ ابھی تو میں خود کو تمہارا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہی تھی کہ تم خود چلی آئیں اور میں کزور محسوس کی زد

ملا آئی لیکن میری جان! اب کبھی ایسا نہیں ہوگا۔“

”آئی جان!“۔ پھر دونوں کتنی ہی دیر رو رہیں۔

”بس اب میں ان پیاری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں۔“

عالی نے اس کا چہرہ صاف کر کے چوم لیا۔

”آئی! ابونے اور امی نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ انہوں نے میری تربیت بھی آپ کے سانچے میں ڈھال کر کی ہے۔ ابونے کہا تھا کہ جب نفرتوں کی دھوپ تیز ہو جائے تو آپ کی محبت کے

سانچے تلے چلی جایا کروں۔ ابو کو آپ پر اندھا اعتماد تھا آئی۔“

عالی ایک گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔

”شعاع بیٹی! یہاں تمہیں میری آپا اور میرے بیٹے ہوی کی مخالفت کا سامنا رہے گا۔ وہ لوگ ذرا سلیبی

ذہن رکھتے ہیں۔ ہوی مجھے بے حد چاہتا ہے اور میری تکلیف پر تڑپ جاتا ہے۔ اس لیے اگر وہ کوئی بات کہے تو

ذہن نہ ہونا جان کر۔“

”کوئی بات نہیں آئی جان! اب مجھے کسی کی مخالفت کی پروا نہیں۔ آپ کی محبت جوتی ہے۔“ وہ سون

سے ایک بار بھر عالی سے لپٹ گئی۔

شعاع عالی کی محبت پر کر خوش ہو گئی تھی لیکن عالی اپنے کمرے تک محدود رہیں اور شعاع کے لیے اس گھر کے ماحول کو سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔ عجیب ماحول تھا۔ کہیں بے پایاں محبتیں تھیں اور کہیں ناقابل برداشت نفرتیں کبھی کبھی تو اس کا بھی چاہتا بھاگ جائے۔ وہ زیادہ وقت عالی کے ساتھ گزارتی یا پھر آغا جی اور بی بی باہر کے ساتھ۔ اس روز عالی بھی کالج چلی گئیں۔ باقی سب بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر کھل گئے۔ وہ بہت لمبے عرصے کے لیے گئی تو بلا مقصد ہی اوپر آ گئی۔ کافی دیر وہ میز پر کھڑی باہر دیکھتی رہی، پھر سامنے والے کمرے میں جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اشعر کا ہے، چلی آئی۔ کمرہ بڑا نفیس سا تھا۔ ہر شے سے خاصیت ملی رہی تھی۔ سفید رنگ ہر چیز میں نمایاں تھا۔

ہوں تو آپ اتنا لطیف ذوق رکھتے ہیں۔

بک سیلف میں شعاع کی نظر ظلیل جبران کی "ٹوٹے ہوئے پر پر پڑ گئی تو وہ کتاب لے کر بیڈ کی پٹ سے ٹپک لگا کر بیڈ کی لطیف جذبات کی چاشنی لیے وہ فوسل کے طلسم میں کھو گئی اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسی وقت ہوا تقریباً بھاگتا ہوا اندر آیا۔ مگر قدم دروازے پر ہی جم گئی۔ وہ زہرہ جمال گھر کے لیے لبادے میں سینے پر کتاب دے بے خبر پڑی تھی۔ ہوی کی نگاہیں اس کے ہونٹ کے ہائیں جانب تل میں الجھ گئیں۔ وہ بے خود سادیکے گیا۔ لگ بھرا چاک ہی اس کے حسین چہرے میں اسے عالی کا چہرہ نظر آیا تو اس کی نسیں تن گئیں۔ اس نے ایک جھٹکے کتاب اشعر کا پرے پھینک دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سامنے غیض و غضب میں بھرے ہوی کود کچھ کر دھمکی۔

"تمہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ تم میرے کمرے میں آ کر آرام فرماؤ۔ کھل جاؤ میرے کمرے سے۔" دھاڑا تو شعاع کانپ گئی اسے کیا خبر تھی کہ یہ اس تم گھر کا کمرہ ہے۔ وہ پکڑا کرتے سر کے ساتھ باہر آ گئی۔

اف میرے خدا اتنی ذلت، اتنی توہین۔ اسے کیا حق پہنچتا ہے میری توہین کرنے کا۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ مجھے کیوں میرے باپ کے کیے کی سزا دیتے ہیں یہ ماں بیٹا۔ وہ زخمی دل کے ساتھ بیڑیاں اتر رہی تھی کہ

راشو سے مذہب بھڑ ہو گئی۔

"اے ہو تو آج تم بلند یوں کی سیر کوئی تمہیں۔"

"جی راشو بھائی یہ جانتے ہوئے بھی کہ بعض لوگ آسمان کی رفعتوں کو چھو لینے کے باوجود غرور کی پہنچا نہیں چھوڑ سکتے۔"

وہ آواز کی لرزش اور پلکوں کو بھینکنے سے نہ روک سکی۔ راشو سب سمجھ گیا کہ یہ بھی اوپر تھی اور ہوی بھی اوپر تھا کیا حاضر و دراس نے کوئی بات کی ہوئی۔

"شعاع! تم نیچے جاؤ۔ صدف وغیرہ آگئی ہیں۔"

اسے نیچے بھیج کر راشو ہوی کے کمرے میں آ گیا۔ وہ ہاتھوں کا ٹکے بنائے ابھی تک اسی موڈ میں چھٹا گھور رہا تھا۔ راشو اس کے قریب چلا آیا۔

"ہوی! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہو۔" ہوی نے رجوت بھرے لہجے میں کہا اور بیٹھ گیا۔

"دیکھو ہوی! ابھی شعاع یہاں سے روتی ہوئی گئی ہے۔ اس کے ساتھ تمہارا رویہ بہت نامناسب

۹۔ "راشا! تم اس لڑکی کی وکالت کرنے آئے ہو۔"

"وہ صرف لڑکی نہیں، ہوی میری تمہاری کزن ہے، فرسٹ کزن!"

"ہوگی وہ تمہاری کزن۔ میں جس شخص کو چننا تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی بیٹی میری کزن کیسے ہو سکتی ہے۔؟" ہوی کے لہجے میں فرمان کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔

"ہوی پلیز بھول جاؤ وہ سب۔ اس طرح کہہ دینے سے رشتے ختم نہیں ہو جاتے۔ پلیز دیکھو۔" راشو نے بی بی سے اسے سمجھانا چاہا تو ہوی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیے۔

"کن پکروں میں پڑ گئے ہو راشو میاں! یہ دوسروں کے گھر اجاڑنے والی عورتیں مردوں کو۔"

کڑا ہوی! بکواس بند کرو۔ پستیاں اگر تمہارا مقدر بن ہی گئی ہیں تو میں تمہیں کیوں کر روک سکتا ہوں لیکن آبدھم شعاع کے بارے میں کوئی بے ہودہ بات نہیں کر دے۔ وہ اس گھر کی عزت ہے۔"

ہوی کی گری ہوئی بات سے راشو بھنا اٹھا اور تیزی سے نیچے آ گیا۔



جب سے حادثہ شاہ کو یہ پتا چلا تھا کہ شرمین اس کی فرسٹ کزن ہے، اس وقت سے وہ بے حد خوش تھا اور اس صرف اپنا ہی حق سمجھ رہا تھا۔ جب سے وہ گاؤں سے یہ خوش کن خبر لے کر آیا تھا کہ شرمین اس کی کزن ہے۔ اس روز سے شرمین سے ملاقات ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس روز ہوی اور شرمین فریو کی کلاس لے کر آ رہے تھے۔ حادثہ بھی جیوں میں ہاتھ ڈالے ان کے قریب آ گیا۔

"ہیلو کزن!" حادثہ شاہ نے سیدھا شرمین کی آنکھوں میں جھانکا تو شرمین نے سر سے پھر تک حادثہ کو دیکھا۔

"تم نے مجھے کون کیوں کہا؟"

"اس لیے کہ کنی الحال جن نہیں کہہ سکتا۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

ہوی کو غصہ آ گیا مگر وہ چپ رہا۔

"اوش! اپ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں۔"

قریب تھا کہ شرمین کا ہاتھ حادثہ کے منہ پر پڑتا، ہوی نے روک دیا۔

"میں تمہیں جانتا ہوں، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کزن۔"

حادثہ اس کی کسی بھی بات سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"کیوں؟ کیسے؟"

شرمین بھی کچھ تردد پڑ گئی کہ اگر یہ ایسی بات کر رہا ہے تو کسی وجہ سے کر رہا ہے۔

"میرا خیال ہے اس کا جواب تمہاری ہی زیادہ بہتر دے سکتی ہیں۔ بہر حال تمہاری می نورین شہزاد میری لکھی ہوئی ہیں۔ ان سے جا کر پوچھنا کہ عالم شاہ کون ہے۔ میرا خیال ہے ابھی ان کا خون اتنا سفید نہیں ہوا

ان کا کھانسی کونہ پہچان پائیں۔ خدا حافظ۔"

حادثہ اسے عجیب الجھن میں ڈال کر چھوٹ کر چلتا آگے بڑھ گیا۔



”ہاں تم نے درست کہا تھا۔“ شرمین نے گویا ہلکتا حلیم کر لی۔  
”تو گویا پھپھو نے اباجی کو بھائی تسلیم کر لیا۔“

”ہاں اس لیے کہ قدرت کے کاموں سے وہ انکار کیونکر کر سکتی ہیں۔ بہر حال آئندہ تم مجھے کزن نہیں کہو گے۔“ اس کا بار بار کزن کہنا شرمین کو نہیں بھایا تھا۔  
”اچھا تو پھر کیا کہا کروں؟“ وہ تھوڑا سا جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا تو وہ کھول گئی۔  
”میرا نام تم جانے ہو۔“

”اچھا ان باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کب چل رہی ہو اپنے ماموں کا گاؤں دیکھنے۔“ وہ اس کی ہر بات پر انداز کر رہا تھا۔  
”شاید کبھی نہیں۔“ وہ سخت فیصلہ کن لہجے میں بولی۔  
”کیوں؟“ حارث کا چلتا ہوا منہ رک گیا۔

”وہ گاؤں جو میری ماں کے لیے قتل ٹھہرا۔ وہ جو بچی جو میری ماں کے لیے کال کوٹھری بنی۔ میں وہاں کیوں جانے لگی۔ جب بہن کو ہی اپنے بھائی سے ملنے کا شوق نہیں تو میں کس لیے راکھ میں اٹھیاں پھیروں۔ تمہارے بھائی نے کیا کیا ستم نہیں ڈھائے میری ماں پر۔ اپنے ہی گھر میں مجی نے قیدیوں جیروں والی زندگی بسر کی ہے۔ میں وہاں قدم بھی رکھنا گوارا نہیں کروں گی۔“

شرمین کو فوراً نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسی لیے اسے حارث شاہ سے اور ان دیکھے ماموں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ شرمین کی تلخ کلاہی نے حارث کو بھی تاؤ دلایا۔  
”تمہاری تمی نے اور تو سب کچھ بتا دیا مگر اپنی کرکوت نہیں بتائی کہ کس طرح وہ باپ اور بھائی کی عزت خاک میں ملا کر تمہارے ڈیڑی کے ساتھ۔“

”مثلاً اب اچھے ہر بات معلوم ہے۔ ان کو میرا آئی اس قید خانے سے نکال کر لائی تھیں اور اس قید خانے سے رہائی کا یہی راستہ تھا جو مجی نے اختیار کیا اور نہ تو وہ گھٹ گھٹ کے سر جلی ہوتیں۔ راستہ دو اور آبدہ گئی میرا راستہ روک کر ایسی باتیں نہ کرنا۔“ شرمین تیزی سے آگے بڑھ گئی۔  
”ہونہا! تمہیں بھی اسی قید خانے میں نہ ڈالا تو میرا نام حارث شاہ نہیں۔“

حارث منہ پر ہاتھ پھیر کر دانت چٹکا کر بولا۔ حارث کو یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ لیا ز بھی شرمین کا کزن ہے۔ لیا ز، شہباز کا بیٹا ہے جس سے ان کی خاندانی دشمنی ہے۔  
”اصل کھیل تو اب شروع ہوا ہے۔“

حارث شاہ کا دماغ اسی وقت سے سے تپ رہا تھا جب سے شرمین نے انسلٹ کی تھی۔  
”کس کھیل کی بات کر رہے ہو لیا ز؟“  
جمال نے کتاب پر اسے نظریں ہٹا کر حارث کو دیکھا جو آج ----- صبح سے برہم تھا۔ حارث آہستگی سے چلا اس کے قریب آیا۔ کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی اور اسے ساری بات بتادی۔  
”اچھا تو یہ بات ہے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ جمال کو حیرت رہی تھی۔  
”چلو اب تو ہاتھ چل گیا ناں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”سہا بات کی ہے یا رتم نے۔ جمال سارے کا سارا تمہارا ہے۔ تمہارے دوست میرے دوست ہمارے دشمن میرے دشمن۔ کوئی میلی نگاہ تو ڈالے میرے یار پر۔ وہ آنکھ ہی نہ نکال دوں تو میرا نام جمال نہ لگے۔ تم فکری نہ کرو۔“ جمال نے بھرپور دوستی کا اہتمام دیا تو حارث خوش ہو گیا۔  
”یہ سوئی بات ا“ حارث جمال سے بغل گیر ہو گیا۔



شعاع کیا آئی تھی۔ آغا بی اور بی بی جان پر سکون ہو گئے تھے۔ آغا بی شعاع کو زیادہ محبت، زیادہ توجہ دے کر اپنی دیادگیوں کا شاید کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے۔  
”آغا بی! آپ ہمیں پہلے معاف کر دیجئے تو۔ تو آغا بی میری بیمار ماں کی آخری حسرت تو پوری ہو رہی۔ وہ آخری وقت تک آپ کے قدموں کو چھونے کے لیے ترپتی رہیں۔ مگر۔ مگر۔“  
بہن دیکھ شعاع کے دل کے ساتھ چٹا ہوا تھا۔ اسے آغا بی سے یہ شکوہ تھا جو آج کیوں تک آئی گیا تو آغا بی نے اسے ساتھ لگا لیا۔

”شعاع! میری بچی! مجھے احساس ہے اس بات کا۔ مریم کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے مجھے سے لیکن بیٹی میں کیا کرتا اگر باپ بن کر صرف اس کا باپ بن کر میں فرمان کی اس کو تائی کو معاف کریتا مریم کو سینے سے لایا تو انصاف کے تقاضے، میری اصول پرستی مجھے جانب داری کی قبر میں دفن کر دیتی اور میں مرحوم بھائی بھادج کو درخشاں دیکھانے کے لائق نہ رہتا۔ میں مریم بیٹی کے لیے پھر بن گیا اور نہ میرا بھی دل چاہتا تھا۔ فرمان کو معاف کر کے بننے سے لگاؤں۔ مریم کو دیکھوں، مگر دکھ تو اس بات کا ہے بیٹی کہ میری ہر قربانی رائیگاں گئی۔ عالی تو نرگس شریف بیٹی ہے مگر سیدہ آج تک مجھے معاف نہیں کر سکی۔ تمہارے ساتھ سیدہ کا رویہ کیا ہے شعاع بیٹی؟“  
شعاع کے دل میں اک ٹیس سی آہ تھی۔ وہ اپنے دھکی دادا کو مزید دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔

”آغا بی! ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں آ کر تو مجھے محبتوں کا بھرپور احساس ملا ہے۔ سب ہی اتنی توجہ اور بعد دیتے ہیں۔ مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں آغا بی۔“ اس نے کمال ہوشیاری سے آواز کی لرزش پر قابو پایا۔  
اس نے آہستگی سے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگائے اور نی چھپائی باہر آ گئی۔  
سیدہ بیگم نے اسے آغا بی کے کمرے سے لھٹا دیکھا تو زہر میں بجائیں اس کی طرف اچھال دیا جو سیدہ حال کے دل میں بیوست ہو گیا۔

”واہ میرے مولا! میری پارسا بہن یوں نامراد رہی اور ایک گھٹیا عورت اس کی خوشیوں کے تاج محل میں آکر اس کی زندگی کو تاریکیوں میں دھکیل گئی اور اب اس کی بیٹی گھوٹی ہمارے بچوں کی خوشیاں جھینے چلی آئی ہے۔ بیٹی! پڑھا آئی ہے لاڈلی پوتی دادا کو۔ اب نئے احکامات جاری ہو جائیں گے ہونہا اب کسی دھوکے میں نہ آؤ گی۔ یہاں آغا بی سمیت سب ڈرامے باز ہیں۔“

سیدہ بیگم زہرا گل رہی تھیں۔ شعاع کے ضبط کے بند ٹوٹنا شروع ہو گئے۔ تو وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی مگر سامنے سے راہ بند آ گیا۔  
”اسے شعاع تم کہاں تھیں؟ پتا ہے سارے گھر میں تمہاری ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی۔ ہائیں یہ تم رو رہی ہو؟“  
ضبط کے باوجود بے شمار گرم پانی کے قطرے اس کے صبح رخساروں پر پھیل گئے تو راشد سمجھ گیا کہ پھر چوٹ



پڑی ہے۔

”کچھ نہیں راشد بھائی ایسے ہی ابو کے لیے پریشان ہوں۔“

وہ آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی تو راشد اس کی پلکوں پر اٹکے موتی دیکھتا رہ گیا۔ سامنے سے اشعر بھی آ رہی تھی۔

”ارے گھاسڑ کیوں رلایا ہے میری بہن کو؟“

اشعر سب جانتا تھا مگر پھر بھی راشد کے شانے پر چت لگاتے ہوئے اس نے شعاع کو دیکھا۔

”تمہاری بہن تو مجھے اپنے دکھوں میں بھی شریک نہیں کرتی میں اسے۔“

”شعاع! میری بہن دیکھو، میں جانتا ہوں کہ سیدہ چچی اور ہوی کا رویہ مناسب نہیں مگر تمہیں پر برداشت کرنا ہوگا آخر کب تک۔ ایک نہ ایک دن ظلم خود ہی تمہارے آگے گھسنے لیک دے گا اور پھر ہم لوگ محبت جو ہے۔ تمہارے اس رویے سے تو ہاتھ چلتا ہے کہ ہماری محبت میں کوئی کھوٹ ہے، غلطی میں کی ہے؟“

”ایسا مت سوچو اشعر بھائی! آپ لوگوں کی محبت ہی تو ہے جو میں جی رہی ہوں۔ میں اپنی ذات پر دوسرے سکتی ہوں مگر میری اکی کو جب تائی امی بڑے الفاظ سے نوازتی ہیں تو۔ تو میں برداشت نہیں کر پاتی۔“

آنسوؤں کا ایک اور منہ زور ریزا اٹھ آیا۔

”اپنے اپنے طرف کی بات ہوتی ہے شعاع ورنہ عالی آئی بھی تو ہیں کہ انہوں نے ایک ٹکڑہ بھی کھانے اور چچی جان ہیں کہ اتنی کم طرفی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ انہوں نے تو آغا جی کو بھی نا انصاف اور نہ جانے کیا خطاب دے رکھے ہیں۔ خود تو تمہیں ہی ہوی کا بھی بیڑہ غرق کر دیا ہے انہوں نے۔ وہ ان ہی کی سوچ رکھتی ہے۔“

ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا، ہوی ہاتھ میں ریٹ پکڑے شوخ انداز میں سیٹی بجاتا ہوا آیا مگر انہوں نے اس کی طرف بھی نظر نہ کیا۔

پڑی تو ایک سختی خیزی مسکراہٹ اس کے کھوں پر آ گئی۔

”اتنی دلداریاں تو بندے کو خواہ وہ ہی دیکھی کر دیا کرتی ہیں۔ نہ کرو اتنی دلداریاں کہ پھر بعد میں۔“

”تم اپنی زبان بند رکھو ہوی۔“ اشعر نے گھور کر ہوی کو دیکھا جو شعاع کے پیچھے رخسار دیکھ رہا تھا۔

”اچھا جناب بند رکھتے ہیں۔ آپ کچھ ارشاد نہیں فرمائیں گے راشد صاحب؟“ ہوی نے ایک نظر لٹکایا۔

پڑالی پھر راشد کو دیکھ کر مسکرایا۔

”شعاع تیار ہو کر آؤ۔ تمہیں چھوٹی پیمپو کے ہاں لے چلیں۔ ان کا فون آیا تھا۔“

راشد ہوی کو قطعی نظر انداز کرتا ہوا ہلا تو شعاع دھندلی آنکھوں سے ہوی کے پشت کو دیکھتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ راشد اور اشعر کا خیال تھا کہ شعاع کو چھوٹی پیمپو کے ہاں لے چلیں گے تاکہ وہ کچھ بہل جائے۔

سب خود ہی آگئے۔ شعاع دیر تک ٹھنڈے پانی کے چیمینے سلگتی آنکھوں پر ڈالتی رہی پھر ہلکے سے رنگ پکڑوں میں ڈھیلی چوٹی بنا کر نیچے آ گئی۔ پیمپو سے مل کر وہ ہال کمرے میں آ گئی۔ جہاں سب موجود تھے۔

”اودہ شعاع باجی! یہاں میرے پاس بیٹھیے۔“ شری نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”نہیں شعاع یہاں میرے پاس۔“ یاسر نے اسے اپنے پاس صوفے پر بٹھالیا۔

”یار راشد! تم خاموش کیوں ہو؟“

ہوی۔ قالمیں پر نیم دراز بیٹھنے پر کشن رکھے ٹانگ پر ٹانگ رکھے عجیب جلی اور چھتی سی مسکراہٹ سے

ابو راشد صرف اسے گھور کر رہ گیا۔ شعاع کا جی چاہا ہی وقت یہاں سے اٹھ کر چلی جائے۔

”چشم بد دور ہوئی بھئی! کافی دن بعد مسوڈ میں آئے ہیں۔“

”اللہ تعالیٰ اسے بچائے۔ میں نظر تو اتار دوں۔“

دانی نے ماحول کو خوشگوار کرنے کی غرض سے چوٹنی جیب سے نکال کر ہوی کا صدقہ اتار کر پھر اپنی پیمیں ڈال لی۔

”کیوں میاں! کون سا قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہے؟“

اشعر نے ایک سیب ہوی کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ہوی نے ایک نظر شعاع پر ڈالی جو نظریں

لے اس وقت یاسر کی کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔

”خزانہ تو راشو کے ہاتھ لگا ہے، اسی سے پوچھو۔ ہمیں تو اللہ بچائے ایسی ویسی چیزوں سے۔“

ہوی نے دانت چیر کر کہا اور راشد کر باہر نکل گیا۔ شعاع دل تمام کر رہ گئی۔

”شعاع باجی! ایک بات تو بتائیں کہ مغرب میں رہ کر بھی آپ میں مغرب کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ نہ

ان میں نہ لباس میں کسی انداز سے بھی پتا نہیں چلتا کہ آپ امریکہ میں رہ کر آئی ہیں۔“

ہوی نے پوچھا۔۔۔۔۔۔ یہ سوال تو باقی سب کے ذہنوں میں تھا مگر اس وقت جو شعاع کے دل کی کیفیت

ہی یہ صرف وہی جانتی تھی۔ مگر ان لوگوں کی خاطر اسے ضبط کرنا پڑا۔

”بات یہ ہے ہوی کہ جب میری اپنی زبان، اپنا ملک، اپنی ثقافت، اپنی پہچان موجود تھی تو میں اپنی تہذیب

اور مگر تہذیب کو کیوں اپناتی۔ میں چاہتی ہوں میرا طرف بھی عالی آئی کی طرح ہو۔“

دانی آواز میں بولتے بولتے شعاع ایک دم رک گئی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا اکٹھا گیا۔ اشعر اٹھ کر

اس کے پاس جا بیٹھا۔

”جانتی ہو عالی آئی بہت بہادر ہیں۔ اتنے بڑے بڑے فیصلے خود کرتی ہیں اور ان کے دل میں کیا

بدگلوں کا ان کی کوئی خبر نہیں ہونے دیتیں۔ آج تک کم از کم میں نے تو ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔“

شعاع سمجھ گئی تھی۔ عالی کی مثال دے کر اشعر نے اسے کیا سمجھانا چاہا ہے۔

”سوری اشعر بھیا! آئندہ میں بھی کوشش کروں گی کہ میرے اندر کی خبر کسی کو نہ ہو۔“

شعاع نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اسے خود بھی احساس ہوا تھا کہ وہ اپنی کمزوریوں کا اظہار کر کے اپنی پیاری

نہیں گلا اس کر دیتی ہے۔

”اچھا چھوڑو شعاع ان باتوں کو، یہ بتاؤ تم نے اپنی تعلیم کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ راشد موضوع بدلتا

”میں بی۔ ایس۔ سی کرنا چاہتی ہوں راشد بھائی یونیورسٹی سے۔“

”یونیورسٹی میں شعاع باجی۔“ دانی وغیرہ ایک ساتھ بولے۔

”ہاں کیوں کیا مضائقہ ہے؟“ اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا۔

”میں شعاع باجی یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے آپ کو ہماری لاش پر سے گزرنے ہوگا۔“ یاسر دل تمام کر

لے لے کر سامنے لیٹ گیا۔

”خدا نہ کرے، ایسی بھی کیا بات ہے؟“ شعاع مسکرائی۔

”آپ نہیں جانتیں شعاع باجی کہ ہمارے تعلیمی ادارے ہمارے اعمال کی وجہ سے تعلیمی ادارے قتل زیادہ بن گئے ہیں۔ اگر آپ بھی یونیورسٹی کے شہیدوں میں شامل ہو گئیں تو ہمارے خاندان کو خوبصورت لڑکی ختم ہو جائے گی۔ ہم دنیا والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اتنی ڈھیر ساری بدصورت لڑکیوں میں ہی خوبصورت۔“

اس سے قبل کہ یاسر آگے بولتا۔ وہ ہی بدصورت لڑکیاں آگے بڑھیں اور اسے دمن ڈالنا پھر لگو لگو کر دی کر دی تو بے چارہ یاسر جتنے جتنے بے حال ہو گیا۔ سب کے ساتھ شعاع بھی ہنس دی۔ راش نے سب کو کرا سے دیکھا تو دل نے چپکے سے اس کی ہنسی کو امر ہو جانے کی دعا دی۔



آمنہ اس روز والے واقعے سے بری طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔ جب بھی وہ منظر یاد آتا ایک فیروز ہاتھ میں اس کا آٹھل تھا۔ اس اجنبی خوبرو جوان کی گہری نگاہیں اس پر تھیں۔

”اف میرے خدا یا یہ کیوں ہوا کیسے ہوا اور۔ اور میرا نام وہ کیونکر جانتا تھا۔ اگر بتاتی یا۔ کوئی ہل لیتا تو میرے کھڑے کر دیے جاتے۔ خدایا مجھے معاف فرما، میں آئندہ کہیں نہیں جاؤں گی کہیں نہیں۔“ آمنہ نے مارے خوف کے آنکھیں زور سے سمجھنے لیں۔ اس نے تو اپنی پیاری بھابھی کو بھی نہیں بتاؤ اس کا اتنا خیال رکھتی تھیں۔

”شیراز باؤ پرسوں رات تمہارا کھانا میرے گھر میں۔“

ہاشم نے آتے ہی گویا شیراز کو اطلاع دی تو وہ حیران رہ گیا۔

”وہ کسی خوشی میں؟“

”میری اور غیاث شاہ کی دوستی کی خوشی میں۔ میں نے عالم شاہ کے سارے گھرانے کو دعوت دی ہے۔“

”وہ بھی آئے گی؟“ شیراز کی آنکھوں میں آمنہ کا چہرہ گھوم گیا۔

”لو اسی کی خاطر تو یہ محفل سجا رہا ہوں تاکہ تمہارے اور اس کے درمیان کوئی خوبصورت حادثہ پیش نہ آوے۔“

اور۔۔۔ ہاشم ذو معنی انداز میں مسکراتا بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”مجھے تمہاری دوستی پر نار ہے یا ہاشم! تم میری خاطر کیا کیا نہیں کر رہے۔“ شیراز ممنون نظروں سے

کو دیکھنے لگا۔

”تمہارے لیے مواقع پیدا کرنا میرا کام اور ان سے فائدہ اٹھانا تمہارا کام۔ تم پہلے آ جانا اور چوٹی

والے حصے میں میرے کمرے میں رہنا۔ میں کسی نہ کسی ذریعے آمنہ کو وہیں بھیج دوں گا۔ کہہ لیتا حال

سے۔ اسے اپنے عشق میں بکڑ لیتا۔“

ہاشم کا خاندان بڑا اثر رسوخ والا تھا۔ اس لیے غیاث شاہ اس خاندان سے تعلق قائم کرنا چاہتا تو

ہی آپ ہو گیا۔ اسی لیے گھر کے سارے افراد عالم شاہ سمیت دعوت پر جانے کو تیار تھے مگر آمنہ نے صاف

دیا حالانکہ یہاں تو خود عالم شاہ نے جانے کو کہا تھا۔

”نہیں بھابھی! میرا دل ہی نہیں مانتا تو میں کیوں جاؤں۔“ آخر وہ کیا ہے؟“ زینب نے کہا۔

”کوئی وجہ نہیں بھابھی! میرا دل نہیں چاہتا۔“ وہ ٹال مٹلی۔ جب ہاشم نے دیکھا آمنہ نہیں آئی تو فوراً شیراز کے پاس اوپر آیا۔

”میرا ہوا یا راہ وہ تو آئی نہیں۔ تمہیں ہی اس کے پاس جانا پڑے گا۔“

”کیا مطلب؟“ شیراز اٹھ کھڑا ہوا۔

”مطلب یہ ہے کہ اس وقت گھر کے سارے افراد یہاں ہیں۔ بس تم کسی بھی طریقے سے عالم شاہ کی

دیکھنی چاہو، نوکروں سے بچ کر آمنہ کے کمرے میں جا کر کہہ سن لیتا۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

ہاشم۔ جلدی جلدی کہہ کر نیچے چلا گیا اور خوش قسمتی نے بھی شیراز کا ساتھ دیا۔ کوئی ملازم نظر نہ آیا تو وہ

آمنہ کے کمرے میں کود پڑا۔

”کون ہو تم؟“ آمنہ چیخ پڑی۔



”تم ذلیل آدمی! اب آگے بڑھو تو میں خود کو فتح کر لوں گی۔ اس لیے کہ۔“

آمنہ نے پہلوں والی پیٹ سے چھری اٹھالی تو شیراز گھبرا گیا۔

”ایسا نہ کرنا آمنہ! تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو، مجھے تمہاری عزت بھی عزیز ہے اور جان بھی پیاری میں تو رن تمہاری محبت میں یہاں تک چلا آیا ہوں۔ یقین جانو آمنہ جس روز سے تمہیں دیکھا ہے، میرے دل کو کہیں زار نہیں۔ تمہارا خوبصورت سراپا ہر وقت نگاہوں میں گھومتا ہے۔ مجھے۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے آمنہ۔ میں ہنسنے لگا ہوں تمہیں۔“

وہ فسوں گر لفظوں کا سحر پھیلاتا چلا گیا۔ مگر وہ ہر نی ایسی آنکھوں میں خوف لیے ہر قسم کے تاثر کے بغیر اسے بکھری تھی۔ چھوری اب بھی اس نے مغربی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی۔

”خیریت چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ نہ مجھے کسی سے محبت ہے اور نہ کسی کو حق ہے مجھے سے ایسی بات کرنے کا چلے جاؤ خدا کے لیے چلے جاؤ۔ تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو میں۔ میں اپنی جان دے کر بھی اپنے باپ بھائیوں کو اپنی بارشانی، بے گناہی کا ثبوت نہیں دے سکتی۔ خدا کے لیے چلے جاؤ۔“

آمنہ نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے تو شیراز کا جگر پانی ہو گیا۔ وہ کچھ دیر بے بسی سے تڑپتی لڑکی کو دیکھ رہا مگر رد مال اٹھا کر منہ پر لپیٹا اور آگے بڑھا مگر پھر مڑا۔ تھوڑا سا اس کے قریب آیا۔

”میں جو کوئی بھی ہوں آمنہ! صرف اختیار د رکھنا کہ تمہیں چاہتا ہوں۔ دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں اور اب کی کو چاہتے لگو تو مجھے ضرور یاد رکھنا۔“

پھر شیراز تیزی سے کھڑکی سے کود گیا۔ آمنہ نے سکون کا سانس لیا اور تکیہ میں منہ چھپا کر روتی چلی گئی۔

باللہ یہ سب کیا تھا۔ میں تو پہلے جھکے کی زد سے ہی نہیں نکل پائی تھی تو۔ تو وہ میرے کمرے تک چلا آیا۔

اے جرات کیسے ہوئی۔ وہ کون ہے اور کیوں میرے دل کے بند دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اے واحد اب ہر اکوئی ہمدرد نہیں، کوئی ہمارا نہیں۔ میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ سوائے تیری ذات کے میں کسی سے مال دلی نہیں کہہ سکتی۔ میرے مولا میری مدد کر دے۔“

وہ خدا کے حضور روتی رہی۔ گڑ گڑائی رہی۔ اور وہ۔۔۔ کیا بھی کس سے حال دل نہ بجا بھی بڑی اچھی تھیں مگر

لگتا یہ سب کیسے بتاتی کہ کس طرح اسے سے پہلی ملاقات ہوئی، کیسے وہ یہاں تک آن پہنچا محبت کا سوال بن کر۔

”خدا یا! وہ کون تھا۔ کوئی دھوکے باز تھا یا واقعی، لیکن یہ سب محبت ہو کیسے گئی اسے؟ بھلا ایک بار دیکھنے سے

میں کب محبت ہوئی ہے۔ نہیں اتنا جی اور بھائیوں کی دشمنیاں بھی تو بہت ہیں ہو سکتا ہے کوئی دشمنی میں کر رہا ہو

یاف خدا یا میری عزت کی حفاظت کرنا۔ میں تو زہر کھالوں گی اگر میری وجہ سے میرے باپ دادا کی عزت پر

نفس آیا۔ یا خدا اس سے پہلے تو مجھے موت دے دینا اور مجھے اپنی امان میں رکھ!“ وہ ہچکیاں لگتی لگتی لپٹوں پر چپ کی

لوگائے تھائی کی بکلی مار کر اپنی ذات کے بچرے میں بند ہو گئی۔

مہمانوں کو رخصت کر کے ہاشم وقت ضائع کیے بغیر شیراز کی حویلی پہنچا جو حویلی کی بیٹھک میں قالین پر لیٹا

کون موقع میں گم تھا۔

”کرا یا دیدار، میرا یار!“ ہاشم نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا تو وہ کچھ کھویا کھویا سا اٹھ بیٹھا۔

”کیا بات ہے یار؟ دل تو پہلی ملاقات میں دے آئے تھے، اب کیا ہوش دھواں بھی؟ بتاؤ تو کسی ملاقات

”کک۔ کک کون ہو تم؟“

بارے خوف کے آمنہ کی خوبصورت آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ عرق آلود پیشانی اور پھولے سانسوں۔ ساتھ شیراز کو دیکھ رہی تھی جس نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

”میں، میں علی ہوں آمنہ! تم پہچانیں نہیں مجھے۔“

شیراز نے چہرے پر سے رد مال اتارتے ہوئے سیدھا آمنہ کی خوف زدہ آنکھوں میں دیکھا تو آمنہ کا کاسانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ وہ اسے پہچان گئی تھی۔ روح فنا کر دینے والا وہ منظر اس کی آنکھ نے اتنی بار دہرایا تھا کہ وہ اسے ہزاروں لوگوں میں بھی پہچان لیتی۔

”میں۔ میں تمہیں نہیں جانتی۔ کون ہو تم اور کیوں یہاں آئے ہو؟“ اس نے خشک لبوں پر زبان بھیر۔

ہوئے صاف انکار کر دیا۔

”خیر تم اب جھوٹ بولو تو الگ بات ہے ورنہ پہچان کی پر چھانیاں تو صاف نظر آرہی ہیں۔“ شیراز اذلی

گھبراہٹ سے بے نیاز اطمینان سے بولا۔

”بکومت۔ تم جو کوئی ہو، ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ ورنہ میں ابھی ملازموں کو بلاتی ہوں۔“

خوف اور غصے سے آمنہ کی آواز لڑکھڑاہی تھی۔

”دیکھو آمنہ! میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی کسی برے ارادے سے یہاں آیا ہوں۔ میں تو۔“

”پھر۔ پھر کیوں آئے ہو اس طرح جو دروازے سے چور بن کر؟ نکل جاؤ یہاں سے۔ خدا کے لیے۔“

جاؤ تم۔ جو کوئی ہو چلے جاؤ۔“

آمنہ گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ کیا تم تھا کہ وہ مدد کے لیے کسی کو پکار بھی نہیں

تھی۔ کیونکہ کوئی اس کی بے گناہی پر اعتبار نہ کرتا۔ شیراز کو بے بسی لڑکی پر ترس آ گیا۔ وہ ہنسنے سے آگے

اس کے مرمریں ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ برق رفتاری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کسی رعبی۔ گھاس پڑی یا۔“ ہاشم اسے خاموش دیکھ کر خود ہی بولا۔

”ملاقات کسی یار و دوہو ہجرے میں بند سبھی ہوئی چڑیا ہے۔ بڑا ترس آتا ہے مجھے اس پر، کاش وہ میرے دشمن کی بیٹی نہ ہوتی تو!“

شیراز اس وقت سے پشیمان سا لیٹا تھا۔ آٹھ سا خوف زدہ روپ اس کی نگاہوں میں محسوس رہا تھا۔  
”تو کیا کرتے؟“ ہاشم نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”تو اسے پیادہ کر اپنے گھر لے آتا۔“ شیراز نے مہر سانس لیا۔

”یہ تو تم اب بھی کر سکتے ہو لیکن ذرا صبر کرو۔ وہ چار ملاقاتیں کرو۔ لڑکی کو اپنے عشق میں گرفتار کر دے۔  
ملے گا۔ ہر مراد پوری ہوگی۔“

اور پھر ہمیشہ کی طرح ہاشم نے شیراز کے اجڑتے ہوئے جذبات کے آگے اپنی سوچ کا پل تیس کر دیا۔  
راہیں نظر آئیں تو شیراز پھر بہل گیا۔



شعاع کیا آئی تھی۔ گھر میں کئی کئی مسائل کا اضافہ ہو گیا تھا۔ آغا جی اور بی بی جان شعاع کو اس کی اور اس کے والدین کی محرومیوں کی وجہ سے زیادہ محبت، زیادہ توجہ دیتے تو سیدہ بیگم کا راسخہ کے دم گھٹنے لگتا۔  
اس کے خلاف مزید زہرا گلنے لگتیں۔ آغا جی اور بی بی جان کے اس رویے نے ان کو یقین دلادیا تھا کہ وہ دونوں فرمان کے ساتھ اس سازش میں شریک تھے جو عابی کے خلاف کی گئی تھی۔

”دیکھ رہی ہیں ناں بھابی جان! آپ! یہ ساری ملی بھگت تھی۔ میری عابی کے خلاف دکھاؤ تھا۔ اب کیسے پوچھنے سے لگایا ہے دونوں نے۔“

”سیدہ! کیوں جلتی رہتی ہو ایسی باتیں نہیں کرتے۔ آخر کو شعاع ان کا خون ہے اور کہاں تک لکیر کو چاہا سکتا ہے۔ مت کڑھا کرو تم ایسی باتوں سے۔“

ہمیشہ کی طرح قدسہ بانوں ان کو سمجھاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسی وقت عذرا بیگم تملاتی ہوئی آئیں۔  
”اب تمہیں کیا ہوا؟“ جاتے جاتے قدسہ بانوں نے مڑ کر ان کو دیکھا۔

”ہوئے کیا ہے بھابی جان! احد ہوتی ہے کسی بات کی۔ انسان کو بات کرنے سے قبل اپنی حیثیت اپنے مرتبے کو دیکھ لینا چاہیے۔ مگر آغا جی نے تو انصاف کی لٹیا ہی ڈھونڈی۔“

”عذرا! ہوا کیا ہے؟ کیوں تپ رہی ہو؟“ قدسہ بانوں بیٹھ گئیں۔

”ہونہہ! بڑا چنچا کرتے تھے فرمان، نافرمان ہے۔ ناخلف ہے۔ میں نے اسے عاق کر دیا۔ مگر اب تمہیں کہ میں نے فرمان کو دل سے معاف کیا۔ لہذا اس کی جائیداد اسے واپس کر دی جائے گی۔ یہ کوئی بات ہے۔

مردوں والی۔ فرمان کے جتنے کی جائیداد وہ باقی تینوں بھابیوں کے نام کر چکے ہیں۔ لطف فرمایا جا رہا ہے کہ فرمان کا حصہ واپس کر کے شعاع کو دیا جائے ہونہہ! یہ ہے ان کا انصاف!“

”اوہو! تو یہ بات ہے، میں سمجھ جاتے کیا بات ہے۔ میں کچن میں دیکھوں کیا ہو رہا ہے۔“ قدسہ بانوں سے اس طرح اٹھیں، گویا ان کو اس بات کے کوئی سروکار نہ ہو۔

”ہونہہ! یہ تو زیادہ ہی پارسا بنتی ہیں۔ اب آگیا ناں آپ کو یقین۔ یہ ساری آغا جی کی ڈراما بازی تھی۔“

نہا بھی دیکھتی ہوں کہ اب آغا جی اور بی بی جان اپنی ڈراما بازی میں کیونکر کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک کوڑی بھی نہ ہمارا کوڑی مٹی تو نام بدل دیتا۔ قسم سے عذر رہا بھی اس لڑکی کو دیکھتی ہوں تو جی چاہتا ہے اسے کچا چبا جاؤں۔ بہرہ معصوم بہن کے ارمانوں کو لوٹنے والی اس کی ماں تھی اور اب یہ آگنی ہے، ہمارے بچوں کی حصہ دار بن کر بیٹھی ہے اسے ایسے ہی تڑپاؤں گی، جیسے میری بہن تڑپا کرتی ہے، میرے مرحوم ماں باپ کی روح آج بھی تڑپتی ہے۔ مجھ سے سوال کرتی ہے کہ میں نے چھوٹی بہن کا گھر کیوں نہ آباد کیا۔ وہ محروم کیوں ہے، لیکن اب میں آغا جی کو پتہ کچھ کرنے نہیں دوں گی۔ دیکھ لوں گی ان کو بھی۔“

سیدہ بیگم کو فرمان کے ہر جاتی پن کا جو دکھ تھا تھا۔ آغا جی کے اس عمل نے انہیں اور بھی سخت بنا ڈالا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ انہوں نے بارہا اپنے والدین کو خواب میں دیکھا تھا۔ جو عابی کی محروم زندگی پر شکوہ کیا کرتے تھے۔ یہ وہ عوامل تھے جو ان کو شعاع کے مزید خلاف کرتے جا رہے تھے اپنی یہ نفرت وہ ہوی کی رنگوں میں غل کر رہی تھیں۔

اس لیے بھی کہ عابی کا بدلہ لیا جائے اور اس لیے بھی کہ ہوی اس کی طرف ملتفت نہ ہو اور اب تک ہوی نے اپنے رویے سے ان کو خوش ہی کیا تھا۔

اس روز شعاع یونیورسٹی سے داخلہ فارم لے کر اشعر کے ساتھ آ رہی تھی کہ اشعر ڈرا پیچھے رہ گیا۔ شعاع کی غرا پر پڑی جو بیٹے پر ہاتھ باندھے بڑی معنی لگا ہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اندر سے کانپ گئی۔ تاہم آگے قدم بڑھا دیے۔

”شعاع!“ شعاع کا ایک جیر میٹر می پر دوسرا نیچے تھا کہ ہوی کی آواز پر ایک ساعت کے لیے شعاع کا دل ہلکا ہوا۔

”اوہ! کتنے دل کے ساتھ بات کی خنجر رہی وہ جو سفید کپڑوں میں اس کی گلابی جھکتے رخساروں کو دیکھ رہا تھا۔  
”آپ نے کچھ کہنا ہے ہوی بھائی؟“ اس نے لرزتی پلکیں اوپر اٹھائیں۔

”مٹی نہیں، کہنا تو نہیں۔ اطلاع دینی ہے کہ یہ امریکہ نہیں۔ پاکستان ہے، یہاں آپ کو اخلاقیات کا خیال رکھنا پڑے گا۔ لہذا آپ ایک ہی گھر کے دو لڑکوں کو بے وقوف نہیں بنائیں۔“

”اوہو!“ ہوی کے لبوں سے جو سنسناتا ہوا تیر لگا تھا۔ سیدہ شعاع کے دل میں بیوست ہو گیا۔ اگر وہ ایک سہارا نہ لے لیتی تو یقیناً اسی دشمن جاں کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی۔

”تھکا کے لیے ہمایوں بھائی! میری اتنی تھکیل نہ کیا کریں۔ پلیز پلیز۔“ اس سے قبل کہ وہ بے ہوش ہو کر گرنے لگے۔ اشعر نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

”ہونہہ! یہی کچھ تو چاہتی ہے یہ!“ ہوی زہر خند لہجے میں بولا۔  
”شٹ اپ! ہوی! گھٹیا انسان!“

اشعر کا اٹھنا ہوا ہاتھ ہوی کے منہ پر نشان چھوڑتا چلا گیا۔ ہوی غضب ناک ہو گیا۔  
”تم۔ تم۔ تم۔“

”خبردار جو ایک لفظ بھی کہا ہوا۔ شعاع میری بہن ہے شفق، افق کی طرح اور آئندہ تم نے اس کے لیے کوئی نجات کی یا سوچی۔ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا، آؤ شعاع۔“



اشعر، شعاع کو سہارا دے کر ساتھ لے گیا۔ ہوی جانے کیوں پشیمان ہو گیا۔ راشکو اس بات کا ہاتھ اس کا بھی غصہ سے برا حال ہو گیا۔

”نجانے یہ ماں بیٹا گھر میں کیا قیامت لانا چاہتے ہیں۔ ہر وقت اس معصوم کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ میرا بس چلے تو۔“ راشو نے ہاتھ پر مٹھا مارا۔

”تم اپنے جذبات پر قابو رکھا کرو راشو! ان دونوں نے بچاری پکاکم الزام لگائے ہیں۔ سیدہ بچہ یہاں تک کہا ہے کہ اگر شعاع اس گھر کے کسی لڑکے سے منسوب ہوئی تو وہ سب کا جینا حرام کر دیں گی۔“

”تو اب کون سا جینے دے رہی ہیں اور وہ کون ہیں شعاع کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی، یہ سب خدا ہاتھ میں ہے اور پتا ہے اشعر! مجھے جس روز شعاع کی تائید حاصل ہوگی ناں تو چچی جان تو کیا سارے زمانے ٹکرا جاؤں گا۔“ راشو نے زور سے دیوار پر مٹھا مارا۔

”آرام سے شہزادے میرے بچوں! ویسے یہ زمانہ نہیں دیوار ہے، ویسے میں تیرے ساتھ ہوں۔“

اشعر راشو سے بغل گیر ہو گیا تو وہ مسکرا پڑا۔

اس روز والے واقعے سے ہوی بڑا اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ گو کہ اشعر نے اسے تھپڑ مارا تھا مگر ہوی کو اسے ہور ہاتھ کہ اسے اشعر کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ عجیب سی الجھن کا شکار رہتا۔ وہ اشعر سے سوڑ کر چاہتا تھا۔ اس روز وہ اس کے کمرے میں آ گیا۔ اشعر نے خشکیں لگا ہوں سے اسے دیکھا پھر کتاب پڑھنے لگا۔

”یار اشعر! میں سوڑی کرنے آیا ہوں۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا۔“

ہوی عداوت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اشعر نے نیکی لگا ہوں سے اسے دیکھا اور کتاب میز پر ڈال دی۔

”سوڑی کرنی ہے تو شعاع سے کرو۔ کیونکہ تم نے اسی پر شک کیا۔ اس کو غلط سمجھا۔ کیا سوچتی ہوگی۔“

سی لڑکی کہہ کیسے ہیں یہ لوگ۔“

”یار اشعر! کیوں تم لوگوں نے اس لڑکی کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے۔ جب سے آئی ہے ہم تینوں کی وہ خراب ہو کر رہ گئی ہے۔ راشو ہے تو اسے کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں۔ مجھے افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ ایک لڑکی کی وجہ سے ہماری دوستی خراب ہو رہی ہے۔“

”ہوی! زبان سنبھال کر بات کرو۔ تمہارا تو بیڑا غرق کر دیا ہے چچی جان نے تم دونوں تو عالی آتی۔ حوصلے اور ظرف کی تو بین کر رہے ہو، تمہیں شرم آتی چاہیے، شعاع کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہوئے تسلیم کرو نہ کہ وہ شعاع ہم میں سے ہے اور اس گھر کی، ہم سب کی عزت ہے۔“

”ہاں ہوگی تم لوگوں کی اور۔“

”اشعر بھئی! فارم اوہ!“ کھلے دروازے سے شعاع ہاتھ میں فارم لیے آگئی تو ہوی کی بات اور حوصلے اور شعاع کی زبان کو بھی اسے دیکھ کر بریک لگ گئی، دل دھڑک اٹھا۔ نجانے اب کیا کہہ دے۔ وہ وہاں سے لپے مڑی۔

”مٹھو شعاع! لاؤ فارم۔“ اشعر نے فارم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ہوی نے ایک نظر شعاع پر ڈالا۔

باہر نکل گیا۔

شعاع کی اس گھر میں عجیب سی حیثیت تھی۔ سیدہ بیگم اور ہوی کے علاوہ سب ہی بے پناہ محبت اور

چہرمان دونوں کی ذرا سی بات ایک نظر ہی باقی سب کی محبتوں، محتاتوں پر حاوی ہو جاتی تھائی میں اکثر وہ کرتی وہ دلفریب منظر نظروں میں محسوس جاتے، جب وہ امی ابو کی محبت کا واحد مرکز ہوا کرتی تھی۔ اس کی باتوں میں نمی تو وہ دونوں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اب حالات نے اسے کس دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ بے باتوں ہوتے ہوئے بھی سزا بھگت رہی تھی۔ باپ کی خطا کی سزا اور اڑھری تھی۔ سیدہ بیگم اور ہوی ایسے کچھ کے لئے کہ کبھی بھی تو وہ گھر سے نکلتی۔ کس سے کہتی۔ کوئی بھی تو اپنا نہیں تھا۔ آغا بی اور بی بی جان سے بھی نہیں کہہ سکتی تھیں۔ کچھ کہتے تو اس کے لیے اور مشکل ہو جاتی۔ ایک مہربان عابی ہی تھیں مگر ان کی طبیعت بھی اسے دیکھ کر بکڑ جاتی تھی۔ اس لیے وہ ان کے سامنے بہت کم جاتی مگر اس ڈھلتی ہوئی شام میں اس کا دل بہت اداس تھا۔ نو کی بھی اسے خبر نہیں آتی تھی۔ وہ عابی کے کمرے میں آگئی۔

”ارے شعاع آؤ۔ بیٹے آؤ۔“

عابی کی مہربان محبت نے اس کے لیے بازو پھیلا دیے تو وہ ان کی سمانی۔ کتنا سکون تھا ان ہاتھوں میں۔ وہ کئی ہی دیر ان کے ساتھ لگ رہی۔

”شعاع! کیا بات ہے؟ آج تم بہت اداس ہو؟“

عابی نے اس کی غم ٹھیکیں اپنے ہاتھوں سے صاف کر دیں تو وہ کتنی ہی دیر ان کے ہاتھ تھانے عابی کو دیکھتی رہی۔ واقعی اللہ تعالیٰ نے فرصت میں بنایا تھا ان کو۔ عمر کا سورج ڈھلنے کے باوجود حسن چمک رہا تھا پھر۔ پھر ابو نے کیوں نہ شادی کی ان سے؟ کیوں نہ چاہا ان کو؟

”کیا دیکھ رہی ہو شعاع!“

”وہ کی تلاش کر رہی ہوں آئی! جس کی بنا پر ابو نہ آپ کو چاہ سکے اور نہ شادی کر سکے۔“

بات کیا تھی۔ تیر تھا جو سیدہ عابی کے دل میں بیوی ست ہو گیا۔ وہ کھڑی ہو گئیں اور رینگ کے ساتھ ٹیک لگا کر کئی ہی دیر شعاع کو دیکھتی رہیں۔

شعاع گھبرا گئی کہ کہیں ان کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔

”شعاع! میری جان! بات کمی کی نہیں ہوتی۔ مقدّر کی ہوتی ہے، اور پھر محبت تو احساسات کا نام ہے، جو خود بخود کسی دوسرے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ دل ہی تو احساسات کا منبع ہوتا ہے اور دل کو اس کی مرضی کے خلاف دھڑکنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے میں فرمان کو قصور وار سمجھتی ہوں نہ خود کو، نامراد بد نصیب نہ مقدّر کی بات ہوتی ہے۔“

”تو پھر پھر آئی جان! مجھے کس گناہ کی سزا ملتی ہے؟ کیوں پل پل مجھے طعنوں پر چڑھایا جاتا ہے کہ۔“

شعاع عابی کے ساتھ لگ کر پھوٹ پڑی۔ آج جانے کیسے ضبط کا دامن ہاتھ سے چھٹ گیا تھا۔ شاید اس نے سنا تھا کہ سیدہ بیگم اور عذرا بیگم اس کی اور اس کی پیاری امی کے بارے میں باتیں بنا رہی تھیں وہ سب کچھ مداخلت کر سکتی تھی۔ مگر اپنی مرحومہ ماں کے کردار پر کچھ برداشت نہیں کر سکتی تھی اور سیدہ بیگم نے ہمیشہ ان کی باتوں کی گوارا بخشی کی تھی۔ ان کو غلط صورت قرار دیا تھا۔ یہ باتیں اس کی روح میں شکاف ڈال دیتیں۔

”شعاع۔ میری بیٹی! کیا بات ہے کسی نے کچھ کہا ہے یقیناً ہوی نے بدتمیزی کی ہوگی آپا نے خراب کر دیا۔“

سیدہ بیگم نے ہوی کو روک دیا۔ تو خیر آپا کو تو میں سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔ وہ تو میرے بس کا روگ نہیں۔ مگر وہ

تو میں ٹھیک کر کے رکھ دوں گی۔“

عالی نے شعاع کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ اسی وقت دروازہ زور سے کھلا۔

”خالہ جان! آپ تیار ہیں ناں۔ چلیے پھر۔“

سفید شرٹ سیاہ جینز کی پیٹ میں خوشبو میں نہایا کہیں جانے کو تیار کھڑا تھا۔ اس پر نظر پڑے ہی تاہم اس کے چہرے پر ابھرا۔

”شیطان کی طرح ہر جگہ موجود ہونا تو ضروری ہے ناں جیسے۔“

ہوئی نے اتنی ہی آواز میں کہا جس کو صرف شعاع ہی سن پائی۔

”میں کہیں بعد میں جاؤں گی۔ پہلے میری طرف دیکھو۔“ عالی نے اسے شانوں سے تھام کر اپنی طرف کر لیا

”ہوئی!“ تم میرے بیٹے ہو۔ میری تربیت تو یہی تھی کہ تم اپنے خطا کار دشمن کو بھی معاف کر دو، ہر کسی

محبت سے پیش آؤ۔ بے قصوروں کو عتاب کا نشانہ نہ بنانا کہاں سے سیکھ لیا ہے تم نے، بتاؤ، جواب دو۔“

عالی نے ہوئی کے شانوں پر دباؤ ڈال کر پوچھا تو اس نے ایک قہر آلود نگاہ شعاع پر ڈالی۔

”خالہ جانی! اگر آپ بے مبادی بے قصوروں کی باتوں میں آکر اپنے بیٹے سے جواب طلب کریں گی تو

جواب دے سیکے گا آپ کو۔“

وہ کھیلے لہجے میں کہہ رہا تھا اور شعاع کو افسوس ہو رہا تھا کہ ناحق اس نے آنٹی سے بات کی۔ اب ہوا

مزید اسے طعنے دے گا۔

”آپا کو تو سمجھانا بے کار ہے، مگر تم شعاع پر طنز کیوں کرتے ہو۔ جب میں سب کچھ بھلا چکی ہوں۔“

کوئی قصور وار تھا تو فرمان تھا۔ میں اسے بھی معاف کر چکی ہوں تو کیوں اسے بے گناہ کو ٹھک کرتے ہو تم لوگ۔“

”اُمی جان درست ہی کہا کرتی ہیں، ایسی عورتوں کے لیے دوسروں کو پھانسا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی!“

ہوئی! عالی کا نازک ہاتھ ہوئی کے رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔ ہوئی نے سکتی آنکھوں سے عالی کو دیکھا

نفرت کے ساتھ شعاع کو دیکھا جو دل تھا اس وقت کو پچھتا رہی تھی کہ کیوں وہ یہاں آئی اور آنٹی سے بات

کی۔ ابھی وہ ہوئی کی کہی ہوئی بات کی ذلت سے نکل بھی نہیں پائی تھی کہ عالی ترپنے لگیں۔

”آنٹی! آنٹی جان!“ شعاع چیخ پڑی تو ہوئی زور سے تک جا چکا تھا۔ تیر کی سی تیزی کے ساتھ بنا

کی طرف بڑھا جو بے ہوش ہو چکی تھیں

”نکل جاؤ منحوس لڑکی یہاں سے۔ آئندہ میں تمہیں نہ دیکھوں۔“

ہوئی غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے عالی کو بازوؤں میں تھام کر بیڈ پر ڈالا اور شعاع کو پرے دھکیلا

باہر نکل گیا۔ شعاع نے ایک نظر بے ہوش پڑی عالی پر ڈالی اور سسکیوں کو دہانی اپنے کمرے میں آگئی۔ پھر

کچھ ہوتا رہا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ اسے معلوم تھا سیدہ بیگم اور ہوئی خوب زہرا گل رہے ہوں گے۔

”یا اللہ یہ کیسی زندگی ہے میں نے تو ایسی زندگی کا بھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اتنی مخالفت ایسی ریک بانٹا

برے بارے میں کیونکر ان مخالفوں کا مقابلہ کر پاؤں گی۔“

وہ تنہائیوں کے گلے لگتی کتنی ہی دیر روئی رہی۔ عالی تو ٹھیک ہو گئیں مگر شعاع پر ہوئی اور سیدہ بیگم نے

ت مزید تنگ کر دیا۔ شعاع تو اب ہوئی کے سایے سے بھی کترانے لگی تھی۔ اس روز ہال کمرے میں خوب

لڑائی ہوئی تھی۔ یاسر وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ اس کا بھی جی چاہا کہ سب میں مل بیٹھے۔ اس نے ذرا سا پردہ

کھینچ کر خوش تھے کتنے پرسکون اور روشن تھے ان کے چہرے سب یاسر کی کسی بات پر ہنس رہے تھے

بے زیادہ بلند قہقہے ہوئی کے تھے جو اس کے عین سامنے ہلکے آسانی شلوار سوٹ میں بے ساختگی سے ہنستا

ہاتھ اچھا لگ رہا تھا۔ جانے کیوں وہ دشمن جاں اسے اس وقت اتنا اچھا لگا کہ وہ اسے دیکھے گئی مگر جلد ہی

دل کر داپہی کے لیے مڑ گئی مگر راشوا سے دیکھ چکا تھا۔ اتفاق سے ہوئی کی نظر بھی اسی وقت شعاع کے آنکھوں پر

پڑی۔ راشوا ہنسی سے سب کی نظر بچا کر باہر آ گیا۔ ہوئی کی ہنسی کو بھی بڑیک لگ گئی وہاں پھر اس سے بیٹھا

بچا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا اور بالکونی میں کھڑا ہو گیا، جہاں اسے لان میں گلاب کے تختوں کے بیچ کھڑ

خاں اور راشوا صاف نظر آ رہے تھے۔

”اے شعاع! تم اندر کیوں نہیں آتیں؟ سب میں مل کر بیٹھا کرو۔“

راشوا نے ایک ادھ کھلی سی کلی توڑ کر شعاع کو دیتے ہوئے کہا تو ایک دم کی مسکراہٹ شعاع کے لبوں پر

پائی۔

”ہی یہ سوچ کر نہیں آتی تھی کہ میری جگہ سے اتنا اچھا ماحول خراب ہو جائے گا میری آمد، وہاں کے لیے

اں ہوتی اور وہ اٹھ کر چلا جاتا۔ دیے بھی جھپٹے ہوئے سب لوگ بہت اچھے لگ رہے تھے۔“ یہ کہتے ہوئے

بالکون پر کھڑی کھڑی ہو گیا کہ اس کا کسی خوشی، کسی ہنسی پر حق نہیں تھا اس گھر میں۔

”ایک باتیں نہیں کرتے شعاع! تمہارے آنے سے ماحول کیوں خراب ہوتا۔ ہوئی بڑا اچھا لڑکا ہے،

اباں کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ اندر چلو۔ ساری فوج تمہارے کمرے میں پہنچ چکی

لے کیونکہ ان سب کا خیال ہے، تم ٹریٹ دینے کے ڈر سے رد پوش ہو گئی ہو۔“

”ٹریٹ! کیسی ٹریٹ!“ شعاع رک کر حیرانی سے راشوا کو دیکھنے لگی۔

”اے بھی، یونیورسٹی میں ایڈمیشن کی خوشی میں۔“

”اوہ اچھا تو یہ کوئی اتنی اہم بات تو نہیں۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

”اے بھی، غیر اہم ہوگی تمہارے لیے مگر ان بدتمیزوں کو تو ٹریٹ کا بہانا چاہیے، سول گیا ہے، دیے بھی

انفال ہے، ایسی گیدرنگ ہوتی رہتی چاہیے۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا!“

”ٹھیک ہے راشوا بھائی! اگر میری ذات سے اتنے لوگوں کو خوشی مل سکتی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہے، میں تو

ذات سے ہر کسی کو خوشی ہی دینا چاہتی ہوں۔“ شعاع نے کلی کو لبوں سے لگایا۔

”ٹھیک ہے مگر تم ان لوگ کے سامنے ٹریٹ دینے سے انکار کر دیتا۔“

”کیوں بھلا؟“ شعاع حیرانی سے راشوا کو دیکھنے لگی۔

”کوئی تنگ کرنے کے لیے۔“

”اچھا!“ شعاع دل کشی سے مسکرا پڑی اور راشوا کے ہنسنے پر ہنسنے لگی۔

”پانی نکالو گا۔ اوپر سے پار سا کتنا بنتا ہے۔“

مناظرہ ہوئی کو غصہ آیا تھا۔ اتنی ہی زور سے اس نے بالکونی کا دروازہ بند کیا، شعاع نے چونک کر بند

کے کونے کو دیکھا۔

”آپ کہاں غائب تھیں شعاع باجی! ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں۔“

یاسر اور نوبی تیزی سے شعاع کی طرف بڑھے تو وہ مسکرا پڑی۔

”ہوں تو اب سمجھا۔ تمہارے محفل سے غائب ہو جانے کا مطلب۔“

اشعر نے آہستگی سے راشو کے کان میں کہا۔

”شرم کرو، وہ ہماری کزن ہے۔“ راشو نے اسے ٹوکا۔

”اور تم شکر کرو کہ کزن ہے، کزن میں تمہارا سارا دو بدل ہو گیا تو۔“

”یہ آپ دونوں کیا کھجڑی پکار ہے ہیں۔؟“ بوبی ان دونوں کے درمیان آن کھڑا ہو گیا۔

”چلیں شعاع باجی پروگرام بتائیں ٹریٹ دینے کا۔“

سب کے سب اس کے گرد جمع تھے۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”بھئی، ایسی کیا خاص بات ہوئی ہے کہ ٹریٹ دی جائے۔“ وہ راشو کے کہنے پر انکار کر رہی تھی۔

”ارے واہ اتنی اہم بات ہوئی ہے۔ اس گھر کی بلکہ خاندان کی پہلی لڑکی کو یونیورسٹی میں داخلہ

ہے۔ یہ کیا کم اہم بات ہے۔“

”اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ ہی آخری لڑکی ثابت ہوں گی جو یونیورسٹی تک پہنچی ہے۔“

یاسر نے بڑے پر زور انداز میں یقین دلایا۔

”کیوں بھلا؟“ شعاع نے مسکرا کر ان شریروں کو دیکھا۔

”کیونکہ نہ کسی کے پاس اتنی ذہانت ہوگی اور نہ وہ یونیورسٹی جائے گی۔ محفل کا فہدان ہے، شعاع

ہمارے گھر کی لڑکیوں میں۔“

”اچھا تم سے زیادہ محفل مند ہیں ہم لوگ۔“ صدف اور فائزہ چلائیں۔

”چلو، ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ صدف! تم یاسر اور شرجیل پر مختصر مضمون لکھو لکھو یا پڑھ کر سنادو۔“

جائے گا۔“

اشعر درمیان میں آتا ہوا پولا تو صدف تقریر کرنے والے انداز میں شروع ہو گئی۔

”یاسر اور شرجیل بڑے بد تمیز جانور ہیں۔ انہیں زیادہ تر بار برادری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

رپڑھے کے ساتھ جوت کسفر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان کو الگ الگ بھی جوتا جاسکتا ہے۔ ان کی آواز پر لا حول

جاتی ہے اور جب یہ دولتیاں مارتے ہیں۔“

”تو بندہ منہ کے بل گر جاتا ہے۔“

یاسر اور شرجیل دونوں نے صدف کی ٹانگ پر پاؤں مارے۔ اگر وہ زمین پر گرتی تو کم از کم وہ

والے دانت ضرور گر جاتے۔ راشو نے اسے تھام لیا۔

”آپ درمیان سے ہٹ جائیں راشو بتایا! اس نے ہمارے بھائیوں کی تو جین کی ہے ہم اس کا بچہ

بگاڑ کر دوسروں کو درائیں گے۔“

نوبی اور بوبی بھی صدف کی طرف بڑھے مگر شعاع نے روک دیا۔

”بھئی، اب دولتیاں مارنے والوں کی عزت نفس کا خیال رکھا جائے گا۔ لہذا لڑائی جھگڑا بھلا کر

دیکھاں جاتا ہے۔“

شعاع کے کہنے پر سب پروگرام بتانے لگے مگر لڑکیاں اگر مشرق کی بات کرتیں تو لڑکے مغرب کو چل

جاتے۔ لہذا ملے ہوا کہ سارا دن ہر جگہ دیکھی اور گھومی جائے گی۔ بارہا دیکھی ہوئی جگہوں کو دیکھنے کی خوشی سب کو

دی تھی۔ خوب پروگرام بن رہے تھے۔ ہونی کو سب خبر تھی اس کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ سب کے ساتھ

جائے۔ انجوائے کرے مگر آٹھ رے تھی اور دوسرے کسی نے اسے لفٹ ہی نہیں کرائی تھی۔

”بھئی! آپ بھی چلیے ناں سب ہی جا رہے ہیں۔“

اس کی چھوٹی بہن گڑیا نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا تو اس نے اسے ٹال دیا۔

”میں گڑیا وقت نہیں ہے بہت پڑھتا ہے۔“

”پلیز بھئی! آپ کے بغیر حرا نہیں آئے گا۔“

گڑیا نے حریدا اصرار کیا اس وقت شعاع راشو کے ساتھ مسکراتی ہوئی اندر آگئی تو اس کی نین تن ہو گئیں۔

”کہہ جو دیا گڑیا! میں نہیں جاؤں گا، نہ تو میں فالتوں انسان ہوں اور نہ ہی مجھے ان گھٹیا لغویات سے کوئی

لگا ہے۔“

اس نے زہر خند لہجے میں ایک حیر شعاع اور راشو کی طرف اچھالا۔ گویا وہ لوگ فالتو بھی ہیں اور گھٹیا

بات کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ اور جب وہ سب ہنستے مسکراتے ایک دوسرے سے مذاق کرتے گاڑی میں غصے

ہے تو کھڑکی میں کھڑے ہوئی کا دل حدت سے چاہا کہ وہ بھی ان زندہ دلوں کی محفل میں شامل ہو جائے مگر

الاک کی باتیں یاد آجائیں۔ وہ جھنجھلا کر کھڑکی کے پٹ بند کر کے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ شعاع نے دھند کے پیچھے

عالم کی بند کھڑکی کو دیکھا اور صدف کے برابر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”راشو میاں! گاڑی ذرا دھیان سے، ہوش دھواس سے ڈرائیو کرنا۔ اتنی ذمیر ساری جانوں کی زندگی ہے

لہاں ہاتھ۔“

اشعر نے شوق لہجے میں معنی خیز نظروں سے راشو کو دیکھا جو سائیڈ مرر سے شعاع کو دیکھ رہا تھا۔ یوں چوری

کرتے جاتے پر اشعر کو شکایتی نظروں سے دیکھتا گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ راستے بھر لڑکے لڑکیاں شور و غل

مچاتے جا رہے تھے۔ یاسر، بوبی، بوبی، شرجی کی باتیں اور صدف وغیرہ سے نوک جھونک پر شعاع بے ساختگی سے

لڑائی تو راشو جانے کیوں خود کو پرسکون سمجھوس کرتا۔ سب سے زیادہ انجوائے ان لوگوں نے ہی سائیڈ پر کیا

پہنچا۔ بچے چھانے پانی سے کھیل رہے تھے۔ ڈوبتے سورج کی ہنسی کرنوں کی لالی میں ایک ہنجر پر خاموش

شعاع دور تک سمندر کی حدود کو دیکھ رہی تھی۔ کرنوں کی سرخی اور شعاع کے اندر کے سونے اس کے چہرے

پر ایک خاص بخش دیا تھا جس پر راشو کی نگاہیں ٹھہر کر رہ گئی تھیں۔ اشعری نظر راشو پر پڑی تو اس نے ایک چھوٹا

نکاح لگا کر راشو کی طرف اچھالا جو اس کی ناک پر لگا۔

”اس ٹکڑی کیا ضرورت تھی۔ سب سے سزا ہنجر تو تم خود ہی ہو۔“

راشو نے شاکی لہجے میں برہم نکاحوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا سوری یارا! وہ محذرت کرتا آگے بڑھ گیا تو راشو شعاع کے قریب چلا آیا۔

”شعاع۔“ راشو نے دھیرے سے پکارا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”تم ہر وقت یوں ہی سوچوں میں گم رہتی ہو شعاع! خوش رہا کرو۔“

راشوی لگا ہیں اس کے نچلے ہونٹ کے بائیں جانب سیاہ تل پرغبر گئیں۔

”خوش!“ شعاع نے آہستگی سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ اور خنڈی ریت پر راشوی کے ساتھ چلے گئی۔

”خوشی تو راشوی بھائی! ایک ست رنگی خوش نمائل ہے جس کو پکڑنے کے لیے انسان تمام عمر اسے پیچھا کرتا ہے اور جب اس تک پہنچ پاتا ہے تو اس کے تمام رنگ اڑ چکے ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی تو ایسا ہوا ہے۔ میں نے رنگ کو پانے کے لیے کتنی محنت کی تھی۔ کتنی دعائیں کی تھیں اور جب۔“

نرم لہروں کے زیر و بم میں اس کی ہنسی آواز ابھرنے ڈوبنے لگی تو راشوی اس کے لیے دھکی ہو گیا۔ کئی طرح حسین اور خیال کی طرح نازکی لڑکی کس طرح ٹوٹ رہی تھی۔

”ایس باتیں نہیں کرتے شعاع! ایسا بھی تو ہو سکتا ہے ناں کہ تھلی کے تمام رنگ انسان کی ذات پر اترا آتے ہیں۔ سوچا اگر ایسا ہو جائے کہ تھلی کے تمام رنگ تمہاری ذات میں سما جائیں تو رنگوں کی برسات میں نہ رہو۔“

راشوی نے اس خوبصورت چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”راشوی تمہارا ان بدترینوں کو منع کریں۔ شے کا پروگرام بنا ہے ہیں۔“ صدف اور فائزہ بھاگتی آن لگیں۔

”ارے! حق لڑکیو! دیکھنا کتنا مزہ آئے گا۔“

لڑکے تمام چھلکے ایک ڈبے میں بھرتے ہوئے بولے۔

”اور جو انہوں نے دھنائی کر ڈالی۔“

”ارے تو تمہیں کس لیے ساتھ لائے ہیں۔“

بولی نے صدف اور فائزہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ہے۔ ہم تمہیں بچائیں گے۔“ فائزہ جلدی سے بولی۔

”جی نہیں آپ ہماری جگہ پیش کی۔“

اور پھر وہ منع ہی کرتی رہ گئیں اور یاسر اور شرعی ڈبہ لے کر ان ہی لڑکیوں کے پاس آ گئے جن سے

پٹنے رہ گئے تھے۔

”میں کہتا ہوں یہ ڈبہ میرا ہے۔“ شرعی چلا یا۔

”ایک بچا کروں گا اور سامنے کے دو دانت پھیلے پر رکھ دوں گا۔ میرا ڈبہ واپس کرو۔ دیکھیے باجی! یہ

ڈبہ واپس نہیں کر رہا۔“ یاسر نے اسی لڑکی کو کہا جس کو کچھ دیر قبل اس نے آہ بھر کر ہیر کہا تھا اور جواب میں

سنی تھیں۔

”آپا! یہ جھوٹ بکتا ہے یہ میرا ڈبہ ہے۔“ غبر فک کہیں کے۔ میں ابھی تیری کھال کا برقعہ سلا رہی تھی۔

”لیے۔“

”تو نے مجھے فک کہا۔ ڈاکو کہیں کے۔“

دونوں ایک دوسرے سے مستم تھا ہو گئے تو ڈبہ ان کے ہاتھ سے چھٹ کر ریت پر آ پڑا۔ لڑکیوں نے

سوجھی اور ڈبہ لے کر بھاگ کھڑی ہوئیں اور دروازہ کھولنے لگیں تو اندر۔ دنیا جہان کے پھلوں کے

بارے کھیاہٹ کے ان کا برا حال ہو گیا۔

”انی لڑکیوں کی لبا ہے۔“ دونوں پیچھے سے آکر بلند آواز میں بولے تو لڑکیاں تیزی سے مڑیں اور

چھلانگ پر اچھال دیے۔

”بڑے منڈے اوکی ہو یا ہے۔“

صدف، شازدہ، فائزہ کی ملی جلی آوازوں اور سب کی ہنسی میں وہ۔ ان کھیانے ہو کر کان کھانے

مارے کی خواری کے بعد لو۔ ا تو سارے کے سارے سامان گاڑی میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

”بہت بدتمیز ہیں یہ لوگ شعاع! اگر اٹھا سکتی ہو تو ایک سائیڈ سے نوکری پکڑ لو۔“

”کیوں نہیں۔ زیادہ وزنی تو نہیں۔“

شعاع نے ایک سائیڈ سے نوکری پکڑتے ہوئے کہا: ہی وقت ہوئی انگلی میں بائیک کی چابیاں گھماتا ہوا

دونوں پر تیزی نگاہ ڈالتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

”ہوی یار! آنا۔ نوکری بہت وزنی ہے۔ شعاع سے اٹھ ہی نہیں رہی تم ذرا مدد کر دو۔“

”سوری یار! راشویہ ہمدردی کا بخار تمہیں ہی راس آسکتا ہے۔ مجھے نہیں۔“

ہوی نے زہر میں بجھا تیر شعاع کی طرف اچھالا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ راشوی افسوس ہونے لگا کہ

اس نے ہوی سے کہا۔ شعاع خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ دل بہت بوجھل ہو رہا تھا دل کا سارا غبار

اٹھ کے رستے بہہ گیا کتنی تیز لیل ہو رہی تھی۔ اس کی، ہوی جانے کیا سمجھ رہا تھا کیوں وہ ایسی باتیں کرتا تھا۔

”ارے شعاع بیٹی! یہاں کیوں پڑی ہو۔ کھانا نہیں کھاؤ گی کتنی۔“

قدیرہ بانو نے لائٹ آن کر دی تو اس نے جلدی سے آنکھیں رنڈ ڈالیں۔

”انٹی جان! مجھے بھوک نہیں۔“ اس نے مہربان سی قدیرہ بانو کو دیکھا انہوں نے اکثر اسے ہوی اور سیدہ

لگا باتوں کی تش سے بچا تھا۔

”شعاع! بری بات ہے۔ ایسے نہیں کرتے۔ اس طرح سوچ سوچ کر تو تم بیمار پڑ جاؤ گی مت اثر لیا

اللہ عیاذہ اور ہوی کی باتوں کا۔ باقی سب تو تمہیں چاہتے ہیں ناں۔ چلو شاپاش۔ منہ دھو کر کھانے والے

کمرے میں آ جاؤ۔“ وہ اس کو ہاتھ روم کی طرف دھکیل کر خود باہر نکل گئیں۔ اسے بھی ایسے ہی مہربان لوگوں کے

ہاتھ بچھ کر کنا پڑتا۔ وہ منہ پر چھینٹے مار کر ڈرائیونگ روم کی طرف آگئی۔

”آ جاؤ سبز پری! میرے برابر بیٹھ جاؤ۔“

بولی نے چھوٹے ہی کہا تو وہ کچھ جھینپ سی گئی سب کے ساتھ ہوی کی نظریں بھی اس کی جانب اٹھ گئیں پر

خوشی کی جاؤ بیٹ اور بھیگی پلوں میں جانے کیا بات تھی۔ ہوی۔ بے خود سا دیکھے گیا اور بولی نے اپنے ساتھ کی

خوشی کی پیش کی تھی۔ اس کے سینے سامنے ہوی براجمان تھا وہ ہچکچاتی ہوئی بیٹھ گئی ہوی بھی سیدھا ہو گیا۔ اپنی اس

خوشی پر خودی غل سا ہو گیا۔



”کیا سوچ رہی ہو بیگم! ہم نے تو بہت سی باتیں کرنی ہیں آپ سے۔“ آغا جی نے خٹے کی نال کو منہ

حاکم کرتے ہوئے صاف بیگم کو دیکھا جو گہری سوچ میں گم تھیں۔



”سوچ یہ رہی ہوں! آغا صاحب کہ زندگی نے کیا کیا کھیل کھیلے ہیں۔ کیا کیا رنگ دکھائے اور اب یہ کیا دکھانے والی ہے۔“ بی بی جان سوچ میں ڈوبی آواز میں کہا۔

”ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے۔“ آغا جی نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

”آپ ہر وقت کمرے میں بند رہتے ہیں۔ آپ کو کیا خبر کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے آپ کی بہنوں کو؟ بیٹیوں کو کیا شکایت ہے آپ سے؟“

بہنوں کے جواب میں بی بی جان کے سامنے تھے وہ آغا جی نہیں جانتے تھے۔

”کیسی شکایت بیگم! ہم نے کسی کی حق تلفی نہیں کی۔“

”یہ تو آپ کہہ رہے ہیں ناں۔ ذرا بارہر نکل کر تو دیکھیے۔ میری بیٹی شعاع پر زندگی کے دروازے کھول رہی ہے۔“ بی بی جان دھکی ہو گئیں۔

”کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ، شعاع کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا جس طرح دوسرے حقدار ہیں۔ وہ بھی حقدار ہیں۔“ اس گھر کی۔

اس بات کے جواب میں بی بی جان نے ساری صورت حال بتادی تو غصے سے چمڑی آغا جی کے ہاتھوں لڑ گئی۔

”سیدہ کو جرات کیونکر ہوئی ایسی بات کہنے کی۔ شعاع کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ درے میں شعاع کاہر کے برابر حق ہے جب میں نے فرمان کو معاف کر دیا ہے تو پھر اور اگر نہ بھی کرتا تو شعاع تب بھی میرے دروازے کی حقدار تھی۔ سیدہ اور عذرا کو کہہ دو، ان کی حق تلفی نہیں ہو رہی اور نہ ہی وہ شعاع کے بارے کوئی بات کریں۔ آغا جی حلال میں آگے تو بی بی جان باقی کی باتیں دبا گئیں۔

”سیدہ! ہم بچپن سے اب تک ایک ساتھ رہے ہیں مگر تمہیں آج تک نہیں سمجھ سکا۔“ رحمن سیدہ کی باتوں میں زچ ہو جایا کرتے۔

”آپ نے کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ آپ کی اپنی سگی بہن کے ساتھ ایسا ہوتا تو بڑا آپ کے اور آپ کے والدین کے طرف کا پکنا نہ کھتی کہ کتنا بلند ہے۔“

سیدہ بیگم واقعی بہت کم حوصلہ تھیں۔ وہ معاف کرنے کا ظرف نہیں رکھتی تھیں۔

”سیدہ! رتی رتی ہی رہے گی۔ تمام عمر بھی تم اسے بختی رہو گی ناں تو تب بھی سا بن نہیں بنے گی جسے تم نے اپنے انتقام کی آگ کو بجھا سکو تھیک ہے۔ فرمان سے غلطی ہو گئی تھی۔ اسے اس کی سزا مل گئی اب تم اس کی جٹی پر تم آزمای ہو یہ کہاں کی بڑائی ہے۔ اوپر سے بنے کو بھی اپنی لائن پر لگا لیا۔ تمہارا کیا خیال ہے مجھے کچھ پتا کہ تم اور ہوی شعاع کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔ وہ بے چاری بچی جس کی ماں دنیا ہی میں نہیں اور باپ زندہ ہوتے ہوئے بھی پاس نہیں وہ اپنے گھر میں بھی غیروں کی طرح سہی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے حق میں بات کہہ دے تو تمہارا دشمن ہو جاتا ہے۔“

”اگر آپ کی چٹیتی یہاں پر اتنی ہی دھکی ہے تو یہاں سے کہیں کہیں اور لے جائیں یا مجھے اور میری اولاد کو گھر سے نکال دیں۔ یقیناً یہ کرنا آپ کے لیے زیادہ آسان ہوگا۔“

”سیدہ! بند کر دینی کو اس۔ سدھوتی ہے کسی بات کی۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کتنی بڑی بات کہہ رہی ہے۔“

”ہمارے انتقام کی آگ کسی طرح بجھ سکتی ہے تو مجھے مار کر میرے خون سے آگ بجھاؤ۔ لیکن خدا کے لیے یہ کچھ ختم کرو جس میں شعاع براہ راست اور باقی سب بھی چلتے رہتے ہیں۔“ رحمن صاحب کو تاؤ آگیا تو جوان کے منہ میں آیا۔ کہتے چلے گئے۔ انہوں نے بار بار آرام سے، پیار سے بیٹا کو سیدہ نفرت اور انتقام کی دلدل میں اسی حد تک پھنس گئی تھیں کہ اب ان کا لکھنا ناممکن تھا۔ انہوں نے نفرت ہوی کے اندر پھنسل کر دی تھی۔ وہ شعاع سے نفرت کا برملا اظہار کیا کرتا تھا۔ عالی اس روز والے واقعے کے بعد ہوی سے بہت خفا تھیں اور ہوی زمانے بھر کی خفا نہیں برداشت کر سکتا تھا مگر اپنی خالہ جانی کو خفا نہیں دیکھ سکتا۔ اور وہ اس سے بہت خفا تھیں۔ اوپری دل سے بات کرتیں اس وقت بھی وہ راہداری سے گزر رہی تھیں۔ خالہ جانی نے آگیا مگر وہ اسے دیکھ کر رکی نہیں۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر کتاب لے کر بیٹھ گئیں۔ اسے یکسر نظر انداز کرتی رہیں۔

”خالہ جانی! آپ بہت خفا ہیں۔ مجھ سے؟“

”ہرگز نہیں۔ جاؤ پڑھو جا کر اور مجھے بھی کتاب دیکھنے دو۔“

عالی نے اس کی طرف دیکھے بغیر روٹھے لہجے میں کہا تو ہوی نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”خالہ جانی پلیز۔ آپ مجھے مار لیں مگر خدا کے لیے مجھ سے خفا نہ ہوں۔ آئی ایم سوری۔ خالہ جانی اپلیز ہال کریں ناں۔“

وہ اچھی لہجے میں ان کے ہاتھ اپنے چہرے سے لگاے سوری کر رہا تھا۔ عالی اسے دیکھتی رہیں۔ یہ بڑا کا تو لہجہ اپنی جان سے بھی پیارا تھا مگر سیدہ بیگم نے اس کا بیڑا غرق کر دیا تھا تو اس میں اس کا کیا تصور تھا۔

”ہوی! ایک بات بتاؤ۔“ عالی اس سے اپنے ہاتھ چمڑا کر کھڑی ہو گئیں تو وہ بھی کھڑا ہو گیا اور کان بات خٹکے لے لے رہے تھے۔

”جی حکم کریں خالہ جانی!“

”صرف سیدہ آپ ہی تمہاری ماں ہیں جنہوں نے تمہیں جنم دیا ہے میں تو تمہاری کچھ نہیں لگتی ناں۔“

بات تھی کہ تیر جو سیدہ ہا ہوی کے دل میں بیوست ہو گیا وہ تڑپ اٹھا۔

”خالہ جانی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، اس سے بہتر تو آپ مجھے مار لیں۔ گالیاں دے لیں۔ مگر یہ بات نہ کہنا خالہ جانی کیوں آپ نے یہ بات کی۔“ وہ روہانسا ہو گیا۔

”یہ بات کہنے پر بھی مجھے تم نے ہی مجبور کیا ہے کہ تم اپنی جنم دینے والی ماں کی تو ہر جائز و ناجائز بات مانتے ہو۔ میری ساری تربیت کو تم نے کونوں میں ڈال دیا ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ کیسا تمہارا احترام ہے۔ کیسی بات کہہ رہی ہیں۔“

عالی کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازہ ذرا سا کھلا۔ شعاع نے اندر جھانک کر دیکھا تو سہم کر فوراً پھرت گئی۔ آج کی شام بڑی اداسی لگ رہی تھی اسے۔ اس کا بی چاہ رہا تھا کہ عالی کے پاس جے اپنے انوکھے لہجے کو کیونکہ ایک عرصے سے فرمان نے اپنی کوئی خبر نہیں دی تھی کہ وہ کہاں ہیں۔ کسی حال میں ہیں۔ خالہ جانی ہاتھوں میں ڈوب کر فرمان کی اتنی باتیں کرتیں کہ شعاع کو سکون آ جاتا مگر اس وقت ان کے کمرے پر دھنکڑ سے خالی نہیں تھا۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ لاؤنج میں آ کر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ پروگرام بھی پور

تھا۔ باقی سب لان میں تھے۔

”ارے شعاع باجی! قسم سے آپ بہت بور ہیں۔ اتنا پیارا موسم ہو رہا ہے اور آپ بور پڑ رہے ہیں۔ چلیے باہر۔“

بونی بڑے غلوص سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔ بونی بھی تو ہوی ہی کا بھائی تو خیال رکھتا تھا اس کا کاش وہ ستم کر بھی مائل بہ کرم ہو۔ ایک خیال ایک سوچ دل میں نہیں کرنا بھری تو وہ بونی ساتھ باہر آگئی۔

”بھئی، میں نے تو اپنا پارٹنر جن لیا ہے۔ شعاع باجی میری پارٹنر ہیں۔ اب کوئی ہم سا ہے تو آئے۔“ نیت لگ چکا تھا اور کچھ دیر بعد سب میں بیڈ مشن کا مقابلہ ہونے والا تھا۔ بونی شعاع کو اپنا پارٹنر لے آیا تھا۔

”راشونا تم نے۔ بونی کیا کہہ رہا ہے۔“ اشعر نے آہستگی سے راشو کے کہا۔

”بونی کی خیر کہنے دو۔ مگر کوئی اور کہہ کر تو دیکھے۔“

راشو نے ریکٹ کی جالی سے شعاع کو دیکھا، جو گلابی کپڑوں میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ایک اور راشو اڈا گڑیا تھے دوسری طرف بونی اور شعاع تھے۔ راشو نظریں بار بار شعاع کی پھٹی پھٹی جلیں میں الجھ جاتے۔ کچھ نہ کچھ کہنے کا موقع مل جاتا۔

”راشو بخیا! اوصیان سے پھیلے ناں، ہم ہار جائیں گے۔ ان کے پوائنٹ زیادہ ہو رہے ہیں۔ ہار جائیں۔“

گڑیا کو لکڑی ہو رہی تھی کیونکہ راشو کے اچار ہار ہی کے تھے۔

”گڑیا رانی! تم نے پارٹنر ہی ہارا ہوا چنا ہے۔ اب ہار لینی ہے؟“ اشعر نے بھی خیر جملہ اچھا لاف۔ مسکرا دیا۔

”گڑیا! اس سے کہہ دو کہ بعض ہاریں زندگی کی ہر جیت سے پیاری ہوتی ہیں۔ لو ہم نے مان لیا کہ ہارے آپ جیتے۔“

راشو نے باقاعدہ ہار تسلیم کرتے ہوئے ریکٹ شعاع کے قدموں میں پھینک دیا تو وہ دلکشی سے مسکرائی۔

”ہزار! ہم جیت گئے۔“ بونی نے بلند غرہ لگایا۔

”اوتھوں اتر او نہیں۔ سنا نہیں تم نے۔ بعض ہاریں زندگی کی ہر چیز سے پیاری ہوتی ہیں۔“

اشعر نے بونی کا بازو دبایا۔ تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرایا۔

”جائیے راشو بخیا! ہم آپ سے نہیں ہوتے۔ آپ جان بوجھ کر ہارے ہیں۔“

گڑیا ناراض ہو کر اندر چلی گئی۔ وہ راشو کی سدا کی پارٹنر تھی۔ کیونکہ راشو ہر کسی سے جیت جایا کرتا تھا۔ آج ہار گیا۔

”ارے گڑیا تو ناراض ہو گئی اس ہار سے۔“ شعاع نے گڑیا کو دیکھا جو بھاگتی ہوئی اندر جا رہی تھی۔ ”خجی ہے ناں۔ ابھی سمجھتی نہیں۔ ہار اور جیت کی اہمیت کو اور نہ ہار کی نوعیت و حیثیت کو۔“

راشو اور اشعر کی باتیں خود شعاع کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ وہ بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔



حارث اور ایاز کی حیثیت شرمین کے لیے ایک سی ہی تھی۔ مگر شرمین ایاز کے لیے کیا تھی۔ حارث کو بھی طرح خبر تھی۔ دونوں میں زبردست انڈر اسٹینڈنگ لگ تھی۔ دوسری جگہ حارث کے لیے ایاز کا شرمین کے مگر آواز نہ آتا جانا تھا۔ جبکہ حارث نے آج تک شرمین کے گھر کی دلیہ نہیں دیکھی تھی حالانکہ اس کا بار بانی چاہا مگر آواز نہ آتا جانا تھا۔

”یار! ایسی بھی کیا بزدلی کہ تم اپنی پھوپھو کے گھر جانے سے کتر آؤ اگر وہ تمہاری لگی پھوپھو ہیں تو تمہیں ان سے ملنا چاہیے۔ تاکہ پتا تو چلے کہ صورت حال کیا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ جمال میں جھوٹ کہہ رہا ہوں کہ شرمین کی اسی میری لگی پھوپھو ہیں۔“ حارث نے سرکٹ الٹ کر بڑے میں بجاتے ہوئے کہا۔

”جھوٹ نہیں ہے تو حارث آگے بڑھو اپنی پھوپھو سے ملو۔ پتا تو چلے کہ اب ان کی سوچ ان کی محبت میں متاثر کیا آیا ہے۔ تمہارے اور تمہارے والد کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے ایک بار ان سے مل تو لو۔“

”اچھا ایسا ہے تو میں ان سے کل ہی ملنے جاؤں گا لیکن تم اس ایاز کہنے کا پتا صاف کرنے کی کوشش کرو۔“

”نہ تک یہ ہے جب تک۔“

”کیا بزدلوں والی بات کی ہے جمال کا یا ہر کر۔ ارے احق دشمن کے بغیر تم میدان کیسے مار سکتے ہو۔“

”تمہاری قابلیت کا تو تب ہی پتا چلے گا، جب تم اپنے دشمن کو میدان میں لگا کر کچھا ڈو گے۔“ جمال نے اس کے

ناتے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”بات تو تمہاری بھی درست ہے۔ حارث قائل ہو گیا۔“

”بد معاش تو تم ہو حارث شاہ! مگر کچے کچے میرا معاملہ ہوتا تو بات یہاں تک پہنچتی ہی نہ دشمن بھی نہ رہتا اور لڑکی بھی۔“

جمال نے مسکرا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اسی لیے تو تمہاری شاگردی میں آیا ہوں یار۔“

اگلے ہی روز جب شرمین ابھی کالج میں تھی حارث اس کے گھر پہنچ گیا۔ نورین اندر آئیں تو وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔

”مجھے حارث شاہ کہتے ہیں پھوپھو۔“

حارث نے ذرا سا جھک کر اپنا تعارف کرایا تو خون نے ایسا جوش مارا کہ ہزار نفرت کے باد جو نورین نے

حارث کو ساتھ لگا لیا۔

”جیتے رہو۔ آج خیال آیا ہے پھوپھو کا۔“ نورین نے اس کی پیشانی کو چوم لیا تو وہ حیران کن نظروں سے

ان کو دیکھتا رہا۔ اتنی مہربان ہستی اتنی پاکیزہ روپ والی اس کی پھوپھو کی کہانی کیسی تھی اور وہ کیسی تھیں۔

”بس ایک خوف سا تھا پھوپھو کہ کہیں آپ ٹھکرانہ دیں۔“ وہ اپنے خوف کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

”ہوں میں جانتی ہوں یہ خوف تمہارے باپ کا عطا کردہ ہے۔ خیر بیٹھو میرا خیال ہے اب تمہارا خوف دور

ہو گیا ہو گا۔ یہ بتاؤ لیکن کس کا حال احوال پوچھوں کون ہے میرا وہاں۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بہن نہ بھائی۔“ نورین

اُبلنے ہو گئیں تو حارث کی بات پر چونک گیا۔

”جی آئمہ باجی۔“ نورین کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ حادث کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ایک نیس  
رہے بعد نورین کے دل میں اٹھی۔

”آئمہ بے چاری۔ خدا کرے اس کی زندگی میں بھی کوئی حمیرا اور شہزاد آ جائے۔“

اسی وقت شرمین اندر آئی۔ حادث کو دیکھ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”حادث تم یہاں؟“ وہ حیران نگاہوں سے حادث کو دیکھ رہی تھی۔

”ہاں میں۔ ایسی کوئی انہونی بات تو نہیں میرا یہاں آنا۔ اور پھر ایاز اگر اپنے ماموں سے ملنے یہاں آ سکتا

ہے تو کیا میں اپنی پھپھو سے ملنے یہاں نہیں آ سکتا۔“

اب یہاں پھر وہی پہلے والا حادث کھڑا شرمین کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”بڑی جلدی خیال آگیا پھپھو کا۔“ شرمین نے فائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”چلو، مجھے آؤ کیا مگر تمہیں تو اسے ماموں کا اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ۔“

”وہ شخص جسے میری ماں نے بھائی تسلیم نہیں کیا۔ میں ماموں کی عمر مان سکتی ہوں۔“

”شرمین امیری بات۔ مگر آیا سہمان خواہ تمہارا دشمن ہی کیوں نہ ہو اس کی عزت کرنی چاہیے۔ دل آزادی

نہیں حادث بیٹے! تم خیال نہ کرنا۔ یہ کچھ جذباتی لڑکی ہے۔“

حمیرا کو شرمین کی بات نہیں بھائی۔ انہوں نے شرمین کو تنبیہ کی تو حادث اس پر وقاری عورت کو دیکھ کر رہ

گیا جس کے بارے میں اتنا جی نے کیا کیا باتیں بتائی تھیں۔ پھر حمیرا اس سے ہر موضوع پر باتیں کرتی

رہیں۔ نورین اور شرمین اٹھ کر ذرا دیر کو باہر نکل گئیں۔ حادث سن رہا تھا۔ شرمین، نورین سے کہہ رہی تھی۔

”جی پتا ہے رات کو ایاز آپ کے پاس آ رہا ہے ایک خاص مقصد کے لیے۔“

شرمین نے کہا تو حادث کے کان ایاز کے نام پر کھڑے ہو گئے۔ حمیرا کی باتوں میں اس کا ذرا بھی دھیان

نہیں۔

”کیسا خاص مقصد؟“ نورین کی آواز میں حیرت اور سوال تھا۔

”وہ ناں نمی! ہمیں موسم بہار کی دس چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ ایاز نے کہا ہے کہ وہ مجھے اپنے گاؤں یعنی پھپھو

کاؤں کے گاؤں لے کر جائے گا۔ ہوی اور اس کے کزنز بھی جائیں گے۔ میں چلی جاؤں ناں۔“ شرمین بڑے لچکی

لچکے میں اجازت طلب کر رہی تھی۔ نورین سوچ میں پڑ گئیں۔

”تم اپنے ناں نمی! میں چلی جاؤں۔ میرا بہت دل چاہتا ہے گاؤں دیکھنے کو۔ پلیز نمی۔“

شرمین افسند نہ کرو، ویسے بھی میں شہزادے سے پوچھتے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ان کو آنے دو تو پھر پوچھ

نہا۔“ نورین نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا۔

”اچھا تو یہ شاہد ایاز صاحب کے۔ دیکھ لوں گا۔“

حادث جیبوں میں ہاتھ ڈال کر وہاں ہی کے لیے کھڑا ہو گیا۔

حادث ہوٹل جانے کے بجائے سید صاحب جمال کے گھر آ گیا۔

”اچھا تو تم کیا چاہتے ہو، ایاز شرمین کو اپنے گاؤں لے کر جائے۔“

جمال نے سگریٹ کے دھوئیں سے فضا کو آلودہ کرتے ہوئے حادث کو دیکھا۔

”ایسا کیوں کہا آپ نے پھپھو؟ ماں باپ اور بہن نہ سہی مگر بھائی تو ہے آپ کا وہاں۔“

”ہونہ بھائی ہوتا تو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ بھائی نہیں تھا میرا۔ ایک ظالم و جاہل جاگیردار تھا جس کی روبرو

میں خون نہیں برف جمی ہوئی تھی۔ اس بے حس انسان نے مجھے اپنی جاگیر کی فیصلوں میں قید کر دیا۔ میری آزادی

سلب کر کے میری سوچ کو بھی مٹا دینا چاہتا تھا جو اس کے غیر انسانی فیصلوں کو نہیں مانتی تھی۔ وہ سوئی بیٹا

پہلی بار آئے ہو اور میں ایسی باتیں لے کر بیٹھ گئی۔“

جوش و جذبات میں بولتے ہوئے نورین کو احساس ہوا تو وہ خاموش ہو گئیں۔

”ہمیں تو کچھ عرصہ قبل ہی پتا چلا ہے کہ ہماری کوئی پھپھو بھی ہے۔ تاجی نے بہت کچھ بتایا ہے۔ آپ

بارے میں۔ لیکن پھپھو! اگر آپ تاجی سے معذرت کر لیتیں تو آپ دونوں بہن بھائی میں جدائی کی اتنی بڑی

فصل حاصل نہ ہوتی۔“

حادث کہنے کو تو کہہ گیا مگر نورین کی رکیں تن گئیں۔

”معذرت۔ کس بات کی معذرت؟ کیسی معافی؟ میں نے کون سا گناہ کیا تھا۔ میرے ماں باپ مرے

تو بھائی جی نے بجائے دونوں کی کمی پوری کرنے کے مجھے ہی زندہ لاش بنا ڈالا۔ وہ میرا سودا کرنا چاہتا تھا۔ اپنے

میں ایک پاکہاز عورت نے مجھے جہالت کی اس قید سے نکالا اور۔ اور شہزاد جیسے فرشتہ انسان نے اپنی غیرت کی

پناہ میں مجھے لے لیا۔ آئیے شہزاد! یہ حادث ہے۔“

نورین کے چہرے پر شہزاد کی محبت، عقیدت اور احترام کے تاثرات ابھر آئے۔ اسی وقت شہزاد بھی اندر

آئے تو انہوں نے حادث سے تعارف کرایا۔ حادث کھڑا ہو گیا۔

”جیتے رہو۔ بیٹھو حادث بیٹے! ویسے تو تم سے تعارف ہے ہی مگر رشتے کے حوالے سے آج تعارف ہوا

ہے۔ تمہیں پہلے آنا چاہیے تھا۔“ شہزاد نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”جی بس۔“ ان دونوں ہستیوں میں جانے کیا بات تھی کہ حادث کچھ بھی نہیں کہہ پا رہا تھا۔ بس خاموش

نظروں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”اچھا ابھی، نورین آپ کے بیٹھے آئے ہیں۔ آپ باتیں کریں۔ مجھے ایک بہت ہی ضروری کام ہے! ہاں

جانا ہے۔ بیٹے حادث پھر ملاقات رہے گی۔“

ایک تو واقعی شہزاد کو کام تھا اور دوسرے وہ چاہتے تھے کہ نورین کھل کر حادث سے باتیں کر لیں۔ ایک

مدت کے بعد ان کو اپنا کوئی ملا تھا۔ پھر کتنی ہی دیر نورین، حادث سے باتیں کرتی رہیں۔ انہوں نے بڑے

واقعات کو پوری صداقت سے اس کے سامنے رکھا تو وہ الجھ گیا۔ وہ باپ کو بچ مانے یا پھپھو کو۔ اس کی سوچیں

نکمرنے لگیں۔ اسی دوران حمیرا بھی آگئیں تو حادث باوقار خاتون کو دیکھ کر خود بخود ہی احترام اٹھ کر اٹھ گئے تو انہوں

نے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

”بیٹھو بیٹے! تمہاری وجاہت تو باپ پر نہیں گئی۔ خدا کرے سوچ بھی نہ گئی ہو۔“ حمیرا نے حادث کو دیکھا

جس کے وجہ پرچے پر متعنا دسوچوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ باپ کو درست

مانے یا ان کو غلط کہے جو دونوں ٹھہری ہوئی سچا رنگ رہی تھیں۔

”میرے والے بچہ میرے میں اب کون بد نصیب قید ہے حادث بیٹے؟“

”ہاں۔“ حارث نے مختصر سا جواب دیا اور ہاتھوں کا تکیہ بنا کر کاؤچ پر نیم دراز ہو گیا۔  
 ”تو نہیں لے جائے گا۔ ایاز بے چارہ۔ ویسے ایک بات بتاؤ تم شرین کے لیے کس حد تک پہنچے ہو۔“ جمال نے سگریٹ اینڈ ٹرے میں بجھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”بس اچھی لگتی ہے۔“ حارث پونہی عام سے لہجے میں بولا۔  
 ”چھوڑ یار! اچھی تو ہمیں ہرگز کی لگتی ہے۔ میں تمہارے دل کی بات پوچھ رہا ہوں۔“  
 جمال جانے کیا پوچھنا چاہ رہا تھا۔ حارث جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے قریب چلا آیا۔  
 ”یہ بھی بتا دوں گا۔ فی الحال ایاز کا پروگرام گز بڑ کرو۔“  
 حارث نے نیلگوں آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔



آغا جی انے اپنے کمرے میں موجود اپنے بیٹوں اور بہوؤں پر ایک نگاہ ڈالی اور نیچے کے سہارے اٹھ کر بیٹھے۔  
 ”میرے بچو! میں نے ہمیشہ کوشش تو یہی کی کہ تم لوگوں کو مجھے سے کوئی شکایت نہ ہو اور میں نے انصاف کی نراز کو تھا۔ رکھا مگر اپنی دانست میں انصاف کرنے کے باوجود بے انصاف ٹھہرا ہوں لیکن خدا کا شکر ہے کہ برا غیر مطمئن ہے۔ فرمان نے گو کہ کوئی گناہ نہیں کیا تھا لیکن چونکہ اس نے ہماری بیٹی کے ساتھ نا انصافی کی تھی اس لیے ہم نے اسے سزا دی۔“  
 ”ہونہ العنت ہے ایسے انصاف پر۔“ آغا جی کی بات پر سیدہ نے منہ بنا کر دل میں کہا۔ آغا جی نے ذرا دیروک کر خصوصی طور پر سیدہ کی طرف دیکھا اور پھر اٹھنے لگے۔  
 ”بہر حال جو ہوا سو ہوا۔ خدا تو بے شمار گناہ سے بھر دیتا ہے لہذا ہم نے بھی فرمان کو معاف کیا۔“  
 ”تو گویا آج مصنوعی اداکاری ختم ہو رہی ہے۔“ سیدہ جل کر رہ گئیں۔  
 ”میرے خیال میں آپ لوگوں کو شکوہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ میں نے فیصل آباد میں جو گلاس فیکٹری لگائی ہے وہ شمع کے نام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“  
 آغا جی کا یہ کہنا تھا کہ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ لقمان احمد اور یسین احمد نے ایک دوسرے کی طرف معنی نظر دیا۔ عذرا بیگم جل کر رہ گئیں۔ سیدہ تو اسی وقت یہاں سے اٹھ کر چلی جانا چاہتی تھی مگر جن کی نظروں میں جانے کیا تھا وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں۔ واحد قدسیہ بانو تھیں جن کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بی بی جان اور آغا جی اپنے بچوں کے چہرے پڑھ رہے تھے۔  
 ”ہاں لقمان! کچھ کہنا چاہتے ہو؟“ آغا جی نے لقمان احمد کی طرف دیکھا جو واقعی کچھ کہنا چاہتے تھے۔  
 ”لیکن آغا جی! آپ نے تو کہا تھا کہ فرمان کو کچھ نہیں دیا جائے گا اور پھر بھی آپ نے ایک فیکٹری لگائی۔“  
 سکنا م کردی۔“ دل کی بات ان کے لبوں پر آئی جو ماں باپ کا دل چیر گئی۔



”میں جو بات نہیں کہنا چاہتا تھا بیٹے! تم نے کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں نے کسی کا حق نہیں دیا اور ہرمان کو کچھ نہیں دیا۔ میں شعاع کو دے رہا ہوں جو بجا طور پر حق دار ہے میری جائیداد کی۔ شعاع کو سب کے اس کا حق مل کر رہے گا۔ میں نے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اس سارے قصے میں شعاع قطعی سبقت لے گیا۔ اس کے ساتھ بے انصافی نہیں کر سکتا۔“

”تو آغا جی اس ساری ڈرامے بازی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ مختار تھے۔ اسی وقت بیٹے کو بڑے سے لگا لیتے۔ ہم بد نصیب بہنوں نے کیا کر لیا تھا آخر۔“ سیدہ کو کچھ احساس نہ رہا۔ وہ کس طرح کس کے ہونے بول رہی ہیں۔

”سیدہ!“ آغا جی کی غصے سے بھری آواز کمرے میں گونجی تو رحمن کھڑے ہو گئے۔

”سیدہ! حواسوں میں رہا کرو۔ تمہیں جرات کیسے ہوئی آغا جی کے سامنے زبان کھولنے کی۔“

رحمن کے بس میں ہوتا تو وہ سیدہ کے تہیز لگا دیتے۔

”یہ جرات مجھے ان کی اور سب کی بے انصافی نے عطا کی ہے۔ رحمن صاحب! کیا دیا ہے آغا جی نے ہمیں۔ سوائے دکھوں کے۔ ہمارا باپ بے شمار دولت جائیداد چھوڑ کر گیا تھا۔ ہمارے لیے لیکن ہمیں اس گھر کی ملا ہے سوائے محرومیوں کے۔ آپ کا انصاف تو یہ تھا کہ میری بہن کو ٹھکانے والے فرما کر تمام عمر معاف کرتے۔ شعاع اس گھر میں نہیں رہے گی۔ وہ رہے گی تو۔ میں نہیں رہوں گی۔“ سیدہ دیوانہ وار بولنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حواس کو بیٹھی ہوں۔

”بھابی جان! خدا کے واسطے اس عورت کو یہاں سے لے جائیے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔“

رحمن مارے ندامت کے آغا جی کے سامنے جھکتے ہوئے بولے تو قد سیدہ بانو سیدہ کو شانوں سے تمام کر رہا تھا۔

”سیدہ! سیدہ تم حواسوں میں نہیں ہو۔ تمہیں کچھ اندازہ نہیں۔ تم نے کیا کہا دیا ہے۔“ قد سیدہ بانو ان پانی پلا کر سمجھا رہی تھیں جواب روئے جاری تھیں۔

”آغا جی! آغا جی مجھے معاف کر دیں میں تو۔“

رحمن نے آغا جی کے پاؤں تھام لیے تو آغا جی نے لرزہ ہوا ہاتھ ان کے سر پر رکھ دیا۔

”نہیں بیٹے! مجھے کسی سے کوئی شکوہ شکایت نہیں نہ مجھے سیدہ کی بات پر دکھ ہوا ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ یقیناً میری ہی محبتوں میں کی رہ گئی ہوگی جس پر یہ غلطی میں پائیداری نہیں ہوگی۔ تب ہی تو سیدہ نے لنگہ باتیں کی ہیں۔ سالہ بیگم تو میری زندگی کی ساتھی ہو۔ میری روح کی گہرائیوں کو جانتی ہو تم۔ تم کو اپنی دنیا میں نے کہاں تک انصاف کیا ہے۔ میرا خدا مجھے معاف کرے۔“ دکھ سے آغا جی کی آواز بہت کمزور ہو گئی۔

”شعاع باجی! پلیز مت روئیں ناں۔ سیدہ جچی تو ہیں ہی ایسی۔“

صدف اور شعاع آغا جی کے پاس آ رہی تھیں کہ ہاتھ چلا کر بڑے کمرے میں موجود ہیں۔ ساری شاع شعاع اور صدف نے ایک ساتھ سنی تھیں اور اب شعاع بے حال ہو رہی تھی۔

”نہیں صدف! مجھے اور کوئی دکھ نہیں۔ دکھ ہے تو اس بات کا کہ انہوں نے آغا جی کے خلوص پر شبہ کیا ہے۔ ان کو دکھ پہنچایا ہے۔ کاش میں نہ آئی یہاں۔ میں تو انہوں کی بھینٹیں سیٹھنے آئی تھی۔ کاش نہ آئی ہوتی۔“

شعاع بہت دھکی اور تنہا کچھ رہی تھی خود کو۔ صدف دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ اس پیاری سی لڑکی کو بچہ رہی۔

”شعاع باجی! پلیز مت روئیں ناں۔ بہت دکھ ہو رہا ہے مجھے۔“

صدف نے بڑھ کر اس کے آنسو صاف کر دیے تو وہ شرمندہ سی ہو گئی کہ ناحق ان چاہنے والوں کو تنگ کرتی

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں نے تمہاری بات مان لی مگر تم بھی وعدہ کرو کہ ان باتوں کے بارے میں کسی سے نہیں کہو گی نہ بڑوں کے بارے میں اور نہ میرے بارے میں۔“ شعاع نہیں چاہتی تھی کہ سب کو ان باتوں کو

”اچھا تو آپ بھی وعدہ کریں کہ آپ اکیلی نہیں رہیں گی اور اس بھی نہیں ہوں گی۔“

”وعدہ نہیں صدف! کوشش ضرور کروں گی کہ تم میری وجہ سے دھکی نہ ہو۔“

اس نے پیار سے صدف کے رخسار پر تھپتھپائے اور واٹس روم میں آگئی لیکن مگر کے سوٹ میں دراز چوٹی پر ڈال کر وہ نیچے آئی تو ہاتھ چلا کر صدف وغیرہ ذکیہ پھمکے ہاں گئے ہیں۔ اس نے سوچا۔ اچھا ہوا جو انہوں نے اسے لے جانے پر اصرار نہیں کیا۔ مگر میں خاصا سناٹا تھا مگر اس کے دل کے سناٹوں سے پھر بھی کم تھا۔ وہ لے لے لان میں آگئی۔ رخصت ہوتے سورج کی نفیسی کر نہیں افق کی گود میں آنکھیں موند رہی تھیں۔ وہ بلا فدی گونجی رہی پھر ایزی جیٹر پر تک کر آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھنے لگی جو اپنے اپنے آشیانوں کی طرف

ہندے تھے۔ ایسے میں اسے انشاء جی کا کہا ہوا مصرعِ حذت سے یاد آ گیا۔

اپنا ہے کوئی مسکن نہ مکاں

لوگوں کے تو گھر لوگوں کے مکاں

”ہاں میرا کوئی مسکن مکاں کہاں ہے۔ میں بے گھر، بے مکاں ہوں۔ مجھے سا بھی کوئی بے سہارا ہوگا۔ دنیا

نہ کھلا ہو۔“

اس کی آنکھوں سے بہتا سا دن ہاتھ میں پکڑی خلیل جبران کی ریت اور جھاگ کو بھگو گیا تو کچھ فاصلے پر لواراشو کہیں باہر جانے کے لیے نکلا تھا۔ شعاع پر نظر پڑے ہی اس کے پاس آ گیا اور اسے دیکھتا رہا جو اس

نک کی شاعر کی مضبوط غزل میں ڈھلی ہوئی تھی، پھر آہستگی سے اس کے قریب چلا آیا۔

”کہنے والے نے کہا ہے کہ اتم پریشانیوں کے سمندر کے سامنے تھمھارے لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ جیت نہ سکتا ہوگی۔“ مگر شعاع تم۔“

راشونے پینٹ کی جیب سے اپنا رومال نکال کر شعاع کی طرف بڑھایا تو شعاع نے دھند کے پیچھے سے لہجہ مان سے غصے کو دیکھا جسے نہانے کیسے خبر ہو جاتی کہ وہ اس سے ہے۔

”کہنے والے نے تو یہ بھی کہا ہے راشو بھائی کہ جس طرح کمرے کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے ہوائیں نمودار ہونے کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کا کردار نمایا ہوتا ہے۔ مجھے

کے قاتلوں کو بھی سزا دے۔“

وہ ایک بار پھر برسات میں بیٹھنے لگی اور وہ برسات میں بیٹھی اس پیاری سی لڑکی کو دکھاتا رہا۔ جو ٹھیک سے نہ جانتی کہ وہ اس کے لیے کیا ہے اور اس کا ایک آنسو بھی اس کے لیے کتنی اذیت کا باعث بنتا ہے۔

”ٹھیک ہے شجاع! مانا کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے لیکن شاید شجاع تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے آنسو کیسے کتنی تکلیف اور اذیت کا باعث بنتے ہیں۔“ کہنے کو تو راشو کہہ گیا لیکن شجاع کی بیٹھی پلکیں اٹھیں تو وہ نگاہیں کھڑکی پر لگا رہی تھیں۔

”اچھا چھوڑو یہ جبران کا فلسفہ یہ دیکھو کتنا خوبصورت پھول ہے۔“

راشو نے سرخ کھلا ہوا گلاب شجاع کی طرف بڑھایا تو شجاع نے بیٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ پھول کے ہاتھ سے لے لیا۔ دونوں مسکراتے ہوئے اندر آ گئے۔ راشو ہال کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شجاع کمرے کی طرف آگئی مگر ابھی زینے کے وسط میں پہنچی تھی کہ سامنے ہوی کسی بت کی طرح ایسا وہ تھا۔ وہ کھڑی تھی۔ اس نے گزرتا چاہا مگر کیسے وہ تو راستہ روک کے کھڑا تھا۔

”ہو گئیں ختم پیار بھری باتیں؟“

آتش فشاں سے لاوا نکلتا شروع ہو گیا اور شجاع جھلنے لگی۔

”راشو بہت پسند آیا ہے تمہیں۔“ لہجہ کا زہر شجاع کی رگوں کو کاٹنے لگا۔ ہوی نے راشو کا دبا ہوا ہاتھ گلاب اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پھر بڑی بے دردی سے پاؤں تلے مسل دیا۔ شجاع کی حالت ایسی تھی کہ وہ تو بدن میں لہو کی بوند نہیں۔

”کتنی بار بتانا پڑے گا شجاع فرمان! کہ یہ پاکستان ہے۔ یہاں آپ یوں عشق نہیں فرما سکتیں۔“ ہوی تکی صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔

”بٹ اپ ہمایوں رحمن! تم گھٹیا انسان کیا سمجھتے ہو۔ میری روح کے قاتل HATE YOU نفرت ہے تم سے۔۔۔ ہمایوں رحمن۔ لیکن نہیں تم میری نفرت کے قابل بھی نہیں، ہاں تم جیسا گھٹیا انسان بنو نفرت کے قابل بھی نہیں۔“

جانے کہاں سے اتنی قوت آگئی تھی اس کی جان نا تو اس میں کہ ہوی جیسا لہجہ چڑا مرد اسے دیکھ کر غصے سے اور ہڈت کر رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں کہ کیسے اس نے ہوی کو پیچھے دھکیل کر دیا۔

منا یا یا وہ خود راہ سے ہٹ گیا۔ کمرے میں آکر شجاع کی حالت جو ہوئی سو ہوئی مگر دنیا جہاں کی بے قرار یوں نے مل کر ہوی کو سر کر دیا۔ اس کے ذہن پر شجاع کے الفاظ ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ اس نے سارا کمرہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ HATE YOU تم جیسے گھٹیا انسان میری نفرت کے قابل بھی نہیں۔“ شجاع کے کہے ہوئے الفاظ اس کے ذہن کے بت کو مسما کر رہے تھے۔ وہ اس سے تو نفرت کر سکتا تھا مگر یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی کہ وہ اس سے نفرت کرے۔

”کیوں نفرت ہے تمہیں مجھ سے؟“ تم کون ہوتی ہو مجھ سے نفرت کرنے والی۔ میں تمہیں راشو سے کرنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔ شجاع فرمان اس لیے کہ اس لیے وہ میرے خدا تو کیا میں خدا کی بات

ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں مجھے تم سے محبت نہیں نفرت ہے۔ شدید نفرت۔ شجاع فرمان نفرت ہے مجھے تم سے۔“ ہوی کو ہاتھوں میں پھنسائے ہوئی نفرت اور محبت کی جنگ میں بے دم سا ہو کر بینڈ پر گر گیا۔ دونوں اپنی جگہ میں چلے رہے۔ شجاع کے الفاظ نے ہوی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ رات کے کھانے پر دونوں غائب ہوئے۔ شجاع کو دیکھنے کی گمروہ لائٹ آف کیے سوئی بنی رہی۔ دل کا درد لپٹے نہیں دے رہا تھا۔ ہوی نے بھی صاف منہ کر لی۔ درد سے دماغ کی رگیں پھٹ رہی تھیں۔

پارشرمی! مجھے تو ان دونوں کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ لگتا ہے۔ یا تو ان دونوں میں زبردست دشمنی ہے یا دشمنی کی اثر را شنید سنگ ہے۔“

ہوی نے تو شرعی سے اپنا خیال ظاہر کیا تھا جو راشو کو بالکل نہیں بھایا۔

”ہوی! خاموشی سے کھانا کھاؤ۔ فضول باتیں نہ کرو۔“

راشو نے ہوی کو جھجھک دیا تو اشعر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ راشو کو دیکھا۔

پھر کئی روز یوں ہی گزر گئے۔ ہوی اور شجاع ایک دوسرے کا سامنا نہیں کر رہے تھے۔ شجاع، جب ہوی ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں سے نہ نکلتی۔ وہ اسٹم کر کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی تھی جس نے اس کا شفاف رہائی گندی سوچ کا کچھڑا چھال دیا تھا۔ وہ اس چھوٹی سوچ رکھنے والے شخص کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی مگر لال کا کیا کرنی جس میں اسی ستم گرے وفا کی صورت آباد تھی۔ وہ زندگی کے اس تضاد کو سمجھ نہیں پاتی۔ کیا فیملی کی، کہ جو لہو لہو رہا ہے اسی کی محبت میں یہ بے قرار ہو۔ ہوی خود زندگی کے اس تضاد کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔ بلکہ وہ نہیں پاتا تھا کہ اسے شجاع سے نفرت ہے یا؟ وہ لہجہ کر رہا جاتا۔ کچھ تو سیدہ اس کا دل صاف نہیں دیتیں اور جب وہ راشو کو شجاع کے ساتھ دیکھ لیتا تو جھنجھوٹی سا ہوتا جاتا۔ وہ اپنی ان کیفیات کو خود بھی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ایک طرف جہاں شجاع کے الفاظ توڑ رہے تھے۔ دوسری طرف اس کا جی چاہتا۔ روٹھی ہوئی شجاع کو ملنا اس سے معذرت کر لے مگر وہ ایسا کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس رات چاند کی چودھویں تھی اور فل مون ٹائٹ یہ جاک کر اتر آ کر تے تھے۔ اس رات کو رت جگے جگے کا پردہ گرام ہمیشہ ہی ہوی بنایا کرتا اور سب سے زیادہ نمایاں کیا کرتا۔ مگر اب کی بار وہ کمرے میں بند تھا بلکہ راشو، اشعر اور شجاع بھی نہیں آئے تھے۔

”وہ لوگ ہرگز نہیں آئیں گے آج کل ان سب کے پارے چڑھے ہوئے ہیں۔“

”ارے آئیں گے کیسے نہیں۔ گڑیا! تم راشو اور اشعر بھائی کو بلا کر لاؤ۔ شجاع باجی کو بولی، بشری تم لے لو۔ صرف! تم ہوی کو لے کر آؤ۔ شاباش۔ دیکھتے ہیں، کون پہلے آتا ہے۔“ یاسر نے بڑوں کی طرح اشارہ جاری کرتے ہوئے کہا۔

”گڑیا! یہ کیا سچ والی بات ہوئی۔ تم لوگ انجوائے کرو۔“ راشو نے پہلو پچھتا جانا۔

”میرے خیال میں آپ بھی داد نہیں بن گئے۔ اشو سچ کا دل نہ توڑو۔“

اشعر راشو کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا تو گڑیا خوش ہو گئی۔

مرد آئی تو ہوی بلب آن کیے کتاب کھولے پڑھ رہا تھا مگر ذہن کہیں اور تھا۔

”صوف! یہ کیا حرکت ہے؟“ صوف نے لائٹ آف کر دی تو ہوی نے غصے سے اسے دیکھا۔

”آپ لہتے پور تو کبھی بھی نہیں تھے ہوی بھیا! پتا بھی ہے آج فل مون ٹائٹ ہے۔ سب لان میں جمع

جس رت جگا ہے۔ آج آپ بھول گئے کیا سب کچھ، چلیے اٹھیے ورنہ ہار جائیں گے شعاع باجی سے۔“  
صدف کے منہ سے جانے کیوں شعاع کا نام نکل گیا۔ ہوی ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔  
”ہار ہی تو گیا ہوں۔“ ہوی نے آہستگی سے کہا۔

”شعاع باجی! خدا کے لیے چلی چلیے۔ ورنہ میں صدف سے ہار جاؤں گا اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“  
شرجی نے شعاع کا کبیل اتار کر اسے کھڑا کرتے ہوئے منت بھرے لہجے میں کہا۔  
”جی شعاع! پلیز۔ جلدی چلیے ورنہ یہ یاسر کا بچہ ہی ہمیں باتیں سنائے گا۔“

یہ سب شعاع کو اتنے پیارے اور عزیز تھے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی آگئی۔ ہنگ کپڑوں پر ہاتھ  
شانوں پر ڈال کر وہ ان کے ساتھ آگئی لیکن شرجی اور صدف کے درمیان ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ  
مقابلہ جیت چکی تھی۔ راشوان سے پہلے موجود تھا۔ ہوی اور شعاع ایک ساتھ ہی پہنچے تھے۔  
”میں اور راشو بھیا جیت گئے۔“ گڑبانے جیت کا نعرہ لگایا تو راشو بھی خوشی سے مسکرایا۔  
دس بیچ لان میں پورے چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فضا پر سوز اور رات بھگی ہوئی تھی۔ باقی سارے  
میں جھگڑ رہے تھے کہ کیا کہا جائے۔ کون سا کھیل کھلایا جائے۔

”آپ ہی کچھ بولیں ہوی بھیا! کیوں زنگ لگ گیا ہے آپ شرارتوں، سوچوں کو؟“  
یاسر نے ہوی کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو وہ جو قدر رت کے حسین شاہکار میں کھویا ہوا تھا۔ چونک گیا۔  
”کرو بھئی، جو کرتا ہے۔ میری تو طبیعت خراب ہے۔“

ہوی نے بے دلی سے کہا اور نظریں ایک بار پھر شعاع پر ٹھہر گئیں جو اس بھگی سی چاندنی میں اداسی  
اچھی لگ رہی تھی۔ یہ لوگ دائرے کی صورت میں نرم نرم گھاس پر بیٹھ گئے۔ سب نے اپنی اپنی پنڈے لٹا  
سنائے۔ راشو نے پیاری سی لہجہ میں کہا۔

”چلیے ہوی بھیا! آپ کی باری ہے۔“ دانی نے کہا تو وہ چونک گیا۔ اول تو اسے شعر و شاعری کا  
خاص لگاؤ ہی نہیں تھا۔ دوسرے یوں اچانک کوئی بھی شعر یاد نہ آ سکا۔

”ارے بھئی، یہ تو ڈاکٹر ہے۔ اس کے پاس حس لطیف کہاں یہ تو انسان کو توڑنا پھوڑنا جانتا ہے۔“  
ہوی کر بجائے اشعر بولا تو شعاع کو اشعر کی یہ بات بہت سچی اور اچھی لگی۔ کتنا سچ کہا تھا اشعر۔  
گر تو انسان کو توڑنا پھوڑنا ہی جانتا ہے۔

”شعاع باجی! آپ کی باری۔ جلدی سے سنائیے ٹافٹ۔“ لڑکے اب اس کے گرد ہو گئے تو شعاع  
ایک نظر ہوی پر ڈالی جو ہاتھوں کا تکیہ بنائے گھاس پر نیم دراز تھا اس کی نظریں بھی اسی پر تھیں۔

تو سیمیا ہے بدن تک ہے تیری چارہ گری  
تیرے امکان میں کہاں زخم کڑوی باتوں کے

شعر کیا تھا ایک تیرہ تھا جو سیدھا ہوی کے دل میں اتر گیا۔ وہ صاف سمجھ گیا شعاع نے اس پر  
مگر نجانے کیوں اس پر کوئی جنونی کیفیت طاری نہیں ہوئی بلکہ وہ صرف شعاع کو دیکھتا رہ گیا۔ ماحول  
اور گھیر ہو گیا تھا۔ ہوی بھی موجود تھا شعاع بھی تھی۔ لہذا ان لوگوں کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں کوئی

چلیے۔ اب غنڈی سڑک کھیلنے ہیں۔“ یاسر وغیرہ کو لڑکیوں کے اس کھیل سے جڑتی مگر چونکہ آج رات  
ہر گروپ میں شعاع اور اشعر وغیرہ تھے۔ دونوں گروپ ہی زبردست تھے۔ مقابلہ سخت تھا۔ صرف  
ایک دو گروپ ہار رہا تھا۔ لڑکے تو اپنی جگہ سے ہلنے بھی نہیں تھے۔ شعاع کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کئی  
جگہ جیت تھی۔ وہ دور ہو گئی۔

”سنئے خوش نصیب اور زندہ دل لوگ! ہیں یہ۔ اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی ہستا مسکراتا رکھے۔ آمین۔“  
صدف نے صدف دل سے ان کی دیشیوں کو دای ہوئے کی دعا دی۔

”اب غنڈی سڑک پر شعاع باجی کو لینے آتے ہیں۔“ شعاع اپنا نام سن کر چونک گئی۔  
”اس کے بدلے کس کو بھیجو گے؟“ صدف اور شنو چلا گئیں۔ شعاع کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے گڑیا پر  
لگا۔ جس نے اس کا نام لے کر اس کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔

”ان کے بدلے ہم ہوی بھیا کو بھیجیں گے۔“ اسی کو توقع ہی نہیں تھی کہ گڑیا شعاع کے مقابل ہوی کو لے  
لی۔ ہوی کے دل کی حالت بھی عجیب سی ہو گئی تھی۔ شعاع کی تو حالت غیر ہو گئی۔ دل اچھل کر حلق میں  
جڑن ہو گئے۔ اس کا بی چاہا کہ یہاں سے چلی جائے اور ہوی کی انسٹ ہو جائے اور ہوی کا بڑھا ہوا

لہجہ جاتے۔ جب کتنا حرا آئے۔ اسے اتنے سارے لوگوں میں وہ تہی داماں رہ جائے۔ خیالات سرکش  
گئے۔ راشو کے دل کی آواز بھی یہی تھی۔ وہ ہوی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے۔ شعاع کوئی فیصلہ نہیں کر پا  
”شعاع باجی! کیا کر رہی ہیں۔ ہاتھ آگے بڑھائیں ورنہ۔“ ہوی بھیا بلا مقابلہ جیت جائیں گے۔

”ہاں میں گے۔“

یاد اور شری جیتے تو جیسے وہ ہوش میں آگئی۔ اس وقت کسی کمزوری کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لڑتا ہوا  
دل کے بھاری مردانہ ہاتھ میں دے دیا تو راشو آہستگی سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ چاندنی کے باوجود دل  
بہت اندھیرا اچھا لگا۔ شعاع کا برف سا ہاتھ ہوی کے ہاتھ میں تھا اور کمزور لہجہ ہوی پر غالب آ گیا کہ کاش

توئی نہ پھوڑے۔ دونوں کے دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہے تھے، پھر سب نے بہت کوشش کی مگر  
نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک ہی جھٹکے میں ان کے گروپ میں آگئی۔ راشو چپکے سے وہاں سے ہٹ گیا اور  
سب آگیا پھر ہوی اور شعاع سے بھی وہاں نہ ٹھہرا گیا۔ ہوی پڑھنے کا کہاں بنا کر آ گیا مگر مجال ہے جو

میں رہی ہو۔ کھلی کھڑکی سے جھانکتے چاند کی غنڈی روشنی میں وہ اپنے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا جس میں کچھ  
نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں کا لہجہ اسے ایک نئی ہی پر سوزی کیفیت سے آشنا کر گیا۔ آنکھوں میں  
آنسو نہ تھا۔ چہرہ گھوم گیا تو وہ دل کشی سے مسکراتا خوابوں کی واوی میں کود گیا۔ جہاں وہ تھا اور شعاع تھو

لہجہ میں کوئی نفرت نہیں تھی، کوئی دشمنی نہیں تھی کتنا سکون تھا۔  
نہیں بلکہ خودی اس ہاتھ کو نہ کے نیچے رکھے لطیف احساسات سے معمور دھڑکنوں کو سنتی جانے کب

چمپاجی گھر کی پرانی ملازمہ تھیں۔ ایک عرصے سے اپنے عزیزوں سے ملنے بھگادیش گئی ہوئی تھی۔ صبح ہی ان کی واپسی ہوئی تو سب ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ سارے شریان کے گرد بیٹھے باتیں کرتے تھے۔

”چمپاجی! آپ کو کیا خبر کہ آپ کے چلے جانے کے بعد گل بابا کی کسی حالت خراب ہوئی۔ ہر روز کی یاد میں غصہ آتی ہیں بھرا کرتے تھے۔“

”ارے کیا چندا! جگ کہہ رہے ہو؟“ چمپاجی بولی کی شرارت سمجھ نہ سکیں۔

”اور نہیں تو کیا چمپاجی! آپ کی بڑی تصویر اپنے کمرے میں رکھ چھوڑی تھی اور اکثر آپ کی تصویر پھولوں کی بارڈل کر کے بھر کر کہا کرتے تھے۔“

”آہ چمپاجی مرحوم۔ بڑی ہی ظالم ہوا کرتی تھی۔ اب بے چارے دوزخیوں کا جینا حرام کر رکھا ہوگا۔“

”اوئی نوج اس کو بخت نے یہ کہا۔ ٹھہرا بھی اس کو کچا چمپاجی ہوں۔ لو بھلا۔ حد ہوگئی۔ ابھی تو میں نے سنا۔“

”چمپاجی بولتے بولتے رک گئیں۔ نگاہیں سامنے میز جوں سے اترتے ہوئی اور اس سے دو بیڑیاں پڑ آتی شعاع پر ٹھہر گئیں۔“

”ارے صدف بیٹا! ہوی بیٹے کی شادی ہوگئی کیا؟“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے چمپاجی۔“ صدف نے صدق دل سے کہا اور پھر یہ بات کانڈا سب تک پہنچتی چلی گئی تو سب پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

”یہ تم لوگ چھوڑے کھی کھی کس خوشی میں کر رہے ہو۔ آداب چمپاجی؟“ ہوی نے ان کو ڈانٹا اور پھر کے آگے سر کر دیا۔

”ہوی بھیا! اگر ہم نے اپنی کھی کھی کا مطلب بتا دیا تا تو آپ چمپاجی کو اٹھا کر باہر پھینک دیں۔“

”کیا بکواس ہے یہ؟“ ہوی نے شری کو ڈانٹا۔

”بکواس نہیں ہے۔ قسم سے بھیا ابھی جب آپ دونوں آرہے تھے ناں تو۔“

”بوی بات ادھوری چھوڑ کر پھر دانی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگا۔“

”تم بتاؤ شوق! کیا بات ہے۔ یہ تو سدا کے چھوڑے ہیں۔“ ہوی چڑ کر بولا۔

”وہ۔ وہ ناں ہوی بھی! ابھی جب آپ اور شعاع باجی نیچے آرہے تھے ناں تو چمپاجی کہنے لگیں۔“

”آپ کی شادی ہوگئی ہے۔“

”شوق نے انک انک کر کہہ۔ دیا باقی سب ہنسنے لگے۔ شعاع کے چہرے پر دھتک سی ٹھہر گئی۔“

”گئے۔ جھینپ تو ہوی بھی گیا۔ اس نے ایک گہری نگاہ شعاع پر ڈالی مگر پھر اچانک وہ بولی وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔“

”شرم تو نہیں آئی ابھی باتیں کرتے ہوئے۔ اصل بات نہیں بتائی جاتی تھی چمپاجی کو۔“

”وہ تو دھاڑتا ہوا چلا گیا مگر ڈنٹ کا شدید احساس شعاع کو مار گیا۔ اتنی سی ہوی کہ وہ پھر دہان ٹھہر گئی۔“

”ف کے ذریعے یہ بات راشونیک بھی پہنچ گئی تھی۔“

”یہ تو سراسر تم لوگوں کی غلطی ہے۔ تمہیں پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا کہ شعاع فرمان چکا کی بیٹی۔“

”راشونیک یہ بات انتہائی ناگوار گزری تھی۔ چمپاجی کیا آئی تھیں۔ قد سیدہ بانو اور بی بی بکلی بکلی ہو گئیں۔“

”چمپاجی! خدا کا شکر ہے۔ آپ بچوں کی شادیوں سے پہلے آئیں۔ اب دیکھیے ناں چمپاجی۔ امر اور حنا کی شادی ہو گئی ہے اور جہانگیر کی بھی کرنا ہے۔ میں تو بکھلا کر رہ گئی تھی۔ شکر ہے آپ آ گئیں۔“

”چمپاجی! کالی عمروالی تھیں مگر بہت اتنی تھی کہ گھر بھر کا کام سنبھال لیتی تھیں۔“

”اللہ مبارک کرے بہو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خوشی کے جتنے کام ہوں۔ کرنے کو تیار ہوں۔ یہ اپنے ہاں کی بیٹی ہے ناں۔ یہاں تو آؤ بیٹا۔“ چمپاجی نظر شعاع پر پڑی جو فرنگ سے پانی کی بوتل نکال رہی تھی۔

”ہاں چمپاجی! یہ اپنے فرمان کی بیٹی ہے۔ شعاع اور شعاع یہ چمپاجی ہیں۔“ قد سیدہ بانو نے دونوں کا کرنا تو شعاع نے سر جھکا کر آداب کیا۔

”جتنی رہے بیٹا۔ ماشاء اللہ چاند کا کھلا معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً ناں بھی ایسی ہوگی۔“

”جی ہاں چمپاجی ان کی والدہ کے پاس حسن کے علاوہ بھی بہت بھگندہ تھے مردوں کو قابو کرنے کے منہ سے شعلے نکلے جن میں شعاع جھلس کر رہ گئی۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور

”چمپاجی! حیران نظروں سے پہلے سیدہ کو پھر قد سیدہ بانو کو دیکھنے لگیں۔ انہوں نے اشارے سے اسے کوئی کینے سے روک دیا۔ بعد میں انہوں نے ساری حقیقت بتائی۔“

”ابن چمپاجی! یہاں تو بس یہی ہے۔ بے چاری جب سے آئی ہے۔ سیدہ اور ہوی نے اس کا ناک میں بکاس۔ ہر وقت طفر کرتے ہیں۔ سیدہ اس بے چاری مریم پر بہتان لگاتی ہیں۔ جواب اس دنیا میں بھی

”ارے تو اس میں نیچی کا کیا قصور تھا۔ اگر غلطی تھی تو فرمان میاں کی تھی۔ اس نیچی کی تو کوئی خطا نہیں تھی کہ

”ہوا کی جائے۔“ قد سیدہ نے ساری روئیداد ان کو سنائی تو انہیں بھی دکھ ہونے لگا۔

”ارے بیٹا! یہ تو ظلم ہے سراسر۔ بڑے صاحب اور بڑی بی بی بھی کچھ نہیں کہتیں۔“

”اوپا کیا کہیں گے چمپاجی! اذرا کچھ کہتے ہیں تو سیدہ ان کو بھی بدعت اور بے انصاف کہتی ہیں۔ کوئی ایک

”بھڑکتا ہے۔ اب آغا جی نے فیصلہ کیا ہے کہ فرمان کے حصے کی جو فیکٹری فیصل آباد میں ہے۔ وہ شعاع

”ہاں کر دی جائے تو سیدہ نے ہنگامہ کر دیا۔ آغا جی سے ایسی بدکلامی کی کہ وہ بے چارے دل تمام کر رہ گئے۔

”نکسے ساتھ یہ سب ہوا۔ وہ بے چاری اتنی صابر اور اعلیٰ ظرف ہے کہ سب سے پہلے شعاع کو پیار سے گلے

”سنا لیا۔“ چمپاجی! اعلیٰ جیسی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ بہن کو بہت سمجھاتی ہے مگر سیدہ تو انتقام

”لے رہی ہیں ساتھ میں ہوی کا بھی بیڑا غرق کھو رہا ہے۔“

”ارے بہو! کیسی کیسی باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سیدہ بیٹی ایسی سنگدل

”ہوگی۔“ چمپاجی کا نرم دل شعاع کے لیے دکھی ہو گیا۔

”ابھی تو آپ دیکھی جائیے۔“ قد سیدہ بانو نے سیدہ کو آتے دیکھ کر یہ موضوع ختم کر دیا۔

”شعاع کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ باقی سارے ہال میں جمع تھے۔ اس وقت اس کا کسی سے بات کرنے

”کاں ہوا۔“ اس لیے وہ کھڑا کر اپنے کمرے میں آ جاتا جیسا کہ راشونیک نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے خود تو



نہیں بلایا البتہ اشعر سے نظروں ہی نظروں میں درخواست کی کہ شعاع کو بلائے مگر اشعر نے چھینٹنے کی بات سے انکار کر دیا۔

”اچھا بچے! کوئی بات نہیں۔ تجھ پر بھی خدا ایسا بروت لائے تو بتاؤں گا۔“

”کیوں بدو عادیے ہو یا ر! بلاتا ہوں۔“ راشو تاراض ہو گیا تو اشعر اسے صورتا بہر آ گیا۔

”ارے شعاع! کہاں جا رہی ہو؟“

”جی اشعر بھیا! اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ پڑھوں گی تھوڑا۔“

وہ بھیگی ٹلکیں چھپانے کی غرض سے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”چھوڑ پڑھائی وڑائی۔ چلو آؤ۔ سب تمہارے منتظر ہیں۔ یوں الگ مت رہا کرو۔ ہم سب تمہارا“

اور تم ہم سے آگ رہتی ہو۔ آؤ۔“

اشعر اسے شانوں سے پکڑ کر اندر لے آیا تو راشو کی نظریں اس کے بھیستے پرسوز حسن پر پھر گئیں۔ اشعر

اسے راشو کے سامنے والے صوفے پر بٹھا دیا تو راشو کا دل چاہا۔ ایسے مہربان دوست پر قربان ہو جائے۔

نے تنکرا نہ نظروں سے اشعر کو دیکھا۔

”ہائیں۔ ہائیں۔ یہ کس کی رسم قتل ہے بھی۔“

یاسر نے آتے ہی شرحی کے دھول بھائی۔ اس کی نظر شعاع کی بھیگی پلکوں پر پڑ چکی تھی۔

”تمہاری۔“ بوبی نے مختصر جواب دیا۔

”اچھا اللہ۔ واہ کیا بندہ تھا۔ کیسا خوبوہ ایسا اچھا۔ اطالصفات کا مالک نو جوان۔ آہ بد نصیب دنیا۔“

تیرے قابل ہی نہیں تھی۔“

یاسر نے اپنے بارے میں روتے ہوئے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ شعاع کو بے ساختہ ہنسی آگئی تو رائی

یوں لگا جیسے بان کی ساری کلیاں کھل کر پھول بن گئی ہوں۔

”پلیسے راشو بھیا! جلدی سناؤ الیے۔ اپنی کوئی غزل، نظم۔ قسم سے آج تک آپ نے ہمیں اپنی شاعری

شکل نہیں دکھائی۔ کیسی ہے؟“

پھر سب ہی اصرار کرنے لگے مگر راشو خاموش رہا۔ اس کی نظریں شعاع کے خوبصورت ہاتھوں پر جمیں

کی انگلیاں آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا۔ وہ کسی ذہنی کشش کا شکار ہے۔

”عجب گھماؤ مشاعر ہو یا ر! اور نہ بے چارے شاعر ترستے ہیں کہ کوئی ان کا کلام سے مکرمت تو۔“

اشعر نے راشو کی طرف دیکھا تو راشو نے ایک نگاہ شعاع پر ڈالی جو یہاں موجود ہوتے ہوئے گئی۔

نہیں تھی۔

”میں کوئی شاعر نہیں ہوں اشعر! تم اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ تو میرے احساسات اور جذبات ہیں۔“

آپ ہی آپ لفظوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ جن کو میں دوسروں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔“

”ارے بابا! جب تک تم کسی پر اظہار نہیں کرو گے کسی کو کیسے خبر ہوگی کہ تم۔“

اشعر نے ایک نظر شعاع پر ڈال کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نہیں اشعر! احساسات اور جذبات کسی اظہار کے محتاج نہیں ہوتے۔ احساسات کا لہجہ تو“

بھوکا سفر طے کرتا ہوا ایک دل سے دوسرے دل میں اتر جاتا ہے۔ کیوں شعاع کیا خیال ہے تمہارا۔“

راشو نے کھولی کھولی سی شعاع کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ چونک گئی۔

”جی س بارے میں خیال؟“ شعاع کی اجنبیت راشو کے دل میں ٹیس بن کر اتر گئی۔ گویا وہ ہر بات

پر غمی۔ اس کا جو تو یہاں تھا مگر دل و دماغ جانے کہاں تھا۔

”کیا تم نے اشعر؟“ راشو نے زخمی سی نگاہ شعاع پر ڈالنے کے بعد اشعر کو دیکھا۔ اسی وقت یاسر نے

پارڈر آن کر دیا۔ کیش کی پرسوز آواز راشو کے احساسات کی ترجمانی کر گئی۔

”میرا دیوانہ پن ہے یا محبت کا سروہ“

تم نہ سمجھے تو ہے تمہاری نظروں کا قصور

شعاع ابھی ہوئی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی تو راشو کے دل کے شہر میں اندھیرا بڑھنے لگا۔

”راشو! مجھے لگتا ہے جیسے تم چاہتوں کے اس سفر میں تنہا بڑھتے جا رہے ہو۔“

اشعر جکانی عرصے سے محسوس کر رہا تھا۔ آج کہہ دیا تو ایک کربناک سا سایہ راشو کے چہرے پر پڑ گیا۔

”تمہارا تو خیال ہے ناں اشعر! اور مجھے یقین ہے کہ میں اسی منزل کی طرف بڑھ رہا ہوں جو میری نہیں۔“

لی ٹیپ آؤ! دکھ کا گہرا احساس لیے ہوئے تھی۔

”تو پھر صبر اجاؤ راشو! انتظار کر لو شعاع کا۔ ہو سکتا ہے ہے تمہاری چاہتوں کی کشش اسے تمہارے نقش

طے پر مجبور کر دے۔ رک جاؤ راشو چاہتوں کا سفر تمہا نہ کاٹ سکو گے اور ان ہی راہوں میں بکھر جاؤ گے اور

پھوٹے ہوئے ہوئے بکھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا۔“

راشو اور اشعر کزن ہی نہیں بہترین دوست بھی تھے اور اشعر اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور نہ ہی وہ اندر

نے خوبصورت سے اس بندے کو بکھرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

”نہیں اشعر! بات سو دو زیاں سے بڑھ کر ایسے موڑ پر آگئی ہے جہاں سو دو زیاں کا احساس بے معنی ہو

گیا ہے مجھے تو خود خبر نہیں اشعر کہ میں یہاں تک پہنچ کیسے گیا؟ تمہیں یاد ہے، ٹو بیہ میرے لیے کیسے مرا کرتی

تھیں؟ مگر دل پر اس چاہت اثر نہ کر سکی مگر شعاع پر نظر پڑتے ہی میرے احساسات میں پھل

پھلنے لگیں اشعر میں نہ تو اتنا کمزور ہوں کہ اپنے جذبات کے آگے ضبط کا بند نہ باندھ سکوں اور نہ اتنا کم ظرف کہ

ان لوگوں کی خواہش اور مرضی کے بغیر اپناؤں جہاں تک سوال رکے یا انتظار کا ہے تو یہ باتیں اب بے معنی سی

لگنا لگیں شعاع کی چاہت تو میرے خون میں رچ بس گئی ہے۔“

نتیجوں میں نارسا تئیلوں کا کرب جو راشو اب تک تنہا سہتا آ رہا تھا آج اشعر کے حوالے کر دیا تو وہ بھی اس

سے انسان کے لیے دکھی ہو گیا۔

”راشو میرے یا ر ایک نہ ایک دن تمہیں شعاع کی چاہتوں کا اعتبار ضرور حاصل ہوگا، انشاء اللہ یہ میرا

نہایت اشعر نے راشو کو ساتھ لگایا۔

”لوں بیٹا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔“ ایک حسرت راشو کے لبوں پر آ کر دم توڑ گئی۔



گھر میں تین شادیوں کی خوب تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف آغا بی ایک اہم فیصلہ کر کے بیٹھے

تھے اور اس انتظار میں تھے کہ شادی کے ہنگامے ختم ہوں تو وہ اپنے فیصلے کا اعلان کریں۔

”خدا کے لیے آغا صاحب ایسا کوئی فیصلہ نہ کیجیے گا کہ میری مستی کی رہی سہی جان بھی نکل جائے۔“

آغا جی کے چہرے پر جودھ کودتی تھی، بی بی جان اسے دیکھ کر ہی دہل رہی تھیں۔

”صالح بیگم دل کو مضبوط رکھنا کیونکہ جب اولاد والدین کی نیت اور محبت پر شبہ کرتی ہے تو والدین اپنے

فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔ خواہ اپنے اندر کچھ بھی نہ بچے بیگم میری بیٹی سیدہ نے میرے انصاف، میری محبت بنیاد پر ہلا کر رکھ دیں کہ میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہوں۔ بہت مجبور ہو کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔“

باقی کی بات خود آغا جی بھی مکمل نہ کر سکے۔ بی بی جان دہل گئیں کہ جانے انہوں نے کیا فیصلہ کیا تھا

خود بھی یوں ٹوٹ گئے ہیں اور وہ جانتیں تھیں آغا جی کے فیصلے کتنے سخت اور اٹل ہوتے ہیں۔ سب اپنے اپنے

تعلیمی مسائل سے بھی فارغ تھے۔ جب فراغت ہو اور گھر میں تین شادیوں کے ہنگامے ہوں تو کون شریں

ہوگا۔ ساری لڑکیاں دن رات اپنے کپڑوں کی فکر میں لگی رہتیں۔ کسی کا گونا گونا رنگ رہا ہوتا تو کسی کا اپنے

سناٹ کی فکر کھائے جاتی ایسے میں سب لڑکے خوب لڑکیوں کو چھیڑتے۔ اس وقت بھی شریں، صدف کو سسل

رہا تھا۔ وہ شعاع کے دوپٹے پر گونا گونا رنگی سوئی میں دھاگا ڈالنا چاہتی مگر شریں نے کہا اس کا ہاتھ ہلا دیتا۔ دوسرے

بار تو ایسا ہوا کہ وہ دھاگہ ڈال کر دیکھتی تو دھاگہ کٹ چکا ہوتا اور صرف چھوٹا ٹکڑا اسی سوئی میں موجود ہوتا آخر وہ

ہی پڑی۔

”چھپا جی! رو کیے اس کو، ورنہ میں اسے سوئی چھو دوں گی۔“

”ارے شریں بیٹا! کاہے کو تنگ کرتے ہو۔ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ اپنی حنا بیٹی کی طرح یہ۔“

”یہ بات نہ کریں چھپا جی! ہمارے گھر کی لڑکیاں کہاں پرایا دھن ہوتی ہیں، وہ دیکھ لیجیے گا، اگر بھائی کی

ہمیں بھی قربانی کا بکرہ اپنا پڑے گا۔“ بونی، دانی ایک ساتھ بولے تو چھپا جی کے ساتھ قد سیدہ بانو اور عذرا بیگم

ہنس پڑیں۔

”ادو! شکل دیکھی ہے بگلوں جیسی۔“ شنفے کشن بونی کو مارا۔

”چلو پتو! تم لوگ جاؤ ان کو تیاری کرنے دو، بہت کم وقت رہ گیا۔ صدف، شنفو بیٹا آج ہی کپڑے دلوانا

کرلو پھر تو خیر سے رسمیں شروع ہو جائیں گی، وقت نہیں ملے گا۔“ لڑکے بھی جڑی شرافت سے نکل گئے اور خانو

بھی چلی گئیں۔

حنا کی ہندی تھی۔ ایک شور، ہنگامہ تھا گھر میں لڑکیاں خوب سے خوب تر نظر آنے کی کوشش میں تھیں

آدھے لڑکے لڑکیاں حنا کی طرف اور آدھے احرر کی طرف ہو گئے۔ شعاع درمیان میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ

کس طرف جائے۔

”مہارے شعاع! یہاں کیوں کھڑی ہو، اندر کیوں جا رہی ہیں؟“ اشعر نے اسے یوں دوا رہے ہاتھ

پایا تو ادھر آ گیا۔

”سوچ رہی ہوں اشعر بھیا کہ کہاں جاؤں، میری کہاں ضرورت ہے، شاید کہیں بھی نہیں۔“ اس کی

بیگم گئی تو اشعر نے اسے شانوں سے تمام لیا۔

”اس کا مطلب ہے شعاع کہ ہم سے تو تمہارا کوئی رشتہ نہیں ناں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یقیناً

میری غلطی میں کی ہے۔ ٹھیک ہے، تم حق بجانب ہو ایسا سوچنے میں۔“

”ارے بھیا! آپ تو ناراض ہونے لگے آپ بھی ناراض ہو گئے تو میرے پاس کیا بچے گا؟“

”اچھا تو پھر چلو اندر تم اشعر کی بہن ہو، احرر کی بہن ہو، دولہا والی ہو، رعب سے اندر جاؤ۔“

اشعر نے پیار سے اسے کے سر پر آٹھل درست کرتے ہوئے اسے یاسر کے ساتھ بٹھا دیا جو ڈھولک گود

کے بڑے ماہر انداز میں بجا رہا تھا۔

”چلے شعاع باجی! چھیڑے کوئی راگ، ان لڑکی والوں کو ہرانا ہے۔“

”مگر یاسر مجھے تو گانے آتے ہی نہیں۔“ وہ معصومیت سے مسکرائی، اسی وقت صدف وغیرہ جھج پڑیں۔

”دولہا والوں کے طوطے اڑ گئے پھر دونوں گروپوں میں ٹھن گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نچا دکھانے

کا کوشش کی۔ شعاع کے لیے یہ سب نیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار پاکستانی اور اپنے گھر کی شادی

کی۔ وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔ گھر سے ہنز جھللاتے کپڑوں اور میک اپ میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی

ہوئی کی لگا جی اس پر انھیں تو پھر ہنسی نہیں۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔ یوں سب کچھ بھلائے دل نشی سے

لی جالیاں بجاتی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

نظر آخر نظر ہے، بے ارادہ اٹھ گئی ہوگی

یاسر بدتر کی نظر جانے کیسے ہوئی پر پڑ گئی! جو شعاع کو دیکھ رہا تھا۔ یاسر نے جان بوجھ کر ٹکڑا لگایا تو ہوئی

ارحمن چپ گیا۔ اس نے وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔

”ہوئی بھیا! لوٹ آئیے ایسی چور یوں پر، بڑی پیاری سزائیں ملا کرتی ہیں۔“

یاسر نے پیچھے سے ہانک لگائی تو ہوئی اسے گھور کر رہ گیا پھر ہندی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ایسی ہل بازی مچی

نفا کی تھانہ۔

”شعاع باجی! سنبل جائیے گا۔“ دانی دور سے چلایا تو شعاع نے گھبرا کر بونی کی طرف دیکھا جو انھیں

ہانک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور ایک کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی اور اس خوبصورت

لہجے سے غوطہ ہوتی رہی۔ دنگ و بونکی اس مغل میں جانے کیا ہوا۔ یہ اس کی شعوری کوشش تھی یا نادانستی میں یا

ہانک کی بے خود خواہش نے وہاں تک پہنچا دیا تھا۔ اب وہ شعاع کے مین سامنے کھڑا اس کی سیاہ آنکھوں

دیکھ رہا تھا۔ شعاع کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ رخسار گرم ہو گئے۔ اداس و سناں راہوں میں گویا جگنو چپکے

لہجے سے اسے شریں، ہوئی سے آکر کھڑا یا تو جیسے وہ ہوش میں آ گیا۔

”اوسوری، میں سمجھا صدف ہے۔“ ہوئی اس کے چہرے پر پچھلی دھنک کو اجاڑتا آگے بڑھ گیا تو شعاع

انھوں میں جلتی قد ملیں بچہ کر رہ گئیں۔ کم مائیگی کا احساس بنی نہ گیا تو وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ حنا اور احرر کی

ہانک کے ایک ہفتے بعد جہا نکیر کی شادی تھی لہذا شادی کے ہنگامے جوں کے توں تھے۔ اگلے دن جہا نکیر کی

شادی ہو کر سے باہر تھی۔ اس لیے سب ہی اپنی تیاری پر خصوصی توجہ دے رہے تھے۔

”صدو! امیر اخیال ہے، میں کل بال کھول کر جاؤں۔“ شنفے نے اپنے لائبرے نشی بال کھولے۔

”لوٹاں بی بی! یہ تم ہرگز نہ کرنا ہلا کی والے لڑکی دینے سے انکار کر دیں گے۔“

بوی نے شفو کے بال ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

”یار! کیوں تم لوگ بھاری لڑکیوں کو تنگ کرتے رہے ہو۔“ راشو نے بوی کو ڈانٹا۔

”لو بھئی گڑیا! تمہاری فرمائش پر میں نے اس پر گونا گونا دیا ہے، ذرا اوڑھ کر دکھاؤ۔“

گڑیا نے ضد کی بھی کہ شعاع ہی اس کے گہرے پرل دوپٹے پر گونا گونا لگے لہذا وہ لگا کر لے آئی۔

”نہیں پہلے آپ اوڑھ کر دکھائیے، کیسا لگتا ہے؟“

اور پھر وہ ناں۔ ناں ہی کرتی رہ گئی مگر گڑیا نے دوپٹے سے اوڑھ دیا۔ اس کی شہابی رنگت پر یہ برسرِ زور

کھلا۔ راشو نے ایک گہری سی نگاہ اٹھ پر ڈالی۔ دل اس پیاری سی لڑکی کی تمنا کرنے لگا۔ اگلے روز جب

بارت تھی رنگ و بو کا ایک سیلاب تھا کہ اندازاً رہا تھا۔ لڑکیاں لڑکے سب تیار ہو کر بہت اچھے لباس

تھے۔ لڑکیاں جھملا تے کپڑوں اور فل میک اپ میں بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔

”یار! میں تو اس بندے کا بے حد احسان مند ہوں۔“

”کس کے بھئی؟“ شربی نے حیرانی سے یاسر کو دیکھا۔

”ارے بھئی میک اپ ایجاد کرنے والے کا۔ دیکھو ناں! اگر آج میک اپ نہ ہوتا تو ہمارے

لڑکیاں کیا کرتیں۔ احساس کتری کا شکار ہو جاتیں۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو لڑکیاں یاسر کا حلیہ بگاڑ دیتیں مگر اپنے میک اپ کا خیال کہہ کے خاموش رہیں۔

”چلو بھئی، جلدی کرو ابو ڈانٹ رہے ہیں۔“ سیاہ ڈرسوٹ میں ہوی بہت وجہیہ لگ رہا تھا۔ اسی دن

شعاع بھی جلدی جلدی بیڑ حیاں اترتی نیچے آئی اور جب وہ ہوی کے قریب پہنچی تو یاسر بچھا۔

”شعاع باجی!“ اور جیسے ہی شعاع نے چمکیں اوپر اٹھائیں یاسر نے دونوں کو کمرے میں مقید کر دیا۔

ہوی کی نظر میں شعاع کی جانب اٹھ گئیں۔ فیروز کی رنگ کے جھملا تے کپڑوں میں وہ دل میں اتر رہی تھی۔

کلیوں کی طرح نازک اور معصوم لڑکی نفرت کے قائل تو نہیں، چاہے جانے کے قائل ہے اور جانے کب وہ سفر

کے سفر سے لوٹا تو سارے گاڑیوں میں مختص رہے تھے۔ لڑکے لڑکیاں کوسڑ میں بھرے ہوئے تھے۔ شعاع ہانڈ

بھا بھی کے ساتھ سب سے آخر میں آئی تو رخصت جھنڈا لگے۔

”شائلہ! تم آگے گاڑی میں جاؤ اور شعاع تم یہیں آ جاؤ، ہوی ذرا آگے سرکو۔“

رخصت نے ہوی سے سر کئے کو کہا تو ہوی کے ساتھ بیٹھنے کے تصور میں شعاع گھبرا گئی۔

”رہنے دیں! اگل میں بھی بھا بھی کے ساتھ!“

”وہاں بھی جگہ نہیں، ہوی سنا نہیں تم نے، ذرا سرکو۔“ رخصت نے پھر ہوی سے کہا۔

”لیکن ابو یہاں تو جگہ نہیں۔“ ہوی کسایا۔

”دل میں جگہ بنانی سیکو ہوی! تو بہت جگہ نظر آئے گی، آؤ شعاع۔“

یہ کہتے ہوئے رخصت نے شعاع کو سہارا دے کر اوپر بٹھا دیا تو ہوی کا دل چاہا، کہہ دے کہ اب دل میں تو

پیاری لڑکی نے جانے کب سے جگہ بنائی۔ شعاع کیا بھی تھی، مگر یاسر پر مسمیٰ خیر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

کرب کا قافلہ بڑی آہستگی سے راشو کے خوبصورت چہرے سے ہوتا ہوا سب کی مسمیٰ خیر ہنسی میں کھو گیا۔ یاسر

شونی سے ہوی اور شعاع کو دیکھا، جن کی حالت واقعی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ عجیب سے احساسات ہو رہے تھے۔

مجھے تلاش تھی جس کی وہ ہمسفر تم ہو

پاسر نے جان بوجھ کر یہ گانا گایا۔ لڑکی والوں نے بڑا اچھا انتظام کیا ہوا تھا۔ ایک لڑکا صدف اور شفو

بچے کے چکر میں تھا کہ شربی، یاسر آ گئے۔

”دیکھو یہاں! یہ جو نازک سی کھال ہے ناں، اسے سنبھال کر رکھو، ابویں ادھر مٹی تو بغیر کھال کے چلتے

خزیدہ ڈالنے لگو گئے۔“ شربی نے نازک سے لڑکے کا گریبان پکڑا تو وہ بھاگ گیا۔

”اور تم جو بال کھول کر خود کو حسینہ سمجھ رہی ہو، کیا ضرورت تھی لفٹ کرانے کی۔“

اس کے جانے کے بعد انہوں نے لڑکیوں کی خبر لے ڈالی تو بیچاریاں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ

سکے۔ ویسے والے روز لڑکیاں اور زیادہ اہتمام سے تیار ہوئیں۔ شعاع سنہری کپڑوں میں جو صدف نے خود

اپنے لیے بنائے تھے، تیار ہو کر آئی تو یاسر سخرے پن سے دل تھام کر گر گیا۔

”ہائے کاش! شعاع باجی آپ باجی نہ ہوتیں۔“ یاسر کی بات پر وہ دیر سے سے مسکرا دی۔

”تو شعاع جن کی باجی نہیں، ان کے لیے راستہ چھوڑ دو۔“

اشعر نے راشو کو دیکھتے ہوئے کہا جس کا دل آج بغاوت پر آمادہ ہو رہا تھا۔

”واپس آ جاؤ، وہ جا چکی ہے۔“ اشعر نے راشو کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”یاسر! اگر یہ لڑکی مجھے بدل سکی تو کیا رہ جائے گا زندگی میں۔“

دل کی شدید خواہش راشو کے لیوں تک آئی تھی۔ یاسر، شربی اور بوی نے تو گویا پروگرام بنایا تھا کہ ان

کو الگ الگ کھانا ہے۔ استقبالیہ پر کھڑے شربی نے اس لڑکے سے ہاتھ ملایا تو وہ کراہ اٹھا۔

”کیا ہوا بھئی؟“ راشو جلدی سے ان کے قریب آیا۔

”یہ ہوا تھا گھماڑو، آیا کہیں سے مجھوں کا نانا۔“

شربی نے ہاتھ راشو کے آگے کر دیا جس کی آنکھوں میں کامن پن پھنسا ہوا تھا۔

”نہیں غلط بات ہے، مہمانوں کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

راشوان کو سرزنش کرتا آگے بڑھ گیا مگر یہ لوگ پروگرام کے تحت کام کرتے رہے۔ دانی۔ سب کو کوک

ہاتھ تھا۔ جب وہ ان لڑکوں کے قریب آیا تو یاسر جان بوجھ کر دانی سے آگے آیا تو ساری کوک اس لڑکے کے

بگڑا۔ وہ سو رہی تھی! ابھی جا کر یاسر کو درست کرتا ہوں۔“ بوی نے اس کے کپڑے جھاڑتے ہوئے اخلاقی

بازو لڑکا بچا رہا۔ بس ان کو دیکھ کر رہ گیا۔

”مٹی کوئی بات نہیں، انہوں نے کون سا جان بوجھ۔ ایسا کیا ہے؟“

وہ لڑکا تو پہلے ہی خوفزدہ تھا اور آج بڑی فحش میں یا تھا، لڑکیوں کو امپریس کرنے بھرا ب ساری شوختم ہو

گیا۔ سفید کپڑوں پر کوک کے بدنماد داغ لیے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ یاسر وغیرہ نے نیک دوسرے کیساتھ پر

فولاور فحش پڑے۔

”بہت باجی ہو تم لوگ، حلیہ بگاڑ دیا بیچارے کا، اتنی شومیں آیا تھا۔“ اشعر کو اس لڑکے پر بڑا ترس آیا۔ اب

پھر نانا چپ بیٹھا تھا۔



شادیوں کے ہنگامے سرد پڑے تو زندگی پھر معمولات پر چلنے لگی۔ آغا بی جو ایک فیصلہ کر چکے تھے، وہ

اب اس کا اعلان کرنا چاہتے تھے۔ بی بی جان سمیت سب دم سارے بیٹھے تھے۔

”میرے بچے! میں تم لوگوں کی عدالت میں ہوں اور آج اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے تمہیں اور میری تربیت میں کوئی کمی رہ گئی، جس کی وجہ سے تم لوگوں کی سوچ کی عمارت میں درازیں پڑ گئیں۔ سیدہ بیٹی کو مجھ سے بہت شکایات ہیں، اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے، رخصت کو میری طرف سے اجازت ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جہاں چاہے جا سکتا ہے، الگ گھر بنا سکتا ہے، یہ بات میں کسی ناراضگی کے تحت نہیں کہہ رہا بلکہ اپنی غلطیوں کو محسوس کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ رخصت بیٹے! یہ تمہارے حصے کے کاغذات ہیں اور بی بی! یہ تمہارے والد کی جائیداد کے کاغذات ہیں جو تمہارا حصہ ہے۔“

آغا جی نے ایک فائل رخصت کی طرف اور ایک فائل سیدہ کی طرف بڑھائی مگر رخصت کو تو جیسے کچھ ہوا تھا۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آغا جی ایسا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔ سنانے میں تو سیدہ بھی آگئیں۔ بی بی جان الگ دل تمام کر رہ گئیں۔

”آغا جی! آغا جی والدین تو اپنی نافرمان اولاد کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں اور آپ تو مجھے اپنا نافرمان بیٹا کہتے ہیں نہیں آغا جی نہیں، مجھے آپ کا فیصلہ منظور نہیں۔“ رخصت نے فائل زمین پر پھینک دی۔

”اس میں کچھ شک نہیں کہ تم میری فرمائیں دار اولاد ہو، اسی لیے میں نے تمہارے لیے یہ فیصلہ کیا ہے تاکہ تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پرسکون اور خوش و خرم زندگی بسر کرو۔ یقین جانو بیٹے، میں ناراض نہیں ہوں، میں نے تم لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمام عمر یہی کوشش کی ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے ہوئے اپنے سارے بچوں کو خوش رکھوں لیکن شاید میں ہی اپنی کوششوں میں مخلص نہیں تھا اور ویسے اس میں بال بھی کوئی نہیں۔“

”کچھ بھی ہو آغا جی! میں آج تک آپ کے حکم کے آگے سر جھکے ہمارا ہوں مگر میں آپ کا یہ حکم نہیں مان سکتا، میں اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتا۔ ہرگز نہیں، بی بی جان کچھ تو بولیں۔“

رخصت رو رہے تھے، انہوں نے بی بی جان کی گود میں سر رکھ دیا بچوں کی طرح تو ایک دکھ بھری آنکھوں سے بی بی جان کے ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔

”میں تو سدا کی بے زبان ہوں میرے بچے! تمہارے باپ نے جو کہہ دیا، اس پر آمین کہنا ہی یہ افضل ٹھہرا۔ تمہارا باپ میرے جگر کے ٹکڑوں کو جدا کر کے میرا ظرف آزماتا چاہتا ہے تو آزمائے بہتر فیصلہ اس کی ذات کر سکتی ہے۔“

بی بی جان پھٹ پڑیں تو آغا جی کا دل خراب ہو گیا مگر جو فیصلہ وہ کر چکے تھے، اس میں ترمیم نہیں تھی۔ لیکن، اتمان اور قدسیہ بانواٹھ کر بی بی جان کے پاس آ گئے۔

”بی بی جان! آپ دل کیوں چھوٹا کرتی ہیں، یہ فیصلہ صرف آغا جی نے اپنے طور پر کیا ہے لیکن ہمیں فیصلہ منظور نہیں، آغا جی کو یہ فیصلہ بدلنا ہوگا۔“ اتمان احمد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”تم لوگ کیا سمجھتے ہو، میں ایسے فیصلے کر کے خوش ہوں، تسکین ملتی ہے مجھے مگر تم لوگوں کو کیا فائدہ کیا ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی جو کچھ ہو رہا ہے، مجھے اس کی خبر نہیں، وہ معصوم بے گناہ بچی، جس کی ماں دنیا میں نہیں ہوئے، بے گناہ نہیں ہے دادا اور اپنوں کی پناہ میں بھی وہ بے امان ہے۔ اتمان تم، یسین تم یہ رخصت تم، بتاؤ شعاں کا کیا

”بچے ہو، تم لوگوں نے کبھی اس سے پوچھا کہ وہ کس حال میں ہے، اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی طرح اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر رہ رہی ہے، اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ۔!“

آغا جی کے کمزور ہاتھ میں چھری لرز گئی۔ حدت ضبط سے وہ غڑھال ہو گئے۔ قدسیہ بانو نے بڑھ کر ان کو روک کر پانی پلایا۔

”جی رہو بیٹی! تم اور عالی ہمیشہ میرے لیے سکون کا باعث بنی ہو۔“

آغا جی، قدسیہ بانو کی فرمائیں داری سے بہت خوش اور مطمئن رہتے تھے۔

”آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے آغا جی! اور آپ کا حکم ہمارے سر آنکھوں پر لیکن آپ کا یہ حکم بہت بُرا ہے۔ آغا جی بہت اذیت ناک ہے۔“

قدسیہ بانو نے ان کے بازو دباتے ہوئے آہستگی سے اپنے دل کی بات کہہ دی تو آغا جی نے دکھ بھری آنکھوں سے ان کو دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ میں نے یہ فیصلہ کوئی آسانی سے تو نہیں کر دیا۔ جگر کو کاٹ کر پھینکنا

”میں جانتا ہوں بیٹی! مگر اس فیصلے کے پیچھے ایک اور فیصلہ ہے، جس نے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا، اگر نہ کرنا تو شاید یہ لوگ خود کر لیتے۔ بہر حال میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شعاں جو اس گھر کی بیٹی ہے اور میری بیٹی ہے کہ وہ اسی گھر کی، بہو بھی بنے مجھے امید ہے تم باغداد جی شعاں کو ضرور بہو بننا لوگی، اور ظاہر ہے شعاں کو اس گھر میں رہنے کی تو سیدہ بیٹی علیحدگی کا ضرور تقاضا کرے گی۔ اس لیے یہ فیصلہ کر کے میں نے اس کی مشکل حل کر دی ہے کیونکہ شعاں کو میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا نہ گھر سے نکال سکتا ہوں۔ رخصت اور سیدہ اپنی زندگی کے ہالک ہیں جہاں چاہیں آباد رہ سکتے ہیں۔“

آغا جی کی بات پر سیدہ جو کم صبر بھی تھیں، ایک دم ٹپ اٹھیں۔

”ہوں کیوں نہیں کہتے آغا جی کہ آپ مجھے نکال کر اپنی لاڈلی پوتی کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ کیا یہ ہی آپ کا انصاف کہ ایک پوتی کی خاطر گھر بھر کو برباد کر دیں؟“

سیدہ انہماکی گستاخی سے بولیں۔ رخصت ان کی طرف گھوم گئے۔

”سیدہ! بکواس بند کرو، میں تمہاری زبان کاٹ دوں گا اگر آغا جی سے گستاخی کی تو، دفع ہو جاؤ یہاں۔“ رخصت پوری قوت سے چبچے، ان سے باپ کی توہین برداشت نہ ہوئی۔

”رخصت! تمہیں یہ کس نے اجازت دی کہ تم سیدہ کے ساتھ اس انداز میں بات کرو، وہ تمہاری بیوی ہے۔“ اتمان نے رخصت کو بری طرح جھڑک دیا مگر سیدہ نفرت اور انتقام کی اس منزل پر تھیں جہاں کسی کی محبت ان کو روکنا ہی نہیں تھی۔ آغا جی کے اس فیصلے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا اور ہوی کے دل میں شعاں کے لیے نفرت کا نیک باہر پوری شدت کے ساتھ چمکنے لگا تو لطیف جذبات کی لطافتیں جھلس کر رہ گئیں۔ عالی بکھرے لگیں۔

”کیا کیا تم نے، ایسے ہوتے ہیں باپ کہ ایک پوتی کی خاطر انہوں نے ہمیں کاٹ کر الگ کر دیا۔“

”تو کس کا قصور ہے آپ، اس میں سراسر آپ کا قصور ہے، جب بعد از معافی اور درگزر کے راستے چھوڑ کر انتقام کا راستہ اپناتا ہے تو سوائے ذلت اور دھوکے کے اس کو بچہ نہیں ملتا، آپ نے آغا جی کا دل دکھایا



”فرمان“ درودل جاگ اٹھا۔

”فرمان! زخم مسکرانے لگے۔

”فرمان!“ میں سالوں سے آنکھوں میں جمی برف پکھلنے لگی تو آنکھوں میں گہری دھند سی چھا گئی۔ عالی خواب کی سی کیفیت میں فرمان کو دیکھتی رہیں۔ فرمان بھی خاموش نگاہوں سے عالی کو دیکھ رہے تھے۔ کتنی مختلف ہائی فائیو اس عالی سے۔ یہ لڑکی تو محبت کا ایک جہاں آباد کیے ہوئے تھی دل میں مگر ان کو ہی فرصت نہ تھی کہ اس کے دل میں جھانکتے۔ کل کی خاموشی اور بے زبان سی عالی سے قطعی مختلف، اس کے سامنے سس عابدہ آغا اید باہار غاقون کی صورت میں کھڑی تھیں وہ اپنی ہار مان کر بھی فاتح ٹھہری تھیں اور فرمان سب کچھ جیت کر بھی تھکے ہارے ان کے سامنے تھے۔

”اف میرے خدا یا! یہ سب کیا ہے؟“ عالی اسے بھی اپنا خواب سمجھ کر سر پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئیں تو فرمان ان کی طرف بڑھے۔

”عالی!“ فرمان نے آہستگی سے پکارا تو عالی پھر پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے لگیں۔ ہاں یہ تو وہ آواز تھی، جو کبھی دل کے تاروں کو چھیڑ کر خوبصورت گیت چھیڑ دیا کرتی تھی۔

”فرمان..... اچھا..... آپ واقعی؟“ لہجہ اب بھی بے اعتبار سا تھا۔

”ہاں عالی! تو بہ کے دروازے کھل جائیں تو گناہ گار لوٹ ہی آیا کرتے ہیں۔ میں لوٹ کر سیدھا تمہاری طرف آ گیا ہوں۔“

فرمان کی پوچھل آواز میں مسافروں کی تھکن تھی، جو عالی کو بے یقینی کی دلدل سے حقیقت کی دنیا میں لے آئی تو تھکے تھکے ہارے ہوئے فرمان کو، یک نظر دیکھ کر رہ گئیں۔ گزرے بیس سالوں میں ہونے والے فلت و ریخت کے عمل نے فرمان کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ قدرے بھاری جسم، چہرے پر ہلکی سی داڑھی اور نظر کے منہ نے اس فرمان کو ماضی کے فرمان سے کتنا مختلف کر دیا تھا۔ کہاں وہ وجاہت اور سحر انگیزی شخصیت۔

ہے آپ، آپ کبھی خوش نہیں رہ سکتیں۔ آپ آپ کا حصہ جائیداد سب کچھ تو لے گیا ہے، جائیے خوشی سے اپنے اور بچوں کے ساتھ جہاں دل چاہے گھر آباد کریں۔“

عالی بری طرح رو پڑیں۔ عالی جانتی تھیں کہ آغا جی نے یہ فیصلہ کس دل سے کیا ہے۔

”تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا، میں نے بھی اب فیصلہ کر لیا ہے، اس گھر میں نہیں رہوں گی۔“

دھڑی سے بولیں، انہیں ذرا بھی ملال نہیں تھا۔

”ناممکن آپ! عورت کے دوی گھر ہوتے ہیں، ایک والدین کا گھر اور دوسرا شوہر کا، جس عورت کو گھر نصیب نہیں ہوتا وہ اپنے والدین کی دلہیز پر آخری سانس لیا کرتی ہے۔ مجھے بھی شوہر کا گھر نصیب نہیں ہوا۔

میں بھی اپنے باپ کی دلہیز پر آخری سانس لینا ہوتا ہی ہوں۔“

”سوچ لو عالی میں تمام عمر تمہیں اپنی صورت نہیں دکھاؤں گی۔“

سیدہ نے پتھریلے لہجے میں ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ کہا تو عالی نے سگنی منہ سے اس ماں جانی کو دیکھا جو نفرت اور انتقام میں رشتوں کا احترام، خون کی پہچان ہی کھو بیٹھی تھی۔

”ٹھیک ہے آپ، جیسے آپ کی خوشی، آپ یقیناً ایسا کر سکتی ہیں۔ پتھر دل ہے ناں بیٹے میں تو سن رہی ہوں۔“

میں بھی آپ ہی کی بہن ہوں۔ میں اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر بہن کے گھر میں نہیں رہ سکتی۔“

عالی نے بھی پتھریلے اور مضبوط لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا اور سیدہ کے جانے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر پڑیں۔ دو روز سے وہ کالج بھی نہیں گئیں۔ تیسرے روز کالج سے فون آیا تو ان کو جانا پڑا۔ طبیعت بڑی مضبوط رہی تھی۔ وہ واپسی کے لیے اٹھنا ہی چاہتی تھیں کہ ملازم نے کہا کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

”بابا آپ کو معلوم ہے، میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں، ویسے بھی۔“

”میڈیم! میں نے بہت کہا مگر وہ صاحب بھند ہیں کہ ضروری کام ہے۔“

”اچھا تو بھیج دو۔“ عالی نے سرخ فال والی آسانی ساڑھی کا پلو درست کیا، ڈھیلی سی چوٹی کو جڑے۔

شکل دی۔ نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں اور جیسے صدیوں پر محیط فاصلے سٹ کر اس آنے والے شخص کو آنکھوں میں اتار آئے ہوں۔

”فرمان!“



”میرے نہیں عالی! ابھی کسی سے ملنے کا وقت نہیں آیا۔ تم سے ملنے سب سے پہلے اس لیے آگیا کہ تم ابھی لڑکھن کر رہی ہو، جہاں سے میں موڑ مڑ گیا تھا۔ گزرے ہوئے بیس سالوں میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں گی کیسے بدلتا ہے؟“ آئے آندھیاں چلیں مگر تم وہیں کھڑی ہو، جہاں میں چھوڑ کر گیا تھا۔“

فرمان نے عالی کو محرومی انگلی میں منگنی کی انگلی دیکھتے ہوئے کہا جو عالی سیدہ کے منع کرنے کے باوجود لپٹا ہوا نکلتی تھی۔

”اس لیے فرمان کہ جہاں سے آپ موڑ مڑ گئے تھے، میرے سارے راستے وہیں ختم ہو گئے تھے۔ اب یہ بچہ آپ نے اطلاع کیوں نہیں دی آنے کی؟“ اتنی احتیاط کے باوجود نہ جانے یہ جملہ کیسے پھسل گیا، جس پر کڑواہٹ کرنے کے لیے وہ جلدی سے بات بدلنے لگیں تو اس بات پر فرمان کے چہرے پر کرب ناک سے لہجہ آگئے۔

”مگر اسانس لے کر کھڑے ہو گئے اور اسی جگہ پر جا کھڑے ہوئے، جہاں کچھ دیر قبل عالی کھڑی تھیں۔“

”مجھ میں نہیں آتا عالی! کہ اپنی نامراد زندگی کا فائدہ کہاں سے شروع کروں۔ آغا بی کی نافرمانی کی بدولت دکھایا مگر سکون قلب میں نے بھی نہیں پایا۔ مریم بھی جب تک زندہ رہی، بے سکون ہی رہی۔ میں نے اپنے والدین کا دل دکھایا تھا۔ اس لیے۔ میں بھی اولاد کے دکھوں کی آگ میں جلتا رہا ہوں۔ نہ بٹے۔ اب بدل میں مل گئی آگ بجھے۔“ فرمان کی آواز درد میں ڈوب گئی۔ عالی تڑپ اٹھیں۔

”فرمان! آپ بیٹھ کہ سب کچھ بتا ڈالیں، کسی بھی بات کا خیال کیے بغیر کیونکہ اب ہم عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں حوصلے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ ہر بات سننے اور سننے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔“

”عالی! میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ اگر کسی کے ارا مانوں کی قبر پر اپنے ارا مانوں کا تاج محل تعمیر کیا جائے تو وہ کبھی آباد نہیں ہوتا۔ میری سمجھ میں اس بات کا مفہوم اس وقت آیا، جب میں خود کو تم سے چھین کر مریم کی محبت و شادی کی نگاہ اس بے خبر پر ڈالی، جو قتل کر کے زندہ رہنے کا حکم دے رہا تھا۔“

”اس لیے فرمان۔۔۔ کہ میں منافقت نہیں کر سکتی تھی۔“

عالی کرسی سے کھڑی ہو گئیں اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگیں۔ شاید اس لیے کہ آنکھوں میں آنے والی نمی فرمان سے پوشیدہ رہ سکے۔

”میڈم! آپ کا ڈرائیور آگیا ہے کیا بولوں اسے؟“ چپڑا سی نے ایک نظر فرمان پر ڈالی اور پھر عالی دیکھنے لگا، جواب مضبوطی سے کھڑکی تھیں۔

”ہاں ابھی روکو اسے، جب جانا ہوگا میں خود آ جاؤں گی، اُسے کچھ انتظار کرے، اور ہاں صبر اسے کیونکہ اچھی سی جانے بنا کر لائے۔“

عالی چپڑا سی کو ہدایت دیتی ہوئی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ فرمان کچھ کچھ تادم لگ رہے تھے چورے۔

”یہ تمہارا ڈرائیور وہی ہے ناں اپنا ریشی یا کوئی نیا ہے؟“

”جی ہاں وہی ہے۔“ عالی نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اب تو بوڑھا ہو گیا ہوگا، میری عمر کا ہے یہ ریشی، جی چاہ رہا ہے اس سے ملنے کو۔“

”بلو اسے کیا؟“ عالی جلدی سے بولیں۔

کہاں یہ تھکا ہارا انسان، عالی کا دل چاہا اس تھکے ہوئے انسان کو سمیٹ لیں جو کبھی بھی ان کا نہ ہو سکا یا پھر ان کے دامن میں منہ چھپا کر اتار وں کہ محرومیوں کے تمام داغ مٹ جائیں خود دونوں میں سے کوئی بات بھی نہ ہوگی کیونکہ دونوں عمر کے اس موڑ پر کھڑے تھے، جہاں شوریدہ جذبات پر برف جم جاتی ہے اور دیسے گی جہاں کو اپنا وقار ہر شے سے زیادہ عزیز تھا۔

”آپ حقیقت بن کر لوٹ ہی آئے ہیں تو سن لیجئے فرمان! کہ جب میں آپ کو ان گناہ گار بنی نہیں سمجھتی پھر کیسی توبہ اور کیسا گناہ، کوئی کسی کے لیے نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے۔ ہر کوئی اپنی ہی خواہشات کا تابع ہے۔ آغا بی ذات کا قیدی ہے۔ گناہ گار تو میں ہوں، میری وجہ سے آغا بی اور بی بی جان انصاف کے تقاضے پر سزا پائے۔ دکھ تو میں نے دیا ہے اپنے پیاروں کو، چاہنے والوں کو۔“

”اپنی اس طرح آمد کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ یہ بتاؤ، سب لوگ کیسے ہیں، آغا بی، بی بی جان، میری بیٹی، میری شعاع کیسی ہے؟“ فرمان تڑپ تڑپ کر سب کا حال پوچھ رہے تھے۔

”آغا بی نے مجھے دل سے معاف کر دیا ناں؟“

”ماں باپ کے دل بہت وسیع ہوتے ہیں فرمان! اولاد کی ہر خطا کو معاف کرنے کا ظرف رکھتے ہیں۔ ہمارے والدین بہت نرم اور وسیع دل و دماغ کے مالک ہیں۔ فرمان گستاخیاں تو ہم ہی لوگوں سے ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں ان کی تمام اولاد میں ہم ہی گستاخ بن گئے ہیں ورنہ باقی تو سب۔۔۔!“

عالی نے ہمیشہ خود کو، آغا بی اور بی بی جان کا مجرم جانا تھا مگر وہ بھی کیا کرتیں، وہ کسی اور مرد کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتی تھیں۔

”عالی! میں نے تو گستاخی کر دی تھی مگر تم ہی ان کی بات مان لیتیں شادی کر لیتیں تو آج میں بھی تمہارے سامنے یوں تادم نہ ہوتا۔“ فرمان کہنے کو تو کہہ گئے مگر ایک نہیں ہی عالی کے دل ستم زدہ سے اٹھی۔ انہوں نے ایک شاکی سی نگاہ اس بے خبر پر ڈالی، جو قتل کر کے زندہ رہنے کا حکم دے رہا تھا۔

”اس لیے فرمان۔۔۔ کہ میں منافقت نہیں کر سکتی تھی۔“

عالی کرسی سے کھڑی ہو گئیں اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگیں۔ شاید اس لیے کہ آنکھوں میں آنے والی نمی فرمان سے پوشیدہ رہ سکے۔

”میڈم! آپ کا ڈرائیور آگیا ہے کیا بولوں اسے؟“ چپڑا سی نے ایک نظر فرمان پر ڈالی اور پھر عالی دیکھنے لگا، جواب مضبوطی سے کھڑکی تھیں۔

”ہاں ابھی روکو اسے، جب جانا ہوگا میں خود آ جاؤں گی، اُسے کچھ انتظار کرے، اور ہاں صبر اسے کیونکہ اچھی سی جانے بنا کر لائے۔“

عالی چپڑا سی کو ہدایت دیتی ہوئی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ فرمان کچھ کچھ تادم لگ رہے تھے چورے۔

”یہ تمہارا ڈرائیور وہی ہے ناں اپنا ریشی یا کوئی نیا ہے؟“

”جی ہاں وہی ہے۔“ عالی نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اب تو بوڑھا ہو گیا ہوگا، میری عمر کا ہے یہ ریشی، جی چاہ رہا ہے اس سے ملنے کو۔“

”بلو اسے کیا؟“ عالی جلدی سے بولیں۔

معدرت اور یہ کہ میری تلاش فضول ہے۔

کیا کیا قیامیں گزر گئیں میرے دل پر اور پھر واقعی اسے جانے زمین نکل  
معنی یا آسمان کھا گیا۔ وہ ظالم عورت میرا جگر گوشہ جھین کر لے گئی تھی اور جب مریم کو  
ہوش آیا تو اس نے کہا کہ فرمان میں اپنی ممتا کو ادھر اور نامکمل محسوس کرتی ہوں، مگر  
میں اس کی بے ہوشی کی آڑ لے کر جھوٹ بولتا رہا کہ ہماری صرف ایک ہی بیٹی ہے  
شعاع۔ اس کو تو اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر مطمئن کر دیتا مگر خود میں راتوں کو  
رویا کرتا۔ خدا کے حضور سجدہ ریز رہتا مگر میری دوسری بیٹی کو نہ ملتا تھا۔ نہ لی۔ جب  
ہفت سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا کہ میں نے اپنے والدین کو دکھ دیا اور  
اللہ نے مجھے بھی اولاد کے دکھ سے جھلا کر دیا۔ میں نے مریم سے بالا بالا اپنی بیٹی کو  
کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ مریم بیمار رہنے لگی مگر اس نے شعاع کو تمہارے سانچے میں  
ڈھالنے کا عہد کیا ہوا تھا اور واقعی تمہیں دیکھے بغیر اس نے شعاع کو تمہارے سانچے  
میں ڈھال دیا۔ وہ تم سے ملتا اور تم سے معافی مانگتا چاہتی تھی مگر اس کے پاس وقت  
بہت کم تھا۔ وہ..... وہ مجھے اور شعاع کو چھوڑ گئی، عابی! مریم! ہمیں چھوڑ گئی۔

فرمان بر رقت طاری ہو گئی، وہ جذبات کے شدید ریلے میں بہہ گئے۔ ایک مدت کے بعد کوئی اپنا ملا تو  
ان کے ہاتھ کھلتے چلے گئے۔ عابی نے پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھایا۔

”سوری عابی! میں جذباتی ہو گیا تھا۔ یہ بھی بھول گیا کہ میں تمہارے آفس میں بیٹھا ہوں۔ دراصل ایک  
دن کے بعد کسی اپنے کو دیکھا ہے ناں تو اس لیے۔“ فرمان اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نام سے لہجے میں  
انت کر رہے تھے۔

”گھر چلیے فرمان! گھر میں بہت سے آپ کے اپنے آپ کے آنسو اپنی پلکوں میں چھپانے اور آپ کے  
دل پر اپنی محبتوں کا مرہم رکھنے کو بے تاب ہیں۔“

”نہیں عابی! ابھی میں گھر نہیں جاسکتا۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ مریم کے بعد ہم دونوں بہت اکیلے ہو  
نہیں نے شعاع کو یہاں بھیج دیا تاکہ اپنی بیٹی اور راشدہ کو تلاش کر سکو مگر نا کامی رہی۔ ایک روز اچانک  
انسان سے ملاقات ہو گئی جو راشدہ کا دور کاراشے دار تھا۔ اسی نے مجھے راشدہ سے متعارف کرایا تھا۔ اس  
راشدہ کے گاؤں کا ایڈریس دیا ہے۔ اب میں اس کے گاؤں جاؤں گا۔ دعا کرو عابی! وہ وہاں مل جائے۔  
مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اولاد اگر والدین کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو والدین کا کیا حال ہوتا ہے۔  
اللہ اور بی بی جان بھی میرے لیے ایسے ہی تڑپتے ہوں گے۔“

اپنے دامن کو آگ لگے تو انسان کو تب ہی دوسروں کی پیش کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ فرمان کو بھی وہ تمام  
ناموس ہو رہی تھیں، جو پہلے بھی نہیں ہوئی تھیں۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں فرمان کہ گھر چلیے، وہ لوگ آپ کو اور آپ ان کو دیکھ لیں تو زیادہ مناسب رہے  
نہیں! کامیاب رہا کہ فرمان گھر چلے حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ فرمان کو دیکھ کر سیدہ کا کیا رد عمل ہو سکتا ہے۔

”نہیں عابی! میں گھر گیا تو ڈھس جاؤں گا، میں سب جانتا ہوں عابی! مجھے سب پتا ہے مگر میں

رکھا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ بہن بن کر مجھے لوٹے گی، یوں اپنی خدمتوں کا خراج وصول کرے گی کہ میں نہ ہی کہہ  
نہہ سکتا ہوں۔“ فرمان ڈرا دیہ کر کے۔ ان کا چہرہ اندرونی خلفشار سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے گہرا سانس  
اور پھر بولنے لگے۔

”پھر مریم کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تو اسے ہسپتال لے آئے اور وہیں پر اسے راشدہ نے مجھے دیکھا۔  
بیٹیوں کی نوید سنائی۔ میں مریم کے کمرے میں آیا، جہاں وہ بے ہوش پڑی تھی۔ اطراف میں دو بے حد غم  
ی گڑیاں پڑی تھیں۔ میں نے بے ساختہ دونوں کو سینے سے لگا لیا۔ راشدہ نے مجھے مبارک باد دی۔ میں نے  
خوش ہوا تھا وہ بیٹیاں پا کر مگر میری خوشی اس وقت تک ادھر ہی تھی جب تک مریم ہوش میں نہ آ جاتی۔ مریم کی  
بہت خراب تھی۔ میں مریم کی وجہ سے ڈاکٹروں کے آگے پیچھے بھاگتا رہا۔ مجھے دوبارہ اپنی بیٹیوں کو ایک بار  
دیکھنا اور سینے سے لگانا نصیب نہیں ہوا۔ دوسرے روز میں ہسپتال گیا تو مریم کو تھوڑا سا ہوش آ گیا تھا۔ میں نے  
ایک نظر بے بی کاٹ پر ڈالی جہاں صرف ایک گڑیا تھی اور راشدہ غائب تھی۔ میں نے خیال کیا کہ کسی ضرورت  
تحت وہ اسے لے کر گئی ہوگی۔ میں مریم کی جانب بڑھا تو اس نے نیم بے ہوشی میں بچوں کے بارے میں پوچھ  
۔ میں نے جلدی سے شعاع کو اٹھا کر مریم کی گود میں دے دیا اور خود دروازے کی جانب دیکھنے لگا شاید راشدہ  
دوسری بیٹی کو لے آئے۔

”گھر“ مگر میرا انتظار میں سالوں پر محیط ہو گیا، وہ میری بیٹی کو لے کر نہیں آئی۔ مریم دواؤں کے زیر اثر  
۔ شعاع کو بھی سنبھال نہ سکی اور پھر ہوش و خود سے آزاد ہو گئی۔ میں شعاع کو گود میں لیے راشدہ اور دوسری بیٹی  
انتظار کرتا رہا۔ کئی گھنٹے گزر گئے، وہ نہیں آئی تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے شعاع کو مریم کے پاس لٹایا، خود راشدہ  
کی تلاش میں نکلا۔ وہ چونکہ اسی اسپتال میں نرس تھی۔ میں نے ہر ایک سے پوچھا، پورا ہسپتال چھان مارا  
راشدہ کہیں نہیں ملی اور نہ کسی کو اس کے بارے میں معلوم تھا۔ غم و غصے سے میری حالت بری ہو گئی۔ میں نے  
اسپتال میں ایک طوفان برپا کر دیا مگر کوئی میرے لیے کیا کر سکتا تھا۔ خود سرگرداں پھر پولیس سے مدد لی مگر  
بے سود ثابت ہوا۔ ادھر مریم کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ادھر وہ ذلیل عورت میرا جگر کاٹ کر رو پڑی ہو گئی  
تھی۔ میں پاگل سا ہو گیا۔ چوتھے دن مجھے راشدہ کی طرف سے ارسال کردہ خط ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

”فرمان بھائی! ادھر مریم بہن!

گو کہ یہ بہت گھٹیا حرکت ہے اور یہ حرکت کر کے نہ صرف میں خدا کی گناہ گار

ہوں بلکہ انسانیت کے درجے سے بھی گھٹتی ہوں۔ میں بہت مجبور ہوں اور خدا کی

بے نیازی دیکھ رہی ہوں کہ ایک عورت اولاد نہ ہونے کے باعث بار بار سہاگن بنتی

ہے اور پھر طلاق یافتہ ہو جاتی ہے۔ میری ممتا بھی کسی بچے کے لیے تڑپتی رہی۔ آج خدا

نے آپ لوگوں کو دو گڑیاں ایک ساتھ دے دی ہیں تو ایک میں لیے جا رہی ہوں۔ اپنی

ممتا میں بے حد خود غرض بن گئی ہوں۔ آپ کے پاس ایک گڑیا ہے اسی سے کھیلا کریں

میں اپنی تمام عمر اپنی گڑیا کے لیے وقف کر دوں گی۔ میری تلاش فضول ہے۔ چاہے

کے باوجود آپ میری ہوا کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مجھے اعتراف ہے میں نے بہت گناہ ڈا

گناہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے اور آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔ ایک بار پھر

”سچ آئی! ابو آئے تھے۔ میرے ابو۔۔۔ میرے پیارے ابو۔۔۔ وہ گھر کیوں نہیں آئے؟ آئی؟ آپ نے مجھ کو بتایا ہوتا کہ۔۔۔ کہ آپ کی نازوں بی بی کی طرح بی بی جیتی اور مرتی ہے۔“ شعاع، عابی کے ساتھ لڑ رہی تھی۔

”شعاع میری جان! ہر تار ایک شب کی ایک چمکتی سنہری صبح ضرور ہوتی ہے فرمان ایک ضروری کام کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی آجائیں گے۔ دعا کرو ان کا کام ہو جائے۔“

عابی کفرمان نے ہدایت کی تھی کہ شعاع کو فی الحال کچھ نہ بتایا جائے۔

”ابا بھی کیا ضروری کام کر رہے ہیں؟ کو ایک نظر دیکھا اور نہ اپنی صورت دکھائی؟“

”شعاع! میری جان! میں سب جانتی ہوں مگر اتنا بے حوصلہ نہیں ہوتے۔ جان! انسانی وقار کی تو بین دہانی، اس طرح کرنے سے۔“ پھر کتنی ہی دیر عابی، شعاع کو سمجھاتی رہیں تو وہ بہل گئی۔ یہ کیا تم تھا کہ ابو کی ذہن کی اطلاع مل گئی تھی۔

”عابی میری بچی! بتاؤ تو میرا بیٹا کیسا ہو گیا ہے۔ میری تو آنکھیں ترس گئیں، اس چاند چہرے کو دیکھنے کے لیے، اے چندا! تم گھر پر فون ہی کر دیتیں تو میں سر کے بل چلی آتی۔ اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے، آئے سینے کے گانے کے لیے۔“ بی بی جان کی مستانہ پٹ پٹ اٹھی۔ انہوں نے عابی کی آنکھیں چوم لیں، جن سے انہوں نے ان کا ان کے بیٹے کو دیکھا تھا۔

”فرمان بہت نامور اور پشیمان ہیں۔۔۔ اپنی بچی کے لیے بہت پریشان ہیں۔ وہ لوٹ آئیں گے بی بی جان! کچھ دنوں کی بات ہے، اب تو فاصلے سمٹ گئے ہیں۔“

عابی نے ساری تفصیل آغا جی اور بی بی جان کے گردش گزار کردی۔ آغا جی اندر سے کھل گئے۔ دل بیٹے کو ایک نظر دیکھنے کے لیے چل چل گیا۔

”اللہ اسے اس کے مقصد میں کامیاب کرے۔ ویسے وہ ایک بار گھر آجاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ بہر حال اللہ سے کامیاب کرے۔ اولاد کا دکھ بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ خدایا جس اذیت سے میں گزر چکا ہوں، اس نعت سے میرے بیٹے کو نجات بخش دے۔ میں نے اسے معاف کر دیا ہے، تو بھی اسے معاف کر دے۔“

”آغا جی جی! وہ میں نے فرمان سے شعاع اور راشو کی بات کی تھی۔ انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو یہی بتا دیا تھا۔ اور کہا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے آپ کوئی رسم ادا کر دیجیے۔“

”واقعی فرمان نے رضا مندی دے دی ہے؟“ آغا جی بے یقینی سے بولے۔

”جی! آغا جی! وہ کہہ رہے تھے، اپنوں سے دور ہو کر جو اذیت انہوں نے برداشت کی ہے، وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بی بی بھی وہ اذیت برداشت کرے۔“

”خدایا تیرا شکرانہ کسی طرح ادا کروں کہ اتنی بڑی خوش خبری دی ہے تو نے مجھے۔ تیرا بڑا احسان ہے۔ بس میں بے وقت، تیرا شکرانہ ادا نہیں کر سکتی۔“

فرط جذبات سے بی بی جان رو پڑیں۔ آغا جی خوش اور مطمئن تھے کہ فرمان نے ان کے فیصلے کو پسند کیا تھا۔ وہ بہت پرسکون ہو گئے تھے۔ شعاع اور راشو کی شادی ان کی اولین خواہش تھی مگر انہوں نے باضابطہ اظہار شکاک نام نہیں لیا تھا۔ صرف اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ شعاع کو ای گھر کی بہو بنانا چاہتے ہیں۔

صرف بی بی جان آغا جی اور شعاع کو میری آمد کے بارے میں بتانا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری آمد کی خبر میں ان ہستیوں ہی کو خوشی ہو سکتی ہے۔“

”نہیں فرمان! ایسی بات نہیں ہے، گھر میں اور بھی لوگ ہیں، جن کو آپ کے جانے سے دکھ اور سنہرے حد خوشی ہو سکتی ہے۔“

”ہاں میں جانتا ہوں عابی! اسی لیے تو سب سے پہلے میں انہی لوگوں کے پاس آیا ہوں، جن کو آپ کے جانے سے دکھ اور آنے کی بے حد خوشی ہوئی ہے۔“

گمبیر لہجے میں بولتے ہوئے فرمان کھڑے ہو گئے تو عابی ان کو دیکھ کر رہ گئیں۔ بعض خواہشات کئی وقت پوری ہوتی ہیں کہ انسان ان کی لطافتوں کو بھی محسوس نہیں کر سکتا۔

”ایک بات کہوں فرمان؟“

”ہاں کہو عابی۔“ فرمان نے نرمی سے کہا۔

”وہ آغا جی، شعاع کی شادی لقمان بھائی کے بیٹے راشو سے کرنا چاہتے ہیں، آپ کی کیا رائے ہے؟“

عابی نے آغا جی کے دل کی بات فرمان سے کہہ دی کیونکہ آغا جی بہت جلد اس فیصلے کا اعلان کرنے والے تھے۔

”تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے عابی! کیونکہ میری تو خواہش ہے کہ میری بی بی ای گھر کی بہو بنے۔ لڑکا خواہ لقمان، یسین بھائی کا ہو یا رحمن بھائی کا کیونکہ اپنوں سے دور رہ کر جو اذیت میں نے برداشت کی ہے، میں نہیں چاہتا کہ میری اولاد بھی اسی آگ میں جلتی رہے۔ ویسے راشو تمہیں کیسا لگتا ہے؟“

فرمان نے ساری ذمہ داری عابی پر ڈال دی تو عابی، فرمان کو دیکھنے لگیں۔

”راشو مثالی لڑکا ہے فرمان! مجھے بے حد پسند ہے۔“

”پھر عابی میرے آگے کا انتظار بے شک نہ کرنا۔ کیونکہ میرا سفر طویل بھی ہو سکتا ہے اور مختصر بھی، مجھے تم پر اعتماد ہے کوئی رسم ادا کر دینا۔“ فرمان نے ساری ذمہ داری عابی پر ڈال دی۔

”فرمان آپ کو مجھ پر اتنا اعتماد کیوں ہے؟“

عابی نہ جانے کیا سنتا چاہ رہی تھیں کیونکہ شعاع نے جو باتیں بتائیں تھیں۔ اس سے ظاہر تھا کہ فرمان، عابی پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ فرمان کچھ دیر عابی کو دیکھتے رہے۔

”مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے عابی! ان جذبات کی صداقت پر اعتماد ہے جو تم اپنے دل میں میرے لیے اور شعاع کے لیے رکھتی ہو، اب میں چلتا ہوں۔ میرے لیے دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہ معاف فرمائے اور میری بی بی مجھ مل جائے خدا حافظ عابی!“

فرمان خدا حافظ کہتے ہوئے دروازے کی طرف مڑ گئے تو عابی کم سمی خوابیدہ نظروں سے ان کی پشت اذیت سے بہت دور چلی گئیں۔ ان کی نظروں میں وہ منظر گھوم گیا جب فرمان پہلی بار جد ہوئے تھے۔ عابی نے دم کی کرسی میں دھنسی فرمان کے آنے اور جانے کو محسوس کر رہی تھیں کہ وہ خواب تھا یا حقیقت اور جب اچھی طرح یقین آ گیا کہ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی۔ ایک خوبصورت اور زندہ حقیقت تو خوشی کا ایک لطیف احساس۔ وہ بے میں سرایت کر گیا، ان سے یہ خوشی تھا سنبھالنے نہیں سنبھال رہی تھی۔ وہ جلدی از جلد بی بی جان کی سستی کو خیر سنا کر پرسکون کرنا چاہتی تھیں۔



”عذرا۔۔۔ قدسہ بیٹی! ایسی کوئی جلدی نہیں، سوچ کر جواب دے دینا۔“

آغا بی نے دونوں کو خاموش دیکھ کر کہا تو دونوں ہر آرائشیں۔

”ویسے لیمن اگر اشعر مان جائے تو لڑکی بڑی اچھی ہے، اپنی بیٹی ہے، گھر میں رہے تو زیادہ بہتر ہے۔ اب گھر میں خیر سے اتنے لڑکے موجود ہیں اگر باہر کریں گے تو لوگ کیا خیال کریں گے۔ آپ لیمن، میں اشعر کو ضرور منالوں گی کہ وہ اشعر سے شادی کر لے، اتنی اچھی لڑکی ہے۔“

عذرا بیگم مسلسل بول رہی تھیں اور لیمن احمد اخبار ایک طرف رکھ کر ان کو بخور دیکھ رہے تھے۔

”بیگم! لڑکی تو جیسی ہے سو ہے مگر اس کے ساتھ ملنے والی فیکٹری کچھ زیادہ ہی دلکش ہے۔“ لیمن مسکرا کر طرہ کیا تو وہ برامان گئیں۔

”ارے ہٹائیے بھی آپ تو ایسے ہی بدنام کرتے ہیں۔ وہ تو اس کا حق ہے۔ آغا بی نے دیا ہے شہر صرف یہ چاہتی ہوں، گھر کی بیٹی گھر میں ہی رہے۔“

”اچھا تو بابا! اپنے بیٹے سے بات کرو، مجھے تو خوشی ہی ہوگی، اشعر کو بہنو بنا کر۔“

لیمن احمد نے ساری ذمہ داری اشعر پر ڈال دی تو عذرا بیگم خوش ہو گئیں کہ بھلا اشعر کو کیا اعتراض ہوگا ہے۔ ایسی بیاری اور باصلاحیت لڑکی کسے پسند نہ ہوگی۔



اس روز موسم بہت خوشگوار تھا۔ گھنیرے بادل اور خشک ہوائے خشکی ہی پیدا کر دی تھی۔ سب ہی نے مل کر لی تھی مگر اشعر کا پیچہ تھا اور اسے لازمی جانا تھا۔ اس نے سوچا اشعر کے ساتھ چلی جائے گی۔ تیار ہو کر باہر آئی تو اشعر بائیک کا قیسمہ بنا ہوا تھا۔ ساری کھول کر رکھی ہوئی تھی۔

”اوہو! آپ کی بائیک کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا اشعر بھائی۔“

وہ اشعر کے قریب چلی آئی۔ اسے فکر لاحق ہو گئی کہ یونیورسٹی کیسے جائے گی۔

”کیا کروں بہن! یہ انتہائی بد بخت ہے۔ آج تک میرے ساتھ کپڑا مارتا نہیں کر پائی۔ ارے بھی کیا جو جس سالوں اس کی ٹیوننگ نہیں کراتا، کھانا چپا کر دیتا ہوں۔ اسے تو اعلاظری کا شہوت دینا چاہیے نا۔“

نے زور سے بائیک کو ٹھوکر ماری، پھر پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا، پھر بے دھیانی میں سیاہ ہاتھ چہرے پر لگا لیے تو انہیں مضمکہ خیر شکل دیکھ کر اشعر کو کہنی آگئی۔ وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

”ہوں تو اس کا مطلب ہے، بارش یقیناً ہوگی، اس لیے کوئی پتھری وغیرہ ساتھ لے لینی چاہیے۔“

راشوی بھی یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر آیا تو اشعر کو یوں ہنسنے دیکھ کر بولا۔

”کیوں ہنسیا! آپ پر کسی وحی کا نزول ہوا ہے کہ بارش ہوگی؟“

اشعر، راشوی کی طرف گھوم گیا تو وہ بھی اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔

”وحی کیا بھائی آج اشعر کھل کر کہتی ہے تو سمجھو بارش ہوئی کہ ہوئی۔“

راشوی نے شوخ نظروں سے دیکھا تو اشعر جھینپ سی گئی۔

”ویسے یار اشعر! اگر تم یوں ہی جو کر بنے رہو ہمیشہ کے لیے تو اشعر یوں ہی ہنستی رہے۔“

راشوی، اشعر کے قریب کھسک آیا تو اشعر اسے گھورنے لگا۔

”اس سے پہلے کہ کچھ کہوں، اشعر کو ساتھ لے جاؤ یونیورسٹی! اس کا پیچہ ہے۔“

اشعر نے کہا تو راشوی، اشعر کو دیکھنے لگا جو شاٹنگ پنک کپڑوں میں ہاتھ میں فائل لیے کھڑی تھی۔

”مجھے تو خیر کیا اعتراض ہوگا اگر اشعر کو اعتراض نہ ہو تو میں تیار ہوں۔“ راشوی نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

”ارے واہ راشو بھائی! آپ بھی کبھی کبھی بیگانوں والی باتیں کرتے ہیں، بھلا مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا؟“

راشوی، اپنی بولتی راشوی کی طرف بڑھی تو اس کی مخصوص مہک راشوی کی روح میں اتر گئی۔

”میں تو کبھی کبھی بیگانوں والی بات کرتا ہوں اشعر مگر تم تو۔۔۔!“

راشوی نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر بات ادھوری چھوڑ کر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔ اشعر کا احتیاط سے بیٹھ

”راشوی راہ حیان سے بائیک چلانا۔“

اشعر کی شوخ بات راشو کے لیوں پر مسکراہٹ کی صورت میں ڈھل گئی۔ غضب تو اس وقت ہوا جب یہ دیکھ لیا کہ وہ تیار ہوئی سیاہ ٹریک سوٹ میں جو گنگ کر کے آ رہا تھا۔ اشعر اندر سے کانپ گئی کہ نہ جانے

کتنے خیر اچھے لگائے گئے تھے۔ گھر ہوی نے ایک اچھٹی سی نگاہ دونوں پر ڈالی اور اک شان بے نیازی سے

”اے ہاں! آئے ہالوں کو چھٹکا دے کر پیچھے کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اشعر نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا مگر پھر بھی ایک

لڑکی کی دل میں کہ ہوی نے اسے راشو کے ساتھ کیوں دیکھ لیا۔ دن بھر دل بوجھل رہا۔ پھر دے کر باہر آئی تو

”میں بڑھ گیا۔ اشعر کو سدری سی محسوس ہونے لگی۔ پوائنٹ کا تو وقت نہیں تھا۔ کسی منی ویکن کے لیے

ہاں! آج تو بسوں، ویکوں کی ہڑتال ہے، پوائنٹ کے چلنے کا انتظار کریں۔“

”اف میرے خدا! پوائنٹ چلنے میں تو ابھی دو گھنٹے ہیں۔“

لڑکا کہہ کر آگے بڑھ گیا تو اشعر پریشان ہو گئی۔ اس نے سوچا لاکھیری میں جا کر یہ وقت گزرا لیا جائے۔ وہ

”اے خدا! آج تو بسوں، ویکوں کی ہڑتال ہے، پوائنٹ کے چلنے کا انتظار کریں۔“

”اف میرے خدا! پوائنٹ چلنے میں تو ابھی دو گھنٹے ہیں۔“

لڑکا کہہ کر آگے بڑھ گیا تو اشعر پریشان ہو گئی۔ اس نے سوچا لاکھیری میں جا کر یہ وقت گزرا لیا جائے۔ وہ

”اے خدا! آج تو بسوں، ویکوں کی ہڑتال ہے، پوائنٹ کے چلنے کا انتظار کریں۔“

لڑکا کہہ کر آگے بڑھ گیا تو اشعر پریشان ہو گئی۔ اس نے سوچا لاکھیری میں جا کر یہ وقت گزرا لیا جائے۔ وہ

”اے خدا! آج تو بسوں، ویکوں کی ہڑتال ہے، پوائنٹ کے چلنے کا انتظار کریں۔“

لڑکا کہہ کر آگے بڑھ گیا تو اشعر پریشان ہو گئی۔ اس نے سوچا لاکھیری میں جا کر یہ وقت گزرا لیا جائے۔ وہ

”اے خدا! آج تو بسوں، ویکوں کی ہڑتال ہے، پوائنٹ کے چلنے کا انتظار کریں۔“

لڑکا کہہ کر آگے بڑھ گیا تو اشعر پریشان ہو گئی۔ اس نے سوچا لاکھیری میں جا کر یہ وقت گزرا لیا جائے۔ وہ

”اے خدا! آج تو بسوں، ویکوں کی ہڑتال ہے، پوائنٹ کے چلنے کا انتظار کریں۔“

لڑکا کہہ کر آگے بڑھ گیا تو اشعر پریشان ہو گئی۔ اس نے سوچا لاکھیری میں جا کر یہ وقت گزرا لیا جائے۔ وہ

”اے خدا! آج تو بسوں، ویکوں کی ہڑتال ہے، پوائنٹ کے چلنے کا انتظار کریں۔“

لڑکا کہہ کر آگے بڑھ گیا تو اشعر پریشان ہو گئی۔ اس نے سوچا لاکھیری میں جا کر یہ وقت گزرا لیا جائے۔ وہ

گئی۔ وہ اسے خشکیں لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا، جو سر جھکائے نام نادام سی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس سرد موسم میں اگر سونٹیا گرم شال وغیرہ لے لیتیں تو اساترئیس میں زیادہ فرق نہ پڑ جاتا۔ برہم لہجے میں وہ اسے سمٹتا ہوا دیکھ کر ڈانٹ رہا تھا۔ کتنی چاشنی، کتنی اپنائیت تھی اس ڈانٹ میں۔ نے بھنگی پلوں سے اس ناخدا کو دیکھا جو نا کو سواحل تک لاتے لاتے کئی بار ڈوبنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ اس کے کہ اس وقت ہوئی کی ڈانٹ، اس کے طنز پر بے نہیں لگ رہے تھے مگر جانے کیوں پھر بھی آنسو غریب پر پھیل گئے تو ہوئی اس بیماری سی بے وفا سی لڑکی کو دیکھنے لگا اور دل بغاوت پر آمادہ ہوئے لگا کہ وہ اسے چھوڑ چکا کر ایسی جگہ چلا جائے، جہاں راشونہ ہو۔ بارش ذرا تیز ہوگئی تو ہوئی نے اپنی جیکٹ اتار کر اس کے شانوں پھیلا دی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”نہیں ہوئی پلیز! یہ آپ ہی پہنے رہیے، آپ کو تو بایک چلا نا ہے۔“

”نہیں، میں بہت سخت جان ہوں کچھ نہیں ہوتا ہم ہی پہنے رہوں۔“ ہوئی نے بایک اشارت کرتے ہوئے۔ ”چلو بیٹھو اب۔“ وہ ذرا ڈپٹ کر بولا تو شعاع دھڑکتے دل کے ساتھ جھنجھکی ہوئی بیٹھ گئی تو وہ بایک ان لگا، شانوں پر ہوئی کی جیکٹ تھی، وہ اس کا محافظ تھا، ہمسفر تھا، قریب تھا، وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ہوا کا پیو شعاع کے بال اڑا کر ہوئی کے منہ تک پہنچ رہے تھے اور وہ ناگواری سے ہنسا رہا تھا۔ ایک ٹریک سٹاپ بایک روٹ پر تو ہوئی کی نگاہیں بیک مڑ پر ٹھہر گئیں، جہاں سے شعاع نظر آ رہی تھی، سر دھوا سے اس کی ہانک اور گال سرخ ہو رہے تھے۔ ہوئی بے خود سا اسے دیکھے گیا۔ بھلا اتنی پیاری لڑکی نفرت کے قابل ہے، یہ تو دل میں چپا کر رکھنے کے لائق ہے۔ عین اسی وقت شعاع کی نظریں بھی اٹھ گئیں تو جیسے لمبے ختم گئے۔ یہ ہوئی کی نگاہوں نے انہیں جن میں ہمیشہ اس کے لیے نفرت کی چنگاریاں ہوتی تھیں۔ ان نگاہوں میں تو محبت کی قدیلیں دانی تھیں۔ وہ ابھی کسی خوش فہمی کا شکار بھی نہیں ہوئے پانی تھی کہ سنل کل گیا۔ گویا ہوئی بھی حواسوں میں آ گیا۔

”دیکھ ڈھنگ سے اوڑھو اور بال سنیا لو۔“

بھاری لہجے میں حکم دیا گیا تو اس نے اپنی چوٹی آگے کر لی۔ دونوں گھر کے آگے پہنچے تو سارے شری بار بار موسم انجوائے کرتے ہوئے پائے گئے۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر سب کو معنی خیز کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

”یا ابھی! یہ ماجرا کیا ہے؟“

”ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔“ دبی دبی سی شریر سرگوشیاں وہ دونوں سن رہے تھے۔ پاسر نے تو حد ہی کر دی ان کے قریب آ کر گنگٹایا۔

”موسم حسین ہے لیکن تم ساجیس نہیں۔“ شعاع جھینپ گئی مگر ہوئی تیز نظروں سے پاسر کو گھورتا تھا۔ بڑھ گیا، کوریڈر میں پہنچا تو سیدہ بیگم نے آ لیا۔

”ہوئی یہ میں نے کیا دیکھا وہ۔ وہ ڈائن تمہارے ساتھ آئی ہے کیوں آخر کیوں؟“ سیدہ..... انتہائی غصے میں اس سے پوچھ رہی تھیں وہ الجھ کر رہ گیا۔

”اے پلیز! بہتر الفاظ استعمال کریں، نہ میں اسے لینے کیا نہ وہ میرے ساتھ آئی۔ وہ اکیلی تھی، بیوں بڑتال کے باعث اکیلی کھڑی تھی ایک غنڈہ اس کی طرف بڑھا۔ اسی آپ سمجھتی کیوں نہیں، وہ میری عزت میرا مطلب ہے وہ اس گھر کی عزت ہے اور سب لڑکیوں کی عزت ایک جیسی ہوتی ہے۔ نازک آجیئے سلامت۔“

”نہیں۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو میں یہی کچھ کرتا جواب کیا ہے۔“ ہوئی نے دل کا چہرہ چھپاتے ہوئے وضاحت کر دی تو سیدہ مطمئن ہو گئیں کہ یہ صرف بھڑدی کے تحت ہوا ہوئی کوئی جذبہ نہیں مگر وہ کیا جانیں کہ بات کہاں تک جا پہنچی ہے؟“

بزرگوں میں آج کل شعاع ہی موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی، عذر اور قد سیدہ بیگم کے جواب کے خطر تھے اور بہانوں اس لیے خاموش تھیں کہ عذرنا بیگم اپنی رائے کا اظہار کر دیں تو وہ بھی کچھ بولیں۔

”بھئی بیگم، مجھے تمہاری منطق سمجھ میں نہیں آئی۔ آغا جی نے ہمیں بھی کہا ہے۔ شعاع تمہیں جب اس حد پسند ہے تو آغا جی سے کہہ دو کہ ہم شعاع کو بہو بنائیں گے۔“

”نہاں! بڑوں کو بہت برداشت کرنا پڑتا ہے، میں اسی لیے خاموش ہوں کہ عذرنا کوئی جواب دے تو میں بڑوں میں تو شعاع کو پھولوں کی ڈولی میں بٹھا کر لاؤں گی۔“ سیدہ بانو نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

عذرنا بیگم کو عین کہاں وہ اشعر سے پوچھتا جا رہی تھیں مگر وہ ہنسنے ہی نہیں چڑھ رہا تھا۔ مگر بھی تو ساتھ راشویا لڑکی اور لاڑکا ہوتا۔ اس وقت اتفاق سے وہ اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ انہوں نے جالیا۔

”اشعر بیٹے! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”ہی اے جان! حکم کریں آپ۔“ اشعر کتاب بند کر کے ماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”بیٹے! تمہیں شعاع کیسی لگتی ہے؟“

”شعاع بہت اچھی لگتی ہے بلکہ ہمارے خاندان کی سب سے اچھی لڑکی شعاع ہی ہے۔“

اشعر کچھ نہ سمجھتے ہوئے شعاع کی تعریف کر گیا تو عذرنا بیگم خوش ہو گئیں۔

”اچھا تو تمہیں شعاع پسند ہے۔ میں آج ہی آغا جی سے کہتی ہوں کہ شعاع تمہیں پسند ہے۔“

آغا جی سے، کیا مطلب ہے آپ کا اسی؟“ اشعر حیران تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

”بیٹے! آغا جی کی خواہش ہے کہ شعاع اسی گھر کی بہو بنے۔ اس کے لیے ان کی نظر تم پر اور راشو پر پڑی ہے۔“

”مجھے بھی شعاع بے حد پسند ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ.....“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ اب ساری بات اشعر کی سمجھ میں آئی تو اس نے ماں کو شانوں سے تمام لیا۔

”امی جان! شعاع کو دلہن بنائیں راشو کی، میری تو وہ بہن ہے، سگی والی بہن بالکل شوق افق کی طرح اور بھئی راشو شعاع کو بہت پسند کرتا ہے بلکہ جتنی جلدی ممکن ہو، شعاع کو راشو کی دلہن بنادیں، پیاری امی جان!“

اشعر نے شعاع کو بہن کہہ کر عذرنا بیگم کو مایوس کر دیا تھا۔ وہ تو کیا کچھ سوچ کر بیٹھی تھیں کہ امانوں پر اس نے اب تو اشعر کو سمجھا تا فضول تھا۔ جب وہ شعاع کو بہن سمجھتا تھا تو کیا حاصل تھا بحث سے وہ مردہ دلی سے اٹھ گیا۔

”امی جان! مایوس کیوں ہوتی ہیں۔ راشو بھی تو آپ ہی کا بیٹا ہے۔ شعاع آپ کی بہو بن تو رہی ہے۔“

”دلہن بن کر.....“ اشعر سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ وہ کیوں مایوس ہوگئی ہیں۔

عذرنا بیگم کی طرف سے مطمئن ہو کر قد سیدہ بانو نے آغا جی کے سامنے سر جھکا دیا۔

”آغا جی! آپ کے حکم سے سرتابی میں بیگناہ عظیم سمجھتی ہوں۔ شعاع تو میرے دل کا ٹکڑا ہے، جواب میں نکال لے ہوگی کہ میں عذرنا کے جواب کی منتظر تھی۔ اب آپ جب چاہیں شعاع کو میری بہو بنادیں۔“

”جیتی رہو بیٹی! تم نے ہمیشہ میرا مان رکھا ہے، خدا ہر کسی کو تم جیسی بیٹیاں دے تو گھر رخت بن جائیں گی۔“  
بات اس وقت فاصل ہوئی جب راشو اور شعاع اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ اب ہم کسی پرانی مرضی مسئلہ پر  
کریں گے کیونکہ ہمارے اکثر فیصلے انتہائی غلط اور اذیت ناک ثابت ہوئے ہیں۔ خدا خوش رکھے تمہیں بیٹی۔“  
آغا جی بڑے پرسکون ہو گئے مگر وہ راشو اور شعاع کی رائے لینا بھی ضروری تصور کرتے تھے لیکن فی الحال

یہ بات صرف ابھی بڑوں تک تھی۔ اس وقت سب ہی ہال کمرے میں موجود تھے کہ ہوی بھی آگیا۔ اس نے تعجب  
کی نگاہ راشو پر ڈالی جو دوسروں سے ہٹ کر بیٹھا پشت سے ٹیک لگائے کچھ سوچ رہا تھا۔  
”راشو! اس روز شعاع تمہاری خطرہ ہی رہی مگر تم اسے لینے پر یورٹل نہیں گئے۔“  
ہوی کے لہجے میں غمی کی کے ساتھ ٹھہر بھی تھی۔ راشو نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا اور سیدھا ہر کر بیٹھ

”وہ میری خطرہ ہی تو نہیں تھی، اسے میرا انتظار ہوتا تو میں ضرور پہنچ جاتا۔“  
ایک آہ، ایک نیس راشو کے ہونٹوں کے اندر ہی دم توڑ گئی۔  
”اتنی چاہت کے باوجود تمہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ تمہاری خطرہ تھی کہ نہیں۔“  
ہوی کا کٹھن لہجہ راشو کے دل پر آ رہے کی طرح چل رہا تھا۔

”میں اسے روح کی شدتوں سے چاہتا ہوں ہوی، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ وہ میری خطرہ نہیں تھی۔“  
راشو کڑکی سے باہر دیکھنے لگا تو ہوی اس کے قریب چلا آیا۔  
”وہ تمہیں نہیں چاہتی تو..... تو راشو پھر وہ کیا چاہتی ہے، کسے چاہتی ہے، کس کو بے وقوف بناتی

ہے؟“ ہوی کے بے قرار لہجے میں کھوج تھی، بے چینی تھی، بے قراری تھی جس کا سبب وہ خود بھی نہیں جانتی  
تھا۔ راشو نے گہرا سانس لیا اور اس کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔  
”ہوی! شعاع کسے چاہتی ہے یا کس کو بے وقوف بناتی ہے، اس کو چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے

ہو، اپنے کس جذبے کی تسکین کے لیے یہ سب پوچھ رہے ہو؟“  
راشو نے بھی تلخ لہجے میں کہا تو ہوی لا جواب سا ہو گیا، اب بھلا کیا جواب دیتا کہ وہ کیا چاہتا ہے اپنے کس  
جذبے کی تسکین کے لیے پوچھ رہا ہے۔  
”واہ راشو بھائی! آپ کی یہ نظم تو واقعی دل میں اتر گئی۔“

شعاع اپنے دھیان میں بولتی ہوئی آگئی مگر سامنے ہوی کو دیکھ کر گویا بڑیک لگ گئے۔ اس نے ڈائری راشو  
کی طرف بڑھائی جو راشو کے منع کرنے کے باوجود اشعر نے شعاع کو بڑھنے کے لیے دے دی تھی۔ ہوی نے  
جنون سوار ہونے لگا۔ اس نے تیزی نگاہ شعاع پر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ شعاع، ہوی کے قدموں کے  
نشان دیکھ رہی تھی اور راشو کی نظریں اس کے خوبصورت چہرے پر تھیں۔ شعاع متوجہ ہوئی تو وہ بھی سیدھا ہو گیا۔  
”نظم کی پسندیدگی کا شکر یہ شعاع!“

انداز بیاں مگرچہ میرا بہت شوخ نہیں  
شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

”نہ..... نہ نامکن ہر بار ہمیں بنز باغ دکھا کر سیاسی وعدے کر کے اپنا بیچ دکھا دیتے ہیں مگر آج تک نہ“

”نہ..... نہ نامکن ہر بار ہمیں بنز باغ دکھا کر سیاسی وعدے کر کے اپنا بیچ دکھا دیتے ہیں مگر آج تک نہ“

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint



”کیا، کیا، یہ کیا کہہ دیا تھا گڑیا نے ایک دم ہی جکھن چکنے لگے دل کا مگر تاروں سے بچے لگا۔“  
 ”گڑیا! تم نے کہیں غلط تو نہیں سن لیا۔“ راشو بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔  
 ”ایسے ہی غلط سن لیا۔ اتنی مشکلوں سے بیڈ کے نیچے چھپ کر سنی ہیں۔ بی بی جان اور بھائی  
 باتیں۔ دیکھیے تو بازو پر خراش آگئی۔“ گڑیا نے ثبوت کے طور پر خراش زدہ بازو اگے کر دیا۔  
 ”اگر یہ سچ ہے تو گڑیا اور کیا چاہیے۔“ راشو نے گڑیا کے بازو پر ہونٹ رکھتے ہوئے سوچا۔  
 ”آپ کو پسند تو ہیں ناں شعاع؟“  
 ”بھئی میری بات چھوڑو اور جو شعاع نے انکار کر دیا تو۔“  
 راشو نے ڈرتے ڈرتے اپنے خدشے کو زبان دی۔  
 ”ارے واہ وہ انکار کیوں کرنے لگیں۔ اتنے پیارے اتنے اسماٹ تو ہیں آپ۔“  
 گڑیا نے محبت بھری نظروں سے راشو کو دیکھا جس کے چہرے پر خوشی پھوٹی پزیر تھی۔  
 ”تو پھر دعا کرو گڑیا! کہ تمہارا یہ بھیا شعاع کو بھی پسند آجائے۔“  
 ”انشاء اللہ ضرور آئے گا۔“ گڑیا خوشی کے پھول راشو کے آنکھن میں مہکا کر خود باہر بھاگ گئی تو راشو ان  
 مہک کوروش میں اترا محسوس کرنے لگا۔

”اچھا تو شعاع یہاں ہے۔ میں اسے باہر ڈھونڈ رہا تھا۔“ اشعر نے بلند آواز میں کہا تو راشو سیدھا ہوا  
 ”کہاں ہے شعاع؟“ راشو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔  
 ”تمہارے خیالوں میں اور کہاں!“ اشعر نے کہا تو راشو دلکشی سے مسکرا دیا۔  
 ”یار! یہ گڑیا ابھی ابھی آئی تھی اور بہاروں کا پیغام سنا گئی۔“  
 ”میں بھی اسی بہار کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“  
 ”کیا یہ سچ بات ہے اشعر۔ میں تو سمجھ رہا تھا۔ گڑیا خود سے کہہ رہی ہے۔“  
 راشو بے پایاں خوشی کو سنبھالتے بے یقینی سے اشعر کو دیکھ رہا تھا۔ جواب میں اشعر نے اسے ساری بات۔  
 دی تو راشو نے آنکھیں بند کر کے ایک بڑے سکون سا گہرا سانس لیا۔  
 ”مبارک ہو۔ اب تو خوش ہو ناں۔“ اشعر نے راشو کے چہرے پر بہاروں کو رکھا دیکھ کر کہا۔  
 ”خوش۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے کیا خوشی ہو سکتی ہے اشعر! لیکن میری خوشی اس وقت تک ادھر  
 ہے۔ جب تک اس میں شعاع کی محبت، اس کی تائید کی روشنی شامل نہیں ہو جاتی۔“ اس سوچ سے راشو کے روٹ  
 چہرے پر جذبی اترنے لگی۔  
 ”وہ بھی حاصل ہو جائے گی انشاء اللہ۔ اب تیار رہو آغا جی کسی بھی وقت تمہیں انٹرویو کے لیے کال  
 سکتے ہیں۔ ڈھنگ سے جواب دینا۔ ٹھیک ٹھیک کیونکہ۔“ اشعر اسے چھیڑ رہا تھا اور وہ سوچوں میں گم تھا۔  
 ”اشعر! اگر شعاع نے انکار کر دیا تو؟“ اس خدشے سے راشو اندر سے ڈوب گیا۔  
 ”ناممکن۔ وہ سعادت مند لڑکی آغا جی کے سامنے انکار کر ہی نہیں سکتی!“  
 ”چلو مان لیا کہ وہ سعادت مندی میں مارا بھی گئی تو۔ تو اشعر وہ مجبوری میں مجھے قبول کرے میں انشاء  
 مسئلہ کر دیا جاؤں یہ مجھے گوارا نہیں۔ بخشی ہوئی خست بھی میری خود داری کی تو ہیں ہے۔ یہ بات مجھے گوارا نہیں۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“  
 ”مگر اشعر کو بھی اس سلسلے میں شعاع سے کسی مثبت جواب کی توقع تو نہ تھی مگر پھر بھی وہ راشو کو بے حوصلہ نہ  
 دیتا۔ جب سے ان شریروں کو اس بات کا پتا چلا تھا سب بے حد خوش تھے۔ شعاع سے چھپ کر راشو کو  
 بچھڑاتے اور وہ دھیرے سے مسکراتا جس میں اس کی اُمید کی کرن بھی ہوتی اور ناکامی کی پُر سوز سی کیفیت  
 اس میں بھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ یاسر کچھ زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ نہ ہی وہ راشو کو پھیر رہا  
 اب بے اس کی یہ حرکت نوٹ کی تھی۔  
 ”یہ تمہیں کیا ہوا ہے تم نے تو ایسے پُپ سادھ لی ہے جیسے خود ہی شعاع باجی کے اُمیدوار ہو۔“  
 شرمی نے اسے ٹوکا تو یاسر کو احساس ہوا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔  
 ”نہیں یار یہ سوچ رہا ہوں کہ خدا کرے شعاع باجی مان جائیں۔“  
 ”ارے واہ کہیے نہیں مانیں گی۔ ہمارے راشو بھتیخا! میں کوئی عیب ہے اتنے خوبصورت اور اسماٹ ہیں کہ  
 مان باجی انکار کر ہی نہیں سکتیں۔“

”Wish You Good Luck“  
 اشعر نے اس کے شانے پر دو باؤ ڈال کر کہا تو راشو ان ب کی محبتیں سمیٹا دھڑکتے دل کے ساتھ اندر آ گیا  
 اٹھ کر بی بی جان اور آغا جی تھے۔ یہ بھی غیبت تھا کہ اپنے والدین نہ تھے۔  
 ”یہ تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو۔“ ہوی باہر سے آیا تو ان سب کو آغا جی کے کمرے کے سامنے جمع دیکھ کر بولا۔  
 ”آہستہ بولے ہوئی بھتیخا اندر راشو بھتیخا کا انٹرویو ہو رہا ہے سلیکشن کے لیے۔“  
 گڑیا نے ہوی کو آہستہ بولنے کی تاکید کی تو وہ سمجھ نہ پایا۔  
 ”سلیکشن کے لیے انٹرویو کیا مطلب؟“

”مطلب ابھی نہیں بتا سکتے۔ راشو بھیا کو باہر آ جانے دیں۔“

شرعی کی بات بھی ہوئی کے پلنے نہ پڑی تو وہ وہاں سے آ گیا۔

”آغا جی آپ نے مجھے بلایا ہے۔“ راشو مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”ہاں بیٹا۔ یہاں آؤ۔ میرے قریب بیٹھ جاؤ۔“ آغا جی نے اسے اپنے قریب بٹھالیا راشو کا دل زبردست سے دھڑک رہا تھا۔

”ہمیں تم سے کچھ کہنا ہے راشو بیٹے۔“ آغا جی نے اس کے جھکے سر کو دیکھا۔

”آپ حکم کریں آغا جی۔“ راشو نے سعادت مندی سے کہا۔

”نہیں بیٹے! حکم نہیں مشورہ کرنا ہے۔ تم اس مشورے میں اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر سکتے ہو۔ خواہ میری خواہش کے مطابق ہو یا خلاف کیونکہ حکم دینا میں نے چھوڑ دیا۔ ماضی میں جو چند فیصلے ہم غلط کر چکے تھے وہ ہر اتنا نہیں چاہتے۔ آج ہم تمہارے سامنے اپنی شدید ترین خواہش کا اظہار کریں گے۔ تمہیں اختیار ہے اقرار کرو یا انکار تم پر یہ فیصلہ مسلط نہیں کیا جائے گا۔“

آغا جی آہستگی سے اپنی بات کے لیے اسے تیار کر رہے تھے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی خواہش کی زندگی ہے۔ بھلا کوئی اپنی زندگی سے بھی انکار کرتا ہے مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔

”راشو۔ میرے بچے ہماری خواہش ہے کہ شعاع اور تمہیں منسوب کر دیا جائے کیونکہ بیٹے کی جدائی ہمیں توڑ دیا ہے اور ہم اس کی اولاد کو اب خود سے جدا نہیں کر سکتے اس لیے۔“

جو بات آغا جی نہ کہہ سکے۔ بی بی جان نے کہہ دی۔ راشو کا دل ٹھوم اٹھا۔ کہ ان کے ہاتھ تمام کر کہہ۔ کہ بی بی جان بھلا کوئی زندگی سے انکار کر سکتا ہے مگر وہ خاموش رہا۔ لحاظ ملاحظہ آ رہا تھا۔

”راشو بیٹے! ہم تمہارے جواب کے منتظر ہیں۔“ آغا جی کی آواز خاموش سکوت کو توڑتی راشو کے دل میں اتر گئی۔ دل تھا کہ کہہ رہا تھا جلدی سے ہاں کر دو مگر داغ تھا کہ سوچنے کی مہلت مانگ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں شعاع کا حسین چہرہ گھوم گیا جو ازل سے انجمنی تھی۔ غیرتی چہرہ کس بھروسے پر اقرار کر لیتا۔

”میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آپ کے حکم سے سرتابی میرے لیے گناہ ہے۔ میں یہ گناہ کیونکر کر سکتا ہوں لیکن آغا جی میں۔“ راشو بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

”لیکن کیا راشو بیٹے جو تمہارے دل میں ہے کھڑا لو۔ اب میرا حوصلہ بہت بڑا ہو گیا ہے۔ غور کرنا کہ اگر انسان سیکتا ہے ناں۔ تمہارے ہر فیصلے کا احترام کیا جائے گا تم کہو تو۔“

آغا جی کی بات نے راشو کی ہمت بندھائی تو اس نے ایک نظر آغا جی پر ڈالی اور کھڑا ہو گیا۔

”آقا۔ اچھے سوچنے کے لیے تم تو اس وقت چاہیے۔“

”ہاں بیٹے ضرور۔ تم جب تک چاہو سوچ لو اور ہر حکم کے تسلط سے آزاد ہو کر زندگی کا یہ فیصلہ کرنا کہیں نہیں ہو کہ ایک بار پھر میں غلط فیصلہ کر بیٹھوں اور پچھتاؤں۔ جاؤ اطمینان سے سوچو۔ تم ہر حکم کے فیصلے کے لیے آزاد ہو۔“

”شکریہ آغا جی! راشو باہر نکل آیا تو سب اس پر جھپٹے۔

”ہونہہ! بڑے افلاطون بننے ہیں سوچ کر بتاؤں گا۔ جھٹ سے کیوں نہیں کہہ دیا کہ آپ کو شعاع باجی قبول ہیں۔“ صدف، شبنم، ہارنہ ناراض ہو رہی تھیں۔ وہ ان سب کی محبت پر بڑھ سوزی مسکراہٹ لیے آئیں دیکھ رہا تھا۔

”مت مسکرائیے۔ زہر لگ رہے ہیں مسکراتے ہوئے۔ بھلا شعاع باجی بھی کوئی سوچنے والا چیز ہیں۔“

بت سے اپنانے والی چیز ہیں۔“ شرعی نے منہ بنا کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔

”چاہئے۔ میں آپ سے نہیں بولتی۔ مقصد کیا ہے آپ کا اس سوچنے سے۔“

من پاداشی ناراض ہوئی تو راشو نے اس کا پھولا ہوا چہرہ اہاتھوں میں تمام لیا۔

”تم لوگ نہیں سمجھتے۔ کچھ نہیں جانتے۔“ راشو نے گڑباز کے رخسار چھپتے اور آگے بڑھ گیا۔

دوسری طرف انہوں نے شعاع کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اٹھتے بیٹھے راشو کی تعریفیں کرتے رہے۔

”پار کیا پر سنائی پائی ہے۔ راشو بھیا کی۔ اتنے خوبصورت اتنے اسمارٹ ہیں۔“

”واقعی پار شرعی! وہ لڑکی تو اپنی قسمت پر ناز کرے گی جس سے راشو بھیا کی شادی ہوگی۔“ بوبی نے

ان کو سنانے کے لیے بلند آواز میں کہا۔ شعاع حیران تھی کہ اچانک ان لوگوں کو راشو میں کون سے نئے سر کے پر نظر آنے لگے ہیں کہ یوں تعریف کر رہے ہیں۔

”اے شعاع عجب کہاں جا رہی ہیں۔ آئیں میں آپ کو راشو بھیا کی تصویریں دیکھاؤں قسم سے کالج کی پاساری لڑکیاں ہی جان دیتی تھیں ان پر مگر یہ بھی پتھر ہیں۔ یہ دیکھے بلیو جری میں کتنے اسمارٹ لگ رہے۔“

شعاع ایک کر کے تصویریں دیکھا رہی تھی اور شعاع حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ بھلا اسے راشو کی وجاہت

بہت کس سے کب انکار تھا۔

”پار بوبی! وہ کون سی لڑکی تھی جو کہا کرتی تھی کہ راشو سے شادی نہ ہوئی تو کبھی شادی نہ کروں گی۔ یا رحم

ذرا کتنی مسین مگر راشو پر جان دیتی تھی۔“

بوبی نے اپنی کوششوں کا اثر شعاع کے چہرے پر تلاش کرتے ہوئے کن اکلیوں سے شعاع کو دیکھا۔

”ہاں یا رحم سے۔ بڑی اچھی لڑکی تھی۔ یہ اپنے راشو بھائی بھی بس ایویں۔ ویسے شعاع باجی آپ کا کیا

لہے راشو بھیا کے بارے میں؟“

اب شرعی براہ راست شعاع سے پوچھ رہا تھا اور وہ حیران نظروں سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کو دیکھ رہی تھی۔

”مٹائیے ناں شعاع باجی؟“ آفاق اصرار کر رہی تھی۔

”اے بھتی یہ اچانک تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے اچھے بہت اچھے ہیں راشو بھائی اس میں کیا شبہ ہے؟“ وہ

لہجے کچھ پارسی تھی کہ وہ کیسا سستا جا رہے ہیں۔

”اے شعاع باجی! آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ یہ دیکھیے کتنے اسمارٹ لگ رہے ہیں راشو بھیا۔“

صدف نے ایک تصویر شعاع کے آگے کر دی جس میں سیاہ ڈنر سوٹ میں راشو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”صدف تو میں نے کب انکار کیا ہے۔ کیوں تم اس طرح کر رہے ہو۔“

”گنہ ماں نے گی لڑکی شومارو پھونک۔“

شرعی نے آہستگی سے کہا اور صدف شبنم، چپا جی سے جو وظیفہ پوچھا تھا، پڑھ کر بھونک ماری تو

لہجے بوش ہونے کو ہو گئی۔



دنیا جان کی حیرانیاں شعاع کے لہجے میں اتر آئیں۔ وہ اسے دیکھنے لگی، جس کا دل اس وقت عجیب سے گزر رہا تھا۔ کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے چاہنے والے سے اپنے بارے میں رائے لینا۔ کیا خبر وہ کیا کہتا ہے، کیا اس کا کل کر محول بن جائیں۔ یا بن کھلے مر جھ جائیں۔ شعاع اب بھی نہیں سمجھ سکتی تھی کہ راشو کیا نہا ہے، راشو کو چونکہ اپنے اوپر مکمل کنٹرول تھا، اسی لیے اس کا کوئی جذبہ شعاع پر عیاں نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے اہم بات اس کی بات سمجھ نہیں پائی تھی۔

”ہاں شعاع اور اصل بی بی جان اور آغا جی سمیت تمام بزرگوں کی خواہش ہے کہ میری اور تمہاری، میرا دل ہے۔ امید ہے تم سمجھ گئی ہوگی۔“

راشو اس پر ایک نظر ڈال کر رُخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ بات گو کہ ادھوری تھی مگر شعاع سمجھ چکی تھی۔ اب اتنی بات سمجھ نہیں سکتی کہ اتنی واضح بات کو سمجھ نہ پائی۔ بات \_\_\_ نہ تو مدی تھی اور نہ یہ غیر متوقع پھر بھی ایک نیسی نے کیوں دل میں اٹھی تھی۔ حالانکہ راشو نے سب سے بڑھ کر اسے ہر اعتبار سے اخلاقی سہارا دیا تھا، اس کی لڑائیوں سے اُلجھ پڑتا۔ سلجھا ہوا، پُر وقار، بحر انگیز شخصیت کا مالک راشو واقعی اس قابل تھا کہ کوئی بھی لڑکی اسے بڑا خوش نصیب تصور کر سکتی۔ لیکن اب جبکہ یہ اعزاز اسے بخشا جا رہا تھا تو اندر کہیں گہری سیاہ شام سناٹوں کی آن لپے اتر آئی تھی۔ وہ شام جو شعاع کے دل میں اترتی تھی۔ راشو نے اس کے سائے، اس کے خوبصورت ہونے پر کد کپے تھے۔ اس نے گہرا سانس لے کر اس کی پلکوں کی گہری ہوئی چلن کی طرف دیکھا جو اپنی اوٹ ہانے لگا تھا۔

”شعاع!“ اس نے آہستگی سے پکارا تو وہ بھی لوٹ آئی۔

”آپ۔ آپ کی کیا رائے ہے؟“

اس نے نظر اٹھا کر راشو سے پوچھا۔ راشو اس کے چہرے پر سوچوں کے سائے دیکھ رہا تھا۔

”میری تو جو رائے تھی۔ وہ میں آغا جی کے سامنے بیان کر چکا ہوں۔ اس لیے کہ میری خواہش ان کی دل سے غفلت نہیں۔“

راشو نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ شعاع چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اسی کا عکس لہرا رہا تھا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔

”تم خود سمجھ دار ہو شعاع! میرا خیال ہے۔ تم سمجھ گئی ہوگی۔ لیکن کوئی فیصلہ اس وقت تک قابل عمل نہیں ہوگا جب تک تم اپنے دل سے اس فیصلے پر خوشی کا اظہار نہیں کرتیں۔ تم ہر قسم کے فیصلے کے لیے آزاد ہو۔ تم پر کوئی جبر نہیں۔ فیصلہ کرنا جس میں تمہارے دل کی رضا بھی شامل ہو۔ تمہارے ہر فیصلے کا احترام کیا جائے گا۔“

راشو اپنی جاہل خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر بڑے خلوص سے فیصلے کا اختیار دے رہا تھا اور وہ فیصلے کی ہر بات کوئی فیصلہ ہی نہیں کر پاری تھی۔ ایک طرف اپنا دل تھا جس میں اس ستم گر کا راج تھا۔ جس سے کسی ناگوار واقعہ نہیں تھی اور دوسری طرف آغا جی، بی بی جان اور دیگر بزرگوں کے ساتھ وہ راشو امید کا کھنکھولہ نہا کھڑا تھا جس نے ہمیشہ اس کی عزت کی تھی۔ کتنی مشکل ہوتی ہے فیصلے کی گھڑی۔ راشو پھینکنے والے فیصلے میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دے لیکن یہ آغا جی کا فیصلہ تھا۔

”شعاع!“ راشو کی آواز شعاع کو سوچ کے شبستان سے واپس لے آئی۔

”ارے آپ نہیں گئے۔؟“ شعاع اپنی طرف بڑھتے ہوئے راشو کو دیکھ رہی تھی۔ اسے نجانے کیوں راہ کا سب کے ساتھ نہ جانا اچھا نہیں لگا تھا۔ ہوی یقیناً اسے دونوں کی ملی جلتی ہی تصور کرے گا اور اس کا دل خراب ہوگا۔ ہوی کے اتنے بڑے روپنے کے باوجود جانے کیوں اس کا اتنا خیال رہتا۔

”ہاں شعاع میں جان بوجھ کر نہیں گیا۔ کیونکہ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

”ضروری باتیں۔“ شعاع نے کچھ چونک کر راشو کو دیکھا جس کے وجہ چہرے پر سوچوں کا الجھا جال بچھا تھا، اور آنکھوں میں ان کی کئی داستان اظہار کی راہ پانے لگی۔

”ہاں بہت ضروری۔“ راشو نے ایک گہری نگاہ اس کے لیے چہرے پر ڈالی، جو شروع سے اب تک ان کی ہی تھا۔ کو سو دور۔

”جی کیسے۔“ شعاع نے آہستگی سے گویا اجازت دی۔ راشو اپنی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کرنے لگا۔ شعاع اس کے چہرے کے الجھاؤ سے اس کی بات کا اندازہ لگانے لگی کہ کیا بات ہو سکتی ہے۔

”شعاع! وہ دراصل میں۔“

وہ پھر ٹھہر گیا اور مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ جو غلط نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ایسی بھی کیا بات ہے جو آپ کہتے کہتے رہ جاتے ہیں۔“

شعاع لہجے میں تجسس اور آنکھوں میں حیرانی لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

”بعض باتیں ایسی بھی ہو جاتی ہیں شعاع زندگی میں کہ الفاظ کا انبوه کثیر بھی یا کافی معلوم ہوتا ہے۔“

حال اپنے بارے میں تمہاری رائے لینے آیا ہوں۔“

راشو نے کیا کچھ سوچ رکھا تھا، مگر کوئی سوچ بھی اظہار کی راہ نہ پاسکی۔

”میری رائے آپ کے بارے میں؟“

”ٹھیک ہے راشو! اگر بزرگوں کا یہی فیصلہ ہے تو میں گستاخی کرنے والی کون ہوں۔“

شعاع نے بمشکل تمام ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تو چھٹا کے سے راشو کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ کتنی بے دلی سے اس نے یوں کہا تھا۔ گویا اپنی تو کوئی مرضی شامل نہیں۔ بزرگوں کی مجبوری سے وہ اسے فوراً کر رہی ہے کتنا اذیت ناک تھا یہ احساس کہ اس کے جذبے کے ایک طرف ہیں۔ اسے تو ملن کی کبھی بھی اتنی خواہش نہیں رہی تھی، جتنی اس بات کی کہ شعاع بھی اسے اسی قدر چاہے جتنا کہ وہ چاہتا ہے۔ راشو کی ہمتیں ٹوٹنے لگیں۔

”نہیں شعاع! یہ ایک دودن کی تو بات نہیں۔ ساری عمر کا سوال ہے۔ مجبوراً اپنا ہاتھ میرے خالی ہاتھ پر دے دو، مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں کہ میں تم پر مسلط کر دیا جاؤں اور تم مجھے ایک ناگوار بوجھ سمجھ کر گوارا نہ دے جاؤ۔ اس معاملے میں میں کچھ خود غرض سا ہوں۔ آغا جی نے مجھ سے کہا، چونکہ ان کی خواہش میں میری خواہش میں نے اپنی رضامندی دے دی۔ لیکن میں نے سوچنے کی مہلت اس لیے مانگی کہ تم سے تمہاری رائے لے لوں۔ لیکن مجھے یہ بات گوارا نہیں تم محض لحاظ اور ادب میں مجھے قبول کرو۔ یہ میرے خلوص کی توہین ہے شعاع! میں چاہتا ہوں کہ جس طرح میں نے یہ فیصلہ دل سے کیا ہے۔ تم بھی اسی طرح کرو، جس طرح میں نے چاہت سے یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم بھی اسی چاہت سے یہ فیصلہ قبول کرو ورنہ انکار کرو۔ ہاں بالکل انکار کرو۔“

یہ کہتے ہوئے راشو کے حلق میں جانے کیوں تکلیف ہونے لگی۔ وہ گم صم کھڑی شعاع کو دیکھ رہا تھا جو ہنوز فیصلے کی صلیب پر لٹکی ہوئی تھی۔ گداز ہاتھوں کی محرومی اٹھایاں آپس میں جکڑی ہوئی تھیں۔ جو اس کی جلیں نکلتی تھیں۔

”شعاع! میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔“

اسے یوں خاموش دیکھ کر راشو کی گھیر آواز پھر سکوت کو توڑ گئی تو شعاع نے گھیری پلکیں اٹھا کر دیکھیں۔ راشو نے محسوس کیا اس کی آنکھوں کے کنارے ہلکے چمکے ہیں۔

”مجھے سوچنے کا موقع تو دیں۔“

راشو نے محسوس کیا۔ اس کی ہنسی آواز میں نامعلوم ہیزار ی ہے، ناپسندیدگی ہے۔

”نہیں شعاع! انسان کبھی بھی تجھیں سوچ کر نہیں کرتا اور جب سوچ کر کرتا ہے تو وہ محبت نہیں ہوتی ہے۔ بس میں سمجھ گیا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہو گی۔ ویسا ہی ہو گا۔ تم کوئی فکر نہ کرنا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ اب تم جا کر آرام کرو۔ سخت اتر آئی ہے۔ اور ہاں اس بات کا کسی سے حسی کہ اشعر سے بھی ذکر نہ کرنا۔ میری کوئی بات بُری لگی ہو تو درگزر کرنا خدا حافظ۔“

راشو نے زخمی سی نگاہ اس پر ڈالی اور دل میں اتر آنے والی برسات چھپائے تیز تیز قدموں سے وہاں سے آگیا، اور شعاع وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب کیا ہو گیا تھا۔ وہ مسلسل راشو کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ وہ تمام رات ہی اس نے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ سب اس کے سامنے راشو کی تعریفیں کیوں کر رہے تھے۔ مگر میں اس کی زندگی کے فیصلے ہوتے رہے اور اسے خبر تک بھی نہ ہوئی۔

آج اپنے والدین ہوتے، اپنا گھر ہوتا تو وہ یوں بے خبر رکھی جاتی، ہر بات سے۔ اس کی زندگی کے فیصلے اس سے بالا بالا ہوتے۔ وہ تو راشو کی اطلاع پر ہی کہ اس نے پوچھ لیا ورنہ تو سر جھکا تا ہی پڑتا آغا جی کے سامنے

شعاع نے جلتی آنکھوں کو گرٹ ڈالا۔ شعاع کو کیا خبر کہ اس وقت وہ بھی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ آج صبح اپنے بیٹم نے اسے یہ حوالہ سنایا تھا کہ شعاع کے لیے آغا جی کی نظر سب سے پہلے تم پر پڑی تھی۔

”پھر ای۔؟“ ہوئی ایک دم کھڑا ہو گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔

”پھر کیا؟“ میں نے کہہ دیا۔ خبردار جو کسی نے میرے ہوی کا نام لیا تو۔ میرا بیٹا اتنا گرا پڑا نہیں کہ اس دو ٹوکے لہجے سے شادی کرے یا اسے پسند کرتا پھرے، نہ میں اسے پسند کرتی ہوں، نہ ہوی اس لڑکی کو پسند کرتا ہے۔

”جی ای۔! ہوئی کرسی پر جھٹک چلا گیا۔ سیدہ بیگم تو آگ لگا کر جا چکی تھیں۔

ان ای ای یہ کیا کیا آپ نے۔ کوئی ماں یوں بھی اپنے بیٹے کے دل کے ٹکڑے کرتی ہے۔ آپ نے کیسے کہہ آپ کا ہوی شعاع کو نہیں چاہتا۔ اس کا طلبگار نہیں۔ یہ زیادتی ہے اسی! یہ ظلم ہے۔ آپ نے ماں ہو کر اپنے لہجہ کو دیا۔ شعاع۔ شعاع راشو کی ہو جائے گی۔ وہ راشو کی ہو کر اسی گھر میں رہے گی۔ میرے زخموں پر نمک لے گا ان دونوں کا تعلق۔ نہیں راشو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا حلیہ مجھڑوں گا۔ کوئی حق نہیں ہے تمہارا باپ۔ سمجھے تم، کوئی حق نہیں۔ میں۔ میں اسی سے کہہ دوں گا۔ میں نگر جاؤں گا سب سے۔ مگر راشو جس جینے نہیں ہاں! خدا یا! میں کیا کروں۔ میں شعاع اور راشو کی صورت ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتا۔ ہرگز نہیں۔

وہ خود سے لڑتے لڑتے بے دم ہو گیا تھا۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو اسی قوت جا کر راشو کا گلا دبا دیتا مگر اسی دلی خوشی سے اسے راشو اور شعاع کی شادی کا حوالہ سنایا تھا۔ وہ مصحوم کیا جانے کہ اس خبر سے اس کے بھیا لپ پکی بجلی گری ہے۔ جس نے سب کچھ جلا کر خاک کر دیا تھا۔ یہ سب لوگ کتنا غلط سمجھتے تھے اسے۔ اسے ان سے نفرت کب تھی۔ وہ تو اسے جہنم جہنم سے چاہتا چلا آ رہا تھا۔ مگر بعض اوقات چاہتوں کا ادراک بھی تو نہیں ہوتا ہے کہ انسان بے بسی سے دیکھتا رہ جاتا ہے اور یہ نفرت کی دیواریں بھی تو اس کے دل کے ارد گرد لگائی ماں نے کھڑی کی تھیں۔ جو اپنی نفرت اور انتقام میں سب کچھ بھول چکی تھیں اور نہ اس نے تو شعاع کی ہوا کو کوی دل میں اس کی محبت کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اور کوئی کیا جانے کہ سب کے سامنے شعاع سے ان کرنے والا ہوی خواہوں خیالوں میں شعاع کا ہاتھ تھامے سپنوں کی وادی میں نکل جاتا، ہنسا سکراتا، پیاری لہجہ میں کہتا۔ پھر یہ کیسی آندھی چلی کہ سب کچھ تاریکی کی نذر ہو گیا۔

اس پر جنون سوار ہو گیا۔ تو تمہیں مجھ سے نفرت ہے۔ ہاں نفرت ہے تمہیں مجھے سے۔ لیکن میں تمہیں نہیں دیکھوں گی میں بھی بننے دوں گا۔ مگر جاؤں گا، یا مار دوں گا۔ جنون میں ہوی نے کمرے کا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔ وہ دھن دھن لگ رہا تھا۔ جو سب کچھ جس نہیں کر دینے پر تلا ہو۔

”تم کون ہوئی ہو مجھ سے نفرت کرنے والی۔ میں تم سے نفرت کر سکتا ہوں۔ تم مجھ سے نہیں۔ میں۔ میں۔“

”ہوی۔! ہوی! یہ کیا پاگل پن ہے۔“

اشعر جو ہوی سے ملنے آیا تھا۔ کمرے کا اجڑا حلیہ۔ اور ہوی کو وحشی بنے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ہوی تب افسانہ لکھنے ہوئے تھے۔ چہرے پر شدید تاؤ تھا۔

”ہوی! مجھے بتاؤ تو۔ کیا بات ہے۔ میں تمہارا بھائی ہی نہیں۔ دوست بھی ہوں۔ تم تو بالکل کٹ کر رہے ہو۔“



اشعر نرم لہجے میں بولتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بٹھانا چاہا مگر وہ بچھڑ گیا۔

”ہونہ! سمجھ لوں گا اس راشکو۔ وہ اس سے شادی کر کے اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ اس گھر میں وہ نہیں رہیں گے یا میں۔“

وہ دھاڑ رہا تھا۔ اور اشعر کو دکھ ہو رہا تھا۔ ہوی ایسا تو ہرگز نہیں تھا۔ یہ چچی جان نے نفرتوں کی آگ بھڑکائی تھی۔

”ہوی! تمہیں میں کچھ اس لیے نہیں کہوں گا کہ اس میں تمہارا قصور نہیں۔ یہ چچی جان ہی تمہارے نفرت کی ضیلیں کھڑکی کی ہیں لیکن اس کے باوجود بھی تم گناہ گار ہو۔ کیونکہ بڑھے لکھے ہو۔ عاقل بالغ ہو۔ حقیر تمہارے سامنے ہے کون قصور وار ہے کون نہیں اس کے باوجود اگر تم اس قسم کی باتیں کرو تو افسوس کی بات ہے۔“

”مت کرو دعائے اس کی، مجھے نفرت ہے اس لڑکی سے شدید نفرت۔“

ہوی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اسی وقت اشعر کی نظر ہوی کی میز پر رکھی فائل پر پڑی، جس کے ہر صفحے پر صرف ایک ہی نام چمک رہا تھا۔

شعاع۔ شعاع۔ ایک سردی لہر اشعر کے دل میں اتر گئی۔ تو وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا ہوی تم بھی۔ اشعر نے دکھ۔ سے سوچا اور مڑ کر ہوی کو دیکھنے لگا جو اتنی نفرتوں کے باوجود خود کو شعاع کی محبت کے فائل سے نہیں بچا سکا تھا۔ وہ فائل تھا اس کی طرف آ گیا جو دونوں ہاتھوں میں بال جکڑے دل میں اٹھے طوفان کی جاہ کاریاں دیکھ رہا تھا۔

”ہوی!“ اشعر نے آہستگی سے پکارا تو وہ وحشت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”ہوی!“ تمہیں شعاع سے اتنی ہی نفرت ہے تو پھر یہ کیا ہے؟ یہ نفرت کا کون سا انداز ہے؟ اس طرح تو نام ان لوگوں کا لکھا اور مٹایا جاتا ہے، جن سے محبت ہو۔ شدید محبت۔ اب بتاؤ تمہیں اس سے واقعی نفرت ہے یا“ اشعر نے اسے شانوں سے تھام کر پوچھا۔

”اشعر!“ وہ بے بسی سے اشعر کے شانے سے آگ کتنی بڑی نعمت ہوتا ہے کسی دوست کسی ہمدرد کا شانہ ہی ایسے وقت میں جب انسان ٹوٹ کر بکھر رہا ہو اور ہوی کو بھی اس وقت ہمدرد دوست اشعر کا شانہ ایک نعمت ہی لگتا۔

”میں نے ایسا تو نہیں سوچا تھا اشعر! یہ زندگی کس دورا ہے پر آگئی ہے۔ میں اتنا برا تو نہیں تھا۔ میرا کیا قصور جو سزا مجھ ل رہی ہے۔“ وہ ٹوٹے لہجے میں بول رہا تھا۔

”یہ یہ تو وہ بات ہے ہوی! جو تمہاری اور چچی جان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اب تمہیں احساس ہوا کہ کسی قصور کو سزا دی جائے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ شعاع کو سزا دیتے ہوئے کبھی تم نے یا چچی جان نے سوچا کہ“

بے گناہ ہے۔“

”اشعر! نشتر نہ چلاؤ۔“ ہوی تڑپ اٹھا۔

”اصل میں نہ تمہارا قصور ہے نہ شعاع کا مگر سزا کے حق دار دونوں غمیرے ہو۔ شعاع کو بھی اس نے ناکردہ گناہوں کی اتنی سزا ملی ہے کہ وہ ٹوٹ گئی ہے اندر سے، وہ اس گھر کی بیٹی ہے اور اس گھر کی بہو بننا بھی اس کا حق ہے۔“ اشعر کتنی ہی دیر ہوی کو سمجھا تا رہا۔ مگر وہ سمجھنے والوں میں سے کب تھا۔

”ہوی! انچل جیسی باتیں نہ کرو۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں۔ کہ اس گھر کے حالات بگاڑنے کا سوا

اور صرف تمہاری والدہ کے سر ہے اور پھر تم لوگوں کو آغا جی نے کچھ نہیں کہا۔ شعاع کے لیے انہوں نے انتخاب کیا ہے اور یہ بہترین انتخاب ہے۔“

”نیک ہے اگر ان کا یہ ہی فیصلہ ہے تو اس گھر میں وہ دونوں رہیں گے یا میں، کیونکہ۔ کیونکہ میں اپنی جان کے سامنے اسے راشکو کا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

اشعر کو وہیں چھوڑ کر ہوی دل کا درد چھپائے باہر آ گیا۔ پچھلی رات میں زرد چاندنی کا پھیلا درد ہوی کی ہڈیوں میں اتر گیا۔ اس تنگی میں بھی اسے لگ رہا تھا گویا سارا بدن آگ میں جل رہا ہو۔ اس نے چپل اتار دی اور ہٹا اس پر بٹھلا رہا۔ پھر بھی سکون قلب نصیب نہ ہوا تو وہ اداں آ گیا۔ شعاع کے کمرے کے سامنے جیسے اس کے دم گئے۔ وہ گویا جاگ رہی تھی اس کا جی چاہا کہ اندر چلا جائے اور پوچھے کہ اسے کیا حق پہنچتا ہے اس سے نہ کرنے کا۔ وہ راشکو کی نہیں ہو سکتی۔ مگر کبھی نہیں۔ اس پر پھر جنون سوار ہونے لگا۔ اسی وقت عالی نے بارہ کول کرا سے دیکھا۔

اس سے قبل کہ وہ ان کی طرف جاتا۔ وہ خود اس کے قریب چلی آئیں۔

”ہوی! کیا بات ہے؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔“

وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئیں تو وہ جیسے صوفے پر گر سا گیا۔ عالی گھبرا گئیں۔

”ہوی! ہوی کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے اس کی تپتی پیشانی پر ہتھولی۔

”خالہ جانی آپ تو میری ماں ہیں۔ خود ہی بتائیے، مجھے کیا ہوا ہے۔ کہاں درد اٹھا ہے، ہاں۔ تو بیٹوں بدل میں رہتی ہیں۔ ان کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتی ہیں۔ مگر آپ کو کچھ خبر نہیں۔ خالہ جانی کچھ خبر نہیں۔“

عالی کے ہاتھ آنکھوں سے لگا لگا رہے وہ روہا ہوا گیا تو انہوں نے اس کی جھلی پیشانی کو چوم لیا۔

”خاتون ہے بیٹے کہ تمہیں پا کر میں اپنی تمام نامراداویوں کو بھول گئی تھی مگر تمہاری ماں تمہیں میری گود میں لاکر ہی بدیت ہی رہی۔ تمہاری رگوں میں نفرت بھرتی رہی، ہم مکمل طور پر میرے بیٹے ہوتے تو میں دیکھتی آج

کب سائے نمی داس ہوتے۔ مجھے بتاؤ میرے بیٹے اس حزن، اس ملال کی کیا وجہ ہے؟“

ممتا کی چادر میں اسے چھپائے وہ کتنی ہی دیر اس کے زخموں پر اپنی محبت کے پھاہے رکھتی رہیں۔ وہ بہکتا ہوا۔ وہ جب اپنے کمرے میں آیا تو درد کی شدت میں کافی کمی محسوس کی۔ وہ خدا کا شکر بجالاتا رہا کہ خالہ جانی نے اسے نہ گھر نہیں گیا۔ اپنے کرب کی آبرو بچالایا تھا۔ ورنہ کتنا برا ہوتا اگر ان کو خبر ہو جاتی۔ کہ وہ اسی شعاع کو

باتا ہے، جس سے نفرت کا اظہار ہر پہلے کرتا رہتا ہے۔ تمام رات خود سے لڑنے کے بعد وہ پہلی بار سیدہ بیگم کے زینے سے متعلق ہوا تھا۔ کہ ان لوگوں کو الگ ہو جانا چاہیے ورنہ پہلے جب انہوں نے کہا تھا تو اس نے شدت سے کالٹ کی تھی۔

”امی! پھر آپ نے کیا سوچا ہے۔“

”کس بارے میں بیٹا!“ وہ حیران نظروں سے اُلجھے ہوئے ہوی کو دیکھ رہی تھیں۔

”الگ ہونے کے بارے میں امی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ ہم الگ ہو جائیں گے۔ آپ کا خیال

ممت ہے امی جان! اب ہم ان خود غرض لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے، میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ انہیں راشکو

نہیں شعاع سے ہونگئی تو سب سے پہلے میں یہ گھر چھوڑ کر جاؤں گا۔ کہہ دیں آپ ابو سے بھی۔“

”یہ ہی تو روتا ہے بیٹے! کہ تمہارے باپ کی آنکھوں پر جو والدین اور بہن بھائیوں کی محبت کی ہے۔ وہ اترے تو ان کو اچھے نمے کی پہچان ہوتا۔ معلوم ہے اس بات کے بعد کتنے دنوں تک انہوں نے شادی کی بات نہیں کی تھی۔“

”کچھ بھی ہوا امی! اگر یہ شادی ہوگئی تو میں اس گھر میں ایک ہل بھی نہیں رکوں گا۔“

وہ پختہ لہجے میں اپنا اٹل فیصلہ سناتا ہوا باہر نکل گیا۔ لیکن اسے کیا خبر تھی کہ شعاع اور راشی کی مشکل صورت اختیار کر گئی تھی۔

شعاع سے بات کرنے کے بعد راشی کے لیے نامکن ہو گیا تھا کہ وہ اس سے شادی کے لیے نہ سکے۔ اور اب اس میں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کس طرح جا کر آغا جی اور بی بی جان کی آنکھوں میں روشنی کے چراغوں کو گل کر دے، اس کے لیے سب سے اذیت ناک بات یہ ہی تھی۔ مگر آخر تک ان کو لازم ہو گیا۔

”شعاع! مجھے معلوم ہے۔ وہ ہرگز انکار نہ کرتی۔“

”ہاں! مجھے معلوم ہے۔ وہ ہرگز انکار نہ کرتی لیکن اشعر وہ اسے صرف بزرگوں کا فیصلہ سمجھ کر ہی قبول کر رہی تھی۔“

”تو اور کیا کرتی۔ ہمارے ہاں ننانوے فیصد فیصلے لڑکیاں ایسے ہی کرتی ہیں۔“

”لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میں محبت کے معاملے میں کتنا خود غرض ہوں۔ لیکن میں چاہتا کہ جسے میں چاہتا ہوں، وہ مجھ کو ملے۔ بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ جسے میں چاہتا ہوں۔ وہ بھی مجھے ملے۔“

”پہلے اور میری اتنی چاہت کے باوجود شعاع پہلے روز کی طرح اچھی ہے۔ میری حیثیت اس کے نزدیک صرف ایک لڑکی ہے۔ اس طرح تو شعاع کو اپناتے ہوئے میں خود کو بہت کم تر اور ذلیل سمجھ رہا ہوں۔ اور یہاں تو اس نے میری نظر میں گرنا نہیں چاہتا۔“

کرنیک سائے راشی کے وجہ یہ چہرے پر جا ل بنانے لگے۔ اس نے سردنوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اشعر بھی سیدھا لپٹا چھٹ کود کھیتے ہوئے عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا۔ اسے یقین تھا۔ شعاع کے دل میں یقیناً ہلکا سا کوشش ہونا چکا ہے اور وہی جو بظاہر شعاع سے شدید نفرت کرتا تھا مگر دل میں۔ کیا چکر ہے یہ۔

”جذبوں کا یہ کھیل اشعر کی سمجھ سے بالاتر تھا۔“

”ان سب سے یہ بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ تم کسی اور لڑکی کو پسند کرنے لگے ہو۔ اس لیے شعاع سے شادی نہیں کر رہے۔“

”اشعر نے راشی کو گھورا۔“

”اس لیے اشعر کہ وہ لوگ شعاع سے بدظن نہ ہو جائیں۔ کیونکہ وہ سب شعاع کو بہت چاہتے ہیں۔“

”اور جواب وہ لوگ تم سے بدظن ہو گئے ہیں۔“

”منالوں گا سب کو۔“ راشی نے رو دینے والی مسکراہٹ لیوں پر لاتے ہوئے کہا۔ اور پھر راشی کی اذیت پر کہاں کہاں سے پتھر نہیں پڑے۔ بزرگ الگ برہم تھے، اور ایک پارٹی تو اس پر ہل پڑی تھی۔ لڑکیوں کو لہذا عام رائیگاں جانے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ لڑکوں کو الگ افسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے خواہ مخواہ راشی جیسے لڑکے کی تعریفیں کر کے شعاع کو متاثر کرنا چاہا۔

”آغا جی! ناراض مت ہوئے گا۔ مجھے تو اس وقت بھی کوئی اختلاف نہیں تھا۔ سوچنے کی یہ بہت توجہ تھی۔ شعاع کی رائے لینے کے لیے مانگی تھی۔ وہ آپ کے حکم پر سر تو جھکانے کے لئے تیار ہے۔ مگر دل میں نہیں۔ اور آغا جی مجھے یہ بات گوارا نہیں کہ اس کی پسند کے خلاف مجھے اس پر مسلط کر دیا جائے۔ آپ ناراض نہیں آغا جی۔“

راشی نے ان کی چھڑی ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے انہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔

”نہیں بیٹے! ناراض کیوں ہونے لگے ہم۔ اللہ بہتر کرے گا۔ آج تک ہم نے بھی ایسے کی غلط فہمی نہیں جن کے نتائج اس بڑھاپے میں ہمیں رلا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے تم دونوں نے جو فیصلہ کیا ہے بہت اچھا ہے۔ ازم اس کے غلط نتائج ہمیں تو بڑا تو نہ سکیں گے ناں۔“

آغا جی کی آواز راشی کو کسی گھر سے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔ راشی میں ہمت نہ ہوئی کہ ان کے چہرے کی طرف دیکھے، وہ باہر آ گیا۔ کچھ دل کا درد بھی ہوا ہو رہا تھا۔ اگر وہ ہی خود غرض بن جاتا تو آغا جی کی بات نہ ہوتے مگر کیا فائدہ ہوتا۔ شعاع کے اس ساتھ کہ وہ مجرم بنا رہے۔ تمام عمر اس بوجھ تلے بارے کہ وہ شعاع پر مسلط کیا گیا ہے۔ وہ دل سے اس کی نہیں۔ وہ اس وقت کسی سے بات کرنا چاہتا تھا نہ کسی کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ خصوصاً اشعر کا، اور شامت اعمال کو ریڈور میں اسی سے مدبھیڑ ہو گئی۔

”ہائیں، یہ تم کس کے جنازے کو کندھا دے کے آ رہے ہو۔“ اشعر نے اس کے ویران چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اپنے ارمانوں کے جنازے کو ایک زخمی مسکراہٹ راشی کے ہونٹوں پر آ گئی۔

”کیا مطلب؟“ اشعر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آ گیا۔ راشی بے دم سانس لے رہا تھا۔

میں نے تو مذاق بنالیا ہے۔“

”پچھو جا رہی ہیں آپ کہہ لیں مگر اس حقیقت سے آپ بھی انکار نہیں کریں گی کہ ہر انسان کو اپنی پسند کی

ابراہیمؑ نے اپنے پسند کے جیون ساتھی کے ساتھ گزارنے کا حق ہوتا ہے پھر۔“

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعاع میں ایسی کیا خرابی ہے۔ کیا کمی ہے کہ تم اس سے یوں بدکتے ہو جیسے باپا جہنم ہو۔ مجھے ملو! اس لڑکی سے۔ میں بھی تو دیکھوں کون ہے شعاع کا مقابلہ کرنے والی۔“

ابراہیمؑ بری طرح چھٹن گیا۔ کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ عالی سب کچھ اگلا کر رہیں گی۔ تب بھی کاسہارا لینا پڑا۔

”اے میرے خدا! یہ ایک ہی کہانی بار بار کیوں دہرائی جا رہی ہے۔“

عابی نے سر ہٹا لیا۔ اب وہ کسے تصور اور ٹھہرائیں۔ راشکو کو یا شعاع کو، کیونکہ یہ تمام وارداتیں ان پر گزر چکی ہیں۔ ان کی زندگی کی بھی ایسی ہی کہانی تھی تو وہ تصور وار کس کو ٹھہرائیں۔ نہ راشکو سمجھا سکتی تھیں، اور نہ ہی مان کو راشکو کے لیے تیار کر سکتی تھیں۔

”سوری راٹھوئے! میں بے خبر تھی مگر تمہیں حقیقت سب کو بتا دینی چاہیے تھی۔ دیکھا سب لوگ کہنے بد  
لانا ہو گئے ہیں تم سے۔ ابھی کچھ دیر قبل قدسیدہ بھنا بھی اور لقمان بھٹیا آئے تھے۔ تمہاری شکایت کرنے، ان کی

”نہیں بچھو! اس طرح وہ سب شعاع سے بدگمان ہو جائیں گے اور یہ بات مجھے گوارا نہیں۔“ راشو نے اٹھی سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ہوئی مگر سے ایک طرح سے لاقطع ہو گیا تھا۔ ماں بیٹے کی اب ایک ہی بات ہوئی تھی۔ دونوں کی اب یہ ایک ہی بات ہو کر اٹھ اور شعاع کی شادی کو روکا جائے، اگر نہ روک سکیں تو الگ ہو جائیں۔ مگر آج جب ہوئی آیا تو بندہ بچہ نہ آتے ہی خوشخبری سنانی کہ راشن نے شادی سے انکار کر دیا ہے اسے کوئی اور لڑکی پسند آگئی ہے۔

”راشن نے انکار کر دیا اسے کوئی اور لڑکی۔ کہا یہ سچ۔ ہاں۔“

ہوئی کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی ناممکن بات بھی ہو جائے گی۔ ایک عجیب طرح کا سلون، اضمینان  
 کا لطیف احساس اس کے دل کی مہر جھانکی کلی کو کھلا گیا۔

”ہاں، کہا تو اس نے یہی ہے۔ خیر، ہمیں کیا۔ اچھا ہی ہوا، ورنہ میں نے تو الگ ہونے کا مکمل فیصلہ کر لیا تھا۔“

نیدہ بیگریہ: ”ابھی بہت کچھ کہتی رہیں۔ مگر اس کے لیے یہ بات ہی حیات بخش تھی۔ کہ یہ بات ختم ہو گئی۔“

بہنوہ مجوم اشفا: ”اور بڑی ترہمک میں راشو کے پاس چلا آیا۔“

”راشو! سنا ہے تم نے شعاع کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اور یہ کہ تمہیں اچانک کوئی اور لڑک

ہولی کا لہجہ عجیب سا تھا خوشی بھی تھی۔ طنز بھی تھا۔ جسے محسوس کر کے راسکو غصہ آ گیا۔ مگر وہ ضبط کر لیا۔

”جہیں کس بات سے دلچسپی ہے میرے انکار سے یا میری زندگی میں آنے والی لڑکی سے؟“  
 کنبے لہجے میں کہا وہ شانے اچکا کر رہ گیا۔  
 ”جی پوچھو تو مجھے کئی بات سے دلچسپی نہیں، نہ تمہارے انکار سے، نہ اس لڑکی سے، اور نہ اس سے۔“  
 ”ہوی اکھڑ لہجے میں بولتا آگے بڑھ گیا۔  
 آج رات سنے پھر اس کی پلکوں میں اتر آئے تھے۔ نجانے کیوں اسے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔  
 لان میں غم گھاس پر نچنے پاؤں چلتے ہوئے وہ بہت سکون اور تازگی محسوس کر رہا تھا۔ سرخ بگری کی روشنی میں  
 ہوئے وہ کورڈور تک آیا تو اس کی نظر شعاع پر پڑی۔ سفید لباس میں لمبوس حسین چہرے پر ہنسی کی لہریں  
 لیے بہت اکیلی اور پیاری لگ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا۔ شعاع کی نظر اس پر پڑی سو اس نے کترا کر کھینچ لیا۔  
 چاہا مگر وہ اس کے سامنے آگیا۔

”چچ۔ چچ۔“  
 ”راشو اسے امید تو نہ تھی۔ بہت دکھ ہوا ہے راشو کے ٹھکانے کا۔“  
 وہ اس کے رخساروں پر سایہ قن پلکوں کے لرزاں سائے کو دیکھتا ہوا جیسے ہوئے لہجے میں بولا تو شعاع  
 جی چاہا اس کم ظرف کے تھپڑ رسید کر دے مگر وہ ضبط کر گئی۔  
 ”چلو اس میں اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ راشو نہیں اور سہی۔“  
 ”مثبت اپ!“ آخر کہاں تک برداشت کرتی۔ ہوی کی کم ظرفی نے اسے اس کی نظروں میں گرانا  
 تھا۔ ہڈت غم سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں تو وہ ناشتا کیے بغیر وہاں سے لوٹ آئی۔ اسے رورہ کر خون ہوا  
 غصہ آتا تھا کہ اس نے اس کم ظرف گھٹیا انسان کو چاہا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ دل پر سے اس کا ایک ایک  
 نقش مٹا دیتی۔ اسی فیشن کی وجہ سے وہ اعصابی طور پر خود کو بہت بیمار محسوس کرنے لگی۔ ہوی کے الفاظ، محسوس  
 بر سرار ہے تھے اس کے دماغ پر۔ سب ہی پریشان ہو کر اس کی تیار داری میں لگے ہوئے تھے۔ راشو سب سے  
 پیش پیش تھا۔ وہ سب کی محبتیں پا کر تادم ہوئی جا رہی تھی۔ ایک وہ تھی کہ اس نے خود غرضی کا مظاہرہ کیا تھا، اور ایک  
 یہ لوگ تھے کہ پھر بھی اسے چاہے جا رہے تھے۔ اس کی پلکیں بار بار بھیگ جاتیں۔  
 ”شعاع بابی! آپ کچھ مت سسو چلیے۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔“

صدف نے اس کے آنسو اپنے ہاتھوں میں جذب کر لیے، شعاع کی نظریں جھک گئیں۔ اسے ایک ایک  
 بات یاد آ رہی تھی کہ کس طرح بہانے بہانے سے یہ لوگ اس کے سامنے راشو کی تعریفیں کرتیں۔ پانی دم کر کے  
 پلاتیں۔ یہ ان کی محبت ہی تو تھی۔ کہ اس کے ہر جانی پن پر بھی اسی طرح محبتیں لٹا رہی تھیں۔ اس واقعے کے بعد  
 گھر کا ماحول یکسر بدل گیا تھا۔ نہ وہ شوخیوں میں نہ کوئی شرارتیں کرتا۔ سب ہی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ زندگی بہت  
 بور لگنے لگی تھی۔ ایسے میں شعاع کا دل ہڈت سے چاہتا، کہیں چلی جائے یا ابولوت آئیں۔ یہ احساس اسے ایک  
 مارے دیتا کہ صرف اس کی وجہ سے گھر پھر ویران ہو گیا تھا، اور وہ اس ستم گر کے خیال سے دل کو تباہ کرتی رہی۔  
 جس نے ہمیشہ اس پر کچھ ہی اچھا لگتا تھا۔ وہ ایک بار پھر خود ساختہ فیصلے کی صلیب پر لٹک گئی۔ ایک طرف وہ  
 جاں تھا جو کبھی بھی اپنا نہ ہو سکا تھا، جس نے ہر بل اُسے تڑپایا تھا۔  
 ”ہوی!“ ایک ٹیس دل سے انہی اور آہ کی صورت میں لبوں تک آگئی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔  
 وہ جو اس قدر گھٹیا تھا۔ اتنا کم ظرف تھا۔ پھر بھی دل اس کے لیے کیوں دھڑک رہا تھا۔ کہ اس کے خلاف فیصلہ

”آف نہیں۔“  
 ”میرے خدا! میں اتنی خود غرض کیوں ہو گئی۔ نہیں میرے خدا مجھے معاف کر دے۔ میں اتنے  
 ”آف نہیں۔“  
 ”میرے خدا! میں اتنی خود غرض کیوں ہو گئی۔ نہیں میرے خدا مجھے معاف کر دے۔ میں اتنے  
 ہمارے اندر اٹھل دیا ہے تمہاری شخصیت کو سچ کر دیا ہے اور تمہاری سچ شدہ شخصیت میرے لیے قابل نفرت  
 بننا۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔“  
 پھر وہ تہائی سے لپٹی روٹی رہی۔ جب دل کا درد آنکھوں سے پانی کی صورت بہہ گیا تو جی کچھ ہلکا محسوس  
 ہوا۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے وضو کیا اور نماز پڑھ کر کتنی ہی دیر سکون قلب کے لیے خدا سے دعائیں  
 کرتی رہی پھر کچھ سکون ملا تو آہستگی سے آغا جی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس وقت سب نے وی لاؤنج میں تھے  
 ان کے موقع غصت جانا۔ اس وقت وہ نہیں جا رہی تھی۔ کہ کسی سے مذہبیز ہو قدموں کی چاپ پر اس نے پیچھے مڑ  
 کر دیکھا۔ پیچھے تو کوئی نہیں تھا۔ البتہ سامنے سے کسی سے ٹکرا گئی۔ ہوی رعزت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا  
 تھا۔ شعاع کے چہرے پر خنجر آگئی۔ وہ اسے نظر انداز کرتی آگے بڑھنے لگی تو اس ظالم نے بازو آگے کر کے اس  
 کو روک لیا۔

”آغا جی کی سفارش بھی بیکار ہے۔ سنا ہے راشواں کی بات بھی نہیں مان رہا۔ کہتا ہے اسے کوئی اور لڑکی  
 بل ہڈت سے پسند آگئی ہے مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ اسے قبل از وقت ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ورنہ  
 پتا نہ تھا مگر تم سے شادی کر کے۔ وہ لڑکی یقیناً بہت اچھی اور شریف والدین کی بیٹی ہوگی۔“

ہوی ذالالت کی دلدل میں گرتا جا رہا تھا۔ وہ ایک ایک لفظ چبا کر ادا کر رہا تھا۔ شعاع اس کم ظرف شخص کو  
 جتنی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتا۔ وہ آغا جی کی پناہ میں آگئی۔ وہ ان کے مشفق سینے  
 کے گہاؤں میں خود آنسوؤں کی نذر کر بیٹھی تھی، اور آغا جی سمجھنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے اسے ساتھ لگا کر رونے دیا  
 کہ اس کے دل کا غبار ہلکا ہو جائے اور وہ بھی اپنی ہنسی کو انکھوں میں منادینے پر تلی ہوئی تھی۔

”بس میری بیٹی! بس اس بڑھے دل میں اس سے زیادہ طاقت نہیں کہ تمہارے آنسو مزید دیکھ سکے۔ میں  
 نے فیصلہ تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا ہے میری بیٹی! میرے فرمان کی بیٹی پھر یہ۔“ آغا جی نے اس نے  
 نہ بولی۔ چوم لی۔

”آغا جی۔ آغا جی مجھے اپنے سینے میں چھپا لیجیے۔ آغا جی ورنہ میں مر جاؤں گی۔“  
 وہ ایک بار پھر ہڈت سے رو دی۔ ہوی کے نشتروں نے اس کا جگر پھٹتی کر ڈال دیا تھا۔  
 ”کلن کر بات کرو بیٹی! ہر بات جو کرنا چاہتی ہو کہو۔“  
 آغا جی کی پدرانہ شفقت ملی تو وہ بہلنے لگی۔



”آغا جی مجھے آپ - آپ کا ہر فیصلہ قبول ہے میں، میں آپ کے قدموں سے دور رہ کر جی نہ پاؤں۔“

اس نے جھک کر ان کے گھٹنے چھو لیے۔ تو آغا جی تڑپ اٹھے۔

”بیٹیوں کی جگہ قدموں میں نہیں بنی، باپ کے دل میں ہوتی ہے اور پھر میں تو تمہارے باپ کا ہوں، مکمل کربات کر کرو، کیا کہنا چاہتی ہو۔“

آغا جی نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ کیسے اپنے منہ سے راشو کا نام لیتی۔

”آغا جی! ابو نے آپ کا حکم نہ مان کر جو گستاخی کی تھی۔ میرے گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ میرے اور راشو کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے۔ مجھے منظور ہے۔ مجھے قبول ہے آغا جی۔“

اس نے جلدی سے کہہ کر ان ہی کے سینے میں منہ چھپا لیا تو آغا جی کو یوں محسوس ہوا گویا کسی نے ان کی حیات بخش انگلیں لگا دیا ہو۔ وہ بہت توانائی محسوس کرنے لگے۔

”شعاع! میری بیٹی۔ تم نے یہ فیصلہ دل سے کیا ہے ناں۔ کسی دباؤ یا مصلحت کے تحت تو نہیں۔“

سے آغا جی کی آواز لڑکھرائی۔

”نہیں آغا جی۔“ وہ نیسوں کو بمشکل دبا پائی۔

شعاع کی رضا پاتے ہی گویا گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ خوشی سب کے لیے اچانک اور حیران کن تھی۔ سب کے چہرے۔۔ مسکرانے لگے تھے۔ راشو بدلتے خوشی کے اس خوشگوار احساس کو سمجھ نہیں پایا تو۔۔

شعاع کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں اشعر کے الفاظ گونج رہے تھے۔

”وہ اتنی گہری لڑکی ہے کہ تمام عمر بھی تمہیں چاہے گی تو تمہیں پتا نہیں چل سکے گا۔“

لیکن پھر بھی راشو کو یقین نہیں آ رہا تھا اور زندگی میں پہلی بار وہ شعاع کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ اپنے۔۔

کی حیا کی سرخی اس کے صبح رخساروں پر دیکھنے آیا تھا۔ مگر شعاع نے بڑے اعتماد وار داخل انداز میں اس سے بات کی تھی۔

”شعاع! میں تمہاری اس ادا کو سمجھ نہیں پایا۔“ راشو کی بھاری آواز کمرے کے سکوت کو توڑ گئی تو شعاع نے گھنیری پلکیں اٹھا کر راشو کو دیکھا، چاہنے کے قابل تو یہ شخص تھا پھر اس سے غلطی کیوں ہوگئی۔ کیوں پاکیزہ جذبہ اس بے وفا کی نذر ہو گئے۔

”اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کیا بات ہے راشو! آپ تو ایسے انسان ہیں کہ آپ کو پا کر کوئی بھی لڑکی محسوس کر سکتی ہے۔ میں نے یہ فیصلہ اپنے نام کر لیا ہے۔ اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔“

پھوڑا برساتے لہجے میں شعاع بول رہی تھی اور راشو گہری نگاہوں سے اس پیاری لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی ہوگئی تھی۔ وہ اس وقت کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا، جس سے اس کا دل لڑکی کا دل خراب ہو۔

”تھینک یو شعاع! تمہاری اعلا غفرنی ہے کہ ورنہ میں کس قابل ہوں۔ کوئی دعا تو نہیں کرتا لیکن خدا منظور ہوا تو تمہاری محرومیوں کو ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اس جبرست معاف کر دیتا۔“

راشو نے اس کا ملائم ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ جو جذبات کے غلبے میں جانے کب اس کے بھاری مضبوط انہوں میں آ گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر شدت سے رو پڑی۔ آج وہ اس تمام پانی کو جو ہوی کے نام کا تھا۔ بہا دینا چاہتی تھی۔ وہ اس گھٹیا انسان کی خاطر راشو جیسے مخلص انسان کو دکھ کا دینا نہیں چاہتی تھی۔

ہوی کے دل پر اس خبر سے جو بجلی گری تھی۔ اس کی تباہ کاری صرف وہی محسوس کر سکتا تھا۔ گھر میں شعاع اور راشو کی رضا سے ان کا رشتہ پکا ہو گیا تھا۔ ہر کوئی شاداں تھا۔ قدسیہ بانو تو شعاع کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں اور

ہندہ بیگم جل جل کر راکھ ہوئی جا رہی تھیں۔

”ہونہہ! بڑی پارسانہی تھیں یہ قدسیہ بھی۔ جائیداد کے جھگڑے میں کیسے اس منحوس کے ناز اٹھاتی ہیں لیکن میں بھی اس لڑکی کو سکون سے یہاں رہنے نہیں دوں گی۔“

وہ بیٹے کے دل میں ہوتی توڑ پھوڑ سے ناواقف تھیں،

”با آخروام الفت میں گرفتار ہونے میں کامیاب ہو ہی گئیں راشو کو۔“

وہ قریب سے گزرتا کچوکا لگایا تھا۔ وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔ پھر اس نے بھی دل کو سخت کر لیا۔ کچھ بھی کہہ

ہوتا۔ وہ ناراض رہتی۔ اس کے سامنے وہ راشو کی طرف متوجہ رہتی تاکہ کچھ تو اسے خیال آئے۔

شعاع آغا جی کے بیٹے فرمان کی بیٹی تھی۔ اس فرمان کی جس کے ساتھ ان کے خیال کے مطابق انہوں نے سخت زیادتی کی تھی۔ نا انصافی کی تھی۔ اب وہ تمام ارمان جو فرمان لیے پورے کرنا چاہتے تھے۔ شعاع کی فٹن پر پورے کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ شعاع اور راشو کی منگنی بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتے تھے۔ اس

مہند کے لیے انہوں نے شہر کے بہترین ہوٹل شیرٹن کا انتخاب کیا تھا۔ یہ کن سیدہ اور عذرا کے بیٹنگ لگ گئے۔

”پھر اگر میں بولوں تو گستاخ کہا جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں یہ کہاں کا انصاف ہے بھلا۔ غضب خدا کا میری بہن نامراد بیٹی ہے اور آغا جی۔ اس کے ارمانوں کی قبر پر اس کی دشمن کا مکمل تیار کرنا چاہتے ہیں۔ میں بھی دیکھتی ہوں یہ کیسے کرتے ہیں۔ سکون سے منگنی۔“ سیدہ بیگم انکارے چبھتی تھیں۔

”قدسیہ بھابھی پر حیرت ہوتی ہے مجھے تو۔ کتنی گھنی ہیں۔ کس طرح قابو میں کیا ہے آغا جی کو خیر قابو میں تو

نہوڑی سے کیا ہوا ہے۔ لیکن شعاع پر دیکھو کیسے قبضہ کیا ہے۔ ہاں کیوں نہ کرتیں شعاع پر تو خدا بھی مہربان ہے اور آغا جی بھی۔ فیکٹری اسے مل رہی ہے۔ منگنی اس کی دنیا جہاں سے نرالی ہو رہی ہے۔ ارے ہمارے بھی دودھ

ٹپل کی منگنیاں ہوئی ہیں۔ شادیاں بھی ہوئی ہیں۔ مگر ایسی مہلت ایسا جوش و خروش تو ظاہر نہیں کیا آغا جی نے۔“

عذرا بیگم بھی جلیبی جلیبی تھیں دونوں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ شعاع سے شدید حد محسوس ہو رہا تھا۔

عذرا بیگم کو تو رہ کر اشعر پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر مان جاتا تو آج سب اسے مل رہا ہوتا۔ مگر آج کے نوجوان جانے اتنی لٹو لٹو سوچ کیوں رکھتے ہیں۔ ”ویسے لیٹیں اب تو میں بھی بھوں گی کہ آغا جی نے یہ ساری ڈراما بازی کی ہے۔“

”کیا بکواس ہے یہ؟“ مہلتیں احمد نے گھور کر بیوی کو دیکھا۔

”بھئی کہ پہلے سیدہ اور عابی کے سامنے سچا بننے کے لیے فرمان وہ۔ عاق کر دیا، بے دخل کر دیا اور اب بیٹے

معاذ بھی کر دیا اور جائیداد بھی اس کے ہتھے کی اس کی اولاد کے نام کر دی۔ یہ کہاں کا انصاف ہوا بھلا۔“

عذرا بیگم کی بات سنے کی تھی، یہ ادا تو ان کو بھی آغا جی کی نہیں بھائی تھی۔ وہ خود اسے نا انصافی سمجھ رہے

تھے مہلت تو وہ تئلیوں کرتے رہیں۔ بڑنس بوہا نہیں۔ جائیداد بنائیں اور آغا جی فرمان کو سب کے برابر حصہ

صدف نے بڑھ کر شعاع کے گلے میں بازو ڈال کر دلار سے کہا۔ ہوی گود میں رکھے کشن قالین پر بیٹھ کر بظنوں سے شعاع کو گھورتا باہر نکل گیا۔ سوائے یاسر کے کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ ہوی کیوں گیا۔ پھر شعاع محض ان لاشی کی خاطر وہاں بیٹھی رہی، ہنسی بولتی رہی۔

ہوی اس وقت گھر میں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہوسٹل ایاز کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

”ہوی بھیا! آپ کافون، شرین باجی ہیں۔“

”شرین کافون۔؟“ وہ سوچتا ہوا آگیا۔

”ہیلو ہوی۔؟“ شرین کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

”ہاں شرین! کیا بات ہے؟ گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔“

”ہوی جلدی سے ہاسپٹل پہنچو۔“

”کیوں خیریت ہے ناں۔“

”وہ ایاز بہت زخمی حالت میں ہاسپٹل لایا گیا ہے۔ مجھے بھی نادیہ نے فون کیا تھا۔ بتا رہی تھی کہ اس کا خون جواہل میں ہوتا ہے اس نے خود دیکھا ہے کہ نامعلوم افراد آئے اور ایاز کو بری طرح زخمی کر کے فرار ہوئے۔ تم جلدی آ جاؤ۔“

”ادھو۔ میں سمجھ گیا ہوں، یہ حادثہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔“ ہوی کا پہلا شک حارث کی طرف گیا۔

”نہیں ہوی! حادثہ تو اس وقت ہمارے گھر پر تھا۔“

”اچھا خیر۔ میں ہوسٹل پہنچ رہا ہوں۔“

ہوی اشعر کو ساتھ لے کر ہاسپٹل پہنچ گیا، جہاں ایاز زخموں سے چورے ہوش پڑا تھا۔ خون بڑی روئی سے بہا تھا۔ ایاز چونکہ مستقبل قریب کا ڈاکٹر تھا۔ اس لیے ہاسپٹل میں کھلبلی مچ گئی۔

”سر ایاز۔“ ڈاکٹر صفدر کو باہر آتے دیکھ کر ہوی تیزی سے ان کی طرف بڑھا جو بڑے مایوس لگ رہے تھے۔

”ہاں ایاز! ایاز کے والدین کو فوراً بلا لو۔“

”ڈاکٹر صفدر نے کہا تو شہزاد، جمیر، انورین اور شرین دل تھام کر بیٹھ گئے۔ حادثہ نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

”سر ایاز۔“ ہوی جانے کیا سوچ کر ڈول گیا۔

”ہاں ہاں۔!“

مگر یہ تینوں بھائی تو خاموش رہے تھے مگر بیویاں تو غیر تھیں۔ وہ کب اس انصافی کو برداشت کر سکتی تھیں۔ مگر وہ اس وقت بیوی کی حوصلہ افزائی کر کے گھر کے ماحول کو خراب نہیں کرنا چاہتے تھے اور دوسرے ان کو والدین کے بڑھاپے کا احساس تھا۔ یہ احساس بیٹوں کو تو ہو سکتا تھا۔ مگر بہوؤں کو نہیں۔

شعاع اور راشو کی مگنی کی تاریخ یکم جنوری رکھی گئی تھی۔ ابھی پندرہ دن باقی تھے۔ مگر گھر میں میلہ سا بیٹھ گیا تھا۔ سب نے چھینڑ چھینڑ کر شعاع کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ وہ دل کا درد جھپٹے صرف مسکرا نے پراکتھاری جیکر راشو کے لیوں پر گہری سی مسکراہٹ آجاتی۔ اس روز شعاع کی طبیعت ذرا مختل سی تھی۔ وہ کمرے کے لیے پڑتی تھیں۔ کڑکیر پھوپھو اپنے بچوں کے ساتھ آگئیں۔ یاسر سمیت سب شرارتی اس کے سر پر سوار ہو کر اسے چھینڑنے لگے۔

”انھیے ناں شعاع باہر چلیے۔“ یاسر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

”اجتنق ہیں۔ پتا بھی ہے ان کے مگنیتر صاحب بھی اسی گھر میں رہتے ہیں۔ شرماتی ہیں ان سے۔“ شرین نے شعاع کو چھینڑنے کی غرض سے کہا۔

”ارے انھیے شعاع باجی! ہم راشو بھتی کی آنکھیں نکلو، میرا مطلب ہے بند کرواد۔ پتے ہیں۔“ یاسر اور بونی نے اسے کھڑا کر دیا۔

”ارے نہیں بھتی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ اس نے پیار سے ان کو دیکھا تھتے خوش تھے یہ سب۔ ایک اس کے دل کی کلی سر بھائی تھی ناں۔ باغ کی ساری کلیاں تو کھل کر پھول بن گئی تھیں۔ اس سے بڑھ کر خوش کیا ہو سکتی تھی۔

”آپ کے تو سر میں درد ہے ناں۔ اور ان کے جودل میں درد اٹھ رہا ہوگا اس کے علاج کون کرے؟ بھلا۔“ وہ بدتمیز شوخیوں پر اترے ہوئے تھے۔

وہ سب اسے گھسیٹ لائے تو اس نے بال درست کیے اور گلابی دوپٹہ درست کرتی ہال کرے میں آگئی۔ یہاں اشعر، راشو بھی موجود تھے۔ راشو نے ایک گہری سی نگاہ شعاع پر ڈالی۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی اس وقت۔

”راشو بھتی! آنکھیں بند کر لیں۔ ہماری شعاع باجی کو شرم آ رہی ہے۔“

یاسر بدتمیز تو بھری محفل میں بدنام کر دینے والا تھا۔ راشو بھینپ کر اشعر کو ساتھ لے کر وہاں سے اٹھ گیا۔ ہوی جو ایک طرف بیٹھا گڑیا سے بات کر رہا تھا۔ شعاع کو دیکھ کر پہلو بدل کر رہ گیا۔ شعاع بھی آف دایٹ شلوار سوٹ میں اس سٹم کر کو دیکھ کر رہ گئی۔ یہ راشو سے وابستگی تھی۔ یا کوئی اور بات اب شعاع میں اعتماد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت وہ بڑے سکون سے عین ہوی کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ سب کی چہرے چھاڑ مسکرا مسکرا کر جواب دے رہی تھی۔

”شعاع باجی! اب تو آپ سے ڈبل ڈبل رشتے ہو جائیں گے۔ بہن کا بھی اور بھائی کا بھی۔“

بونہ کی بات پر ہوی نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ گزرا اس وقت کسی کو بھی فرصت نہیں تھی اس کی طرف دیکھنے کی۔

”بھتی۔ تم لوگ کچھ بھی کہو۔ میں تو ان کو صرف بھائی بھی جان ہی کہوں گی۔“

”ہیں سر!“ ہوی نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا۔ حادث کے لیے وہاں رکا رہتا ممکن نہیں تھا۔ وہ سب ناظرین چا کر..... باہر جانے لگا تو شرمین کا جی چاہا، اس کم ظرف کا سر توڑ دے۔ اسے شدید نفرت محسوس ہوئی، اس سے گھرا سے اپنے جذبات پر کنٹرول تھا اور پھر وہ ڈاکٹر مندر کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار کرتا نہ تھا۔

”شہزاد صاحب! ہمیں اللہ تعالیٰ سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن پھر بھی ہمیں ہر کم کی ممکنہ صورت حال کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔ اس لیے آپ ایاز کے والدین کو بلا لیجیے تو زیادہ بہتر ہے۔“

ڈاکٹر مندر یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے مگر شہزاد سوچ میں پڑ گئے۔

”آپ تو مرجائیں گی ایاز کا سن کر۔“

”کچھ بھی ہو شہزاد بلانا تو ہے ناں ان کو بہت سے کام لیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔“ نورین نے کہا۔

”لیکن نورین مسئلہ یہ ہے۔ کہ ان کو لینے کون جائے۔ تمہیں تو خبر ہے کہ بھائی جی نے ان پر پابندی لگا رکھی ہے۔“

”نہیں حیر! کچھ بھی ہو، میں خود جاؤں گا۔ آپا کو ہر صورت لے کر آؤں گا۔ شہباز بھائی آئیں یا نہ لیں۔“ شہزاد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”دیکھ کے شہزاد کہیں بات بگڑ نہ جائے۔ وہ تو پہلے ہی آپ کے دشمن ہیں۔“ نورین ایک دم پریشان ہوئی۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ نورین! دشمنی اور نفرتوں کے اس ظلم کو توڑا نہیں جائے گا تو اس کا سحر ہم سب کو ختم کر لے گا اور پھر اس سے بڑھ کر کون سا موقع آئے گا۔ ایاز موت و حیات کی کشش میں ہے، نجانے کیا ہے میں۔“ حیر بات کرتے کرتے رو ہنسی ہو گئیں۔

”حیر ابھی خدا پر بھروسہ رکھیے۔“ نورین نے بڑھ کر حیر کو ساتھ لگا لیا۔

”حیر! خدا سے دعا کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ نورین گھر چلتے ہیں۔ میں آج ہی روانہ ہو جاؤں گا۔“

”ہاں ہاں بٹے! یہاں ایاز کا خیال رکھنا ہے۔ جذباتی ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ حیر! روانے سے بہتر ایاز کے لیے دعا کرو! تو نورین۔“

شہزاد، حیر! کو تسلی اور شرمین، ہمایوں کو ہدایات دیتے نورین کے ساتھ باہر نکل گئے۔ منزہ آپا کے گھر کی لڑکیوں پر بڑھاتے ہوئے شہزاد کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ ایک مذمت کے بعد بہن کے گھر پہنچے، اور کیسی خبر لے کر کہ ان کا بیٹا زندگی اور موت کی کشش میں مبتلا ہے۔ پھر خود بخود ان کے قدم زیرے لڑکھٹا گئے۔ وہ براہ راست شہباز احمد سے ملنا چاہتے تھے۔ زیرے پر شہباز احمد تو نہیں شیراز موجود تھا۔ وہ ناہشی نظروں سے دیکھتا کھڑا ہو گیا۔

”تم مجھے، جنہی نظروں سے دیکھو، مجھے نہ پچھاؤ مگر تمہارے چہرے میں مجھے اپنی بہن کا چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔“

”اے ناں! تو تو تو تمہارا منوں شہزاد ہو۔“

”اے ناں! تو تو تو تمہارا منوں شہزاد ہو۔“

”ڈاکٹر صاحب! امید کا کوئی چراغ تو روشن کیجیے۔“

شہزاد گرفتہ دل کو تھام کر بولے۔ ان کی نظروں کے سامنے اپنی بہن تھی، وہ مظلوم بہن جو نا کردہ گناہ کی بھگت رہی تھی اور ایاز اسی کا بیٹا تھا۔ اور انہیں بے حد عزیز تھا۔

”شہزاد صاحب! ڈاکٹر بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ وہ حتیٰ فیصلہ نہیں دے سکتا۔ موت اور زندگی تو اس پر۔“

ڈاکٹر کے اختیار میں ہے، جو ہر فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے، ایاز موت اور زندگی کی یہ جنگ جیت بھی سکتا ہے اور۔“

”خدا نہ کرے ڈاکٹر ایسا مت کیجیے۔ ایاز میرے بھتیجا کا جگر گوشہ ہے۔“

حیر نے تڑپ کر ڈاکٹر کو پوری بات کرنے سے روک دیا۔

”حادث۔ حادث بتاؤ۔ یہ کیوں اور کیسے ہوا؟ بتاؤ ورنہ میں تمہارا بھی یہی حشر کر دوں گا۔ نظریں جھکاؤ۔ منہ چھپاؤ۔ حقیقت میں جان گیا ہوں۔ سچ بتاؤ حادث ورنہ۔“

ہوی نے مشتعل ہو کر کسی کا بھی خیال کیے بغیر حادث کو گریبان سے پکڑ کر جھجھوڑ ڈالا۔ ڈاکٹر مندر نے بڑھ کر دونوں کو لگا کر دیا۔

”ہمایوں! یہ کیا حماقت ہے۔ آپ لوگ مستقبل قریب ڈاکٹر ہیں۔ یہ جہالت آپ لوگوں کو سونپ کر دیتی، اور پھر وہ بھی ہاتھ پھیل میں۔ جبکہ آپ لوگوں کا ساتھی، دوست موت اور زندگی کی کشش میں مبتلا ہے۔“

ڈاکٹر مندر نے جوان کے نیچر تھے دونوں کو اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ حادث تو اسی طرح نظریں جھکا کر اڑا رہا لیکن ہوی سے اپنے بھائیوں جیسے دوست ایاز کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ”آئی ایم سوری سر۔“

”نہیں، آئی نو۔ ہمایوں! لیکن صبر و تحمل بھی کوئی چیز ہے ہمارا تعلق جس چیز سے ہے، اس میں جذبات بہت ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، اس وقت ایک انسانی جان کو بچانے کا مسئلہ ہے، اور بس۔“





ہاشم جلدی ہے اس کی طرف بڑھا۔

”اویا میرا یار۔ بڑے وقت پر آئے ہو، کیا دل نے خبر دے دی تھی۔ کہ آج آمنہ ہمارے گھر میں آ رہی ہے۔“

ہاشم شوخ ہو رہا تھا، جبکہ شیراز کا دل بچھا ہوا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اسے اس خبر سے کتنی خوشی ہوتی۔  
”یار! کیا بات ہے؟ اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی کیا؟“

ہاشم نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بٹھادیا۔

”نہیں یار۔ آج میرا دل رو رہا ہے۔ کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی۔ تاجی کہاں ہیں؟“ شیراز رو ہنس رہا تھا۔  
”کیا تو ہاشم پریشان ہو گیا۔“

”دل رو رہا ہے۔ تاجی کہاں ہیں۔ بات کیا ہے؟“

جواب میں شیراز نے ساری بات اسے بتادی۔

”اوہو، یہ تو بری خبر ہے۔ چا چا جی تو ابھی تاجی کے ساتھ حویلی گئے ہیں۔ ابھی بلواتا ہوں۔ پریشان ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ شہر چلتا ہوں۔“

اور جب شہباز احمد کو بیٹے کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تو چھڑی ان کے ہاتھ سے چھٹ کر فرش پر آ رہی۔  
”کون لایا ہے یہ منحوس خبر۔“ پاٹ دارا آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

”وہ۔ وہ ماموں جان شہزاد۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تو وہ چھڑی پکڑ کر پھر کھڑے ہو گئے۔  
”کیا وہ میرا دشمن یہ منحوس خبر لے کر میرے گھر آیا ہے؟“

”نہیں تاجی! انہوں نے فون کیا تھا اور میں نے ایاز کے کالج فون کر کے تصدیق کر لی ہے۔ وہ بہت زخمی ہے ہمیں ابھی شہر چلنا ہے۔“

شیراز گھبرا گیا کہ اگر شہباز گھر چلے گئے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔

”اوپنی ماں کو بھی بتایا ہے کہ نہیں۔“

”نہیں جی، ان کو صرف یہ بتایا کہ ہم ٹریکسٹر خریدنے شہر جا رہے ہیں۔“

”اچھا چلو پھر۔“

دونوں ہاسپٹل پہنچے تو ایاز چونکہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھا۔ اس لیے ان کو ملنے نہیں دیا گیا۔  
شہباز احمد کا دل بیٹھ گیا۔

”اوشیراز۔! کیا میرا پتر اتنا زخمی ہوا ہے۔ کس نے کیا ہے اسے اتنا زخمی۔“

”تاجی۔ حوصلے سے کام لیں۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے۔ ایاز جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“

شیراز نے ڈولتے دل کے ساتھ باپ کو تسلی دی۔ اتنے میں نورین، شرمین اور حمیرا، بہزاد کے ساتھ وینٹنگ روم کی طرف بڑھیں۔ حمیرا کی نظریں شہباز پر ٹھہر گئیں۔ جو ماتھے پر ہاتھ رکھے آنکھیں موندے بہت دیر لگ رہے تھے۔ ایک ٹانگ سے محروم بھائی کو دیکھ کر حمیرا کا دل پانی بن کر آنکھوں میں اتر آیا۔ ان کا بیٹی چہرہ

بھاگ کر بھائی کے سینے سے لگ جائیں اور جدائیوں کے داغ، فاصلوں کی دھول بہہ جائے مگر وہ خواہش تو کرتی تھیں۔ مگر اس پر عمل نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ دل پکڑ کر کھڑکی کا پٹ تھا سے کھڑی بھائی کو دیکھتی رہیں۔ اسی وقت شہباز

ان میں حمیرا پر پڑی تو ایک عرصے کے بعد ملنے والی بہن کے لیے دل میں جگہ بننے لگی۔ مگر دوسرے ہی بل دہ لے کر قید سے آزاد تھے۔ چھڑی پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ انہوں نے کچھ ایسے نفرت سے منہ پھیرا۔ کہ ساری ہتھیں جواب دے گئیں۔ شیراز اور شہباز کے چلے جانے کے بعد ان دونوں بہن بھائی کے پاس بہت قنادھکی مالا پروانے کا مگر شہزاد بہت بے گلی محسوس کر رہے تھے۔ ان کو رہ کر ایاز کا خیال آ رہا تھا۔

”اچھا آبا! اب میں چلوں۔ ضروری کام نہ ہوتا تو ضرور رک جاتا۔“

شہزاد نہ چاہتے ہوئے بھی کھڑے ہو گئے تو مزہ کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ یوں شہزاد کا آکر مل جانا اس بات کی بات کہ انہوں کا ملاپ ناممکن نہیں، اور ہجرتی ماری ہوئی نذرہ کے لیے یہ ہی بہت تھا۔

”اچھا بھائی! اسی طرح کسی روز اچانک میری ماں کو بھی مجھ سے ملو ادیتا یا پھر روزِ حشر ہی ملاپ ہوگا۔“

یہ سن کر پر وہ رو پڑیں۔

”خدا نہ کرے آبا۔ یاس کیوں ہوتی ہیں۔ انشاء اللہ اب نفرتوں کے بادل چھٹ جائیں گے، میں۔ میں۔ میں۔“

”آبا! آپ کچھ مت سوچا کریں۔ اور دعا کریں کہ۔ اچھا خدا حافظ۔“

شہزاد گھر جانے کے بجائے سیدھا ہاسپٹل گئے۔ ایاز کا آپریشن ہو رہا تھا۔ سب دم سادھے بیٹھے تھے۔ اور شیراز الگ تھے اور یہ سب الگ بیٹھے تھے۔ ہونی بڑی بے چینی سے نہل رہا تھا۔ ایاز اس کا بہترین

بھائی اس سے تو بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”آپ تو ایاز کے بہت گہرے دوست ہیں۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ حادثہ کیسے ہوا؟ اور وہ کون سا اس کا بہن، جو اس وقت اس کے ساتھ تھا۔ مجھے اس سے ملنا ہے اور ایکسیڈنٹ کے بارے میں تفصیلات حاصل کرنا۔“

یہ سن کر ایاز کے جسم پر آنے والے زخم ہمارے دلوں پر آئے ہیں۔ ایاز کا خون بہانا آسان نہیں ہے۔“

شیراز بڑی مشکل سے ضبط کر رہا تھا۔ ورنہ اس کا توجہ چاہ رہا تھا کہ اس نامعلوم شخص کو گولی سے بچائے۔

”ایکسیڈنٹ۔“ وہ حیران۔ نظروں سے شیراز کو دیکھنے لگا۔

”ہاں ایکسیڈنٹ، جس میں ایاز اتنا زخمی ہوا ہے۔“

”مگر خیال ہے جی۔ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایاز کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا، بلکہ نامعلوم افراد نے ایاز کو زخمی کر گئے۔ نہ جانے کون لوگ تھے۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔“

ملا تو بے خبر تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ شہزاد نے جس ممکنہ طوفان کو روکنا چاہا تھا اس نے اس طوفان کی راہ نہ بنے۔ ہونی نے یہ بات کہی تھی۔ تو شیراز اور شہباز احمد کے چہرے کے تاثرات ہی بدل گئے تھے۔ دل ٹھانڈا ہوا چلنے لگیں۔ رگوں میں خون کی گردش کئی گنا بڑھ گئی۔ غصے سے دونوں باپ بیٹے کے چہرے۔

ہوئی اس اچانک تبدیلی پر گھبرا سا گیا۔

”میں عالم شاہ۔ نہیں۔ اب تک تجھے معاف کرتا آیا مگر اب نہیں، بیٹے کا خون معاف نہیں ہوگا مجھ سے۔“

”میں قیامت برپا نہ کروں تو شہباز نام نہیں۔“

شہزاد نے دانستہ نہیں کہا۔

”مگر کون کرتے ہیں تاجی! عالم شاہ نے ہمارے جگر پر چھریاں چلائی ہیں۔ ایاز کے بدن پر آنے

والے ایک ایک زخم کے بدلے میں دس دس زخم نہ ڈالے تو خود کو گولی مار لوں گا۔ تاجی میرے بھائی کو زخمی نہ ہنگا پڑے گا ان دشمنوں کو۔“

دونوں باپ بیٹے کا غم وغصے سے برا حال تھا۔ ان کا بس چلتا تو ابھی جا کر عالم شاہ کی حویلی سمیت ہر گاؤں کو آگ لگا دیتے۔ ہوی کے لیے ان کی باتیں سمجھنا مشکل تھا۔

”آپ لوگوں کا غصہ بجا ہے انکل۔ لیکن ابھی تو ان لوگوں کی نشاندہی نہیں ہوئی۔ آپ فکر نہ کیجیو، ہم بھی نہیں۔“

”او نہیں بیٹا! ہم اپنے دشمن کو جانتے ہیں بڑی اچھی طرح۔“

شہباز احمد نے بڑی عقلمانی نظروں سے وینگ روم کا جائزہ لیا۔

”تم کسی حادثہ نامی لڑکے کو تو جانتے ہو گے۔ تمہارے ہی کالج میں پڑھتا ہے۔“

”جی ہاں، وہ ہمارا کلاس فیلو ہے۔“

ہوی نے حیرانی سے شیراز کو دیکھا۔

”وہ ہی ہے ہمارا دشمن۔ یہ کام اس کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔“

”جی نہیں بھی اسی پر شبہ ہے، کیونکہ وہ اکثر ایاز سے الجھ پڑتا تھا۔“

”جہیں شبہ ہے اور ہمیں یقین۔ لیکن اب اس کا باپ اس کی لاش ہی لینے آئے گا۔“

شیراز کا خون ابل ابل کر باہر آ رہا تھا۔

”فی الحال محل سے کام لیں شیراز بھائی۔ ہم خود اس گروپ کو نہیں چھوڑیں گے۔ ابھی تو آپ دعا کریں۔ آپریشن ہو رہا ہے ایاز کا۔“

ہوی نے باپ بیٹے کی توجہ ایاز کی طرف دلائی۔ تو دونوں وقتی طور پر خاموش ہو گئے۔ مگر دل میں جوفان اٹھ رہے تھے۔ ان کو قابو کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ہوی باہر آیا تو شہزاد نے پکڑ لیا۔

”ہوی بیٹے! بہت برا ہوا۔“

”کیا ہوا انکل؟“ ہوی کچھ پریشان ہو گیا۔

”جہیں شہباز بھائی اور شیراز کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔ اب بہت خون خرابا ہوگا۔ شہباز بھائی نے تو پہلے نفرتوں کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ ہر شے ہر تعلق کو۔“

اور پھر انہوں نے مختصر اسب بتا دیا تو ہوی کو افسوس ہونے لگا۔

”سوری انکل! میں تو ہر بات سے بے خبر تھا۔ معلوم ہوتا تو میں ان کو اس طرف آنے ہی نہ دیتا۔ لیکن انکل مجھے بھی یقین ہے کہ حادثہ اس واقعے میں منوث ہے۔“

”میں جانتا ہوں، لیکن ہوی بیٹے! آنے والے طوفان کو روکنے کے لیے ہمیں بند بننا ہوگا۔ ہوی بیٹے ورنہ کچھ باقی نہیں بچے گا۔ ان دونوں خاندانوں کی دشمنی بہت پرانی، اور اب تو خدا محفوظ رکھے ان دونوں خاندانوں کو، اور سیدھی راہ دکھائے۔“ شہزاد نے صدق دل سے دعا کی۔

”آمین، آپ گھبراہٹیں نہیں، اللہ بہتر کرے گا۔ آپ ایسا کریں۔ خواتین کو گھر بھیج دیں۔ آپریشن نہ نجانے کتنا وقت لگ جائے۔“

”اب یہ درست ہے۔ میں ان کو کہتا ہوں۔“

شہزاد نے ان کو گھر جانے کو کہا۔ لیکن حیرانے جانے سے انکار کر دیا۔

”نہیں شہزاد۔ میرا دل ایاز میں اٹکا ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ اور پھر دو تھے، دو تھے سے بھائی جی اور بھائی ہوں تو کچھ قرار آتا ہے۔“

پورا آج جذباتی ہو رہی تھیں۔ نورین وغیرہ کے جانے کے بعد حیرانے کوشش کی کہ بھائی سے بات ہو بھائی کے سینے سے لگ کر رونا چاہتی تھیں۔

”بھائی جی۔“ حیرانے ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوئیں، تو شہباز احمد نے پہلے بڑھ کر نفرت سے منہ بھائی جی۔

”میں کہتا ہوں حیرانے! میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ کوئی تعلق، واسطہ نہیں ہے میرا تم سے۔ سمجھیں۔“

”پہلے ہی گئے تھے کہ وہ ہاسپٹل میں ہیں، اور ان کا بیٹا اندر موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔“

”بھائی جی! خدا کے لیے بھول جائیں سب کچھ۔ آئیے اپنے ایاز کی زندگی کے لیے دعا کریں۔ اللہ رحمت اور زندگی دے۔“

”بڑی چاہت سے بھائی کی طرف بڑھیں۔ مگر کینہ پرور بھائی دل صاف کرنے کو تیار نہ تھا۔“

”ایاز صرف میرا بیٹا ہے۔ میرے ہی دل پر زخم آئے ہیں۔ وہ کسی اور کا کچھ نہیں لگتا۔ چلی جاؤ یہاں شہزاد احمد کی پاٹ دارا آواز کمرے میں گونج اٹھی۔“

”اللہ شہزاد احمدی اندر آ گئے۔ شہباز احمد نے خونخوار نظروں سے شہزاد کو گھورا۔ وہ تیزی سے شہزاد کی طرف

”خدا کے لیے شہباز بھائی! یہ وقت نہیں ہے کہ۔“

”تم۔ تم چپ رہو۔ میرے دشمن تم نے سدا دشمنی کی ہے۔ پہلے میری زندگی برباد کی۔ اب میرے بچوں پر ہونے ہو۔ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔ میرے بچے کو دشمنوں نے زخم زخم کر ڈالا اور تم اطلاع دے لیا کیلینٹ میں زخمی ہوا ہے۔ تم۔ تم میرے دشمن کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔“

”گھر کریں بھائی جی۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی، یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ اللہ اللہ کرنے کے بجائے ہمارا پکچر اچھا کر رہے ہیں۔ شہزاد کیا چیز ہیں آپ۔ کبھی نہیں جان سکتے۔“ حیرانے ضبط نہ ہو سکا تو وہ

”ہاں تم شہزاد کی حمایت نہ کرو گی تو کون کرے گا۔ لیکن، یاد رکھو، میں کسی کو نہیں بخشوں گا۔“ شہباز احمد

شیراز احمدی پریشان ہو گیا۔

”میرا چھوٹی بے عزتی اسے دکھی کر گئی۔ مگر وہ خاموش رہا۔“

”اکھیرا۔ نفرت نے شہباز بھائی سے ہر شے کی پچھان چھین لی ہے۔“

”لو اکھیرا! کوشاںوں سے تمام کر باہر لے آئے تو پیچھے سے آنے والی آواز دونوں کو مزید دکھی کر گئی۔“

”میں دیکھ لوں گا تم سب کو۔“

لڑکھکی بات تھی کہ ایاز آپریشن تھمیز میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا، اور شہباز احمد دشمنوں سے



”چھوڑ یار۔ اب یہ سوگ، یہ رقیب روسیہ سے اتنی ہمدردی کب ہو گئی کہ سوگ میں تم نے یہ حال بنالیا چھوڑ بھول جاؤ۔“

جمال نے حادث کی طرف کافی کا کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔ جو اس روز سے گم صم تھا۔ نہ ڈھنگ سے اٹھا رہا تھا، اور نہ ہی اس نے شیو بنایا تھا۔ ضمیر کی خلش اسے مارے دے رہی تھی۔ وہ تو نورین پھپھو، حمیرا اور شمین سے نظریں بھی نہیں ملا پایا تھا۔

”کیسے چھوڑ دوں یار۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا ہے کہ کیوں ہوا ایسا یار۔ میں نورین پھپھو سے اور حمیرا سے معافی مانگتا چاہتا ہوں۔“

وہ بے چینی سے ٹھٹھا ہوا بول رہا تھا۔

”حادث! ان سے معافی مانگ لینے کا مطالب ہے کہ تم اعتراف جرم کر رہے ہو۔“

”اعتراف کروں یا نہ کروں۔ مجرم تو میں ہی ہوں۔ ان کی نظروں میں۔ تمہیں بتایا تو تھا کہ ہمایوں نے ہائی میں میرا گریبان پکڑ لیا تھا۔ وہ تو ڈاکٹر صفدر نے روک دیا اور نہ۔“ حادث نے دونوں ہاتھوں میں سر

”یار! تم میرے یار ہو کر گھبراتے کیوں ہو۔ بے شک سب کو یقین بھی ہے مگر میں تم پر ایک حرف بھی لے دوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

جمال نے اسے بہت تسلی دی۔ مگر ایک تو اسے ضمیر کی خلش بے قرار کر رہی تھی، اور دوسرے اسے معلوم

ہاں کی حرکت سے دونوں خاندانوں کی دشمنی خطرناک صورت حال اختیار کر جائے گی۔

”تمہیں جمال اب تو ایسی تباہی آئے گی کہ خدا کی پناہ تم نہیں جانتے۔ شہباز احمد اور عالم شاہ کی دشمنی

لا پھٹے ہے۔“

”کیا دشمنی ہے دونوں خاندانوں میں؟“۔ جمال نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔

”تمہیں یار! ہم نے تو جب ہوش سنبھالا۔ دشمنیاں ہمیں وراثت میں ملیں۔ ان بڑوں نے ہمارے

نہیں کا جال بچھا کر ہمیں بھی اس میں الجھا دیا۔ اور..... اور.....“

حادث بہت ڈپر لیس تھا۔ آج اسے اپنے باپ اور بھائیوں پر بھی غصہ آرہا تھا۔ کہ جنہوں نے ہمیشہ اسے

غنی بنایا تھا۔

”یار! مجھے پتا ہوتا کہ تم نے ایاز کو زخمی کروا کر اتنا ڈپر لیس ہونا ہے تو میں کبھی ایسا نہ کرواتا۔ خیر، اب کیا ہو

بغوا کا شکر ہے، اس کی جان بچ گئی۔ میں نے ہاسپٹل فون کر کے معلوم کر لیا تھا۔ ہوئی تو اس کے ساتھ

ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ سوائے پچھتاوے کے۔ چلو اپنا موڈ درست کرو۔ چلو آج کہیں ماہر کھانا

”یار!“

جمال نے لاکھ اس کے دل جوئی کرنا چاہی، مگر حادث کو تنجانے کیوں چھین نہیں آ رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ

”یار!“



انتقام لینے کا سوچ رہے تھے۔ وقت کی رفتار کو یا قہم ہی مٹی تھی۔ واہموں کے ناگ بلی بلی ان کو ڈنکے

تھے۔ بے چینی کسی کو بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ ابھی تک کوئی ڈاکٹر باہر نہیں نکلا تھا۔ ہوی نے ڈاکٹر صفدر کو

دیکھا تو جلدی سے ان کی طرف بڑھا۔

”سر!“

”ایک آپریشن اور ہوگا۔ سب سے زیادہ متاثر ایاز کی گردن ہوئی ہے۔ بہر حال اللہ مالک ہے تم ان کے

والد اور بھائی کو کنٹرول میں رکھو۔ وہ لوگ خاصے جذباتی ہو رہے ہیں۔ یہ فطری بات ہے، لیکن ان کے منہ سے

ایک بات بھی ہمیں اور ہمارے کالج کو بدنام کر سکتی ہے، جاؤ۔ انہیں تسلی دو۔“

”اوکے سر! لیکن یہ انکشاف بھی آج ہی ہوا ہے کہ حادث کے خاندان اور ایاز کے خاندان کی پرانی دشمنی

ہے، اور ہمارا اسٹوڈنٹ زخمی ہوا ہے۔“

”نہیں سر! میں سنبھال لوں گا ان کو۔“

سردار بداندہ چلے گئے تو ہوی، شیراز کے پاس آگیا۔ اور ڈھیر ساری تسلیاں دیں، مگر ان باپ بیٹے کے

دل کو قرار کہاں آ رہا تھا۔ مضطرب سے چلتے رہے۔ شہباز احمد اور حمیرا الگ بے چین تھے۔ گھر پر شرمین اور نورین کو

بارفون کر رہے تھے۔ کبھی کبھی تو اس کی ناؤ ڈوب ہی جاتی۔ سب سے بری حالت شہباز اور شیراز کی تھی۔ ایک تو

عزیزان جان ایاز کی جان کے لالے پڑے سوئے تھے اور دوسری طرف دشمن سے انتقام کی آگ بھڑک رہی

تھی۔ کئی گھنٹوں کی اذیت اور کرب کے بعد جب ڈاکٹر باہر آئے تو شہباز، ہوی اور شیراز تیزی سے ان کی طرف

لپکے۔ کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ مگر ڈاکٹر صفدر ان کے چہروں کی تحریر پڑھ رہے تھے۔ اس لیے مسکرایے۔

”آپ سب کو ایاز کی زندگی مبارک ہو۔ خدا کا شکر ہے، وہ خطرے سے بالکل باہر ہے۔ خدا کا بہت احسان

ہوا ہے۔ ایک موقع پر میری ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایاز کی زندگی بخش دی۔“

ڈاکٹر صفدر کے چہرے کا اطمینان اور لہجے کی سرشاری نے سب کو پرسکون کر دیا۔ زندگی کی لہر دوڑ گئی

کے۔ چہروں پر۔

”ڈاکٹر! ہم ایاز کو دیکھ سکتے ہیں؟“ شہباز احمد نے بے قراری سے پوچھا۔

”نہیں شہباز صاحب! آپ والدین ہیں، اسے یوں بیٹوں میں جکڑا دیکھ کر برداشت نہیں کر پائیں

گے۔ اللہ بہتر کرے گا۔ وہ انشاء اللہ آپ کے ساتھ چل کر گھر جائے گا۔ لیکن فی الحال آپ لوگ خود پر قابو

رکھیں۔“

ڈاکٹر صفدر نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ان کو سمجھایا۔

”ڈاکٹر صاحب! اس کے علاوہ ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ویسے تو ہم اپنے دشمن کو بچانے

گئے ہیں، مگر چونکہ یہ آپ کے کالج کا معاملہ ہے اس لیے۔“

”اونہیں شیراز پترا اس میں ڈاکٹر صاحب کی ضرورت نہیں۔ ہم خود نمٹ لیں گے۔“

شہباز احمد نے شیراز کو مزید بات کرنے سے روک دیا۔ تو ڈاکٹر صفدر، ہوی کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

خالصہ الجھ گیا تھا۔ گوکہ حادث براہ راست اس حادثے میں ملوث نہیں تھا۔ مگر یہ سب کو خبر تھی کہ یہ ایسی بات

ہے، اور کرنے والا جمال گروپ ہے۔

وہ اگر بے کل تھا تو رات شعاع نے بھی سکتے ہوئے گزاری تھی۔ صبح دونوں کی آنکھ دیر سے کھلی۔ شعاع کی ابھی ڈانٹنگ روم میں آئی تھی۔ نرسین اس کے لیے ناشتا بنا رہی تھی۔ اسی وقت ہوی بھی آگیا وجہ چہرے پر کا احساس ابھی باقی تھا۔ اس نے سسکتی نگاہوں سے شعاع کو دیکھا۔ اس کے سوجے ہوئے رت جگے کے بازو۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کے سامنے والی کرسی تھیں کر بیٹھ گیا تو شعاع فوراً کھڑی ہو گئی۔ ہوی کوتاہ

”بیٹھ جاؤ۔ کھانسیں جاؤں گا۔“ وہ دھاڑا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اب ہوی کیا جانے کہ اس کے بیٹھنے میں اس کے لیے کچھ کا اثر ہے کہ اس کے دل کی خواہش۔

”اگر راشو یہاں آکر بیٹھتا تو تم اٹھ کر جاتیں؟“

”کیسے لیے کی کٹار سے آزاد ہوتا تیر زخمی کر گیا۔“ شعاع نے اسے دیکھا مگر پھر جلدی سے ہوی اس کی ٹھون میں اتر آنے والی دھند میں چھپ گیا۔

”راشو، راشو ہے، ہمایوں رحمن۔“ اشکوں کے گولے کو جو اس کے گلے میں پھنس گیا تھا۔ ہناتی بہ شکل لہو کا بلند پریش رہا ہوا ہونے لگا۔

”اچھا گلے ہاتھوں سے یو تباتی جاؤ۔ تمہارے دل میں راشو کا کیا مقام ہے؟“

وہ بھی آج ستم پر ستم آزمائے جا رہا تھا، کتنا سنگدل لگ رہا تھا۔ اس وقت۔

”راشو کا میرے دل میں وہ مقام ہے۔ ہمایوں رحمن! جس کی بندی کو آپ جیسا چھوٹا اور کم ظرف انسان ہوی نہیں سکتا۔“

شعاع میں جانے اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ وہ جو کہنا چاہتی تھی کہہ گئی۔ یہ بات ہوی کے دماغ کو چڑھ

لا دے سے باہر ہو گیا۔

”تمہیں جرأت کیسے ہوئی مجھے یہ کہنے کی۔“

اس نے شعاع کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ مگر وہ پرسکون رہی۔

”یہ جرأت، یہ اعتماد بھی راشو کی چاہت کا عطا کردہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ راشو بھی اور اس کی چاہت بھی دے لیے ہے۔“

”شٹ اپ۔“ ہوی نے زور سے جھٹکا دے کر شعاع پیچھے ہٹایا کہ نرسین جو ناشتہ لارہی تھی شعاع سے ٹکرا

اور وہ تمام برتن فرش پر گر گئے۔ اس سے قبل کہ شعاع کی ہمتیں، جراتیں جواب دے جاتیں۔ وہ تیزی سے

پکڑ کرے میں آگئی۔ آج ہوی سے یوں بات کر کے جو بیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ اس سے قبل نہیں اٹھی تھیں۔

”یا خدا۔ یہ زندگی کا کون سا مرحلہ ہے کہ مجھے بل پل توڑنے والے کو دکھ پہنچتا ہے تو بیسیں بھی میرے ہی

ٹانگوں اٹھتی ہیں۔ یا خدا! نہیں معلوم زندگی کا یہ کڑا امتحان میں گزرا بھی سکوں گی کہ نہیں۔ آئی ایم سوری ہویم۔

میں۔“

آج ہوی کو دکھ دے کر وہ جتنی دکھی ہو گئی تھی۔ ہوی جان لیتا تو شاید اسے شعاع سے کوئی شکوہ نہ رہتا۔ اس

منہ کے بعد ہوی نے پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ کہ وہ یہ گھر چھوڑ دے گا۔ خواہ کہیں بھی رہے مگر اس گھر میں جہاں

ٹانگوں اور راشو تھے، وہ نہیں رہے گا۔

نے شعاع اور راشو کو چھیڑ چھیڑ کر تاک میں دم کر دیا تھا۔ شعاع ان کی خوشی کی خاطر سب کچھ کرتی تھی کہ دل پر قیامت گزر جاتی۔ راشو بہت سنجیدہ تھا۔ اس نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

جاتا۔ ورنہ شعاع کو دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ یہ پیاری سی لڑکی اس کی ہونے والی ہے، اس کی رائے ہو جاتی۔ اس وقت بھی وہ آیا تو اشعر اور شعاع سب میں گھرے بیٹھے تھے۔ راشو کا جی چاہا کہ وہ میں ٹھہر

سامنے جا کر کھڑا ہو جائے۔ اور شعاع کے رخساروں پر حیا کی۔ سرخیاں پھیلتی دیکھ لے مگر اس کی

تھا۔ شعاع نارمل ہی رہتی تھی۔ کبھی اس کے چہرے پر دھنک کی برسات اترتے لہس نے نہیں دیکھی تھی۔

دیکھ کر اتر آتی چاہیے تھی۔ وہ سبز کپڑوں میں بہت اچھی لگتی شعاع کو دیکھتا رہا، پھر وہاں سے ہٹ کر

ہوی جو ایاز کی وجہ سے کئی روز سے نہ سوسکا تھا اور نہ ڈھنک سے کھانا کھایا تھا۔ آج ایاز کی طبیعت بہت

اسی لیے وہ آرام کرنے گھر آیا، اسے اشعر سے کام تھا۔ وہ شعاع پر نظر ڈال کر وہیں رک گیا۔

”شعاع! ایک بات پوری سچائی سے بتانا۔“

”پوچھیے اشعر بھئی!۔“ شعاع نے حیران ہو کر اشعر کو دیکھا۔

”یہ بتاؤ شعاع کہ تم خوش ہونا۔ راشو بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔“

اشعر کی بات پر شعاع کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ اس کا جی چاہا کہہ دے کہ خوشی تو اس کے لیے فخر

تھی ہے جس کے پیچھے انسان تمام عمر بھاگتا ہے۔ مگر جب اس تک رسائی حاصل کرتا ہے تو تھکی کے قمار

چکے ہوتے ہیں۔ اور اس کی زندگی میں بھی ایسی ہی چٹکی، بے رنگ خوشیاں ہیں۔ جس میں اس کی اپنی

کوئی رنگ نہیں۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اسی دوران ہوی پر نظر پڑی تو وہ بھٹکا ہوا

”کیوں نہیں اشعر بھئی! یہ فیصلہ میری خوشی سے ہوا ہے۔ اور راشو تو ایسے انسان ہیں۔ ان کو ہاں

لڑکی فخر کر سکتی ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ وہ خوش نصیب لڑکی میں ہوں۔ کوئی نہیں جانتا کہ راشو کا میرا

کیا مقام ہے۔“

یہ الفاظ شعاع نے جان کر اتنی آواز میں کہے تھے کہ چند ہی قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوی کی

چیرتے ہوئے دل میں پوچھتا ہوا تھا۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کا نشان ٹھیک جگہ پر جا کر لگا تھا۔ ہوی

میں پکڑی سگریٹ کی ڈبیہ جو بیسیں پچھانے منگوائی تھی۔ چرمر ہو گئی۔ اس کا جی چاہا شعاع کو اٹھا کر

دے۔ وہ اشعر سے بات کیے بغیر لوٹ آیا۔ پھر وہاں شعاع بھی نہ ٹھہر سکی اور کمرے میں آگئی۔

”ہونہہ! مکارا شور راشو مجھے پاگل کر دے گا یہ شخص۔ کیسا جادو کیا ہے، اپنی فوسں گرباتوں میں

الٹا لٹا رہا ہے اس بے وفا کو، اتنی ٹھیک کہتی ہیں، جیسی ماں ویسی بیٹی، اس کی ماں نے میری خالہ جالی کو

بیٹی نے میری زندگی برباد کر دی۔ نفرت ہے مجھے تم سے شعاع فرمان اٹکل جاؤ میری زندگی سے۔ اور

نظروں سے۔“

وہ تھکا ہوا تھا۔ کئی راتوں کا رت جگا آنکھوں میں چھ رہا تھا۔ مگر آج اس حادثے نے قرار

انجان تھا وہ، سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ نجانے کیوں ہر موڑ پر رک کر دیکھنے لگتا۔ کہ شاید کسی

شعاع بھاگتی ہوئی اس کی طرف آجائے گی۔ لیکن ہر بار شعاع یہ یقین دلائی کہ اس کی طرف کوئی

جاتی جس پر چل کر وہ اس کی طرف بڑھ سکے۔



نے خوشی کو مانع کر دیا تھا۔ ان کے الگ ہونے کا مطالبہ حقہٗ اختیار کر گیا اور یہ ساری باتیں شعاع کو  
 زبانی کے لیے کافی تھیں۔ وہ سوچتی رہتی کہ کیا وہ واقعی اتنی بری ہے کہ اس کی وجہ سے اس گھر کی محبتوں کا بوارہ  
 برباد ہے۔ وہ بہت ڈپر پس ہو گئی تو عابی کے کمرے میں چلی آئی۔

”گناہ ہے۔ آج میری بیٹی ڈپر پس ہے۔ کیا بات ہے؟“  
 عابی نے کتاب ایک طرف رکھ کر اس کے اجڑے روپ کو دیکھا۔ وہ کچھ سوچے بغیر ان کے شفیع سینے سے  
 لگی۔ عابی نے اسے رونے دیا، تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

”ہاں۔ اب بتاؤ کیا بات ہے۔“ عابی نے اس کا ترجمہ صاف کرتے ہوئے کہا۔  
 ”آئی۔ ابو کی کوئی خبر نہیں آئی، کوئی رابطہ نہیں آپ کا۔“ آج شعاع کو ابوشدت سے یاد آ رہے تھے۔  
 ”نہیں۔ بیٹی کوئی خبر نہیں فرمان کی لیکن تم اتنی غلط حال کیوں ہو رہی ہو۔ خدا جوڑی سلامت رکھے، جتنی  
 دل چاہتا ہے میں اور تم۔“

”پلیز آئی۔ یہ بتائیے۔ کیا میں بہت بری ہوں کہ کوئی میری وجہ سے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرے۔ آئی  
 میں جتنی کوششیں کر رہی ہوں کہ میں اس عیب کو دور کر دوں۔ میں یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتی کہ آئی سیدہ میری وجہ سے گھر  
 چھوڑیں اور آئی عابی اس عمر میں پھر اولاد کا دکھ برداشت کریں۔“

شعاع کی بات پر عابی نے گہرا سانس لیا۔ وہ اس کی کیفیت کو سمجھ رہی تھیں۔

”دیکھو شعاع بیٹی۔ یہ دنیا ہے، یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہاں چھوٹے بڑے طرف پائے جاتے ہیں اور  
 ایک دوسرے کو ہتھیار کرتے ہیں۔ وہ کم ظرف ہوتے ہیں۔ تقدیر پر ایمان کمزور ہوتا ہے ان لوگوں کا۔ سیدہ میری بہن  
 ماورہ یہ سب میری وجہ سے کر رہی ہیں جبکہ میں خدا پر یقین رکھتی ہوں اور اس کے فیصلے پر یقین رکھتی  
 ہوں۔ مجھے تو اپنے خدا سے کوئی شکایت نہیں تو انسانوں سے کیا ہوگی۔ جو معاف کرنے کا ظرف ہی نہیں رکھتے  
 اب اگر وہ ایسا کر رہی ہیں اور ہوئی کو بھی انہوں نے اپنے رنگ میں رنگ لیا اور الگ بننے کا فیصلہ کر لیا ہے تو  
 کہاں اس کا اثر لینے کی ضرورت نہیں۔ تم کیوں ہلکان ہو رہی ہو جاتے ہیں تو جاؤں۔ جب اپنی غلطی کا احساس ہو  
 اذلت آئیں گے۔ ٹھیک۔ تم اپنا دل خراب نہ کرو۔ چلو۔ شاباش۔ آنسو پونچھ لو۔ شاباش۔ میری بیٹی۔ تم تو  
 لڑائی نہیں۔ میں تو اتنی کمزور نہیں۔ بتاؤ کیا میں کمزور ہوں؟“

اس کا چہرہ ہاتھوں میں تمام کر عابی نے اس سے پوچھا تو اس نے ہنسی چکوں سے ان کو دیکھتے ہوئے نفی  
 کیا۔

”بس تو ٹھیک ہے میری بیٹی کو بھی بہادر بننا ہے۔ ہر قسم کے حالات کے لیے خود کو تیار کرنا ہے۔ اب میں  
 ہاتھوں میں کمزوری کے آنسو نہ دیکھوں۔ آئی سمجھ۔“

مگر وہ کتنی دیر اسے سمجھاتی رہیں۔ وہ قدرے بہل گئی۔ اسی وقت قدسیہ بانو اور راشو اندر آ گئے۔ شعاع  
 نے اسے دیکھا اور مست کرنے لگی۔ راشو نے ایک گہری سی گھاس پر ڈالی۔

”جتنی عابی۔ کیا بیٹیاں پڑھاری ہو میری بہو کو۔“ قدسیہ بانو نے شعاع کو ساتھ لگاتے ہوئے مسکرا کر

”یہ بیٹیاں پڑھاری ہوں بھائی جان کہ سسرال جا کر ماؤں جیسی ساس کی خدمت کرنا اور۔ اور راشو کا

”امی جان! ابو سے بات کریں کہ ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔ اور اگر آغا جی نے ہمیں رکھا ہے  
 راشو اور شعاع کا رشتہ نہیں ہوگا۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بول رہا تھا۔

”ارے میرے چاند آغا جی کو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم یہاں رہیں یا نہ رہیں۔ اور تمہارا باپ تو ہے ہم  
 بھائیوں کے فیصلے کا غلام، میں تو اسی دن سمجھ گئی تھی۔ جب یہ شخص شعاع اس گھر میں آئی تھی۔ ڈاکٹر نے  
 طرح ہمارے ہی گھر کو سنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے، ان ماں بیٹی نے۔ وہ تو مر گئی، اب اپنی جگہ میں چھوڑ گئی ہے۔  
 سیدہ بیگم شکر کرتیں کہ ہوی ان کا ہم خیال ہے ورنہ وہ کس کے سامنے زہرا گل کر دل ہلکا کرتیں۔“

”آپ نہیں کر سکتیں تو میں خود بات کر لوں گا۔ ابو سے بھی اور آغا جی سے بھی ہمارے کون سے حق  
 پہچانے ہیں آغا جی نے کہ وہ اپنے فیصلے ہم پر مسلط کرتے ہیں۔ ہماری مرضی ہم کہیں بھی رہیں۔ بس ہمیں ہمارا  
 حصہ دے کر الگ کر دیں۔“

”شاباش ہوی بیٹے! تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم سیدہ ہی کے بیٹے ہو۔ عابی کے نہیں۔ تم نے تو پڑھ لکھ  
 گنویا ہے۔ بیٹے تعلیم تو نفرتیں کدورتیں ختم کرتی ہے۔ ہاں لیکن تم نے شاید صرف اپنی ماں کی تعلیم کا اثر لیا ہے۔  
 دیکھو جو اندر آ رہے تھے۔ آتے آتے انہوں نے ہوی کی باتیں سن لی تھیں۔ ہوی نے کچھ غصہ  
 شرمندگی اور دکھ کے احساسات کے ساتھ لہو کو دیکھا۔ اب وہ ان کو کیا بتاتا کہ گھر چھوڑنے اور الگ ہونے کا  
 مطالبہ کیوں کر رہا ہے۔

”ابو جی! گھر میں ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔ ہمارے حقوق مارے جائیں گے تو ہم عبادت تو  
 کریں گے ہی۔“

”کون سے تمہارے حقوق غصب ہوئے ہیں۔ کون تمہیں کچھ کہتا ہے۔ تم لوگ تو سیدہ ہی کے وجہ سے آغا جی  
 کے زیادہ قریب ہو۔ کیوں ایسی باتیں کرنے لگے ہو۔“ رحمن نے دکھ کے ساتھ سیدہ اور ہوی کو دیکھا۔ سیدہ منہ نہ  
 کر رہی تھیں۔

”یہ کیسی قربت ہے کہ آغا جی ہر فیصلہ ہمارے خلاف کرتے ہیں۔“ ہوی نے جانے کیا بات سمجھانا چاہ رہا تھا۔  
 ”کون سی نا انصافی ہوئی تم ماں بیٹیوں کے ساتھ۔ تم دونوں اگر بوارہ چاہتے ہو۔ حصہ چاہتے ہو تو جاؤ

آغا جی سے بات کرو۔ اب ان میں بھی اولاد کی گستاخیاں برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ مجھے امید  
 ہے، وہ شعاع اور راشو کی گفتگو سے قائل ہی تم لوگوں کو الگ کر دیں گے لیکن اگر تم لوگوں کا خیال ہے کہ میں اس  
 معاملے میں تم ماں بیٹے کا ساتھ دوں گا تو یہ ناممکن ہے۔ میں اس عمر میں اپنے بوڑھے ضعیف والدین کو دکھ نہیں  
 دے سکتا۔ یہ میرا نقص اور آخری فیصلہ ہے۔ آگے تم لوگ خود سمجھو۔ جو چاہو فیصلہ کر لو۔ میں تم لوگوں کے فیصلے  
 پر مسلط نہیں ہوں گا۔“

اس سے قائل کہ ماں بیٹا کوئی اعتراض کوئی بات کرتے۔ رحمن پختہ لہجے میں اپنا فیصلہ سناتے باہر نکل گئے۔  
 ”ہونہہ! میں دیکھتی ہوں۔ کیسے یہ ہمیں چھوڑ کر الگ ہوتے ہیں۔ سب کچھ ان ہی کے ہاتھوں نہ کر دیا تو

سیدہ نام نہیں۔ دیکھ لوں گی میں ان سب کو۔“

ہوی کے دل کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ اس نے ماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر اپنا چل  
 کے لیے نکل گیا۔ پورا گھر جہاں راشو اور شعاع کی گفتگو کی وجہ سے بے حد خوش تھا وہاں ہوی اور سیدہ بیٹے

خیال رکھنا۔“ عالی نے مسکرا کر راشکو دیکھا تو وہ جھینپ گیا۔ شعاع وہاں سے آگئی۔

دونوں خواتین ہنسنے لگیں تو راشو بھی کھسکا سا ہو کر وہاں سے آگیا۔ شعاع اپنے کمرے میں جاتا ہوا نظر پڑا۔

مگر زینے پر پھر اسی سٹم گرسے کھڑا ہو گیا۔ ہوی کی تیز نگاہیں اس کے آ پار ہو گئیں۔

”اب آرام سے سکون سے رہنا۔ اپنے راشو کے ساتھ۔ ہم یہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ دوسرے گھر پر جہاں تمہارا منحوس وجود نہ ہو۔“ وہ زہرا اٹھتا رہا۔

”خدا کرے آپ کے گھر چھوڑنے سے قبل میں یہ دنیا چھوڑ دوں۔“

وہ زیراب کہتی اوپر چلی گئی اور ہوی اس کے بلیوں کی لرزش کو محسوس کرتا دیر تک اس راستے کو دیکھتا رہا۔

سے شعاع گئی تھی۔ ”کاش تم میری زندگی میں نہ آئی ہو تیس شعاع۔ آئی تھیں تو راشو کی نہ بنی ہوتیں۔“ ہوی نے آنکھیں بند کر کے ٹیس کو دبائے کی کوشش کی۔

”ہوی بھئی! یہ کھڑے کھڑے مراقبے میں جانے کا کون سا انداز ہے۔ کسے دیکھ رہے ہیں چشمہ نظر میں؟“ شرعی اور دانی شونی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

شعاع کابی۔ ایس۔ سی کا فاسل ایر کا فاسل سمسٹر تھا جو جنوری کے پہلے ہفتے میں ہو رہا تھا اور بشکل ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ ایڈام اور پھر اسی دوران منگنی بھی، اس لیے وہ چاہتی تھی کہ تیاری کرے اور تیاری کے لیے نوٹس کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس تمام نوٹس موجود تھے لیکن فرزانہ کا بھلا ہو، لے کر ہی بیٹھ گئی تھی۔

فرزانہ اس کی اچھی دوست تھی مگر نوٹس لے کر تو ایک طرح سے غائب ہو گئی تھی۔ شعاع فکر مند ہو گئی تو اس نے فرزانہ کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کئی روز سے اس کی کوئی خبر ہی نہیں تھی اور فون نمبر بھی اس سے کھو گیا تھا۔

”شرعی! مجھے فرزانہ کے ہاں جانا ہے۔ تمہارے پاس وقت ہو تو لے چلو۔“

وہ شرعی کے قریب چلی آئی تو وہ شوخ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”ایک شرط پر۔“

”بولو لیکن جلدی کرو۔ مجھے جلدی جانا ہے۔“ وہ ہارے ہوئے انداز میں بولی۔

”پھر آپ مجھے بھابھی جان کہنے کی اجازت دے دیں۔“

شرعی کی ہر کام کے لیے یہی شرط ہوتی تھی جس پر شعاع کو اعتراض ہوتا۔

نجانے کیوں اچھا نہیں لگتا تھا اسے شرم محسوس ہوتی تھی۔

”کیوں جی میری شرط منظور ہے کہ نہیں۔“ شرعی مزید شوخ ہو گیا۔

”کیوں باجی۔ یہ اٹھانی گیر آپ کو کجگ تو نہیں کر رہا۔“

اس وقت یاسر اور دانی بھی آگئے تو وہ مسکرا پڑی۔

”ہاں بھئی۔ بڑی دیر سے تنگ کر رہا ہے۔ کھد رہی ہوں کہ فرزانہ کے گھر لے جاؤ اور یہ الٹی سیدھی شرطیں منوار ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں جی۔ ابھی مرمت کرتے ہیں اوئے نیچے اترناں ذرا پھٹ پھٹی سے، دوسروں کی بہن کو چھینرتے شرم نہیں آتی، بے شرم اپنے گھر میں ماں بہن نہیں ہیں۔“

پھر یاسر نے فلمی انداز میں شرعی کے مکہ جڑا مگر وہ لگا دانی کے اور شعاع سمجھ رہی تھی کہ یاسر نے جان کر کیا۔

کیا ہے۔ شرعی کو بچا کر دانی کو مارا تھا شرعی سے دوستی جو تھی۔

”اوہ معاف کرنا یا رانگ نمبر پر ہاتھ چلا گیا۔“

”لیکن نیچے میرا ہاتھ رانگ بندے پر نہیں جا رہا۔“

جواب میں دانی نے بھی اسے مکہ جڑا دیا اور یوں ان کی آپس کی کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ شعاع کو اچھا جانا مشکل ہی لگ رہا تھا۔ وہ تئیلوں آپس میں ہتھم ہتھاتے، ایسے میں بولی بانیک اشارت کر کے شعاع کے قریب نہ آیا۔ شعاع نے غصیت جانا اور جھٹ بولی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”بائے بائے۔“ بولی نے رفتار بدھاتے ہوئے ان تئیلوں کو بائے کہا تو وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے محروم کر رہے۔ ابھی بولی اور شعاع عین گیٹ عبور نہیں کر پائے تھے کہ سامنے سے ہوی آگیا۔

”یہ کہاں جا رہے ہو تم؟“ پوچھ رہی بولی سے رہا تھا مگر تیز نظریں شعاع پر تھیں۔

”وہ شعاع باجی کو ان کی دوست کے ہاں لے جا رہا ہوں بھئی۔“

بولی کو اپنا تو کوئی خیال نہیں تھا مگر وہ خوفزدہ تھا کہ اب وہ شعاع کو کچھ نہ کہہ دے۔

”بہت ہیں ان کے چاہنے والے، لے جائیں گے اور پھر یہ ذمہ داری راشو کی ہے تمہاری نہیں۔ چلو میرے ساتھ ہاسٹل ایاز شکوہ کر رہا تھا کہ بولی دیکھنے نہیں آیا۔“

”اف اتنی تذلیل، اتنا گھٹیا پن۔“ شعاع اپنی ہی نظروں میں گرنے لگی۔ اسے افسوس بہ ہاتھ کا وہ بولی کے ساتھ کیں بیٹھ گئی۔ بولی کو اس کم ظرف کا بھائی تھا مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

”بھئی، میں پھر چلا جاؤں گا ہاسٹل۔“ بولی بانی پانی ہو گیا تھا ہوی کی بات پر، وہ شعاع سے نظریں نہیں ملا پارہا تھا۔

”مجھے بکواس نہیں چاہیے۔ چلو جاؤ۔ حارہ دست کر کے آؤ۔ ہاسٹل جانا ہے۔“

ہوی دھڑاؤ تو بولی سے مزید وہاں نہ رکھ لیا۔ وہ تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔

”کمینگی کی حدوں کو چھونے لگا ہے یہ شخص۔“

یاسر نے ہی منہ میں بوڑھاتا ہوی کو گھورتا بانیک اشارت کر کے شعاع کے پاس آگیا۔

”آئے شعاع باجی۔ اجازت ہے ہوی بھئی!“

یاسر نے گہرے طنز سے لہجے میں کہا اور ہوی کا کوئی جواب نہ بغیر اس نے شعاع کا ہاتھ پکڑ کر بانیک پر بیٹھنے میں مدد دی اور ہوی کو گھورتا بانیک لے اڑا۔ شعاع کا اب تو موڈ بھی نہیں رہا تھا۔ سب کچھ ہی گزیر ہو گیا تھا۔

”دفع کریں شعاع آپ اثر نہ لیا کریں۔“

یاسر نے شیشے میں شعاع کو دیکھا جس کی جھیلوں میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ جلن ہو رہی تھی آنکھوں میں۔

”نہیں میرے بھئی۔ اب کیا اثر لیتا ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ ان ماں بیٹے کا بے گام کیا؟ انہوں نے

نظروں کی فصیلیں کھڑی کر لی ہیں اپنے اطراف اگر یہ لکھنا بھی چاہیں تو نہیں نکل پائیں گے۔“

اک کھنکھاتی سی آہ اندر ہی اندر دم توڑ گئی۔

”بس یا سر یہیں روک دو۔“ شعاع فرزانہ کا گھر پہنچانے ہوئے بولی۔

”اچھا لینے کب آؤں؟“ یا سر مڑ کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

”پانچ بجے تک آ جانا کیونکہ ہم دونوں بیٹھ کر کچھ دیر پڑھیں گے بھی۔“

”اچھا پھر خدا حافظ۔ میں پورے پانچ بجے یہاں موجود ہوں گا۔“

یا سر نے لک مارے ہوئے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جلدی سے اوجھل ہو گیا۔

”خدا حافظ یا سر خدا تم لوگوں کو خوش رکھے، میرا مان رکھ لینے ہو۔“

شعاع کے دل سے دعا نکلی۔ اب وہ گیٹ پر کھڑی تیل پر تیل دیے جاری تھی مگر کوئی جواب نہیں آ رہا تو۔

پھر اس نے دیکھا گیٹ کھلا ہے وہ کھول کر اندر آ گئی۔ وسیع لان کو عبور کر کے اندر کی تیل دینا ہی چاہتی تھی کہ لان

میں ایک طرف نماز پڑھتے ہوئے چوکیدار بابا پر اس کی نظر پڑی۔ گھر کی خاموشی بتا رہی تھی کہ جیسے گھر میں کوئی نہ ہو۔ وہ مزید معلومات کے لیے بابا کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ دعا کے بعد بابا اس کی طرف آ گئے۔

”کون شعاع بیٹی۔“ فرزانہ کا چوکیدار اسے اچھی طرح جانتا تھا۔

”جی بابا آداب۔ کہاں ہیں یہ لوگ؟“ وہ کھڑی ہو گئی۔

جھپتی رہو بیٹی۔ تمہیں خبر نہیں کیا فرزانہ بیٹی کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ دو روز ہوئے یہ سب لوگ لاہور چلے گئے ہیں۔“

”لاہور چلے گئے ہیں!“ شعاع نے منہ میں دہرایا۔

”ہاں بیٹی فرزانہ بیٹی مجھے کہہ گئی تھی کہ آپ فون کریں یا خود آئیں تو میں آپ کے کاغذات آپ کو دے

دوں آپ بیٹھو، میں کاغذات لے کر آتا ہوں۔“

بابا اسے سفید کین کی کرسی پیش کر کے خود کاغذات لینے چلے گئے اور وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اسے فرزانہ

کے دادا کا افسوس ہوا تھا مگر غنیمت تھا کہ وہ اس کے نوٹس چھوڑ گئی تھی۔

”یہ لو بیٹی کاغذات۔“ بابا نے فائل اس کی طرف بڑھا دی لیکن اب وہ سوچ رہی تھی گھر کیسے جائے گی

یا سر کو پانچ بجے آنا تھا۔ اور ابھی صرف دو بجے تھے۔

”بابا میں فون کر سکتی ہوں۔“

”نہیں بیٹی فون تو کئی روز سے خراب پڑا ہے۔ گھر والے آئیں گے تو ٹھیک ہوگا۔“

”اوہو! اچھا بابا خدا حافظ۔“ شعاع نے سوچا کوئی رکشہ وغیرہ لے کر چلی جائے گی۔ باہر نکلی تو اس علاقے

کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔ مین روڈ پر لڑکھنوں سے پوچھتی کیا کرتی۔ تھک ہار کر وہ ایک بڑی

سی کوشی کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک گلی میں ابھی رکشہ جاتے دیکھا تھا۔ وہ اس کی واپسی کا انتظار کر رہی

تھی۔ خنکی کے باوجود اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ آیات کا درد کرتی جا رہی تھی۔ زبان پر ذکر الہی ہڈت

اعتیار کر رہا تھا۔ اسی وقت اسی کوشی کا گیٹ کھلا اور ایک ہنڈا سوک نکلی۔ ایک لڑکی گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی اور

خواتین پیچھے بیٹھی تھیں۔ شعاع کا جی چاہا ان سے لفٹ مانگے۔ کم از کم اسے مین روڈ تک پہنچا دیں پھر وہ آگے

لا جائے گی۔

ابھی وہ فیصلہ کر رہی تھی کہ ان خواتین کی اس پر نگاہ پڑی۔ وہ اس وقت بہت ڈری سبھی ی چڑیا لگ رہی

گاڑی خود بخود ہی اس کے قریب آ کر رک گئی۔

”بیٹی! تمہیں کہاں جانا ہے؟“ ایک مہربان نے پوچھا تو وہ خوش ہو گئی۔

”جی جانا تو مجھے کلفٹن ہے مگر آپ اگر مین روڈ تک ڈراپ کر دیں تو احسان مند ہوں گی۔“ وہ بڑے عزت

رے لہجے میں بولی۔

”ارے بیٹی، اس میں احسان مندی کی کیا بات ہے۔ مین روڈ کیوں ہم لوگ خود کلفٹن جا رہے

ہیں ہمارے وجہ سے تھوڑی جا رہے ہیں۔ تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دیں گے۔ ماشاء اللہ بہت اچھے گھر انے

آئی ہو۔“

اب کی بار دوسری خاتون نے نظروں ہی نظروں میں پوسٹ مارٹم کر ڈالا تو وہ موقع غنیمت جانتے ہو۔

ٹٹائی۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ آرام سے گھر پہنچ جائے گی۔



لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔ لڑکی بھی خاصی تیز تھی۔ ان کی اوور ٹیکنگ کی ہر کوشش کو ناکام بنا رہی تھی۔  
”یار، آج کل کی لڑکیاں تو بس آفت کی پرکالہ ہیں۔ مجال ہے جو برا کرنے دیں۔“

یاسر نے گیر بند لٹے ہوئے نیلے رنگ کی کروڑا کو دیکھا جس کے سائیز مرر سے لڑکی کا خوبصورت چہرہ نظر آ رہا تھا۔

”یار ویسے ہے غضب کی چیز۔ ہاں۔ ہاں۔ نکال یہاں سے جگہ ہے یار۔ یہ این ایل سی کا ٹرک رقیب پابنا ہوا ہے جب سے اب تک۔“

شرجی نے پیلے رنگ کے دیو ہیکل این ایل سی کے ٹرک کو گھورا جو واقعی جب سے ساتھ ہی چلا آ رہا تھا۔  
”ہاں اب پھنسی ناں۔“ گنگل ہوا تو دونوں خوش ہو گئے اور یاسر نے کوشش کر کے اپنی گاڑی اس لڑکی کی ڈی کے قریب لاکھڑی کی۔ شرجی نے فوراً ہال سنوارے، یاسر نے ایک انداز سے جیسے کو تھوڑا سا نیچے کیا۔ لڑکی نابینا چشمہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ کر اس کے کونے کو دانتوں میں دبایا۔ شوخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی تو راجل پڑا۔

”مارے گئے۔“ یاسر نے فوراً عینک اوپر کی اور سامنے دیکھنے لگا۔

”یہ تمہیں کرنٹ کیوں لگا؟“

یاسر نے مڑے بغیر کہا تو شرجی بھی غور سے لڑکی کو دیکھنے لگا پھر یاسر کے انداز میں اچھل پڑا۔

”باپ رے! یہ تو ویسی لڑکی ہے۔“

”جی ہاں سو فیصدی وہی ہے جو ایک بار پہلے بھی خاندان بھر میں رسوا کر چکی ہے۔ دیکھ لینا۔ آج بھی نے ہی صدف کو فون کر کے کہہ گی۔ صدف تمہارے کزنز بہت چھپورے ہیں۔ لو بھلا جیسے ان کو تو پتا ہی نہیں ہوئی۔“

وہ دونوں جڑبڑ ہو رہے تھے۔ اوپر سے لڑکی کی شوخ مسکراہٹ جان جلائے جا رہی تھی اور لڑکیوں میں ہلکی کا احساس الگ مارے دے رہا تھا۔

”خدا تیرا بھلا کرے اور رزق حلال نصیب کرے۔“ شرجی اور یاسر نے گنگل کھول دینے پر کانٹیل کو دعا اور گاڑی بھگالی۔

”آہستہ یار۔ لگتا ہے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔“

انہوں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور تیزی سے سڑک کر اس کے لوگوں کے جھوم میں گھس گئے۔

”شعاع باجی!“ دونوں ایک ساتھ بولے اور ٹپ کر شعاع کی طرف بڑھے جس کے سر سے خون بہہ رہا اور ایک عورت نے شعاع کا سر اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا اور وہ بے ہوش تھی۔

”یاسر۔ گاڑی لے کر آؤ کیا ہوا؟ شعاع باجی۔ شعاع باجی۔“

شرجی نے شعاع کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے اس عورت کو دیکھا۔

”کیا ہوا تھا؟ آپ کچھ بتا سکتی ہیں؟ کس طرح ایکسیڈنٹ۔ یہ۔ یہ میری بہن ہیں۔ ہم نے ان کو ان کی موت کے ہاں چھوڑا تھا اور اب لینے جا رہے تھے کہ۔“ شرجی نے جیب سے رومال نکال کر شعاع کے مسلسل ٹھلے خون پر رکھ دیا۔

”اچھا بھئی، میں تو چلا۔“

”بھائی ذرا دور ہٹ کر چلنا۔ یہاں بڑے کمزور دل بیٹھے ہیں۔“

”ویسے بانی دلوے کہاں چلے گی تیاری ہو رہی ہے؟“ شرجی نے یاسر کو دیکھا جو جیکٹ کی زپ بند کر رہا تھا۔

”شعاع باجی کو لینے جا رہا ہوں۔ لاؤ، بائیک کی چابی دو۔“

”اچھا تو پھر میں راشو بھیا سے ان کی گاڑی کی چابی لاتا ہوں۔ میں بھی چلوں گا۔“

شرجی وہاں سے اٹھ کر نئی۔ وی لاؤنچ میں آگیا۔ جہاں راشو کتاب دیکھ رہا تھا۔ اشعر اور ہوی کسی بحث لگے ہوئے تھے۔ شرجی کو دیکھ کر تینوں ہی متوجہ ہو گئے۔

”راشو بھیا! جلدی سے گاڑی کی چابی دے دیں ورنہ بچھتا نہیں گے۔“

”کوئی ضرورت نہیں، تمہیں معلوم ہے۔ مجھے خود حیدر آباد جانا ہے آج ہی۔“

راشو نے صاف انکار کر دیا تو شرجی نے یاسر کو دیکھا۔

”دے دیجیے راشو بھائی۔ آپ ہی کا بھلا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ راشو بھیا نہیں پارہا تھا۔

”مطلب یہ کہ آپ کی مگسٹری کو لینے جا رہے ہیں۔“

یاسر نے کچھ اس طرح کہا کہ راشو جینپ گیا۔ اور زربل مسکراتے ہوئے چابی ان کو دے دی۔

”کیا موت کیا کرو۔“

”ہاں چاہے اس بکواس سے دل میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔“

ہاں یاسر! مگر کسی کے دل کی ہستی میں گہرے دکھ کی دھند بھی تو اتر آتی ہے۔

ہوی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر گہرا سانس لیتے ہوئے سوچا۔

یاسر اور شرجی گاڑی لے کر نکل گئے اور اب مسلسل ایک گاڑی کا پیچھا کر رہے تھے جس کو ایک خوبصورت



”پتا نہیں بیٹا یہ لوگ بتا رہے ہیں کہ ایک گاڑی ٹکرا کر چلی گئی۔ میں بھی یہاں سے گزر رہی تھی۔ دیکھ لڑکی ہے تو رک گئی۔ لوگ بھی تو ایسے ہی ہیں۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر بہن کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“

ان دونوں کا بس چلنا تو شعاع کو ٹکرا مارنے والے کو ختم کر ڈالنے مگر شعاع کا زخم کی بات کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ دونوں اسے لے کر ہاسپٹل پہنچ گئے۔ اتفاق سے وہی بھی وہاں موجود تھا۔ شعاع کو یوں زخمی دیکھ کر وہ پریشان تو بہت ہو گیا تھا۔ تاہم اس نے ظاہر نہیں کیا۔ البتہ وہ سینئر ڈاکٹر کو بلا لایا۔

”ڈاکٹر صاحب! زخم گہرا تو نہیں؟“ شرعی کو بہت فکر ہو رہی تھی۔

”ارے نہیں۔ میاں گھبرانے کوئی ضرورت نہیں۔ زخم ہے ضرور اور گہرا بھی مگر فکر مند ہونے کی نفسی ضرورت نہیں۔“ ڈاکٹر نے مسکرا کر شرعی کو دیکھا۔ یاسر نے گھروفن کر دیا تھا۔ رجن اور یسین فوراً ہاسپٹل پہنچ گئے۔

”ہوی بیٹے شعاع؟“ رجن نے تو یسین البتہ یسین احمد نے ہوی سے پوچھا۔

”گھبرانے کوئی بات نہیں بچا جان! معمولی زخم ہے، پٹی کر دی ہے۔“

یہ ڈاکٹر تو م بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ آخری دم تک یہی کہتے ہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ شعاع کو بھی انہوں نے ہنسنے مسکراتے چھوٹا نکلے اس کے زخم پر لگا دیے تھے۔

”رجن صاحب! بے بی بی فی الحال انجکشن کے اثر سے بے ہوش ہے۔ زخم معمولی ہے گھبرائیے مت۔ مگر لے جانا چاہیں تو لے جائیں ورنہ۔“

”نہیں ڈاکٹر! ہم جی کو گھر لے جانا چاہتے ہیں۔“

اور پھر وہ شعاع کو گھر لے آئے تو گھر بھر پریشان سا اس کے گرد ہو گیا۔ یاسر کو ڈاکٹر پڑ چکی تھی کہ وہ شعاع کو تنہا کیوں چھوڑ کر آتا تھا۔ لڑکیوں کو اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ کیوں نہیں گئیں۔ قد سیدہ بانو نے جھٹ شعاع کا صدمہ اتار دیا تھا۔

”میری بچی۔ کس کی نظر لگ گئی۔ خدایا میرے فرمان کی امانت ہے میرے پاس اسے صحت اور زندگی عطا کر دے۔“ بی بی جان مسلسل پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھیں۔

”بی بی جان! معمولی سا زخم ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ دعا کیجیے۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

رجن نے بڑھ کر ماں کو تسلی دی۔ آغا بھی شعاع کو دیکھنے آئے تھے اور اس کی طرف سے بہت فکر مند تھے اور انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا وہ بیٹے کی امانت کی صحیح طور پر دیکھ بھال نہیں کر پارہے ہیں۔

”امی یہ ریشمی اور ابوبک تک حیدر آباد سے لوٹیں گے؟“

صدف نے شعاع کی چادر درست کرتے ہوئے قد سیدہ بانو سے پوچھا۔

”پتا نہیں بیٹا برنس کے سلسلے میں گئے ہیں، نجائے کتنے دن لگ جائیں۔“

”اچھا بھئی، سب لوگ اب باہر جائیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ابھی انجکشن کا اثر ہے اور ویسے بھی یہ بتنا ہے اس کے زخم کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔ اب بھی جان شعاع کے لیے آپ سوپ بنا کر رکھ دیجیے۔ جب بھی جاگے تو میں خود گرم کراؤں گی آپ لوگ آرام کریں۔“

عابی نے سب کو اٹھا دیا اور خود شعاع کے بید کے قریب ہی ایزی چیر لے کر بیٹھ گئیں۔ کتنی ہی دیر وہ ہے

پڑی شعاع کو دیکھتی رہیں۔ شعاع اتنا خون بہہ جانے سے کافی کمزور اور زرد لگ رہی تھی۔ وہ کتاب پڑھتی باور نہ جانے کب یوں ہی بیٹھے بیٹھے نیند غالب آگئی۔ انجکشن کا اثر شاید ختم ہو رہا تھا اور زخم میں بیسیں بھی اٹھنے نہیں کہ شعاع کراہ اٹھی۔

”اف میرے خدا! یہ سب کیا ہے۔ کتنا درد ہو رہا ہے۔ اف۔“ شعاع دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کراہ اٹھی۔ اس نے انجینی ٹی ٹکا ہوں سے اس نئی جگہ، نئی ہر چیز کو دیکھا۔ ایک تو تکلیف اوپر سے نئی جگہ۔ اس کا سر اٹھنے لگا۔

”یا اللہ یہ سب کیا ہے؟ میں کہاں ہوں؟“

عابی کی آنکھیں کھل گئی تو وہ جلدی سے شعاع کے قریب آگئیں مگر وہ ان کو انجینی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”جی کون ہیں آپ؟ اور میں کہاں ہوں۔“

”شعاع بیٹی۔“ عابی کا دل بیٹھ سا گیا۔ شعاع مستقل غیریت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کی نظروں میں تو ان کی رقی ہی باقی نہیں رہی تھی۔

کہیں خدا انخواسہ شعاع کی یادداشت۔ اف میرے خدایا ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں۔ میں فرمان کو کیا ہکاؤں گی۔ عابی دل ہلانے والی سوچوں میں گم تھیں اور شعاع ان کو انجینی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”پلیز، مجھے بتائیے۔ میں کہاں ہوں۔ آپ کون ہیں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ عابی کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ انہوں نے اسے ساتھ لگایا۔

”ہم تمہارے اپنے ہیں بیٹے۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ یہ تمہارا کمرہ ہے۔ میں آنٹی ہوں تمہاری۔ عابی آنٹی۔“

”میری اف بہت درد ہو رہا ہے۔ کون ہیں آپ، میں پہچان نہیں پاتی۔“

شعاع نے سر کو تھامتے ہوئے عابی کو دیکھا۔ تکلیف تو کتنی ہی اوپر سے یہ نئے چہرے۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہو رہی ہے مجھ سے باہر ہے۔

”شعاع بیٹی! پریشان نہ ہو۔ تمہیں چوٹ لگ گئی ہے ناں۔ تم اپنی دوست کے ہاں گئی تھیں۔ پھر تمہارا باپ ہو گیا تھا اور تمہیں چوٹ آگئی تھی۔ آ یا یاد۔“ عابی دل کو سنبھالنے سے یاد دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہاں میرا ایکسڈنٹ ہو گیا تھا۔ مجھے چوٹ آگئی تھی۔ اتنا تو مجھے بھی یاد ہے مگر پھر یاد نہیں آپ لوگوں نے اہمیت دیکھ بھال کی۔ پلیز۔ آہ۔“

بولنے بولنے شعاع کے زخم میں پھر نہیں اٹھی عابی بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہی تھیں جس انکھ میں نہ پہچان کی چمک تھی اور نہ گفتگو میں اپنائیت۔

”سوپ لاؤں بیٹی؟“ عابی نے آہستگی سے سے پوچھا تو شعاع نے آنکھیں کھول کر عابی کے صلح اور

انہوں نے کو دیکھا خزن و طلال نے عجیب سا رنگ دے دیا تھا۔ اس چہرے کو۔ وہ کتنی ہی دیر دیکھے گئی۔ نجائے

”معاذ بیٹی! سوپ لے کر آؤں؟“ محبت بھری آواز پھر ابھری تو اس نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”معاذ بیٹی! سوپ لے کر آؤں؟“ محبت بھری آواز پھر ابھری تو اس نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”معاذ بیٹی! سوپ لے کر آؤں؟“ محبت بھری آواز پھر ابھری تو اس نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سپ لے رہی تھی اور عالی اسے دیکھتے ہوئے نجانے کن سوچوں میں گم تھیں۔

”آئی! شجاع کو آواز نے سکوت توڑا۔

”جی بیٹا!“ عالی نے شفقت سے اسے دیکھا۔

”آئی! بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری دیکھ بھال کی لیکن اب مجھے گھر پہنچا دیں۔“

”گھر؟“ عالی کے دل پہ جیسے گھونسہ پڑا۔

”جی آئی میں اپنی دوست کے ہاں جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی کہ ایک سیڈنٹ ہو گیا اور اب میری

فکر مند ہو رہی ہوں گی۔ بہت دیر ہو رہی ہے پلیز۔ چنچا دیجیے۔ میں تمام عمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔“

وہ منت بھرے لہجے میں التجا کر رہی تھی اور عالی اندر ہی اندر ڈھس رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ

محل طور پر یادداشت گواہی دیتی تھی۔ تب ہی تو بہن کی باتیں کر رہی تھی۔

”اچھا بیٹی۔ تم یہ دوا لے لو میں خود تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گی۔ ٹھیک ہے ناں۔ یہ دو دوا کھا لو۔“

عالی نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا اس کے ہاتھ میں دی اور پانی کا گلاس دیا۔

”تم لیٹ جاؤ۔ میں جا کر ڈرائیور کو دیکھتی ہوں۔ آگیا ہے تو اسے کہتی ہوں گا ڈی نکالے۔ چلو شاہ

لیٹ جاؤ۔“ عالی نے نرمی سے کہا اور اس کپہل درست کر کے باہر آ گئیں۔ کیونکہ ان کو خبر تھی کہ دواؤں کے

اثر سے شجاع پھر سو جائے گی۔ تب وہ ڈاکٹر کو فون کر لیں گی۔ کچھ ہی دیر بعد شجاع سو گئی تو عالی نے ڈاکٹر

نمبر گھمایا۔

”نو۔ نو۔ آغا میں مان ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر میں ہوں۔ بے بی کو بالکل معمولی سی چوٹ ہے۔ یادداشت

جانے کا سوال ہی نہیں۔ لیکن خیر آپ گھبرائیے نہیں، میں صبح آؤں گا اور بے بی کو دیکھوں گا۔ فی الحال اسے

کرنے دیں۔“

”ڈاکٹر! آپ تو جانتے ہیں آغا جی پہلے ہی بہت دکھی ہیں۔ یہ صدمہ وہ۔“

”مس آغا آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کریں آپ کا خدشہ غلط ہے۔ میں صبح ہوتے ہی آؤں

گا۔ تسلی رکھیے آپ۔“

ڈاکٹر اتنی تسلیوں کے باوجود عالی مضطرب ہی رہیں۔ مسلسل دعائیں پڑھ کر شجاع پر پھونک

تھیں۔ رات کے نجانے کس پہر آنکھ لگ گئی۔ وہ شجاع کے ساتھ ہی بیڈ پر آکر لیٹ گئیں۔ جب وہ مکمل طور

گئیں تب شجاع دوا کے اثر کی قید سے رہا ہو گئی۔ اور اس نے جھٹ آتھیں کھول کر اجنبی کمرے اور اجنبی خدوں

کو اپنے نزدیک دیکھا پھر سارے واقعات نظروں میں گھوم گئے۔

”اف میرے خدا! رات کا ایک بج گیا۔ آئی کا مارے پریشانی کے برا حال ہو گا۔ خدا یا کون لوگ ہیں

یہ۔ میں کیسے آئی کو اطلاع کروں کہ میں خیریت سے ہوں۔“

دوا کا اثر تھا کہ زخم سے اب ٹیسس بھی نہیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ پریشانی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اس نے

سی نگاہ خوبصورتی سے سج کرے پر ڈالی۔ کمرے کی سجاوٹ میں سادگی بھی تھی اور حسن بھی مگر اس وقت تو اسے

کوئی چیز بھی متاثر نہیں کر رہی تھی۔

”یہ کیا میری تصویر اور یہاں۔“

اس کی نظر کارلس پر جا کر جم گئی تو وہ بے خودی اس کی طرف بڑھی۔

”ہاں یہ میری ہی تصویر ہے مگر یہاں کیوں؟ کیسے؟ کون ہیں یہ لوگ میری تصویر ان کے پاس کیسے آئی؟“

وہ بھی پتھر آنکھوں سے تصویر تھامے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آئینہ دیکھ رہی

ہے۔ ہونٹ۔ ناک۔ ہیرا شاکل کوئی چیز مختلف نہیں تھی۔ ہاں اگر کچھ مختلف تھا تو کی جھوٹا سا مل جو اس

پر نہیں تھا البتہ تصویر والی کے نچلے ہونٹ کے بائیں جانب رعب حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ تصویر کے ایک

پنسل نقش کو چھو کر محسوس کر رہی تھی اور پھر اپنے نقوش کو محسوس کر رہی تھی۔

یادداشت کہاں آگئی ہوں۔ میری تصویر یہاں کیسے آئی۔“

سوچ سوچ کر پھر ٹیسس اٹھنے لگی تھیں۔ اس نے صوفے کی پشت سے سر نکا دیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں

ہو رہا تھا۔ اسے سوئی ہوئی عالی یہ گھر، یہ کمر اور ہاتھ میں پکڑی اپنی ہی تصویر بہت پر سرار لگ رہی تھی۔ اسے خوف

لوں ہونے لگا۔ اس کا بس چلتا تو ابھی بھاگ جاتی۔ اس پر اسرار ماحول سے۔ جانے کون لوگ تھے۔ اب تک

انہاں کو ابھی رحم دل لوگ سمجھ ہوئے تھے۔ جنہوں نے مشکل میں اس کی مدد کی تھی مگر اب اسے خوف محسوس

ہونے لگا تھا یہاں سے۔ اس نے بے ارادہ ہی الماری کی دراز کو کھولا تو ایک بڑی عمر کے خوش آؤی تصویر اس کے

انہیں آگئی۔ وہ کتنی ہی دیر اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ نجانے کیا بات تھی اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اسے احساس ہی

ہوا کہ کتنی دیر گزر گئی۔ عالی کی آنکھ کھلی تو وہ اسے یوں دیکھ کر اس کے قریب آ گئیں۔

”ہاں۔ ہاں بیٹی یہ تمہارا ابو کی تصویر ہے۔ اور..... اور یہ تمہاری امی کی۔“ عالی نے جلدی سے دوسری

پور دکھائی جو مریم کی تھی۔

کتنی خوبصورت عورت ہے۔ اس نے دل میں تصویر کو سہا۔ عالی اسے ساری باتیں یاد دلانے کی کوشش

رہی رہیں اور وہ گم سم سی ہوں ہاں میں جواب دیتی نجانے کیا کچھ سوچ رہی تھی۔ بے شمار سوال گبولوں کی

دور اختیار کر رہے تھے مگر فی الحال وہ صورت حال پر غور کر رہی تھی۔ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو، سازش نہ ہو۔

”شجاع بیٹی اٹھو۔ بستر پر لیٹ جاؤ۔“

”جی شجاع۔“ اس نے دھیرے سے دہراتے ہوئے ایک بار پھر اجنبی نظروں سے عالی کو دیکھا جو بڑی

وقت سے مسکرا رہی تھیں۔

”ہاں شجاع فرمان اور مریم کی شجاع، میری شجاع، راشد کی شجاع۔“

عالی نے ایک ہی سانس میں کتنے ڈھیر سارے نام شجاع کے نام سے وابستہ کر دیے تھے کہ وہ ان ناموں

کا شمع کو تو نہیں جانتی تھی مگر اتنا تو سمجھ گئی تھی یہ شجاع کے جذباتی رشتے ہیں۔ اس نے کسی سوال کو لبوں تک

بلنے کی اجازت نہیں دی۔ خاموشی سے عالی کی باتیں سن رہی اور پھر آنکھیں موند کر سوتی بن گئی۔ مگر ایک بے کلی

گما جس نے قرار نہ لینے دیا۔ وہ۔ خیال تھا کہ آئی طاہرہ کس قدر پریشان ہوں گی اس کے لیے۔ یہ کچھ سوچتے

بلنے تک آنکھ لگ گئی۔ صبح ابھی تو کسی مہربان چاہنے والے چہرے اس پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ ان کی محبتوں سے

ٹاٹ ہوئے بغیر نہ رہی۔

”اب کیسی طبیعت ہے ہماری بیٹی کی؟“

آغا جی خود چل کر اس کے کمرے میں آئے تو بے ساختہ وہ اٹھ بیٹھی۔

”جیت رہی بیٹی! لیٹی رہو۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں بھر ہوش میں دیکھا۔“

بی بی جان نے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔ گھر کے تقریباً سب ہی لوگ اس کے پاس تھے۔ سب کی محبتیں بھی وہ بس خاموشی سے دیکھتی رہی۔ یہ ان سب کی چاہت ہی کا اثر تھا کہ زخم سے اٹھنے والی نہیں بے اثر ہوئی تھیں۔ پھر سارے بزرگ اٹھ کر چلے گئے۔ عابی بھی تھکی ہوئی تھیں۔ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئیں تو شرجی اور بونی اس کے قریب آ گئے۔ اتنے قریب کہ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

”شعاع باجی جلدی سے ٹھیک ہو جائیے۔ راشو بھٹیا کے آنے سے پہلے ورنہ یا سر میں اس بچے کی جگہ لٹے ہوئے پائے جائیں گے۔“

”اور یہ آپ کو کھڑکی سے باہر نظر آئیں گے۔“

دانی نے شرجی کو دکھادے کر پیچھے کیا اور خود شعاع کے قریب بیٹھ گیا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکرا دی۔ وہ فی الحال کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ وہ تو رات سے اس کے بارے میں سوچ رہی تھی جو ان سب کی بیماری عزیز اور جان شعاع تھی اور اب بچانے کہاں تھی۔

”چلو بھئی۔ سچ۔ باہر جاؤ۔ بیٹی۔ تم اب دوا لے کر آرام کرو۔“

قد سید بانو نے سب کو باہر نکال دیا۔

”شعاع باجی گھبرا ئے گا مت۔ میں پھر آ جاؤں گا چور دروازے سے۔“

بونی نے اس کے کان میں آ کر گویا خوشخبری سنائی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اب کمر خالی تھا۔

وہ پھر بغور اپنی فرمان اور سریم کی تصویر دیکھنے لگی۔

”سنو“ اس نے تصویر سے نظریں ہٹا کر سرین کو دیکھا جو صفائی کر رہی تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”جی باجی۔“

”آں۔ تم ٹیلی فون اٹھا کر یہاں لاسکتی ہو۔“

وہ اس طرح بولی جیسے کوئی ناممکن بات ہو۔

”ابھی لیں باجی جی۔“

اور پھر سرین برقی رفتار سے فون اٹھا لائی اور دوسرے حکم کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔

”بس اب تم جاؤ اور وہ جو آئی ہیں ناں۔ وہ جنہوں نے مجھے دوا دی تھی۔“

”ہائے کیسی چالاک ہیں آپ باجی بھلا ان کا آپ کو پتا نہیں راشو بھٹیا کی امی ہیں۔“ سرین نے خامے

مسخرے اور معنی خیز انداز میں کہا۔

”ہاں۔ ان کو بتادینا کہ میں نے دوا کھالی ہے اور اب سوری ہوں۔ لہذا اب کمرے میں کوئی نہ آئے۔“

سرین کو اس کا انداز کچھ پسند نہیں آیا تاہم وہ باہر نکل گئی۔

”ہیلو آئی۔ میں علیہ بول رہی ہوں۔“

”کون؟ علیہ۔ علیہ بیٹی کہاں ہو؟ تم کہاں سے بول رہی ہو؟ کیا حادثہ پیش آیا تمہارے ساتھ۔ خیریت

سے تو ہوتا۔ جلدی سے بتاؤ کہاں ہو۔ میں ابھی لینے آ جاتی ہوں۔“

ڈاکٹر طاہرہ کل سے علیہ کی گمشدگی کی وجہ سے بے فکر مند تھیں۔ کہاں کہاں انہوں نے تلاش نہیں

کے کیسے کیسے واہے ناگ بنے تھے۔ انہوں نے بے قراری سے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”آئی! میں اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کل جب میں گھر سے یا سمین کے گھر جانے کے لیے نکلے تو سڑک

اں کرتے ہوئے ایک گاڑی سے ٹکرا گئی۔“

”ہائے خدا خیر۔ میری بیٹی کو زیادہ جوئیں تو نہیں آئی۔ بس پیشانی پر چوٹ آئی ہے لیکن آئی اس وقت اہم

لچوٹ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو مجھے جائے حادثہ سے لے کر آئے ہیں۔“

علیہ بہت سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔

”کیوں کیا مطلب؟ کیسے لوگ ہیں۔ مجھے ایڈریس بتاؤ ناں۔“

”لوگ تو آئی بہت اچھے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ لوگ مجھے اپنی لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ کمرے میں

برقی تصویر بھی ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے۔ جیسے یہاں کوئی ہم شکل لڑکی تھی جو بچانے کہاں چلی گئی اور یہ لوگ مجھے

یاد سمجھ رہے ہیں۔ اس لڑکی کا نام شعاع ہے آئی اور لگتا ہے۔ وہ ان سب کی عزیز از جان تھی۔ اسی لیے سب مجھ

اپنی محبتیں بچھا کر کر رہے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا آئی بتائیے میں کیا کروں۔“

”علیہ نے مختصراً آئی کو ساری بات بتادی تو کچھ دیر کے لیے ڈاکٹر طاہرہ سکتے میں آ گئیں۔ ان کا بھی

ایک چکر اٹھ گیا۔ ایک ساتھ سوچوں کے دروازے کھل گئے تھے۔

”ہیلو آئی کیا سوچ رہی ہیں؟ میں بہت پریشان ہوں۔ بتائیے میں کیا کروں۔“

علیہ کی پریشانی میں ڈوبی آواز ابھری تو ڈاکٹر طاہرہ چونک گئیں۔

”بات پریشانی والی ہی تو ہے۔ بہر حال تم ایسا کرو۔ ایڈریس بتاؤ میں آ کر تمہیں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا

ہے۔ اس صورت حال میں۔“

”آئی! میں تو کل سے اس کمرے میں بند ہوں۔ مجھے ایڈریس کا کیا پتا۔“

”اچھا تو فی الحال نائل رہو ان لوگوں کو احساس نہ ہونے دینا کہ تم حقیقی شعاع نہیں ہو۔ کیا خبر قدرت تم پر

امران ہو رہی ہو۔“

ڈاکٹر طاہرہ بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔

”کیا مطلب آئی؟“ علیہ کچھ بھی سمجھ نہیں پائی۔

”مطلب بھی سمجھا دوں گی۔ فی الحال تم نائل رہو اور کسی طرح ایڈریس معلوم کر کے بتاؤ۔“

”اچھا آئی میں کوشش کرتی ہوں۔ ابھی تو کوئی آ رہا ہے خدا حافظ۔“

علیہ نے ریسور رکھ دیا اور کمبل لپیٹ کر لیٹ گئی۔

جب سے علیہ کا فون آیا تھا۔ ڈاکٹر طاہرہ بے چینی سے ٹہل رہی تھیں اور اس کی بتائی ہوئی باتوں پر غور

کر رہی تھیں۔ علیہ کی ہم شکل لڑکی کا اس گھر میں موجود ہونا پھر کہیں چلا جانا اور اس کے گھر والوں کا علیہ کو شعاع

کہنا۔

”لگتا ہے۔ علیہ بیٹی! تمہیں تمہاری منزل مل گئی ہے۔“

ڈاکٹر طاہرہ علیہ کی باتوں پر غور کر رہی تھی کہ پھر فون کی بیل گونجی۔

”ہیلو آئی! میں نے اس لڑکی شعاع کی ڈائری سے ایڈریس نوٹ کیا ہے۔ آپ جلدی سے لکھ لیجیے۔ کوئی

”یہ تصویر دیکھ رہی ہیں آنٹی۔“ علیہ نے شعاع کی تصویر آگے کر دی۔

”یہ تو تمہاری تصویر ہے۔“ بے ساختہ ڈاکٹر طاہرہ کے منہ سے نکلا۔

”جی نہیں، یہ شعاع کی تصویر ہے جس کے دھوکے میں یہ لوگ مجھے لے آئے ہیں، لیکن وہ نہ جانے کہاں اور اس سے قبل کہ وہ آجائے اور میرا بھانڈا پھوٹ جائے، پلیرز آئی مجھے لے چلیے یہاں سے، مجھے تو خوف ہی ہو رہا ہے۔“

ڈاکٹر طاہرہ تصویر کو ایک تک دیکھتی ہوئے کچھ سوچے جا رہی تھیں۔

”اچھا وہ دوسری تصویر جن کا ذکر کیا تھا، وہ دکھاؤ۔“

علیہ آہستگی سے آٹھی، باہر جھانکا اور دروازے سے فرمان اور سریم کی تصویر نکال لائی۔

”اوہ میرے خدایا۔“ دونوں تصویریں ڈاکٹر طاہرہ کے ہاتھ میں لرز گئیں۔

”کیا ہوا آنٹی؟“ عزیز نے ان کا شانہ ہلایا۔

”کچھ نہیں بیٹا! اس قدرت کے انداز دیکھ رہی ہوں۔ کسی کسی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملا دیتی ہے اس کی

تاک۔“ وہ بڑے پر خیال انداز میں بولیں۔

”آنٹی! کچھ مجھے بھی بتائیے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں۔“

”تمہیں کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں، یہ ایک نیکی کا کام ہے اور تمہیں یہاں رہنا ہے، اس وقت تک جب

شعاع انہیں جاتی۔“

لیکن آنٹی، وہ کیوں گئی؟ گھر چھوڑ کر کہاں گئی۔ اپنوں کو چھوڑ کر اتنے چاہنے والوں کو چھوڑ کر۔ کیا یہ غلط

نہیں کہ ہم اس کے گھر والوں کو بے خبر رکھیں۔ ان کو خبر کر دینی چاہیے تاکہ وہ اسے تلاش تو کریں کہ کہاں چلی

گئی۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے کہ وہ گھر ہی نہیں آئی۔“

”تمہاری بات بھی درست ہے علیہ، لیکن بیٹی فی الحال ہمیں خاموش رہنا ہے، خصوصاً تمہیں میں جو کہوں

لو پر عمل کرنا ہوگا۔ میں اپنے طور پر اس لڑکی شعاع کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گی لیکن فی الحال چونکہ ان کی

فراہم میں تم شعاع ہو تو تمہیں شعاع کی عزت کا بھرم رکھنا ہے، تمہیں خبر ہے کہ اس لڑکی شعاع کے والدین

نہیں؟“

”جی آنٹی۔“ علیہ کو جانے کیوں شاک سا لگا یہ سن کر۔

”ہاں ابھی نیچے ہی یہ بات پتا چلی ہے شعاع دادا کے ہاں رہ رہی ہے اور یہ سب اس کے رشتے دار ہیں۔

بہانہ ہے ان کا وہ یہ شعاع کے ساتھ کیسا تھا، کیا حالات تھے۔ اس کے ساتھ جوہر گھر چھوڑنے پر

بلاؤ گھر سے نکلی ہو تو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ خیر وہ جہاں کہیں بھی ہے، اللہ اسے اپنے امان میں رکھے لیکن

”خدا نے اس کی عزت کا بھرم تمہارے ذریعے رکھا ہے اور اب اس کی عزت تمہارے پاس اس کی امانت

پہنچاؤ مجھے امید ہے کہ تم پوری نیک نیتی سے اس کا کردار ادا کرو گی۔ کیوں علیہ بیٹی؟“ رمان سے بولتے بولتے

ڈاکٹر طاہرہ نے رک کر علیہ کو دیکھا، جس کے خوبصورت چہرے پر سوچوں کا جال بچھا ہوا تھا۔

”اگر خدا نے مجھے اس لڑکی کی عزت کا بھرم رکھنے کا اعزاز بخشا ہے تو میں خدا کی مہربانی سے اس کے

والد پر حرف نہیں آنے دوں گی، لیکن میں یہ سوچ رہی ہوں کہ وہ کیوں گئی؟ آخر کہاں گئی؟“ روز روز ہو گئے اسے

آندہ جائے۔“ پھر جلدی جلدی علیہ ایڈریس لکھوا کر ریسور رکھ کر آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ شعاع کا کمر باندھ کر اسے راسے میں پڑتا تھا۔ بارہا قدم اس کے دروازے کے سامنے رک گئے۔ دل نے چاہا اس کچ ادا کو، کیجئے کہ میرا مگر ان کے بت نے آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس وقت بھی وہ شعاع کے دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ اندہ

یاد نہ جائے۔

”ہونہہ! اسے کون سی پروا ہوگی آؤں یا نہ آؤں۔ اس کی دھڑکنیں تو راشکی مٹھنوں کی۔ بنی زینہ بھی کوئی پروا نہیں۔“

وہ اپنے جذبوں کو جھٹلاتا ہوا قہر آلودی نگاہ شعاع کے بند دروازے پر ڈالتا ہوا گنگے بڑھ گیا۔ وہ سے نکل رہا تھا کہ ڈاکٹر طاہرہ کی گاڑی آ کر کی۔ وہ بھی ٹھہر گیا۔

”بیٹا! مجھے شعاع سے ملنا ہے۔“ ہوی نے ایک نگاہ اس گریس فل خاتون پر ڈالی اور پھر بائیک

کر کے ان کی طرف آ گیا۔

”جی آئیے۔“ پھر وہ ان کو لیے ہوئے اندر آ گیا۔

”صدف! ان کو شعاع سے ملنا ہے لے جاؤ۔“ وہ ان کو صدف کے سپرد کر کے خود باہر آ گیا۔

”آئیے آنٹی۔“ صدف ڈاکٹر طاہرہ کو ڈرائنگ روم میں لے آئی پھر گھر کی دوسری خواتین بھی

ڈاکٹر طاہرہ کو یہ لوگ بہت اچھے لگے۔

”دراصل جی مجھے کچھ ہی دیر پہلے شعاع بیٹی کے بارے میں خبر ہوئی ہے۔ شعاع میری بیٹی کی بہتر

دوست ہے۔ میری بیٹی آج کل لاہور گئی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا میں ہی خبر لے آؤں۔ کئی ہے شعاع؟“

زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“

”بس ڈاکٹر صاحبہ! خدا نے بڑا کرم کیا ہے۔ ہم سب کی تو جان ہے اس بچی میں۔ خدا اسے اپنی امان

میں رکھے۔ خدا نیک ہدایت دے لوگوں کو جو دوسروں کا احساس ہی نہیں کرتے۔ وہ تو آپ کہتے کہ خدا نے بڑا

ہاتھ دے کر بچا لیا ورنہ اس خالم نے تو کسر نہیں جھوڑی تھی۔“ قدسیہ بانو تفصیلات بتاتی تھیں۔ سیدہ سلیم غلام

سے منہ ہٹا کر وہاں سے اٹھ گئیں۔ ڈاکٹر طاہرہ نے صاف ان کا منہ بنا ہوا دیکھ لیا تھا۔ قدسیہ بانو شرمندہ ہوئی۔

اب وہ انہیں کیا بتائیں۔

”آئیے ڈاکٹر صاحبہ! میں آپ کو شعاع کے پاس لے چلوں۔“

پھر قدسیہ بانو ڈاکٹر طاہرہ کو شعاع کے کمرے میں لے آئیں۔ علیہ، ڈاکٹر طاہرہ کو کچھ کرکے

”ارے بیٹی! تم لیٹی رہو، کہیں زخم رسنے نہ لگے۔“

ڈاکٹر طاہرہ نے علیہ کا شانہ دبا کر نارمل رہنے کی ہدایت کی تو وہ بھی نارمل ہو کر لب گئی۔ ویسے بھی اس

زخم میں درد اٹھنے لگا تھا۔

”ڈاکٹر طاہرہ! میں معذرت چاہتی ہوں۔ آپ بیٹھے، میں ابھی آئی۔“

قدسیہ بانو معذرتی لہجے میں بولیں تو وہ دونوں خوش ہو گئیں۔

”ارے نہیں، آپ کام کیجیے میں اپنی بیٹی کے پاس بیٹھتی ہوں۔“ ڈاکٹر طاہرہ علیہ کے قریب

”ہاں اب بتائیے معاملہ ہے؟“ قدسیہ بانو کے جاتے ہی ڈاکٹر طاہرہ نے پاپھا۔

غائب ہوئے اگر میں نہ ملتی تو۔“

”تو بیٹی اس معصوم لڑکی کے کردار کی دھجیاں بکھر چکی ہوتیں۔ اس کے بوڑھے دادا، دادی شاید صدے کو برداشت نہ کر پاتے، لیکن دیکھو، وہ اس قدر باکردار لڑکی تھی کہ خدا نے اس کے کردار پر ایک حرف نہیں آنے دیا۔ کم وقت میں، میں بہت کچھ سمجھ گئی ہوں، اس کی کچھ عزیز ہستیاں اس کے ذکر سے نفرت کرتی تھیں تو یقیناً اس سے بھی کرتی ہوں گی۔ بہر حال اللہ اسے محفوظ رکھے ہر بلا سے، جنہیں ذرا مضبوط رہنا ہوگا۔“

”بیٹی آنٹی! میں پوری کوشش کروں گی کہ شعاع ہی بن کر رہوں۔ آنٹی ایک بات پوچھوں؟“

اچانک رک کر ڈاکٹر طاہرہ کو دیکھا۔

”ہاں بیٹی جلدی سے پوچھو، کوئی آ نہ جائے۔“

”آنٹی! آپ تو ڈاکٹر ہیں پھر بتائیے کہ کیا دو الگ الگ گھرانوں میں پیدا ہونے والی لڑکیاں ہم شکل سکتیں ہیں؟“

”واہ علیہ کیسی بات کی ہے تم نے۔ دیکھو وہ جو خالق ہے ناں پیدا کرنے والا، وہ مختار کل ہے، وہ ایک ہی شکل کے بے شمار انسان پیدا کر سکتا ہے، اس کے لیے کوئی مشکل بات ہے یہ۔“

”وہ تو ٹھیک ہے آنٹی، اللہ تعالیٰ کے اختیار میں سب کچھ ہے، جو چاہے کر سکتا ہے، لیکن عام طور پر بیٹی دیکھا گیا ہے ناں کہ جڑواں لوگ ہم شکل ہوتے ہیں، یہی بات مجھے الجھا رہی ہے۔“ وہ واقعی بہت الجھی ہوئی تھی تب سے۔

”علینہ بیٹی! یہ قدرت کے کام ہیں اور یہی خدا کی قدرت ہے اور یہ سب مظاہرے خدا کی ذات کا ظہار ہیں بجائے الجھنے کے اس کی ذات کو جھننا چاہیے اور جنہیں بھی الجھنا نہیں چاہیے، بس خاموشی سے خدا کے کام دیکھو اور جو ذمہ داری تم پر آئی ہے، اسے احسن طریقے سے نبھانے کی کوشش کرو۔ دیکھنا اللہ تمہیں بہت بڑا اجر دے گا جو کسی کی عزت رکھتا ہے خدا اس کی عزت رکھتا ہے، ٹھیک!“

ڈاکٹر طاہرہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کچھ اس انداز میں سمجھایا کہ ساری الجھنیں دور ہو گئیں، وہ خود کو ہلکا چھکا محسوس کرنے لگی۔

”لیکن آنٹی! مجھے کسی کا پتا نہیں کہ کسی کا شعاع سے کیا رشتہ تھا اور شعاع کا ان لوگوں سے کیا رشتہ تھا۔“

”یوں سا مشکل کام ہے۔ تعارف تو اتنی ہو جائے گا، رہا رویے کا سوال تو ان سب کی محبت، توجہ بٹانی ہے کہ شعاع بہت اچھی، سلیبی ہوئی لڑکی ہوگی۔ باقی آہستہ آہستہ تمہیں پتا چلتا جائے گا۔ میرے خیال میں کوئی آ رہا ہے، تم لیٹ جاؤ ہاں میں یہ تصویریں لے جاؤں گی، پھر لے آؤں گی۔“ ڈاکٹر طاہرہ نے فرمان اور مہمان تصویر اپنے پرس میں رکھ لی۔ اسی وقت قدسیہ بانو آ گئیں۔

”معافی چاہتی ہوں ڈاکٹر طاہرہ! دیر ہو گئی۔ لو شعاع سوپ پی لو، اس کے بعد دوالے لیتا۔ اس بچی میں تو سب کی جان ہے ڈاکٹر صاحبہ! اور میری تو خیر سے یہ بہو بھی بننے والی ہے۔“

قدسیہ بانو نے محبت بھری نظروں سے علیینہ کو دیکھا۔ وہ چونک کر ڈاکٹر طاہرہ کو دیکھنے لگی، جنہوں نے اسے مسکرا کر پرسکون رہنے کی ہدایت کی۔

”اچھا! یہ تو بڑی اچھی بات ہے، کیا کرتا ہے آپ کا بیٹا؟“

ڈاکٹر طاہرہ بڑی دلچسپی سے پوچھ رہی تھیں۔

”مجی راشو میرا بیٹا۔ انجینئرنگ کے آخری سال میں ہے۔ آج کل اپنے ابو کے ساتھ حیدر آباد گیا ہوا ہے۔“

”ہوں تو یہ چکر ہے، اسی لیے کل سے یہ لوگ راشو کا نام لے لے کر مجھے پھینڈ رہے ہیں۔ نہ جانے حضرت باپے ہیں، نام تو اچھا ہے، خود نہ جانے کیسے ہیں لیکن مجھے کیا جیسے بھی ہوں۔ علیینہ نے سوچوں ہی میں شانے چاکر راشو سے لائق کا اظہار کیا۔ اتنی دیر میں سب ہی کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔“

”بھی شعاع بیٹی! تم نے تعارف تو کرایا ہی نہیں ان سب سے۔“

سب کو جمع دیکھ کر ڈاکٹر طاہرہ نے دانستہ علیینہ کو دیکھا تو وہ بے بسی سے ان کو دیکھنے لگی۔

”یہ کیا تعارف کرائیں گی آنٹی، میں کراتی ہوں۔“

پھر فافازہ نے سب کا تعارف کر لیا تو ڈاکٹر طاہرہ کے ساتھ علیینہ کو بھی پتا چل گیا۔

”یقین جانے، مجھے تو بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔ افسوس ہو رہا ہے کہ اتنا عرصہ کیوں نہ ملی۔“

شعاع بیٹی! تم ان سب کو لے کر آنا ہمارے گھر۔“

ڈاکٹر طاہرہ بڑے اخلاق سے ان کو آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ اب وہ دیکھ رہی تھیں کہ علیینہ بہت پر کون ہے۔

”اچھا بیگم لقمان، اب اجازت دیجیے۔ اوکے شعاع بیٹی! اللہ آپ کو صحت دے۔ آپ کی دوست تو ہانے بک واپس آئے۔ ہاں میں تمہارا پتا کرنے آتی رہوں گی، خون ضرور کرنا مجھے۔“

”بیٹی شکریہ آنٹی!“ علیینہ بھی ڈاکٹر طاہرہ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

طاہرہ آنٹی کے جانے کے بعد علیینہ خود کو تنہا سا محسوس کرنے لگی۔ یہ قدرت نے بیٹھے بٹھائے اسے کس خان میں ڈال دیا تھا۔ وہ اب چپ چاپ لیٹ کر آئندہ کے حالات کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی مگر سب کے سب اس کے کمرے میں جمع تھے۔

”شعاع باجی! ویسے آپ کو سوچھی کیا، میں نے کہا جو تھا کہ لینے آؤں گا پھر آپ خود کیوں نکلیں۔ وہ تو خدا کا ارشاد بجالائیے کہ۔ مارنے والا رحم دل تھا اور کچھ خدا کو آپ کی ابھی ضرورت نہ تھی، ورنہ گئی تھیں ناں آپ۔“ یا سراس سے پوچھ رہا تھا اور وہ کوئی جواب دیے بغیر دھیرے سے مسکرا دی۔

”شعاع باجی! اراشو تمہارے کا فون آیا تھا۔ ایک دوروز اور لگ جائیں گے، تب تک ٹھیک ہو جائیے ورنہ ہم سب کی خیر نہیں۔“

راشو اور شعاع کے رشتے کی نوعیت کی تو اسے خبر ہو ہی گئی تھی، اس لحاظ سے آپ ہی آپ اس کی نظریں ہلک گئیں۔



لو دیکھ لو راشدہ بیگم! قدرت کا انصاف! تم نے انسانیت کے مقام سے گر کر ایک ماں کا جگر کاٹ لیا تھا ایک باپ کا دل تو زودیا تھا۔ ایک ماں کی ممتا کو جلا کر تم نے اپنی ممتا ڈاگ بجھانی چاہی تھی، اس کے لیے تم نے کتا بڑا گناہ کر ڈالا تھا مگر تمہاری ممتا کی آگ کیا بجھتی، مزید بھڑک اٹھی۔ دیکھ لو راشدہ بیگم! تمہاری وہ علیینہ جس





نہیں دن سے۔ میرے گھر پر قیامت گزر گئی ہوگی۔ یا خدا میرے کردار کی دجیاں بکھر گئی ہوں گی، آنٹی سیدہ۔  
 کیا کیا الزام نہ لگے ہوں گے میرے کردار پر میری ماں کے کردار پر۔ یا اللہ یہ سب کیا ہو گیا۔“  
 رات بھر شعاع روتی رہی، اسے گھر والوں کا خیال آ رہا تھا۔ وہ تصور کر رہی تھی کہ اس کی گمشدگی کے بعد  
 یہ کسی قیامت ٹوٹی ہوگی۔

اف میرے خدایا، یہ سب میری وجہ سے ہوا، میرے ہاتھوں میرے خاندان کی بربادی کیوں لکھی تھی، اس  
 پہلے مجھے موت کیوں نہ آگئی۔

شعاع نے خشکے کا گلاس توڑا اور قریب تھا کہ وہ کانچ کو اپنی شہ رگ پر چلا دیتی، رجو اندر آگئی۔

”کیا کر رہی ہو تم؟ زندگی خدا کی نعمت ہے۔“

”ہونہ! کیا فائدہ ایسی نعمت سے جو سوائے خاندان بن جائے۔ میں زندہ نہیں رہوں گی۔“ شعاع نے  
 اسے سر ہکا دیا۔

”میں تمہارے لیے خوشخبری لائی ہوں اور تم ہو کہ اس قسم کی باتیں کر رہی ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں تم اور خان بھائی یہاں سے کل رات نکل جائیں گے۔“

”لیکن کہاں؟“

”کہیں بھی کم از کم اس قید سے تو رہا ہوں گے ناں، میں تو خود ایک عرصے سے اس زندگی سے تنگ آگئی  
 ہوں۔ میں نے خان بھائی سے بات کی ہے۔ وہ بڑا اچھا خدا ترس انسان ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں کسی  
 نو مقام پر پہنچا دے گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

”لیکن میں رہا ہو کر جاؤں گی بھی کہاں؟ اب موت ہی میری منزل ہے۔ اس قید خانے میں آئے یا کسی  
 دیگر؟“ شعاع گویا گھر کے کنویں سے بولی۔

”اچھا اب موت کی باتیں نہ کرو۔ تم نے تو میری بھی زندگی اور سوچ بدل دی ہے۔ کل رات انشاء اللہ ہم  
 تم چھوڑ دیں گے۔“

پھر ایک ایک دن شعاع کے لیے گزارنا مشکل ہو گیا۔ کتنے عجیب دوراے پر اس کی زندگی آگئی تھی۔ اسی  
 میڈم کسی کے ہاں گئی تھیں اور یہ سنہری موقع تھا۔ خان بھائی نے بھی جان پر کھیل کر شعاع سے مردوں والا  
 لہا لہا تھا اور اس کا وقت آ گیا تھا۔ رجو نے میڈم کو اعتماد میں لے لیا تھا، ار وہ اس پر چھوڑ کر چلی گئیں۔  
 جنو، شعاع کو لے کر کوٹھی کے پچھلی طرف آگئی، جہاں پروگرام کے تحت خان بھائی موجود تھا۔ شعاع کو ادب  
 لاپرواہی میں رجو نے مدد دی اور جیسے ہی شعاع نے نیچے چھلانگ لگائی تو وہ پورن روشنی میں نہا گئی۔



کرو، اس میں تمہارا بھی بھلا ہے اور ہمارا تو ہے ہی اور ویسے بھی اب تم رہائی پا کر کیا کرو گی۔ تمہیں ہمارے  
 لڑکی باہر ایک رات بھی گزار آتی ہے تو اسے زمانہ تو کیا گھر والے بھی قبول نہیں کرتے۔ خواہ لڑکی کا دامن فرشتہ  
 کی طرح پاک ہی کیوں نہ ہو، ٹھیک ہے تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے مگر ہماری جیوری ہے۔ ہمیں تمہارا  
 حسین لڑکی کی تلاش تھی، وہ خدا نے خود گھر بھیج دی تو اسے کھو کر ہم کفرانِ نعمت تو نہیں کر سکتے ناں۔ چلو  
 ! کھانا کھاؤ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میڈم نے چپکار کر نوالہ بنا کر اس کے منہ میں ڈالنا چاہا مگر شعاع نے غرے کو اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔  
 ”دور ہو جاؤ ظالم عورت! میری نظروں سے، میں مرجنا چاہتی ہوں۔ میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتی۔  
 خدا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ مجھے موت دے دے یا اللہ۔“

شعاع تکیے پر سر مار مار کر پھر رونے لگی، رجو کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔  
 ”سیدھی طرح قابو میں آ جاؤ لڑکی! ورنہ قاسم کے حوالے کر دیا تو پچھتاؤ گی اسے خوب اچھی طرح سیدھا  
 کرنا آتا ہے۔“

”نہیں میڈم! آپ رہنے دیں، میں اسے سمجھاؤں گی ٹھیک ہو جائے گی اسے قاسم کے پاس نہیں بھیجاؤ۔“  
 قاسم کے نام پر رجو کانپ گئی۔ اس نے میڈم کو یقین دلایا کہ وہ لڑکی کو سمجھالے گی۔

”ٹھیک ہے سمجھاؤ ورنہ پھر میں خود اپنے طریقے سے سمجھاؤں گی۔“  
 میڈم دندنا باہر نکل گئی۔ رجو، شعاع کے قریب آگئی۔

”بس کرو میری بہن، بد نصیب لڑکیاں جب اس ذلیل عورت کے چنگل میں پھنس جاتی ہیں تو ان کو لوت  
 کر جانا نصیب نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے کچھ کھاؤ، تین دن سے تم نے ایک لقمہ منہ میں نہیں ڈالا ہے، اس طرح تو  
 مرجاؤ گی۔“

”ہاں، میں مرجنا چاہتی ہوں، اب بھلا زندہ رہ کر کروں گی بھی کیا۔ کیا رہا ہے میرے پاس! اتنی داس تو  
 ہو گئی ہوں، دیکھو، تمہیں مجھ سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو..... تو زہر لا دو مجھے۔“

شعاع، رجو کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رجو بھی روتی رہی۔  
 ”فی الحال تو تم صبر کرو، میری بہن میں ضرور تمہارے لیے کچھ کروں گی۔ بے شک مجھے اپنی جان ہی  
 کیوں نہ دینی پڑے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر تم سے عہد کرتی ہوں کہ تمہارا ساتھ دوں گی، تم یہ دودھ لٹاؤ  
 پلیز۔“ رجو نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

”نہیں رجو! یہ جگہ غلط ہے، یہاں کی ہر چیز مجھ پر حرام ہے۔ تم مجھے اس قید خانے سے نکال کر لے جاؤ  
 کہیں بھی، کیونکہ..... کیونکہ میں اب اپنی دخت میں واپس نہیں جاسکتی۔“ شعاع کا بس چٹا تو خود کو ختم کر اٹتی۔

”نقدیر کا یہ وار برداشت کر جاؤ بہن! سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن تم ذرا نارمل رہو تا کہ میڈم کو پھر قہر  
 خیال نہ آئے۔ اب تم لیٹ جاؤ، میں تمہیں رات کو تپاؤں گی، جو بھی پروگرام بنا ٹھیک ہے ناں۔ اب تم سوئے گی  
 کو خوش کرو۔“

رجو کی تسلیوں سے دل قدرے قابو میں آیا۔ وہ لیٹ گئی مگر کہاں کی نیند۔ کہاں کا آرام، وہ تو قدرت کے  
 اس نئے انداز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے کب سوچا تھا کہ بھی زندگی میں ایسے مرحلے بھی آئیں گے۔  
 ”یا میرے خدا! مجھ سے ایسا کون سا گناہ ہو گیا کہ جس کی اتنی بڑی سزا ملی ہے مجھے۔ یا اللہ میں یہاں ہوں

ابن علی دھندلا گئی تھیں پھر وہ کیا بتاتی۔

”کوئی بات نہیں بہن۔ خدا تو ہے ناں ہمارا تمہارا بس یہ خدا کا شکر کہ بجالاؤ کر ان ذلیل عورتوں کا جان چوٹ گئی۔“

”اچھا بہن اب آنسو صاف کرلو۔ بڑا طویل سفر طے کرتا ہے تمہیں۔“  
”کیا مطلب؟“ شعاع نے دھندلی آنکھوں سے خان کو دیکھا۔

”ہاں بہن! جبکہ تم بتا رہی ہو کہ تمہارا کوئی نہیں تو بہن! میرا بھی دنیا میں کوئی نہیں۔ بس ایک بھائی ہے۔ لاہور میں رہتا ہے۔ اس کا ماں مجھے بھی عمیر کی طرح ہی سمجھتی ہیں۔ بس میرا وہی ایک بھائی ہے۔ میں نے چلتا ہوں۔ ماں جی کے حوالے تمہیں کر کے مجھے سکون آ جائے گا۔ ورنہ تو میری شکل ہے انسان کا اس دنیا میں۔ بولو۔ کیا ارادہ ہے۔ میں نے تمہیں بہن کہا ہے تو نبھادوں گا بھی۔“  
خان خلوص سے پوچھ رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا فیصلہ کرے۔ لوٹ کر جائے تو گھر قبول نہیں رہے۔ بڑے تواتنی دھندلا گئی کہ کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن پھر اس نے خدا کا نام لے کر رخسار اٹھالے کر دیا۔

”ٹھیک ہے بھائی! جو تم نے سوچا ہے، ویسا ہی کرو۔“

اور اب وہ طرین کی اکاٹومی کلاس میں بیٹھی اپنی آئینہ منزل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”اے موت تو ہی میرا بن ہو جاتی۔ زندگی نے تو مارا ڈالا ہے۔“

ہر آتی جاتی سانس میں شعاع موت کی دعا مانگتی۔ اب بھلا زندہ رہ کر کرنا بھی کیا تھا۔ بھلا موت کا کیا بھی کرنا تھا۔ پھر وہ کس آس پر زندگی کی تمنا کرتی۔ طرین برق رفتاری سے آگے بڑھتی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ ڈبے میں لوگ سکتے ہوئے تھے۔ گھر شعاع کی آنکھوں میں تو ماضی چھوٹا سا بکتایا آ رہے تھے۔ امی، ابو، آغا جی، بی بی جان، کتنے چاہنے والے بچے۔ بے لوگ تھے۔ کیسے چھوٹا سا بچہ۔ ہوئی؟ اک ٹیس اٹھی دل میں۔ راشو؟ نظریں اندامت سے آپ ہی اس مہربان شخص کے سامنے آئیں۔ کتنی عزت دی تھی اس نے اسے۔ ڈھال بن گیا تھا اس کی سب کی چائیس وہ منگتی۔

اف میرے خدایہ سب کیا ہو گیا۔ مجھے معاف کر دینا میرے پیارو۔ میں تو ہزار بار پیدا ہو کر بھی اپنی باتیں نہیں دلا سکتی۔ سیدہ انٹی، ہوئی اف خدایا۔ ان کی نظریں، ان کی باتوں کے نشتر، میری روح میں گامیں گئے اس سے بہتر ہے، میں انجانی راہوں کی دھول بن جاؤں۔

لاہور آچکا تھا اور اب وہ سردرات میں بغیر کسی سوٹر کے خالی ایک شال میں ہر احساس سے بے ہوش ہوئی۔ بھائی کے پیچھے چل رہی تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ یوں تو رات کے دس بجے تھے گھر سردار ورنہ خواؤں کے لیے لگ رہا تھا۔ گویا رات بہت بیت چکی ہو۔ اس کم نصیب نے کب سوچا تھا کہ کبھی پناہ کی تلاش میں وہ بھول جائے گی۔

”ارے اس وقت اتنی سردی میں کون آ گیا۔“

عمیر نے فائل پر سے نظر ہٹا کر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بیٹھے تھیا! میں دیکھتا ہوں۔“

غضب ہو گیا راجو، یہ لوگ اتنی جلدی کیسے آگئیں؟“ خان، شعاع کے سلسلے کھڑا ہو گیا۔

”اب کیا ہو گا خان بھیا! کچھ بھی ہو، میں اس جہنم میں دوبارہ نہیں جاؤں گی۔ یہیں مر جاؤں گی۔“

شعاع کی روح فنا ہو رہی تھی۔ وہ تو اس رہائی کو اپنی دعاؤں کا شمر سمجھ کر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ وہیر قیامت پر اس جہنم سے نکل جانا چاہتی تھی۔

”تم مت گھبراؤ۔ میں تمہیں جان پر کھیل کر بھی آزاد کرادوں گی۔ خان بھائی! تم لڑکی کو لے کر کسی طرف نکل جاؤ۔ میں عورتوں کو سنبھال لوں گی۔ ہاں اسی طرف سے نکل جاؤ۔ جلدی کرو۔“

راجو نے شعاع اور خان کو بازئی آڑ میں کر دیا اور اس سے قبل کہ وہ گاڑی ان کے قریب آتی۔ خان نے وہ گاڑی جو پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ اس میں شعاع کو بٹھایا اور فل اسپید کر دی اور گاڑی ریوے انٹیشن کی طرف موڑ دی۔ اڑتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی شعاع ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ کیا بھی اور کیا ہونے جاری تھی۔ کیا ہو گیا تھا یہ سب۔ یہ کس گناہ کی سزا تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سب کچھ دھندلا چھپ گیا تھا۔

”یا خدا! کاش یہ سب بھی ایک خواب ہو۔ میں آنکھیں کھولوں تو یہ سب ختم ہو جائے کاش۔“

شعاع نے زور سے سر پیٹ پر مارتے ہوئے سوچا۔

”دیکھو بہن ابھی بھی وقت ہے۔ بتاؤ۔ اپنے گھر کا پتادو۔ میں تمہیں پہنچا دیتا ہوں۔“

خان نے مڑ کر شعاع کو دیکھا۔ اسے اس معصومہ کی دیکھی لڑکی پر ترس آ رہا تھا۔

”میرا گھر کوئی نہیں ہے بھیا! کس گھر کا پتا بتاؤ تمہیں۔ میں بے گھر ہوں۔ جس گھر میں ماں باپ۔“

ہوں۔ ”خلا وہ بھی کوئی گھر ہوتا ہے۔ مجھے کبھی بھی ندی سمندر میں بہا دو۔ میں اب جینا نہیں چاہتی۔“

شعاع بے حال ہوئی جاری تھی۔ اپنے گھر، اپنے وارثوں کا پتا تو وہ خود بھی بھول گئی تھی۔ واپسی کی تہا۔

”بھابھی! مجھے تو کوئی گڑ بڑ لگتی ہے۔ خدا جانے کیا چل رہا ہے۔ لگتا ہے خان بھیا جھوٹ بول رہے ہیں۔ لڑکی اور ہے۔“

چلہا جلا کر تو اس کے اوپر رکھتے ہوئے شمرہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”خدا جانے کیا بات ہے، ویسے لڑکی کے چہرے پر ہلاکی مصومت اور پائیٹنگی ہے۔ کسی بہت اچھے رانے کی لگتی ہے، خدائی جانے کیا معاملہ پیش آیا ہے بے چاری کے ساتھ۔“

”ایضاً بھابھی یہ معصوم چہرے ہی قیامت ڈھایا کرتے ہیں۔“ شمرہ نے حتیٰ خیر نظروں سے بھ بھی دیکھا۔

”ہائے بچو کسی باتیں کرتی ہیں۔ اتنی پیاری معصوم اور دھکی سی لڑکی ہے۔ آپ تو اس بے تجربے ہی بول دیتی ہائے کو شعاع کے بارے میں شمرہ کے اس قسم کے خیالات پسند نہ آئے۔

”بس تم تو گئیں کام سے۔ سدا کی حسن پرست ہو۔ ہمیشہ ظاہری حسن پر جاتی ہو۔ دیکھ لین خود ہی ایک بے شمرہ نے منہ بتایا۔

”ہونہ! آپ تو بس۔“

ادوبھئی۔ کیا مصیبت ہے۔ تم دونوں کیوں الجھ رہی ہو آج میں ایک غیر لڑکی کی وجہ سے جدی کر دو۔ عمیرہ ہار پوچھ چکے ہیں کھانے کا۔“

رضوانہ نے آکر ان کا جھگڑا ختم کیا۔ کھانا کیا کھانا تھا۔ شعاع کے حلق میں تو گویا کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے لپٹے۔ بار بار آنسوؤں کا گولا حلق میں اٹک جاتا۔ اس نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

”ارے بیٹی۔ تم نے کھایا ہی کیا ہے اور کھاؤ۔“

”نہیں نہیں آئی۔ بس اتنی ہی جھوک تھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اگر۔“ سر میں اتنا شدید درد ہو رہا تھا کہ ایسے لگ رہا تھا شریان پھٹ جائے گی۔

”آئی نہیں بیٹا۔ امی کہا کرو۔ خیر رضوانہ بیٹے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ میری بیٹی اور بیٹے کے لیے اور چائے کے لیے سر درد کی گولیاں بھی لیتی آنا۔“

گرم گرم چائے اور گولیاں کھانے کے بعد حرا کو قدرے سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اتنے دنوں سے بے گھر لگائی تھی۔ اب ماں کا سا پیار بھی ملا اور سکون بھی تو وہ وہیں حمیدہ بیگم کے بستر پر سوئی۔

”اب بتاؤ خان! خان کیا بات ہے۔ یہ لڑکی تو بہت ہی اچھے خاندان کی لگتی ہے۔“

حمیدہ بیگم نے حرا کو اچھی طرح لحاف اڑھاتے ہوئے پوچھا تو خان نے ساری بات بتادی۔

لیکن ماں جی! یہ اپنے گھر کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ بڑی مصیبت زدہ لگتی ہے۔ آپ اس سے پوچھ لیں۔ بتادے تو اسے اس کے وارثوں تک پہنچا دیجیے گا۔ ورنہ پھر کسی اچھی جگہ اس کی شادی کر دیجیے گا۔ اس کے

بارگرم کر بھی کیا سکتے ہیں۔“ خان شعاع کے لیے بہت پریشان تھا۔

”بیٹا۔ فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے وارث نہ ملے تو میرا تم سے وعدہ ہے۔ اپنی ہائے کو اس طرح اس کو بھی کھاؤ۔ اچھے گھر انے میں بیاباہ دوں گی۔ کتنی خوبصورت اور معصوم سی لڑکی ہے۔ نجات کن

نہ سے گزری ہے۔“

حمیدہ بیگم نے شفقت سے شعاع کے سر پر ہاتھ پھیرا جس کی آنکھوں میں اتنے رت جلوں کے بعد نیند

جوانے لحاف ہٹا کر عمیرہ کو دیکھ کر عمیرہ۔ ممنون نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ کیونکہ اتنی سردی میں کوئی نہ گرم بستر چھوڑ کر ایسا کام کرنے سے بڑا مہربان کون ہوگا۔

”کون ہے بھئی؟“ جوانہ۔ دروازہ کھولتے ہوئے خان کو دیکھا، جس نے چادر سے خود کو اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔

”اچھا اب اپنے خان! کو بھی بیس پہنچا ہو گئے۔“

”ارے خان! کیا آپ؟“ خان نے چادر ہٹائی تو جو اس سے لپٹ گیا۔ خان صرف عمیرہ کا دوست نہیں تھا۔ گھر کے فرد کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ اس کی آمد پر سب ہی جمع ہو گئے تھے۔

”اتنے عرصے بعد آیا ہے میرا بیٹا۔“ حمیدہ بیگم نے خان کو ساتھ لگا کر پیار کیا۔

”بس ماں جی! انسان دلدل میں پھنس جائے تو کھانا مشکل ہی ہوتا ہے۔“

”تم کوشش تو کرو خان! خدا دے گا۔“ عمیرہ خان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

”ہاں ضرور کروں گا لیکن فی الحال میں جو کہنا چاہتا ہوں، وہ سنو۔“

پھر خان نے شعاع کی جانب دیکھا جو سب کے لیے سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔

”یہ کوئی لڑکی ہے۔ میں نہیں جانتا۔ یہ کس گھر سے ہے گھر ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم نہ اس نے کچھ بتایا ہے۔ ماں جی! اسے میں نے ظہر پڑھ کر بہن کہا ہے تو اس نے اتنے ہی آپ کی بیٹی ہوئی۔“

”اور میری بہن۔“ عمیرہ نے بڑے بھائی کی حیثیت سے شعاع کے سر پر ہاتھ رکھا تو بے شمار آنسو بند توڑ کر بہہ نکلے۔

”ارے میری بیٹی کتنی پیاری ہے۔ یہ آنسو کیوں؟ ماں کے ہوتے ہوئے۔“

حمیدہ بیگم نے شعاع کو ساتھ لگا لیا تو دل کا درد ہچکیوں میں ڈھل گیا۔ سب ہی پریشان ہو گئے۔

”بس ماں جی۔ اس کے پاس ہر بات کا جواب یہ آنسو ہی ہیں۔ آپ ہی اس سے پوچھیں۔ مجھے تو کچھ بتاتی نہیں۔“ خان بتا رہا تھا اور شعاع جیسے زمین میں گڑے جا رہی تھی کہ کیا سوچ رہے ہوں گے یہ سب کہ کیے

کر! ارکی مالک ہے یہ لڑکی، اور اس کا یہ خیال درست بھی تھا۔ عمیرہ کی بیوی رضوانہ اور بہن شمرہ نے بڑے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا تھا جبکہ چھوٹی نمروہ کو شعاع بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اور اس پر ترس بھی آ رہا تھا۔

اس وقت جو شعاع کے دل پر بیت رہی تھی۔ یہ وہ ہی جانتی تھی۔

”خیر۔ کوئی بھی ہو۔ اس گھر میں یہ میری بیٹی کی حیثیت سے داخل ہوئی ہے اور بیٹی بن کر رہے گی انشاء اللہ۔ کتنی پیاری ہے میری بیٹی۔ کیا نام ہے؟“

حمیدہ بیگم نے محبت سے کہا۔

”جی حرا۔“ جلدی میں بس یہی نام ذہن میں آیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ویسے بھی اس کی ختم ہو چکی تھی۔

”ماشاء اللہ بہت پیارا نام ہے۔ لڑکیو! چلو۔ اب کھانا گرم کرو۔ میرے بچوں کے لیے۔ پھر بستر لگا دو۔ سردی میں آئے ہیں۔“

حمیدہ بیگم نے شعاع کو جسے تقدیر نے شعاع سے حرا بنا دیا تھا۔ اپنے بستر پر بٹھا کر لحاف اڑھا دیا اور واقعی چھپ جانا چاہتی تھی سب کی نظروں سے۔

اتری تھی۔

”یار خان، پہلے تو چلو انجان تھے تم۔ تمہیں ان لوگوں کے کاروبار کا علم نہیں تھا مگر اب تو جان چل گیا ہے۔ چھوڑ دو ان کو واپس مت جاؤ۔“ عمیر نے خان کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ دھکی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”میرے بھائی! اپنا بھی تو مجھے اس وقت چلا ہے جبکہ ان کا ہاتھ میری گردن تک پہنچ گیا ہے لیکن بائیں جب بھی مروں گا تو ان کو ساتھ لے کر مروں گا۔ بس یہ۔۔۔ بھیا۔ حق دوستی اگر بھٹاتا ہے تو اس لڑکی کا خیال رکھنا۔ میں نے خدا اور رسول کو گواہ بنا کر اسے بہن کہا ہے اور یہ تمہارا ذمہ داری ہے۔“

”اچھا یار! میں بھی خدا اور رسول کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہ میری بہن، میری ذمہ داری ہے۔ بس آپ اعتبار۔“

عمیر نے غلوں سے خان کو دیکھ کر وہ یوں پرسکون ہوا جیسے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ شعاع کو رات بھر ہوش ہی نہ رہا۔ کہیں نہ جاتی ہے۔ جب فجر کے وقت آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور حیران نظروں سے کمرے کو دیکھنے لگی۔ وہ خواب میں اپنے حرم تھی۔ اپنے بستر پر تھی۔ وہ اس خواب کی کیفیت سے لکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن جب خواب کا حرم نہ تھا تو۔۔۔

”اف میرے خدا! اپنا گھر تو خواب ہوا۔“

وہ نیچے پر سر رکھ کر حذت سے رو پڑی۔ حمیدہ بیگم نماز کے لے اٹھ چکی تھیں۔

”ارے حرا بیٹے! اٹھ گئیں۔“ وہ اسے بیٹھا دیکھ کر پیار سے بولیں۔

”جی نماز کے لیے ابھی ہوں۔“ اس نے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”ماشاء اللہ۔ شاباش۔ بڑی نیک بچی ہے میری۔ اٹھ جاؤ۔ میں جو لمبے پر پانی رکھ آئی ہوں۔ گرم ہو گیا ہوگا۔“

شعاع آہستگی سے باہر آگئی۔ خرمی نیم روشن ترنیں چھونے سے صحن میں اتر رہی تھیں۔ وہ وضو کر کے اندر آگئی۔

”لو بیٹی آ جاؤ۔ میں پڑھ چکی۔“ حمیدہ بیگم تسبیح پکڑ کر بستر پر آگئیں تو شعاع نماز پڑھنے لگی۔ جب وہ اپنے بچے کے حضور سجدہ ریز ہوئی تو ضبط کا یا ر اندر رہا۔ وہ بچے خالق حقیقی کے سامنے بکھر کھڑی۔ اس کی ہچکوں نے حمیدہ بیگم کو کھینچ لیا۔

”حرا بیٹی! تمہیں کیا دکھ ہے؟ میں ماں ہوں۔ ماں کا سینہ سمندر ہوتا ہے بیٹی۔ اس میں اولاد کی محبت بھی ہوتی ہے اور ان کے دکھ درد، کمزوریاں، معاف کرنے کا ظرف بھی ہوتا ہے۔ مجھے تاؤ۔ تم کون ہو اور یوں بے فکر کیونکہ ہوئیں؟“ حمیدہ بیگم عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ شعاع کے آنسو انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے ساتھ لگایا تو وہ مشفق ماں سے کچھ بھی چھپانہ سکی۔

”لیکن امی! آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ آپ مجھے لوٹ کر جانے کو نہیں کہیں گی۔“

پھر شعاع نے جان تا توں پر گزرنے والی وارداتوں کا حوالہ بنا ڈالا۔

”ہائے میری بیٹی! اتنا اتنا کچھ برداشت کرتی رہی مگر بیٹے! تم تو بالکل بے قصور ہو پھر۔“

”نہیں امی جان۔ میں لاکھ بے گناہ سہی، لیکن سیدہ آئی اور ہوئی۔ اف نہیں۔ امی میں مرنے لگتی ہوں۔“

لی جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر آپ مجھے بیٹی سمجھ کر سینے سے لگا سکتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ان ہی ہاتھوں پر ہلاک باد بھیجے۔ آپ کو کیا خبر امی جان۔ ان ماں بیٹے کی نظروں میں، میں کیا تھی اب تو اور بھی میرے کردار کا کیا کچھ نہ کہا ہو گا انہوں نے۔ کتنا گرو آلود ہو گیا ہو گا میرا کردار، ان سب کی نظروں میں، میرے آغا جی، لیجان بھانے کیا حال ہو گا ان کا۔ یا خدا۔ مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی۔“

شعاع حمیدہ بیگم کی گود میں مائی بے آب کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ انہوں نے لاکھ لپاں دیں مگر وہ واپس جانے کو تیار نہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ سب کی نظروں میں گر چکی ہوگی۔ اس لیے ہی ان کا تصور موت سے بھیا تک تھا۔ حمیدہ بیگم سوچ رہی تھیں کہ اب کیا حکمت سے عملی اختیار کی جائے۔

”امی جان! آپ کو یاد ہے ناں۔ آپ نے خدا کو حاضر ناظر جان کر مجھے بیٹی کہا ہے۔“

”ہاں بیٹی! اس میں کوئی شک ہے تم شرمہ و نمرہ کی طرح ہو۔“

انہوں نے اس کے ترچہ پر پرچکے ہوئے بال بٹاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر وعدہ کریں۔ میرے دکھوں کو صرف اپنے تک محدود رکھیں گی۔ اپنے بچوں کو میرے بارے میں نہیں بتائیں گی۔“ اس نے حمیدہ بیگم کے ہاتھ تھام لیے۔

”میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ حتیٰ کہ عمیر کو بھی نہیں بتاؤں گی۔ میرا اعتبار کرو۔ تم اگر واپس جانا نہیں چاہتیں۔“

”جی۔ آج سے تم میری تیسری بیٹی ہو۔ اور تم بھی میری ممتا میں فرق محسوس نہیں کرو گی۔“

انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ خدا نہ کرے جو میرا اعتبار مجرد ہو۔ میں تو مر جاؤں گی امی جان۔“

”خدا پھر بھر دیا رکھو بیٹی۔ وہی انصاف کرنے والی ذات ہے۔“

شعاع پرسکون ہو گئی کتنے دنوں بعد سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ قیامت جو گزر چکی تھی۔ اس کی جاہ کاریاں تو داعی ساتھ رہیں گی۔ مگر وقتی طوڑ پر جو خدا نے ایک پناہ گاہ ماں کی صورت میں دی تھی۔ اس کے لیے وہ خدا کی لڑکھاری تھی۔

”امی جان! انا شاکستار ہے اور حرام نے ہاتھ منہ دھو لیا ہو تو آ جاؤ۔“

رضوانہ پہلی بار شعاع سے مخاطب ہوئی تھی۔ شعاع خاموشی سے اس پیاری سی نازک سی لڑکی کو دیکھنے لگی۔

”لو۔ وضو کر کے نماز پڑھ چکی ہے میری بیٹی! تم لوگوں کی طرح نہیں ہے بے نماری۔ آؤ حرا بیٹی، ناشتا کریں۔“

ناشتے پر سب ہی موجود تھے۔ شعاع اپنے چہرے پر سب کی نظریں محسوس کر رہی تھی جن میں اس کے حلق بہت سے سوالات تھے۔ کیا تم تھا کہ وقت نے اسے سوال بنا ڈالا تھا۔ سب کے لیے۔ خان نے خاص لہر شعاع کو دیکھا جس کے چہرے پر اب کھینچاؤ اور تاؤ قدرے کم تھا۔ وہ بھی پرسکون ہو گیا۔ ناشتے کے بعد خان نے واپسی کی تیاری پکڑ لی۔

”حرا بہن! میں تمہیں اپنی ماں اور بہن کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر میں دو ہفتوں کے اندر اندر آیا تو ٹھیک ورنہ۔ ورنہ پھر سمجھ لینا کہ تمہارا خان بھائی کام آ گیا۔“

”خدا نہ کرے خان بھائی۔ آپ نے اور رجونے میرے ساتھ جو کیا ہے اس کا ثمر آپ کو اللہ ہی دے گا۔“



خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے بخیر۔ اگر ممکن ہو تو آپ رجو کو لے کر یہاں آ جانا پھر ہم تینوں بہن بھائی زندگی کی ابتدا کریں گے۔“

شعاع کی آنکھوں میں قدیلیں سی روشن ہو گئیں۔

”ہاں۔ تم دعا کرنا۔ میرے سب تو ہیں ہی میرے لیکن اب تمہارے بھی ہیں۔۔۔ امید ہے۔ تم یہاں فخر رہو گی۔ اب میں چلتا ہوں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“

خان نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل گیا تو شعاع کو یوں لگا جیسے اب وہ اس شہر کبھی نہ جاسکے گی جہاں اس کا سب کچھ تھا۔ اب تو شاید ان کو بغیر دیکھے ہی زندگی گزارنی ہو گی۔ اف کتنا اذیت ناک تھا یہ احساس۔



علینہ کی زندگی کا یہ بڑا حیران کن اور دلچسپ تجربہ تھا جو بات اس کے لیے اکثر حیرت اور الجھن کا باعث بن جایا کرتی۔ وہ شعاع کا ہم شکل ہونا تھا مگر آئی طاہرہ اسے سمجھا دیتی۔

”دیکھو علینہ! جب ایک بار سمجھا دیا تو بار کیوں اس مسئلہ پر الجھتی ہو۔ بس جو کام تمہارے ذمہ لگایا ہے۔ وہ انجام دو۔ اس لڑکی کے آنے تک۔ اور یہ بڑا نیک کام ہے کسی کی عزت رکھنا۔“

”لیکن آئی! سمجھ میں نہیں آتا۔ اتنی تجنّیس چھوڑ کر آخر غور ہی کیوں؟ ایسی کیا بات ہوئی تھی۔“

”ہاں یہ بات قابل غور ضرور ہے لیکن تم اس میں مت الجھو۔ اپنا کام دھیان سے کرو۔ اب تو تمہیں کوئی پرابلم نہیں ناں۔ سب سے تعارف بھی ہو گیا ہے اور۔“

”جی آئی! مائی تو سب ٹھیک ہے اور زیادہ مدد شعاع کی ڈائری سے مل رہی ہے۔ اس کے مطابق اس کی آئی سیدہ اور ہونی کا رویہ اس کے ساتھ لگتا ہے۔ زیادہ ہی خراب تھا تب ہی اس نے رو رو کر ذکر کیا ہوا ہے۔ ہونی صاحب کو تو میں نے آج تک دیکھا نہیں۔ البتہ آئی سیدہ واقعی بڑی خوشنوا قسم کی ہیں۔ انہی کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھتی ہیں کہ مجھے بھی غصہ آ جاتا ہے۔ تو بے چاری شعاع تو۔ لیکن آئی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے روپنے کے جواب میں شعاع کا کیا رد عمل ہوا کرتا تھا۔ تاکہ میں بھی دیا ہی رکھوں۔“

واقعی علینہ کے لیے یہ بات بڑی الجھن پیدا کرتی تھی کہ شعاع کا رویہ کیا ہوتا تھا۔

”ویسے بیگم لقمان تو بتا رہی تھیں کہ شعاع بڑی خاموش طبع اور ظلم سہہ جانے والی لڑکی ہے۔ تب ہی تو اتنے عرصے سے جی کی باتیں برداشت کر رہی تھی۔“

”خیر آئی! غلط بات میں تو برداشت نہیں کروں گی۔“ علینہ کو غصہ آ گیا۔

”احتیاط سے بیٹا۔ بہت احتیاط سے۔“

”اچھا آئی جان۔ فکر نہ کریں۔ خدا حافظ۔“

ریسپور کہ علینہ کیلے بالوں میں برش کرتی کھڑکی کے پاس آگئی۔ موسم بڑا سہانا ہو رہا تھا۔ اس کا پیچھا رہا تھا۔ باہر لان میں جائے جہاں خوبصورت پھول موسم کو مزید حسین بنا رہے تھے۔ علینہ پھولوں حسن میں کوئی شئی کہ دروازے پر ہلکی سی دھک ہوئی۔

”آ جاؤ بھی۔“ شرجی۔ بولی ہوں گے۔ اس نے سرخ روپہ شانوں پر پھیلایا۔ اب وہ ان کی ہنسنے لگی۔

رہا سنہ وہ ایک سحر انگیزی شخصیت کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کتنا پر وقار سا بندہ ہے۔ کون ہے؟ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

”یہ کون سی ادا ہے جناب کہ اتنے دنوں بعد آیا ہوں اور نہ آداب نہ سلام۔“ راجشوک شوق آواز کو فحشی تو وہ

”راشوک آپ۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ نظر میں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ دل ایک نئے ہی انداز

پر گھومنے لگے دنوں سے اسے جس ہستی کے ساتھ منسوب کیا جا رہا تھا، چھیڑا جا رہا تھا۔ آج وہی ہستی رو برو آئی

دل کے دھڑکنے کا انداز ہی بدل گیا۔ وہ حیران سی رہ گئی تھی۔ پتا نہیں شعاع کا کیا رد عمل ہوتا تھا۔ یا ہونا چاہیے

لہو دھڑکنے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

”نہ ہے نصیب! میرا نام تو آیا تمہارے ہونٹوں پر۔“

شعاع کے چہرے پر پھل جانے والی دھک اور صبیح رخساروں پر لرزتی پلکوں کا عکس راشوک کے دل کا شہر

دول سے سجا گیا۔ اب علینہ کو اپنی حرکت پر ندامت محسوس ہو رہی تھی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ وہ بمشکل بول پائی۔ وہ بار بار ہاتھوں کو آپس میں انبھا رہی تھی جس سے اس کی

دولتی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”میں تو خیر جیسا بھی ہوں۔ تمہاری چوٹ اب کیسی ہے۔“

راجشوک کی شفاف پیشانی پر ٹانگوں کے نشانات کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہوں اب تو۔“

علینہ کا ہاتھ بے ساختہ اپنی پیشانی پر چلا گیا۔ یہ چوٹ بھی اس کی زندگی کی اہم ترین چوٹ ثابت ہوئی

”میں تاریخ تک بالکل ٹھیک ہو جائیے گا۔“ راجشوک۔ داجا رہا تھا۔

”کیوں میں کو کیا ہے؟“ اب بے چاری علینہ کو کیا خبر کہ اس تاریخ کیا اہمیت رکھتی ہے۔

”اچھا جی تو یہ بھی بھول گئیں۔ خیر۔ اطلاع عرض ہے کہ ہاری مگنی ہے۔“

”جی۔“ علینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”جی اف میرے خدا! شعاع شریہ پارٹی میںیں آ رہی ہے۔ اب دیکھنا پچھڑ پچھڑ کرنا کہ میں دم نہ دیں

میرا خیال ہے، میں چلتا ہوں۔ میں کہہ کر آیا تھا کہ آغا جی کے کمرے میں جا رہا ہوں مگر قدم خود بخود ادھر اٹھ

راشونے شوقی سے اس کی پھلی آنکھوں میں جھانکا تو وہ ڈگمگاسی گئی۔

”جی مجھے کیا پتا۔ میں ہی چلی جاتی ہوں۔“

علینہ بولکھڑا کر ہانگی تو تیزی سے اوپر آتے ہوئے جا کر لائی۔

”خواسوں میں رہا کرو۔ راشونی آیا ہے کوئی بادشاہ تو نہیں آگیا۔ زہر لگتا ہے یہ چھوڑ پکڑ مجھے راشونہ ہوا کو پتا۔“

”ہوئی!“ اس سے قبل کہ ہوی کے لہجے کا زہر شعاع کی رگوں کو کاٹتا راشو باہر آگیا۔ علینہ تو بس پہلے آنکھوں سے اس خود مردوہ جذبہ کی شخصیت رکھنے والے ہوی کو دیکھ رہی تھی جس کے کھیلے لہجے نے آگ بھڑائی اس کی آنکھوں میں۔

”ہوی! تمہیں شعاع سے اس لہجے، اس انداز میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔“

”کیوں اب شعاع صاحبہ کے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں۔“ ہوی کا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔

”اس لیے کہ شعاع اب میری عزت ہے اور تمہیں اس سے اس انداز میں بات کرنے کا اجازت نہیں دے سکتا۔“ راشونے خود پر ضبط کرتے ہوئے بڑے مضبوط اور سخت لہجے میں آہستگی سے کہا۔

”ہونہ! پہلے مٹکھو! تو کرو اور پھر حق بتا لینا۔“

ہوی نے جھپتی نظروں سے شعاع کو دیکھا اور پھر راشو کو گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ راشونے مرکز شعاع کو دیکھا جس کی آنکھوں کے کنارے ہلکے چمکے تھے۔

”چھوڑے شعاع باجی! یہ ہوی بتایا تو ہیں ہی جلس میرے بھتیجے۔“

صدف بھی سب سن چکی تھی۔ شعاع کی دل جوئی کے لیے آگے بڑھی۔

”نہیں صدف۔ تم جاؤ۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

علینہ صدف کے اصرار پر بھی اس کے ساتھ نہ گئی اور آ کر لیٹ گئی۔ وہ سوچنا چاہتی تھی۔

”اف۔ کتنا خراب ماحول ہے اس گھر کا۔ تو یہ ہوی صاحبہ تھے کتنی اچھی پرستش اور کتنا غلط رویہ۔ کتنی دشوار تھی شعاع کی زندگی یہاں پر۔ ہوی کی ایک بات ہی باقی سب کی محبتوں کو ختم کر ڈالتی ہوگی۔ میں تو غیر ہوں پھر بھی مجھے یہ سب برداگ ہے اور شعاع کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ برداشت کرتی ہوگی اور جانے کب سے۔ لیکن پھر بھی کتنی حیرت کی بات ہے کہ شعاع ہوی ہی کو چاہتی تھی۔ ہوی کو روح کی خدمتوں سے چاہنے کے باوجود وہ راشو سے مٹکھی پر آمادہ بھی میرے خیال میں ہوی کی کج ادائیگیوں کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ لیکن راشو تو پوری سچیگی اور سچائی سے چاہتے ہیں شعاع کو۔“

اپنی ذمہ ساری سوچوں میں بس یہی ایک خیال تھا جس نے علینہ کو مضطرب کر دیا۔ ایسی بات بھی نہیں تھی کہ وہ دیکھتے ہی راشو پر مڑتی ہو۔ لیکن اتنے دنوں سے جو نام سن رہی تھی۔ جس کا نام لے لے کر اسے جھپٹا جا رہا تھا۔ اس سے جذباتی وابستگی ضرور ہو گئی تھی۔ وہ اسے محسوس کیے بغیر بھی نہیں رہ سکی تھی۔ جذبات احساسات کے اس کمبل کو سمجھ نہ سکی۔

”یا اللہ یہ کس امتحان گاہ میں لا ڈالا تو نے۔ میں کیونکر بھاپاؤں گی یہ سارے معاملات۔ جانے شعاع کیسے رہ رہی تھی اس ماحول میں۔ ان لوگوں کو اصل صورت حال کا علم ہوگا تو کیا سوچیں گے میرے بارے۔ خدا ہی جانے کیا راز ہے۔ آنٹی اتنی پرسکون کیوں ہیں۔“

وہ ان ہی سوچوں میں غلطیاں تھی کہ شنو اور صدف آگئیں۔

”شعاع باجی جلدی سے تیار ہو جائیے۔ ہم لوگ گھومنے جا رہے ہیں۔ جلدی کریں۔“

”صدف وہ۔“ اس نے انکار کرنا چاہا مگر دونوں اس کے سر ہو گئیں۔

”جی نہیں۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں۔ پتا ہے راشو بھتیجے اتنے دنوں بعد آئے ہیں اور جناب بھتیجے نے یہ اگرم بتایا ہی آپ کی خاطر ہے۔“

”میرے لیے۔“ علینہ نے حیرت سے ان کو دیکھا۔

”جی۔ آپ کیا جانیں۔ بھتیجے آپ کو کس قدر چاہتے ہیں۔“

شنو نے کچھ ایسے کہا کہ علینہ کی نظریں آپ ہی جھک گئیں وہ اٹھ کر تیار ہونے لگی۔ لیکن گھر کے سوت میں اس کا ایک آپ کر کے وہ نیچے آئی تو سب سے پہلی ملاقات ہوی سے ہوئی۔ ہوی نے گہری نگاہ اس کے سینے پر ڈالی تو وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ علینہ تھی۔ شعاع تو نہیں تھی۔ جس کے دل میں اس کی بات تھی۔ وہ اسے کوئی اہمیت کیوں دیتی۔ اس کی یہ لاپرواہی ہوی کے دل میں ٹیس بن کر ابھری۔ اس نے زور سے کڑی گھبراہٹ ماری اور آگے بڑھ گیا۔ شعاع زیر لب مسکراتی ان کی طرف آگئی۔

”راشو بھتیجے! اب تو چلیے۔ اب تو وہ شاہکار بھی آگیا جس کا انتظار ہو رہا تھا۔“ یاسر نے شعاع کو آتے دیکھ کر کہا۔

”بھئی اشعر۔۔ تم بچوں کو ذرا گھملا لاؤ۔ میرا موڈ نہیں ہو رہا جانے کا۔“

راشونے اچانک ہی جانے سے انکار کر دیا۔ سب نے چونک کر راشو کو دیکھا۔ علینہ کے چہرے پر عجیب سا مایہ لہر گیا اور راشو یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ علینہ کا دل خراب ہوگا۔ وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن اب انکار کرنا بھی لگتا چاہتی تھی چنانچہ خاموش ہو رہی۔

”ٹھیک ہے۔ نہیں جاتے تو نہ جاؤ۔ چلو ہمیں بچو۔ شمس جاؤ گاڑی میں آؤ شعاع۔“

اشعر نے اٹھتے ہوئے کہا تو راشو کو غصہ آگیا۔

”یار! تم تو ہوی ذلیل آدمی۔“ راشونے اشعر کو مکہ مارا۔

”ہوں۔ دیکھا آگیا ناں لائن پر۔“ اشعر نے براہ راست شعاع کو دیکھا تو وہ حینپ گئی۔ علینہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی اتنے خوبصورت روپ میں اسے مل سکتی ہے۔ اب اس کی گھبراہٹ، دوسو سے ختم ہو چکے تھے۔ وہ خود کو شعاع ہی سمجھنے لگی تھی۔ اب تو وہ سب کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ ہاں ایک بات کی اسے بہت اذیت لگ رہی تھی۔ وہ مل کی احتیاط تھی۔ شعاع کے تو قدرتی قل تھا مگر اسے مصنوعی قل کا سہارا لینا پڑتا تھا اور سب سے اہم تو راشو کی شخصیت تھی۔ وہ خود حیران تھی کہ زندگی میں اچانک آ جانے والا خود بوسا یہ شخص کتنا اپنا اپنا سا لگنے لگتا۔ یوں جیسے صدیوں سے وہ اسے جانتی ہو۔ اسے چاہتی ہو۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک انجان سا شخص اس کی زندگی میں آ کر اتنا معتبر ہو جائے گا۔ راشو کی گہری نگاہیں اس پر انھیں تو اس کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگتیں اور خساروں پر جو دھنک اترتی وہ راشو کی نظروں سے اوجھل کہاں رہتی اور یہ بات علینہ جانتی تھی کہ اس کی پلکوں کی انھیں اس کے رخساروں کے رنگ راشو کی متاع حیات ہیں۔ راشو اس تبدیلی پر خوش بھی تھا اور حیران بھی۔

”یار! اشعر، شعاع کی تبدیلی بڑی حیران کن ہے میرے لیے۔“

”تمہیں ہی اپنے جذبول کی صداقت پر اعتبار نہیں تھا۔ اب تو خوش ہوتا۔“

”ہاں یار پہلے تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں اس پر مسلط کر دیا گیا ہوں۔“

سعادت مندی میں..... مجھے قبول کر رہی ہے۔ اب میں خود کو ہلکا چمکا سامھوس کرتا ہوں۔“

راشود اسی بہت خوش تھا شعاع کی تبدیلی پر۔ اشعر را شود اور ہوی کا مشعر کہ کہ کزن بھی تھا اور دوست بھی۔

وہ دونوں کے دل کی حالت بھی جانتا تھا۔ ہوی کے دل سے بھی واقف تھا۔ اسے لیے راشو کی خوشی میں خوش تو رہا

ہوی کا بھی دکھ تھا جو اپنی ماں کی لگائی ہوئی آگ میں جل رہا تھا۔ شعاع میں تبدیلی سب نے نوٹ کی تھی۔ اب

ہر بات میں گل کر حصہ لیتی تھی۔ خصوصاً جب ہوی بھی موجود ہوتا تو وہ راشو کی طرف جھکاؤ ظاہر کرتی جو کزن

کے دل کی خواہش ہوتی مگر ہوی بس پہلو بدل کر رہ جاتا۔

اس روز شعاع لائنٹ سے پنک سوٹ پر سیاہ شمال لیے ہوئے آئی تو بوبی چڑ گیا کیونکہ اسے پنک کمر پزیر

نہیں تھا۔ اس لیے وہ گھر کی لڑکیوں کو بھی یہ کھرا استعمال کرنے سے روکتا۔

”شعاع باجی لگتا ہے آپ کو پنک کمر بہت پسند ہے۔“

”نہیں تو۔“ شعاع سادگی سے بولی۔

”تو پھر اس کو کثرت سے کیوں استعمال کرتی ہیں؟“

”شاید اس لیے کہ راشو کو بہت پسند ہے۔“

راشو کا نام لیتے ہوئے کئی رنگ اس کے خوبصورت چہرے پر اتر آئے تو ہوی نے کھا جانے والی نگاہوں

سے شعاع کو گھورا۔

”یہ تم کو کیا ہر وقت راشو، راشو کی رٹ لگائے رکھتے ہو۔ کس کو جلاتی ہو اس کا نام لے کر؟“

”جو اس سے جلنے کا اظہار کر رہا ہے۔“

شعاع نے نہایت مضبوط لہجے میں کہا اور اعتماد سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ہوی نے زور

سے دیوار پر مکا مارا۔

”یہ کیا پچپنا ہے ہوی۔“ اشعر نے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”مجھے نفرت ہے اس لڑکی سے۔“ ہوی کسی کا بھی خیال کیے بغیر دھاڑا۔

”کاش یہ سچ ہوتا۔ تم اس لڑکی سے نفرت کر سکتے۔“

اشعر نے دکھ سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں گہری دھندلاتی ہوئی تھی۔

”میں یہ سچ کر دکھاؤں گا۔“ ہوی راستے کی ہر چیز کو ٹھوکر مارا تا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں آ کر دھڑ سے اس نے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر گر گیا وہ ذہنی طور پر بہت پریشان ہو رہا تھا اس

سے پہلے تو شعاع نے کبھی راشو سے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اب تو۔

کیوں ہوا یہ سب؟ میں نہیں رہوں گا اس گھر میں۔ شعاع فرمان، میں تمہیں راشو کی ہونے نہیں دیکھ سکتا۔

میں کیا کروں۔ میں کیوں ہو گیا ہوں ایسا۔ میرے ہی ساتھ ایسا کیوں ہوا۔

قریب تھا کہ ہوی کی منتشر سوجھیں جنون کی شکل اختیار کر گئیں۔ دروازے پر دستک ہوئی اس نے آنکھوں

پر سے بازو ہٹا کر دیکھا تو اشعر تھا۔ وہ آہستگی سے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ وہ اس کے قریب بیٹھا تو ہوی

پڑا سے کھڑا ہو گیا۔ اسے اب قلم سے اشعر سے بھی چڑھنے لگی تھی۔

”اشعر پلیز۔ اس وقت مجھے کوئی لکچر نہ دینا۔ تمہا چھوڑ دو مجھے۔“

ہوی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا مگر اشعر اس کے پاس آ گیا۔

”ہوی! ختم کرو اب یہ سب، یہ نفرت کسی کا کچھ نہیں بگاڑ رہی سوائے تمہارے اپنے آپ کے۔ تم کیوں

اچھے ہو کہ گھر بھر کو پتا چلے کہ تم شعاع کو چاہتے ہو۔ اس طرح تمہاری نفرت نہیں چاہت عیاں ہوگی اور ظاہر ہے

لانا اور راشو ایک دوسرے کو۔“

”اشعر پلیز۔“ ہوی درمیان ہی میں دھاڑا مگر اشعر بالکل متاثر نہ ہوا۔

”ہوی میں تمہیں حسد، نفرت کی آگ میں جل کر ختم نہیں ہونے دوں گا۔ چلو میرے ساتھ۔ اشو شاہاش

پا جانے تو بیزار غرق کر کے رکھ دیا ہے تمہارا۔ نہ خود سکون سے رہتی ہیں اور نہ تمہیں رہنے دیتی ہیں چلو گھومنے

لیں۔ مجھے ذرا شاہچنگ کرنی ہے اشو پلیز۔“

اشعر کئی دیر اسے سمجھا تا رہا۔ وہ بھی بہت الجھا ہوا تھا۔ کچھ اپنی زیادتی کا احساس تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہویا

اشعر نے اسے سارا اشعر ہی گھما ڈالا اب اس کا موڈ کافی حد تک فریش تھا اشعر اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

”ہوی کیا خیال ہے سمندر پر چلیں۔ ساحل پر ڈوبتے سورج کی کرنوں کا نظارہ بڑا دلکش ہوتا ہے۔“

اشعر نے خریدار ہوا سامان گاڑی کی بچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ لیکن اشعر ذرا دیکھنا یہ ابوی ہیں ناں۔“

ہوی نے کافی فاصلے پر دیکھتے ہوئے ایسے پوچھا جیسے اسے شبہ ہو، اشعر نے بھی اسی سمت دیکھا۔

”ہاں یار ہیں تو چچا جان ہی لیکن یہ لڑکی کون ہے؟“

اشعر کی نظریں رحمن کے ساتھ کھڑی پیاری سی لڑکی پر ٹھہر گئیں جو دو پکٹ تھاے گاڑی کا دروازہ کھلنے کی

غرضی ہوی کو عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

”چلو ہوی۔ چلیں چچا جان کے پاس۔“

اشعر نے گاڑی لاک کرتے ہوئے کہا مگر ہوی کے قدم بہت بھاری ہو رہے تھے نجانے کیوں اندر کچھ

لٹے لگا تھا۔ اور اس سے قبل کہ وہ لوگ سڑک کر اس کر کے ان تک پہنچنے رحمن گاڑی نکال چکے تھے۔

”یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے بڑی انجان سی لڑکی ہے۔“

ہوی اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے کسی دوست کی بیٹی ہو اس میں الجھنے کی کیا بات ہے۔“

اشعر نے لاپرواہی سے گاڑی اشارت کر دی۔

”اشعر کیا خیال ہے۔ دیکھنا نہ جائے اب لڑکی کو کہاں ڈرا پ کرتے ہیں۔“

”یعنی جاسوسی کی جائے۔“ اشعر نے مسکرا کر اسے دیکھا مگر وہ نظریں چرا گیا۔

ہوی کے اصرار پر اشعر نے گاڑی رحمن صاحب کی گاڑی کے پیچھے لگا دی اور اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں

لٹا نظر نہ ان دونوں پر پڑ جائے۔ پھر رحمن کا گاڑی پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کے علاقے میں داخل ہوئی اور

بلکہ ضرورت سی کوئی کے سامنے جاڑی اشعر کے منع کرنے کے باوجود ہوی بھی آہستگی سے ندر آ گیا۔ اتنی

باقی رہی کہ اپنے گھر، اپنے باپ کے گھر جاتی۔ بہن بھائیوں کی بھینس سینٹی۔ جائے۔ ابو آپ کے گھر میں آپ کے بیوی بچے آپ کے گھر ہوں گے جائے پلڑے۔“

”یعنی جی ٹی تم بھی ناراض ہو گئیں تو تمہارا باپ کچھ نہ کر سکے گا۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ۔“

”ہوی! خود پر قابو رکھو۔ یہ کیا کر رہے ہو ہوی۔ ہوش میں آؤ۔“

ہوی کے لیے یہ حقیقت برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا خشکی کے باوجود وہ پیسے میں نہا گیا۔

”اشعر۔ اشعر۔ کہو کہ یہ جموت ہے خواب ہے۔ ہنجومز ڈالو مجھے اس خواب سے میرا دم گھٹ رہا ہے ریکام نے بھی وہی کچھ سنا ہے جو میں نے سنا ہے۔ کہو نکس، یہ میری ہی ساتوں کو دھوکا ہوا ہے میں نے ہی غلط سنا۔ اشعر۔ اشعر۔“

ہوی کو بالکل بھی خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ ایک جوان بیٹا اپنے باپ کی دوسری شادی کا سن کر جواز نہت دیں کر سکتا تھا۔ وہ ہوی کر رہا تھا۔ شرم نہ مات سے اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ اشعر کی حالت اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ رخصت اٹھ کر کو اس نے آئینہ دیکھا..... سمجھا ہوا تھا گھر میں اسن و سکون کا سہل تھے رخصت اٹھ کر اس نے انکشاف کا اسے بھی بہت صدمہ ہوا تھا۔ وہ دونوں باہر قیامت خیز گھڑیوں سے گزر رہے تھے باہر

پانی آوازوں کو سن کر رخصت چونکا سے ہو گئے۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو ہوی اور اشعر گویا پتھر کے ہو گئے۔ اور اشعر کی سوالیہ نگاہیں ان پر اٹھیں تو ان کی حذت سے خواہش ہوئی کہ سینے میں دبا ہوا سانس باہر نہ آئے یا زمین پر مہربان ہو کر اپنا سینہ چاک کر دے تو وہ اس میں چھپ جائیں لیکن کچھ بھی تو نہیں ہوا وہ یوں ہی زندہ ات مجسم نہ مات بنے گھڑے تھے۔

ہوی اور اشعر کی حالت سے صاف لگ رہا تھا کہ..... انہوں نے سب کچھ سن لیا ہے پھر فرار ہونا بھی بے فائدہ۔ ان کی انگلیں کانپ رہی تھیں وہ بس اب گرے کہ تب کرنے والی کیفیت میں تھے۔

”ہوی..... بیٹے..... ان کی آواز کسی گھرے کتوں سے آئی۔“

”ابو..... ابو یہ کیا کیا..... آپ نے ابو آپ کو میرا مان تھے۔ ابو یہ کر دیا آپ نے۔“

اب ہوی سے ضبط کا یار نہ رہا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا اور رخصت جوان بیٹے کے دکان میں خود کو ڈوبتا ہوا محسوس کرنے لگے۔

”چچا جان۔“

”ابو جان۔“ رخصت توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ اس کے ایک طرف کو جھکے تو یعنی اور اشعر ایک ساتھ رخصت کی پیڑھے۔

”چچا جان۔ خود کو سنبھال لے آپ، پلین پانی لے کر آئیے۔“

اشعر نے رخصت کو بیڈ پر لٹاتے ہوئے یعنی سے پانی لانے کو کہا وہ تیزی سے باہر گئی۔

”اشعر بیٹے۔ مجھ سا بد نصیب بھی کوئی شخص ہو گا جو اپنی ہی اولاد کی نظروں سے گر گیا ہو۔“

رخصت بالکل بے حوصلہ ہو رہے تھے۔ نہ مات کے آنسوؤں سے چہرہ اتر رہا تھا۔ ان قیامت خیز لمحوں کی اسے گزرنا پڑا نہ سکے۔ اتنا تو وہ جانتے تھے کہ اتنی غیر متوقع کردہ سبب بھی نہیں پائے۔

”چچا جان! فی الحال آپ کچھ مت بولے۔ یہ پانی پی لیجیے۔“

تعلیم کو چھوڑ کر..... 458

بڑی کوشش میں ہر طرف ویرانی سی تھی۔ لان میں ہر طرف گھاس پر سوکھے پتے گرے ہوئے تھے پورے۔

”یار ہوی! غلط بات ہے۔ نجانے کون لوگ ہیں اور پھر اگر بچان جان کی نظر ہم پر پڑ گئی تو کیا خیال کریں گے کہ ہم ان کی جاسوسی کر رہے ہیں مت جاؤ آگے۔“

اشعر نے ہوی کو روکا جواب کو بڈور میں آگیا تھا یوں لگ رہا تھا یہاں کوئی ہے بخیر نہیں اشعر بھی وہ نہیں اس کے سامنے آگیا۔ سنسان ویران کوشی عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ ہوی کی تو عجیب سی حالت ہوئی تھی۔ اشعر کا دل بھی خراب ہونے لگا۔ دونوں کے قدم ایک کمرے کے سامنے رک گئے۔ جہاں سے کئی کئی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہوی نے ہنڈل کی جبری سے جمایا کہ اندر کا منظر دیکھا۔ وہی لڑکی بری طرح رو رہی تھی اور رخصت صاحب خاموشی سے اسے روتا دیکھ رہے تھے۔ ہوی نے جھٹ اشعر کو بھانسنے کا کہا۔ اب رخصت لڑکی ساتھ لگائے پیار سے کچھ سمجھا رہے تھے، اشعر نے بولکھلا کر ہوی کو دیکھا جس کے چہرے پر پہلے ہی ہوا کی آڑ رہی تھیں۔

”یہ کیا چکر ہے ہوی؟“ اشعر نے آہستگی سے کہا ہوی نے اسے خاموش رہنے کا کہہ کر کان دروازے سے لگا دیے۔ مگر اب کمرے سے آنے والی آوازیں اتنی بلند اور واضح تھیں کہ کان لگانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

”یعنی بس کرو میری جان! بابا کی مجبوریوں کو جانتے ہوئے بھی رو کر گھٹاؤ لگا رہی ہو اس کی رو ج پڑے۔“

”بابا۔“ ہوی آسمان سے زمین پر آکر اشعر بھی سناٹے میں آگیا۔

”آخر کب تک۔ ابو! کب تک آپ مجبور اور میں لاوارث رہوں گی۔ آخر کب تک میں اپنے نام لگا شہادت اپنے حقوق کے انتظار میں اس قبر میں تنہا کی کاہر بیویوں کی۔ کب تک ابو جان! آخر کب تک۔“

لڑکی کی ہیکلی آواز ہوی کے اعتماد کو چیرتی گزرتی۔

”بس میری بیٹی تھوڑا سا انتظار اور کرلو۔ تمہیں اپنے باپ کی مجبوری کا اندازہ ہی نہیں۔ بیٹی تمہیں کیا خبر میں کس اذیت میں زندہ ہوں۔ کس قدر مجبور ہوں۔“

”ابو جان! آخر آپ کی مجبوری کب ختم ہوگی آپ کی یہی مجبوری پہلے میری ماں کی موت تھی اور اب لگا ہے میری موت بنے گی!“

”میری بیٹی! میری بیٹی مت کرو ایسی باتیں میرا دل پھٹ جائے گا۔“

”تو پھر ابو جان بتائیے میں کس سے حال دل کہوں۔ میرا ہی بھی اپنے گھر! اپنی شہادت کے انتظار میں قبر میں جا اتریں مگر آپ اپنی مجبوریوں کا رونا روتے رہے۔ آپ میں اتنا بھی حوصلہ نہ ہوا کہ گھر میں ہمارا ذکر ہی کر دیں۔“

میں تنہا اس قبر میں پڑی اپنے گھر، اپنے بہن بھائیوں کی محبت کو ترستی رہتی ہوں۔ لہو وہ بھی آپ کی اولاد ہیں جن کو آپ نے سینے سے لگا کر رکھا ہوا ہے اور میں بھی جسے آپ نے ایک جرم کی طرح چھپا رکھا ہے۔ ابو جان! آپ نے کوئی جرم کیا ہے۔ میری اسی شادی کر کے کوئی گناہ کیا ہے تو خطا وار آپ ہیں۔ سزا مجھے کیوں مل رہی ہے۔ میرا کیا قصور ہے میں۔ کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اپنی بیٹی کی حیثیت سے گھرے جاسکتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ رونا۔ ایسے ہاتھوں سے میرا گلہا دیا۔ اف بھی نہ کروں گی یہی سمجھوں گی۔ اپنی ماں کی طرح میں بھی بے وقعت تھی۔



اشعر نے رُحمن کا سراٹھا کر پانی پلایا۔ وہ یوں ہانپ رہے تھے۔ گویا کوسوں میل کا سفر بھاگتے ہوئے کیا ہو۔

”ہوی! یہ کیا بچپنا ہے خود کو سنبھالو۔ اور پلیز آپ بھی۔“

اشعر کی حالت کچھ مختلف تو نہ تھی مگر وہ سدا کا معاملہ فہم تھا۔ کسی ہی عکس صورت حال کیوں نہ ہوئی تو اس باختہ نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے اس نے ہوی اور یحییٰ کو خاموش ہونے کو کہا۔ جو بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ کافی دیر کمرے میں گہرا سکوت طاری رہا۔ ایک سو گوارسی فضا میں چار نفوس سانس لے رہے تھے۔ دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ رُحمن احمد چاہتے تھے سب کچھ کہہ دیں مگر ہمت کہاں سے لاتے جو ان کے اور بچے کی نظروں میں گرے جا رہے تھے۔

”ابو آپ نے یہ کیا کیا، کیا اتنا بڑا بچہ اتنی بڑی حقیقت آپ نے ہم لوگوں سے چھپائے رکھی کیوں، ابو کیوں؟“ ہوی ضبط نہ کرتے ہوئے اشعر کے منہ کرنے کے باوجود بولے گیا اور یہ کوئی معمولی بات تو نہ تھی جسے ہر کرسمس جاتا۔ احمد ڈوٹا۔ بھرم چکنا چور۔

”ہوی تم خاموش نہیں رہ سکتے۔“ اشعر نے ہوی کو سرزنش کی۔

”اسے کہتے دو اشعر بیٹے! ایک نہ ایک دن تو مجھے اولاد کی عدالت میں حاضر ہونا ہی تھا۔ میں تو ہوی کے آگے بھی جواب دہ ہوں اور یحییٰ کا خطا وار بھی ہوں۔ مگر یہ تو میرے ساتھ بھی رہا ہے کہ میں نے دوسروں کی خوشیوں کے لیے پھول چنے مگر جواب میں میرا دامن کا نٹوں سے بھر دیا گیا۔ کیوں آخر میرا کیا قصور تھا کیا گاڑا تھا میں نے کسی کا۔ آغا جی کی عزت کا بھرم رکھا۔ سیدہ کو نہ چاہتے ہوئے اپنا دل پر جبر کر کے سسلی کو چھوڑا اس لیے، اس لیے کہ۔“

رُحمن احمد چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ اس وقت کوئی ان کے دل کی حالت جان لیتا کہ جو ان اولاد کے سامنے اعتراف شکست کرتے ہوئے ان کی کیا حالت ہو رہی ہے تو شاید بغیر کسی سفائی کے ہر خطا معاف کر دیتا۔

”ہوی، یحییٰ! اشعر بیٹے! آج جب وقت نے مجھے اولاد کے سامنے بے پردہ کر ہی دیا ہے تو میں بھی کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ اس لیے کہ یہ سب چھپا کر میں ہل ہل جیا اور مرا ہوں۔ سسلی میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی اور ہر انسان کو اپنی پہلی محبت بے حد عزیز ہوتی ہے لیکن مجھے اس کو قربان کرنا پڑا سیدہ کی خاطر آغا جی کی خاطر میں اپنی ذات سے ان کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا چنانچہ میں نے سیدہ کے ساتھ شادی کر لی سسلی نے بھی مہر کر لیا سسلی کا اس دینا میں سوائے ایک ماں کے کوئی نہیں تھا۔ والدہ کے انتقال کے بعد سسلی بالکل تنہا رہ گئی۔ میں نے بہت چاہا کہ وہ کسی اچھی جگہ شادی کر لے مگر اس نے کہا کہ وہ تنہا تو جی سکتی ہے کہیں اور شادی نہیں کرے گی۔ تو..... تو.....“

روانی سے بولتے بولتے رُحمن رک گئے۔ انہوں نے چورنگا ہوں سے ہوی کو دیکھا جو صوفے کے بازو سر کے ایسے بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ بالکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ یحییٰ کا آنچل ڈھلک کر گھونگٹ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ البتہ اس کی سسکیاں ماحول کے سکوت کو توڑ رہیں تھیں۔

”تو میرے بچو! جب ہوی تین برس کا تھا۔ میں نے مجبوراً سسلی سے نکاح کر لیا کہ اس مجبوری میں ہی

خدا اہل کا زیادہ دل تھا۔ اس کا مجھے اعتراف ہے میں نے سسلی کو شرعی طور پر اپنا کر اور اس کا اخلاقی سہارا کوئی جرم کیا تھا نہ گناہ، مگر ہم دونوں نے سزا بھرموں والی کاٹی۔ سسلی ترستی رہی۔ اپنے سرال جانے اپنے حقوق پانے کو۔ آزادانہ طور پر میری بیوی کہلانے کو، مگر میں سدا کا بزدل اسے کوئی حق بھی نہ مل سکا اور باقی کے خوف سے خاموش رہا کیونکہ جو حرکت فرمان نے نافرمانی کر کے اعلانیہ کی تھی، وہ میں نے چھپ بزدلی کے ساتھ کی تھی اور پھر بچے جو ان ہوتے گئے تو میں مزید بزدل ہوتا گیا۔ سچ کہنے کا حوصلہ نہ رہا تو سسلی سرال جانے کے انتظار میں خدا کو پیاری ہو گئی تو یحییٰ، سسلی کی واحد نشانی بالکل تنہا ہو گئی میں پھر ہاتھوں رہا۔ اشعر بیٹے! تم میرے بیٹے ہو۔ اس ساری کہانی میں تمہیں میرا قصور نظر آتا ہے۔ تم مجھے سرزنش دیتے ہو۔ میں نے کبھی سیدہ یا ان بچوں کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے تو سسلی اور یحییٰ کے لیے ہوئی اگر اب بھی مجھے خطا وار سمجھتا ہے تو میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ تیار ہوں بیٹے۔ جو چاہو کہہ لو۔“

رنگہ گاربا پر کو۔ ”رُحمن احمد جذباتی ہو گئے تو اشعر نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔“

”چچا جان آپ نے کوئی جرم کیا ہے نہ گناہ۔ آپ نے تو ایک بے سہارا کو سہارا دے کر انسانیت کا دھار لیا ہے۔ ہاں آپ سے باز پرس کی جاسکتی ہے تو صرف اس بات کی کہ آپ نے یہ سب سے چھپا کر کیوں کیا۔ یحییٰ ہے اس سسلی پر آغا جی آپ سے ناراض نہیں ہوں گے۔ ہاں البتہ چچی جان کا ناراض ہونا فطری امر ہے ہاں آپ کیلئے نہیں ہیں ہم جو ہیں آپ کے ساتھ۔“

اشعر کئی ہی دیر ان کو سمجھا رہا تھا اور رُحمن احمد کافی حد تک بہل گئے مگر ہوی نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا وہ اسی طرح چہرہ اچھپائے بیٹھا تھا جبکہ رُحمن کا جی چاہتا تھا۔ وہ کچھ تو بولے۔ چچے۔ چلائے ناراضگی کا اظہار نہ کر دے تو جیسے بے حس ہو گیا۔ پھر اچانک ہی وہ چہرہ صاف کر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک لمبا پرنسڈ ڈالی دوڑنے لگے۔ آخر جو ان بیٹا تھا۔

”ہوی بھئی! یحییٰ کی آواز پر تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے مڑ کر یحییٰ کو دیکھا جس کا چہرہ بالکل سے تر تھا۔ اسے یحییٰ میں اپنی چھوٹی بہن گڑیا نظر آئی۔ وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتا رہا۔ کتنی اپنی اور عزیز سی لڑکی تھی آخر اس کی بہن تھی رگوں میں ابھو جوش مارنے لگا مگر وہ۔۔۔ وہی طور پر اس قدر ڈسٹرب تھا۔ اس کی سمجھ لکھیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ یحییٰ کی طرف بڑھا اور اس کے سر پر ٹھہر گیا۔ رُحمن احمد نے ٹھکانہ کر لیں۔

”اس وقت میرا داغ ٹھکانے نہیں مجھے جانے دو۔“

ہوی کی گھٹی گھٹی ہی آواز ابھری اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا یعنی باپ کے سینے سے آگئی۔

”ابو جان کاش امی کے ساتھ میں بھی مر گئی ہوتی۔ تو آج یوں آپ کو نام نہ ہونا پڑتا اور ہوی بھئی یوں اسے نہ بھیر کر نہ جاتے۔“

یحییٰ کتنی ہی دیر روٹی رہی وہ تو اپنی قسمت پر رو رہی تھی کہ کیا قسمت اس نے پائی ہے کہ تمام رشتے ہونے لگے اور اس کا کسی پر حق نہیں۔ وہ تھارہنے پر مجبور ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر موت ہے۔ رُحمن احمد خود بے جان نہ تھا۔ اسے کیا چاہ کر رہا تھا۔

”مترہ میں علی علیہ! جذباتی ہونے سے بہتر ہے۔ انسان حوصلے اور ہمت سے کام لے، انشاء اللہ۔ سب



یعنی برائی ہو کھلا ہٹ سوار ہو گئی کہ بسکٹ کی پلیٹ کو چائے بنا ڈالا۔  
 ”مخترمہ! یہ چائے نہیں بسکٹ ہیں ہو سکتا ہے۔ کہ آپ کے ہاں اس کو بی چائے کہا جاتا ہو۔“  
 اشعر نے کچھ ایسے کہا کہ عینی کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔  
 ”دیے عینی صاحبہ! انسان کو زیادہ نہ سبھی کبھی مسکرا ضرور دینا چاہیے۔ حرم کی بدبغی کے لیے کارینا کرتی ہے یہ مسکراہٹ۔“  
 اشعر نے اس کے مسکراتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا جو زندگی میں اچانک آ جانے والی اس وارنڈیلی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

ہوئی دینی طور پر اس قدر آپ سیٹ تھا کہ وہ گاڑی کو چلا نہیں رہا تھا۔ ازار ہا تھا۔ دل و دماغ میں بھگڑا۔  
 لہے تھے۔ کئی بار ایک سیٹ نہ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ ایک ایک لفظ پھوٹے برسر ہاتھ آندھی طوفان کی طرح  
 نہ گاڑی کو پوری طرح میں کھڑا کیا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ تو قیمت تھا کہ اس وقت کوئی  
 نے نہ آیا اور نہ شاید وہ سب کچھ اگل دیتا۔ وہ اس وقت اپنی ماں کے سینے سے لگ کر رونا چاہتا تھا۔ اس کے لئے  
 ہستان سنا نا چاہتا تھا مگر اس نے خود کو بڑے ضبط سے روکا۔ بستر پر آکر ڈیر ہو گیا۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں  
 تھی وہ آسانی سے سہہ جاتا۔ وہ تو آسمان سے زمین پر بیٹھ دیا گیا تھا۔ اس کے چند اکرام کدہ اجڑ گیا تھا۔ اتنا  
 ہمارے بت پاش پاش کر دیے تھے اس کے اپنے باپ نے وہ لکنا کھڑا تھا۔ مغرور تھا۔ وہ تو اپنے چچا فرمان اور  
 ہارم کو خطا کار سمجھتا تھا ان کو مجرم گناہ کا قرار دے چکا تھا اور ان کے گناہ کی سزا ان کی محسوس عینی شجاع کو دیتا  
 لہے تڑپا تا رہا۔ رلاتا رہا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ قدرت اسے اس انداز میں سبق سکھا سکتی ہے۔

”ابو! میرا کیا قصور ہے خطا وار ہیں تو آپ اور امی۔ میرا کیا قصور ہے سزا مجھے کیوں مل رہی ہے۔“  
 عینی کے لفظوں کی بازگشت ہوئی کے کانوں میں ہو رہی تھی۔ ہاں شجاع بھی تو بے قصور تھی مگر سزا تو اس  
 کی مل چکی ہے۔ عینی تم بھی تم بھی سزا کی مستحق ہو۔ تمہیں بھی سزا ملے گی۔ عینی ہمارا کیا قصور تھا۔ ہم بھی تو بے  
 تبارے گئے ہیں۔ اعتماد کی موت۔ روح کی موت سے کہیں بڑھ کر اذیت ناک ہوتی ہے۔ ابو! آپ نے  
 کیا کیا۔ فرمان چچا! آپ نے جو کیا۔ اچھا کیا۔ کم از کم آپ کی اولاد کا اعتماد تو مجروح نہیں ہوا۔ آپ نے کسی  
 کو کا تو نہیں دیا۔ لیکن ابو! آپ نے تو ہمیں مار ڈالا ہے۔ میری مظلوم ماں کو دھوکا دیا ہے۔ ہمارا مان تو زنا ہے۔  
 لااباب قابل معافی نہیں ہیں آپ کو معاف نہیں کر سکتا۔ ہرگز نہیں۔

ہوئی حقیقت تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا سوچ سوچ کر عینی کا معصوم چہرہ  
 ہاں میں گھوم جاتا تو وہ پانی ہونے لگتا۔ ساتھ میں شجاع آکھڑی ہوتی تو عذامت سے گڑنے لگتا۔ کیا چھ نہیں  
 ہاں شجاع نے شجاع کو۔ اس کی مرحومہ ماں کو۔ خود اپنے چچا کو لیکن اسے کیا خبر تھی کہ ایک دن وہ خود ان کی  
 اول میں گر جائے گا۔ اکیلے اس سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کس سے اپنا دکھ ششدر کرتا۔ اسے  
 ایک ہی عالمی کا خیال آیا تو افسوس ہوتی نیسوں میں ایک کی آگئی۔ وہ سیدھا عالمی کے کمرے میں آیا۔

”ہوئی۔ ہوئی بیٹے کیا ہوا ہے؟ یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے۔“  
 عالمی تڑپ ہی تو انھیں۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر، اس کی حالت۔ قبر سے نکلے ہوئے مردے کی سی ہو  
 گئی۔ کس فرق صرف یہ تھا کہ سانس آ جا رہی تھی۔

ٹھیک ہو جائے گا۔ دیے ایک بات تو ملے ہے کہ آپ چچا جان کی بیٹی تو اچھی ہو سکتی ہیں۔ مگر اچھی میریاں ہرگز  
 نہیں۔“  
 اشعر نے ماحول کے جو جمل پن کو کم کرنے کے لیے ذرا شوخی سے کہا تو عینی نے آنکھیں رگڑ کر پہلی بار باہر  
 سے اشعر کو دیکھا۔ اساتر سایہ لڑکا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ جھل سی ہو گئی۔

”دیے آپ کو چائے تو بنا آتی ہے ناں۔“  
 ”جی ہاں۔“ عینی ہو کھلا سی گئی۔  
 ”عینی بیٹا! جاؤ چائے کا کوما سی کو۔“ رجن احمد نے کہا تو وہ فوراً اٹھ گئی مگر پیچھے سے اشعر نے ہانک لائی۔  
 ”عینی صاحبہ! میں ملازمہ کے ہاتھ کی نہیں آپ کے ہاتھ کی چائے پیوں گا کیونکہ مہمان آپ کا ہوں آپ  
 کی ملازمہ نہیں۔“

اک ذرا سی بات کتنی مستحکم تھی عینی کو، کتنی اپنائیت تھی اشعر کے لہجے میں۔ وہ کچن میں آ گئی۔  
 اشعر سنجیدگی سے رجن احمد کی طرف متوجہ ہو گیا جو اتنی سی دیر میں برسوں کے مریض لگ رہے تھے۔  
 ”اشعر بیٹے۔ اب تم بتاؤ۔ کیا کروں جب تک سسلی زندہ تھی۔ مجھے عینی کی فکر نہیں تھی مگر اب عینی کو ملازمن  
 کے ساتھ تھا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ وہ خود بھی ٹوٹ گئی ہے اندر سے، میں نہ اس کی ماں کو اس کا حق دلا سکا ہوں اور نہ  
 ہی اسے دلا سکوں۔“

”چچا جان حوصلہ مت ہارے، یہ کم و بیش چچا فرمان والی کہانی ہے۔ آپ سے غلطی صرف یہ ہوئی ہے کہ  
 آپ نے کسی کو اعتماد میں نہیں لیا۔ اگر آپ آغا جی سے بھی براہ راست بات کرتے تو وہ آپ کو یقیناً اس سنگی  
 اجازت ضرور دے دیتے یا پھر کوئی اور دل نکال لیتے۔ بہر حال۔ اب آپ کفر نہ کریں ہوئی کو میں سنبھال دوں گا  
 چچی جان کو وہ سنبھالے گا۔ بس اب آپ مطمئن ہو جائیے۔ دیکھ لیجیے گا ایک دو روز میں عینی اپنے گھر میں ہو گی ہم  
 سب کے ساتھ۔“

اشعر نے کہا تو رجن احمد اسے بے عینی سے دیکھنے لگے۔  
 ”یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے بیٹے۔“  
 ”چچا جان! بس خدا پر بھروسہ رکھیے۔ پھر دیکھیے۔ اف کتنی دیر ہو گئی۔ چچا جان یہ چائے ابھی گلی نہیں۔ میں  
 دیکھتا ہوں۔“

پھر اشعر کچن تلاش کرتا ہوا آ پہنچا۔ عینی سنجیدگی سے چائے بنانے میں مصروف تھی۔  
 ”سوری مخترمہ! نہیں معلوم تھا۔ آپ کے ہاں چائے بھی پائے جتنا وقت لیتی ہے بننے میں۔“  
 اشعر بولا تو عینی گھبرا کر مڑی، وہ بیٹے پر ہاتھ باندھے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا شوخ نظروں سے  
 اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہو کھلا گئی۔

”آپ!“  
 ”جی۔ میں فرسٹ کزن ہوں آپ کا اشعر کے نام سے پکارا جاتا ہوں۔ آپ جو چاہیں کہہ لیں، آپ کے  
 لیے خصوصی رعایت ہے۔ ویسے چائے گلی کر نہیں۔“  
 ”جی گلی گئی۔ میرا مطلب ہے بن گئی۔ یہ لیجیے چائے۔“

”خالہ جانی۔ خالہ جانی ہم لٹ گئے۔ مجھے بتائیے۔ یہ سب کیوں ہوا۔ تو نے ایسا کیوں کیا۔“

ہوی۔ عالی کی گود میں سر رکھے رو پڑا اور دل کا سارا درد عالی کے دل میں اٹھیل دیا تو وہ سن ہی گئی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ رحمن بھائی ایسا کر سکتے ہیں اور ان کی بہن کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو ان کے ساتھ ہو۔ جس نارسانی کے صحرا سے وہ گزاری تھیں۔ ان کی بہن کو بھی گزرنا پڑا۔ وہ ہوی کو ساتھ لگائے سو جتنی ریل۔ ان کے اپنے دل کے سارے احساس بھی نئے سرے سے جاگ اٹھے۔ مگر وہ ہوی کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر ہوی کو سمجھاتی رہیں۔

”یہ ہی مکانات عمل ہے۔ اور پھر بیٹے اسی لیے کہا ہے کہ کسی کو برا نہ کہو، بات نہ بناؤ۔ جانے کب ہمیں اس کا بدلہ مل جائے۔“

”خالہ جانی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابو۔“ ہوی کو کوئی دلیل بھی مطمئن نہیں کر پاری تھی۔

”خبردار ہوی۔ میں تمہیں ایک لفظ بھی رحمن بھائی کی عیان میں گستاخی کا کہنے نہ دوں گی۔ تم ذرا ان کی عظمت تو دیکھو۔ اپنی جان پر ہر بات برداشت کرتے رہے مگر نہ کبھی آپا کو کچھ کہا اور نہ والدین سے گستاخی کی اور دوسری طرف ایک بے سہارا کو سہارا دے کر جو عظیم کام کیا ہے اس کی بلندی کو اللہ ہی جانتا ہے۔ انسان اگر اپنی اغراض اپنے مفادات سے بلند ہو کر سوچے تو جب وہ صحیح معنوں میں انسان کہلاتا ہے اور رحمن بھائی ایک اچھے انسان ہیں۔ میں ان کو نہ مجرم سمجھتی ہوں اور نہ گناہ گار۔ انہوں نے شادی کی ہے۔ کوئی گناہ یا جرم نہیں کیا کہ وہ کسی کے آگے جواب دہ ہوں۔ اگر تم نے کوئی گستاخی کی تو میں تمام عمر تم سے بات نہیں کروں گی۔ ہوی بیٹے۔ یہ ہی زندگی ہے، ہر انسان حالات کا قیدی ہوتا ہے۔ ہر کوئی مجبور ہوتا ہے۔ یعنی تمہاری بہن ہے۔ دوسری بہنوں کی طرح اور تم اس کو بھی وہی مقام دو گے جو دوسری بہنوں کو دیتے ہو۔“

ہوی تو جنون کے سرکش گھوڑے پر سوار تھا۔ عالی بڑی مشکل سے اسے قابو کر پائیں تو وہ بہل گیا۔ پھر اشعر بھی آگیا تو عالی اور اشعر نے ہوی کو نہ صرف قائل کر لیا بلکہ وہ یعنی کو خود گھولانے پر تیار بھی ہو گیا۔ اب اسے ابو سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس نے اب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اسے ابو بہت مظلوم لگے۔ اس کا جی جا ہاں کے قدموں سے لپٹ کر معافی مانگ لے۔ یعنی کے لیے بے ساختہ سی محبت ابجری تو اس کا جی جا ہا۔ اسے ابھی ساتھ لے آئے۔ دل پر جی گرد اتری تو ہر منظر صاف اور واضح ہونے لگا۔ فرمان چچا بھی بے قصور لگنے لگے۔ اشعار کا خیال تو ایک ٹھنڈی آہ میں ڈھل کر رہ گیا۔

”اشعر! یعنی کو گھولانے کا کوئی طریقہ بتاؤ۔ میں۔ میں اب اسے وہاں نہیں رہنے دوں گا۔“

ہوی نے بے چینی سے کہا تو عالی اور اشعر مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

”یہ کس عینی کا ذکر ہو رہا ہے؟“

اس آواز پر سب نے چونک کر دیکھا۔

سیدہ بیگم کی اچانک آمد پر وہ تینوں بوکھلا گئے۔ تاہم اشعر نے بات کو فوراً سنبھالا۔

”وہ چچی جان۔ یعنی دراصل میرے اور ہوی کے مشترکہ دوست کی بہن ہے اور عالی پھوپھو کی ذہین ملاؤں ہے۔“

اشعر نے کچھ ایسے بات بتائی کہ عالی اور ہوی حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ مگر سیدہ کچھ سمجھ نہ پائیں۔

”تو۔؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اشعر کو دیکھا۔

”تو یہ چچی جان کہ۔ اس کی والدہ تو حیات ہیں نہیں باپ اور بھائی ہیں۔“

”جب باپ اور بھائی ہوں تو پھر کیسی پریشانی؟“ سیدہ لا پرواہی سے بولیں۔

”آپا۔ آپ ان کی سن تو لیں، کہنا کیا چاہتے ہیں۔“ عالی پہلی بار بولیں تو سیدہ بیگم نے اشعر کو ایسے دیکھا جیسے وہی ہوں، اجازت ہے۔

”چچی جان، یعنی کے والدہ کا بزنس امریکہ میں پھیلنا ہوا ہے لیکن اب وہ چاہتے ہیں، بزنس پاکستان میں چلی جائے۔“ بس اسی غرض سے میرا دوست راجیل اور اس کے والد امریکہ جا رہے ہیں کچھ عرصے کے لیے،

انہی خواہش ہے یعنی کچھ عرصے ہمارے ہاں رہے۔ راجیل اور اس کے والد بہت اصرار کر رہے تھے۔ بہت ننانہند ہو رہے تھے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم یعنی کو لے آئیں۔ دیکھیے ناں، وہ ہم پر کتنا اعتبار کر رہے

ہیں! کیا عزت کو ہمارے گھر چھوڑے جا رہے ہیں۔ آپ کا خیال ہے عالی پھوپھو؟“

اشعر نے عالی کی طرف پوچھتے ہوئے دیکھا جو اشعر کی ذہانت کی دل ہی دل میں داد دے رہی تھیں۔

”کیا آسان کر دی تھی اشعر نے۔ ہوی بھی پرسکون ہو گیا۔“

”ہاں اشعر بیٹے، اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ میرے خیال میں تم اپنے دوست کی بہن کو لے آؤ۔ ہم انشاء اللہ کے اعتماد پر پورے اتریں گے اور پھر ماشاء اللہ ہمارا اپنا گھر بھر پڑا ہے لڑکیوں سے، ایک اور آجائے گی تو بزنس پڑ جائے گا۔“



”ارے واہ۔ کیسے فرق نہیں پڑے گا۔ ماشاء اللہ خیر سے گھر لڑکیوں کی طرح لڑکوں سے بھی بھرا ہوا ہے۔“  
جوان جہان پرانی لڑکی ہے۔ نہ باپ نہ کل کلاں کوئی ایسی بات ہو جائے تو..... نہ بھی، یہ مناسب بات نہیں ہے۔“  
”سیدہ بیگم کے فیصلہ کن لہجے پر وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔“

”آپ کو اپنی اولاد پر اعتماد نہیں پہنچی جان؟“

اشعر نے بڑی افسوس بھری نظروں سے ان کو دیکھا مگر وہ خاموش رہیں۔ ہوی کا منہ بھی اتر گیا۔ یہ نظروں میں عینی کا معصوم بھیا ہوا چہرہ اگھوم گیا۔

”نہیں آپ! میں عینی کے والد سے بات کر چکی ہوں۔ وہ بڑے اچھے شریف لوگ ہیں۔ اور پھر عینی کو میں جانتی ہوں، بے حد نیک سیرت بچی ہے۔ میں عینی کی ذمہ داری لے چکی ہوں۔“

عابی نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا تو اشعر نے حیرت سے عابی کو دیکھا اور دل ہی دل میں ان کی عقلیت پر سراہا۔

”اچھا۔ جب تم ذمہ داری لے لی ہو تو پھر ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا ہونا نہ ہونا دیے ہی کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ ہوی تم نے کوشی کی صفائی کرائی کہ نہیں؟“

سیدہ بیگم جاتے جاتے پلٹ کر ہوی کو دیکھنے لگیں تو دل کا کرب ہوی کی آنکھوں میں اتر آیا۔

”نہیں امی..... اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ کہیں بھی نہیں، اس لیے امی کہہ۔“

ہوی کا درد بھر سوا ہونے لگا تو وہ جلدی سے ہمہ ہی بات کر کے ماں کو انھیں میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اور وہ اس کی بات، اس کے لہجے پر غور کرتی رہ گئیں۔

سوچ سوچ کر ہوی کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ دماغ کی رگیں پھینکنے لگی تھیں۔ وہ جو شعاع کو بنا کر وہ گناہوں کی سزا دیتا آیا تھا۔ انکل فرمان کو مجرم اور مریم کو بدکردار قرار دے چکا تھا اور ماں بیٹا جانے کب تک اپنے موقف پر ڈٹے رہے کہ اچانک ہی ہوا کا رخ بدلا اور۔ اور وہ اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔ اس کی نگاہوں میں کبھی شعاع کا بنے گناہ معصوم سراپا اگھوم جاتا اور کبھی عینی بیگم کی پلکوں کے ساتھ سامنے آ جاتی۔ تو کبھی فرمان کے برابر کمرے رحمن نظر آنے لگتے۔ ان سب میں کون قصور دار تھا، کون مزا کا حقدار تھا۔ شاید کوئی بھی نہیں کیونکہ انسان کبھی بھی خود غارت نہیں رہا۔ دل کے ہاتھوں مجبور، کبھی حالات کا قیدی اور کبھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک گیا۔

”آ جاؤ۔“ ہوی درد سے پھٹتی کنپٹیوں کو دبا رہا تو اسی طرح لینے لینے بولا۔ اسے یقین تھا یہ اشعر ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن خوبصورت چہرے پر کچھ تجبک، کچھ خوف لیے شعاع داخل ہوئی تو ایک نیس سی دل میں ابھی ہوی بیٹھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہا ہا ہا بھائی۔ یہ میں کتاب آپ کے کمرے سے لے گئی تھی۔ سوری ہو مجھے بتا۔“

اف، اتنی اجنبیت، اتنی غیریت، اتنا تکلف، اتنے فاصلے۔ ہوی نے اس کے صبحیرے سے نظریہ ہٹائیں۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ میں نے اس معصوم لڑکی کو یاد ہی کیا ہے سوائے نفرت کے، جواب میں وہ مجھے جنت کیسے دے سکتی ہے۔ ہوی رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ شعاع حیران تھی۔ ہوی تو بالکل ہی بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ چہرے پر تناؤ تھا، نہ آنکھوں میں حقارت کی بجلیاں تھیں۔ بس دکھ اور بے بسی کے کریم کا سائے تھے۔

”کوئی بات نہیں شعاع! اور چاہیے تو رے جاؤ۔“

ہوی نرمی سے بولا تو شعاع حیرت سے اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گئی۔ علیحدہ کی جگہ اگر شعاع ہوتی تو ہوی کی اتحادی پر شاید خوشی سے مرجاتی لیکن علیحدہ کو خوشی کے بجائے حیرت زیادہ ہو رہی تھی۔ اس نے جب سے اسے دیکھا تھا، پرہم ہی پایا تھا۔

شعر ہی ہوی بن گیا۔ آپ کی طبیعت خراب لگ رہی ہے۔ میں چاہے یا کافی بتلاؤں۔“

شعاع کو اس کے متعطل چہرے کو دیکھ کر ترس آ گیا تو جھٹ آ کر کر دی۔ ہوی نے پلٹ کر ابھی ہوئی ٹاپوں سے اسے دیکھا اور کچھ دیر دیکھتا ہی رہا۔

”نہیں ٹھیک ہو۔ اب تم جاؤ اور پھر کبھی نہ آنا اس لیے کہ۔ کہ راشو یہ بات پسند نہیں کرتا۔“

ہوی دل کا درد چھپائے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالتا واداش روم میں گھس گیا اور وہ ابھی ہوئی واپس آ گئی۔ وہ ہوی کے کمرے سے نکلی تو سامنے سے آتے راشو سے ٹک بھڑ ہو گئی۔ راشو اسے ہوی کے کمرے سے نکلتا دیکھ کر تھجھکھجھک سا ہو گیا۔

”وہ میں نے ہوی بن گیا کی کتاب پڑھنے کے لیے لی ہوئی تھی، وہ واپس کرنے آئی تھی۔“

شعاع نے راشو کی آنکھوں میں ناراضگی کے سارے تلاش کرتے ہوئے کہا۔ تو راشو اس کی اس ادا پر مسکرا دیا۔ کتنا خوش کن تھا اس کے لیے یہ احساس کہ شعاع کو اس کی ناراضگی کا کتنا خیال ہے۔

”کچھ کہا تو نہیں اس بد دماغ نے؟“ راشو نے اس کی لرزتی پلکوں کو دیکھا۔

”نہیں۔ بلکہ کہنے لگے کہ اور چاہیے تو اور لے جاؤ لیکن آج وہ بہت ڈسٹرب اور مضطرب سے تھے۔“

نبائے کیا بات تھی؟“

”ہوں۔“ راشو نے شعاع کو دیکھتے ہوئے بڑے گہرے انداز میں ہوں کہا۔

”اچھا تو یوں سر راہ راز و نیاز ہو رہے ہیں۔ ابھی جا کر شکایت کرتا ہوں ایوان بالا میں تمہاری۔“ اشعر بولتا ہوا دونوں کے قریب آ گیا تو دونوں جھینپ گئے۔

”سننا ہے آج ہا ہا صاحب ڈسٹرب ہیں۔ آج تو شعاع سے بھی نرمی سے بات کی ہے۔“ راشو نے ہاتھ تو اشعر کا ہیں چرا گیا۔

”ہوں اچھا، ابھی بتا کرتا ہوں۔ وہ کون ہوتا ہے شعاع سے نرمی سے بات کرنے والا۔“ اشعر مسکراتا ہوا ہلی کے کمرے میں آ گیا جو بیڈ پر دونوں ہاتھوں میں سر تھا ہے بہت دیران سا لگ رہا تھا۔

”ہوی۔ کیا ارادہ ہے چلنا نہیں؟ عینی تو اپنے بن گیا کا انتظار کر رہی ہوگی اور میں نے اسے صبح ہی فون کر دیا تھا کہ شام کو ہوی تمہیں لینے آئے گا۔“ اشعر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو ہوی تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اشعر۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہوا ایسا؟ نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“ وہ پھر بکھرے لگا تو اشعر کو پھر سیننا ہلا۔

”ہوی۔ دنیا میں بے شمار لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ عینی کو قدرت نے تمہاری بہن بنایا ہے اور اگر تم اسے اس کا حق نہیں دیتے تو گناہ گار تم ہو۔ وہ تو بے چاری نہ احتجاج کا حق رکھتی ہے اور نہ حق چھین لینے کی طاقت۔ چلو راشو۔“

ہوی نے ممنون نظروں سے اشعر کو دیکھا۔ وہ نہ ہوتا تو شاید اکیلے وہ اتنا بڑا صدمہ برداشت نہ کر پاتا۔

اشعر کی ہدایت کار کی طرح دونوں کو ہدایت دے رہے تھا۔ ہوی نے بھی کود دیکھا جو چہرے پر خوف کے مائے لیے بالکل گڑیا کی طرح معصوم اور پیاری لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہوی کو وہی تکلیف ہوئی جو گڑیا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہوتی تھی۔ اس کی بائیں پھیل گئیں یعنی کے لیے۔

”معتیا جان۔“ یعنی تڑپ کر ہوی کے ساتھ جاگلی۔ وہ تو جنم جنم کی پیاسی تھی، اینڈ کے پیار کی۔

”چلو جی، یہاں تو جذباتی سین شروع ہو گیا۔ چل یا ر اشعر، خود ہی چائے پانی کا بندوبست کر لے۔“

اشعر نے مسکرا کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے دانستہ دونوں کو تنہا چھوڑ دیا تاکہ دل کی بھڑاس نکال لیں دونوں بہن بھائی۔

”مجھے۔ مجھے احساس ہے معتیا۔ کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کی پرسکون زندگی میں طوفان آ گیا ہے مگر تمہا۔ اس میں میرا بھی تو کوئی قصور نہیں کہ مجھے اپنے گھر اپنے باپ اور بہن بھائیوں سے دور رہنے کی سزا دی جائے۔ معتیا میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ آپ لوگوں کی محبتوں کو، برکتوں کو ترسی ہوں۔ آپ سب کی نصیحتیں دیکھ دیکھ کر سمجھتی رہی ہوں۔ اب بھی اگر آپ لوگ مجھے قبول نہیں کر سکتے تو اپنے ہاتھوں میرا گلا بادیں لیں میں اب آپ لوگوں سے جدا نہیں رہ سکتی۔“ یعنی ہوی کے ہاتھ تھامے روئے جاری تھی۔

”یعنی یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی قصور وار نہیں۔ اس قسم کے جھکے قدرت ہمیں اس لیے دیتی ہے کہ ہم جیسے لوگ جو حق کی، سچائی کی راہ کو چھوڑ کر دشمن بغض کی راہ اپنا کر انسانیت کی ذہین کرتے ہیں۔ اس سے باز رہیں۔ لیکن اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس گھر پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ہمارا ہے۔ بس اب میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں۔“

ہوی نے بوئے بھائیوں کی سی شفقت کے ساتھ اس کے آنسو صاف کر دیے تو شکرانے کے بے شمار آنسو ہلی کے ہاتھ بھگو گئے۔

”میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی معتیا کہ کبھی آپ لوگوں کی توجہ حاصل کر پاؤں گی۔ میں اپنے خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔“

”لیجئے جناب! گرم گرم چائے تیار ہے۔“ اشعر باقاعدہ ہڑے میں چائے سجا کر لے آیا تو عینی کی بھیگلی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”آپ چائے بنا لیتے ہیں؟“ یعنی نے چائے سے اٹھ کر ہوئی بھاپ کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

”جی انڈا بھی ابال لیتا ہوں۔ آڑے وقت کے لیے اور بھی بہت کچھ سکھ رکھا ہے میں نے۔ نجانے کل کو کبھی لڑکی سے واسطہ پڑ جائے۔ جو چائے بنانے میں بھی پائے بنانے جتنا وقت لیتی ہو تو میرے مہمان تو چائے کے انتظار میں سوکھ جایا کر س گئے۔“

اشعر نے اس کی بھیگلی پلکوں کو دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا تو عینی کی نظریں جھک گئیں۔ اشعر نے شوخ باتوں سے دونوں کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ہوی کے دماغ میں سوچوں کے جھگڑا چل رہے تھے۔ وہ آنکھ پٹش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بہر حال عینی کو اس کی حیثیت دلا نا چاہتا تھا اور اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ عینی کو لے کر جائے گا تو سب کا کیا راز عمل ہوگا۔

”یعنی اپنی اہمال تم گھر میں میری نہیں بلکہ میرے اور اشعر کے دوست کی بہن کی حیثیت سے جاؤ گی لیکن

”ابو کو بتا دیا تم نے کہ ہم عینی کو لینے جا رہے ہیں۔“ ہوی ساری امت جمع کر کے اٹھتا ہوا ہوا۔

”اونہوں۔ ہرگز نہیں، ہم ان کو سر پر ناز دیں گے۔ انہیں کتنی خوشی ہوگی کہ جب ان کو ہٹا پٹے گا کہ تم میری لے کر آئے ہو۔“

”اچھا چلو ٹھیک ہے۔“ ہوی نے مخلص سے اشعر کو دیکھ کر کہا۔

پھر دونوں خاموشی سے کھل آئے۔ رحمن نے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا مگر وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ عینی کو لینے جا سکتے ہیں۔ رحمن سرد آہ بھر کر عالی کے کمرے میں آئے۔ چھوٹی بہن، چھوٹی سالی کے سامنے اعتراف شکست کرتے ہوئے رحمن کس قدر نادام تھے، یہ وہی جان سکتے تھے۔

”دکھ تو رحمن معتیا! مجھے اس بات کا ہے کہ آپ نے مجھے اپنی بیوی کی بہن سمجھا، اپنی نہیں۔ ہاں اپنی سہا ہوتا تو، تو یہ سب مجھے پہلے پتا ہوتا۔“ عالی نے ساری بات سن کر کہا۔

”تم جو کہو عالی، روا ہے مگر..... مجھے غلط نہ سمجھنا۔“ سگی کو اپنانے میں میرے جذبات سے کہیں زیادہ انسانی ہمدردی کا رزق ماضی۔“ رحمن کی نگاہیں گڑی جاری تھیں۔

”رحمن بھائی! جب بات انسانی جذبے کی آجائے تو باقی تمام جذبے ماند پڑ جاتے ہیں۔ آپ کیوں ایسے کہہ رہے ہیں۔ آپ سے غلطی صرف یہ ہوئی ہے کہ آپ نے اسے چھپایا۔ جس کی وجہ سے بہت سی چیزیں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن بہر حال اب آپ اس کیلئے نہیں ہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ آغا جی اور بی بی جان بلکہ سب سے میں خود بات کر لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“

عالی نے کچھ اس طرح سے تسلی دی کہ بکھرے ہوئے رحمن احمد سنبھل گئے یوں جیسے طوفان میں گھری ناؤ کو ناخدا اہل کیا ہو۔

”عالی۔ اور تو سب ٹھیک ہے مگر تمہاری آپا کی طرف سے میں بہت پریشان ہوں۔ وہ تو معاف کرنے کا ہنر جانتی ہی نہیں اور پھر یہ تو۔“ رحمن کی اصل پریشانی کی وجہ سیدہ بیگم ہی تھیں۔

”آپ فکر نہ کریں بھائی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“

عالی نے دکھ کے گھرے احساس کے ساتھ کہا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ دونوں بہنوں کی ایک جیسی تقدیر ہے۔ دونوں کے ساتھ ایک جیسا ہی سلوک کیا تقدیر نے۔ عالی سے بات کر کے رحمن مطمئن سے ہو گئے۔ اور دوسری طرف اشعر نے یقین دہانی کرائی تھی عینی کو لے آئے گا۔

وہاں پہنچ کر ہوی عجیب سی کیفیت ہونے لگی۔ نجانے کیوں دل گہرانے لگا۔ وہ عینی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا خود میں۔ اشعر نے کال نبل پر انگلی رکھ دی تو تھوڑی ہی دیر بعد عینی کا خوبصورت سراپا چہرے، حیرت و خوشی کے تاثرات لیے موجود تھا۔

”ارے بھئی یعنی صاحبہ! یہ کیسا اخلاق ہے آپ کا کہ نہ آداب نہ سلام۔ دو بڑے بھائی، اونہوں ایک بڑے بھائی کو سلام تو کہہ دیں۔“

اشعر نے دلچسپی سے عینی کو دیکھتے ہوئے کہا مگر جلد ہی صبح کر کے دو کے بجائے ایک بڑا بھائی کہا۔

”آداب معتیا۔“ عینی نے کہا تو ہوی اشعر کو دیکھنے لگا۔

”ارے بھئی، مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔ چھوٹی بہن ہے۔ سر پر ہاتھ رکھ کر دیکھ آداب کہو، جیتی رہو کہو۔“

تم کوئی خیال۔

”کوئی بات نہیں بتایا۔ مجھے آپ اپنی ملازمہ کی حیثیت سے بھی لے جائیں تو مجھے خوشی ہی ہوگی۔“ میں کالج رو پڑا۔ اشعر نے ایک لگاوا اس پر ڈالی پھر ایک دم شوخ ہو گیا۔

”ارے واہ! کیا بات کی ہے بھئی آپ نے۔ ویسے جب سے آپ ملی ہیں میرے بہت سے مسائل حل ہو گئے ہیں۔ اب یہ ہی دیکھ لیجیے، مجھے ملازمہ کی اشد ضرورت تھی۔ وہ اب آپ کی صورت میں حل جائے گی۔ اور۔“ اشعر کی لگاوا میں شوخ ہو گئیں۔

”اشعر۔“ ہوئی نے اشعر کو تنبیہ کی۔

”تمہیں کیا ہے ہوئی، یعنی اگر تمہاری بہن ہیں تو ہماری کزن ہیں۔ آپ نے مانڈ تو نہیں کیا یعنی؟“

ہوئی کو جواب دے کر اشعر بھئی کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھ رہا تھا۔

”جی نہیں، ایسی ہنسی باتوں پر کون مانڈ کر سکتا ہے۔“ یعنی نے آہستہ سے کہا تو اشعر شیر ہو گیا۔

”سن لیا اپنی بہن صاحبہ کا جواب، اب آئندہ مت ٹو کننا مجھے۔“

اشعر نے ذرا خفگی سے ہوئی کو دیکھا جو چہرے پر سوچ کے گہرے بادل لیے کھڑا ہر دیکھ رہا تھا۔ یوں مجھے کوئی فیصلہ کر رہا ہوا۔

”یعنی اب تم تیار ہو جاؤ، ہم اب گھر چلیں گے۔“

یعنی ہوئی کے کہنے پر دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھ گئی۔ راستے بھر ہوئی خاموش رہا۔ سوچتا رہا۔ یعنی کی کیفیت بھی بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ نجانے سب اسے کس انداز میں ملتے ہیں۔ اس کے بارے میں کیا سوچے ہیں۔ کتنی عجیب بات تھی وہ اپنے ہی باپ کے گھر مہمان بن کر جا رہی تھی۔ غیر اجنبی بن کر۔ یعنی کی آنکھوں کے کنارے پھر بھیکنے لگے۔

اشعر اور ہوئی کے درمیان نازک سی یعنی سب کی لگاواں کامرکز بن گئی۔ رحمن تو یعنی کو ہوئی کے ساتھ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اشعر نے یعنی کا تعارف سب سے دوست کی بہن کی حیثیت سے کرایا تھا۔ سب ہی بڑے اچھے انداز میں ملے۔

”یعنی نہ صرف ہوئی اور اشعر کے دوست کی بہن ہے بلکہ میری ذہین اسٹوڈنٹ بھی ہے اور میں نے ہی اس کے والد سے کہا تھا کہ یعنی کو ہمارے ہاں چھوڑ دیں، جب وہ لوٹ آئیں تو اپنی امانت واپس لے جائیں۔“ عابی کی گواہی سب کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی۔

”ارے تو پھر ہماری اپنی بیٹی ہوئی۔ بیٹی! تم اس گھر کو اپنا گھر ہی سمجھنا۔“

قدسیہ بانو نے بڑھ کر یعنی کو ساتھ لگا لیا۔ تو اس کی آنکھوں میں گہری دھند اتر آئی۔ اور اسی دھند میں اس نے اپنے مجبور باپ کو دیکھا۔ اتنی دھند میں بھی جس کے چہرے پر مجبوریاں صاف نظر آرہی تھیں۔ اس سے بڑھ کر ایک باپ کی اور کیا مجبوری ہو سکتی تھی کہ سامنے سگی بیٹی بھی مگر وہ اسے بیٹی کہہ کر سینے سے لگا نہیں سکتے تھے۔ یعنی کی لگاواں ان پر اٹھیں تو وہ لگاواں کتر اگئے۔

”بیٹی! یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ مجھے اپنا باپ سمجھو۔ کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

رحمن صاحب کا لڑتا ہوا ہاتھ اٹھا اور یعنی کے سر پر ٹھہر گیا۔ رحمن بے یقینی سے ہوئی کو دیکھ رہے تھے۔ ہوئی

چہان کو خطرہ تھا۔ وہ ہی ان کے درد کی دون بن گیا تھا تو یہ خدا کا احسان ہی تو تھا۔

”ٹھیک ہو ہوئی بیٹے۔ تم نے مجھے ایسے وقت میں سہارا دیا، جب میں ڈول رہا تھا، بکھر رہا تھا۔ اب مجھے لڑ نہیں۔“ رحمن نے ہوئی کو ساتھ لگا کر پیار کیا تو وہ ان کو تسلی دینے لگا۔

”ابو! انا دم تو میں ہوں آپ سے، اپنے تمام پچھلے رویے پر، اپنی ان تمام گستاخیوں پر جو میں نے آپ میں۔ اکل فرمان کو غلط کہتا رہا۔ شعاع کو بے گناہی کی سزا دیتا رہا۔ اگر ہم انسان دوسروں کی مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہیں تو ضرورت کا وجود ہی غم ہو جائے۔ لیکن اب آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو گا۔“

ہوئی نے باپ کو کچھ ایسے انداز میں تسلی دی کہ رحمن کو لگا جیسے اب کوئی مسئلہ نہ رہا ہو۔

”بیٹے! تمہاری ماں مجھے معاف نہیں کرے گی۔“

رحمن کو معلوم تھا کہ سب ہی معاف کر دیں گے مگر سیدہ جو بہن کی وجہ سے آج تک فرمان کو معاف نہیں کر رہی۔ ان کو جوان کے شوہر ہیں کیونکہ معاف کریں گی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ بہتر کرے گا۔ میں اُمی کو مانا لوں گا۔ آپ بے فکر رہیے۔“

ہوئی باپ کی طبیعت جان رہا تھا کہ ان کا بی بی ہانی ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ ان کو تسلیاں دے کر پرسکون کی ہدایت کرتا باہر آ گیا۔ یعنی اب بھی سب کے درمیان گہری بیٹھی تھی۔ تعارف کا مرحلہ گزر چکا تو یاسر ناوردانی بھاگے آئے۔

”ہو چکا تعارف مکمل۔ ان لوگوں کو کبھی ہمارا خیال نہیں آئے گا کہ کسی حسینہ کے سامنے ہمارا تعارف بھی اہم کہ ان کے علاوہ بھی کوئی گدھا پاجی ہے اس دنیا میں۔“ وہ تینوں ایک ساتھ بولے۔

”لیجیے یعنی۔ ان سے ملے، یہ ہمارے گھر کے گدھے پاجی ہیں۔“ اشعر نے ان تینوں کو دیکھ کر کہا تو یعنی اندھ مگر اپڑی۔

”اور آپ کی تعریف؟“ شرجی، یعنی کے قریب کھٹک آیا۔

”یہ آپ سب کی پاجی ہیں۔ یعنی پاجی۔“ اشعر نے لفظ پاجی پر خاصا زور دیا تو انہوں نے برا سامنہ بتالیا۔

”اور آپ کی؟“ یاسر کمرہ ہاتھ باندھ کر اشعر سے مخاطب تھا۔

”بھئی، ابھی تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ یہ مجھ سے خاصی چھوٹی ہیں۔ اس لیے کم از کم پاجی تو نہیں ہیں یہ۔“ اشعر نے یعنی کے رخساروں پر سائین پتلون پتلون کو دیکھا۔

”میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ بڑے ہر اچھی لڑکی کو ہماری پاجی کیوں بنا دیتے ہیں تاکہ۔“ دانی نے اشعر کو ہنسے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”یار۔ مجھے تو لگتا ہے، دنیا کی کوئی بھی حسین لڑکی ہم سے چھوٹی ہوئی نہیں سکتی۔“ یاسر نے مایوسی سے کہا۔

”کیوں نہیں، مگر کی ڈھیر ساری لڑکیاں تم لوگوں سے چھوٹی ہیں مثلاً۔“

”معاف کیجیے گا راجو بھیا۔ میں حسین لڑکیوں کی بات کر رہا ہوں، چڑیلوں کی بات نہیں کر رہا۔“ یاسر نے اندھا کر کہا۔

”کیا مطلب؟ ہم لوگ چڑیلیں ہیں، بد صورت ہیں۔“ صدف اور فائزہ ان کی طرف بڑھیں تو وہ



بھاگ کھڑے ہوئے۔

”دیکھا، آپ نے چور کی داڑھی میں تنکا اسی کو کہتے ہیں۔“

دانی نے بھاگتے ہوئے یعنی کو دیکھ کر کہا۔ یعنی خوشدلی سے مسکرا دی۔ کتنے خوش پرسکون، پر اعتماد لوگ۔ ان کی ایک پہچان ہے، ایک مقام ہے۔ دینا میں اپنے اپنے حوالے ہیں۔ اپنے اپنے بابوں کے بارے میں پکارے پچانے جاتے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تنہا تھی، بے نام تھی، غیر مسمیٰ، اپنے نام میں۔ یہ سب سوچیں آنسو بن کر اس کی شفاف آنکھوں میں چپکنے لگیں۔ ہونی نے بڑھ کر اس کے آنسو مان کر دیے۔



ایک لحاظ سے شعاع کا یہ دوسرا جنم تھا مگر وہ مطمئن نہ تھی۔ انسان کہیں بھی چلا جائے، اپنے اصل سے اپنے ماضی سے بچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اور اس کے لیے تو اس کا سب کچھ ماضی ہی تھا، جہاں محبتیں بھی تھیں، نفرتیں بھی۔ لیکن اب تو وہ نفرتیں بھی عزیز تر ہو گئی تھیں۔ اب تو دل ترسنے لگا تھا ان نفرتوں کو۔ ان صورتوں کو جو اس کے اپنے پیاروں کی تھیں۔ باری باری سب چہرے نظروں میں گھوم جاتے تو وہ تڑپ کر رہ جاتی۔

”اف۔ میرے خدایا! ایسا کیا حال ہو گا جب ان کو میرے بارے میں خبر ہوگی؟ کیا کیا باتیں سننا پڑیں گی ان کو خدایا! موت کیوں نہ دے دی تو نے مجھے۔ میں تو خود اپنی نظروں سے گر گئی ہوں۔ بے گناہ ہوئے ہوئے بھی دوسروں کو کیا جواب دوں؟“ شعاع تنہائیوں سے لپٹ کر دل کی بھڑاس نکالتی رہتی۔

”حرا بیٹی۔“ حمیدہ بیگم نے پکارا۔

”جی امی جان۔“ شعاع جلدی سے چچا اصف کر کے سید می ہو گئی۔

”بیٹی۔ میں جانتی ہوں تمہاری حالت سمجھتی ہوں۔ تم نے ہی میری ممتا پر پھرے، بٹھا دیے ہیں درد نہ دیکھتی، کوئی تمہیں کس طرح غلط سمجھتا ہے۔“ حمیدہ بیگم اس کے قریبی آنکھیں تو وہ تڑپ اٹھی۔

”تمہیں اسی جان۔ میں مروتو سکتی ہوں مگر وہاں نہیں جاسکتی۔“ وہ سسک پڑی تو حمیدہ بیگم نے اسے مانہ لگا لیا۔

”تو پھر بیٹی خوش رہا کرو۔ ماؤں کے گھر میں بیٹیاں دکھی نہیں رہا کرتیں۔ تم نہیں جانتیں، جنہیں رہنمائی دیکھ کر میرا دل کتنا دکھتا ہے؟“

حمیدہ بیگم کے لہجے میں وہی تڑپ، وہی سسک، وہی ٹھنڈک تھی جو اس کی امی کے لہجے میں ہوتی تھی۔

”ادو۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹی میں؟“ عمیرا اندر آتا ہوا بولا تو شعاع دوپٹہ درست کر لی الگ کر بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں بتایا۔ میں امی جان سے کہہ رہی تھی کہ مجھے جاب کی اجازت دے دیں مگر یہ مان ہی نہیں رہیں۔ آپ ہی سمجھائیے ناں۔“

شعاع نے جلدی سے بات بتائی تو حمیدہ بیگم نے بھی اس کی تائید میں سر ہلایا، گویا یہی بات ہو۔

”ہوں تو ہماری، بہن جاب کرنا چاہتی ہے مگر کیوں؟“

عمیرا کی ایک کیوں میں بے شمار سوال تھے کہ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟ کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟

نہاری ضرورت پوری ہوتی ہے کہ نہیں؟ شعاع جریز ہو گئی۔

”کوئی خاص وجہ تو نہیں، بس یونہی۔“ وہ اور کیا کہتی۔

”یونہی تاکہ تم جاب کر کے ہمارا بوجھ جو تمہارے آنے سے بڑھ گیا ہے، کم کر دو سکو۔“

”نہیں بتایا۔ میں ایسی گھٹیا سوچ کو ذہن میں لا کر نہ تو خود گناہگار ہونا چاہتی ہوں اور نہ آپ کی نیکی کو بانی کرنا چاہتی ہوں۔ بس یوریت کے خیال سے کہہ دیا تھا۔ اگر آپ کو پسند نہیں تو نہ سہی۔“

شعاع نے نرم لہجے میں کہا تو عمیرا سے دیکھ کر رہ گیا۔ کتنا مان رکھا تھا اس نے درد نہ تو ایسی کھری کھری باتیں کر رہا تھا سامنے لے کر رہ جاتا۔

”چھایہ بات ہے، بھی یوریت کا مل تو یہی ہے کہ گھر میں اپنی بھابی کا ہاتھ بٹایا کرو۔ تمہارا گھر ہے اس اخیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ ویسے میں نے تمہاری خواہش نوٹ کر لی ہے، دیکھو جب موقع ملا تو۔ ویسے میرا بلا مشورہ بھی برا نہیں۔“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب عمیر صاحب، آپ کی بہن نے مجھے بے کار کر دیا ہے۔ کچن کا سارا کام نبھال لیا ہے۔ پھر نمرہ کے ساتھ صفائی وغیرہ کرتی ہے۔“

رضوانہ نے اندر آتے ہوئے بتایا تو حرا نے سر جھکا لیا۔

”اچھا تو میری نازک سی بہن سے اتنے کام لیتی ہو۔ ہاتھ دیکھے ہیں اس کے جیسے گلاب کی کلیاں۔“

عمیر نے اس کے مرمریں ہاتھوں کو دیکھ کر کہا تو ایک میں شعاع کے دل میں اٹھی۔ یہ وقت بھی کیا ظالم ٹہ ہے۔ وہ تو سونے کا چچے لے کر پیدا ہونے والی وہ لڑکی تھی، جس نے تمام زندگی پھولوں کی بیج پر گزاری تھی

اس نے تو کائناتوں کا نام بھی نہیں سنا تھا مگر وقت و حالات نے اس سے پھولوں کی بیج چھین کر اسے کانٹوں پر اس طرح چٹا تھا کہ وہ زخم زخم ہو گئی تھی۔ لیکن کیا ستم تھا کہ کاف تک نہیں کر سکتی تھی۔

”آپ کی بہن ہازی نہیں آتی، منع کرتی رہ جاتی ہوں۔“

رضوانہ نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا تو وہ نادمی ہو گئی۔ کتنے اچھے اور غلط لوگ ہیں۔

”ارے نہیں بھابی جب آپ لوگ مجھے اتنی محبت، اتنی چاہت دیتے ہیں تو میں آپ کو، اس گھر کو اپنا کیوں نہ سمجھوں۔“

”اچھا تو کڑی سی بہن۔ اچھی سی چائے بنا دو۔ نرہ تو پڑھ رہی ہے۔ شمرہ کا موڈ آف ہے۔“

”اور یہ ہے بے چاری آرام کر کے تھک گئی ہیں۔“ عمیر نے رضوانہ کا ادھر اور جملہ پورا کیا تو وہ بے چاری کھپا کر رہ گئی۔

”کیوں نہیں بھیا۔ چائے پینے کو تو میرا بھی بوا دل چاہ رہا تھا۔ چلیے اب آپ کے لے بھی بتالوں گی۔“ شعاع نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

”حرا بھابی۔ میں بھی چائے پیوں گا۔“ جواد نے بھی دوسرے کمرے سے ہانک لگائی۔

شعاع مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔ کچن میں جھومنے برتن رکھے تھے۔ اس نے پہلے وہ دھوئے پھر چائے بنا کر کپ کپ کوئی۔ اس نے ایسے کام کبھی نہیں کیے تھے مگر جانے کیوں، اب یہ سب کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ جواد کا کپ سے لگ کر اس کے کمرے میں آ گئی۔

”اچھا تم میری دادی جان بننے کی کوشش نہ کیا کرو۔ کیا دے دیا ہے میں نے کسی کو۔“ ثمرہ خوشخوار انداز  
نہ کی طرف چلی۔

”دینی ہی رہتی ہو۔ کوئی موقع جانے دیا ہے، کبھی کسی کی برتھ ڈے ہے تو کبھی منگنی ہے اور تم نے ہر جگہ  
لے کر ضرور جانا ہے۔ کبھی احساس کیا ہے۔ اکیلے بیٹھا کھاتے ہیں۔ کتنی مشکل سے گھر کی گزراوقات ہو  
ہے۔“

”اگر دونوں بیٹیں آپس میں ابھی ہوئی تھیں۔ شعاع برآمدے میں بیٹھی اگر ان کی باتوں کو نہ بھی سنتا جانتی  
اور خود بخود ہی کانوں میں بین بلائی مہمان کی طرح کھسی آ رہی تھی۔ مگر تھائی کتنا بڑا کردہ کہیں اور جاتی اکیلی  
اور دونوں بیٹوں کی سوچ اور احساسات کا موازنہ نہ کر رہی تھی۔“

”ہاں سب جانتی ہوں مگر کہ حالات کو۔ پھر کیا ضرورت تھی حراصلہ کے چار جوڑے لانے کی۔ یہ  
نہ بوجھ آ رہا ہے ہم پر۔ پہلے بڑے خوشحال تھے۔“ ثمرہ کی تیز آواز شعاع کی گھائل روح کو کاتنوں پر گھسٹتی  
لگتی۔

”اف میرے خدا اب میں بوجھ ہو گئی ہوں دوسروں پر۔“ آنکھوں کے پیالے فوراً ہی لبالب بھر گئے۔  
”آہستہ بولو بھتیجو! حراہمی بے حد حساس ہیں۔ سن لیا تو کتنا برا ہوگا۔ چاہیے ہے، وہ کیڑے بیٹا اپنے  
ت سے ادھار لے کر آئے ہیں۔ اس لیے کہ حراہمی یہاں خان بھیا کے حوالے سے یہاں آئی ہیں اور خان  
بھیا پر جو احساسات ہیں۔ اس سے تو تمہیں بھی انکار نہیں ہوگا۔“

ثمرہ نے کبھی آہستہ بولنے کی تاکید کی اور خود بھی کھٹی کھٹی آواز میں بول رہی تھی مگر قسمت کی ماری  
اب سن رہی تھی۔

”ہاں تو کیا ضرورت تھی ادھار لینے کی۔ وہ اتنی نوابزادی تو نہیں، آگنی کہیں سے۔ ہمارے کپڑے بھی تو  
اچھے ہیں۔ بس میں نہیں جانتی۔ بھیا سے کہو، مجھے دوسروں سے بڑے۔“ ثمرہ ہٹ دھرمی سے بولی۔  
”میں تو نہیں کہہ سکتی۔ خود ہی کہہ لو۔ مجھ سے تو بھیا کے چہرے پر ندامت کے سائے نہیں دیکھے  
تھے۔“ ثمرہ نے صاف انکار کر دیا۔

”ثمرہ بیاری بہن۔ میری مجبوری سمجھو ناں۔ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ تم نہیں جانتیں، نازیہ  
لاٹنی بیاری دوست ہے۔ اس کی برتھ ڈے ہے اور جانتی ہو کتنے امیر ہیں وہ لوگ۔ ان کے تو نوکر بھی اتنے  
لاٹنہ لیتے ہوں گے مگر وہ ہے کہ جان دیتی ہے مجھ پر۔“

ثمرہ نے جب دیکھا کہ کبھی سیدمی انگلیوں سے نکلنے کا نہیں منہ پر اتر آئی۔ نازیہ کی کڑک پر بے شمار  
لٹائے کے چہرے پر اتر آئے۔ ثمرہ نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا، وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ نازیہ واقعی کوئی خاص  
انسان ہے۔

”سوئی بجو۔ میں نہیں کہہ سکتی۔“

ثمرہ نے زور سے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ شعاع نے ثمرہ کو آتے دیکھ کر چہرہ صاف کر لیا۔

”شعاع باجی! مانتا نہ کیجیو گا۔ ثمرہ بجو یوں ہی کبھی کبھی بڑی سے اتر جاتی ہیں۔“

ثمرہ نے شعاع کے قریب بیٹھ کر شعاع کھس پر پیار کیا۔ اتنی کم عمر میں کتنی پختہ سوچ تھی اس کی۔

”ارے شعاع باجی! مجھے آواز دے لی ہوئی۔ آپ کیوں لے کر آئیں؟“  
جواد کتا میں چھوڑ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا تو وہ پیار سے مسکرا دی۔ جواد کو دیکھ کر اسے اپنے ڈھیر سا  
پیارے پیارے کزن یاد آ جاتے۔ یاسر، بولی، شرجی، دانی، کتنے شوخ، کتنے پیار کرنے والے تھے اس کی خوشی  
کتنا خیال رکھا کرتے تھے۔

”ارے تو کون سا قیامت آگئی۔ تم پڑھ رہے تھے۔ میں نے سوچا تمہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے، دینے  
تمہارے پاس پری میڈیکل ہے یا انجینئرنگ؟“ شعاع اس کا کپ اسے تھا کر اپنا لے کر اس کے سامنے والی  
کرسی پر بیٹھ گئی۔

”جی انجینئرنگ۔ اور میں ایروناٹیکل انجینئر بننا چاہتا ہوں مگر۔“ جوش سے بولا ہوا جواد مگر پر آ کر کرک گیا۔  
”مگر کیا؟“ شعاع نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”لیکن یہ کہ مجھے معلوم ہے میں سلیکٹ ہی نہیں ہو سکوں گا۔“ جواد کے چہرے پر مکمل مایوسی چھائی تھی۔  
”ہیں کیوں، سلیکٹ کیوں نہیں ہو سکو گے؟ ماشاء اللہ اتنے لائق تو ہو تم۔“

”ارے نہیں باجی۔ یہ سب دکھا دے کی باتیں ہیں۔ کسی قابلیت کی کہیں ضرورت نہیں۔ آپ کو پتا ہے  
میرے دو دوستوں نے آری میں اپلائی کیا۔ ایک جو بے حد لائق تھا۔ وہ رہ گیا اور جو ایس سا تھا، وہ سلیکٹ ہو  
گیا۔ بھلا یہ کوئی انصاف ہوا۔“

جواد بھی بچہ تھا۔ اتنی سی شوگر برکھیرا گیا تھا۔ اس نا انصافی کی مصلحتوں کو نہیں سمجھ پایا تھا۔

”نہیں جواد۔ بری بات۔ یہ فیضی سوچ ہے تمہاری۔ کوئی اور شعبہ ہو تو انسان مان بھی لے کہ ایسا ہو سکتا  
ہے۔ جہاں تک دفاع کا تعلق ہے تو تمہیں پتا ہے کہ کتنا حساس شعبہ ہے یہ، یہاں تو ایسے ہوشیار اور چوک  
پاسہانوں کی ضرورت ہوتی ہے جو واقعی ملک کی سرحدوں کی پاسپانی کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ممکن ہے تمہارا  
وہ دوست جو سلیکٹ ہوا ہے، اس میں دفاعی صلاحیت موجود ہو۔ یقیناً اس میں وہ کچھ ہوگا جو سلیکٹر چاہتے  
ہوں، جب ہی تو اس کا انتخاب ہوا۔ لیکن تم فکر کیوں کرتے ہو؟ تم پورے غلوں کے ساتھ محنت کرو۔ اللہ تعالیٰ کی  
کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ آئندہ کبھی منفی سوچ کو اس زرخیز دماغ میں جگہ نہ دینا۔ ٹھیک؟“

شعاع نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو جواد گویا ہلکا پھلکا ہو گیا یوں جیسے واقعی اس کا سلیکٹ  
ہو گیا ہو۔ شعاع وہاں سے اٹھ کر اس کمرے میں آگئی۔ جہاں ثمرہ کے ساتھ اب اس کا قیام تھا۔ ثمرہ کا موڈ  
واقعی آف تھا۔ بڑی عجیب منچر کی مالک تھی۔ صرف اپنی ذات کو اہمیت دینے والی۔

”لغت ہے ایسی زندگی پر۔ کہ انسان کو چھوٹی چھوٹی خواہشات کا گلا گھونٹنا پڑے۔“ ثمرہ چیزوں کو اٹھا کر  
ادھر ادھر پھینک رہی تھی۔ ثمرہ حرا کو دیکھ کر شرمندہ ہو رہی تھی۔ شعاع صورتحال کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے کمرے  
سے نکل گئی۔

”بھتیجو۔ کچھ تو خیال کرو۔ کیا سوچیں گی حرا باجی ہمارے بارے میں، اور پھر آئے دن آپ کی دوستوں  
کی برتھ ڈے منگنیاں، شادیاں ہوتی رہتی ہیں، ہم کہاں سے انورڈ کریں! اتنا خرچہ، اب خود ہی بتاؤ۔ کیا ضرورت  
ہے۔ دوست کو اتنا مہنگا پر غلوں کٹٹ کرنے کی۔ کہاں سے دیں امی تمہیں دو تین سو روپے صرف ایک کٹٹ کے  
لیے۔“ ثمرہ اس سے چھوٹی ضرورت تھی مگر بہت حساس اور سمجھدار تھی۔ وہ ثمرہ کو روک کر ٹوکتی رہتی۔



مہمان بھی جاری تھی۔ رخصت اسے چور نظروں سے دیکھتے، دور دور سے۔ قریب آ کر بات کرنے یا بیٹھنے کے لئے نہیں ہمت بہت نہیں تھی۔

”ابو۔ آپ میں حق بات کہنے کی ہمت نہیں تھی تو مجھے ذلیل کرنے کو کیوں لے آئے۔ اتار دیا ہوتا تو اس کی اس دلدل میں جہاں میری ماں اتر گئی۔“

تہائی میں وہ باپ سے شکوہ کتنا ہو کر سسک پڑی۔ ہوی اس کا بے حد خیال رکھتا تھا کہ سیدہ بیگم کو بڑا پڑتا۔

”ہوی بیٹے ٹھیک ہے، وہ تمہارے دوست کی بہن ہے مگر تمہاری اس کے ساتھ بے تکلفی لوگوں کو کھلا چھی۔“

”خدا کے لیے امی جان۔ اور شاید کسی کو غلط چھی نہ ہو مگر آپ کو ضرور ہوگی۔ امی! یعنی ہماری بہن ہے۔ آپ نے یا کسی نے بھی اس کے متعلق کوئی خیال کیا تو گناہگار ہوگا۔“

ہوی تیزی سے بولتا باہر نکل گیا تو سیدہ بیگم حیران سی لپٹے ہوئے پردے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ ان سارے حالات نے ہوی کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ شعاع کے ساتھ اپنا سابقہ رویہ اور اب یعنی کی سوائیڈنگ جہاں مار کا خیال، باپ کا خیال۔ ان سب باتوں نے اسے ذہنی مریض بنادیا تھا۔ وہ فرار چاہتا تھا۔ ان حالات سے گمراہ تھی الجھ رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر سونا چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ رائے میں پڑنے والا شعاع کا کمرہ تھا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ بے ارادہ ہی اس کی نگاہیں اندر چلی گئیں۔

وہ دروازہ بال پھیلانے سے خبری پڑی احمد اسلام احمد کی ”ذرا پھر سے کہنا“ دیکھ رہی تھی۔ خوبصورت لیور پر دھڑکی سی مسکراہٹ نے اسے اور بھی جاذب نظر بنادیا تھا۔ کتنی خوش رہنے لگی تھی۔ راشو کی چاہت سے اس کی خوبصورت آنکھوں میں قدیل بن کر روشن ہو گئی تھی۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ پہلے تو شعاع کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر زندگی مسکراتے لگتی تھی۔ مگر اب وہ بالکل اجنبی ہو گئی ہے۔ ہاں کیوں نہ ہوتی، اس بے گناہ کے ساتھ زیادتی بھی تو بہت ہوئی ہے۔

”شعاع۔ تم ہمیشہ کے لیے راشو کی ہو جاؤ گی۔ میں نے تمہیں کھو دیا شعاع۔ خود اپنے ہاتھوں میں نے اپنے ارمانوں کو جلا ڈالا۔ پھر شکایت کس سے کروں؟“

جانے کب تک وہ یہ غیر اخلاقی حرکت کرتا اور دل سے اٹھنے والی ٹیسوں کو شعاع کی بے حس ہاتھ کرتا مٹا ہٹ پر وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ کیا جانے، شعاع کہیں اس کی چاہت میں سگ رہی ہے۔ یہ ان شعاع ہوتی تو اس کے احساس کا پس یقیناً اسے بھی بے قرار کر دیتا۔ آخری تاریخوں کے چاند کو دیکھتے ہوئے

ہوی نے کیا کچھ سوچ ڈالا۔ اداس سی فضا میں اس کی دھڑکنوں نے بار بار شعاع سے چاہت کا اقرار کیا تھا۔ ڈیہ خالی ہو چکی تھی۔ ہوی نے آخری سگریٹ سلکا کر سرٹھڑی ریٹک سے نکال دیا۔ کتنی دیرانی تھی۔ دل کے

مگر میں۔ وہ خود کو بہت دھکی اور تھا محسوس کرنے لگا۔

”غیر دار۔ سگریٹ صحت کے لیے مضر ہیں۔ یہ تحریر پڑھی آپ نے ڈاکٹر صاحب۔“

اشعر جانے کب آ گیا تھا اور اب ایٹھ ٹرے اس کے سامنے کیے کھڑا اس کے دیران دھواں دھواں کے کو دیکھ رہا تھا۔

”میں بہت ڈسٹرب ہوں اشعر۔ یعنی ہر وقت سوائیڈ نظروں سے دیکھتی ہے۔ ابوالگ اس فکر میں مچلتے رہے ہیں کہ راز افشاں ہوگا تو کیا ہوگا؟ میں خود پریشان ہوں۔ میں کیا کروں؟“

ہوی جس قدر اذیت میں تھا اتنی وہ لفظوں میں بیان نہیں کر پایا تو جھنجھلا گیا۔

”میں سمجھتا ہوں ہوی، مگر اب کیا کیا جا۔؟ ہمیں کسی مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”لیکن میں اس جہنم میں رہ کر کسی جنت کا انتظار نہیں کر سکتی، بیٹا پلیز مجھے میری تہائی کے پاس چھوڑ آئیں ہاں کم از کم میرا سانس تو آسانی سے آتا تھا۔ یہاں ایٹھ کے میلے میں مجھے ٹھن محسوس ہوتی ہے۔ پلیز مجھے ہاں چھوڑ دیجیے۔“ اشعر کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ یعنی رونی، دنی آ کر ہوی کے ساتھ لگ گئی تو ہوی لڑنے لگا۔

”یعنی اتم جذباتی ہو رہی ہو اور تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا جب تک سب کو خبر نہیں ہو جاتی۔ تم جتا مار ہو۔“ اشعر نے چلتی ہوئی یعنی کو دیکھ کر کہا تو وہ بیٹھی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اتنا دکھ، کتنا کرب تھا ان برستی اہوں میں اشعر نظر نہیں کتر گیا۔

یعنی کے جذباتی پن سے ہوی تو بے حوصلہ ہو گیا تھا۔ اشعر بھی گھبرا گیا۔ ابھی کوئی آگیا تو نجائے گیا بچے۔ اور کیا کیا باتیں بنیں۔ اشعر نے ایک نظر ہوی پر ڈالی جو دونوں ہاتھوں میں سر تھا بے بیضا تھا۔ شدت ہاں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”یعنی پلیز۔ اس وقت تم عالی پھو کے پاس چلی جاؤ پلیز۔“

اشعر نے رنی سے یعنی کا ہاتھ پکڑا مگر اس نے جھٹکے سے ہاتھ چمڑا لیا۔

”نہوہ۔ یہ تو حال ہے کہ بھائی کے کمرے میں آنے پر پابندی۔ بھائی سے بات کرنے پر پابندی آج لایمیرے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا تو سیدہ امی نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا کہ وہ آئندہ اسے میرے قریب بیٹھا لایمیں نہ بات کرتا ہوا۔ تف ہے میری زندگی پر مجھے تو مر جانا چاہیے۔“

یعنی چہرے پر ہاتھ رکھے باہر نکل گئی تو ہوی کا بچی چاہا۔ چیخ کر ساری دنیا کو بتا دے کہ یعنی، رخصت احمد کی ماہ۔ اس کی بہن ہے جو مصطفیٰ کی نذر ہو گئی ہے۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

”یہ یعنی ابھی ابھی میں سے گئی ہے رونی ہوئی، کیا کہا ہے تم لوگوں نے اسے؟۔ ہوی! اشعر! کیا بات لگے اس سے؟“

راشو نہ صرف غصے میں تھا بلکہ بے اعتباری سے ہوی اور اشعر کو گھور بھی رہا تھا۔ جن کے اپنے چہرے اٹھائے تھے۔

”اشعر بتاؤ پلیز۔ راشو صاحب کو بھی بتاؤ ساری دنیا کو بتاؤ کہ یعنی کون ہے، اس کو کسی نے کیا کہا ہے کہ اتنا دکھ کہ وہ میری بہن ہے رخصت احمد کی بیٹی ہے مگر پھر بھی بے گناہ اور بے نام ہے۔“



ابھی بیٹھے ہی تھے کہ عالی بیٹو، کو ساتھ لگائے ہوئے آگئیں۔

”ہوی! اشعر! کیا کہا ہے تم نے میری بیٹی سے؟“ کیسے رو رو کر بلکان ہوئی ہے۔“

عالی نے سرزنش بھرے لہجے میں ہوی اور اشعر کو دیکھا تو اشعر نے گہری نگاہوں سے عینی کے دھلے ہوئے کودیکھا جس کی آنکھیں شدت گرہ سے سوچ گئی تھیں۔

”اچھا جی۔ پھوسے ہماری شکایت لگائی گئی ہے۔ ٹھیک ہے آئندہ ہم بات نہیں کریں گے۔“

اشعر کے لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ عینی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اشعر کی آنکھوں میں برہمی اور اے پختی تھی۔ عینی پریشان ہو گئی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی معذرتی کلمہ کہتی، اشعر تیزی سے باہر نکل گیا۔ عینی کی پٹھن میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا کرے۔ رات بھر وہ مضطرب رہی۔ مخلص سے اس شخص نے کتنا مان رکھا تھا اس کا، کافی سہارا دیا تھا اور وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر اسے غلط جانے، یہ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

اشعر بھی تو مکمل طور پر روٹھ گیا تھا۔ دو روز سے سامنا بھی نہیں ہوا تھا ورنہ عینی جہاں کہیں بھی ہوتی ’اس کی لڑی ہاں خود پر محسوس کرتی اور اس کی اپنی دھڑکنیں بھی تو اسی کے نام پر بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ عالی نے ایسی مذاق کیا تھا۔ وہ اسے سچ جان کر روٹھ بیٹھا تھا۔ وہ اسے منانا چاہتی تھی۔ سوری کرنا چاہتی تھی۔ مگر اول تو وہ اسے ہی نہ آتا اور آتا بھی تو سب موجود ہوتے۔ اس وقت اتفاق سے اشعر لاؤنج میں اکیلا لگ گیا تو وہ اس کے رہنچ چلی آئی۔

”آپ۔ آپ مجھ سے خفا ہیں؟“ وہ بمشکل کہہ پائی تو ایسے میں ہاتھوں کو آپس میں جکڑے پریشان سی لڑی اشعر کو بہت اچھی لگی مگر وہ بنا رہا۔

”جی نہیں۔ میں کس بات پر خفا ہونے لگا۔ ہمارا آپ سے ناراضگی کا کیا رشتہ ہے؟“ وہ مزید اترانے لگا اور یہ پریشان ہو گئی۔

”دیکھ بیٹے، وہ تو خالد جان نے دیے ہی مجھے بہلانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ ورنہ میں نے بھلا آپ کی کیا گت کرتی تھی۔ آپ نے درست بات کہی تھی۔ پھر میں شکایت کیوں کرتی؟“ پلیز اشعر بھائی۔“

”اؤںہوں۔ اشعر بھائی نہیں صرف اشعر۔ بڑی مشکل سے تو زندگی میں ایسی لڑکی آئی جس کے منہ سے میں افسانہ سننا چاہتا ہوں۔ کچھ سمجھیں آپ؟“ اشعر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ ملکیں جھکا کر رہ گئی۔

راشور اشعر کی منگنی کی تیاریاں بنیو گی سے ہو رہی تھیں۔ علینہ کی جان پر بن رہی تھی کیونکہ یہ سب تو اللہ تھا۔ اسے تو بہر حال یہ سب چھوڑنا تھا جبکہ اس کے دل کے ویران نگر میں راشور کی محبت نے روشنیاں پھیلانا تھا تو اسے یہ سب کچھ چھوڑ دینے کا احساس دکھی کر دیتا۔ ایسے میں ڈاکٹر طاہرہ درد کا درماں بن جاتیں۔

”آپ نے کہاں پھنسا دیا ہے مجھے آئی؟“ وہ فون پر آنٹی سے الجھ پڑتی۔

”او کم آن علینہ۔ اس میں ایسی کیا بات ہے؟“ انجوائے کر داس صورت حال سے۔“

”انجوائے۔ آئی آپ اسے انجوائے منٹ کہہ رہی ہیں۔ میری جان پر بنی ہے اور آپ کہہ رہی ہیں مجھے کر دل زندگی داؤ پر لگی ہو تو کون ایسا ہے جسے جو انجوائے کر سکتا ہے۔“

ہوی آخر کب تک ضبط کرتا سسک پڑا تو راشور کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھے گیا۔ پھر اشعر نے ساری کہانی اس کے گوش گزار کر دی۔ ہوی کمرے سے نکل گیا۔ جیسے جیسے اشعر بتا رہا تھا۔ راشور کی آنکھیں حیرت سے پھل رہی تھیں۔

”یار اشعر۔ کیا ہیں ہمارے گھر کے بزرگ، کیسے کیسے انکشافات ہو رہے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ رجن پچا جیسا انسان بھی اس قدر گہرا ہو سکتا ہے۔“

راشور کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”کیا بات کرتے ہو راشور؟ انسان بہت کمزور شے ہے۔ جذبات اس پر بڑی جلدی حاوی ہو جاتے ہیں انسان اپنی پہلی محبت کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اور پھر ایک بے سہارا کو سہارا دے کر انہوں نے کوئی گناہ یا جرم نہیں کیا۔“

”ہاں۔ مگر اشعر اب ہو گا کیا، چچی جان انکل فرمان کو معاف نہیں کر سکیں تو شوہر کو حاف کر دیں گی بھلا بہت ہنگامہ ہو گا اشعر، بہت ہنگامہ ہو گا۔“

راشور آئندہ کا قصور کر کے ہی پریشان ہوا تھا۔ وہ آنے والی تباہی کو دیکھ رہا تھا۔

”ہاں اللہ ہی مالک ہے۔ ہوی آ رہا ہے۔ اسے تسلی دینا، بہت ڈسٹرب ہے۔“

راشور نے ہوی پر نگاہ ڈالی۔ کتنا بدل گیا تھا۔ نہ آنکھوں میں نفرت کی، بجلیاں کو ندر رہی تھیں اور نہ چہرے پر رعونت تھی۔ اب تو ڈپریشن اور حزن و ملال نے وجہیہ چہرے کو دھندلا دیا تھا۔ راشور آہستگی سے چلا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

”ہوی۔ کیوں پریشان ہوتے ہو؟“ یہ سب قدرت کی طرف سے ہوا ہے۔ میں چچا جان کو قصور وار نہیں سمجھتا۔ تم تنہا نہیں ہو، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ عینی صرف تمہاری بہن نہیں، میری بھی ہے۔ وہ ہماری ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے۔ تم خود کو تنہا کیوں سمجھتے ہو؟“ راشور نے اتنے خلوص سے کہا کہ ہوی کچھل گیا۔ ساری نفرتیں، ساری رقابتیں بہہ گئیں۔ وہ راشور کے گلے جا لگا۔

”راشور! یہ سب کیوں ہوا؟“ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ”وہ رو ہانا ہو گیا۔“ لیکن اب جبکہ ایسا ہو گیا ہے تو ہمیں مردانہ وار اس صورتحال کا مقابلہ کرنا ہے۔“ پھر اشعر اور راشور اسے سمجھاتے رہے۔ حوصلہ دیتے رہے تو ہوی بہل گیا، آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا اب اس میں۔

”راشور میں۔ راشور میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کہ میں تم سے مس بی ہو کر رہا ہوں۔ بس نفرت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی کہ میں حقیقت۔“ راشور کے خلوص میں دھل کر ہوی کا آئینہ دل شفاف ہو گیا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

”اوہ کم آن یار۔ چھوڑو۔ ان فضول باتوں کو۔ اسی طرح ہوتا ہے۔ ممکن ہے میرے ساتھ ایسی صورتحال ہوتی تو شاید میں بھی ایسا ہی کرتا۔ اب ہمیں مل کر سوچنا ہے آئندہ پیش آنے والے حالات کے بارے میں۔ اب تم ریلیکس ہو جاؤ۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

راشور کی تسلیوں نے ہوی کے لیے کسی طوفان کا کام کیا وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگا۔



ڈاکٹر طاہرہ کے اس فخرے سے علیہ کو بے حد دکھ ہوا۔

”آپ کو کیا خبر آئی۔ آپ جسے انجوائے منٹ کہہ رہی ہیں۔ وہ میری چاہتوں کا سفر بن گیا ہے جس پر میں اتنی دور آچکی ہوں کہ لوٹ جانا میری موت بن سکتا ہے۔“ علیہ نے گہرے دکھ کے احساس کے ساتھ سوچا۔

”علیہ۔ بیٹی! کیا سوچ رہی ہو تم جانتی ہوناں یہ سب شعاع کے لیے کر رہی ہو۔ یہ ایک نیک عمل ہے اور ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اس نیکی کے بدلے ایسا اجر دے کہ تم تمام عمر خوشیاں سینٹے گزار دو گے۔“

ڈاکٹر علیہ سب سمجھ رہی تھیں کہ علیہ راشو سے متاثر ہو گئی ہے۔

”مگر آئی۔ ممکن قریب ہے تو۔؟“

”ارے بچے! تو ہونے دو۔ مبارک شکون ہے۔“

ڈاکٹر طاہرہ نے ہنس کر کہا تو وہ روا ہانسی ہو گئی۔

”آئی کو تو بس ہر وقت مذاق ہی سو جاتا ہے۔ میری جان پر بنی ہے اور وہ ہنس رہی ہیں۔“

علیہ نے خشکی سے خدا حافظ کہہ کر ریسور رکھ دیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ کچھ سوچنا چاہتی تھی

کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”آ جاؤ۔“ وہ یونہی پڑی رہی۔

ارے آپ۔؟“ ہوی کو دیکھ کر وہ فوراً سیدھی ہو گئی۔

”ہاں۔ میں۔ میں شعاع تم سے کچھ کہنے آیا ہوں۔“

ہوی کے بھاری لہجے کا کھوکھلا پن اس کے وجہہ چہرے پر حزن و ملال اور۔ اداس کر دینے والی شام کے لمبے ساہوں نے ہوی کی شخصیت میں عجیب سی کشش بھردی تھی۔ علیہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اسے شعاع کا کبھی پرہہ کر دکھ ہو رہا تھا جس نے بہت جلد ہمت ہار دی تھی۔

”جی ضرور آپ کو جو کہتا ہے کیسے میں بہترن گوش ہوں۔“

علیہ پورے اخلاق سے ہوی کو کرسی پیش کی بیٹھنے کے لیے مگر وہ نہیں بیٹھا۔ کچھ دیر اسے خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر آہستگی سے کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

”وقت اور حالات بعض اوقات انسان کو ایسے دورا ہے پر لا کھڑا کرتے ہیں شعاع کہ نہ تو موت کو گلے لاس کے لیے آسان ہوتا ہے اور نہ ہی زندہ رہنا ہی اس کے بس کی بات رہتا ہے۔ کاش انسان اس بات پر اور ہو۔ گزرا ہوا وقت واپس لاسکے تو۔ لیکن ایسا ممکن ہی کہاں ہے اور میری جھولی میں تو چھید ہی اتنے ہیں شعاع کہ کوئی خوشی ٹھہر ہی نہیں سکتی تم چند روز بعد مکمل طوراً شوکی ہو جاؤ گی۔ راشو بہت اچھا انسان ہے اور تم واقعی اس کے قابل ہو اور میں تم سے اپنے تمام سابقہ رویوں کی معذرت چاہتا ہوں۔ تم پہلے بھی اعلیٰ ظرف تھیں اور اب تم اس لیے پلیز اب میری طرف سے دل صاف کر لو۔“

ہوی کی آواز علیہ کو کسی کھنڈر کے دیوانوں سے ابھرتی ہوئی سوس ہوئی۔ ہوی چاکا تھا اور علیہ یوں ہی اُمم کھڑی بس کے نقش پا دیکھتی رہ گئی اور ہوی سے کوئی قلبی جذباتی تعلق نہ ہونے کے باوجود علیہ شدت سے ”کاش“ سے شعاع اور ہوی کی اجڑی محبت پر شدید دکھ ہو رہا تھا۔

”کاش شعاع! تم نے مجھوں پر جی برف کے کھیلنے کا انتظار کیا ہوتا۔ تم نے اتنی جلدی ہمت کیوں ہار دی ایک بار دیکھو تو آکر ہوی تمہیں کھو کر کتنا جی دامن ہو گیا ہے۔“

مگر میں ممکن کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ آغا جی اور بی بی جان جلد از جلد یہ خوشی دیکھنا چاہتے تھے اور

آغا جی بذات خود اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔  
 ”شعاع اور راشو کی خوشی ہماری اولین خوشی ہے رحمن بیٹے۔ کوئی کمی یا کسر نہیں رہنی چاہیے۔ شعاع کی ماں کی بیٹی ہے اور۔ اور باپ ہوتے ہوئے بھی اس کی خوشی میں شریک نہیں اس لیے میں تم سے توقع نہیں ہوں۔ کہ اسے باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دو گے۔“

آغا جی نے رحمن کو پاس بلا کر بطور خاص ہدایات دیں تو انہوں نے ان کے خیمے ہاتھ تھام لیے۔  
 ”آغا جی! آپ۔ آپ کی اولاد آپ کے اعتماد اور محبتوں کے لائق نہیں تھی جتنی آپ نے دے رکھی ہے۔ لیکن میں آپ کو اس معاملے میں مایوس نہیں کروں گا۔ شعاع کو فرمان کی کمی محسوس نہیں ہوگی آپ مطمئن رہیے۔“

رحمن جو اندرونی طور پر خود بھی آغا جی سے شرمندہ تھے۔ آغا جی کے ہاتھ آنکھوں سے لگا کر بولے۔  
 ”جیتے رہو بیٹے! تم نے تو کبھی میرے اعتماد کو محسوس نہیں پہنچائی۔ ساری اولاد میں ایک تم ہی تو ہو جس میں اعتماد کر سکتا ہوں۔“

آغا جی واقعی رحمن سے بہت مطمئن تھے۔ انہوں نے کبھی ان کا دل نہیں دکھایا تھا۔ اس وقت تو رحمن گزے جارہے تھے، وہ نظریں کتر کر کھڑے ہو گئے۔  
 ”اور ہاں بیٹے! دوسری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ گھر میں جو نجی یعنی آئی ہے اس کے بارے میں کچھ سوچو۔“

”جی! آغا جی یعنی کے بارے میں؟“ رحمن کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ کتنا عجیب موڑ آیا تھا زندگی میں۔ ان کی اپنی بیٹی ان کے ہی گھر میں غیر اجنبی بن کر دوسروں کے لیے سواہر نکالنے لگی تھی۔ اور وہ خود رشتوں کی اس عدالت میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی مجرم بنے کھڑے تھے۔  
 ”ہاں بھی وہ عذرا بیٹی بتا رہی تھی کہ وہ نجی اشعر اور ہونی کے دوست کی بہن ہے۔“

”اس کے علاوہ آغا جی اور عالی کی اسٹوڈنٹ بھی ہے اور عالی ہی نے اس کی ذمہ داری لی ہے۔ آپ گھر مند نہ ہوں۔ ویسے بھی وہ نجی بڑے اچھے خاندان کی شریف نجی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے رحمن کے دل پر جو قیامت گزر رہی تھی یہ وہی جانتے تھے۔  
 ”ٹھیک ہے رحمن بیٹے مگر وہ نجی ہے، پرانی عزت ہے گھر میں لڑکھی ہیں۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے خون پر اعتماد ہے، لیکن پر بھی احتیاط کرنی چاہیے۔ تم اس کے والد اور بھائی کو خط لکھو دو کہ جتنی جلدی ممکن ہو نجی کو لے جائیں۔“

”جی بہتر!“ رحمن کا دل رو پڑا۔ کیا قسم طریق تھی کہ وہ بیٹی کو بیٹی نہیں کہہ سکتے تھے۔ رحمن احمد کچھ دل کو لیے باہر آئے تو یعنی پر نظر پڑی جو صدف کے ساتھ خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ رحمن تڑپ اٹھان کے جی چاہا اسے سینے سے لگا کر پیچ پیچ کر کہیں کہ یہ ان کی بیٹی ہے ان کی اولاد ہے۔  
 وہ بے خود ہو کر یعنی کے قریب چلے آئے۔  
 ”یعنی بیٹی! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟ تم یہاں خوش تو ہوتا۔ یعنی اسے اپنا ہی گھر سمجھنا کوئی شکایت ہو کسی سے شکوہ ہو؟ تمہیں آج کو بتایا کرو۔“ رحمن کے لرزتے لہجے کے ساتھ لرزتا ہاتھ یعنی کے سر پر ٹھہر گیا۔ یعنی نے

بہاؤ کو دیکھا، جن کا کس آنکھوں میں اتر آنے والی نمی سے دھندلا گیا تھا۔  
 ”جی نہیں اکل! مجھے بھلا کسی سے شکایت کیوں ہونے لگی سب ہی تو اتنا چاہتے ہیں آپ کی شفقت ماں کی پورا کرتی ہے اور ہونی بھیا بھائیوں۔!“

یعنی کی آواز لڑکھڑا گئی۔ وہ بمشکل خود پر قابو پا کر وہاں سے بھاگی۔ وہ اس وقت کی۔ یہ بات نہیں کرتا اپنی جی۔ خاموشی سے لیٹ جانا چاہتی تھی مگر اشعر سے مذہمیز ہو گئی۔  
 ”یا اللہ! مجھے اتنی برسات پسند نہیں۔ لڑکی تمہارا نازک سا وجود بہہ جائے گا ان آنسوؤں کے سیلاب کی۔“ اشعر نے اس کے ترچہ سے کود دیکھا۔  
 ”اچھا ہے ناں، بقیہ ہی ختم ہو جائے گا۔“ بے شمار آنسو پلکوں کی گرفت سے آزاد ہو کر گرے۔  
 ”بھئی یعنی صاحبہ! ویسے تو مجھے بھی اس قصے کے ختم ہونے پر اعتراض نہیں، مگر اب مجبوری ہو گئی ہے میرے دل کا معاملہ ہے ناں۔“

اشعر نے تھوڑا سا جھک کر یعنی کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا جس کے سینے پر وہ سناٹ تھے۔  
 ”آپ مجھ پر ایک احسان کریں گے۔“ اشعر نے اس سے پہلے پلوں۔ شمر دیکھا۔  
 ”ہر گز نہیں، قطعی نہیں۔“

”جی۔“ یعنی نے مایوسی سے اس خوب رو مضی کو دیکھا، جس کے دلاسوں نے اس کے دل کی ڈوبتی ناز کو اپنے سے بچا لیا تھا۔  
 ”جی! اس لیے کہ میں ایک احسان نہیں بلکہ بے شمار احسان کرنے کا عادی ہوں۔ ایک احسان کرنے سے مجھے کچھ بد محسوس ہو جاتی ہے اس لیے۔“ وہ خوش ہو گیا۔  
 ”اشعر پلیز! آپ مجھے واپس چھوڑ آئیے۔ انسانوں کے اس میلے میں بے شمار رشتوں کے بیچ میں اجنبی ہوں۔ بے حیثیت ہوں، اس شخص کی بیٹی اور بہن ہوں جس کا کوئی وجود نہیں۔ نہیں اشعر! میں یہاں نہیں رہ سکتی لڑکوں کے درمیان اجنبی بن کر بے نام بے حیثیت ہو کر۔“

”دیکھو یعنی! میں تمہاری کیفیت سمجھتا ہوں لیکن۔ یہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں تھوڑا سا اور کرلو۔ راشو اور شعاع کی منگی کی رسم ہو جائے۔ تو اگر رحمن اکل اور ہوز خاموش بھی رہے تو میں خاندان بھر کے سامنے تمہیں اپنا ہاؤس کرانتا با حیثیت کر دوں گا کہ کوئی فرد تمہاری حیثیت کو چیلنج نہیں کر سکے گا بولو میرا ساتھ قبول ہے عمر بھر کے لیے۔“

اشعر کی باتوں کی مہک یعنی کی روح میں اترنے لگی۔ اشعر کی آنکھوں کی چمک اس کے دل کے اندھیروں کو مٹانے لگی اس سے قلب وہ کوئی جواب دیتی اسی وقت شرعی، صدف نے دھار ابول دیا۔  
 ”اشعر بھیا! سدرہ جاکیں آپ، یہ نہ سمجھ جیسے کہ ان کا کوئی نہیں۔“

شرعی سینہ تان کر اشعر کی طرف بڑھا۔  
 ”ارے نہ بابا نہ، میں ایسا کیوں سمجھنے لگا۔ میں جانتا ہوں کہ تم جیسے گھرو بھائی ہیں۔“

”اونہوں! سارے جذبات کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔ سن رہی ہیں محترمہ! آپ تھوڑی سی چھوٹی ہو ہائیں تو آج رحمن ہمیں آپ کا بھائی نہ کہہ رہے ہوتے۔“

پشانی بنار مانوں کے لئے کا تماشا دیکھتا رہا۔ کتنا بے کار اور غیر اہم تھا اس کا وجود شعاع کے لیے کہ اس کا اسے احساس ہی نہیں تھا اور کتنا معتبر تھا، راشو کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کی پسند کا خیال رکھا جا رہا تھا۔ یہ ہی احساس درد سا جگا رہا تھا۔ اپنی بے وقوفی کا احساس اسے مار گیا۔ علینہ۔ یہ سب محسوس کر رہی تھی مگر وہ بھی کیا کرتی، ایک ہی صلی شعاع تو نہیں تھی کہ اس کی چاہت کا جواب چاہت سے دیتی۔ کبھی کبھی تو اس کا کھٹ سے جی چاہتا رہی کو شعاع کے بارے میں بتا دے وہ خواہاں اسے شعاع سمجھ کر دیکھی ہوتا رہتا ہے۔ اس کے دل پر تو شروع ہی سے راشو کا قبضہ ہو گیا تھا جو چند روز میں اس کا ہونے والا تھا۔ اسی خیال کے تحت شرمیلی سی مسکراہٹ اس کے من پر آ گئی۔



باقی سب تو خوش اور مطمئن تھے مگر کچھ ہستیوں کو آغاجی کا شعاع سے التفات پسند نہیں آیا تھا۔ ”حد ہو گئی یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا۔ آغاجی اس کی اولاد کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں جس نے ان کی اہمائی کی اسی کو اتنا نواز رہے ہیں اور ہم لوگ جنہوں نے تمام عمر غلامی میں تابعداری میں گزار دی، ان کو کیا ملا باری اولاد کو کیا ملا۔ شعاع کی تو منگنی پر ہی اتنا خرچ کر رہے ہیں کہ۔“

عذرا بیگم ہر کے سامنے جی کھول کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

”عذرا۔ عذرا! کیوں اتنا خون جلاتی ہو۔ شعاع کا معاملہ اور ہے اور پھر یہ سب تو بنیوں کے اپنے نصیب دے ہیں۔ یہ بھی تو سوچو شعاع کے پاس ہے کیا۔ دولت کا بنیاد اسے انسان کو خوشی نہیں ملتی بے چاری کی ماں سے لہا ناپ ہوتے ہوئے بھی اس کی خوشی میں شریک نہیں چھوڑاں دان باتوں کو خوشی کو خراب نہ کرو ایسی باتوں سے۔“

”ہونہہ! یہ قدسیہ بھابھی بھی بڑی تیز ہیں۔ جب دیکھا کہ شعاع اتنی بالدار ہے تو فوراً اسے بہو بنانے کا لانا کر دیا۔“ عذرا بیگم کو رہ رہ کر قدسیہ بانو پر غصہ آیا کرتا۔

”عذرا بیگم! شعاع اس گھر کی بیٹی ہے اس کا حق ہے کہ وہ اسی گھر کی بہو بنے اور اس مقصد کے لیے ان لائبراشو ہوی اور اشعر پر تھی۔ ہوی سے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور تمہارے بیٹے نے شعاع کو بہن کہہ دیا انواب راشو ہی بچا تھا اور اچھا ہی ہوا ہے ورنہ آغاجی کتنے دکھی ہو جاتے۔“

”ہونہہ! دکھی ہو جاتے۔“ عذرا بیگم نہ تو شوہر کے دلائل سے متفق تھیں اور نہ ہی ان کو آغاجی کے انصاف میں تھا۔

دوسری طرف اس منگنی پر جو دوسری ہستی ناخوش تھی وہ سیدہ بیگم تھیں جو کیکر کو پینٹے رہنے کا عزم کر چکی تھیں۔ مگر اب وہ کمزور پڑنے لگی تھیں ان کی بیساکھی ان کا بیٹا ہوی جو ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ وہ ساتھ تھا تو ان کا ہاتھ لگا کر وہ خاندان بھر کو ناکوں چنے چوہا دیں گی۔

مگر جس کے بھروسے پر ایسا کیا کرتی تھیں وہ ہی ریت کی دیوار کی طرح ڈھلے گیا۔ نہ جانے کیوں وہ سمجھ لکھا ہلی تھیں۔

”ہوی چاند! تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم تو میرا سہارا تھے بیٹے! میں نے تو سوچا تھا کہ تم ساتھ ہو تو ایک بار تو ناکھان کو، آغاجی کو بتا دوں گی کہ انصاف کس کو کہتے ہیں۔“

”اکی جان پلیر! امت کریں ایسی باتیں کچھ باقی نہیں بچا ہے۔ ہم نے جو گڑھاد و سروں کے لیے کھودا

شرعی نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ یعنی بے ساختہ مسکرا پڑی۔ یوں جیسے گہرے بادلوں کے درمیان سے سورج کی چھوٹی سی کرن جھانک کر مسکرا رہی ہو۔ اشعر اسے مسکراتا دیکھ کر خوش ہو گیا اور پھر عذرا بیگم کو اتنا غصہ جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا کیونکہ عذرا بیگم کو یعنی کچھ خاص پسند نہیں تھی اس کے لیے ان کی نظر شہزادی بنی شرمین پر تھی۔

راشو اور شعاع کی منگنی گھر کی تاریخ کی منفرد منگنی تھی جو اتنے اہتمام سے منائی جا رہی تھی۔ شعاع کی طرف سے سارے انتظامات عالی نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔

”ہوی بیٹے! آج شام تم مصروف ہو رہے ہو تو نہیں ہو؟“

”کیوں خالد جانی! اگر مصروف ہوتا بھی تو آپ حکم کر سکتی ہیں۔“

ہوی کتاب بند کر کے کھڑا ہو گیا۔

”حکم تو بعد میں کروں گی یہ تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے چاند! اتنے کمزور ہو گئے، کیا سوچتے رہتے ہو؟ آنکھوں کے گرد حلقے پر گئے ہیں۔ ہوی! میں نے تمہاری پرورش بڑے ارمانوں سے کی ہے جان! میں تمہیں افسردہ نہیں دیکھ سکتی۔ بتاؤ۔ کیا پریشانی ہے؟“

عالی نے ہوی کا ویران چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا تو وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر مسکرایا۔

”آپ ناحق فکر مند ہو رہی ہیں خالد جانی! اچھا بھلا تو ہوں، بس ذرا منگنی کے لیے سوچتا رہتا ہوں۔ نہ جانے اس کا کیا مستقبل ہوگا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے یعنی کے بارے میں فکر بند ہونے کی۔ وہ صرف تمہاری ہی ذمہ داری نہیں اور پھر جب بڑے موجود ہیں تو تمہیں منگنی کے لیے فکر بند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں چلو تیار ہو جاؤ، شاپنگ کرنے جاتا ہے۔“

شاپنگ کرنے! ہوی حیران۔ نظروں سے عالی کو دیکھنے لگا۔

”ہاں شعاع کے لیے شاپنگ کرنی ہے ناں!“

ایک نیم سی ہوی کے دل میں ابھری۔ بھلا شعاع کی شاپنگ سے اس کا کیا واسطہ۔

”شعاع کے لیے شاپنگ کرنی ہے تو خالد جانی! راشو کے لئے کر جائے میں بھلا کیا کروں گا۔ راشو کی پسند کی ہونی چاہیے شاپنگ تو۔“ وہ مردہ سے لہجے میں بولا۔

”لو یہ کوئی اچھا لگتا ہے کہ جس کے ساتھ منگنی ہو اسی کے ساتھ شاپنگ کی جائے، چلو جلدی سے تیار ہو کر آؤ، شعاع تیار رہی ہے۔“

ہوی کا ریڈور سے ہوتا ہوا نیچے آیا تو اس نے دیکھا۔ سیڑھیوں کے قریب راشو شعاع سے جانے لیا سرگوشی کر رہا تھا کہ شعاع کا چہرہ اسرخ ہو گیا۔ حیا کی سرخیوں نے اسے مزید حسن بخش دیا۔ ہوی نے دل سے تم زدہ ہو کر اہم لیا۔ آنکھیں بند کر کے ایک گہرا سانس لیا۔ کاش ایسا نہ ہوتا، کاش راشو کی جگہ وہ ہوتا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور گاڑی نکالنے لگا۔

شاپنگ کے درمیان سارے وقت شعاع شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ شاپنگ کرتی رہی۔ عالی نے سب کچھ اس کی پسند پر ڈال دیا تھا اور اس نے ساری شاپنگ راشو کی عین پسند کے مطابق کی تھی۔ ہوی خاموش



”اف میرے خدایا، تو ہی مدد کرنا۔ میری تو ہی کچھ کچھ میں نہیں آتا۔“ ہوی نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام

”ہر وقت مت سوچتے رہا کرو۔ ہوی کیا بیمار پڑتا ہے۔“

”میں کیا کروں اشعر! یہ سوچیں میرا اچھا نہیں چھوڑتیں۔ اشعر! می ہرگز بخنی کو سوتلی بیٹی کی حیثیت سے

نہیں کریں گی۔ ادھر اہو کی بے بسی اور بخنی کے آنسو یہ سب برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔“

ہوی بہت گھبرا گیا تھا۔ بہت پریشان رہنے لگا تھا۔

”ہوی! تم تو ایسے کر رہے ہو، جیسے یہ صرف تمہاری ہی ذمہ داری ہے، سب خدا پر چھوڑ دو۔ میرا خیال

ہے تم چند دن کے لیے اپنے دوست عیسر کے پاس لاہور چلے جاؤ۔ ذرا آؤ تنگ ہی ہو جائے گی۔“

”ہونہ! اول کا درد تو ساتھ ہی رہے گا ناں۔ چاہے لاہور۔ چلا جاؤں یا امریکہ!“

ہوی کے لہجے میں گھر سے درد کو محسوس کر کے اشعر بھی افسردہ ہو گیا۔



شعاع کی خندنی نفرت نے سب کو اپنا گردیدنا لیا تھا۔ خصوصاً ثمرہ جو ہمیشہ اس کی طرف طعنوں کے

نہ اچھا کرتی، اب اس کے اخلاق سے اس کی بہترین دوست بن گئی تھی۔ گو کہ اس کی فطری ہمت دھری ابھی

”ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ ابھی کچھ چھپا کر رکھا ہوا ہے مجھ سے۔ یعنی ابھی مکمل اعتماد کے لائق نہیں

”ارے نہیں حرا! یہ بات نہیں۔ خدا کی قسم تمہاری صورت میں تو مجھے وہ دوست ملی ہے جس سے میں کچھ

”اچھا چلو چھوڑو پرانی باتیں۔ وہ نئی بات بتاؤ۔ جواب تک چھپا رکھی ہے تم نے مجھ سے۔“

”وہ حرا، بات یہ ہے کہ۔“ بات کرتے کرتے ثمرہ رک گئی۔ اس کے رخساروں پر سرفی پھیل گئی تھی۔

”ہاں پھر کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اس کا؟“

شعاع نے براہ راست پوچھ لیا تو ثمرہ شرمناک اس کے گلے لگ گئی۔

”اس کا نام عامر ہے۔ حرا اور بے حد چاہتا ہے مجھے۔“

”اسے چاہتا بھی چاہیے۔ ہماری ثمرہ تو ہے ہی چاہے جانے کے لائق۔“

شعاع نے غلوں کے ساتھ ثمرہ کو دیکھا۔ خیکھے نقوش والی سانوئی سی ثمرہ واقعی بہت پرکشش تھی۔

”تم تو بارہی ہو۔“ ہاں حرا اس کی تصویر بھی ہے میرے پاس۔“

جب راز مکمل ہی گیا تھا تو پھر تصویر چھپانے سے کیا فائدہ تھا۔ وہ جلدی سے اپنی وراز سے عامر کی تصویر

نگاہ لائی۔ شعاع نے تصویر دیکھی تو نہجانے کیوں اس کا دل بچھ سا گیا۔ تصویر والا لڑکا بڑا ہونا اب وہاں شرم کا

لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی کہ شعاع کو قطعی طور پر وہ پسند نہ آیا۔ تاہم وہ ثمرہ کی دل آزاری کے

”ٹھیک ہے ہوی! میں تمہاری حالت کو سمجھ رہا ہوں مگر تمہیں کچھ رومانز تو کرنا پڑے گا ہی! ہم سب نے اس

جگہ رہنا ہے، یہ تو قسمت کی بات ہوتی ہے۔“

اشعر کتنی ہی دیر ہوی کو سمجھا رہا۔ وہ نکھرتے وجود کو سینٹا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اشعر نے اپنے جیسا سیاہ

سوٹ تیار کر رکھا تھا۔ ہوی نے لاکھ انکار کیا مگر اشعر نہیں مانا، مجبوراً ہوی بھی تیار ہو گیا۔

ہاں میں ویسا ہی مشورہ ہنگامہ تھا۔

”ہوی بھیا۔ زبردست لگ رہے ہیں!“ جانے کہاں سے آواز آئی تو سب ہی ہوی کو دیکھنے لگے۔

بھینپ گیا۔

”ماشاء اللہ کتنا چمک رہا ہے میرا بیٹا!“ عابی نے ہوی کی پیشانی چوم لی، ہوی کی سکتی نگاہیں شعاع پر

”کتی حسین لگ رہی تھی وہ۔“

بچوں کا اصرار تھا تھا کہ لڑکی لڑکا ایک دوسرے کو خود انگوٹھی پہنائیں اور عابی کی بھی یہی خواہش تھی مگر

آغا جی اور بی بی جان کا لحاظ مانع آرہا تھا۔

”خالہ جانی! آغا جی سے کہیے ناں کہ لڑکی لڑکا ایک دوسرے کو انگوٹھی پہننا دیں۔“ لڑکیاں لڑکے بعد سے

اور عابی سے اصرار کر رہے تھے۔

”نہیں بری بات۔ بزرگوں کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں۔ آغا جی بسم اللہ کیجیے۔“

عابی نے دونوں انگوٹھیاں آغا جی کے لرزتے ہاتھوں میں دے دیں۔ آغا جی نے پہلے شعاع کو انگوٹھی

پہنائی، پھر راشکو، سارا ہال مبارک سلامت کے شور سے گونج اٹھا۔ رنگ و نور برساتی فضا میں کوئی بھی ہوی کے

دل کی ہستی میں اتنی اداس شام کے سایہ نہ دیکھ سکا۔ ہوی باہر نکل آیا۔ جو بن پر چودھویں کا چاند ضرور تھا۔

لیکن کتنا اداس ویران اک بے نام سارو فضا کو اداس اور گھبرنا رہا تھا۔

”راشکوٹھیا! شعاع بھابھی تو یہیں ہیں۔ آپ کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔“

شرعی نے شوفی سے شعاع کو بھابھی کو کہا تو اس کا سر مزید جھک گیا۔ راشکوٹھیا نظروں سے اس کے

خوبصورت ہاتھ دیکھنے لگا جس کی مخروطی انگلی میں اس کے نام کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

”ویسے شعاع باجی آپ نے بہت گھانے کا سودا کیا ہے۔ انتہائی خشک اور بے سرے ہیں۔ بہت

پابندیاں لگاتے ہیں۔ یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ اونچی آواز میں مت بنو۔“ صدف نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

”ارے نہیں صدف! یہ ساری پابندیاں بہنوں کے لیے ہوتی ہیں۔ بیگمات کے لیے نہیں بیگمات کو تو کہو

جاتا ہے۔ بیگم آپ آرام فرمائیے میں کھانا بنا لیتا ہوں۔ صفائی کر لیتا ہوں۔ اور راشکوٹھیا ویسے بھی تا بعد اتم سے

ہیں۔ اچھے شوہر ثابت ہوں گے۔“

اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے راشکوٹھیا شعاع جھینپتے رہے۔

راشکوٹھیا شعاع کی سکتی کے بعد زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ ہوی نے اپنے آپ کو ہاسپٹل میں اس

حد تک مصروف کر لیا کہ گھر آنے کا موقع کم ہی ملتا۔ دل پر تو جو قیامت جتنی تھی سو بیت گئی تھی۔ اب اوقیامت کا

سامنا تھا۔ وہ تھا بخنی کے وجود کا اظہار۔ اسے اس وقت سے خوف آرہا تھا۔ جب سیدہ بیگم کو پتا چلا کہ بخنی ان کی

رقیب کی بیٹی ہے۔



خیال سے خاموش رہی۔ مگر شرہ خوشی سے گلزار چرا لے اے اپنے عشق کی داستان ساری تھی۔

”جج حرا! مجھے تو پتا نہیں چلا کہ یہ شخص ایک عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں تو اپنے دھیان میں کالج جا کر کرتی تھی۔ مگر یہ ہی بایک پر پچھا کرتا تھا۔ آخر ایک روز کامیاب ہوئی گیا۔ اور میں بھی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔“

حرا کو شرہ کا یوں اپنی محبت کی داستان سنانا بڑا اعلیٰ نہ ہن لگا تھا۔ مگر وہ بونی کچھ نہیں بس بغیر تصویر کا چارہ لیتی رہی۔

”تمہاری تصویر بھی ہے اس کے پاس؟“ حرا نے پوچھا تو چوری بن گئی۔

”ہاں وہ۔ حرا، بہت ضد کرنے لگا تھا وہ ناراض ہو گیا تھا مجبوراً پھر مجھے دینا پڑی اور کیا کرتی۔“ شرہ نے سر جھکا کر اقرار کر لیا۔

”جہیں یقین ہے کہ تمہاری شادی اس کے ساتھ ہی ہو جائے گی۔“

اب کی بار حرا کا لہجہ کچھ تیز تھا۔ شرہ گھبرائی گی کیا جواب دے۔

”ہاں حرا! انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ پتا ہے حرا! وہ کہتا ہے کہ اگر مجھ سے شادی نہ ہوئی تو وہ جان دے دے گا۔ وہ بہت چاہتا ہے مجھے۔“ شرہ عامر کی محبت کا یقین دلانے کی، سر تو ڈکوش کر رہی تھی۔

”ہونہہ ایہ جو فت چاہیے عاشق ہوتے ہیں ناں۔ شرہ یہ صرف انجوائے منت کرتے ہیں۔ تم نے اسے اپنی تصویر دے کر اچھا نہیں کیا۔“ حرا کو شرہ کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

”حرا تم نے غلط تجزیہ کیا ہے عامر کا۔ وہ ہرگز بھی ایسا نہیں ہے۔ وہ مجھے جان دینے کی حد تک چاہتا ہے۔“ شرہ ایک بار پھر پہلے والی شرہ بن کر تنک گئی۔

”تمہاری تحریر بھی ہے اس کے پاس؟“

حرا نے کون کونک گئی تھی اسی لیے کرید رہی تھی۔ مگر شرہ کو یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اسے گھورنے لگی۔

”ہاں میں نے بھی اسے خط لکھے ہیں۔ میں اس کی اتنی چاہت کے جواب میں خاموش تو نہیں رہ سکتی تھی۔ ناں، ویسے حرا تمہارا عامر پر شبہ کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔“

شرہ ناراض ہو گئی۔ تو حرا کو بھی احساس ہوا کہ اسے ایسے نہیں چاہیے تھا۔

”سوری شرہ! اگر تمہیں میری بات بری لگی ہے تو میں معذرت چاہتی ہوں۔ چلو دل میلانہ کرو۔ اگر انسان کی نیت اچھی ہو تو اللہ اسے ضرور بچا لیتا ہے۔“

حرا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے سمجھایا تو شرہ مسکرا پڑی۔ کیونکہ ابھی اسے اس سلسلے میں حرا کی بہت ضرورت تھی۔ حرا وہاں سے اٹھ کر رضوانہ کے کمرے میں آ گئی جو اپنا بکس درست کر رہا تھا۔

”لایے مجھ بھی! مجھے بھی کوئی کام بتائیے۔ فارغ رہ کر بور ہو رہی ہوں۔“

شعاع ایک پلی بھی فارغ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ فارغ یا تھا ہوتی تو اندر کے سائے چیتنے لگتے۔ وہ بے رہ سی ہو گیا کرتی، اسی لیے وہ کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی۔

”شکریہ حرا! کام تو سارا ہو گیا ہے۔ لوم یہ تصویریں دیکھ کر اپنی بوریخت ختم کرو۔ یہ لو اس میں ہماری شادی

نہیں ہیں۔“

رضوانہ اسے البم دے کر باہر نکل گئی۔ وہ دلچسپی سے تصویریں دیکھنے لگی مگر اب جو تصویر اس کے ہاتھ آئی تو لپٹا۔ تبصیریں سناست ہو گئیں۔ یہ تصویر ہوتی ہی کی تھی۔ جو عمیر کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہوتی دل میں درد جگانے لگی۔ وہی وقت پیچھے جانے لگا۔ ایک ایک یاد تازہ پانے لگی، رنموں کے منہ کل گئے۔ وہ بے خبر ایک تک تصویر دیکھنے لگی۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ رضوانہ کب سے آکر اسے دیکھ رہی ہیں۔

”ہاں بھی یہ چیز ہی ایسی ہے مجھ دیکھتا ہے۔ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔“

رضوانہ نے تصویر اس کے ہاتھ سے پکڑی تو وہ حواسوں میں لوٹ آئی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں بھابھی! بس یونہی ذرا۔“

وہ اپنی اس بے خودی پر بہت نادم ہو رہی تھی۔ اب بچاری رضوانہ بھابھی کیا جانیں کہ یہ ہوتی کون ہے اور ان کا اس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔

”ارے میں تو مذاق کر رہی تھی۔ یہ ہمایوں احمد ہے۔ عمیر کا بچپن کا دوست ہے۔ پہلے یہ لوگ بھی کراچی لپٹا کر رہتے تھے، بہت اچھا بزنس تھا عمیر کے والد کا۔ ہمایوں کے گھر والوں سے اچھی دوستی تھی، پھر قسمت کی لڑائی کہ چچا جان یعنی عمیر کے والد کا بزنس ایسا ڈاؤن ہوا کہ بس ختم ہی ہو گیا۔ پھر ان کا دل کراچی سے ایسا اجاٹ ہا کہ لاہور آئے۔ والد کی طرف سے جو تعویذ بہت جانید ادلی۔ اسی پر اکٹھا کر لیا اور پھر زیادہ عرصہ زندہ بھی نہ رہا۔ ہمایوں کراچی اور عمیر لاہور میں تھے مگر فاصلے بچی دوستی میں حائل نہیں ہوئے۔ دونوں کا رابطہ رہا۔ خطوط لکھتے رہے۔ ہمایوں تو ابھی جاتا ہے۔ ذرا فرصت ملے تو عمیر بھی چکر لگا آتے تھے۔ مگر اب تو ایک حدت بیت گئی

ہمایوں آیا نہ عمیر وقت نکال سکے۔ ہر کسی کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔“

رضوانہ بھابھی اسے داستان ساری تھیں۔ اور اس کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا دل کا درد ڈھاٹھیں تانا ہوا سندھ بن کر آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ وہ تمام رات اس نے جل تھل آنکھوں میں گزار دی۔ تڑپتی یادیں لپٹ پھل کا کام کر رہی تھیں۔

شعاع کا رواں رواں رو رہا تھا۔ کتنی شدت سے سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔ دل پھر اسی جنت میں جانے کو لپٹ لگا تھا۔ ہوتی کی محبت کی وہ چنگاریاں جنہیں اس نے صبر کی سل رکھ کر غصہ کر دیا تھا۔ پھر بھر کئے لگیں۔

قیامت خیز رات گزر گئی۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔

”ارے حرا بچی لگتا ہے رات جہیں نیند نہیں آئی کچھ سوچتی رہی ہو؟“

حمیدہ بیگم نے اس کے سوچے سوچے پوچھنے دیکھ کر کہا تو وہ نظریں چرا کر رہ گئی۔

”جی نہیں اسی جان! ذرا سوس رہا تھا!“ اب ماں جیسی ہستی کو کس طرح دل کے درد کا حال سناتی۔

”حرا! چلو بھی۔ تیار ہو جاؤ!“ عمیر جلدی جلدی ٹائی لگاتے ہوئے بولے۔

”کہاں جانا ہے حرا کو؟“ حرا کے ساتھ سب سوالیہ نظروں سے عمیر کو دیکھنے لگے۔

”ارے بھئی۔ حرا کی ضد تھی ناں کہ یہ جاب کرے گی۔ کل سسر کرمانی سے ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ ان کو لپٹ اسکول کے لیے ایک انگلش ٹیچر کی ضرورت ہے۔ حرا کی انگلش تو بہت اچھی ہے۔ میں نے جھٹ اس کا نام ملایا تو اصرار کرنے لگیں کہ میں اسے لے کر اسکول ضرور آؤں۔ لہذا اب تم فائز تیار ہو جاؤ۔ تب تک میں

ناشتا کرلوں۔“

عمیر نے ایک ہی سانس میں ساری تفصیل بتا کر سب کو مطمئن کر دیا۔ حرا تیار ہونے کے لیے اٹھ گئی سفید لباس پر آسمانی رنگ کا دو پندرہ دست کرتی وہ تیار ہو کر آگئی۔ پرائیویٹ گرائمر اسکول تھا جو شاید کسی کوٹھی ہی میں کھولا گیا تھا۔ جدید سہولیات و آرائش سے آراستہ اسکول حرا کو اچھا لگا۔

”استقامت علیکم آئی!“

عمیر نے پریسل کے کمرے میں آکر۔ جس خاتون کو آئی کہا تھا غالباً وہی مسز کرمانی اور اسکول کی مالک تھیں۔

”اوہ جیلو عمیر آؤ بھی آؤ بیٹھو۔“

مسز کرمانی بڑے اخلاق سے ملیں انہوں نے شفیق سی نگاہ حرا پر ڈالی جو خاموش ضرورتی مگر بڑی پراعتماد نظر آ رہی تھی۔

”آئی یہ یہی وہ میری سسٹر ہے، جس کے متعلق میں نے آپ سے کہا تھا!“

”اوہ اچھا کیا نام بتایا تھا حرا۔ ہاں حرا بیٹی کیا حال ہیں تمہارے؟“

مسز کرمانی سارا وقت اس سے انگلیش میں گفتگو کرتی رہیں اور متاثر ہوتی رہیں۔

”ویری گڈ بیٹی۔ حرا تمہاری انگلیش بہت اچھی ہے۔“

مسز کرمانی حرا سے بے حد متاثر نظر آ رہی تھیں۔

”بات یہ ہے آئی کہ حرا امریکہ ہی میں پیدا ہوئی اور ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اس لیے۔“

”بہر حال یہ لڑکی آج سے ہماری ہوئی۔ ہماری انگلیش بھی اچھی کرے گی اور ہمارے بچوں کی بھی کیوں حرا؟“

”شیور۔ میں پوری کوشش کروں گی میڈم کہ آپ کو مطمئن کر سکوں۔ اور آپ کی امیدوں پر پوری اتر سکوں۔“

تھینک یو حرا۔ تو کیا خیال ہے آج ہی سے جوان کرلو۔ کیوں عمیر بیٹے؟

مسز کرمانی نے رضامندی کے لیے عمیر کی طرف دیکھا جو رستہ واضح ہر وقت دکھ رہے تھے۔

”جیسے آپ کی مرضی میڈم اؤ کے حرا میڈم آف لک میں آفس سے واپسی پر تمہیں لیتا ہوا جاؤں گا خدا

حافظ۔“

عمیر خدا حافظ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے تو مسز کرمانی اسے لے کر باہر آگئیں جو بڑے گزرتے ہوئے اسکول کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ ابھی وہ کلاس میں چائنا ہی چاہتی تھیں کہ آواز پر غبر گئیں۔

”ممی اپنی گاڑی کی چابیاں دیجیے۔ میری گاڑی خراب ہوگئی۔“

حرا نے چونک کر اس خوبصورت وکرا دہاؤش سے نوجوان کو دیکھا۔ جس کی گہری نگاہیں حرا کے وجود کے آ رہا

ہونے لگی تھیں۔

”یہ لو تمہارا روز کا یہی کام ہے جلدی آ جانا۔“

مسز کرمانی نے چابیاں اس کی طرف بڑھائیں مگر اس کی نظریں تو حرا کے طبع چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔

”یہ حرا ہے۔ میرا بیٹا سلیکشن۔“ مسز کرمانی نے تعارف کرایا۔

”واہ ممی، دس سال سے آپ اسکول چلا رہی ہیں۔ مگر ایسا حسین سلیکشن آپ نے آج تک نہیں کیا ہوئی

فل۔“ اس نوجوان کی بے باک نظروں اور بے باک تعریف پر حرا کھول کر رہ گئی۔ چہرا چمک گیا۔

”بکواس مت کرو۔ حرا بہت اچھی بچی ہے۔ چلو جاؤ۔“

”تو ممی! یہی تو میں کہہ رہا ہوں!“ وہ ایک ہنر ڈھیت تھا۔

”چلو جاؤ۔ ہمیں کام کرنے دو۔ آؤ حرا بیٹی!“

مسز کرمانی حرا کی حالت بھی سمجھ رہی تھیں، اور کچھ بیٹے کا یہ انداز بھی ان کو نہیں بھایا تھا۔ ماں کے کہنے پر وہ

بھی بیٹی بجاتا آگے بڑھ گیا۔ حرا کا سارا موڈ غارت ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کی باتوں سے کہیں زیادہ اسے یہ الجھن ہو رہی تھی کہ اسے لگ رہا تھا وہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکی

ہو کہیں؟ یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اسکول میں بھی وہ الجھن رہی اور گھر آ کر بھی وہ الجھن بھی رہی۔ سارا وقت اس

گہری نظریں اپنے وجود پر محسوس کرتی رہی۔ اس نے عمیر سے ذکر نہیں کیا خواہ خواہ بات خراب ہوتی اور پھر وہ

نا مانجی مٹی کی کڑا پادافاع نہیں کر سکتی تھی اگر بات بڑھ جاتی تو وہ اسکول چھوڑ دیتی۔

”حرا! تمہارا اسکول میں کیسا رہاؤن؟“

”بس سوسورہا بھابھی! مسز کرمانی اچھی عادت کی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں وہاں ایڈجسٹ ہو جاؤں گی

اللہ۔“

وہ اعتماد سے بولتی دوسرے کمرے میں آگئی وہ آرام کرنا چاہتی تھی کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ مگر کمرے میں ٹھر

جائے موجود تھی، جو کچھ لکھ رہی تھی حرا کو دیکھ کر اس نے کاپی بند کر دی اور لیٹ گئی۔ حرا نے بھی گریڈ نامناسب نہ

بگا۔ خاموشی سے لیٹ گئی۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی تو شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ مغرب کی اذان ہو چکی

لی۔ وہ نماز پڑھ کر پھر کمرے میں آگئی۔ عجائے کس خیال کے تحت اس نے ٹھر کے دروازے سے کاپی نکالی تو اس

ایک درست نکلا۔ عامر کے ساتھ کہیں باہر ملنے کا پروگرام طے ہوا تھا۔ اسے ٹھر پر شدید غصہ آ گیا جو ایک غلط

مانا کے لیے گھروالوں کو دھوکا دے رہی تھی۔ تاہم اس نے فی الوقت ٹھر سے کچھ کہنا مناسب نہیں جانا۔ بات

چمک ہی رہی۔ دوسرے روز وہ وقت پر اسکول پہنچی تو کلاس میں چونکہ ابھی وقت تھا۔ وہ مسز کرمانی کے روم

لی۔ وہ تو موجود نہیں تھیں البتہ ان کا بیٹا ضرور موجود تھا۔ حرا کو دیکھ کر وہ کھل اٹھا۔

”اوبیلوس حرا! ہاؤ آریو۔“ وہ اس سے یوں مخاطب تھا گویا بڑے دوستانہ رسم ہوں۔

”فائن تھینک یو۔“ حرا نے ایک کڑی سی نگاہ اس پر ڈالی۔ اور اعتماد سے اس کی بات کا جواب دے کر بیٹھ

لاخبرا اٹھا کر پڑھنے لگی۔

”ممی! راؤنڈ پر گئی ہیں۔ آپ بور تو نہیں ہو رہی ہیں۔“

وہ خوشخوار ہی لٹھ لینے کے چکر میں تھا۔ مگر وہ اخبار پر نظر جمائے رہی۔

”میں اخبار کی موجودگی میں بور نہیں ہوا کرتی۔“

حرا کا انداز ایسا تھا۔ گویا کہہ رہی ہو کہ میرے لیے اخبار موجود ہے۔ لہذا تم چلے جاؤ۔ مگر وہ بھی نمبر دن

نہ تھا۔ حرا نے اپنے سامنے اخبار پل پھیلا کر رکھا تھا کہ سوائے اس کے ہاتھ کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ

نہا کر کھرا ہو گیا۔ اسی وقت مسز کرمانی آگئیں۔

”حرا آگئیں تم!“ میڈم اس پر نظر پڑتے ہیں خوش ہو گئیں۔

”ممی میڈم! میں اس لیے بیٹھی تھی کہ آپ نے کہا تھا۔ کوئی بات کرنی ہے۔“

”کھڑی ہوگئی۔“

”ہاں میں چاہتی ہوں کہ تم بچنگ کے علاوہ میرا بھی تھوڑا بہت ہاتھ بنادیا کرو۔ اب مجھ سے زیادہ کار نہیں ہوتا۔ اور میری اولاد میں کوئی بھی ایسا لائق نہیں۔ اور یہ تم آج پھر یہاں موجود ہو کیوں!“

بات کرتے کرتے مسز کمانی کی نظر بیٹے پر پڑی تو اس کی طرف متوجہ ہو گئیں وہ جو دم چپاتا ہوا مسلسل بڑھ کر کھڑا ہوا۔

”ممی! آپ خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کی اولاد کو آپ کی پروا نہیں، میں آپ کی سیلپ کے لیے ہوں۔ آج سے میں آپ کا ہاتھ بنایا کروں گا۔“

حرا کے قریب آنے کا ایک یہی راستہ کھلا تھا۔ جس سے وہ بلا روک ٹوک اندر داخل ہو کر خود کو دروازہ پر منسلک کر سکتا تھا۔

”نی الحال مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنے فڈی کے بزنس میں ان کا ہاتھ بناؤ!“

مسز کمانی اس کی مداخلت کم از کم اسکول میں برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ کیونکہ وہ ہر جگہ بڑھ کر کے دیکھ چکی تھیں۔ اس کا کام صرف لڑکیوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا ہوتا تھا۔ جس سے لڑکیاں جاب چھوڑ گئیں تو ان کو بہت تکلیف اٹھانا پڑی اس لیے وہ اسے اسکول سے دور ہی رکھتی تھیں۔

”پلیز ممی پراس۔ اب کوئی غلط بات نہ ہوگی۔“ اس نے ماں کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔

”پلیز! عا! مجھے تنگ نہ کرو۔“

”عالم!“ حرا اس نام پر چونکی۔ شکل دیکھ کر اسے شبہ تو ہوا ہی تھا۔ آج نام سن کر یقین ہو گیا کہ یہ ثمرہ ہی کا عا ہے وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر کلاس لینے آگئی۔ وہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ اسے ثمرہ کی نا اہلی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ کیوں اس فریبی کے دھوکے میں آئی، جس کی نظریں ہی اتنی گندی تھیں۔ وہ گھرواپس آئی تو ثمرہ کو بڑا سرد گرم پایا۔ بال سیٹ ہو رہے تھے۔ اچھا سا جوڑا استری ہوا پڑا تھا۔

”کہیں جارہی ہو ثمرہ؟“ حرا چاہتی تھی کہ وہ خود اسے بتائے مگر اس نے نہیں بتایا تو اسے خود ہی پوچھنا پڑا۔

”ثمرہ کچھ بوکھلا گئی۔“

”ہاں، وہ نازیبہ ناں۔ میری دوست!“

”اوہوں! نازیہ نہیں عالم کو۔ عا سے ملنے جا رہی ہوں نا۔“

”تمہیں پتا ہے تو پوچھ کیوں رہی ہو؟“

ثمرہ نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو حرا کو دکھ ہونے لگا کہ اتنی نیک میرت ماں کی بیٹی اور فرشتہ صفت بھائی کی بہن ہو کر وہ اپنے مقام سے گر رہی تھی۔

”دیکھو ثمرہ! ابھی تمہیں میری ہر بات بری لگے گی، مگر میں تمہیں بتا دوں کہ تم ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔“

”اس قسم کے لیکچر اپنے اسکول تک ہی رکھا کرو میں سنی نہیں ہوں۔“

وہ اب مکمل طور پر پہلے والا ثمرہ بنی ہوئی تھی۔

”میں مانتی ہوں ثمرہ کہ محبت کا وجود ہے۔ انسان جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن جذبات کے ساتھ عقل کا استعمال بھی ہو تو لڑکی کسی بڑا نہیں ہوتی۔ عا غلط آدمی ہے، وہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔“

”حرا! تمہیں عا کے بارے میں ایسی بات کہنے کا کوئی حق نہیں۔“

ثمرہ مکمل طور پر عا کے اثر میں تھی اس کی تو جین کیونکر برداشت کر سکتی تھی۔

”مجھے حق ہے ثمرہ! میں اس گھر میں عزت کے ساتھ رہتی ہوں۔ بیٹی اور بہن سمجھ کر جو مجھے محبت دی جاتی عزت دی جاتی ہے۔ یہ سب قرض ہے مجھ پر اور میں اس گھر کی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔“

حرا نے پر عزم لہجے میں کہا تو ثمرہ تورا کر اس کی طرف چلی۔

”یہ لوز! آ! چیزیں دے کر تم بھتی ہو کہ تم نے مجھے خرید لیا ہے اور جو چاہو کہہ سکتی ہو۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ مگر اپنے عا کے خلاف ایک بات بھی برداشت نہیں کر سکتی۔“ ثمرہ نے سونے کی چین جو اپنے اسے دی تھی۔ اتار کر حرا کی طرف اچھالی تو حرا کا جی ہا ہا ایک زوردار چائنا سے رسید کرے جو اس کے بازو کے لیے مر رہی تھی۔ مگر اسے ضبط کرنا پڑا کیونکہ اس کا غصہ جلتی پرتیل کا کام کرتا۔ اس نے آہستگی سے ناٹھائی اور ثمرہ کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”ثمرہ! میری بہن! میرا تو سب کچھ ہی تم لوگ ہو، ان مادی چیزوں کی تو میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔“

”نظریہ کہنا چاہتی ہوں کہ لڑکی کو اس وقت سے پہلے موت آجائے جب وہ گھر سے قدم نکالے۔ کیونکہ ایک لڑکی کا قدم اپنے گھر کی دلہیز سے نکل جائے تو وہ تمام عمر اس دلہیز کو ترستی رہتی ہے۔“

حرا کے دل کا درد آنسو بن کر آنکھوں سے ڈھلک گیا۔

”حرا! میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ وہ مر جائے گا میرے بغیر۔“

”بہنہ! یہ خوش فہمی ہی لڑکی سے غلط کام کرواتا ہے۔ چلو مرنے دو۔ تجربہ یہ سیکھی، میں بھی تو دیکھوں، کوئی ای طرح کسی لڑکی کے لیے جان دیتا ہے۔ اچھا ہے شہید محبت کہلائے گا۔ اسے اور کیا چاہیے۔“

”حرا!“ حرا نے اس کے ہاتھ سے کپڑے جھین لیے تو وہ چیخ پڑی۔

”آہ۔ بولو! میں نہیں چاہتی کہ کسی دوسرے فرد کو تمہاری کہانی کا پتا چلے۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گی!“ حرا اٹھ بیٹھ جانے کہاں سے آگئی۔ یازندگی کے تجزے تجربے نے پیدا کر دی تھی۔ وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ ایسا نہیں کرنے دیتی تھی۔ وہ بھی اپنے محسنوں کی بیٹی کے ساتھ ثمرہ نے لاکھ سارا منت سماجت بھی کی مگر حرا نہیں مانی۔ اور ہاتھ تھا کہ اگر اس نے کسی کو بتا دیا تو قیامت آجائے گی۔ اس کے بعد وہ حرا سے مکمل طور پر بدظن ہو گئی تھی۔ مگر حرا ہاتھ نہیں کی۔ وہ کسی خاص موقع کے انتظار میں تھی کہ اس عا کے مکر وہ چہرے سے نقاب اٹھائے۔

مگر ابھی وہ موقع نہیں آیا تھا۔ اس روز ثمرہ سمیت سب گھر والے رضوانہ کے گھر گئے ہوئے۔ صرف حمیدہ اور حرا گھر تھیں۔ حمیدہ بیگم تو عصر کی نماز کے بعد وظیفہ میں مصروف ہو گئیں۔ حرا بچوں کی کاپیاں چیک کرنے لگی وقت تیل ہوئی۔ وہ جین بند کر کے اٹھی تاکہ دیکھے کون آیا۔

”عمیر صاحب جین جی گھر پر؟“

”ہوئی!“

حرا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔



”ہوی بیٹے اتنے عرصے بعد ہمار خیال آیا کیسے؟“

”بس خالد جان پڑھائی میں مصروفیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ عیسر سے خط و کتابت ہی ہو سکتی تھی۔ اب ہاؤس ہپ کے بعد ذرا فرصت ملی تو حاضر ہو گیا ہوں۔ آپ لوگوں نے بھی تو مڑ کر نہیں دیکھا۔“

ہوی کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ کیا ابھرا حمیدہ بیگم ہنسی ہوئی۔

”ہوی بیٹے تم سب کچھ تو جانتے ہو جس طرح میں وہاں سے بریاد ہو کر آئی تھی۔ پھر مڑ کر دیکھنے کی ہمت ملاں سے لاتی اور پھر ہم لوگ تو ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔ ایک اکیلی جان ہے عیسر کی کمانے والی۔ سوطرچ کی پٹانیاں ہیں بیٹا۔ تم سناؤ کھر میں سب خیریت ہے ناں۔ بی بی جان اور آغا جی کی صحت تو ٹھیک رہتی ہے ناں۔“

”جی خالد جان سب ٹھیک ہیں۔ یہ عیسر وغیرہ کب تک آجائیں گے؟“ ہوی نے سامنے لگے وال کلاک کو دیکھا جس پر شام کے پانچ بج رہے تھے۔

”بس آتے ہی ہوں گے۔ کتنی گرمی ہو رہی ہے۔ ارے حرا بیٹی شربت بناؤ بھی ٹھنڈا سا۔“

حمیدہ بیگم نے اس خیال سے کہ جانے کرا کہاں ہو بلند آواز میں کہا مگر وہ تو ساتھ والے کمرے میں کان مار رہی تھی۔ اس کا بھی نام آجائے۔ وہ خاموشی سے کچن لگا آئی۔ اس کا کٹس بنا کر کھڑے تھے وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں امی جان اندر آئے کو نہ کہیں دیں۔

”امی جان یہ لے جائیے۔“ حرا نے آہستگی سے کہا تو ہوی اس آواز پر چونک گیا۔ جانے کیوں اس کی آنکھوں نے دور تک اس آواز کا پیچھا کیا۔

”کتنی آواز ملتی ہے اس کی شاعر سے“ ایک خیال سوچ کی گہرائی سے ابھرا اور ڈوب گیا۔

پھر کچھ ہی دیر میں سب لوگ آگئے سب ہوی سے یوں ملے پیسے کوئی پھنڑا ہوا مل جاتا ہے۔

”اور شمرہ، نمرہ تم لوگ کیسی ہو۔ کیا ہو رہا ہے؟“

”ٹھیک ہیں ہوی بھیا۔ آپ کچھ بدل گئے ہیں“

”دیکھا ہماری نمرہ کتنی تمھارا ہے کیسے پڑا۔ خیر تم لوگ جاؤ اس کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرو، میں لکڑی خرید لیتا ہوں۔“

یہ تمام باتیں حرا کچن میں برتن دھوتے ہوئے سن رہی تھی۔ رضوانہ اور شمرہ وغیرہ کے قدموں کی آواز پر وہ دل ہو گئی تھیں وہ کچھ پانہ لیں۔

”اگرے حرا تم برتن دھو رہی ہو۔ آج تو سارا دن تم نے ہی کام کیا۔ ارے ہاں تم ہمایوں سے ملیں۔ آؤ میں تم سے کیا چیز ہے بیڈا کٹر ہمایوں بھی۔“ رضوانہ نے اس کے بھیکے ہاتھ کھینچے تو وہ پوری جان سے کانپ گئی۔

”نہیں بھابھی۔ مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ مجھے یہ پسند نہیں پلیر۔“

وہ آواز کی لرزش پر قانونہ پاکی۔ رضوانہ اور شمرہ کو حیران چھوڑ کر وہ کمرے میں آ گئی۔

”عجیب ہے یہ حرا بھی اسے تو سمجھنا ہی مشکل ہے۔“ شمرہ نے مخالفت برائے مخالفت کی۔

”نہی بات شمرہ اتنی اچھی لڑکی ہے حرا۔ ہو سکتا ہے اس وقت اس کا موڈ نہ ہو یا وہ واقعی کسی سے ملنا پسند نہ لائے۔ چلو تم قہر نکال کر کہاں بنا لو میں تو رملہ تیار کر لیتی ہوں اور نمرہ تم سلا دو وغیرہ بنا لو۔“

مضوں میں رضوانہ نے کام بانٹ دیے۔ شمرہ کی آواز برتنوں کے بجھنے کی آوازیں باتوں کی آوازیں حرا

عیر ہوی کی آواز تھی۔ حرا کی رگوں میں خون جنسنے لگا۔ اس کی آواز پر ہمیشہ ہی ڈھونڈ نکلیں منتشر ہو جایا کرتی تھیں۔ آج کچھ کیوں نکلیں۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کی آواز کی ٹھنڈک کو اپنے اندر اتارنا چاہتی تھی۔ صدیاں ہی تو بیت گئیں تھیں اس آواز کو سننے ہوئے۔ وہ وہیں جم کر رہ گئی۔ ہاتھوں میں نیلی اتر آئی تھیں۔ ٹانگیں کا پنے لگی تھیں۔ یہ کیسی گھڑی تھی کہ وہ اس دل میں اتر جانے والی آواز کو سن کر نہ تو خوش ہو سکتی تھی اور نہ لبیک کہہ سکتی تھی۔ پھر دستک ہوئی ہوی کی آواز پھر ساعتوں میں رس گھول گئی۔

”عیسر یا جواد گھر پر ہیں جی؟“

وہ بولی کچھ نہیں جلدی سے کمرے میں آ گئی جہاں حمیدہ بیگم جائے نماز پڑھ رہی تھیں۔

”کون ہے باہر حرا؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کے اداس چہرے کو دیکھا۔

”وہ جی کوئی عیسر بھیا اور جواد کو پوچھ رہا ہے۔“

”اچھا ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں“ حمیدہ بیگم آہستگی سے چلتی دروازہ کھولنے لگیں تو حرا وہیں کمرے کی کھڑکی کا پردہ سر کا کر باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ ہوی کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش میں وہ وہیں ٹھہر گئی۔ حمیدہ بیگم نے دروازہ کھولا۔ ہوی اندر داخل ہوا۔ اب وہ حمیدہ بیگم کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ حمیدہ بیگم نے بڑے پیار اور خوشی سے ساتھ لگا لیا تھا حرا نے دل تمام لیا۔ کتنے عرصے بعد اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کی نفرت میں بھی جانے لگا بات تھی کہ وہ اس سے نفرت نہیں کر پاتی تھی۔ وہ جسے دیکھنے کی دل نے ہر وقت دعائیں کی تھیں وہ اس کے سامنے تھا مگر کتابت بدلا سا لگ رہا تھا۔ اداس ویران سا۔

”اف خدا یا ہوی ہی کیا میری وجہ سے تو سب کا یہی حال ہوگا۔ آغا جی۔ بی بی جان اور باقی سب۔“

وہ پھر سے ادھڑنے لگی۔ زخم پھر ہرے ہونے لگے تو وہ پردہ چھوڑ کر شمرہ کے کمرے میں آئی۔ جی تو یہی ہی چاہتا تھا اپنی محرومیوں سے لپٹ کر جی کا بوجھ ہلکا کرے مگر یہاں اسے بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ ذرا تنگ روم سے حمیدہ بیگم کی زیادہ اور ہوی کی آواز نہ سن سکتی تھی۔

لے ہوی کو متوجہ کر گئی۔ وہ ایک بار پھر چونک گیا جانے یہ اجنبی لڑکی اپنی اپنی سی کیوں لگی تھی۔ اس کی آواز، اس کی ہنسی کیوں چونکا گئی تھی۔ وہ وہاں سے جا چکی تھی ہوی سوچ میں ڈوبا اندر آ گیا حرا نے اسکول سے دو چھٹیاں کر لیں۔ تیسرے دن اسکول کا چوکیدار بلانے آ گیا۔ تو وہ اسی وقت تیار ہو کر اسکول آ گئی مگر پتا چلا کہ میڈم خود تین ماہ سے نہیں آ رہیں۔

”بابا آپ نے غلط بیانی سے کام کیوں لیا، میڈم تو آئیں ہی رہیں۔“ حرا کو باپ پر غصہ آ گیا۔  
 ”ریلیکس مس حرا! میڈم نہیں ہیں تو کیا ہو اس تو ہوں۔ می بیار ہیں آج کل میں آ رہا ہوں اور میں نے ہی پایا ہے آپ کو۔“  
 حرا نے مڑ کر دیکھا عامر بیٹے پر ہاتھ باندھے مگر وہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ تب کر رہ

لی۔

”می فرمائیے۔“ اس کے چہرے پر نئی آگئی۔

”اجی فرماتا کیا ہے، ہم تو عرض کر سکتے ہیں۔“

وہ پڑی سے اترنے لگا تو حرا نے اسے گھورا۔

”میرا مطلب ہے مس کہ یہ اسکول ہے اور نیچر کوروز آنا چاہے۔“ وہ اس کے مقابل بیٹھ کر بات بدل گیا۔  
 بچوں کو ایگزام ہو چکے ہیں۔ آج کل فرصت ہے، اس لیے میں نہیں آ رہی۔ میں نے میڈم سے کہہ رکھا تھا کہ جب کلاسز ہوں گی میں تب آؤں گی اور پھر اسکول آنا بے کار ہے آج کل تو۔“ وہ اباسی کے لیے اٹھ گئی۔

”آپ بہت مستعد ہیں مس حرا۔“ وہ اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔

”کوئی نئی بات کریں مسٹر عامر۔“ وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔

”آپ کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں؟“ وہ ک کرا سے دیکھنے لگا۔

”ہے مگر نیکی کے لیے سچائی کے لیے۔“ اس نے بھی اعتماد سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مس حرا مگر آپ ہیں کہ۔“

حرا کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے کچھ سوچا اور پھر اس کی طرف ہلٹی۔

”دیکھیے عامر صاحب اس وقت تو میں نہیں ر سکتی۔ اس حال دل کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے میں آپ کو موقع ضرور دوں گی۔“

حرا نے بڑے مضبوط اور سرد سے لہجے میں کہا، اور آگے بڑھ گئی اور عامر نے اسی کو غنیمت جانا۔ لڑکی آہستہ آہستہ لائن پر آ رہی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ حرا بھی اس سے فاضل بات کرنا چاہتی تھی۔ لیکن جب تک ہوی تھا وہ کوئی دوسری بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ہوی کی مہمان نوازی کی جو چند گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں وہ انہیں اپنی اہلی ویران زندگی کے لیے محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہوی ہمیشہ یہاں رہے۔ بھلے وہ اس سے خفا رہے اجنبی رہے مگر یہاں سے جائے نہ۔ اس نے کچن سنبھال لیا تھا۔ چونکہ اس نے ہوی کے سامنے نہیں جانا تھا اس لیے رضوانہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔

”بھابھی جان اب آپ لوگ کراچی ضرور آئے گا۔ میں نے عمیر سے کہہ دیا ہے۔“

ناشتے کے برتن لگاتی رضوانہ کو دیکھ کر ہوی نے دعوت دی۔

لے کانوں میں اتر رہی تھیں۔ وہ بکھرنے لگی تھی۔ حالانکہ جی تو یہ چاہ رہا تھا دل کے اس مستقل کیس کے لیے جواب مہمان بن کر آیا تھا اس کے لیے کھانا اپنے ہاتھوں سے تیار کرے۔ ارمانوں سے اسے پیش کرے۔ اس کے قریب جائے۔ اسے محسوس کر کے دیکھے کہ وہ جسم حقیقت ہے کہ اس کی کسی خواہش کی پرچھائیں، دل بانی بن کر آنکھوں میں اتر آ رہا تھا۔ اس نے لائٹ آف کر دی۔ دروازہ بند کر لیا اور ڈرائنگ روم کی طرف گلے والی کھڑکی کے جھروکے سے اندر جھانکنے لگی وہ دشمن جاں سامنے ہی صوفے پر ڈارک براؤن شلوار سوٹ میں پشت سے ٹیک لگاے ہاتھ میں تھا۔ سر گریٹ کے دھوئیں میں کتنا دھمکی لگ رہا تھا۔ یوں جیسے سب پتھوٹا چکا ہو۔ حرا اسے دیکھنے لگی۔ دل میں درد سا ہونے لگا۔ وہ اس کے ہونٹوں سے اپنا نام سنتا چاہتی تھی۔ عمیر آخر کو بہترین دوست تھا کہیں نہ کہیں تو اس کا ذکر آتا ہی۔ اسی آس میں تصویر بنی کھڑی رہی۔

”اچھا تو یہ ہے صورت حال ایسی واردات تمہارے دل میں بیت گئی اور مجھے خبر ہی نہ دی۔ تسلی دینا تو بے معنی سا ہے مگر ہوی ایک ہی ڈالی پر کھٹکنے کے باوجود پھول مختلف قسمت لے کر آتے ہیں۔ ایک سہرے میں بجتا ہے اور دوسرا کسی مزار پر جامہ پہنا ہے۔ خیر اسے بھول جاؤ ہوی ایک خواب سمجھ کر۔“

یہ کس کا ذکر ہو رہا تھا جس نے ہوی کو اس حد تک دھمکی کر دیا تھا حرا یہ جاننے کو بے تاب ہو گئی۔ کان متوجہ اور نظریں ہوی پر پٹھری ہوئی تھیں جس کے چہرے پر رعونت نفرت اور تناؤ کی جگہ اب عجیب سی محرومی اور ملال نے لے لی تھی۔

”عمیر تم نے اپنی محبت پالی ہے ناں اسی لیے نارسائی کے کرب سے نا آشنا ہو تم۔ مجھے شعاع کو بھول جانے کا مشورہ دے رہے ہو عمیر جس سے ہر بل نفرت کا اظہار کرنے کے باوجود میں اس سے نفرت نہیں کر سکا۔ عمیر میں نے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے ہمیشہ کے لیے۔“

ہوی کے گھیر لہجے کا سوز کمرے کی فضا کو تو سو گوار کر گیا مگر حرا کو یوں لگا گویا وہ فرش سے عرش کی جانب پرواز کرنے لگی۔ یہ یہ آج اس نے کیا سنا تھا۔ واقعی ہوی نے یہ ہی کہا تھا کہ وہ شعاع کو چاہتا ہے یا پھر اس کی خواہش نے اس کے الفاظ کو اپنے مطلب کے معنی دے دیے تھے وہ دل پر ہونے والی خوشیوں کی برسات کو برستا ہوا دیکھنے لگی۔ آج۔ آج اسے وہ خوشی ملی تھی کہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب شور مچائے۔ اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ زندگی کی کتنی بڑی خوشی ملی تھی۔ وہ لمحات انسان کو زندگی میں واقعی بڑے افسوس ہوتے ہیں جب انسان کو اس کے جذباتوں کی پذیرائی مل جاتی ہے۔ جب یہ پتا چلتا ہے کہ جس کی چاہ میں اس نے راتوں کو تارے گنے ہیں وہ بھی اس کی لیے تڑپ رہتا ہے۔

”ہوی۔ ہوی یہ سب کیا ہے زندگی نے کتنا بڑا مذاق کیا ہے میرے ساتھ میرے درد کی کہانی کو عنوان اس وقت ملا جب۔ جب کہانی میری بربادی کا انجام بن چکی ہے۔ ہوی تم نے مجھے نہیں میں۔ میں نے تمہیں پا کر کھو دیا ہے۔ وہ سب کیا تھا ہوی کیوں نفرت کے لبادے میں چھپا رکھا تھا اپنی چاہت کو۔

ہوی کیا آیا تھا وہ اپنے کمرے میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ چونکہ اس نے ہوی کے سامنے آنے سے انکار کر دیا تھا اس لیے کسی نے اصرار بھی نہیں کیا۔ وہ ایسے وقت میں گھر سے نکلتی جب وہ گھر پر نہ ہوتا۔ اس روز وہ رضوانہ کے لیے باہر نکلتی تو اسی وقت ہوی اور جواد اندر داخل ہوئے۔ وہ پوری جان سے کانپ گئی۔ مگر خدا کا شکر تھا کہ ہوی جواد سے کسی بحث میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے نہیں دیکھا۔ وہ برق رفتاری سے مڑی مڑی اس کی پشت پر لہرائی لہی سی



”کراچی تو بھیا ہم ضرور آئیں گے لیکن آپ کی شادی پر۔“

رضوانہ نے دیکھا ہی نہیں اس بات پر ایک ساہم ساہمی کے چہرے پر پلہرا گیا۔

”اس کا مطلب ہے مجھ بھی آپ کراچی نہیں آئیں گی کبھی بھی۔“ ہوی کے لہجے میں حسرت سی نمایاں تھی۔  
”خدا نہ کرے بھیا آپ کو شادی نہیں کرنی کیا؟“

رضوانہ نے چونک کر ہوی کو دیکھا جو بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔ حرا نے کان دروازے سے لگا دیے۔

”شادی خوشی کا نام ہے بھیا بھی اور خوشی میری زندگی سے نکل چکی ہے اور پھر دل کا شہر ایک بار بستا ہے اُڑ جائے تو پھر آباد نہیں ہوتا۔“ ہوی کی آواز کا سارا درد حرا کے دل میں اُتر آیا۔

”ہوی۔ ہوی اس حد تک گہرے ہو تم۔ میں نے تمہیں کھودیا ہوی۔ اس سے بڑھ کر میری زندگی کا الیہ کیا ہو گا خدا یا یہ چاہنے والے کیوں چھن گئے مجھ سے۔“

وہ ناشائستہ کراپے کرے میں آگئی۔ وہ پھر بکھر نے لگی۔ اگلے روز ہوی واپس جا رہا تھا۔ تو وہ چل چل کر کتنا دل چاہ رہا تھا اس کے ساتھ جانے کو سب اسے اتنا چاہتے تھے۔ وہ لوگ یقیناً اس کی اس خطا کو معاف کر دیتے اور پھر کون سا اس نے دانستہ ایسا قدم اٹھایا تھا۔ اس کے ساتھ تو دھوکا ہو گیا تھا۔ وہ دھوکے میں سب کو کھو بیٹھی تھی۔ اس کا کیا قصور تھا کہ سزا اس کیلی کو مل رہی تھی لیکن نہیں وہ سب بھی اس کرب سے گزر رہے تھے۔ اس کا جی چاہا ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر ہوی کے سامنے چلی جائے اسے یقین تھا کہ ہوی اسے ضرور معاف کر دے گا۔ ہاں ہوی مجھے ضرور معاف کر دے گا۔ وہ کھڑکی تک آئی تو ہوی سب کو، ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ وہ چل گئی۔ اس کے بس میں ہوتا تو اسے روک لیتی یا خود اس کی مسافر بن جاتی مگر دونوں باتیں ہی ممکن نہ ہو سکیں۔

ہوی جا چکا تھا۔ حرا کو لگا جیسے جسم سے روح نکل گئی ہو۔ وہ جی دامن جانے کب تک روتی رہی۔ کیا تم تھا کہ وہ اوروں کے خیال سے اپنی عرومیوں پر کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی اُڑے چمن میں بہار چپکے سے آئی اور چلی گئی۔ وہ تو ابھی اس کی لطفانوں کو محسوس بھی نہ کر پائی تھی کہ خواب ٹوٹ گیا۔  
ہوی کے جانے کے بعد زندگی کے وہی معمولات ہو گئے تھے۔ حرا ختم نہ ہونے والے راستے پر چل رہی تھی۔  
نظر نہ آنے والی منزل کی طرف۔

عامر کا القعات دن بدن بڑھتا جا رہا تھا اور وہ مصلحتاً خاموش تھی کبھی تو عامر کی بات پر خاموش رہتی اور کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی۔

”مس حرا آپ کو یاد ہے ناں میں نے کہا تھا کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ وہ کلاس لے کر واپس آ رہی تھی کہ عامر نے راستے ہی میں روک لیا۔

”جب مجھے یاد ہے میں نے کہا تھا ناں ابھی اس کا موقع نہیں آیا۔ موقع آئے گا تو میں خود آپ سے بات کر لوں گی۔“

حرا نے مضبوط لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی۔ عامر کو طیش تو بہت آیا کہ یہ وہ تھا کہ جس لڑکی طرف اشارہ کرتا اس کی ہوجاتی اور یہ اسے سختے کر رہی ہے گویا وہ کچھ بھی نہیں۔

”تمہارے غرور کو قدموں تلے نہ روندنا تو عامر نام نہیں میرا۔“ عامر نے غصے سے دور جاتی حرا کو دیکھنے

عذارت پیے۔ حرا گھر آئی تو شمرہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

”آج پھر نازیہ کی برتھ ڈے ہے کیا؟“

حرا نے ذرا سختی سے شمرہ کو دیکھا تو وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

”جی نہیں، میں عامر سے ملنے جا رہی ہوں۔ ناراض ہے وہ مجھ سے منانے جا رہی ہوں۔ کوئی اعتراض؟“

شمرہ نے انتہائی ڈھٹائی کا مظاہر کیا تو حرا کا جی چاہا کہ جتنی قوت ہے اتنی ہی قوت سے اس بے شرم لڑکی پر چھپر مارے جس کے اندر نہ انہمی اور نہ والدین کی عزت کا احساس تھا۔ مگر وہ ضبط کر گئی۔ وہ اسے حقیقت پر مارنا چاہ رہی تھی۔ وہ حقیقت کا چہرہ اس طرح بے نقاب کرنا چاہتی تھی کہ شمرہ شرمندگی کی گہرائیوں میں پڑے۔

”ارے نہیں بھئی، مجھے بھلا کوئی اعتراض کیوں ہونے لگا۔ ہاں سنو کل تم میرے ساتھ اسکول جاؤ گے۔“ حرا نے مائنڈ کیے بغیر آفر کی تو وہ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیوں کل کیا ہے تمہارے اسکول میں؟“ شمرہ کا دبی ٹیکھا لہجہ تھا۔

”ڈراما۔“ حرا نے مختصر سا جواب دیا تو شمرہ مزید الجھ گئی۔

”کیسا ڈراما۔ یہ پراسرار کیوں بنی ہوئی ہو تم۔“ شمرہ نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی اس میں پراسراریت کی کیا بات ہے۔ بچے ڈراما کر رہے ہیں۔ تم بھی چلنا اچھا ہے۔ ذرا انجوائے ہو جائے گی۔ چلو گی ناں؟“

حرا کا صراٹھا شمرہ کے لیے حیران کن ضرور تھا مگر اسے جانے کے لیے ہاں بھرنا پڑی۔ حرا جو کچھ سوچے اپنی شمرہ اس سے بے خبر تھی۔ مسز کرمانی تو آنہیں رہی تھیں۔ اس لیے حرا نے یہ موقع ہی غنیمت جانا تھا عامر پر واضح کرنے کا۔

”ایک بات بتاؤ شمرہ؟“

”ہاں پوچھو۔“ آج شمرہ کو حرا بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔

”یہ بتاؤ عامر تمہیں کس حد تک چاہتا ہے؟“

”حرا لگتا ہے تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی جب ہی نہیں جانتی کہ جذبوں کی پیمائش کا کوئی پیمانہ آج کا نہیں ہوا۔ اگر ہوتا تو عامر کی چاہت اس پیمانے کو بھی تو زودیتی۔ وہ کہتا ہے حرا کہ میں اگر اسے نہ ملی تو وہ رہائے گا۔ خودکشی کر لے گا اور..... اور.....“

”یقیناً کر لے گا۔ اب تو مجھے بھی یقین آ گیا ہے، وہ واقعی تمہیں بے حد چاہتا ہے اس لیے میں نے تم کو مدد کا ارادہ کیا ہے۔“

”میں حرا جی تم۔ تم میری اور عامر کی مدد کرو گی ناں۔ منا لو گی امی اور بھیا وغیرہ کو۔“ شمرہ سارے تھلا کر حرا کے گلے آگئی۔

”ہاں وعدہ میں تمہاری پوری طرح سے مدد کروں گی اچھا پھر تم کل صبح جلدی تیار ہو جانا تمہیں تو معلوم تھا ناں میں کروا رہی ہوں۔ تو اس لیے مجھے جلدی ہی جانا ہوگا۔ تم ذرا جلدی تیار ہو جانا۔“

”تم فکر نہ کرو میں تیار ہو جاؤں گی لیکن تم اپنا وعدہ نہ بھول جانا۔“

شرہ بہت خوش تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی بھیا اور ای حرا کی بات ٹال ہی نہیں سکتے۔

”میں بھلا بھول سکتی ہوں تم سے کیا ہوا وعدہ۔“

حرا نے آہستگی سے اس کے گال چتھپتے اور باہر نکل گئی۔ صبح یہ دونوں تیار ہو کر جلدی ہی آگئیں۔

”ہونہ نئے شکار کو پھانسنے کے لیے موصوف پہنچ گئے ہیں اتنی جلدی۔“ حرا نے عامر کی گاڑی کو بوجھتے ہوئے سوجا۔

”شرہ تم اس کمرے میں بیٹھو میں ذرا جائزہ لے کر آتی ہوں، اندر کیا ہو رہا ہے۔“ حرا نے اسے کمرے کے کمرے کے ساتھ والے چھوٹے سے کمرے میں بٹھا دیا اور خود بیڈم کے کمرے میں عامر کا انتظار کرنے لگی۔ غالباً نو شرم دم میں تھی۔

”ارے مس حرا! آپ تو وعدہ کی بڑی پابند ہیں۔“ عامر کو بڑی خوشی ہوئی تھی حرا کو دیکھ کر۔

”عورت مردوں والے وعدے نہیں کیا کرتی مسٹر! کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جانے والے، میں آپ زیادہ بے قرار کرنا نہیں چاہتی۔ آج آپ کو اجازت ہے آپ جو کہنا چاہتے ہیں وہ کہہ ڈالیے۔ اس لیے کہ میرا موڈ بار بار ایسا نہیں ہوتا۔“

حرا خود بھی تیز آواز میں بول رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ عامر بھی اتنی آواز میں بولے کہ شرہ سن سکے۔ اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔ شرہ حرا کے انداز گفتگو اور عامر کی آواز پر چونک گئی۔ ایک عجیب طرح کی بے چینی ہونے لگی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے کے اوپر برآمد ہوئی۔

”اب کیا سوچ رہے ہیں عامر صاحب۔ حال دل کہہ ڈالیے۔“

عامر کی آواز۔ حرا۔ خدا یا یہ کیا پھر ہے؟

آواز نے تو شرہ کو چونکا ہی دیا تھا۔ اب نام نے شک کو یقین میں بدل دیا تو اس نے ہلکا سا پردہ مہر کا اندر جھانکا تو وہ پاتال میں گرتی چلی گئی۔ اس کا عامر اس کے ساتھ جیسے ساتھ مرنے کے وعدے کرنا والا عامر اس کی چاہت کا دم بھرنے والا عامر، حرا کو بھی اسی چاہت ویسی ہی محبت بھری پر شوق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”میری آنکھیں اسی وقت بے نور ہو جائیں شرہ اگر تمہارے علاوہ کسی اور لڑکی کو ایسی نظروں سے دیکھوں۔“

عامر کی بازگشت قریب ہی سنائی دی تو شرہ تڑپنے لگی۔

”نہیں میرا عامر ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ حرا ہی جا دو گئی ہے۔“

شرہ نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ ورنہ تو جی چاہ رہا تھا کہ حرا کا گلابا دے جو اس کی محبت پڑا کاٹال رہی تھی۔ اب عامر کے ہونٹوں نے حرکت کی تو شرہ نے دل تمام لیا کہ جانے اب کیا کہے۔

”کیسے بات کروں حرا کہاں سے درد دل کا افسانہ شروع کروں۔ یہ کس طرح کہوں کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہو۔ میرے دل میں جو تمہاری محبت ہے میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں حرا میں تمہیں بے یقین دلاؤں کہ تم مجھے نہیں تو میں خود کشی کر لوں گا۔ زہر کھالوں گا یا ٹرین کے نیچے آ جاؤں گا۔“

عامر جوش جذبات میں بلند آواز میں بول رہا تھا اور شرہ پتھر ہو گئی تھی۔

وہی جنوں، وہی جذبات وہی ڈائلاگ تھے مگر لڑکی مختلف تھی۔ شرہ کے بجائے حرا تھی اور شرہ سے پہلے جانے کون کون تھیں اور حرا کے بعد جانے کون کون ہوں گی۔ جن پر یہ شخص اپنی محبتیں نثار کرے گا۔

”اچھا یہ فلمی ڈائلاگ بازی ہی ہوتی رہے گی یا کام کی بات بھی ہوگی۔ اصل میں عامر میں ذرا حقیقت پسندی ہوگی۔ ایسی باتوں پر اعتبار کم ہی کرتی ہوں۔ میرا مطلب تو آپ سمجھ رہے ہیں ناں کہ میں تو اپنی خال سے پاس رہتی ہوں۔ ایک طرح سے بوجھ ہوں اس پر۔ آپ کو جو کرتا ہے جلدی کر لیجئے ورنہ۔“

حرا چاہتی تھی کہ عامر کا اصل روپ شرہ پر آج کھل جائے تاکہ پھر کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اسی لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی باتیں کرنے پر مجبور تھی۔

”مکارا احسان فرموش حرا خدا تمہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ میرے حق پڑا کا ڈالنے والی لڑکی۔“ شرہ جلد نہ کر سکی اور رونے لگی۔ حرا سے ڈسنے والی ناگن لگ رہی تھی۔

”حرا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی جلدی رام ہو جاؤ گی۔“ عامر واقعی حرا کی حرا جیسی لڑکی اتنی جلد قابو میں کیسے آگئی۔

”اس کا مطلب ہے آپ کو اپنی محبت کی صداقت پر شبہ ہے تب ہی کہہ رہے ہیں۔“

”ارے نہیں حرا! یہ بات نہیں۔ اگر تم اجازت دو تو میں کمی کو سمجھوں تمہارے گھر۔ تمہارے گھر والے مان جائیں گے ناں۔“

”عامر یہ سب تو تم مجھ سے بھی کہا کرتے تھے۔“ شرہ کا دل درد سے پھنسا جا رہا تھا۔

”جی ہاں کیوں نہیں مانیں گی۔ جب میں مان گئی ہوں تو وہ بھی مان جائیں گے لیکن۔“

”لیکن کیا حرا؟“ عامر نے چونک کر مڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن عامر وہ شرہ کا کیا ہوگا؟“

”شرہ۔ کون شرہ؟“ پہلے تو عامر کا رنگ فق ہو گیا مگر پھر اس کمال ہنر سے وہ مسکرایا حرا کا جی چاہا اس کا منہ لوج لے اور شرہ کا بس چلتا تو خود کو ہی ختم کر ڈالتی۔

”آپ واقعی کسی شرہ کو نہیں جانتے؟“

”مجھے چھوڑو تم یہ بتاؤ تم شرہ کو کیسے جانتی ہو؟“ وہ مشکوک ہونے لگا۔

”دیکھیے مسٹر عامر، یہ زندگی کا اہم ترین معاملہ ہے مذاق تو نہیں ناں، جہاں میں تو کرنی پڑتی ہے نا، اور پھر اس روز آپ ایک خط نیل پر بھول گئے۔ میں نے غیر اخلاقی حرکت کرتے ہوئے پڑھ لیا تھا۔ اس لیے کہ مجھے تجس جوتا تھا آپ کے بارے میں جاننے کا۔ پتا چلا کہ وہ خط کسی شرہ کا ہے اور آپ نے اس سے بھی شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اب میں کس پر اعتبار کروں۔ اس کے خط پر یا آپ کی زبان پر۔ میں تو اُلجھ کر رہ گئی ہوں۔“

”اوہ اچھا۔ اچھا شرہ۔ تم اس شرہ کی بات کر رہی ہوناں۔“

عامر نے یاد کرنے کی ادا کاری کے بعد شرہ کو پہچانا۔

”جی ہاں، وہی شرہ جس سے آپ نے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔“

حرا نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

”اوہ کم آراشی از مانی کرل فرینڈ۔ جسٹ کرل فرینڈ اور کرل فرینڈ سے دوستی تو کی جاسکتی ہے۔ اس کے

ہی رہی میں جس کے لیے سب کو دھوکا دیتی رہی اس نے گرل فرینڈ سے زیادہ اہمیت نہیں دی مجھے۔ میں سر کیوں ہنگی۔ یہ سب سننے سے پہلے۔“

شرہ دکھ میں خود کو ہی کو سے جاری تھی حرا اسے بہلاتی رہی پھر یہ لوگ گھر آ گئیں۔ اس وقت سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ دونوں نے غنیمت جانا، ورنہ اس صورت حال کا جواز کیا پیش کرتیں شرہ مسلسل رو رہی تھی۔ حرا نے بھی چپ نہیں کرایا کہ دل کی بھڑاس اچھی طرح نکال لے۔

”بس شرہ! اب تم ایک آنسو بھی اُس گھٹیا انسان کے لیے ضائع نہیں کرو گی۔ دیکھو شرہ! جذبوں کے سحر سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ نہ مرد نہ عورت بات صرف سچائی کی صداقت کی ہوتی ہے اور جو مرد واقعی کسی لڑکی کو ہاتھ دے رہا ہے وہ لڑکی کو باعزت طور پر پیار کر رہا ہے۔ یہ عقل تو عورت کو ہونی چاہیے۔ اپنی عزت نفس کا پاس لے خود ہونا چاہیے۔ اسے اپنے جذبات پر کنٹرول ہونا چاہئے کہ وہ مرد کے ہاتھوں گھلونا نہ بنے۔ دیکھو شرہ! ہر لڑکی کے سر پر دو پٹا نہیں اس کے والدین کی عزت اور بھائیوں کی غیرت ہوتی ہے۔ یہ عزت، یہ غیرت امانت ہوتی ہے۔ لڑکی کے پاس ان کی اور اس امانت کی حفاظت کے لیے تو لڑکی کو جان بھی دے دینی چاہیے۔ اب تو لڑکی نہیں اندازہ ہو گیا کہ عامر غلط تھا اور جو سچے ہوتے ہیں وہ کبھی چور دروازے سے نہیں آتے وہ حق اور سچ کے راستے پر چل کر آتے ہیں خواہ وقت ان کی جمبوں میں خوشیاں ڈال دے یا غم۔ شرہ میں تمہارے دکھ کو اچھی طرح سمجھتی ہوں لیکن اگر عامر اس قابل ہوتا تو اسے کھودینے پر میں تمہارے ساتھ روتی مگر وہ گھٹیا انسان تو اس قابل ہی نہیں کہ اس سے نفرت کی جائے چلو خدا کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں محفوظ رکھا اس غلط آدمی سے خاموش ہو جاؤ۔“

شرہ کا ہاتھ تمام کر حرا کافی دیر سے اُسے سمجھا رہی تھی اور وہ ہچکچکیوں کے ساتھ روئے جاری تھی۔ یہ آنسو اس بھوکے بدل جانے کے مدد سے میں نہیں تھے بلکہ اس بات پر دکھ تھا کہ اُس کیسے کی چاہت میں اسے پیارے ہاتھ والوں کو تنگ کیا لایا تریا۔

”حرا! مجھے معاف کرنا میں نے تمہیں ہمیشہ غلط سمجھا مگر تم ہمیشہ میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہو گئی۔ اگر ایسا نہ کرتیں تو میں اس گھٹیا انسان کے ہاتھوں جانے کب تک بے وقوف بنتی، مجھے معاف کر دو حرا۔“

شرہ کو آج اپنی ہر زیادتی کا احساس ہو رہا تھا۔

”شرہ! میں بہن ہوں تمہاری میں بھلا تمہیں تباہ ہونے دیتی۔“

”میرے ضمیر کی خلش مجھے تاحیات تڑپائے گی حرا۔“ وہ پھر رو دی۔

”نہیں شرہ! تم نے کچھ ایسا نہیں کیا کہ تم بچتاؤ۔ ابھی تو گھر میں بھی کسی کو خبر نہیں کہ تازیہ کے روپ میں لٹی عامر تھا۔ بھول جاؤ یہ ایک خواب سمجھ کر اور پھر صبح کا بھولا شام کو لٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے چلو اب لکھا آنسو بھی اس کیسے پر ضائع نہ کرنا۔“

اور پھر وہ دونوں غشی ہی دیر بھلتی رہیں، باتیں کرتی رہیں جیسے جیسے حرا باتیں کر رہی تھی شرہ پر سکون ہوتی جا رہی تھی۔ اُس رات اسے بڑی پرسکون نیند آئی صبح جب سوکر اٹھی تو اُسے اپنا آپ نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا اور..... خوش باش محسوس کر رہی تھی، اب وہ بالکل بدل گئی تھی اُسے حیرت ہوتی خود پر وہ تو سمجھتی تھی

ساتھ گھوما تو جاسکتا ہے۔ مگر شادی نہیں کی جاسکتی۔“

کس قدر سفاک کس قدر مکار اور دیتی مرد ثابت ہوا تھا۔ یہ عامر۔ شرہ اپنی نظروں میں مگر نہ لگی۔ وہ خود کو عامر کے دل کی ملکہ سمجھتی تھی مگر وہ تو صرف اس کی گرل فرینڈ تھی۔ شرہ جیسی لڑکیاں اسی حیثیت کے لائق ہوتی ہیں..... جو عامر جیسے مردوں کی اداکاری سے متاثر ہو کر زندگی بے باک کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ حرا کا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا مگر ابھی اس کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔

”یہ تو زیادتی ہے عامر صاحب! آخر گرل فرینڈ بھی تو دل رکھتی ہے۔ وہ بھی تو محبت کر سکتی ہے اور شرہ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آپ کو جنون کی حد تک چاہتی ہے؟“

حرا شرہ کے سامنے عامر کو اچھی طرح بے نقاب کر دیتا چاہتی تھی۔

”مائی فٹ چاہتی ہے تو چاہا کرے۔ یہ اس کا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں۔ وہ تھرڈ کلاس لڑکی مرد کے پیچھے بھاگنے والی چھپوری لڑکی میرے اسٹینڈرڈ کی ہو سکتی ہے۔ مجھے تو ہمیشہ ہی خود دار اور سنجیدہ لڑکیاں پسند رہی ہیں مگر مجھے آج تک ایسی کوئی لڑکی ملی نہیں جیسی تم ہو۔ اب تم ملی ہو تو.....“

”شٹ اپ مسٹر عامر۔ شرہ! اگر زندہ ہو تو آ کر تھوک دو۔ اس کے مکر وہ چہرے پر جس پر تمہیں اندھا اعتماد تھا۔“

حرا کرسی پر گر گئی۔ عامر حیران و پریشان اسے دیکھتا رہ گیا۔ مڑا تو شرہ نے حملہ کر دیا۔

”ذلیل۔ کینے عیار۔ مکار انسان تم جیسے گندے مرد، مردوں کی ذات پر بد نما داغ ہیں وہ لڑکی جو تمہیں روح کی گہرائیوں سے چاہتی رہی جس نے اپنے پاکیزہ جذبے تم جیسے کم ظرف انسان پر بھروسہ کر دیے۔ اس کی حیثیت تمہارے ایک تھرڈ کلاس گرل فرینڈ کی سی ہے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تم جیسے شخص پر اور میں لعنت بھیجتی ہوں اپنے آپ پر بھی کہ تم جیسے گھٹیا انسان کی باتوں میں آ کر اپنے گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی رہی۔ کیسے کیسے جھوٹ نہیں بولے۔ کتنا کتنا تنگ نہیں کیا سب کو۔ اور تم نے مجھے تھرڈ کلاس گرل فرینڈ کا اعزاز بخش دیا۔ گھٹیا انسان میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

شرہ پر جنون سوار ہو گیا۔ اس نے عامر پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ عامر تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حرا اس قسم کی حرکت بھی کر سکتی تھی۔

”میں تمہیں تو اچھی طرح دیکھ لوں گا معصوم چہرے والی مکار لڑکی۔ بابا، مائی بابا۔“

عامر نے خنخواری نظروں سے پہلے حرا کو گھورا۔ شرہ کو دھکا دے کر صوف پر گر لایا اور مائی بابا کو آوازیں دیتا ہر نکل گیا حرا، بے جان سی پڑی بے حال ہوتی شرہ کو روٹے ہوئے دیکھتی رہی جس کا برا حال ہو رہا تھا۔ حرا نے تکی کی اور آہستگی سے چلتی شرہ کے پاس آ گئی۔

”شرہ! یہ وہ ڈراما تھا جسے میں تمہیں دکھانے کے لیے لائی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس ڈرامے کا انجام تمہیں دے گا۔ ختم کر ڈالے گا مگر یہ بھی مجبوری تھی اور ضروری تھا، تمہیں اس راستے سے واپس لانے کے لیے جس کی فی منزل نہیں تھی۔ اٹھو گھر چلیں۔“

حرا نے اُسے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ اس سے لپٹ گئی۔

”حرا! وہ ذلیل مجھے بے وقوف بناتا رہا میرے پاکیزہ جذبوں کی تذلیل کرتا رہا اور میں بے وقوف

ہوا۔ وہ زچ ہو جاتی۔

”وہیے محترمہ! کہیں وہ خوشی میں ہی تو نہیں تھا؟“ وہ اس کے رخساروں پر ہلکوں کے سائے دیکھنے لگا۔

”جی کون سی؟“ وہ اُس کی بات پہلی بار تو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔

”جس کے بارے میں گھنٹوں سے سوچ رہی تھیں۔“

اشعر نے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھا تو وہ باہر دیکھنے لگی۔

”جی نہیں، میں بھیا کے بارے میں سوچ رہی تھی، آخر اتنے دن انہوں نے کہا لگا دیے؟“

”اونہوں! یہ بھیا تو بڑی بن کر رہ گیا ہمارے لیے ہم خواستہ ہی خوش فہمی کا شکار ہیں کہ محترمہ ہمارے

رے میں سوچ رہی ہیں۔“ اشعر نے ہوشی کے ذکر پر ہنسیلا ہٹ کا اظہار کیا تو بھینی خفا ہو گئی۔

”آپ بھیا کے بارے میں ایسا سوچتے ہیں؟“

”جی ہاں سوچیں گے اور ضرور سوچیں گے آپ کے بھیا کے بارے میں ایسا، بھینی کی حد ہو گئی ہماری جگہ

نہیں بننے دیتا آپ کے دل میں۔ روئیں گے نہیں تو کیا قہقہے لگائیں گے ہم۔“

اشعر جان بوجھ کر ایسے وقت میں جب وہ اُداس ہوتی ایسی باتیں کرتا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑتی۔

”اشعر! تم یہاں کیا کر رہے ہو، میں نے تو تمہیں شہزاد کے ہاں بھیجا تھا۔ ابھی تک یہیں ہو؟“

عذرا بیگم کی تیز آواز بھینی کے دل کو چرتی گزر گئی۔ ان کی نظروں کا انداز آف تو بھینی کا دم گھٹنے لگا۔ اتنی

جہاں رفتا میں سانس لینا کتنا دشوار تھا اس کے لیے۔

”جی امی! وہیں جا رہا تھا، وہ بھینی کے والد کا خط آیا تھا، وہ دینے آ گیا تھا، بھینی! آپ اُن کو جواب ضرور

اسد بھیجے گا، وہ پریشان ہو جائیں گے۔“

اشعر اُسے آنکھوں میں تسلی دیتا وہاں سے آ گیا اُسے ڈر تھا کہ کہیں عذرا بیگم کوئی گل افشانی کر

کے نہ چلا ڈالیں۔

”اشعر! اس لڑکی کے ساتھ تمہاری بے تکلفی مجھے ہرگز پسند نہیں۔“ عذرا بیگم نے نخوت سے بھینی کو دیکھا۔

”آپ بھی کمال کرتی ہیں امی! بے چاری معصوم لڑکی ہے ذرا ہمدردی کر دیتے ہیں تو آپ لوگ غلط کچھ

لکھیں۔“ ہم سے امی جان! آپ خواتین بھی بس..... اچھا میں جا رہا ہوں۔“

اشعر نے ایک الوداعی سی نظر چپکے سے بھینی پر ڈالی اور باہر کی طرف بڑھا، سامنے سے شرمین سے ٹکرا گیا۔

”یہ تشریف کہاں جا رہی ہے؟“ شرمین نے سن گلاسز اتار کر پرس میں رکھے۔

”آپ کے ہاں۔“

”وہ کس خوشی میں؟“ شرمین وہیں رک گئی۔

”انہاں اور تمہارا رشتہ طے کرتے۔“ اشعر کو معلوم تھا کہ شرمین اس بات سے چرتی ہے اسی لیے اسے تنگ

کرنے کی غرض سے بولا۔

واٹ۔ نان سنس، دماغ درست ہے تمہارا سر تو ڈوڈوں کی اگر آئندہ ایسی بات کی تو۔ حسب توقع شرمین

ہنچا ہوا اُس کے پیچھے پڑ گئی۔

ذرا ان سبہرے خیالات کا اظہار اپنی پھپھو جان کے سامنے کر دیجئے گا، جو آپ کو بہو بنانا چاہتی ہیں، مجھے

کہ اگر عامر نہ ملا تو مر جائے گی لیکن اب تو وہ اُسے کھو کر نہ صرف زندہ تھی بلکہ بہت خوش تھی۔ اس کے رویے میں جو تبدیلی آئی تھی اس سے سب حیران ضرور تھے مگر خوش تھے۔

”حرا بھئی! تم تو میرے لیے رحمت ہی رحمت ہو بیٹی، ورنہ میں تو شمرہ کی طرف سے ناامید تھی کہ کبھی یہ سدھرے گی۔“

”مجھے گناہ گار نہ کیجئے امی جان! یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے مجھے تو اُس کی ذات پاک نے وسیلہ بنایا ہے بس اب دیکھیے گا شمرہ آپ کی سب سے زیادہ تابعدار اور اذیتا بہت ہو گئی۔“

”انشاء اللہ بیٹی! اس سے پھر کامران کے بارے میں پوچھ لو، رضوانہ کا بھائی ہے اور وہ لوگ بہت خواہش مند ہیں پہلے تو مانگتی ہیں نہیں تھی اب بات کرو۔“

”اچھا، یہ بات تو مجھے معلوم ہی نہیں تھی، آپ فکر نہ کریں اللہ کو منظور ہو تو وہ ضرور مان جائے گی۔“ اسی شام حرا نے شمرہ سے بات کی تو وہ خاموش ہو گئی۔

”سنا ہے وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے“

”ہاں حرا! واقعی بہت سنجیدہ ہے مگر میں ہی عامر کی وجہ سے اُسے ٹھکراتی رہی۔“ شمرہ نے اعتراف ٹھٹھ کرتے ہوئے کہا۔

”اب تو کوئی دیوار حائل نہیں ہے ناں، دیکھو شمرہ! چاہنے والے ہر موڑ پر نہیں ملا کرتے اس لیے پرظوم چاہتیں جہاں جس موڑ پر بھی ملیں سمیٹ لیتی چاہئیں۔ امی کو ہاں کہہ دوں تمہاری طرف سے؟“ حرا نے اُس کی سوچ میں ڈوبی آنکھوں میں دیکھا۔

”سوچنے کا موقع نہیں دو گی۔“ شمرہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”کیا سوچتا ہے۔ کامران تمہارا کزن بھی ہے اور پھر اچھی پر سنائی اچھی جاب اور کسی لڑکی کو کیا چاہیے۔“ میرے خیال میں اب سوچنے کی ضرورت تو نہیں مگر.....

”اچھا بابا! تم سے بھلا میں جیت سکتی ہوں کبھی، میں سب کی خوشی میں خوش ہوں اور پھر چاہنے والے ہر موڑ پر تو نہیں ملتے ناں جہاں ملیں وہیں اُن کو پکڑ لینا چاہیے۔“ شمرہ نے نظریں جھکا کر شوخ سے انداز میں کہا حرا نے اُسے ساتھ لگایا۔



ہوشی کو لاہور سے اسلام آباد بھیجنا تھا اور وہ عمیر سے مل کر وہیں چلا گیا اور اتنے دن لگا دیے تھے کہ کبھی خود کو بڑا تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے بغیر ہوشی تو گویا اس کی ڈھال تھا وہ ہوتا تو خوف نہیں آتا تھا مگر اب تو اُسے ہر ایک کی نگاہیں آ رہی تھیں اور پار ہوتی محسوس ہوتیں۔ خصوصاً سیدہ بیگم اور عذرا بیگم کی کتنی عجیب تھی اس کی زندگی اپنے گھر میں ہی انجینی بن کر رہ رہی تھی وہ کسی رشتے کو بھی اسے کے نام سے نہیں پکار سکتی تھی اسی لیے زیادہ تر ان کی ہی رہتی اس وقت بھی وہ بالکونی میں کھڑی خاموشی سے اپنے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اشعر غیر محسوس انداز میں اس کے پاس آ کھڑا ہوا تو وہ چونک گئی۔

”ارے! آپ کب آئے؟“

”کچھ زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا آپ سے چند سال پہلے آیا تھا۔“ اشعر کبھی بھی ڈھٹک کا جواب اُسے نہیں



چونکہ اپنی زندگی اور بال بہت عزیز ہیں اس لیے میں تمہیں بیگم بنانا نہیں چاہتا۔

”کیا مطلب پھوپھو ایسا سوچتی ہیں؟“

شرمین کو یہ بات پہلی بار معلوم ہوئی تھی وہ تو ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتی تھی۔ ایاز کے علاوہ اور اشعر تو اس کا اچھا دوست تھا۔ اس کے حلق ایسا سوچنا تو بے اُسے چھر چھری آگئی۔

”جی آپ کی پھوپھو نہ صرف ایسا سوچتی ہیں بلکہ اب تو وہ اس سوچ کو عملی جامہ بھی پہنانے جانے والی ہیں کچھ کر سکتی ہو تو کرو اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اچھی خوبصورت ڈاکٹر جسے مل جائے اس اور کیا چاہئے میں تو ہاں کہہ دوں گا وہ اُسے چھیڑے گیا۔

”اشعر کے بچے! میں تمہارا خون پی جاؤں گی اگر تم نے ایسی ویسی حرکت کی تو۔“

”صرف ایک شرط پر نہیں کروں گا۔“ وہ خواہ خواہ ہی شرط پر اتر آیا۔

”بکھو۔“

”نہ صرف میرے ساتھ شادی سے انکار کرو بلکہ امی کو یعنی کے لیے تیار بھی کرو۔“ وہ اصل مقصد پر آگیا تو شرمین خوش ہوگئی۔

”اچھا تو یہ بات ہے، تم یعنی کو پسند کرتے ہو؟“

”بہت چھوٹا لفظ ہے پسند۔“ اشعر نے گہرے لہجے میں کہا۔

”بس اب تم فکر نہ کرو انشاء اللہ خدا کو منظور ہوا تو وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو میں تمہاری پوری پوری مدد کروں گی۔“

”وعدہ!“ اشعر نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔

”پکا وعدہ!“ شرمین نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا تو اُسی وقت عذرا بیگم آگئیں۔ اُس کو یوں شیر شر دیکھ وہ نہال ہوگئی۔

”ماشاء اللہ! کیا چاند سورج کی جوڑی ہے۔“ انہوں نے تعریف کی تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔

اسی روز ہوی بھی واپس آگیا یعنی کل اٹھی مگر ہوی کی بے قراریاں ہنوز تھیں۔

”تمہیں میں نے گھر سے دور اس لیے بھیجا تھا کہ ذرا فریش ہو جاؤ مگر لگتا ہے تم۔“

اشعر نے اُس کے سر جھائے ہوئے چہرے کو دیکھا تو ہوی نے ایک زخمی سی نظر باہر لان میں اکیلی بیٹی شعاع پر ڈالی جو جانے کن خیالوں میں مگن ہوئی تھی۔

”گھر سے دور تھا اشعر مگر دل کا درد تو ساتھ ہی تھا ناں۔“

”ہاں وہ تمہاری بہن صاحبہ کو مجھ پر خفا ہوتی رہیں کہ میں نے تمہیں یہاں سے بھیج دیا ہے اس سے لے کر نہیں؟“

”نہیں! ابھی تو ملاقات نہیں ہوئی ابھی جاؤں گا ہے کہاں خالہ جانی کے کمرے میں ہے یا کسی اور؟“ ہوی

یعنی سے ملنے کے لیے اُٹھ گیا۔

”ہوی! میرے خیال میں اب چچا جان کو سب پر ظاہر کر دینا چاہئے کیونکہ یعنی کا وجود اب سب کی نظروں

میں محسوس ہوتا جا رہا ہے مگر کی خواتین کتنی تنگ نظر ہیں یہ تم بھی خود اچھی طرح جانتے ہو خصوصاً امی جان اور چچی ابا اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں اور اس لڑکی کی تذلیل کم از کم میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

رخ موز کر اشعر بہت بڑی بات کہہ گیا تھا۔ ہوی اُس کی پشت کو دیکھتا ہوا کچھ دیر سوچتا رہا۔

”ہاں اشعر! میں نے بھی یہی ہی چاہے کہ اب تو سامنے آ جائیں تو اچھا ہے ورنہ دیر ہوگی تو یعنی شاید یہ سب بات نہ کر سکے۔ خالہ جان سے مشورہ کر کے ابو سے بات کر لیں گے۔“

ہوی عین جگہ سے بولتا ہوا آگیا لاؤنج میں سب ہی موجود تھے یعنی خوشی میں اس طرف بڑھی۔ اسے ہوی نے اپنی اطلاع تو مل گئی تھی مگر ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

”آپ نے بہت دن نگا دیے بس۔“ یعنی کسی کی بھی موجودگی کا خیال کے بغیر ہوی کی طرف بڑھی اور اس کے ہاتھ تمام لیے۔ اس کی یہ حرکت سب نے نوٹ کی۔ اشعر نے محسوس کیا تو فریادیں پٹنے لگا۔

”شکر ہے یعنی صاحبہ! کہ آپ کے بھائی صاحب نے دن لگانے دل لگا لیتے تو بھلا واپس آتے۔“ اتنی ہی میں یعنی کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اُس نے جلدی سے ہوی کے ہاتھ چھوڑ دیے اور یہ حرکت بھی سب نے

نوٹ کی یعنی اچھی خاصی بوکھلا گئی۔ سب کی نظریں اُس پر جمی تھیں۔ جانے کیوں اُسے بڑی انسٹ محسوس ہوئی اس کا جی چاہا یہاں سے بھاگ جائے کہیں چھپ جائے۔

”کیسی ہو یعنی؟ ٹھیک تو ہونا؟“ ہوی نے آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”جی ٹھیک ہوں۔“ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا اور تیز تیز قدم اٹھائی باہر نکل گئی کمرے میں آکر وہ بستر پر لیٹی وہ کتنی ہی دیر روتی رہی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اپنے پرانے گھر چلی جائے گی جہاں اُس کی ماں کی خوشبو تھی

ان کی یادیں تھیں۔ وہ اُن کے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی۔ وہ جگہ وہ تنہائی رشتوں کے سلسلے سے کہیں بہتر تھی یہاں لے کے ابو جب بھی جاتے جی کہہ کر پکارتے وہ باپ بن کر رہتے تھے یہاں تو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ابو

کے کئی دن تک ملاقات نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی تو وہ نہ اُن کو ابو کہہ سکتی تھی اور نہ وہ اسے بیٹی کہہ سکتے تھے ابھر کیا فائدہ ایسی جگہ رہنے کا ہوی اُلگ پریشان رہتا ہے۔

وہ فیصلہ کر کے باہر آئی اس نے سوچا تھا کہ اشعر ہی کی منت کرے گی گو کہ امید کم ہی تھی تاہم پھر بھی اس نے کوشش کر لی۔

”ماں یعنی صاحبہ! میں شکل سے آپ کو اتنا ہی احسن نظر آتا ہوں۔ معلوم ہے آپ کے باپ اور بھائی بڑے

لچلے ہیں خواہوا، اغوا کے الزام میں اندر کرادیں گے تو میں کیا کروں گا اور فی الحال جیل جانے کا میرا کوئی ہلکا نہیں۔“ اشعر نے صاف انکار کر دیا تو یعنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اشعر! اگر آپ کو میرا ذرا بھی خیال ہے تو پلیز، مجھے وہاں فلیٹ پر چھوڑ آئیں۔“

پائپ ر کے ہوئے آنسو رخساروں پر پھیل گئے۔ اشعر خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

”واہ! کیا خوب بات کی ہے یعنی صاحبہ نے جیل، یہ تو مانا کہ مجھے تمہارا خیال ہے۔ دیکھو یعنی! مجھے جتنا تمہارا

بلا ہے ناں، جی تو چاہتا ہے کہ ابھی اور اسی وقت جا کر آجانی کے سامنے کہہ دوں کہ میں لیکن یعنی! میں انتظار

لہوں آج میں خود چچا جان سے بات کروں گا۔“

”نہیں! اشعر! مجھے جھوٹے دلا سے مت دیں۔“



”تو پھر چچا جان اسے جا کر بیٹی کی حیثیت سے سب کے سامنے لیے آئے“ ورنہ وہ کہتی ہے کہ وہ یہاں کسی صورت میں بھی نہیں رہے گا۔ میں ابھی اس سے بات کر کے آ رہا ہوں چچا جان؟ آپ کیوں گھبرا رہے ہیں؟ کوئی گناہ نہیں کیا۔ جرم نہیں کیا پھر یہ تامل کیوں؟“

”بیٹے تم میری مجبوری نہیں سمجھ رہے لیکن اب ہمت کرتا پڑے گی۔ میں رات کو عابی سے مشورہ کر کے آؤں گا۔“

اور پھر رحمن احمد نے ہمت کر لی عابی بھی بہت خوش ہوئیں۔

”میرے خیال میں تو رحمن بھیا آپ کو یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ آپ نے کوئی گناہ تو نہیں کیا ہوائی ہوں کہ آپ اس حقیقت کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گی، مگر آخر میں کو کس جرم کی سزا دی جائے۔ میرے خیال میں ابھی آغا جی کے پاس جائیں اور ان کو بتا دیں کہ میں نے کوئی غیر نہیں آپ اپنی بیٹی ہے۔ یعنی آپ کی اپنی سگی ماں ہے۔“

”لیکن اب اس احتیاط کے ساتھ کہ امی کوئی الحال خبر نہ ہو۔“

لیکن بد قسمتی سے سیدہ بیگم نے ہی یہ خبر سن لی۔ وہ جو عابی سے کوئی بات پوچھنے آئی تھیں، آخری بات ہلانے سنی اتنا تو سماعتوں نے کام کیا اس کے بعد کچھ ہوش نہیں کیا ہوا۔



”ارے واہ! مجھے فٹ پاتھیا عاشق سمجھ رکھا ہے کہ جموں نے دلا سے ندو۔ یہ لیجئے میری کسی دوسری دورست نے دیا تھا یہ رومال، بڑے پیار سے پسینہ صاف کرنے کے لیے لیکن آپ آنسو صاف کر لیجئے۔“

اشعر مستقل اسے فریش کرنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس نے جیب سے نفیس سا رومال نکال کر بیٹی کے ہاتھ میں دے دیا۔

”آپ میرا اتنا سا کام نہیں کر سکتے؟“ یعنی نے شا کی نظروں سے اشعر کو دیکھا۔

”محترمہ! میں آپ کا بہت بڑا کام کر سکتا ہوں لیکن ابھی نہیں چچا جان سے بات کرنے دوا اگر پھر بھی کوئی بات نہ بنی تو پھر میں خود آگے بڑھوں گا لیکن فی الحال جانے کا پروگرام ملتوی کرو۔ وہ دیکھو تمہارے جموں نے بھائی صاحب بوٹی ادھر ہی آرہے ہیں اور اس سے پہلے کہ آپ کے بھائی مجھ پر شک کریں میں چلا آؤں۔ یہ رومال احتیاطاً رکھ لیجئے وہ فائدہ ہوں گے اس کے ایک تو میری یاد دلائے گا اور دوسرا این بادل برسات کو صاف کرنے میں کام آئے گا، بائے بائے۔“

اشعر اسی طرح ہمیشہ ہی اپنی ہلکی پھلکی باتوں اور غلوں سے بھلا جاتا اور وہ وقتی طور پر بھل بھی جاتی اشعر وہاں سے سیدہ رحمن احمد کے کمرے میں آیا اس نے خود ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خود بات آگے بڑھائے گا، ورنہ تو اس طرح یہ معاملہ درمیان ہی میں رہے گا۔ اس نے ہوش کا بھی انتظار نہیں کیا۔ دراصل اسے یعنی کے آنسو بہت اذیت پہنچاتے تھے۔

”کوئی خاص بات اشعر بیٹے؟“ رحمن نے غور سے اسے دیکھا۔

”یعنی سے بڑھ کر کوئی خاص بات ہو سکتی ہے چچا جان۔“

”یعنی.....! کیا ہوا یعنی کو؟“ رحمن احمد ایک دم چونک پڑے وہ ویسے ہی یعنی کی طرف سے فکر مند رہتے تھے۔

”ابھی تو کچھ نہیں ہوا چچا جان، لیکن اگر یہ خاموشی برقرار رہی تو یقیناً کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ وہ بے چاری اپنے گھر میں اب بھی بن کر رہ رہی ہے۔“

”پھر میں کیا کروں بیٹے میں تو بے قصور ہو کر بھی سزا پا رہا ہوں بھلا ایک باپ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا اذیت ہو سکتی ہے کہ اس کی بیٹی اس کی نظروں کے سامنے ہو اور وہ اسے بیٹی نہ کہہ سکے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ جو قیامت آئے گی وہ سب کو برباد کر دے گی۔“ رحمن صاحب جذباتی سے ہو گئے۔

”چچا جان! آخر آپ کب تک ڈرتے رہیں گے اس حقیقت کو ایک نہ ایک دن تو کھلتا ہی ہے پھر جلدی کیوں نہیں کیونکہ یعنی بری طرح ٹوٹ رہی ہے۔ پلیز چچا جان ہمت سے کام لیں۔“

”تو پھر تم لوگ ہی کچھ بتاؤ میں کیا کروں، سب معاف کر دیں گے مگر..... مگر سیدہ بیگم ہرگز معاف نہیں کریں گی۔ میں سب کی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گا بیٹے! میں کس طرح سب کی نظروں کا باتوں کا مقابلہ کر پاؤں گا۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔“

”چچا جان! اگر آپ ہمت نہیں کر سکتے تو پھر یعنی کو واپس اسی تنہائی میں جموڑ آئیے۔“ اشعر کو چچا جان کی یہ تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟، کیا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

آغا جی کے کمزور لہجے میں..... دل کا درد لفظوں میں ڈھلا تو رحمن کا شدت سے جی چاہا، زمین کا سید شمس ہو اپنے اور وہ اس میں سما جائیں۔

”آپ جو سزا بھی دیں آغا جی! قبول ہے مگر آغا جی! اگر آپ دیکھیں تو میں نے یہ نیکی کا کام کیا۔ سلی لالہ چاقی۔ دنیا میں۔ اس کا کوئی بھی نہیں تھا میں نے لاکھ چاہا کہ وہ شادی کر لے مگر وہ کہیں اور شادی کے لیے لڑی نہیں تو مجبوراً مجھے سلی سے نکاح کرنا پڑا۔ آغا جی نیک اور صالح اعمال کی تربیت تو آپ ہی نے ہمیں دی“

رحمن کے پاس اپنے دفاع کے لیے یہی ایک دلیل تھی، جسے انہوں نے اپنی ڈھال بنا کر اپنے سامنے کر دیا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا ان کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے۔

”ہماری تربیت کو الزم نہ دو رحمن! ہم نے کبھی تم لوگوں کی ایسی تربیت نہیں کی اور جسے تم نیک عمل کہہ رہے ہو۔ وہ ایسا بھی نیک عمل نہیں۔ ایک ایسا عمل جس میں انسان کی ذاتی غرض، ذاتی مفاد اور احساسات کی تسکین مل ہو جائے۔ وہ نیک عمل نہیں بلکہ خواہش پرستی کہلاتا ہے فرض کرو ایسا ہوتا کہ سلی سے تمہاری جذباتی وابستگی ہوتی، جب تم اس کی مدد کرتے تو یقیناً نیک عمل تھا لیکن کیا کریں کہ ہم اولاد کے ہاتھوں مجبور ہو کر خدائے پاک ہمارے نام آدم اور شرمندہ ہو گئے۔ اپنے مرحوم بھائی اور بھادج کو کیا منہ دکھائیں گے، جنہوں نے مرتے وقت اپنا خدا کے بعد میرے حوالے کی تھیں۔

”رحمن..... رحمن! ابھی..... میں تو عابی کا دکھ ہی نہیں بھلا پایا تھا کہ..... سیدہ کو بھی تم نے اذیت میں مبتلا کر ملی کیا کروں خدائے بزرگ و برتر تیری ذات جانتی ہے۔ میں بے گناہ ہوں میری اولاد ہی اپنی خواہشوں اور غلامی کے لیے تو میں کیا کروں؟“

آغا جی بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ آج وہ زندگی میں پہلی بار خود کو اتنا کمزور سمجھ رہے تھے رحمن نے آہستگی سے ارمان کے پاؤں میں چھو لیے۔

”آغا جی! میں گناہ گار ہوں تو جو چاہے سزا دے دیں، میرا سر قلم کر دیں یا اپنی شفقت سے محروم کر دیں۔ آغا جی اس بات پر اعتبار کر لیں کہ میں کبھی بھی بد نیت نہیں رہا۔ میں نے سلی کو بھلا کر پورے خلوص اور نیک کے ساتھ سیدہ سے شادی کی تھی مگر.....“

رحمن نے بے بسی سے آغا جی کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ بی بی جان کا دل بیٹے کی حالت پر پانی ہوتا رہا۔ اُن لاکھ رہا تھا رحمن کو اٹھا کر بیٹے سے لگا لیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ رحمن سلی کو کتنا چاہتے تھے مگر نواز میں انہوں نے سلی کو چھوڑ کر سیدہ سے شادی کر لی تھی اور اگر وقت اور حالات نے انہیں سلی کو اپنا محبوب کر ہی دیا تھا تو یہ کوئی ایسا گناہ بھی نہ تھا کہ معاف نہ ہو سکتا۔

”تم سے بہتر تو فرمان تھا جس نے جو کچھ کیا، اعلانیہ کیا اور تم..... تم نے میرے اعتماد کے بت کو پاش پاش کیا ہے۔ تم نے رحمن بہت دھوکا دیا ہے مجھے، تم تو میرا مان تھے، میرا فخر تھے، ساری اولاد میں سے مجھے تم پر نمایاں تم نے کیا کر دیا بیٹے کہ میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہوں، کیا جواب دوں گا، سیدہ کو جس نے ہمیشہ اپنا پرشبہ کیا ہے وہ تو عابی والی غلطی معاف کرنے پر آج تک تیار نہیں ہوئی تو۔ اپنی حق تلفی کیونکر برداشت کر لے گا۔ پہلے یہ مجھے بتا دیا ہوتا تو آج میں یوں اپنی نظروں میں نہ گر ہوتا۔“

لیوں تو آغا ہاؤس عموماً جھکوں کی زد میں رہتا تھا۔ چھوٹے بڑے طوفان اس گھر کی ہر سکون زندگی کو متلاطم کرتے ہی رہتے تھے اور اس بار تو زندگی پر بھرم کی دیوار ٹوٹ کر گری تھی۔ قیامت کیسے نہ آتی۔ رحمن احمد آغا جی ساری اولاد میں سب سے زیادہ فرمانبردار تھے۔ انہوں نے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر آداب فرزندگی اور کیے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی سیدہ بیگم سے شادی پر رضامند ہو گئے تھے اور وہ پوری دیانت داری سے یہ رشتہ نباہ رہے تھے لیکن جب خدائی کو کچھ اور منظور تھا تو وہ کیا کر سکتے تھے۔ راستے میں جب انسانیت، مدد کے لیے دامن پھیلائے آگئی تو وہ اس کا دامن کیونکر جھٹک سکتے تھے جبکہ اس مدد میں دلی جذبات کا بھی دخل تھا۔ وہ سلی کو چاہتے تھے پھر اُسے اس بھری دنیا میں بے یار و مددگار کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ انہوں نے سلی سے نکاح کر لیا۔ اٹھارہ سال میں وہ ہل ہل جیسے اور مرے تھے۔

بچتے پھرتے تھے اس گھڑی سے جو ان کے ناکردہ گناہوں کی سزا بنی سامنے کھڑی تھی وہ سب کی گھڑی نظروں کی عدالت میں لاجواب کھڑے تھے باپ اور ماں کی نظروں میں، بہن بھائیوں کی نظروں میں جو ان اولاد کی نظروں اور بیوی کی نظروں میں جنہیں تمام عمر یہی خوش فہمی رہی کہ رحمن انہیں چاہتے ہیں۔ بیویاں تمام عمر ای خوش فہمی میں تو گزار دیتی ہیں کہ ان کا شوہر انہیں دل و جان سے چاہتا ہے لیکن اعتماد کے پس آئینہ ان کا شوہر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی اور کا ہو جاتا ہے تو اعتماد کے چکنا چور آئینے میں بیویاں ساکن آنکھوں سے اپنا شوہر تلاش کرتی رہ جاتی ہیں آغا جی اور بی بی جان اس ضعیف العمری میں ایسے کسی جھکے کے تحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس حرکت پر بیٹے کو سرنش کی ہمت تھی اور نہ ہی سکتے کی حالت میں بے سدھ پڑی جیتی کی سر پر ہاتھ رکھنے کی تاب۔ چہرے پر جلال کے ساتھ دکھ کے سائے بھی تھے۔ لرزتے ہاتھوں میں چھڑی کی حرکت سے الگی اندرونی حالت عیاں ہو رہی تھی۔ رحمن احمد نامت شرم کے پسینے میں شرابور سر جھکائے کھڑے تھے اپنی صفائی میں کہنے کو ایک لفظ بھی نہیں تھا، ان کے پاس۔

”رحمن بیٹے! خدا کی قسم میں آج اپنی نظروں میں گر گیا ہوں تم۔ تم تو میری ریڑھ کی ہڈی تھے رحمن ریڑھ کی ہڈی ہی ٹوٹ جائے تو بیٹے انسان بھلا کھڑا کب رہ سکتا ہے۔

پہ چاری سیدہ نے تمام عمر شوہر پر اعتماد کرتے گزار دی۔ صلہ کیا ملا ایک عدد سوتیلی بیٹی۔ مجھے تو وہ لڑکی شروع ہی سے پسند نہیں ایسی عورتوں کا کام ہی کیا ہوتا ہے دوسروں کے گھر برباد کرنا اب جیسی ماں۔  
 ”بھابھی جان! اتنی بڑی گالی نہ دیں سلمیٰ کو وہ انتہائی شریف اور پارسا عورت تھی جس نے تمام حقوق سنبھالے ہوئے تھے کسی حق کا مطالبہ نہیں کیا اور خاتون شریفی سے قبر میں اتر گئی۔ وہ چاہتی تو آج آپ لوگوں کی طرح اس گھر میں رہ رہی ہوتی۔“ عالی برداشت نہ کر سکیں تو بول پڑیں۔

عالی اگر درمیان میں نہ ٹوک دیتیں تو عذرا بیگم تو آج دل کی بھڑاس اچھی طرح نکال لیتیں۔  
 ”واہ بی بی عالی! تمہاری تو دنیا ہی زوالی ہے خود بھی تمام عمر اگلے سیدہ کے فلسفے میں ضائع کر دی اور اب میں موت کی دہلیز پر کھڑی ہے اور تمہیں اس کی سوسن کی اولاد سے محبت ہو رہی ہے۔“ عذرا بیگم خود اشعر کی وجہ سے بھی کونا پسند کرتی تھیں اس لیے وہ عالی کی بات پر چڑ کر بولیں تو اشعر نے دکھ بھری نظروں سے ماں کو دیکھا اور ہنسی سے باہر نکل آیا۔ کیا تم تھا کہ وہ جس لڑکی کو چاہتا تھا وہی لڑکی اس کی ماں کو سخت ناپسند تھی۔ اسے تو اپنی اولاد ہی ہوئی نظر آتی۔ وہ کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

آغا جی کو اس نئے صدمے نے کچھ ضرورت سے زیادہ کمزور کر دیا تھا مگر پھر بھی خود چل کر سیدہ بیگم کے کمرے میں آئے تو سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔

”آغا جی آپ..... آپ نے تکلیف کیوں کی؟“

عالی نے سیدہ بیگم کا سر تھیکے پر رکھا اور تیزی سے آغا جی کی طرف بڑھیں۔ انہیں سہارے کر سیدہ بیگم کے ہانک لے آئیں۔

”سیدہ بیٹی! ہوش میں آؤ میری بچی! تمہارا گناہ گار باپ معافی مانگتے آیا ہے تم سے سیدہ بیٹی! اولاد کی کتابوں کا خمیازہ والدین ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کچھ بولو جو جی میں آئے کہو مجھے بے انصاف کہو! جانب دار سر پرست کہو جو جی میں آئے کہو۔“

آغا جی نے لرزتا ہوا تھا سیدہ کے سر پر رکھا تو گویا انہیں کرنٹ سا لگیوں جیسے زندگی کی رو کو نہ گئی ہو۔ وہ خود دنیا میں لوٹ آئیں تو پہلا تیر جول میں ترازو ہوا وہ یعنی کارجن کی بیٹی ہونا تھا۔ وہ بکھرے لگیں دکھ کی جس ادوی میں سفر کر رہی تھیں اس میں اس وقت کسی تخلص سہارے کی ضرورت تھی جو خود چل کر ان کے پاس آ گیا تھا۔  
 ”آغا جی..... آغا جی! دیکھا آپ نے میرے ساتھ کیا ہوا۔ آغا جی رحمن نے عمر کے کس موڑ پر دھوکا دیا ہے مجھے، کیوں ایسا ہوا آغا جی، ہم دونوں بہنوں ہی کے نصیب ایسے کیوں تھے۔ آغا جی آپ نے پوچھا رحمن سے کہا انہوں نے مجھے اس عمر میں دھوکا کیوں دیا؟“

سیدہ باپ سے زیادہ تخلص اور شوق آغا جی کے ساتھ لگی تھیں تھپ تھپ کر رورور کر ان سے ان ہی کے بیٹے کی شکایت کر رہی تھیں۔ آغا جی کا دل دکھ کی گہری کھائی میں اتر رہا تھا ماحول بہت گھبرایا اور افسردہ ہو رہا تھا۔ سیدہ کی حالت پر سب ہی دھکی ہو رہے تھے۔ سب ان کو خاموش کر رہے تھے جبکہ وہی کا خیال تھا وہ جتنا روئیں گی ان کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔

”راشوا! یعنی کہاں ہے اس کا تو پتا کرو، ہے بھی کہ نہیں۔“ ہوئی کو بار بار یعنی کا خیال آ رہا تھا۔

”تم بچی جان کا خیال رکھو میں دیکھتا ہوں یعنی کو۔“

آغا جی بھی باپ تھے ہر بات کو سمجھتے تھے۔ بیٹا بھی بے گناہ لگ رہا تھا اور سیدہ کے طعنوں سے بھی فزولہ تھے۔ جی تو چاہتا تھا اپنے اس بیٹے کو سینے سے لگا لیں جس نے ان کی بھی حکم عدولی نہیں کی۔ ان کی خوشی پر خوشی کو ترجیح دی۔ آج وہ اگر اپنی کمزوری کا مجرم بنا کھڑا تھا تو وہ انصاف کی کرسی پر بیٹھے ان کے حق میں فیصلہ نہیں دے سکتے تھے۔

”میں مانتا ہوں آغا جی کہ آپ کو نہ بتانے میں میری غلطی تھی مگر میں کیا کروں آغا جی! میں نے تو آپ کو خوشی دینے کی کوشش میں اپنے لیے دکھ خریدے ہیں دوسروں کو پھول دینے میں اپنا دامن کاٹوں۔ البتہ اب بے بی بی جان! آغا جی اس ساری زندگی میں، میں نے صرف ایک خوشی اپنے نام کی تو زمانہ بھر خفا ہو رہا ہے، آپ تو والدین ہیں آپ لوگ بھی اپنی شفقتوں میں پناہ نہیں دیں گے تو کہاں جاؤں گا آغا جی؟“  
 آغا جی باپ تھے، پھر تو نہ تھے کہ اولاد کے آنسوؤں پر بھی نہ پھٹتے۔ انہوں نے رحمن کو ساتھ لگایا اور دیر سا ساتھ لگے رکھا رحمن پر سکون ہو گئے۔

”گناہ دہلاؤ اب کو میں بھی سمجھتا ہوں بیٹے! لیکن مجھے معلوم ہے کہ سیدہ جو عالی والی بات نہیں بھولی ساتھ یہ انصاف کی کھوپڑی برداشت کرے گی وہ معاف کرنے کا ظرف نہیں رکھتی بیٹا میرے خدا یا! اس عمر میں میں موت کی دہلیز پر بیٹھا موت کی راہ تک رہا ہوں تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا۔“

”آپ ملال نہ کریں اتنا آغا صاحب انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا بچوں سے غلطیاں ہو کر ہی معاف کروں اسے فرما میرا دیواریوں کو تو صلہ اسے کبھی ملا نہیں، ایک گستاخی کی سزا تو بخش دیں۔“  
 تمام عمر تاج پوری میں گزار دینے والی بیوی آج بیٹے کے حق کے لیے بولی تو آغا جی انہیں دیکھ کر کہہ گئے  
 ”صالح بیگم! بات اگر صرف میری ہوتی تو میں معاف کر دیتا لیکن سیدہ کو کیا کہہ کر مطمئن کروں گا۔ معاف کرنے کا ہنر نہیں جانتی۔“

آغا جی کی ٹیف آواز تاریکی میں ڈوب گئی۔ کیسا موڑ تھا یہ زندگی کے راستے کا کہ ان کی کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کیا کریں ایک طرف مجبور اور فرما میرا دار بڑا بیٹا تھا اور دوسری طرف بدگمان بیٹی تھی۔ وہ بہتر فیصلے کے اس واحد عادل کے سامنے جھک گئے جو دلوں کے نیوٹوں کے بھید بہتر جانتا ہے اور بہتر فیصلے کرتا ہے۔  
 رحمن اس بات کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ سب کی سوالیہ نظروں کا نشانہ بنیں یا جواب دیں وہ اپنے کمرے میں بند تھے اور پھر اتنی آنکھیں لیے سیدہ بیگم سب کو پریشان کیے ہو تھیں۔

آپا! آپا جان ہوش کرو۔ زندگی اسی کا نام ہے آپا! خدا کے لیے کچھ تو بولو، جینو! چلاؤ، روؤ، تڑپنا پنا، پر لیکن ہوش میں آؤ آپا۔“

عالی سیدہ بیگم کا سر گود میں رکھے مسلسل انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر بھڑبھڑ سیدہ بیگم کے گرد جمع تھے۔

”رحمن کو اب سمجھ دار ہو کر ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ انتہائی نا عاقبت اندیشی کا ثبوت دیا ہے رحمن نے۔“  
 قد سیدہ بانوں نے سیدہ بیگم کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

”ارے! مجھے تو اس معصوم شکل والی مکار لڑکی یعنی کو دکھ کر ہی یقین ہو گیا تھا کہ یہ رحمن کی اپنی بیٹی۔“

راشو جلدی سے باہر آیا۔ یعنی کے کمرے میں جھانکا، دروازہ کھلا تھا۔ وہ دستک دے کر اندر آ گیا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ واش روم کا دروازہ کھلا تھا۔ اُس نے اوپر نیچے اندر باہر گھر کا کونا کونا جھان مارا مگر عینی کہیں بھی نہیں مل سکی۔ اُسے ایک دم فکر لاحق ہو گئی۔

”کہیں اشعر تو عینی کو نہیں لے گیا لیکن ایسا بھی ممکن نہیں پھر عینی کہاں گئی۔“

یہی کچھ سوچتا رہا، اشعر کے کمرے میں آیا جہاں وہ ہاتھوں کا تکیہ بتائے نیم دراز سوچوں میں گم تھا۔

”اشعر! یعنی کہاں ہے؟“

”کیا مطلب؟ یعنی کہاں ہے؟“ عینی کے نام پر ایک دم ہی اشعر کی تمام حسنیات بیدار ہو گئیں۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

”یعنی گھر میں کہیں بھی نہیں ہے اشعر۔“

”یعنی گھر پر نہیں؟ کہاں گئی؟“

اشعر بے چین ہو گیا اور پھر دونوں نے ایک بار پھر سارے گھر میں تلاش کر ڈالا۔

”راشو! میرا خیال ہے وہ اس صورت حال سے گھبرا کر اپنے پرانے گھر چلی گئی ہے۔ وہ کئی روز سے مجھے وہاں لے جانے کا کہہ رہی تھی۔“

اشعر کا پہلا خیال اُسی طرف گیا۔

”پھر سوچ کیا رہے ہو گاڑی نکالو، مل، امی کو بتا کر ابھی آیا۔“

”نہیں راشو! ابھی چچی جان کی حالت ٹھیک نہیں کسی کو کچھ مت بتاؤ اور چلو۔“

اشعر کا خدشہ درست تھا۔ فلیٹ کے سارے دروازے کھلے تھے۔ اشعر نے عینی کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر کا منظر دونوں کو ہلکا گیا۔ وہ بیڈ پر بے سندھ پڑی تھی۔ ساتھ ہی پانی کا گلاس اور خواب اور گولیوں کی بوتل تھی۔

”یعنی!“ دونوں تیزی سے اُس کی طرف بڑھے۔

عینی ایسے تم نے کیا کیا؟“ اشعر بے دم سامنے کا سر ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا۔

”اشعر جلدی سے گاڑی اشارت کرو! اسے ابھی اسپتال لے جاتے ہیں چلو جلدی کرو۔“

راشو بے ہوش عینی کو سنبھالے ہوئے تھا اور اشعر گاڑی اُڑا رہا تھا۔ راشو بار بار عینی کی نبض دیکھ رہا تھا جس کی رفتار دم ہوتی جا رہی تھی، اشعر مزمر کر عینی کو دیکھ رہا تھا۔ اسپتال کے مین گیٹ پر شرین مل گئی جو اپنی ڈیوٹی آف کر کے جا رہی تھی۔ اشعر کو دیکھ کر وہ اُس کے قریب آ گئی۔

”خیرت! ارے یہ کون؟ عینی ہے؟ کیا ہوا اسے؟“ شرین جلدی سے عینی کی طرف لپکی۔

”شرین! سب کچھ بتا دوں گا تمہیں پہلے اس کا کچھ کرو۔“

شرین تیزی سے اندر گئی اور وارڈ بوائے کے ساتھ اسٹرینچر لے کر آ گئی۔

عینی کو فوراً انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں بھیج دیا گیا۔

”کیا کھالیا ہے اس لڑکی نے؟“ شرین پریشان سی باہر آ گئی۔

”یہ.....“ راشو نے سلسلہ بنگ بنگ کی بوتل ساتھ لے لی تھی۔

”مائی گاڈ ایک تو سیلینک پلو اوپر سے ایکسپازٹ کی، کیوں کیا اس معصوم لڑکی نے ایسا، اشعر کچھ تو بتاؤ۔“

”شرین! نے اشعر کی طرف دیکھا مگر وہ سامنے لان میں چھل قدمی کرتے مریضوں کو دیکھتا رہا، بولا کچھ راشو نے بے چینی سے کہا۔

”میں نے اُسے سینئر ڈاکٹرز کے حوالے کر دیا ہے لیکن حالت اُس کی ٹھیک نہیں، لیکن پھر بھی ڈونٹ وری ہالو۔“

شرین نے آہستگی سے اشعر کا شانہ دبایا اور نرس کے اشارے پر تیزی سے اس کی طرف بڑھ گئی۔

”راشو! میرا خیال ہے، ہوئی کو اطلاع دے دینی چاہیے؟“

”ہاں اشعر میں ابھی فون کر کے آتا ہوں تم یہیں رہو۔“

گھر میں ڈیئر سارے افراد کی موجودگی کے باوجود مکمل سکوت اور عجیب سی افسردگی ویرانی کا راج تھا۔ ہاتھم کی حالت زیادہ بگڑنے لگی تو ہوئی نے اُن کو ٹینشن ریلیف انجکشن لگا دیا جس سے وہ اب سو رہی تھیں۔

نواقات بے ہوشی بھی کتنی اچھی ہوتی ہے بے ہوشی کی تاریکی ہوش کی ہر تخی کو مٹا دیتی ہے سیدہ بیگم جو آغا جی ہاتھ لگ کر بے تحاشا روٹی تھیں اب پر سکون پڑی تھیں عینی راشو اور اشعر کی غیر موجودگی نے سب کو فکر مند کر ڈالا۔

ہوئی عینی کے پرانے گھر جانے کا سوچ رہی رہا تھا کہ اسی وقت راشو کا فون آ گیا۔

”ہوئی! تم فوراً اسپتال پہنچ جاؤ عینی کی طبیعت بہت خراب ہے۔“

”کیوں کیا ہوا عینی، راشو صاف بتاؤ بات کیا ہے؟“

ہوئی بری طرح کھمرا گیا عینی کے بارے میں سن کر۔

”بس تم آ جاؤ کسی کو بتائے بغیر فوراً۔“

”اچھا، میں آ رہا ہوں۔“

ہوئی تیزی سے عابی کے پاس آیا جو سیدہ بیگم کے پاس بیٹھی تھیں ان کے کان میں بتایا۔

”اؤ فلو اس جذبہ بانی لڑکی نے ضرور کوئی بے وقوفانہ حرکت کی ہوگی میں بھی چلتی ہوں۔“

”لیکن امی۔!“

”آپا کے پاس ابھی عذرا بھابھی یا بڑی بھابھی آ جائیں، چلو تم، رحمن بیٹا کو تو نہیں بتایا؟“ عابی نے ہلست کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”نہیں، وہ تو کمرے سے نکلے ہی نہیں۔“

”ٹھیک ہے، فی الحال ان کا بے خبر رہنا ہی بہتر ہے آؤ تم۔“

دونوں بھاکم بھاکم اسپتال پہنچے تو شرین عینی کے بارے میں راشو اور اشعر کو بتا رہی تھی۔

”خدا کا شکر ہے کہ بروقت ٹریٹ منٹ مل گئی۔ معذہ واش کر دیا گیا ہے اب وہ خطرے سے باہر ہے۔“

اشعر نے خدا کے شکرانے کے طور پر نظریں جھکا لیں۔

”کیا مطلب شرین عینی نے؟“ ہوئی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

”اُف میرے خدا! کیا کیا اُس لڑکی نے؟“

عابی بیچ پر سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

اسے اچھی طرح یاد تھا ایک بار بولی عیسیٰ کے برابر بیٹھ گیا تھا تو سیدہ بیگم نے کچھ ایسی نظروں سے بولی کو گھورا تھا کہ وہ اپنی نظروں میں گرنے لگی تھی۔

”بولی میرے بھیا! میری تو جان بھی قربان ہے ایسے جوان بھائیوں پر۔“

”یعنی صاحبہ! تھوڑی سی جان بچا کر رکھے گا کوئی اور بھی طلب گار ہے۔“ ہوی جیسے ہی وہاں سے اٹھا

اشعر نے فخر اچھا لیا۔

”ارے یہ آپ سب نے کیوں گھبرا ڈال رکھا۔ ہے میری مریض کے گرد ہٹ جاؤ۔ عیسیٰ یہ تم کیوں اپنی تمام دنیا کی ان فضول چیزوں پر ضائع کر رہی ہو؟ بولی یہاں سے۔ اور عیسیٰ نہ تم نے سوپ بچا ہے اور نہ جوس اب تمہاری سزا سبکی ہے کہ تمہیں انجکشن لگادیا جائے۔“

شرمین تیزی سے بولتی سرخ لے عیسیٰ کی طرف بڑھی تو اشعر اس کے قریب آ گیا۔

”یہ رقیبہ کے اوپر اتنی نوازشیں ڈاکٹر شرمین! کہیں زہر کارادہ تو نہیں؟“ اشعر نے انداز تو خاصا راز دارانہ اپنایا تھا مگر سب نے سن لیا۔

”کاش کہ اس میں واقعی زہر ہوتا تو رقیبہ کو لگانے کے بجائے میں تمہیں یا انجکشن لگا کر یا دھوختی محسوس کرتی جھلی مچھکتی۔“ شرمین نے اشعر کی شوخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور تھوڑا سا انجکشن اُس پر اچھا لیا۔ وہ انجکشن لگا کر بیٹی عیسیٰ کی رحمٰن اور عالی آگئے۔ عیسیٰ تھامت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”عیسیٰ..... عیسیٰ میری بیٹی میری جان میں نے بتا دیا ہے سارے زمانے کو تم..... تم میری بیٹی ہو۔ تم میری بیٹی ہو۔“ رحمٰن صاحب بالکل بچوں کی طرح رو پڑے تھے۔ شرمین مع ہی کر رہی تھی مگر۔ دونوں کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ ہر وقت سامنے رہتے تھے مگر آج یوں ملے تھے کہ یا صدموں بعد باپ بیٹی کا ملاپ ہوا ہو۔

”انکل پلیر! اب بس کر عیسیٰ کی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اتنا ہلکا کرے خود کو۔“ شرمین نے رحمٰن احمد کو سمجھایا تو وہ ہیلنے لگے، مگر عیسیٰ انجکشن کے زیر اثر آنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد عیسیٰ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی۔ رحمٰن ننھی بچی کی طرح اس کا سر گود میں رکھے اس کا ترچہ اور چہرے پر جیسے بال ہٹاتے رہے۔



اس شدید طوفان کے جھلکے گھر کے ہر فرد نے محسوس کیے تھے مگر اب سب سکون محسوس کر رہے تھے۔ عیسیٰ کی حالت اب بہت بہتر تھی۔ اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ یوں سب مل جائیں گے۔ سب کی محبتیں پا کر وہ بے حد خوش اور مطمئن تھی مگر سیدہ بیگم کا خیال خوف بن کر اس کو بے چین کر جاتا۔

سیدہ بیگم عورت تھیں اور وہ عورت جنہوں نے رحمٰن کو بڑی خاموشی سے چاہا اور انہیں پا کر اپنے آپ کو فاتح سمجھتی تھیں۔ رحمٰن نے بھی تو اپنے غلوں اور محبت میں کبھی کی نہیں آنے دی تھی کہ وہ کسی قسم کے شک و شبہ میں گرفتار ہو کر ایسا سوچتیں یا پھر یہ بات تھی کہ وہ محبت میں اندھے اعتماد کی قائل تھیں اور ان کو بھی رحمٰن سے شاید محبت اتنی نہیں تھی جتنا اعتماد تھا اور اب ان کے اعتماد کی دیوار انہیں پر آ گری تھی تو وہ کیونکر سنبھلتیں، کس طرح بھلتیں۔ وہ اس روز سے مسلسل خاموش تھیں یا پھر اچانک رونے لگتیں۔ چاہنے کے باوجود رحمٰن ایک بار بھی اس کے سامنے نہ جانے کی ہمت نہیں کر پائے تھے۔ وہ مقروض جوتے سیدہ کی محبتوں کے۔ عالی اور ہوی مستقل

”لیکن آئی! اب فکری ضرورت نہیں خدا کا احسان ہے کہ یہ لوگ اسے بہت جلدی لے آئے۔“ خیر ہوی

”میں بھی دیکھوں گی۔“ عالی فوراً کھڑی ہو گئیں۔

”تمہیں آئی! فی الحال ڈاکٹر صفر کسی کو اجازت نہیں دے رہے عیسیٰ کے پاس آنے کی ہوی کی بات دوسری ہے۔“ رات تک عیسیٰ کی حالت بہتر ہو چکی تھی اور احتیاط کے باوجود گھر میں اس کے بارے میں سب کو خبر ہو گئی تھی چونکہ اب عیسیٰ کی حیثیت ہی بدل گئی تھی اس لیے سب پریشان تھے اس کے لیے۔ آخانی بار بار عیسیٰ کی خیرت معلوم کر رہے تھے۔ رحمٰن کو جب پتا چلا تو وہ کسی کا بھی خیال کیے بغیر اسپتال پہنچ گئے۔

”ہوی بیٹے! کہاں ہے عیسیٰ؟ کیسی ہے میری بیٹی؟“ وہ بے چینی سے پوچھ رہے تھے۔

”عیسیٰ بالکل ٹھیک ہے اور آپ پریشان نہ ہوں۔“

ہوی اُن کی گھبراہٹ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ وہ پہلے ہی دل کے مریض تھے۔

”مجھے اُس کے پاس لے چلو ہوی! میں ایک نظر اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ابو! عیسیٰ بالکل ٹھیک ہے ابھی وہ سو رہی ہے میں شام کو خود آپ کو لے کر جاؤں گا اور.....“

”اچھا بیٹے! مجھے دور سے اُس کی صورت ہی دکھا دو۔“

ہوی نے لاکھ سمجھایا مگر رحمٰن نہ مانے تو ہوی انہیں عیسیٰ کے کمرے میں لے آیا۔ سرخ کبیل میں بے پردہ پڑی عیسیٰ بہت کمزور لگ رہی تھی۔

”میری مظلوم بیٹی!“ رحمٰن صاحب جذباتی ہونے لگے مگر ہوی نے بڑھ کر انہیں روک دیا۔

”ابو پلیر! ایسا مت کریں فی الحال عیسیٰ کو مکمل سکون و آرام کی ضرورت ہے۔ اب تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ آپ خود اسے گھر لے کر جائیے گا۔“

ہوی انہیں دلا سے دیتا ہوا واپس لے آیا۔ دو تین روز بعد عیسیٰ کو اچھی طرح ہوش آیا تو وہ اجنبی نظروں سے اسپتال کا ماحول اور اس پاس کھڑے ہوئے ہوی اشعر راٹھوار اور یاسر کو دیکھنے لگی۔

”میں..... میں کہاں ہوں؟“

”جنت میں“ اشعر نے تھوڑا سا جھک کر کہا۔ تو وہ حیران نظروں سے یاسر کو دیکھنے لگی۔

”دیکھیے اشعر بھیا! یہ کبہ رہی ہیں کہ گریہ جنت میں ہیں تو آپ کا یہاں کیا کام ہے؟“

یاسر نے عیسیٰ کی خاموش نظروں کو خوشی سے معنی دیے تو سب مسکرا پڑے۔

”بھیا جان! یہ سب کیا ہے میں یہاں کیوں ہوں..... اوہ نو۔“

عیسیٰ کو اُس روز والے واقعات یاد آنا شروع ہوئے تو وہ کھرنے لگی۔ ہوی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ دوسری طرف بولی بیٹھ گیا۔

”عیسیٰ..... عیسیٰ دیکھو! ابھی تمہاری حالت درست نہیں، مت رو دو پلیر! میری بہن اب تو سب ٹھیک ہو گیا۔ اب تو اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہو گئی ہے، بس چپ کرو۔“

”یعنی باجی! جن بہنوں کے جوان بھائی ہوتے ہیں وہ یوں نہیں رویا کرتیں۔“

بولی نے پیار سے عیسیٰ کا ہاتھ تھا تا تو وہ بے چینی سے بولی کو دیکھنے لگی۔



سیدہ کی ہمدردی میں گھبرے۔

”ای جان! اٹھیں آپ سوپ پی لیں۔“ ہوی نے انہیں سہارا دے کر بٹھانا چاہا تو انہوں نے ہوی کے ہاتھ تھام لیے۔

”ہوی بیٹے! جنہیں پہلے سے خبر تھی ناں کہ بھئی کون ہے؟“

سیدہ بیگم عجیب سے لہجے میں بولیں تو ہوی نظریں چرا کر رہ گیا۔

”بولو ناں بیٹے۔“ انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

”جی امی!“ ہوی نے سر جھکا لیا۔

”پھر..... پھر مجھے کیوں بے وقوف بنایا۔ تم باپ بیٹے نے کیوں آزمایا میرے ظرف کو۔“ وہ بکھرے لگیں۔ اسی وقت عالی آگئیں۔ ہوی نے سوپ کا پیالہ ان کے ہاتھ میں دیا اور باہر نکل گیا۔ ماں کے آنسو اس کی برداشت سے باہر تھے۔

”عالی! جنہیں بھی سب پتا تھا ناں رجن کی شادی کا؟ اس کی بیٹی کا؟“

”ہاں آپا! مجھے بھی سب پتا تھا۔“ عالی نے گہرا سانس لیتے ہوئے دھکی نظروں سے سیدہ کو دیکھا ناں چار دنوں میں وہ قبر سے نکلا ہوا مردہ بن گئی تھیں۔

”کیسے نصیب ہیں میرے کہ میرے اپنے میرے بنے میں رجن سے کیا شکوہ کروں میرا بیٹا میرا نہ ہوا۔ میری سگی بہن میری نہ ہوئی، پھر کسی شے سے کیا شکوہ کروں۔“ سیدہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر شدت سے رونے لگیں۔

”آپا! بس کریں ناں اب بہت ہو گیا۔ انسان غلطی کا پتلا ہے آپا۔ دراصل ہم عورتوں کا الیہ یہ ہے کہ ہم جس مرد کو چاہتی ہیں ناں اسے انسان نہیں فرض شدہ سمجھ لیتی ہیں اور جب اس فرشتے سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو نوٹ کر بکھرنے لگتی ہیں۔ رجن بھیا آپ کی پہلی چاہت ضرور تھی آپا مگر آپ ان کی پہلی چوٹیں نہیں تھیں۔ وہ شروع ہی سے سسلی کو پسند کرتے تھے مگر وقت اور حالات کا تقاضا تھا کہ وہ والدین کا حکم مان لیں اور انہوں نے والدین کی خاطر سسلی کو چھوڑ دیا اور آپ سے شادی کر لی اور پورے خلوص سے انہوں نے یہ شادی بھائی اور پھر جب قدرت کی طرف سے رجن بھیا اور سسلی کا نکاح لکھا چکا تھا تو اس کا سبب بھی کوئی نہ کوئی بننا تھا۔ دراصل آپا ہم انسان تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ اب دیکھو ناں! رجن بھیا نے تو آپ سے شادی کر لی تھی سسلی سے پھر کسی نہیں ملے تھے مگر جب قدرت کو منظور ہوا تو ایک موڑ پر دونوں کو ملا دیا۔ اس میں نہ ان کا قصور تھا نہ سسلی کا! اسی طرح میرے اور فرمان کے معاملے میں کسی کا قصور نہ تھا۔ نہ میرا نہ فرمان کا اور نہ مریم کا لیکن سزا تو ہم سب نے بھگتی ہے ناں۔“

جب ہمارے اختیار میں کچھ نہیں تو ہم کیوں دوسروں کو الزام دیں یا سزا دیں یہ سب قدرت کی طرف سے ہوتا ہے تو پھر گناہ گار بندے سزا اور جزا دینے والے کون ہیں اس لیے آپا بجائے نفرت کرنے اور انتقام لینے کے ہم غمناور و درگزر سے کام لیں۔ ہمارے رونے دھونے یا نفرت کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ معاف کر دو آپ رجن بھیا، یعنی کو، سب کو اس لیے آپا کہ معاف کر دینا انتقام لینے سے کہیں بہتر ہے۔ خدا تو انسان کی ہر خطا معاف کر دیتا ہے آپا! ہم اسی کے پیدا کردہ انسان ہیں۔ ایک آدھ خطا معاف کرنے کا ظرف تو ہم انسانوں میں

بھی ہونا چاہئے۔ ساری عمر آپا تم نے فرمان کو معاف نہیں کیا، اُس کی مخالفت کی تو کیا حاصل ہوا ہے سوائے بکوں کے رجن بھائی کے بعد نہ نام ہیں آپا اور وہ معصوم لڑکی اس نے تو جان سے گزرنے میں بھی کی نہیں چھوڑی۔ وہ تمہاری مستی کا طلب گار ہے آپا پلیز! سوچو ذرا اگر تم سسلی ہوتیں اور بھئی کی جگہ تمہاری اپنی بیٹی گڑیا ہوتی اور کوئی اور عورت اُسے ٹھکراتی تو.....“

عالی بڑی محبت سے بڑی بہن کے ہاتھ پکڑے سمجھاری تھیں عالی کے سر دلچے کی دھیمی دھوپ نفروں کی ہف کو پھلانے لگی تو سیدہ بیگم اپ سیٹ ہونے لگیں، پھر ایک دم جھج پڑیں۔

”چپ رہو عالی! چلی جاؤ یہاں سے تنہا چھوڑ دو مجھے۔ جنہیں کبھی میرا خیال نہیں آیا ہے، سب میرے دشمن ہیں، شوہر بھی، اولاد بھی، بہن بھی، جاؤ چلی جاؤ۔“

وہ مذہبی انداز میں چلائیں تو عالی راستہ وہاں سے اٹھ کر آگئیں اور انہوں نے ہوی کو بھی اندر جانے سے روک دیا اور پھر رات ڈھلنے لگی۔ سیدہ روتے روتے بھی ٹھک گئیں اب وہ خود کو ایک اندر مگر کی میں تنہا بھٹکتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ نفرت اور انتقام کی ایک آگ تھی۔ جوان کے اندر بھڑک اٹھی تھی۔ ان کا جی چاہتا تھا ساری دنیا کو بس نہس کر ڈالیں۔ رجن کو شوٹ کر دیں یعنی کا گلا دبا دیں۔ وہ عجیب جونی انداز میں جھج رہی تھیں۔ چلا رہی تھیں۔ اندھیر مگر کی میں اندھا دھند بھاگی جا رہی تھیں۔

”آپا! سیدہ کو تھوکر لگی تو وہ مگر پڑیں۔“

”آپا! خدا تو انسان کی بے شمار خطا میں معاف کرتا ہے، ہم اُس کی مخلوق ہیں۔ ایک آدھ خطا معاف کرنے کا ظرف تو ہم میں بھی ہونا چاہئے۔“ عالی کے لہجے کی سرد پھواری آگ کے شعلوں کو مٹانے لگی۔ روشنی پھیلنے لگی۔

”ذرا سوچو آپا! اگر سسلی کی جگہ تم ہوتیں اور بھئی کی جگہ تمہاری اپنی بیٹی گڑیا ہوتی اور کوئی ان کے ساتھ یہ ملوک کرتا تو کیا تم برداشت کر لیتیں۔ یعنی تمہاری بیٹی ہے، آپا معاف کر دو رجن بھائی کو، یعنی کو۔“

عالی کے الفاظ کے جھگڑا انتقام کے اس جنگل میں راستہ بناتے چلے گئے آگ سرد پڑنے لگی۔ نفرت اور انتقام کے بادل چھٹے تو حقیقت کے آئینے میں اُن کو بھئی، شعاع، فرمان، رجن اور مریم اور سسلی بے خطا نظر آئے۔ وہاں رات حقیقتوں کا سفر کرتی رہیں۔ صبح جب آنکھ کھلی تو انہوں نے زندگی میں پہلی بار خود کو مطمئن پر سکون اور ہلکا محسوس کیا آج کی صبح تپتی خوبصورت اور سنہری تھی۔ ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔ انہوں نے اٹھ کر وضو کیا ملازدا کی اور آکر لیٹ گئیں۔ انہیں سب سے پہلا خیال رجن کا آیا تھا۔ آج وہ ان کو ظالم کے بجائے مظلوم لگ رہے تھے۔ اُن..... کا شدت سے جی چاہا، شعاع اور بھئی کو بلا کر سینے سے لگانے کو۔ انہوں نے کتنی زیادتیاں کی تھیں اُس معصوم لڑکیوں کے ساتھ..... ہوی نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اندر آگیا۔ سیدہ کے چہرے پر ممتا لڑی مسکراہٹ آگئی اسے دیکھ کر کتنا بددل گیا تھا۔ ان کا نٹ کھٹ ہوی کتنا سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”ہوی بیٹے! یہ تمہاری شیو کیوں بڑھی ہوئی ہے اتنے کمزور کیوں ہو گئے؟“

سیدہ بیگم کے لہجے میں ممتا تھی۔ انہیں خود احساس جرم سا ہونے لگا کہ وہ انتقام میں اپنی ہی اولاد سے بے رحم ہو گئی تھیں۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں امی! آپ ٹھیک ہو جائیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ہوی کو بڑی خوشی ہوئی ماں کو ملازہ دم دیکھ کر۔

”اصل دیوار تو شرمین ہے میرے اور عینی کے درمیان یہ ہٹ جانے تو بات ہے۔“

جب کہا عینی شرمین کو سنانے کے لیے تھوڑے بھر نہ سنی بھلا۔  
”باز آ جاؤ اشعر کے بچے پیٹ ڈالوں گی سارے اسپتال کے سامنے“ کیوں کانوں کے بغیر گھر جانا چاہتے

ہو۔“

شرمین نے یہ جملہ کیوں کہا تھا یہ تو کسی اور کی سمجھ میں نہیں آیا البتہ اس کا یہ جملہ سب کو مغلطہ ضرور کر گیا۔  
”اچھا تو شرمین بیٹی! میری بیٹی کو اب اجازت ہے ناں؟“ سیدہ بیگم نے ابھی تک عینی کو ساتھ لگا ہوا تھا۔  
”آئی! آپ کی بیٹی نے انتہائی غلط حرکت کی ہے۔“

”شرمین! تم فکر نہ کرو یہاں سے میں سیدہ صاحبہ پولیس اسٹیشن جاؤں گا اور اقدام خود کشی کی رپورٹ لکھ کر  
آؤں گا عینی کے خلاف“ اشعر نے شونی سے عینی کی بھیگی آنکھوں میں جھانکا جہاں اب مایوسی اور خوف کے  
ماے نہیں خوشی کے تارے چمک رہے تھے۔

”اور سزا کے طور پر عینی کی شادی تم سے کر دی جائے گی۔“

راشونے آہستگی سے اُس کے کان میں کہا تو وہ اُسے گھوا کر رہ گیا۔ شرمین کا اصرار تھا کہ عینی کو ایک دوروز  
اور اسپتال میں رہنا چاہئے مگر سیدہ بیگم کا کہنا تھا کہ کوئی علاج ماں کی ممتا سے زیادہ طاقت نہیں رکھتا اور جب سیدہ  
بہم خود عینی کو لے کر گھر آئیں تو گویا بہاروں کے قافلے آغا ہاؤس میں آئے عینی ایک نئی حیثیت سے اس گھر  
میں دوبارہ آئی تھی۔ کتنی باعزت اور معجز محسوس کر رہی تھی وہ خود کو۔ آج وہ اس گھر کی بیٹی تھی۔ آغا جی اور بی بی  
جان نے اُسے ساتھ لگا لیا تو ڈیڑھ گھنٹوں سکون اس کے اندر اتر گیا۔

”میری بچی ایک عرصے تک اپنے ہی گھر میں مہمان بن کر اجنبی بن کر رہی اور ہمیں احساس تک نہ ہوا۔  
فلانی! ہمیں معاف فرماتا۔“

چاروں طرف سے عینی پر چاہتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ رُحمن سامنے تو نہیں آئے تھے مگر وہ خدا کی رحمتوں  
کا شکرانہ ضرور بجالا رہے تھے۔ یہ اُس کی رحمتیں ہی تو تھیں ورنہ یہ سب کتنا ناممکن تھا اس کے لیے جسے اللہ تعالیٰ  
نے ممکن کر دیا تھا وہ خدا کے حضور سجدہ ریز تھے اسی وقت دروازہ ہلکی سی آواز سے کھلا سیدہ بیگم، چہرے پر صلح و امن  
کا سنہرا پیغام لیے اندر آ گئیں تو رُحمن کی نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

”رُحمن! آپ اس طرح چھپ کر مجھے کیوں گناہ گار کر رہے ہیں؟“ آج کتنے ہی دنوں بعد وہ شوہر سے  
تغلب ہوئی تھیں۔

”سیدہ! سیدہ! میں بہت نادام ہوں تم سے، میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔“ رُحمن اُس سے نگاہیں نہیں  
ٹاپا رہے تھے۔

”رُحمن! پلیز پرانی کوئی بات نہ دہرائیں میں نے آپ کو معاف کیا اور خدا۔ میرے گناہ معاف کرے۔  
واقعی اگر ہم خود درگزر سے کام لیتے تو آج حالات بہت مختلف ہوتے۔ عینی اندر آؤ بیٹی اپنے ابو سے ملو۔“

سیدہ بیگم نے ذرا بلند آواز میں عینی کو پکارا تو عینی جو پہلے سے موجود تھی اندر آ گئی۔ رُحمن نے بازو پھیلا دیے۔  
”عینی میری بیٹی۔“ آج پہلی بار رُحمن نے عینی کو بے خوف ہو کر بیٹی کہا۔

آغا ہاؤس میں آج کل بہاریں اُتر رہی تھیں ہر کوئی خوش اور مطمئن تھا۔ عینی سے تو یہ خوشیاں سنبھالے

”میں تو بالکل ٹھیک ہوں دیکھی تم نے اپنے ابو کی لاپرواہی میں اتنی بیمار رہی وہ مجھے دیکھنے تک نہیں آئے۔“  
سیدہ بیگم کے لہجے میں شکوہ تھا۔ ہوئی لا جواب سا ہو گیا۔

”امی! ابو کسی سے بھی لاپرواہ نہیں، بس وہ آپ سے شرمندہ ہیں ناں! اسی لیے نہیں آئے۔ یہ سوپ تو بی  
لجے ناں!“ ہوئی سوپ کا پیالہ لے لے ان کے پاس آ بیٹھا۔

”اور عینی۔ وہ مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئی؟“  
”جی امی! عینی۔؟“ ہوئی چونک گیا اُسے ماں کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا کہ وہ اور عینی کا نام لیں وہ  
بس ماں کو دیکھے گیا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو بیٹے! بالکل نہیں ہوں میں۔“  
”نہیں امی! کیا آپ نے عینی کو معاف کر دیا؟“ ہوئی کے۔ لہجے میں بے یقینی تھی۔

”معاف تو بیٹے اُسے کیا جاتا ہے جس کا کوئی قصور ہو، عینی تو بے قصور ہے میں نے تو اُسے بھی معاف کر دیا  
ہے جس کی خطا تھی۔“

”مگر خدا کی کرم نوازی ہوئی گئی ہے امی! تو میں آج ہی عینی کو لے آؤں گا آپ کے پاس آپ کو ہا نہیں  
اُس نے ہماری خوشیوں کی خاطر اپنی جان بھی دینے سے گریز نہیں کیا تھا۔“  
ہوئی کو یقین نہیں آیا تھا کہ یہ رات ہی رات میں جنت کی کھڑکی کب کھلی اور کون راہبر سیدہ کو سیدھے  
راستے پر ڈال گیا۔

”نہیں، مجھے اُس کے پاس لے کر چلو، میں، میں خود اپنی بیٹی کو اسپتال سے گھر لے کر آؤں گی۔ عالی! اؤ  
میری بہن! میرے سینے سے لگ جاؤ ایسے حیران نظروں سے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے خود ہی تو راستے پر ڈال گئی

تھیں۔ اب جبکہ میں منزل پر پہنچی گئی ہوں تو پریشان کیوں ہو میرے قریب آؤ۔“  
بات کرتے کرتے سیدہ کی نظریں دروازے میں کھڑی عالی پر ٹھہر گئیں جو حیران نظروں سے انہیں دیکھ رہی

تھیں۔ پھر دونوں انہیں یوں ملیں گویا عرصے بعد ملی ہوں اور شام کو سیدہ کے اصرار پر ہوئی انہیں اسپتال لے گیا۔  
عینی کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ وہ خوفزدہ سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ راشونے اشعر بھی ڈر گئے اب نہ

جانے کیا قیامت آئے مگر پھر سب نے جاگتی نظروں سے وہ منظر دیکھا جس کی کوئی خواب میں بھی توقع نہیں کر  
سکتا تھا۔

”عینی! میری بیٹی! میری گزیا! مجھے معاف کر دو میری بچی۔“ سیدہ عینی کو ساتھ لگائے پیار کیے جا رہی تھیں  
اور عینی تو اس اچانک مل جانے والی خوشی پر بے حال ہو گئی تھی اسے کب یقین تھا کہ اسے باپ اور بھائیوں کے

ساتھ ماں کا پیار بھی مل جائے گا۔  
”امی جان! معافی تو مجھے آپ سے مانگنا ہے۔ میری وجہ سے آپ سب لوگ پریشان ہوئے۔“

پھر کتنی ہی دیر یہ جذباتی منظر جاری رہا۔  
”اے کہتے ہیں خدا کی شان۔“ اشعر نے عینی کے پیچھے چہرے کو دیکھتے ہوئے راشونے کان میں سرگوشی کی۔  
”ہوں مبارک ہو، راستے کی اتنی مضبوط دیوار خود بہ خود ڈھ گئی۔“

راشونے آہستگی سے کہا۔ اُسی وقت شرمین قریب آ گئی۔ اشعر نے اُسے چمپیزنے کی غرض سے کہا۔

نہیں سنبھال رہی تھیں۔

”ای! اب تو میں، یعنی باجی کے پاس بیٹھ سکتا ہوں ناں؟“

بولی نے عینی کے پاس بیٹھتے ہوئے شوفی سے ماں کو دیکھا تو وہ مسکرائیں۔

”ہاں بیٹھ سکتے ہو مگر اچھا سا پر فہم لگا کر۔ دیکھو عینی باجی ناک بند کر رہی ہیں۔“

شرابی نے اپنا رومال ایک دم عینی کے ناک کے آگے کرتے ہوئے کہا تو عینی بے ساختہ ہنس پڑی تو پھر فاصلے کھڑا شعر اس کے لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ دیکھ کر نہ سکون ہو گیا۔

”شعاع بیٹی! تم دور دور کیوں رہتی ہو یہاں آؤ میرے پاس۔“

سیدہ بیگم نے دور خاموش کھڑی شعاع کو بلا کر ساتھ لگا لیا تو نہ جانے کس خیال کے تحت بے وجہی علیحدہ کی بلیکس بیگم گئی۔ ایسے موقع پر اُسے اصلی شعاع کی کم نصیبی پر رونا آجاتا۔ کاش اُس نے غم کے بادلوں کے چھٹ جانے کا انتظار کر لیا ہوتا۔ ہوئی نے یوں شعاع کو ماں کے ساتھ دیکھا تو ایک ٹیس سی اُس کے دل میں اُٹھی۔ اُس نے ایک زخمی سی نظر شعاع پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

”ای! اب ان محبتوں بے کیا حاصل، آپ نے تو اپنے انتقام میں بیٹے کی خوشی کا بھی خیال نہیں کیا۔ شعاع سے نفرت کرتی رہیں۔ یہ جانے بغیر کہ آپ کا بیٹا شعاع کو کس حد تک چاہتا ہے۔ شعاع اب میری زندگی میں لوٹ کر نہیں آسکتی ای! آپ نے..... آپ نے“

ہوئی دُکھتے دل کے ساتھ سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔ ایک ایک یاد تازہ پارہی تھی۔ مگر میں آغا جی سمیت سب کی خواہش تھی کہ شعاع اور ہوئی جیون ساتھی بنیں مگر سیدہ بیگم نے اس کی چاہت کے کنول کو اپنی نفرت میں پھینک دیا۔ ”وہ تجھا“ اُداس سی زرد چاندنی میں ٹھہلتا رہا فضا کتنی افسردہ اور خاموش تھی۔ اُس کے دل کی طرح جبکہ اندر خوشیوں کا سیلاب اُٹا آ رہا تھا۔ ہر کوئی خوش اور شادان تھا۔ ایک عرصے بعد سب یوں خوش تھے، ایسی مذاق ہو رہا تھا مگر عینی نے محسوس کیا کہ اشعر کچھ چپ چاپ سا ہے۔

”آپ مجھ سے خفا ہیں اشعر؟“ عینی نے آہستگی سے پوچھا تو وہ اسے شاکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”جی نہیں، آپ نے جو اتنی عمدہ حرکت فرمائی تھی، اس سے کون خفا ہوگا۔“

اشعر واقعی اس کی اس حرکت پر بہت ناراض تھا، اس نے وہ تو خاموش اس لیے تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ ”اوہ اوہ! وہ بات تو اب پرانی ہوگئی اور پھر یہ بھی تو سوچئے کہ اگر میں یہ حرکت نہ فرماتی تو نفرت کے بادل کیونکر چھٹتے؟“ وہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”اور اگر آپ کی یہ حرکت کامیاب ہو جاتی تو آپ یہاں خوشیاں سمیٹنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کو حساب کتاب دے رہی ہوتیں۔ ہمارا کیا ہے، درود کو مبرا کر رہی لیتے۔“

”اور کسی اور کو چاہ بھی لیتے۔“ عینی نے شوفی سے کہا تو اشعر اُسے گھورنے لگا۔

”جی نہیں اتنا بے وفائیں ہوں تاں عمر آپ کی قبر پر اشکوں کے دیے جلاتے مگر ازادیتا، آزمائش شرط ہے۔“

”اچھا تو آپ کو آ زمانے کے لیے مجھے پھر یہ حرکت فرمانا پڑے گی۔“

”خیر دارا!، عینی مسکرائی تو اشعر ڈپٹ کر بولا۔

ایاز والے واقعہ کو بہت دن گزر چکے تھے مگر شہباز علی کو عالم شاہ سے بھڑنے کا ایک اور موقع ہاتھ لگ گیا اور ان کی رگوں میں خون اُٹل رہا تھا کہ کس طرح اس کا بدلہ لیا جائے۔

”شیراز کیا سوچا ہے تم نے حارث کے بارے میں؟ تم نے کچھ کیا ہے یا میں کہیں اور بندوبست کروں؟“

”ہی! اور کو کہوں؟“

شہباز کی رگوں میں خون کے بجائے انتقام گردش کر رہا تھا اور ایاز کے زخم تو بھر بھی چکے تھے مگر ان کے دل پر آئے ہوئے زخم اُسی طرح تازہ تھے اور وہ اسی کی آڑ میں عالم شاہ کو مزہ توڑ جواب دینا چاہتے تھے۔

”اباجی! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں حارث شاہ کے ساتھ جانے دیں جو ہوا سو ہوا۔“

ایاز جانتا تھا کہ اس کے اباجی حارث شاہ کی جان کے درپے ہیں اور اس نے جو تعلیم حاصل کی تھی، وہ درگزر کا درس دیتی تھی۔

”تم چپ رہو اس معاملے میں جب تک حارث شاہ کے جسم پر بھی اتنے ہی زخم نہ ڈال لوں گا، مجھے چین نہیں آئے گا۔ اب تک عالم شاہ کی ٹانگ میرے اوپر ہی رہی ہے، لیکن اب میرا اور خالی نہیں جائے گا، مگر نہ توڑا تو شہباز علی نام نہیں۔“ شہباز علی غصے میں سرخ ہو رہے تھے۔

”اباجی! کیا ضروری ہے کہ برائی کا جواب برائی سے دیا جائے۔ عالم شاہ سے آپ کی دشمنی کو ایک عرصہ ہو گیا ختم کریں اب حارث نے مجھ سے معذرت کر لی تھی اور میں نے اُسے معاف بھی کر دیا تھا پھر نئے سرے سے لڑے مردے اُکھاڑے جائیں یہ اچھا نہیں۔“

ایاز کو یہ خونریزی بالکل پسند نہیں تھی۔

”تم اپنی کتابی باتیں کتابوں تک ہی رہنے دو ایاز! ہمارے معاملات ہمیں ہی نمٹانے دو، میں نے بھی جب تک۔“

”اباجی آپ فکر نہ کریں میں نے بھی بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔“ شیراز نے باپ کو حوصلہ دیا۔

”شیراز بھائی آپ بھی اُن کی لڑکی کو؟“

”لڑکی۔ یہ کس لڑکی کا ذکر ہے؟“ شہباز نے ایاز کو گھورا تو شیراز اندر سے کانپ کر رہ گیا۔



”ہیں تمہیں خوشی نہیں ہوئی یہ جان کر؟“ ہاشم حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

”نہیں ہاشم! ایسی ملاقات سے کیا فائدہ کہ وہ مجھے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتی ہے اور جب میں اس کی طرف بھا ہوں تو دشمنی کی دھند میں گھر جاتا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ہم لوگ دشمنوں کے جال کیوں بچھا لیتے ہیں۔ بچہ ہی ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو محبت اور بھائی چارے کے لیے پیدا کیا ہے مگر یار یہ۔“

”تم لوگوں کی یہ دشمنی تو خاصی پرانی ہے مگر آج کیا بات ہے۔ کوئی خاص بات تو نہیں ہو گئی کہ تم یوں۔“

انہوں نے شیراز کو دیکھا جو آج کافی اداس اور طول سا نظر آ رہا تھا۔

”یار اس سے بڑھ کر خاص بات کیا ہو گی کہ انسان مجھے اتنا چاہے پسند کرے اس کا حصول ناممکن ہو۔“

پیر از افسردہ سے لہجے میں بولا۔

”کیسے ناممکن ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میرے ابا جی جو دشمنی کی آگ کو کسی بل بھی سر نہیں بڑنے دیتے وہ اپنے دشمن کی ہلکا مار سے بچنے جائیں گے اور فرض کرو یہ ممکن ہو بھی جائے تو کیا عالم شاہ.....؟ ناممکن ہاشم ناممکن ویسے یہ آئندہ دوس کی بھابھی کا آنا جاتا تمہارے ہاں کچھ زیادہ نہیں ہو گیا؟“

شیراز نے مڑ کر ہاشم کی طرف دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر بڑی شوخی مسکراہٹ آگئی جو شیراز کو پسند نہیں آئی۔

”ہاں میں بھی نوٹ کر رہا ہوں، ویسے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آمنہ کی بھابھی میری بھابھی کی رشتہ دار ہیں اور دونوں میں دوستی بھی بہت ہے اور دوسری وجہ.....“

بات درمیان میں ادھوری چھوڑ کر ہاشم پھر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

”اور دوسری وجہ نہیں بتاؤ گے؟“ شیراز کچھ تلخ سا ہو گیا۔

”اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آمنہ کو گھر میں میرے لیے پسند کیا جا رہا ہے۔“

ہاشم کا انداز بڑا سادہ تھا مگر شیرازی کی رئیس تن کہیں۔ اس کا جی چاہا۔ ہاشم جیسے شخص دوست کا منت توڑ دے جس کی دوستی پر اُسے فخر رہا تھا مگر آج کتنا غیر لگ رہا تھا۔ سب جانتے ہوئے بھی ایسی بات کر رہا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے خود پر ضبط کیا۔

”اور تمہارا کیا خیال ہے؟“

کوشش کے باوجود لہجے میں کاٹ اور تلخی زچ گئی۔ ہاشم اس کی چھتی نظروں کا مطب سمجھ کر غصے میں آ گیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اتنا کمینہ ہوں مگر اہواہوں کہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کی ہامی بھرنوں گا جس پر ایسی دوست پسند کرتا ہو۔ تمہاری آمنہ سے شادی ہو یا نہ ہو، ہرگز بھی آمنہ سے شادی نہیں کروں گا۔ میں اسے اتنا کر دیا ہے مگر میں اور اب میں جا رہا ہوں جس دوستی میں اعتبار نہیں اس سے کیا فائدہ میرے پیچھے آنے کا کوشش نہ کرتا۔“

اور پھر واقعی شیراز پکارتا ہی رہ گیا مگر ہاشم نے ایک نہیں سنی اور چلا گیا۔ شیراز پچھتا تا رہا۔ وہ ہاشم کو اچھی طرح جانتا تھا پھر بھی اس نے ایسی بات کہہ دی تو ہاشم کا ناراض ہونا لازمی تھا مگر شیراز بات منہ سے نکال کر پچھتا

شیراز بیچے اور فضل آیا ہے کہہ رہا ہے کہ ہاشم آیا ہے۔“

”خدا یا تیرا شکر ہے۔“

شیراز نے منون خنوروں سے ماں کو دیکھا، جو اُس مشکل وقت میں پہنچ گئی تھیں اور وہ وضاحت پیش کرنے سے بچ گیا تھا، درمیان اُڑنے کو تیز افراق کر بی دیا تھا۔ آج - وہ آئندہ کا نام بھی اباجی کے سامنے نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ ان کی سچی سوچ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ شکر کرتا ہوا ہر آ گیا۔

”یار ہاشم! آج تو تم رحمت کافرشتہ بن کر آئے ہو، اور نہ تو اس ایاز کے بچے نے تو مردادیا تھا۔“

شیراز نے ہاشم سے بغل گیر ہوتے ہوئے پیچھے کھڑے ایاز کو دیکھا۔

”ویسے یہ بات مجھے بڑی بری لگی ہے شیراز بھائی کے جس لڑکی کو آپ اتنا پسند کرتے ہیں اُس کے باپ بھائیوں سے جانی دشمنی۔ میری تو سمجھ سے بالاتر ہے۔“ ایاز باہر آ کر بھائی سے الجھ رہا تھا۔

”یار! تم بھی مجھے ای جان کی طرح غلط سمجھ رہے ہو میری کب کسی سے دشمنی ہے میں تو دشمنی کے اس چال میں خودخواہ، الجھاد یا گیا ہوں۔ مجھے تو اس دشمنی کی جوابی جی اور عالم شاہ نے پال رکھی ہے کوئی تک نظر نہیں آتی۔

اپنی اپنی کھوکھلی انا کے بُت کی پوجا کر رہے ہیں۔ مجھے تو محبت سے زیادہ ہمدردی ہے اس معصوم لڑکی سے جو ان فضیلوں میں جنم دی گئی ہے۔“

شیراز بڑا ہمداشت و ملا امن پسند لڑکا تھا جو مجبوراً باب کے کہنے پر خوانخواہ کی اس دشمنی کو نبھا رہا تھا۔

”مار! معاملہ کماے مجھے بھی تو ہوتا ہے؟“

ہاشم: دونوں بھائیوں کو الجھتا دیکھ کر بولا تو شیراز نے ساری بات اُسے بتادی۔

”ہوں! تو یہ قصہ ہے دیے میرے پاس اسی لڑکی کے متعلق خبر ہے۔“

”کیا؟“ شیراز پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُسے تو نہ بھائی کی بات سمجھ میں آتی تھی اور نہ باپ کی۔

”یہ کہ آج آمنہ اور اس کی بھابھی آری ہیں ہمارے ہاں آجانا۔ اور دعائیں دو میری دوستی کو کہ ملاقات

”کرا دیتا ہوں۔“

ہاشم شونہی سے مسکرایا اس کا خیال تھا کہ شیراز مکمل اُٹھے گا مگر وہ سنجیدگی سے اُسے دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

رہا تھا۔ وہ ایسا نہیں کہتا چاہتا تھا مگر جانے کیوں غصے میں بلا ارادہ ہی یہ بات زبان سے پھسل گئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ منہ سے نکلی بات تو پرانی ہو جاتی ہے۔ وہ کتنی ہی دیر اٹھتا رہا، وہ اس وقت مکمل سکون چاہتا تھا۔

بچپن ہی سے اباجی نے اسے دشمنیوں کا سبق پڑھانا شروع کر دیا تھا، ورنہ فطری طور پر وہ چاہتا تھا کوئی کس سے ناراض نہ ہو، کوئی آپس میں لڑے جھگڑے نہ وہ اس وقت ہاشم کو ماننے کے لیے جانا چاہتا تھا کہ اباجی کی آواز گونجی۔

”میں پوچھتا ہوں کہ تمہیں جرات کیسے ہوئے مردوں کے معاملے میں بولنے کی۔ یہ میرے بیٹے ہیں جس طرح سے چاہوں استعمال کروں، حق ہے میرا ان پر اور فرض ہے ان کا کہ میرے بدلے لیں، تم بولنے والی کون ہو۔ ایاز! تم شہزادہ نہیں جاؤ گے۔ مجھے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لیے تم دونوں بھائیوں کی ضرورت ہے اور میں نے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔“

شہباز علی نے ایاز کو دیکھا جو سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ وہ انسانیت سے عاری اپنے باپ کو کس طرح سمجھائے کہ معاف کر دینا کتنا بڑا اور احسن عمل ہے۔

”میں ماں ہوں ان کی شہباز علی! اور میں نے پال پوس کر ان کو اس لیے جوان نہیں کیا کہ اپنی جوانیوں کو آپ کی کھوکھلی خود ساختہ دشمنیوں کی نذر کر دیں۔ ایسا نہیں ہوگا شہباز علی! میں نے آپ کی اس جیل میں مجبوس زندگی گزار دی ہے تو کس لیے؟ صرف ان ہی کی خاطر اور اب میں ان کو آپ کی دشمنی کی نذر نہیں ہونے دوں گی۔“ زندگی میں پہلی بار منترہ بیگم یوں بلا خوف شوہر کے سامنے بولی تھیں۔ وقت نے خوف کم کر دیا تھا یا بیڑوں کی ماں تھیں اس لیے۔

”تم نہیں بولو گی منترہ! اس لیے کہ میں نے بڑا انتظار کیا ہے اس دن کا۔ عالم شاہ نے آگ لگائی ہوئی ہے میرے دل میں، جب تک حمیرا کی جائیداد کے کاغذات واپس نہیں مل جاتے اور جب تک میں ایاز کے ایک ایک زخم کا بدلہ نہیں لے لیتا آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔“

گزرے وقت نے شہباز علی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ نہ کسی معذوری کا احساس، ان کو نرم کر سکا تھا۔ وہ تو انتقام کی آگ میں جھلس رہے تھے۔

”صاف کیوں نہیں کہتے کہ نورین کو نہیں بھلا سکے آپ اب تک؟“

منترہ بیگم کی تلخ بات پر شہباز علی نے گھبراہٹ سے دیکھا پھر ایاز کو مگر وہ اڑے رہے۔

”ہاں نہیں بھلا سکا۔ عالم شاہ نے میرے ساتھ دھوکا کیا میں اسے کسی صورت معاف نہیں کروں گا۔“ شہباز علی نے انتقامی آگ میں جپے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہونہہ! آپ دونوں عورت کے ٹھکرانے ہوئے دو کم طرف انسان، شہباز! حمیرہ نے عالم شاہ کو تھپڑ مار کر ٹھکرادیا اور وہ آج تک اس تھپڑ کی جلن محسوس کرتا ہے اور آپ کو نورین نے ٹھکر کر زندگی بھر کے لیے بے چین کر دیا۔ جب مرد کی اتنا کابٹ کا عورت کے ہاتھوں پاش پاش ہوتا ہے تو بل کھاتے ہوئے مرد کی طرح کھانا چبے ہیں اور اپنے انتقام کو مختلف نام دیتے ہیں لیکن، لیکن شہباز! میرے بیٹے تمہارے انتقام میں برباد ہونے کے لیے نہیں، میں نے خدا سے بڑی دعائیں مانگی ہیں، ان کی زندگی کے لیے میری ممتا کی ٹھنڈک ہیں وہ شہباز! میں اس ٹھنڈک کو انتقام میں جلنے نہیں دوں گی خواہ درہوں یا نہ۔“ لٹے بولتے منترہ بیگم کی سانس پھولنے لگی۔ آج

پہلی بار وہ یوں مکمل کر بولی تھیں ورنہ اب تک تو وہ شہباز سے ڈرتی ہی رہی تھیں۔ انہوں نے کیا کچھ قربان نہیں کیا تھا بیڑوں کی خاطر۔ ماں باپ، بہن بھائی سب ہی تو چھوڑ دیے تھے۔ اور اب وہ اپنے بیڑوں کو دوانا کے مارے ہوئے مردوں کے انتقام کی بیخیت کیسے چڑھنے دیتیں۔

”امی جان! کچھ نہیں ہوگا، اب ہم سب ایک ساتھ رہیں گے ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہم نے کسی سے انتقام لیتا ہے۔ یہ جہالت کا دور نہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر دشمنیاں پالی جائیں اور انتقام لیے جائیں۔ میں عارٹ کو بھی معاف کر چکا ہوں اور اب تو اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے، اُسے بھی اس کے باپ بھائیوں نے خراب کیا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، آپ انصاف مان رکھیے۔ آپ تیار ہو جائیے میں آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ ایاز نے ماں کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔

”ایاز! تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ شہباز دھماڑے۔

”گستاخی معاف اباجی! اب تک آپ نے جو ہمارے ساتھ کیا، ہماری ماں کے ساتھ کیا ہم اور ہماری ماں برداشت کرتے رہے آپ نے اب تک جو بھی کیا اپنی اتنی تسکین کے لیے کیا اور اس تسکین کے لیے آپ نے کس کس کے جذبات کو محروم نہیں کیا۔ شیراز بھائی کی تو زندگی آپ نے برباد کر دی ہے مگر مجھ پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی رہی ہے اور ماں کی دعاؤں سے آج میں اس قابل ہوں کہ اچھائی برائی میں تیز کر سکوں اور میں اب نہ آپ کو اور نہ ہی شیراز بھائی کو کسی آگ میں کودنے دوں گا اور نہ ہی اپنی مظلوم ماں کو وردی دلدل میں تنہا چھوڑ دوں گا۔ آئیے امی جان۔“ وہ ادب، لحاظ اور تابعداری کے تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی منوذب لہجے میں باپ کو سب کو سمجھا گیا تھا۔

شہباز کھول کر رہ گئے مگر انہیں شیراز پر بھروسہ تھا۔ شیراز نے سب کچھ سنا۔ اتنی اچھی باتیں کرنے پر اسے باز پر تیار کیا۔ واقعی علم ہی انسان کو حقیقی معنوں میں انسان بنا سکتا ہے مگر فی الحال وہ صرف ہاشم کے ہاں جا کر اُسے منانا چاہتا تھا۔ وہ آہستگی سے باہر نکل آیا۔

اور اب وہ ہاشم کے سامنے کب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا تھا، مگر ہاشم آنکھوں میں بازو رکھے لیٹا تھا۔ اُس کے چہرے ہی سے پتا چل رہا تھا کہ وہ دھکی اور مضطرب ہے شیراز کی بات نے اُسے بہت دکھ پہنچایا تھا۔

”تم اب کیوں آئے ہو؟ اب تو وہ جا چکی ہے؟“ ہاشم اُس کے بندھے ہاتھوں کو نظر انداز کرتا ہوا اکھڑ لہجے میں بولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اُس کے لیے نہیں تمہارے لیے آیا ہوں۔“ شیراز اُس کی طرف بڑھا جس کے منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

”مجھ سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟“ ہاشم سخت عارٹ تھا۔

”سارے رشتے ہی تم سے ہیں، بھلا دوستی سے بڑھ کر عی وئی رشتہ ہو سکتا ہے۔ بابا معاف کر دو میرے باپ کی تو یہ جو آئندہ کبھی تمہاری دوستی پر شبہ کر دوں۔“

کتنی ہی دیر شیراز اُسے مناتا رہا پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا تو ہاشم کو اس پر ترس آ گیا۔

”وہیے عارٹ! مجھے خاصی حیرت ہوئی یہ سن کر کہ تم جاب کرو گے۔“ شرمین عارٹ کو کافی کانگ دیتے



وہ اُس کے لیے راستہ بتاتی ہوئی اس کے ساتھ واپس آگئی۔

”امی ساتھ آئی ہیں۔“

”ہیں سچ! آنٹی آئی ہیں، لیکن ٹھہری ہوں گی کسی ہوٹل میں یا کسی دوست کے گھر۔ سچ آپ لوگ تو بالکل

فہموں جیسا سلوک کرتے ہیں۔“

شرمین کو پوری خوشی ہوئی تھی منظرہ آنٹی کے آنے کا سن کر۔ مگر پھر بجھ سی گئی کیونکہ منظرہ بیگم جب بھی شہر آتیں ہوئیں ہی میں ٹھہرتی تھیں۔

”نہیں شرمین! میں امی کو تمہارے گھر چھوڑ کر آیا ہوں، نانی جان کے پاس۔“

”سچ ایاز! پھر تو میں۔ ابھی جا رہی ہوں گھر۔“

شرمین یہ سن کر ایک دم ہی چیخ پڑی۔ باہر تیزی سے جاتی نرس نے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”اور ڈاکٹر حارث کیا حال ہیں؟ تمہاری چاب کاسن کر سچ بڑی خوشی ہوئی۔“

ہرے خاصا ذیل کیا گیا رماز فطری طور پر بہت صلح جو اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ وہ حارث سے بدلہ لینے کے بجائے اُسے سُدھارنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

”یارا یازا! میں تو تم سے نظر س بھی ملا سکتا۔ میں بہت زیادہ نادام ہوں۔ میں تو گمراہی میں کھویا ہوا تھا۔ اگر پھپھو اور آئی حیرا سے ملاقات نہ ہوتی تو میں انسانیت سے دور بہت دور ہوتا چلا جاتا۔ میں نے خصوصاً تمہارے ساتھ بہت بد تمیزیاں کیں ہیں اس لیے پلیز تم۔“

”اوکم آن یار! کیوں پرانی باتیں یاد کرتے ہو۔ تم اندر سے اچھے تھے ناں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمہیں جلد ہی سیدھی راہ پر ڈال دیا اور تم یہ کیا بچوں کی طرح معافی طلبانی کرتے رہتے ہو۔ ہم بڑھے لکھے باشعور لوگ ہیں یا حارث! اگر ہم لوگ بھی ایک دوسرے کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کی کوتاہیوں کو معاف نہیں کریں گے تو کیا فائدہ ہمارے تعلیم یافتہ ہونے کا۔ آئندہ ایسی بات نہ کرنا۔“

پھر شرمین، وارڈ کاراؤنڈ لینے چلی گئی اور وہ دونوں مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔

”چلیں گھر۔“ شرمین راؤنڈ لے کر واپس آئی۔ یہ دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

منزہ بیگم ایک مدت کے بعد اپنے میکے آئی تھیں سب بہن بھائیوں کے بالوں میں ان کی طرح سفیدی آئی تھی بچے جوان ہو گئے تھے۔ منزہ بیگم سب کو دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔

”قہنہ ادبشر میں میری بیٹی کب آئے گی؟“ منظرہ بیگم کو شدت سے شرمین کا انتظار تھا۔

”بس آتی ہی ہوگی آپنی! آپ چائے لیجئے..... وہ لیجئے..... آگئی آپ کی بیٹی۔“ نوہین نے جیسے ہی منظرہ کے ہاتھ میں کتھما اُسی وقت شرین اپنا ز اور حادث آگے شرین تیزی سے منظرہ کی طرف بڑھی۔

”ہائے پھمپھو! ہماری قیمت کیسے جاگ گئی۔ سچ آپ تو ان کہانیوں کی ہیروئن تھیں جو پچا آپ کی سنایا کرتے تھے۔ میرا دل تو ہر وقت آپ سے ملنے کو تڑپا تھا مگر آپ.....؟“

شرمین، پھپھو سے لڑی شکوے کیے جا رہی تھی۔

ہوئے مسکرائی۔  
 ”تو تمہارا کیا خیال ہے“ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر کے مجھے تھک مارنی چاہیے تھی؟“ حادثہ نے انہیں  
 نظروں سے شرمین کو دکھا۔

”نہیں تھک نہیں مگر تمہارے تو والد صاحب کے سلسلے ہی اور ہیں، اسی چوڑی جائیدادیں ہیں اس۔ کہیں زیادہ دشمنیاں ہیں۔“ شمرین کے لہجے میں ہلکا سا طنز نمایاں تھا، حارث کو اس نے اس کی کبھی ہوئی بات دلائی تو حارث نے نظریں جھکا لیں۔

”جہالت کے دور کی باتیں یاد نہ دلاؤ شرمین، نہ جانے میری کون سی نیکی کام آگئی کہ خدا نے مجھے پھوپھو حمیرا آنٹی سے ملوایا۔ ورنہ میں تو حیوان ہی رہتا۔ ہمیں تو جو اباجی نے سکھا دیا سیکھ گئے۔ اولاد کی اصل تربیت اس کرتی ہے اور ہمیں تو اس کی لذت ہی سے آشنائی نہیں۔ میں نے تو اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ ہمارے بعد بہن ہوتی ہے۔ ہماری بہن کو اباجی نے گاؤں میں پھیلی ہوئی دشمنیوں کی وجہ سے ہمیشہ ماموں کے پاس رکھا۔ ماموں کا انتقال ہو گیا تو آمنہ باجی آگئیں مگر اس دوران ہم لوگ ایک دوسرے سے اتنے دور ہو چکے تھے کہ بعض اوقات تو آمنہ باجی سے بات کرتے ہوئے بھی عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی عورت تو ایسا ہو جو مجھ پر توجہ دے، پیار کرے مجھ سے مخلص ہو، مگر میرا انداز کچھ ایسا رہا تھا کہ لڑکیاں مجھے ادباًش‘ غلط قسم نوجوان سمجھ کر دور ہی بھاگتی تھیں۔ تمہارا چلا چلا کہ تم میری کزن ہو تو یقین جانو مجھے بے حد خوشی ہو مگر تمہاری طرز بڑھنے کا میرا انداز اتنا منفی قسم کا تھا کہ تم میرے سائے سے بھی کترانے لگیں۔ ایسی بات نہیں تھی کہ میں تمہیں دیکھتے ہی فت ہو گیا تھا مجھے تم سے کوئی جنونی عشق ہو گیا تھا۔ بس ایک احساس تھا کہ اپنی ہو اور میں تمہارے قریب آنا چاہتا تھا اس لیے کہ میں بھٹکتے بھٹکتے تھک گیا تھا۔ شرمین! میں کوئی منزل چاہتا تھا کوئی سمت چاہتا تھا جو میرا منزل کا تعین کرتی اور میری اس خواہش میں جانے کتنا خلوص تھا کہ ایسا والا ناخوشگوار حادثہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے پھوپھو سے اور حمیرا آنٹی سے ملوایا میں سوچتا ہوں اگر یہ مہربان خواتین میری زندگی میں نہ آتیں تو میں یوں ہی بھٹک رہا ہوتا۔“

ہاسٹل کے سٹنک روم میں بیٹھے بیٹھے پہلی بار حارث نے اپنی محرومیوں کو لفظوں میں بیان کر دیا تو شرمندہ اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ کتنا اکھڑا ہوا کرتا تھا یہ حارث وہ سمجھتی تھی کہ یہ ہے ہی غلط مگر وہ تو ایسے سمندر کی مانند ظاہر ہوا تھا جس کی سطح بر سکون ہوتی ہے اور گہرائی میں بے شمار طوفان اٹھ رہے ہوتے ہیں۔

”چلو چھوڑو حارث! زندگی ایسے ہی حادثات و واقعات کا نام ہے۔ ویسے ایک بات ہے کالج میں جب نا بھیمہ کزن کہا کرتے تھے تو مجھے اس قدر غصہ آتا تھا اور شرمندگی الگ ہوتی تھی کہ باقی لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے کہ میں کس فیملی سے ہوں۔ خیر! اب ہاسٹل نہیں جاتا ہے، تم نے! ای نے کہا تھا کہ تمہیں ہاسٹل لینی آؤں میں ذرا وارڈ کا راولڈ لے آؤں تو چلے ہیں۔“ شرمین کاؤن سنچال کر دروازے کی جانب بڑھی تو ایاز سے مذہم بیٹھ رہی ہوئی تو اُسے یوں اچانک اتنے دنوں کے بعد دیکھ کر شرمین دل میں ایک لطیف سی لہر کو اترتے ہوئے محسوس کرنے لگی۔

”ہیلو! ایاز نے اس کے چہرے پر خوشی اور حیرت کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چونک گئی۔

”اوہ ہیلو! کیسے ہیں یا آپ؟ امی کیسی ہیں؟“

”میری جان میں کب کب نہیں تڑپی ہوں تم لوگوں کے لیے مگر قید سے رہائی ملتی تو آتی ناں۔ خدا نے میری جانے کون سی دعا سن لی کہ میرے بیٹے کو اتنی بہت نصیب ہوئی یہ مجھے اس جہنم سے نکال لایا اور برسوں کے چمڑے ہوئے بہن بھائی مل گئے۔“

”جھٹکے ایاز!“ شرمین نے خاموش بیٹھے ایاز کو دیکھ کر آہستگی سے کہا تو وہ مسکرایا۔

”میں اس بیٹے کو نہیں پہچان سکی نورین۔“ منزہ بیگم نے خاموش بیٹھے حارث کو دیکھا جو سلام کر کے ایاز کے برابر بیٹھ چکا تھا۔ نورین بڑی شفقت سے حارث کی طرف بڑھیں۔

”منزہ آپلی یہ۔۔۔۔۔“

”بلین پھو آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں کہہ سکتیں تو شرمین کا کلاس فیلو ہی کہہ دیں مگر جس حوالے سے آپ میرا تعارف کرانا چاہ رہی ہیں ناں وہ میرے لیے نہ تو اتنا مستحقر ہے نہ قابل فخر کہ میں اس حوالے سے تعارف ہو کر خوش محسوس کروں گا۔“

اس سے قبل کہ نورین اس کا تعارف کراتیں وہ معذرت کرتا کھڑا ہو گیا۔ اس کے لہجے میں اپنے باپ کے لیے نفرت اور ناپسندیدگی تھی۔

”امی جان! اس کا بہترین حوالہ یہ ہے کہ یہ میرا دوست ہے حارث! اس کی دوستی میرے لیے باعث فخر ہے۔ بہت اچھا انسان ہے یہ۔“

ایاز نے اس کا تعارف کچھ ایسے انداز میں کرایا کہ حارث اندر سے شرمندہ ہو گیا مگر اس کے تعارف نے اسے بڑی عزت بخش دی تھی۔

”آداب آئی!“ اُس نے سعادت مندی سے سر اُٹکے سامنے جھکا دیا تو منزہ نے شفقت سے اسے ساتھ لگا لیا۔

”جیتے رہو بیٹا! بڑا سعادت مند بیٹا ہے۔ نورین واقعی یہ تمہارا ہی بیٹا لگتا ہے۔“

”آپلی! یہ میرا ہی بیٹا تو ہے جب ہی تو میرے پاس ہے۔“

نورین نے متاثری نظروں سے حارث کو دیکھا جو سوچ رہا تھا کہ کتنے اچھے ہیں یہ لوگ نہ کسی نفرت کا شائبہ تھا اور نہ کسی کے دل میں کوئی کدورت تھی چہرہ پر کسی دیرینہ دشمنی کی تاریکی نہیں تھی محبت کی یہ دنیا اس جہنم سے کتنی مختلف تھی جو اس کا گھر کہلاتا تھا جہاں کوئی خوشی نہیں تھی۔ روایتی دشمنیوں میں جکڑی ہوئی زندگی کتنی بد صورت اور بے معنی تھی جہاں زندگی کی ابتداء اور انتہا نفرت اور دشمنی ہی تھی اور ایسی زندگی کو رواج دینے والا اس کا اپنا باپ تھا جس نے ان کے لیے دشمنیوں کے جال بچھائے تھے۔ کیا دیا تھا ان کے باپ نے ان کو ایک مہربان پھوپھو تھیں۔ ان کو بھی زندگی سے نکال دیا تھا ایک بہن تھی وہ نہ ہونے کے برابر۔ اسے خود سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہا ابھی اُٹھ کر چلا جائے یہاں سے اُسے، احساس کتری ہونے لگا تھا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ہیلو! کہاں ہو حارث چلو آؤ کھانا لگ چکا ہے۔“

شرمین نے اُس کی آنکھوں کے سامانے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک پڑا ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان کھانا کھا رہا تھا۔ مگر اپنی باتیں ہونے لگیں۔ چائے کا دور چلا ماحول اتنا اچھا ہو رہا تھا کہ حارث کا ہاسل جانے کو ہی نہیں چاہو رہا۔ مجبوراً وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسی وقت عذرا بیگم اور اشعر آگے رونق مزید بڑھ گئی۔

چمڑے ہوئے مل رہے تھے باتیں ہو رہی تھیں کہ کس طرح جدائیاں ہوئیں اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ تمام برائیوں کی جڑ اس کے ابائی ہوں۔ انہوں نے ہی سب کو جدا کیا ہو پھر سب کے روکنے پر بھی وہ نہیں ہلا ہلا آگیا۔

ساری رات سوچوں میں گزر گئی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بھی اپنے گھر کے آگن میں محبتوں کے بیج بٹھے۔ نفرتوں کی ان دیواروں کو گرانے کے لیے محبتوں کا سفیر بنے گا۔ اپنے باپ اور بھائیوں کو جہالت کی بڑی سے نکال کر محبت کی ہستی میں لے آئے گا اگر ایسا ہو گیا تو ٹھیک ورنہ آئندہ کو لے کر یہاں آ جائے گا۔

آئندہ اُس کی بڑی بہن تھی۔ بڑی بہنیں ماؤں کی طرح ہوتی ہیں مگر کتنی دوریاں تھیں ان سب بہن بھائیوں میں آج اُسے آئندہ بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی اور ساتھ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب جلد ہی چھٹیاں لے کر اڑاں جائے گا اور وہ بھی نادرل زندہ اور محبت کرنے والے محبت سیکھنے والے لوگوں میں شامل ہو جائے گا اور یہ ہلکے کر کے وہ مطمئن ہو کر سو گیا۔



”دوستی صلح۔۔۔۔۔ کیا اسی لیے میں نے تم دونوں کو جو ان کیا تھا کہ تم لوگ میرا شملہ اُدھانچا کرنے کے بائے مجھے دشمنوں سے دوستی کا مشورہ دیتے، جھکنے پر مجبور کرتے، دشمن کے سامنے اور شیراز پترا کیا بیٹے اسی لیے بیان ہوتے ہیں کہ باپ کا بدلہ لینے کے بجائے اسے دشمن کے سامنے جھکائیں وہ نواب صاحب ماں کو لے کر ہالیا اور تم۔۔۔۔۔!“ شہباز اندر باہر جھلتے پھر رہے تھے کیونکہ شیراز نے بھی بغاوت کر دی تھی۔

”اب جی! تو کیا باپ بیٹوں کو اس لیے جو ان کرتے ہیں کہ ان کو اپنی کھوکھلی دشمنیوں کی نذر کر دیں۔“

”اوہ بس! عالم شاہ کے غیائے نے قیامت برپا کر رکھی ہے ہمارے بندوں کو وہ سانس لینے نہیں دیتا وہ لوگ باہر نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ چوڑیاں پہنو اور گھر بیٹھ جاؤ یا ان کے پاؤں چھولو جا کر بزدل نہ ہوتے تم لوگ کم از کم یہ تو صبر ہوتا کہ میں بے اولاد ہوں میرا بدلہ لینے والا کوئی نہیں مگر آگ لگ جاتی ہے مجھے تم دونوں اولوں کو دیکھ کر۔“ شہباز علی کا بس چلنا تو اپنی دانست میں اپنے نافرمان، نا تنجار، ناکارہ بیٹوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیتے۔

”اباجی! اس میں جھکنے والی کون سی بات ہے۔ انسانی جان اتنی ارزاں نہیں کہ اسے بے بنیاد کھوکھلی باتوں نرمان کیا جائے۔ خون ریزی اچھی بات ہے کوئی؟ ہیں۔۔۔۔۔ اباجی! اب تک آگیا ہوں دشمنیوں سے۔“

”اٹو جاؤ دفع ہو با! اپنی ماں کے پاس تنہا چھوڑ دو مجھے۔ ابھی میرے بازوؤں میں اتنا دم ہے کہ اپنے دشمنوں لہجہ زسکوں نہیں ضرورت مجھے تم جیسے ناکارہ بیٹوں کی نکل جاؤ دفع ہو جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“

شہباز علی ڈھاڑے تو شیراز مزید کوئی بد مزگی پیدا کیے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔ اُس کا جی تو چاہتا تھا کہ شہر اپنی لادور بھائی کے پاس چلا جائے مگر وہ باپ کو بھی دشمنی کی آگ میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس بار اس کے سننے لایا تھا کہ غیاث خاصے خطرناک عزائم رکھتا ہے اور شہباز علی بھی جوانی کا روائی کے لیے تیار تھے جبکہ وہ نہیں لایا تھا کہ دونوں فریقین میں سے کسی کا نقصان ہو۔ وہ سیدھا ہاشم کے پاس آ گیا۔

”ہاں یا ر! اساتو میں نے بھی ہے کہ اس بار خاصا بڑا پروگرام ہے دونوں جانب کا۔“

”یار میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بے وجہ کی دشمنی ختم کیوں نہیں کر دیتے یہ لوگ۔ ادھر صرف عالم شاہ اور

غیاث شاہ ہی اس بات کو طول دے رہے ہیں جبکہ دوسرے دونوں بھائی تو کسی پھندے میں آتے ہی نہیں اور سب سے بڑھ کر مجھے آمنہ کا خیال آتا ہے۔ دشمنی کے جنگل میں ایک ہی ہتھکنٹی رہتی ہوگی۔ وہ وہاں کیوں ہے۔ دیشیوں کے درمیان۔ اسے وہاں نہیں ہونا چاہئے۔“ ساری کوفت ہی شیراز کو آمنہ کی تھی وہ اسے پریشان اور دکھی کیونکر کر سکتا تھا۔

”کہیں تمہارے پیچھے ہٹنے کی وجہ آمنہ ہی تو نہیں؟“

”ہاں بڑی وجہ یہی ہے ہاشم! میں اُسے چاہتا ہوں۔ بھلا جسے چاہا جائے اُسے کوئی اذیت دی جاسکتی ہے؟ محبت واقعی انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔“

”یار کوئی ایسی راہ نہیں نکل سکتی کہ دونوں خاندان اختلافات بھلا کر اپنی دشمنی ختم کر دیں۔“

شیراز کو شدید خواہش ہی تھی کہ یہ دشمنی ختم ہو جائے۔

”گویا کہ یہ بات تقریباً ناممکن ہے شیراز لیکن صلح کے لیے ہاتھ بڑھایا تو جاسکتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ عالم شاہ کا بیٹا حارث شاہ آیا ہوا ہے۔ وہ ڈاکٹر ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ بڑے سمجھ داز ہوتے ہیں اُس سے بات کرتے ہیں۔ دیکھو شاید بہتری کی کوئی راہ نکل آئے۔“

”ہاں یار ایاز بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر حارث بڑا اچھا ہے۔ پہلے تو وہ بھی بگڑا ہوا تھا مگر اب بہت سندرہ گیا ہے اس سے بات ہو سکتی ہے اور ہم ضرور اس سے طیس گے تاکہ وہ اپنے باپ اور بھائیوں کو سمجھائے ہم اچھے دوستوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔“

حارث کا خیال آتے ہی شیراز کچھ بُرا امید ہو گیا کیونکہ ایاز نے سُن رکھا تھا کہ حارث اپنی بات منوانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔



حارث کافی عرصے بعد گھر آیا تھا گھر میں عجیب سی بے رونقی اور اُداسی تھی اور اس کے ذہن میں ڈھرمین کا خوشحال زندہ دل لوگوں کا گھر بسا ہوا تھا۔ بس ملازمتیں ہی آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سیدھا آمنہ کے کمرے میں آ گیا۔ آمنہ کھڑکی کا پت کھولے آسمان پر آخری تاریخ کے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ آہٹ، پیچھے مڑی تو دروازے پر نظر پڑ گئی۔

”میں حارث ہوں باجی! پہچاننے کی کوشش کر رہی ہیں۔“ وہ اُسے دیکھتا ہوا اُس کے قریب چلا آیا۔

”ہاں، کبھی بکھار ملنے والے مہمان کو پہچاننے میں تو وقت ہوتی ہی ہے ناں۔“

آمنہ نے بڑھ کر اُسے ساتھ لگا لیا۔ چیشانی چوم کر پیار کیا تو ایک اجنبی سا سکون ٹھنڈک پہنچانے والی راحت حارث نے زندگی میں پہلی بار محسوس کی۔

”باجی! آج سے پہلے آپ نے ایسا پیار کیوں نہیں کیا۔ میں تو ترستا ہی رہا ہوں محبتوں کو مجھے تو ہمیشہ نفرت ہی کا سبق دیا گیا ہے۔ محبت کا درس دینے والا کوئی نہیں ملا۔“

”میرے قریب ہی تم پہلی بار آئے ہو حارث! میرا ہوتا وجود ہی میرے اپنے لیے اپنی رہا ہے اور پھر درمیان میں حائل دوریوں نے..... خیر! تم بتاؤ وہیں سیٹ کیوں نہیں ہو جائے؟ یہاں اس جہنم میں کیا لینے آئے ہو؟ یہاں کیا ملے گا تمہیں؟“

”میں آپ کو لینے آیا ہوں باجی! نہ میں خود یہاں رہوں گا اور نہ آپ کو یہاں رہنے دوں گا۔ پتا ہے آپ کو ہاری پھسواتی اچھی! اتنی چاہنے والی ہیں کہ حد نہیں جن کو باجی نے ناکردہ گناہوں کی سزا دے رکھی تھی۔ اور وہ جو بعد آتی ہیں وہ اتنی اچھی خاتون ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔“

”تمہیں بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ تمہاری بدلی ہوئی سوچ ہی اُن کی اچھائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کاش! ایسی کوئی مہربان ہستی ہماری زندگی میں بھی آ جاتی تو شاید محرومیوں کے اس جنگل میں ہم تنہا بلک نہ رہے ہوتے۔“ پھر کافی دیر دونوں بہن بھائی باتیں کرتے رہے۔ آج آمنہ پر بڑے نئے نئے راز منکشف ہو رہے تھے۔

”ایسا ناممکن ہے حارث کیونکہ باجی غیاث بھائی تو ان لوگوں کے جانی دشمن ہیں اور وہ لوگ بھی تو بڑے ہی خنوار ہیں۔“ آمنہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

نہیں باجی! وہ لوگ بہت اچھے ہیں خصوصاً ایاز اور شیراز بھائی تو بے حد اچھے اور رحم دل ہیں میں اُن سے اہل چکا ہوں میں نے ایاز اور شیراز بھائی کے ساتھ باجی کے کہنے پر خاصی بدتمیزی کی ہوئی ہیں مگر انہوں نے ہمیشہ اچھا برتاؤ کیا ہے۔ حمیرا آئی ان کی سگی پھپھو ہیں۔ وہ اتنی اچھی خاتون ہیں کہ کیا بتاؤں محبتوں کا یہ سبق انہوں نے ہی مجھے پڑھایا ہے آمنہ باجی! وہ سب لوگ ایسے لوگ ہیں جن سے مل کر زندگی سے پیار ہونے لگتا ہے۔“ حارث زندگی کا اصل مفہوم سمجھ آیا تھا اور اب اپنے باپ، بھائیوں کو سمجھانا چاہتا تھا، جو جہالت کی صدیوں پائی روایات کے اہل بنے ہوئے تھے۔

”اللہ تمہیں کامیاب کرے میرے بھائی! اور کاش نفرتوں کی دھند چھٹ جائے اور ناممکن ممکن ہو جائے۔“ آمنہ کے خیالوں میں چپکے سے شیراز چلا آیا جسے وہ سوچنا چاہتی تھی مگر اس خیال سے کہ کہیں کوئی اس کی طرف ہی نہ پڑھ لے۔ اس کے خیال کو جھٹک دیا کرتی تھی وہ جس کی اچھائی کے قصے ہاشم کی بھابھی سنایا کرتی تھیں اور ایک روز تو بھابھی نے یہ کہہ کر اس کی خاموش بے زبان دھڑکنوں کو زندگی عطا کر دی تھی کہ وہ جس سے اس کے باپ کی پرانی دشمنی ہے۔ وہ اسے چاہتا ہے کتنا لطیف اور معتبر کر دینے والا ہوتا ہے یہ احساس کہ کوئی آپ کو چاہ رہا ہے۔ آپ کا طلب گار ہو رہا ہے۔ اس خیال نے اسے کتنا پرسکون اور معتبر کر دیا تھا کہ وہ بھی اس قابل ہے کہ کسی کی دست طلب میں ہو سکتی ہے ورنہ تو اس کا وجود اور عدم وجود بے معنی ہی بات تھی۔ اسے تو احساس نہیں رہا تھا کہ وہ چپکے ہی چپکے شیراز کی چاہت میں کتنی آگے نکل گئی تھی جسے چند بار ہی دیکھا تھا۔

ایک بار جب وہ اور ننب بھابھی ہاشم کے گھر سے واپس آ رہی تھیں تو اچانک ہی شیراز اور ہاشم آگئے تھے پادری اوٹ سے اس نے خوبرو سے شیراز کو دیکھا تھا تو دل بہت زور سے دھڑکا تھا، مگر وہ سب جانتی تھی اسی لیے تو شیراز کا خیال بھی شجر ممنوعہ تھا۔ حارث جودل میں ٹھان کر آیا تھا اس کا اظہار اس نے عالم شاہ کے سامنے کر دیا۔

”ہوں! تو یہ ساری پٹیاں تمہیں نورین ہی نے پڑھائی ہیں۔ میں پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ ناخلف ضرور کوئی نہ کوئی نکل کھلائے گی پہلے بھائی کی۔“ عالم شاہ نورین کا نام سنتے ہی بھڑک اٹھے۔

”پلیز باجی! پھپھو کو کچھ مت کہیے گا۔ مہبت کا، اخلاص کا، انسانیت کا، جو درس انہوں نے مجھے اب دیا ہے۔ آپ کا فرض تھا کہ وہ آپ بہت پہلے دیتے مگر آپ کے پاس تو اپنی دشمنیاں ہی نبھانے کے لیے وقت کم تھا تو محبت کا کیا درس دیتے اور باجی میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آمنہ باجی کو شہر لے جاؤں گا، ورنہ وہ ان فیصلوں کے

”اوس بس یہ لکچر شہر ہی میں چھوڑ کر آیا کرو۔ اب میں جھک جاؤں شہباز کے سامنے۔ ہار مان لوں کہ شہباز میں ہار تم جیتے اس لیے کہ میری اولاد ناخلف نکلی ہے۔ وہ باپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ بس رہنے دو میں جنہیں پڑھا کر ہی بچتا رہا ہوں۔“

”اباجی! آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ یہ سب جہالت ہے اور میں آپ کو ایسی کسی حماقت کی یا جالت کی بات کرنے نہیں دوں گا۔“

اور پھر کافی دیر وہ باپ کو صلح کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر ان کی عقل پر جہالت کے گھرے ہل چماٹے ہوئے تھے۔ انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ بھلا اسے یا اس کے دلائل کو کہاں خاطر میں لاتے اپنی دیر میں ہاشم کا آدمی حارث کو بلانے آگیا۔ آمنہ کا دل جانے کیوں خوف سے کانپ اٹھا۔ اس نے حارث کو بلایا۔ ”نہ جاؤ حارث! میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ اس نے اس کا بازو تھام لیا۔

”ارے باجی! کچھ نہیں ہوتا اور پھر ہاشم لوگ ہمارے دشمن تھوڑی ہیں۔ حارث نے عالم شاہ کو دیکھتے ہوئے لفظ دشمن چھپایا۔“

”جانے دو آمنہ اسے۔ ہاشم کوئی غیر نہیں ایک تو تم عورتیں بزدل بنادیتی ہو مرد کو۔ جاؤ حارث تم اور ہاشم کے باپ سے ضرور مل کے آنا۔ ذرا طبیعت صاف کرے گا وہ تمہاری۔“

حارث نے ایک خاموش سی نگاہ باپ اور بہن پر ڈالی اور باہر نکل گیا تو آمنہ کے پہلو میں دل تڑپ سا اٹھ بے اختیار حارث کے لیے دعائیں مانوں تک آگئیں۔

آمنہ کا دل بے سبب نہیں دھڑکا تھا۔ کچھ تو ضرور تھا کہ اس کا دل انجانے خوف سے لرز اٹھا تھا حارث جو لوگوں کا سفیر بننا جس نے صلح کا امن کا جھنڈا گاڑنے کا عزم کیا تھا وہ اپنی حویلی سے دور ہوا ہی تھا کہ رات کی تاریکی میں جانے کہاں دشمن نے نقب لگائی اور کئی عالم گولیاں اس کے جسم کے آ رہا ہو گئیں اور وہ زمین پر گر کر ڈبے لگا۔ دونوں ملازم صاف قح گئے تھے۔ ظاہر ہے نشانے باز نے جس کا نشانہ لیتا تھا اسی کا لیا۔ خون میں لت پت تڑپتے ہوئے حارث کو جب حویلی پہنچایا گیا تو آمنہ بے ہوش ہو کر نینب بھا بھی کے بازوؤں میں جھول گئی۔ عالم شاہ پر گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ خون میں لت پت اس جوان بیٹے کو دیکھ رہے تھے جو ابھی ابھی تو ان کو اکا کر درس دیتا گیا تھا پھر کس دشمن نے اسے خون سے غسل کر دیا تھا۔ غیث کی دھاڑیں پورے گاؤں کو دہلا رہی تھیں۔

”نہیں چھوڑوں گا کسی کو۔ ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔ یہ، یہ میرے بھائی کا خون ہے ایک ایک لٹرے کا حساب لوں گا۔“

غیث کا جی چاہ رہا تھا ابھی جا کر شیراز اور شہباز قتل کر آئے۔ حویلی میں کھرام ہی تو جع گیا تھا۔ حارث کی طرف بھٹ چل رہی تھی جو اس کے زندہ ہون کا ثبوت دے رہی تھی۔ جسم بے حس و حرکت تھا۔ اس المناک واقعے کا شیراز اور ہاشم کو ہاشم کی بیٹھک میں ملی۔ جہاں دونوں صلح صفائی کے لیے حارث کا انتظار کر رہے تھے کہ اسے میں حارث کو دشمنوں نے زیر دام کر لیا۔

”حارث زندہ تو ہے ناں؟“ ہاشم نے اطلاع دینے والے سے پوچھا۔

”ہاں نہیں جی پر گولیاں بہت لگی ہیں جی۔“

پچھلے ہی دم توڑ دیں گی۔“ حارث نے بڑے پختہ اور بے اعتماد لہجے میں کہا۔ جانے وہ اتنا بہادر کیسے ہو گیا تھا اور نہ اباجی کی سرخ آنکھیں ہمیشہ ہی اسے وفادہ کر دیا کرتی تھیں اور پختہ سے پختہ ارادہ پانی ہو جایا کرتا تھا مگر آج وہ ڈنارہا۔ عالم شاہ حیران نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے حکم کے بغیر تو گاؤں میں کچھ نہیں ہوتا تھا اور وہ حارث میں اتنی جرات کیسے ہو گئی کہ وہ اپنے فیصلے ان پر صادر کرنے لگا۔

”تمہیں جرات کیسے ہوئی کہ تم مجھے اپنے فیصلے سنناؤ خبردار جو آئندہ تم نورین سے ملے یا آمنہ کو یہاں سے لے جانے کی بات کی۔ تم اپنے کام سے کام کھوچ ہے کہ بڑھائی انسان کو بزدل بنادیتی ہے۔“

عالم شاہ نے بڑی کڑی نگاہوں سے حارث کو دیکھا جو کچھ کر گزرنے کی ضمان چکا تھا۔

”بزدل نہیں اباجی! تعلیم انسان کو انسان بناتی ہے، عقل و شعور عطا کرتی ہے، حقوق و فرائض کی آگہی دیتی ہے، اسی تعلیم کا فیض ہے کہ میں صبح اور غلط میں تمیز کرنے لگا ہوں۔ بس اباجی! اب تک جو ہوا سو ہوا اب میں کوئی دشمنیاں کھیل نہیں ہونے دوں گا گھر میں، حیرا آئی کی جاندا۔“

”حیرا“ زوردار تھپڑ کی تکلیف عالم شاہ نے اپنے دائیں رخسار پر محسوس کی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئے۔

”یہ نام اگر دوبارہ لیا تو مجھے سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ ان کی کڑک دار آواز آمنہ کے دل کو ہلا گئی۔

”اباجی وہ فرشتہ صفت خاتون ہیں اور پچھوسے زیادہ انہوں نے مجھے پیار دیا۔ جیسے کی سیدھی راہ پر ڈال دیتے جانتے ہوئے بھی کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔“ حارث کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیسے حیرا آئی کی اچھائی بیان کرے۔

”بس بس میں سب جانتا ہوں وہ تمہیں قبضے میں کر کے مجھے بچا دکھانا چاہتی ہے۔ ہونہ۔ بہن بھائی دھوکے بارجال باز اور تمہیں خبر ہے کہ تمہاری پچھونوین کو اسی عورت نے درغلایا اور اپنے ساتھ لے گئی۔“

عالم شاہ نے اسے بتا کر گویا اس کی غیرت کو جگانا چاہا۔

”میں سمجھتا ہوں۔ پچھو کوئی نیکی کام آگئی ہوگی کہ حیرا آئی نے ان کا ہاتھ تھام لیا ورنہ اس زندان میں آخر تک تک جی پاتیں۔ اب ذرا دیکھیے ان کو ان سے بڑھ کر کوئی خوش قسمت نہیں بے حد اچھے پڑھے لکھے ہیں شہزاد انکل۔ ایک ہی بیٹی وہ بھی ڈاکٹر۔ ذرا آپ شرمین کو دیکھیں۔ کتنی بولندار خود اعتماد ہے کہ حد نہیں اور آپ نے اپنی بیٹی کو سوائے آنسوؤں کے، بزدلی کے، قید کے کیا دیا ہے۔“ حارث کشتی کو آ پار لگانے کا عزم کر چکا تھا۔

”حارث! بند کر دیہ بکواس ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا تم پر۔ تم بھی دشمنوں سے جا ملو گے یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“ عالم شاہ کو خاصی مایوسی ہوئی تھی حارث کی باتوں سے وہ تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔

”اباجی! یہی تو آپ کی غلط فہمی ہے۔ کوئی بھی ہمارا دشمن نہیں وہ سب تو اتنا چاہنے والے محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو آپ کا اور شہباز علی کا۔ بس ختم کریں اب یہ قصہ بہت ہو گیا۔ اباجی انسان محبت کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے نفرت کرنے کے لیے نہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے اپنے۔ چنگن ہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔ اباجی! انسان بہت قیمتی چیز ہے۔ آپ اسے زمین زر کے ترازو میں نہ تولیں آپ لوگ زمینوں کے ٹکڑے میں بڑے رہے لیکن آخری ٹکڑے کے لیے تو دو گز زمین ہی درکار ہوتی ہے۔ تو پھر انسان بے شمار زمین کے لیے کیوں لڑتا ہے۔ آپس میں دشمنی رکھتا ہے۔ درگزر بڑا اچھا عمل ہے اور عظیم وہی ہے جو دوستی میں پہل کرے اباجی آپ دو دوستی کی طرف پہلا قدم اٹھا کر عظمت کا ثبوت دیں۔“



”ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں شیراز۔“

ملازم کو بھیج کر ہاشم نے شیراز کو دیکھا جو معطل حواسوں کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ یہ کس کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔

”یار ہاشم! بہت بُرا ہوا ہے یہ اور اگر یہ میرے ابائی کا کارنامہ ہے ناں تو۔ تو حارث کے بدلے میں اپنا خون پیش کر دوں گا۔ میں حارث کا خون رائیگاں جانے نہیں دوں گا۔ تم جاؤ۔ صورت حال کا جائزے لے کر مجھے بتاؤ۔ اس جرم کی سزا میں ابائی کو خود دوں گا۔ اپنی موت کی صورت میں۔“

”شیراز کو یقین تھا کہ یہ حرکت اس کے ابائی نے کروائی ہے۔ غم و غصے سے اس کا انداز حال تھا۔

”شیراز تم جذباتی نہ بنو۔ ہو سکتا ہے یہ حرکت کسی اور نے کی ہو۔ تم اپنی احوال یہیں میرے گھر رہو۔

غیاث اور اس کے آدمی بڑے جذباتی اور مشتعل ہو رہے ہوں گے اور تمہیں کوئی نقصان پہنچے یہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گا اس لیے بہتر ہے۔ تم یہیں رکو میں جا کر دیکھتا ہوں صورت حال کیا ہے۔ اور جب تک میں نہ آ جاؤں تم یہاں سے جانا نہیں۔“

ہاشم اسے ہدایت دیتا باہر آ گیا۔ عالم شاہ کی حویلی میں ایک قیامت کا سماں تھا۔ غیاث اندر باہر چلا رہا تھا۔ دھاڑ رہا تھا جبکہ عالم شاہ سکتے کی کیفیت میں خاموش بیٹھے حارث کے زخموں سے روانی سے بہنے والا خون دیکھتے رہے۔

”غیاث شاہ! اس طرح کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ حارث کو جلدی سے شہر لے جانا چاہیے۔ بدلہ، انتقام، زخم لوگوں کو ان حالوں تک پہنچایا ہے۔ بعد میں لیتے رہنا بدلے۔ خون زیادہ بہہ گیا تو اچھا نہ ہوگا۔“

پھر ہاشم نے خود ہی حارث کو شہر لے جانے کا بندوبست کیا۔ عالم شاہ تو کم مہم ہو کر سب دیکھ رہے تھے آخر کار حال تھا۔

”اے کہیں نہ لے کر جاؤ۔ یہ بڑی مدت بعد مجھے ملا ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گی۔ میں بھی جاؤں گی۔“ آئندہ روتی ہوئی باہر آ گئی تو ہاشم اس کے قریب آ گیا۔ اس پردہ نشین لڑکی کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا اور شیراز کی دیوانگی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔

”آمنہ! بہن اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ حارث کو زندگی عطا کرے۔ اندر جاؤ۔“

ہاشم نے آمنہ کی دھمکی ہوئی چادر اس کے سر پر درست کرتے ہوئے کہا مگر وہ ساتھ جانے پر مصر رہی تھی۔ ہاشم نے غیاث سے کہہ کر آمنہ اور نضب بھابی کو بھی ساتھ لے لیا۔ حارث خود ڈاکٹر تھا اسے اتنی زخمی حالت میں دیکھ کر ہاسپٹل کا سارا عملہ اس کے ارد گرد ہو گیا۔ حارث کو فوراً انتہائی نگہداشت کے شعبے میں داخل کر دیا گیا۔

”ارے ہاشم بھائی! آپ، خیر تو ہے ناں۔“ ایاز جو نائنٹ ڈیوٹی پر ابھی آیا تھا۔ ہاشم کو برا آمدے میں دیکھ کر گھبرا کر پوچھا۔

”حارث شدید زخمی ہو گیا ہے ایاز۔ تم غیاث کے سامنے ہرگز نہ جانا۔ وہ لوگ بہت غصے میں ہیں۔ تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ میں اسی لیے یہاں ٹہل رہا تھا۔ تم فوراً گھر لوٹ جاؤ۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے ہاشم بھائی۔ کہ حارث شدید زخمی ہو اور میں شخص اپنی جان کو بچانے کے لیے چھپ جاؤں۔ میں جانتا ہوں یہ کام ابائی کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔ وہ معاف کرنے کا ہنر نہیں جانتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ حارث کو بھی اتنے ہی گھاؤ لگاؤں گا جتنے اس نے تمہیں لگائے ہیں اور یہ ابائی نے اچھا نہیں کیا۔ آپ میری

لڑ کر میں۔ ہاشم بھائی! میں اپنی نظروں سے گر گیا ہوں۔ حارث تو مجھوں کا سفیر بن کر گیا تھا۔ اُف میرے خدا یا چہاں کب ختم ہوگی۔ انتقام کے ناگ کب تک ہمیں ڈستے رہیں گے۔ میں حارث کو دیکھنے جا رہا ہوں۔“ ایاز بڑی سے جزل وارڈ سے گزرتا ہوا انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف چلا گیا جہاں سینئر ڈاکٹر ز حارث پر جھکے پڑے تھے۔

”سرا حارث۔“ وہ سر صفر کے قریب آ گیا تو وہ منظر چہرے کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ایاز! حارث شدید زخمی ہے۔۔۔۔ خون بہت بہہ رہا ہے۔ اس کے گروپ کا بلڈ پمپ جلدی ہو سکے۔ مہیا رُو فوراً جاؤ۔ اسے خون کی شد ضرورت ہے ہری آپ۔“

”سرا! میرا اور حارث کا بلڈ گروپ ایک ہی ہے جب تک کہیں اور سے مہیا نہیں ہوتا۔ میں حاضر ہوں۔ میرے بدن کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیجئے سرا اور حارث کی رگوں میں اتار دیجیے۔ شاید اسی طرح میرے آپ کے گناہ کا کفارہ ادا ہو جائے۔“ آخری جملہ ایاز نے گویا خود سے کہا۔

”او کے تو تم تیار ہو کر آ جاؤ۔ حارث کو فوری ضرورت ہے۔“

”سرا ایک منٹ میں ڈاکٹر شرمین کو فون کر کے ابھی آیا۔“ ایاز بھاگتا ہوا آیا۔ شرمین کا نمبر ملایا۔

”ہیلو شرمین! حارث زخمی ہو کر ہاسپٹل آیا ہے۔ تم آئی نورین کو لے کر فوراً پہنچ جاؤ۔“

اور پھر اس کا جواب سنے بغیر واپس آ گیا اور اب ایاز کا خون حارث کی رگوں میں اترنے لگا تھا۔ شاید اسی کام انسانیت ہے۔ دشمن کا بیٹا دشمن کے بیٹے کو اپنا خون دے کر زندگی کی طرف بلا رہا تھا۔ شرمین نے گھر میں بلا تھا۔ نورین تو تڑپ کر رہ گئیں۔ شیراز حیران رہ گیا۔ شنگ روم میں عالم شاہ خاموش بیٹھے تھے۔ نلیوں پر دھاتی نائیکس نہ تھیں۔ نورین نے اس اجڑے ہوئے بھائی کو دیکھا جن کا ضمیر غور سے تار ہتا تھا۔ آج ٹوٹی شاخ کی طرح گردن جھکی ہوئی تھی۔ چہرے پر حزن و دلال لے وقت کی عدالت میں سزا سننے کے منتظر بیٹھے تھے۔ وہ سزا جو ان بیٹے کی موت کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ اگر حارث کو کچھ ہو گیا تو باقی کیا بچے گا۔ اس زندگی میں عالم شاہ کے اندر طوفان اٹھ رہے تھے۔ کانوں میں حارث کی میٹھی آواز گونج رہی تھی اور انگوٹوں میں اس کا سرخ گرم خون بکھرا ہوا تھا۔ دل میں درد کا طوفان سا اٹھنے لگا۔ یوں کہ دل پھٹ جائے گا۔ ان کے دل کی حالت چہرے سے ظاہر ہونے لگی۔ خون نے جوش مارا نورین سارے اختلافات بھلا کر بھائی کی طرف بڑھیں۔

”بھائی جی!“ فرش پر بیٹھ کر نورین نے ان کے خنیدہ کھنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے پکارا تو وہ اجنبی نظروں سے ان کو دیکھنے لگے۔

”وہ تو صلح کی دوستی کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ تو زخموں کا مہم بن کر آیا تھا۔ پھر بتاؤ اسے زخم زخم کس نے کیا؟ وہ کہتا تھا کہ معاف کر دینا بڑا مستحسن عمل ہے۔ وہ تو بے خطا تھا۔ خطا کرتا تو میں تھا۔ سزا اسے کیوں ملی۔ پتا ہے کہہ رہا تھا۔ ابائی آپ زمینوں کے لیے جھگڑتے ہیں۔ کتنے نا بچھڑتے ہیں۔ انسان کو آخری ٹھکانے کے لیے تو صرف دو گزر زمین ہی درکار ہوتی ہے اور انسان اسی دو گزر زمین کو بھول کر دوسری زمینوں کے لیے لڑتا رہتا ہے، خون بہاتا ہے۔ بالآخر دو گزر زمین ہی اسے نصیب ہوتی ہے۔ تم۔ تم جو کوئی بھی ہو۔ یہ بتاؤ میرے بیٹے مرث کو دو گزر زمین مل جائے گی ناں۔“



ڈکے درد اور ایک مغرور انتقام پرست زمیندار کا دل نہیں ایک باپ کا دل پھٹ پڑا تھا۔ عالم بھگت کے دل میں درد اٹھا تو وہ دل پر ہاتھ رکھ کر فرش پر گر پڑے۔

”بھائی جی۔ بھائی جی۔۔۔۔۔ شہزاد۔۔۔۔۔ ڈاکٹر کو بلائیے۔ میرے بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔“

نورین نے یہی طرح رورہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں عالم شاہ کو شعبہ امراض قلب میں داخل کر دیا گیا۔ وقت کس کا امتحان درکار تھا۔ باپ اور بیٹا موت و حیات کی کشمکش میں جھلا تھے۔ شیراز ہاشم کے منع کرتے کے باوجود ہاسپٹل چلا آیا۔ حادثہ کو مزید خون کی ضرورت تھی۔ شیراز نے اسی وقت اپنا گرد پچک کر ایسا جو اتفاق سے حادثہ سے مل گیا۔ اس نے فوراً خون کے لیے خود کو پیش کر دیا۔

کیا خوب ادا ہے شیراز بھائی کہ پہلے خود ہی کھاؤ لگائے۔ ضمیر کی خلش اور زمانے کی باتوں سے بچنے کے لیے خود ہی مر رہا ہے ہیں واہ۔“

ایاز کا مظهر شیراز کو دکھی کر گیا کیونکہ ایاز بھی یہی سمجھتا تھا کہ شیراز ابائی کا ہم خیال ہے اور وہ بے چارہ ابائی کے خوف سے کبھی اپنی سچائیاں پیش بھی نہیں کر سکا۔

”ایاز! تم بھی مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ خدا گواہ ہے۔ حادثہ مجھے تمہاری طرح عزیز ہے۔ اگر میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچا سکتا تو حادثہ کو کیونکر پہنچا سکتا تھا۔ یہ ابائی کے آدمیوں کا کام ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ اگر حادثہ نہ ہوتا تو ابائی مجھے بھی زندہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ میرا خود سے عہد ہے۔“

شیراز نے پختہ لہجے میں کہا اور حادثہ کے ساتھ والے بیڈ پر لیٹ گیا اور اب شیراز کا خون حادثہ کی رگوں میں گردش کرنے لگا تھا۔ اور تین روز کی ڈاکٹروں کی محنت اور سب کی دعاؤں کا ثمر حادثہ کے ہوش کی صورت میں مل گیا تھا۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ آتا تھا۔ مگر عالم شاہ اب بھی تک بے ہوش تھے۔ ان کو آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ پانچویں روز وہ ذرا ہوش میں آئے تو رات کے علاوہ کچھ نہیں پوچھا۔ وہ صرف حادثہ۔ حادثہ ہی پکارے پلے جا رہے تھے ان پانچ دنوں میں حادثہ کی حالت قدرے بہتر ہوئی تھی۔ تاہم پھر بھی اس قابل ہرگز نہیں تھا دل کے مریض باپ کو سفید پٹیوں میں جکڑے جو ان بیٹے کو دکھایا جاتا۔ جبکہ عالم شاہ ذرا بھی ہوش میں آتے تو حادثہ ہی کو پکارتے۔

عالم شاہ کے دونوں بیٹے غیاث شاہ اور فیاض شاہ بڑے مشتعل تھے۔ وہ ہر صورت میں حادثہ کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر ہاشم دیوار بن گیا تھا۔

”شرم کرو غیاث! تم ان سے انتقام لینا چاہتے ہو۔ جن کا خون تمہارے بھائی کی رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔“

ہاشم کی دلیل اتنی جاندار تھی کہ کچھ دیر کے لیے دونوں کی سٹی گم ہو گئی۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اگر دونوں بھائی بروقت خون نہ دیتے تو صورت حال کتنی مختلف ہوتی۔ ہاشم کی اس دلیل نے ایسا کام کیا کہ دونوں خاموش ہو گئے۔ اس وقت تک جب تک کہ حادثہ اور عالم شاہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو جاتے۔ مگر ہاشم کو ان کی خاموشی بھی بڑی معنی خیز لگ رہی تھی۔ اور غیاث کی آنکھوں کی چمک یہی بتا رہی تھی کہ اس کے ارادے خطرناک ہیں۔ وہ شیراز کے پاس آ گیا۔

”شیراز! انی حال تو میں نے ان دونوں کو قابو کر لیا ہے مگر غیاث کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔ تم فوراً

ہوں چلے جاؤ اور اپنے ابائی کی حفاظت کا کوئی بندوبست کر کے آؤ۔“

”ہونہہ! رہنے دو ہاشم۔ نہ بے کام کا نہ اسی انجام ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے حادثہ کو زندگی بخش دیا اور انہوں نے تو کام کر دکھایا تھا۔ کتنا سمجھایا تھا میں نے۔ ایاز نے۔ مگر وہ اپنے دل میں لگی انتقام کی آگ کو ہانے میں ناکام رہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا حاصل ہے ان کو اس دشمنی سے۔ پہلے اپنی ٹانگ سے محروم رہے۔ اب دوزندگیوں کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ دونوں بچ گئے۔ ورنہ ہاشم میں خود کو ایسی رادیتا کہ ابائی تمام عمر جیتے اور مرتے رہتے۔“ شیراز کا غم غصے سے بے حال تھا۔

”ہاشم بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی۔ آپ چلے جائیں۔ اب حالات اور ہیں۔ آپ ایسا کریں کسی نہ کسی طرح ابائی کو شہر لے آئیں۔ حادثہ مکمل طور پر ہوش میں آ جائے تو جو کاروائی بھی ہوگی قانونی ہوگی تاکہ لڑتے اور انتقام کی اس روایت کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاسکے۔“

ایاز کی دلیل بھی بڑی جاندار تھی۔ شیراز اسی وقت گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا میں کوئی چور ہوں ڈاکو ہوں کہ روپوش ہوتا پھروں۔“ شیراز نے ساتھ چلنے کو کہا تو لہجہ اعلیٰ تھے سے اکھڑ گئے۔

”چور ڈاکو نہیں ابائی! قتل لگ رہا ہے آپ کے ذمے۔ اقدام قتل کا پراکت سکتا ہے آپ پر۔ وہ تو شکر بچے کہ حادثہ کو خدا نے زندگی عطا کر دی ورنہ ابھی کچھ پتا نہیں عالم شاہ کا اگلا قدم کیا ہوتا ہے۔ لی الحال تو وہ لاکھ دورے کے باعث بے ہوش ہیں۔ ہوش میں آتے ہی وہ قیامت پر بار کر دیں گے۔ اس لیے کہ معاف کرنے کا ہنر نہ آپ کو آتا ہے اور نہ ان کو غیاث شاہ بہت بھرا ہوا ہے۔“ دیکھ لوں گا جو ہوگا۔ نمٹنا آتا ہے مجھے انوں سے بھی۔“ شہباز علی کے بل کسی طور پر بھی ڈھیلے نہیں پڑے رہے تھے۔

”ابائی آپ کو میری بات ماننا ہوگی اور میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں نے کچھ ایسا کر گزروں گا کہ آپ تمام عمر لپٹائیں گے۔“ شیراز کی اس دھمکی میں جانے کیا تھا کہ شہباز علی خاموش ہو گئے۔



”ااشعر بھائی! آپ پر تو اللہ بہت مہربان ہے۔ ساری مشکلات چٹکیوں میں ڈور ہو گئیں۔“

”یہ تمہارا خیال نے یا سرمیاں۔ ورنہ کتنی مشکلات مجھے دیکھنا پڑی ہیں ناں کسی اور نے شاید ہی دیکھی تھیں۔ راشو سے پوچھو اس نے اٹھائی ہیں اتنی مشکلات ان کی شعاع نے کھائی تھیں درجن بھر گولیاں۔“

اشعر نے ٹھوکر کر یعنی کو دیکھا تو وہ نظریں جھکا کر مسکرا دی۔

”چھوڑیں راشو بھیا! آپ تو بے چاری یعنی کوچ کرتے رہتے ہیں۔“ شعاع نے یعنی کی طرف داری کی۔

”ارے واہ! خواہ مخواہ میں چھوڑ دوں۔ میں تو گن گن کر بد۔ لے لوں گا ان سے۔ پتا ہے جب یہ موت و فطرت کی کشمکش میں پڑی تھیں۔ میں کیا سوچ رہا تھا۔“ اشعر مسلسل یعنی کو جھپٹے جا رہا تھا۔

”جی کیا سوچ رہے تھے آپ؟ یہ بھی بتا دیجیے؟“ راشو نے مسکرا کر اشعر کو دیکھا۔

”یہی ہی کہ جلدی سے ان کا قصہ پاک ہو تو کوئی اور لڑکی دیکھوں۔“

اشعر کی شوخ بات پر سب ہنس پڑے۔ یعنی بھی خائف سی نظروں سے اسے دیکھ کر مسکرا پڑی۔ زندگی کی لپٹوں سے معمور اس محفل میں کسی نے بھی نہیں دیکھا کہ ہوی کب آیا اور کب دل کا درد چھپائے وہاں سے ہٹ

ہتھی۔

”ہومی، ہمیا چلیے ناں۔ دلہا والوں پر رعب پڑے گا کہ دلہن کا بھائی کتنی زبردست پرستانشی والا ہے۔“ نمرہ کی بات پر وہ ہنس دیا۔

”ہومی“۔ ہومی نے پلٹ کر دیکھا تو شعاع کو کچھ کہنے کا آرز مند پا کر ٹھہر گیا۔

کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ شمعائے لب کچھ کہنے کو کانپ گئے تھے اور ہومی کے کان اس کے اظہارِ کامریت لیے بغیر جیسے رہ گئے تھے۔ مگر ہر بار وہ پہلو بچا کر گزر جایا کرتی تھی۔

”مجھے اور تو کچھ نہیں کہنا آپ سے ہوئی! صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر یقین کر سکتے ہیں تو کر لیں کہ میں آپ کی شعاع نہیں علیحدہ ہوں۔“

♥ ..... ♥ ..... ♥

”ثمرہ باجی! دیکھیے تو کون آیا ہے۔ ہومی بھیا آئے ہیں۔“

Scanned By Wagar Azeem Paḡsitanipoint

ہو گئیں۔ اس آواز میں سوائے بے چینی اور تجسس کے کچھ نہیں تھا۔ اس کا جی چاہا اس کے ہاتھ تمام کرا سے اپنی بے گناہی کا یقین دلادے اور بتادے کہ اس نے یہ قیامت کس طرح برداشت کی ہے۔ یہ وہی جانتی ہے۔ مگر اس میں ہوی کا سامنا کرنے کی قطعی ہمت نہیں تھی۔ وہ پلٹے بغیر ہی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ہوی بھی تیزی سے اسی طرف آیا مگر سامنے سے رضوانہ بھا بھی۔۔۔۔۔ بہت سی بنی سنوری لڑکیوں کے ساتھ آگئیں۔

”ارے ہوی بھائی! آپ یہاں کھڑے ہیں اور عمیر آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔ کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“

رضوانہ بھا بھی نے لڑکیوں کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ہوی کی طرف آگئیں۔ جس کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔

”جی کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں یونہی سوچ رہا تھا۔ آپ کی تقریب تو خالص لڑکیوں کی تقریب ہے ہم مرد جا کر بھلا کیا کریں گے۔ لیکن نمرہ کی خواہش تھی اس لیے۔“

ہوی پہلے بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اور اب سے کچھ دیر قبل پیش آنے والا خوشگوار حادثہ ایسا تھا کہ وہ تنہائی میں اس پر سوچنا چاہتا تھا۔ وہ کسی طور بھی جانے پر تیار نہ تھا۔

”ویسے کہ تو آپ بھی ٹھیک رہے ہیں۔ چلیے آپ عمیر کے ساتھ گھر پر ہی رہ جائیے۔ نمرہ تو بچی ہے۔ ایسے ہی ضد کر دی ہوگی“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ نمرہ کو سمجھا دیجیے گا میں عمیر کے پاس جا رہا ہوں۔“

ہوی تو گویا یہی ہی چاہتا تھا کہ وہ تنہا رہے۔ وہ سوچنا چاہتا تھا۔ وہ عمیر سے بھی نہیں ملا اور کمرے میں آگیا اس وقت گھر میں خاصا سکون تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اور اب سے آدھا گھنٹہ پہلے پیش آنے والے حادثے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اپنے ہاتھ میں وہ ابھی تک حرا کے ہاتھ کا کلس محسوس کر رہا تھا۔

”میرے خدا! یہ سب کیا معاملہ ہے۔ ایک ہی سراپے کے دو روپ ہیں یا میں اس حد تک کمزور پڑ گیا ہوں کہ معمولی سی مشابہت رکھنے پر میں نے اس اجنبی لڑکی کو شعاع سمجھ لیا۔ شعاع کے روپ کو اس پر طاری کر دیا۔

کہیں یہ میری نظر کو دھوکا تو نہیں تھا۔ یا پھر میں نے اپنے خیالوں میں ایسی شعاع کے خدا کو اس لڑی، لیکن میں میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔ میں نے خود اسے محسوس کیا ہے۔ چھو ا ہے“

ہوی بغور اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ جس سے اس نے حرا کا ہاتھ تھا تھا تھا۔ سوچ سوچ کر ہوی کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ دل جیج جیج کر گواہی دے رہا تھا یہ ہی اس کی شعاع ہے۔ وہ جس کے لیے تڑپا رہا ہے یہ وہی شعاع ہے اگر یہ اصل شعاع ہے تو پھر وہاں کون ہے۔

”اگر یقین کر سکتے ہیں تو کر لیں میں شعاع نہیں علینہ ہوا۔“

شعاع کا جملہ بار بار ہوی کے ذہن میں ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ آخر کوئی تو حقیقت تھی اس کے جملے میں، لیکن یہ سب کیوں ہوا۔ کیا چکر ہے یہ؟ ہوی کے دماغ کی رگیں تن گئیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور سردیوں ہاتھوں میں تمام لیا۔ اسی وقت عمیر کمرے میں آیا۔

”ہوی! تم یہاں ہو اور میں سمجھ رہا تھا کہ تم لڑکیوں کے ساتھ گئے ہو۔“

”یہ چھوڑ تم بتاؤ ابھی فارغ ہو۔ کیونکہ میں بہت آپ سیٹ ہوں اور تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس

میری روشنی تیرے خدو خال سے مختلف تو نہیں مگر تو قریب آ تجھے دیکھ لوں تو وہی ہے یا کوئی اور ہے۔“

ایک سوچ، اک خیال ایک وہم جو اس لڑکی کو اس کی چال ڈھال اس کے سراپے کو دیکھ کر ابھرا کرتا تھا وہ شعاع کے روپ میں اس کے سامنے موجود تھا اور شعاع کا نرم ہاتھ اس کی مضبوط گرفت میں تھا۔ دل یہ کہہ رہا تھا یہ اس کی شعاع ہے۔ اور عقل یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک ہی پیکر دو مختلف جگہوں پر پایا جائے۔ دونوں ہی عجیب موڑ پر کھڑے حیرت و خوشی کے مختلف احساسات لیے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہوی کی تو بڑی حالت تھی۔ اگر شعاع یہ ہے تو وہاں کون ہے۔ اور اگر وہاں شعاع ہے تو یہ کون ہے۔ ہوی کے دماغ میں۔۔۔ آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے اندر کی لطیفانی الجھن کا جال بن کر اس کے چہرے پر ابھرتی تھی۔

اور حرا کی حالت تو دیدنی تھی۔ اس کی شدت سے دعا تھی کہ وہ ہوی کی نگاہوں سے چھپ جائے یا زمین کا سینہ چاک ہو جائے تو اس میں دفن ہو جائے، زندگی یہ کس موڑ پر لے آئی تھی۔ اس میں کہاں ہمت تھی۔ وضاحتیں پیش کرنے کی اب نجائے ہوی کیا قیامت پر پا کرے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ اسے اس کی نظروں میں گر اسکتا تھا۔ اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ ناچگنیں اس طرح کانپ رہی تھیں۔ گویا ابھی گر جائے گی۔ ہاتھوں میں مہندی کا لہالہ ڈول رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ گر پڑتی اور انا کا بھرم ٹوٹ جاتا۔ اس نے ہوی کے ہاتھ کی گرفت کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”ہو۔ ہو۔“

ہوی کا نام زبان پر آیا۔ اس کا منہ دائرے کی صورت میں پھیلا مگر ہونٹوں کی سرحد نے آواز باہر نکالنے پر آیا۔ اس کا منہ دائرے کی صورت میں پھیلا مگر ہونٹوں کی سرحد نے آواز باہر نکالنے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے ہاتھ چھڑایا۔ مہندی کا تھال مضبوطی سے تھا اور آگے بڑھ گئی۔

”شعاع، شعاع میری بات سنو۔“ ہوی کی بے چینی آ۔ شعاع کی زنجیر پائی۔ وہ زکی۔ دھڑکنیں تیز تر

”ہوں تو ٹھیک ہے۔ ابی حرا کو آنے دو، پوچھ لیتے ہیں۔ یا رب میں تو خود الجھ کر رہ گیا ہوں۔ اگر ایسی ہی بات خفی تواس نے مجھ سے کیوں چھپایا اسے چھپانا نہیں چاہیے تھا۔ تم اب ذرا ذہن کو سکون دے سوچو مت، میں ذرا اپر کا مدمدیکھ کر آتا ہوں، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

"یار! یہ لوگ کب واپس آئیں گی۔۔۔۔ بھئی تمہاری بے چینی بھی ٹھیک ہے مگر الجھ تو میں بھی بہت گیا ہوں آنے دو چراگو۔ لوزیادہ پریشان مت ہو جائے پو، اتنی سی دیر میں تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔"

”تم یہیں بیٹھو، میں حرا کو لے کر یہیں آتا ہوں۔“

ہوی سے یہ ٹکراؤ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔

”شعاع“

”آپ نے مجھے شعاع کیوں کہا عمیر بھیا!“ حرا کی آواز گویا کہیں دہر سے آئی۔

Scanned By Wagar Azeem Pakstanipoint



مطلب ہے تمہارا نام شعاع ہی ہے۔“

عمیراب پورے یقین کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ شعاع میں ہمت نہیں تھی کہ اس کو جھٹلا سکے اسے معلوم تھا کہ ہوی نے اس کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔

”عمیراب! میں بہت نادم ہوں۔ آپ سے کہ حقیقت نہ بتا پائی، لیکن آپ کو کیسے بتاؤں کہ۔“ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر نرمی طرح رو پڑی۔ عمیر نے اس کا سر ساتھ لگا لیا۔

”میرے ساتھ آؤ، اوپر کمرے میں۔“ پھر عمیر اسے اوپر لے آیا۔ جہاں ہوی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ شعاع کو دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ شعاع اندر تک کانپ گئی۔ اب جانے وہ کیا کہہ دے عمیر کے سامنے اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی اس کے شفاف کردار کی دھجیاں نکیر سکتا تھا۔ ”شعاع! اس شخص نے اس چھوٹے سے کمرے میں اتنے پھر لگائے ہیں کہ اگر یہ دنیا کے سفر پر نکلتا تو ساری دنیا کھوم آتا، خیراب تم دونوں ایک دوسرے کو تلاش کرو، سمجھو اور جب سمجھ چکے تو مجھے بھی آواز دے لیتا۔“ عمیر نے سسکا کر کہا اور باہر نکل گیا۔ شعاع کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ سارا بدن سن ہو رہا تھا۔ اب گری کہ تب گری والی کیفیت ہو رہی تھی اس کی۔

وقت اسے ہوی کی عدالت میں یوں اچانک لا کھڑا کرے گا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا ہوی بھی گوگو کی سی کیفیت میں کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ شعاع آنکھیں بند کیے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ موت کا پردانہ ملنے کی خطر کھڑی ہوئی تھی۔

”شعاع!“ ہوی کی ہماری آواز کمرے کے سکوت کو توڑتی اس کی دم توڑتی دھڑکنوں میں اتر گئی۔

”ہوی! آپ کو جو کہنا ہے کہہ ڈالیے اپنے ہاتھوں سے میرا گلا بادیجیے، میں آپ سب کی مجرم ہوں۔ مجھے مگر مار ڈالیے، ہوی خدا کے لئے میرے کردار پر شک مت کیجیے گا۔ وقت کی گرد نے میرے کردار کے شفاف آئینے کو دھندلا ضرور کر دیا ہے۔ لیکن خدا کی قسم، میں خود مطمئن ہوں، اپنے ضمیر کی عدالت میں بے گناہ ہوں۔ میں سو بار جہنم لے کر بھی آپ سب کو اپنی بے گناہی کا ثبوت نہیں دے سکتی۔ اس لیے کچھ تم سوچئے ہوی، مجھے مار دیں۔ آپ کے ہاتھوں موت آگئی تو، تو خدا کا احسان سمجھوں گی کہ میری جان لینے والا کوئی غیر نہیں۔ میرا اپنا ہے۔ پلیز ہوی! جلد کریں۔ میں خود اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اب مجھے نہیں جینا۔ آپ سب کی نظروں سے گر کر میں کس طرح جی پاؤں گی۔ ہوی پلیز ہوی مجھے مار دیجیے۔“

شعاع آنکھیں بند کر کے ایسے کھڑی ہو گئی، جیسے واقعی ہوی کے ہاتھ میں تھوڑا ہوا اور وہ اس کی گردن اڑاتا ہی چاہتا ہو۔ ہوی تو خود پاگل ہو جانے کی حد تک الجھا ہوا تھا اس کی شعاع جس کی چاہت میں وہ کیسے کیسے نہیں تڑپا تھا۔ اور جس کے کھودینے کے احساس نے اسے پل پل زلایا تھا۔ آج یوں اس کے سامنے اس کے ہی ہاتھوں موت کی طلبگار رہی کھڑی تھی۔

وہ ساکت نظروں سے اس کے لرزتے ہونٹ روانی سے بہتے اشکوں کی برسات میں دھلتا خوبصورت چہرہ نیچے گیا۔ پھر وہ آہستگی سے آگے بڑھا۔ اس کے کانچے وجود کو شانوں سے تمام کر کر سی پر بٹھایا اور خود بھی کرسی پر بیٹھ کر اس کے برف کی مانند ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ شعاع کو لگا گویا اس کی روح نفسِ غصری سے پرداز کرنے والی ہے۔ اس نے آنکھیں زور سے میچ لیں۔

”شعاع پلیز! آنکھیں کھولو اور مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہے۔ کیا حقیقت اور کیا افسانہ ہے تم یہاں بھی ہو تم ہاں بھی ہو، یہ کیا چکر ہے میرا دماغ خراب ہو جائے گا!“

ہوی کی انجھی ہوئی آواز ابھری تو شعاع نے حیرت سے آنکھیں کھول دیں۔ اور ہوی کی بات پر غور کرنے لگی۔ ”کیا مطلب ہے ہوی، آپ کا اس بات سے؟“ اس کی بھیگی ہوئی آواز ابھری۔

”ہاں شعاع! تمہارے ایک سر پرے کا نام علیہ ہے۔ جو وہاں شعاع کا کردار ادا کر رہا ہے۔ وہاں سب کی شعاع موجود ہے مگر میری نہیں۔“

”ہوی! ہوی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

شعاع کا دماغ چکرانے لگا۔ اسے ہوی کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔

”شعاع! اس لڑکی کا نام علیہ ہی ہے۔ جسے قدرت نے ہو بہو تمہاری شکل عطا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان سے کچھ بھی بعید نہیں۔ وہ ایک جیسے دو چہرے تو کیا کئی چہرے بنا سکتا ہے لیکن یہ کیسا اتفاق ہے کہ تم گھر سے اتنا دُور دور ہیں۔ اور ایک روز بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ تم گھر پر نہیں ہو۔“

”ہوی! مجھے سوچنے دیں یہ سب، آف میرے خدا!“

شعاع کے لیے یہ صورتحال بالکل نئی اور حیران کن تھی۔ وہ سوچنا چاہتی تھی اور بہت سی یادیں ذہن کے درجے سے در آئی تھیں۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ اب وہ ان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل آئی ہے۔ لیکن وہ قدرت کی اس مہربانی کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ وہ مسلسل علیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بقول ہوی کے وہاں اس کا ہم شکل ہے تو۔

”آف خدایا! تیری ذات بڑی غور اور رحیم ہے۔ ہوی ابوی تلاش ختم ہو گئی۔ ہوی ابوی الہس آگئے ہیں کیا؟“ ایک دم ہی شعاع خوشی سے چیخ پڑی۔ زندگی بہار بن کر اس کے رخساروں پر رقصاں نظر آنے لگی تو ہوی نردان نظروں سے اس کے چہرے پر انوکھی خوشی کا عکس دیکھنے لگا۔

”نہیں بچا جان کی تو کوئی خبر نہیں جانے کہاں ہیں۔ کہاں نہیں، آغا جی اور بی بی جان تو ایک نظر دیکھنے کی اس میں زندہ ہیں۔ لیکن تم اس طرح خوش کیوں ہو۔ یوں لگتا ہے، جیسے تمہیں کسی خزانے کا پتہ مل گیا ہے۔“

”ہاں، ہاں ہوی! مجھے تو وہ خوشی ملی ہے۔ آپ کو کیا بتاؤں، جی چاہتا ہے کہ ابھی جا کر اپنی جہنم کا پھڑی بہن سے ملوں۔ خوشی اور جوش سے شعاع کی آواز لرز گئی، آنکھوں سے رنہم پھر شروع ہو گئی۔ یہ خوشی کی برکھائی تھی لیکن ہوی کچھ بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

”شعاع! کیا بات ہے مجھے بھی تو کچھ بتاؤ؟“

جواب میں شعاع نے ساری بات بتادی تو ہوی سر ہٹا کر رہ گیا۔

”یا خدا! کیسے بزرگ ہیں ہم لوگوں کے۔ اتنی بڑی حقیقت ہم لوگوں سے کیوں پوشیدہ رکھی گئی۔ لیکن اب

حوالہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم یہاں کیسے آئیں اور علیہ وہاں کیسے پہنچی۔“

ہوی کو حیرت ہو رہی تھی یہ راز جان کر واقعی وہ لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اگلے ہی فلمی سی پچویشن تھی۔

”یہ مت پوچھیں ہوی! کہ میں یہاں کس طرح پہنچی۔ وادی پر خار کو میں نے برہنہ پا عبور کیا ہے ہوی!



”میری روح زخمِ زخم ہے کس طرح بتاؤں آپ کو۔“

اور پھر شعاع نے اپنا اذیت ناک سفر شروع سے آخر تک ساڈالا۔ گزرنے ہوئے اذیت ناک وقت کا ایک ایک لمحہ دل میں تیر بن کر پیوست ہوتا رہا۔ اس نے اپنے اوپر گزرنے والی ہر واردات کو ہوی کے گوشِ گزار کر دیا۔ اس وقت یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ یہ وہی ہوی ہے جس نے پل پل اس کو تڑپایا ہے۔

”تو ہوی یہ ہے میرے اپنے گھر سے عیسر بھیا کے گھر تک آنے کی کہانی!“

شعاع نے ترجمہ دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے کہا تو ہوی نے اس کے ہاتھ جھٹکے سے چھوڑ دیے اور کھڑا ہو گیا۔ غصے سے اس کا چہرہ اپ گیا۔ شعاع ساری جان سے کانپ نہی۔

”خدا کی قسم ہوی میں، میں!“

”ہاں، ہاں مانا کہ تم بے قصور ہو پارسا ہو مگر دوسروں کو تو تم نے ذلیل سمجھانا، دوسروں کے ظرف کو بھی آزمایا ہوتا گھر پلٹ کر آتے تو یہ تو خدا کا شکر ہے کہ اچھے لوگوں تک اللہ نے پہنچا دیا ورنہ“

ہوی کو ایک دم ہی غصہ آ گیا غصے میں اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی۔

”درست کہہ رہے ہیں ہوی آپ، یہ خدا کی ذات ہی ہے جو حقیقت جانتا ہے۔ اور اسی خدا نے ہر جگہ میری عزت رکھی ہے۔ یہاں خدا نے میری عزت یوں رکھی کہ فرشتہ صفت لوگوں تک پہنچا دیا۔ اور وہاں میری عزت یوں رکھی کہ میری عزت کا بھرم رکھنے کے لیے میری بہن کو خدا نے بھیج دیا۔ خدا ہی سب کی عزتوں کا نگہبان ہے ہوی! ورنہ اب آپ جو اس قدر خفا ہو رہے ہیں۔ میں اگر لوٹ کر گھر جاتی تو سب سے زیادہ سنگ باری آپ اور آپ کی امی کرتیں مجھ پر اور پارسا ہوتے ہوئے بھی میرے روبرو کر جیتیں مگر تم نہیں۔ وہ میں ہی جانتی ہوں۔ اور اس خوف سے میں گھر لوٹ کر نہیں گئی کیونکہ مجھے اپنی عزت اس کھوکھلی پناہ گاہ سے زیادہ عزیز تھی جو آپ لوگ بعد میں مجھے دیتے۔ مجھے در بدر ہونا منظور تھا۔ راہوں کی خاک ہونا قبول تھا۔ مگر آپ لوگوں کی نظروں میں گرنا تو اور انہیں تھا۔ مجھے یقین تھا۔ مجھے سب معاف کر دیں گے۔ سب کو میری بے گناہی پر اعتبار آ جائے گا۔ مگر آپ کو اور آنٹی سیدہ کو مطمئن کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں پل پل کی موت برداشت نہیں کر سکتی تھی ہوی! اسی لیے۔ اسی لیے موت کو گٹے لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ گھر سے ملنے والی زندگی سے کہیں بہتر موت تھی۔ مگر میں اپنے خدائے پاک کا شکر کیونکر ادا کروں کہ اس نے ہر جگہ مجھ گناہ گار کی لاج رکھی۔ یہاں آکر۔ مجھے محبت اور عزت ملی کہ مجھے زندگی پھر سے اچھی لگنے لگی۔ یہاں ہر شے کی کی پوری ہو گئی۔ مجھے اب بھی واہیں نہیں جانا۔ یہاں میری ماں ہے، بھائی ہیں، بہنیں ہیں اور نہ ہی آپ مجھے ساتھ لے جانے کو کہیں گے۔“

شعاع مکمل طور پر خفا ہو گئی تھی۔ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے آنسوؤں کی موسلا دھار بارش میں بھیگ رہی تھی۔ ہوی نادم سا ہو گیا، وہ اس سے بدگمان کب تھا۔ وہ تو اس کے مل جانے کی خوشی میں اس کی بڑی سے بڑی خطا بھی معاف کرنے کو تیار تھا۔ اور اب تو وہ بالکل بے خطا تھی۔ شعاع کے آخری جملے نے اسے خاصا محفوظ کیا تھا۔ وہ مسکرا کر اسے روتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ باہر جانے لگی تو ہوی نے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”میرے علاوہ تمہیں یہاں سے لے کر جانے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ شعاع فرمانِ صلب!“ وہ شونخ ہونے لگا۔

”چھوڑ دیں میرے ہاتھ!“ شعاع بری طرح ناراض ہو گئی تھی۔

”کیوں بھی کوئی سراملا ایک دوسرے کا؟“ ”عیسر ہوی کو خوش دیکھ کر بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔“

”ایک نہیں کئی سرے ملے ہیں بھائی!“ ہوی نے مسکرا کر کہا اور کن اکھیوں سے شعاع کو دیکھا جو بیٹکی لیں کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ہوی نے عیسر کو مختصر اسب کچھ بتا دیا تو عیسر نے بے یقینی سے شعاع کو دیکھا۔

”بڑی حیرت اور خوشی کی بات ہے۔ بہت بہت مہنگے ہو شعاع“ دیکھا میں کہتا تھا ناں کہ اللہ کی رحمت سے واپس نہیں ہونا چاہیے، جنہیں خوشیوں بھرا یہ ملن مبارک ہو شعاع!“ عیسر کو بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ اس نے بڑھ کر شعاع کے سر پر ہاتھ رکھ کر مسرت سے لبریز آواز میں کہا تو شعاع نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”عیسر بھیا آپ۔ آپ مجھ سے بدگمان تو نہیں۔ میں نے آپ لوگوں سے جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔ خان بانی نے جو آپ سے کہا۔ وہ خود سے کہا تھا۔ آپ مجھ سے بدگمان مت ہوئے گا۔“

”ارے شعاع میری بہن۔ تم اس گھر میں ایک بہن کی حیثیت سے داخل ہوئی تھیں۔ اور بھائی بہنوں کو اپنی غیرت کی پناہ گاہ میں رکھتے ہیں۔ ان سے بدگمان نہیں ہوتے۔ میں نے کبھی شرمہ، ہنرہ اور تم میں کوئی فرق نہیں سمجھا میری نظروں میں تمہاری وہی عزت ہے، جو پہلے تھی۔ اور دل میں وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔“ عیسر نے بے خلوص سے کہا۔

”مت دو بھائی! ان کو اتنی محبتیں میرے ساتھ جانے سے پہلے ہی انکار کر چکی ہیں۔“ ہوی نے شونخی سے شعاع کو دیکھا۔ جو عیسر کے پیچھے ہوئی جا رہی تھی۔

”ہاں تو بہت اچھا کیا۔ وہ تمہارے اکیلے کے ساتھ کیوں جائے۔ کوئی سوچ پاس اپنے خفائی لے کر آؤ پھر ہم بھیجیں گے اپنی بہن کو تمہارے ساتھ۔ کیوں شعاع ٹھیک کہا ہے ناں میں نے۔“

”ہی!“ شعاع عیسر کا مطلب سمجھ بغیر بولی مگر جب بات سمجھ میں آئی تو وہ وہاں ایک پل بھی ٹھہرنے کی عیسر اور ہوی خوش دلی سے مسکرا دیے۔

شعاع کو نئی زندگی ملی تھی وہ تو آڑی آڑی بھر رہی تھی۔

اس نے بے شمار شکرانے کے بعد بے ادا۔۔۔ کیسے تھے، مگر وہ مطمئن نہیں تھی کہ خدا کا شکر ادا نہیں کر پارہی تھی، وہ تو سوچا کرتی تھی کہ بس یہاں ہی مرنا جانا ہے لیکن خدا کی ذات کبھی اپنے بندوں کو واپس نہیں کرتی۔ ہوی تو اس قدر خوش تھا کہ وہ جلدی سے واپس جانا چاہتا تھا مگر یہاں اتنے دن لگ گئے اور پتا بھی نہیں چلا اس حقیقت کے کھل جانے پر سب گھروالے خوش تھے۔ اسی لیے شعاع صلبہ ہوی کی تصویر کو بڑے غور غور سے دیکھا کرتی تھیں۔ پتا ہے ہوی بھیا یہ۔“

”بھابھی جان پلیر“ رضوانہ بھابھی کچھ بتانے لگی تھیں کہ شعاع شرما کر وہاں سے اٹھ گئی۔ اب تو شادی کے ہنگامے بھی سرد پڑ چکے تھے، اور ہوی کو آئے دن بھی کافی ہو گئے تھے اگلے روز ہوی کو واپس جانا تھا۔ شعاع اور اس ہو گئی۔ اس کا دل ساتھ جانے کو چل گیا۔ سب کتنا یاد آنے لگے تھے۔ خصوصاً وہ علینہ سے ملنے کو بے چین ہو گئی تھی۔

لجی۔ سب سے ملنے کو بے چین ہو رہی تھی۔

”کرنا ہوں تمہارے بھیا سے بات کہ کب زخمت کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔“

”ہومی پلیر! ایسی بات نہ کریں، آپ کو اندازہ ہی نہیں۔ میں گھر جانے کو کتنی بے قرار ہوں۔“ وہ زچ ہو رہی تو ہومی ہنس پڑا۔

”اور تمہیں بھی اندازہ نہیں میں تمہیں گھر لے جانے کو کتنا بے چین ہوں۔“

وہ بھی اس کے انداز میں یولا تو اس کی حجاب آلودی مسکراہٹ کی روشنی ہومی کے اطراف میں پھیلنے لگی۔



ہومی واپس آیا تو بے حد خوش تھا، اس کے چہرے پر ان کی خوشیوں کا عکس لہرا رہا تھا، سب حیران تھے۔

”بھائی صاحب یہ پکڑ کیا ہے؟ آپ کے چہرے پر گلاب کیوں کھلے جا رہے ہیں۔“ اشعر نے غور سے

ہومی کی طرف دیکھا۔

”کیوں جل گئے۔“ ہومی مسکرایا۔

”جل کیوں گئے یا راجھا تمہیں دائمی خوشیاں نصیب کرے۔ ہم تو ترس گئے تھے تمہارے چہرے پر زندگی

پھر پھر مسکراہٹ دیکھنے کے لیے، لیکن وجہ بھی تو معلوم ہو کہ کون سا قارون کا خزانہ کچھ کر آئے ہو عیس کے پاس۔“

”ایک لڑکی دیکھ کر آیا ہوں عیس کے پاس۔“

ہومی دلکشی سے مسکرایا تو اشعر اچھل پڑا۔

”لڑکی۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟ میرا تو خیال ہے کہ دنیا کی حسین ترین لڑکی بھی شعاع کا مقابلہ نہیں کر

سکتی۔“ اشعر اس لڑکی کے بارے میں جاننے کو بے تاب ہو گیا جس نے

ہومی کو شعاع سے ہٹا کر اپنی طرف کر لی تھی۔

”دھیرج میرے یاد دہیرج۔ بتاتا ہوں۔ تھوڑا سا انجوائے تو کرنے دو۔ مجھے خوش ہونے دو۔ جی چاہتا

ہوئی سے اچھلوں کو دوں۔“ قہقہہ لگاؤں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں کس قدر خوش ہوں، جی چاہتا ہے کہ۔“

ہومی خوشی سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اشعر اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

”بس کرو بھائی! حالت تو تمہاری ویسے ہی مشکوک ہو رہی ہے۔ اب قہقہہ لگانے مت شروع ہو جانا۔ گھر

لے پاگل خانے چھوڑ آئیں گے۔“

”یار اشعر! جو خبر میرے پاس ہے ناں۔ وہ واقعی پاگل کر دینے والی ہے۔“ ہومی نے اشعر کو گھما ڈالا۔

”اب صاحب میرے خیال میں یہ خبر تم اپنے تک ہی رہنے دو یہ پاگل پن تم پر ہی سوٹ کر رہا ہے۔“

”اچھا تمہاری مرضی۔۔۔ اوہیلو علینہ کیسی ہو؟“

ہومی نے اشعر کو جواب دے کر کوریڈور سے گزرتی علینہ کو پکارا تو وہ پریشان سی اس کی طرف آ گئی۔

”ہومی! تو میرا وہم یقین میں بدل گیا ہے کہ تم یقیناً ٹھک گئے ہو، یہ شعاع ہے علینہ کب سے ہو

ادب اشعر واقعی پریشان ہونے لگا۔

”پوچھ لو علینہ سے۔ اس کا نام شعاع نہیں علینہ ہے، اور یہ شعاع ہے بھی نہیں کیوں علینہ؟“ ہومی نے

لئے علینہ کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

”ہومی! اب تو آپ مجھ سے خفا یا بدگمان نہیں ہیں۔“ وہی ابھی ہوئی نظروں سے ہومی کو دیکھ رہی تھی۔

”ہوں۔ بہت زیادہ خفا ہوں۔“ ہومی بھی اترانے لگا۔

”مگر کس بات پر؟“ اس کی آواز ہلکتی لگی۔

”اس بات پر کہ تم میرے ساتھ نہیں چل رہی ہیں۔“ ہومی نے۔۔۔ کہا تو شعاع نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

”میں دوسری بات کر رہی ہوں ہومی۔“ اس نے نظریں پڑا لیں۔

”نہیں شعاع! اُس روز بھی مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہوا تھا۔ اور نہ میں تم سے سے ناراض تھا جس تمہاری

حماقت پر غصہ آیا تھا کہ تم نے اتنی بڑی حماقت کر کیسے لی۔“ ہومی نے صاف گوئی سے کہا۔

”ایک بات پوچھوں ہومی۔“

”جناب! ایک نہیں بے شمار باتیں کریں اور پوچھیں۔ وہ بڑا فراخ دل بنا ہوا تھا۔“

”آپ کے رویے میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ اس کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔“

شعاع کی بات پر ایک دم ایک تاریک ساسا یہ ہومی کے چہرے پر لہرا گیا۔

”یہ قانون فرط ہے شعاع کہ زمین پر جو لوگ اکڑ کر چلتے ہیں۔ وہ اسی زمین پر اس طرح منہ کے بل

گرتے ہیں کہ ان کی ہیبت ہی بدل جاتی ہے۔“

میں ہی نہیں شعاع! گھر چل کر دیکھو، دنیا ہی بدل گئی ہے۔“ ہومی ہلکتی خوردہ سی آواز میں بولا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا اس بات سے؟“ وہ بالکل نہیں سمجھ پائی، البتہ ہومی کے اس انداز سے پریشان

ضرور ہو گئی۔

”مطلب یہ کہ شعاع میں اور امی جان تمہیں جس نا کردہ گناہ کی سزا دیا کرتے تھے۔ وہی سزا یعنی کو بھی

ملتی رہی ہے۔“

”یعنی۔۔۔۔۔ یہ کون ہے عینی؟“ یہ تاہم بالکل نیا تھا شعاع کے لیے اس لیے وہ چونک گئی اس نام پر۔

”شعاع! اچھا جان فرمانے نے اپنی پسند کی شادی جو عرف عام میں ان کی خطا ٹھہری تھی علی الاعلان کی تھی

اور ملک بدری کے سزاوار قرار دیے گئے تھے۔ وہ خطا میرے ابو نے بھی خفیہ طور پر کر ڈالی تھی۔ یہ شادی محبت کا

نتیجہ تھی یا ہمدردی میں کی گئی تھی، بہر حال اللہ تعالیٰ نے ہمیں سبق دینا تھا شاید یعنی ابو کی دوسری بیٹی ہے بڑی پیاری

لڑکی ہے۔“

آئی سیدہ کا کیاری ایکشن تھا؟“ شعاع کی نظروں میں سیدہ بیگم کا خوفناک سا سراپا گھوم گیا۔ جن کی

نظروں میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔

”شعاع! جب انسان عرش سے فرش پر گرتا ہے ناں۔ تو کچھ دیر کے لیے تو گھٹا نوپ اندھرے میں یہ بی

سمجھتا ہے کہ بس دنیا ختم ہو گئی، مگر آہستہ آہستہ شعور کی روشنی میں آتا ہے تو اپنی اوقات یاد آ جاتی ہے اور جب

انسان کو اپنی اوقات یاد آ جاتی ہے تو خود ہی سدھر جاتا ہے، چل کر دیکھنا کتنا بدل گئی ہیں امی جان۔“ ہومی کی آواز

میں عجیب سی آوازی اور افسردگی تھی۔

”اچھا چھوڑیں اس بات کو۔۔۔ یہ بتائیں، مجھے لینے کب آئیں گے آپ لوگ۔“

اب کی بار یہ بات کہتے ہوئے وہ خود ہی جھجک سی گئی، مگر اب پوچھنا تو تھا ہی وہ اپنے گھر جانے کے بے

”جی خالہ جانی! اے! خود دل کرتا یا ہوں شعاع سے۔“

Scanned By Wagar

”جی۔۔۔۔ جی بھیا! ہمیں ضرور بتائیں، کیا بات ہے، ہم سب آپ کی تبدیلی پر حیران اور پریشان ہیں۔“  
صدف نے شرجیل کی بات کو آگے بڑھایا۔

حارث کے ذمہ خاصے گھرے تھے۔ اسی لیے وہ اب تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا تھا کہ چل کر پکی تسلی کرادیتا۔ جو ہوش میں آتے ہی حارث حارث پکارنے لگتے تھے۔

”شاہ صاحب! آپ کا بیٹا حارث بالکل ٹھیک ہے معمولی زخم آئے ہیں۔ وہ چل کر آپ کے پاس نہیں منتے آپ جلدی سے صحت یاب ہو جائیے۔ ہم آپ کو ان کے پاس لے چلیں گے۔“ ڈاکٹر صفر یہ بات بار بار لہ شاہ کو سمجھا چکے تھے۔ مگر ان کو کسی ہل چلن نہیں تھا۔

”نورین! میری بہن! میری ساری خطائیں معاف کر دو۔ لیکن مجھے بے حارث کے پاس لے چلو۔ زندہ ہے ناں! میں نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں مگر بہنوں کے دل تو بڑے ہوتے ہیں ناں، تم رے گناہ معاف کر دو اور حارث کو ڈھونڈ لاؤ۔“ عالم شاہ نے قریب بیٹھی نورین کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”بھائی جی! حارث اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کی میری بات پر اعتبار نہیں آ رہا۔ آپ نے میرے ساتھ پہلے ہی بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ اب اور نہ کریں۔ اس طرح معافیاں مانگ کر۔“ نورین نے ناکے ہاتھ تمام لیے۔

”اچھا تو میں یقین کر لوں کہ حارث ٹھیک ہے۔ تم کہہ رہی ہو اس لیے۔“ عالم شاہ نے بے یقین سے لہجے لہا لہا۔

”جی بھائی جی! کیوں نہیں۔۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو میں اسے دیکھ کر آئی ہوں۔ آپ ٹھیک ہو جائیں تو بد دیکھ آئے گا۔“

میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب! میں ٹھیک ہوں اب لے چلیے مجھے میرے بیٹے کے پاس۔“ اس نے عالم شاہ صرف ایک باپ تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص ناسی ہیں ایک جابر اور سفاک دوسروں کے دکھوں بٹنے والا دوسروں کو رلانے والا ظالم سا انسان ہے۔

”ڈاکٹر! اگر کوئی حرج نہ ہو تو لے چلیے ان کو حارث کے کمرے ہیں۔“ نورین کو عالم شاہ پر ترس آ رہا تھا۔

”بیگم نورین شہزاد! آپ سمجھ دار پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ آپ کے بھائی ہارٹ کے مریض ہیں اور حارث عاں کا بڑا جذباتی رشتہ ہے۔ بیٹے کو بیٹیوں میں جکڑا دیکھ کر کہیں ان کی حالت خراب نہ ہو جائے۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں ان کو بھلاتی رہوں گی۔“ پھر گزرتا ہوا ہر ہل حارث کے زخم بھرتا گیا اور عالم شاہ منت یاب ہو گئے۔

اس عرصے میں عالم شاہ کئی بار حارث کو دیکھ چکے تھے اور ہر بار اسے چھو کر دیکھتے محسوس کرتے۔

”ابا جی! میں بالکل ٹھیک ہوں اور بالکل ٹھیک جاؤں گا، اگر آپ مجھے اس بات کا یقین دلائیں گے کہ آپ لگائے ہیں۔“ حارث نے ان کے ہاتھ تمام لیے کیونکہ وہ بڑے بھائیوں کے عزائم بھی دیکھ چکا تھا۔

”او بیٹا جی! وہ تو دل ہی ختم ہو گیا جس میں ایک ذلیل ظالم جابر عالم شاہ زندہ تھا۔ وہ دل ختم ہو گیا۔ بیٹا جی ہوا ایک پیار دل ہے جواب صرف محبت کرے گا۔ ہر ایک سے، ہر ایک سے معافیاں مانگے گا، اور پتا ہے میں نے تمہاری پچھو سے بھی معافی مانگ لی ہے، اور اُس نے مجھے معاف بھی کر دیا ہے۔“ عالم شاہ بچوں کی طرح اُل ہو کر حارث کو تارہے تھے۔

”اچھا تو پھر ابا جی آپ غیاث بھائی اور فیاض بھائی کو منع کر دیں کہ وہ کوئی ایسی کارروائی نہ کریں کہ نفرتوں

”خدا یا! تیرا شکر ہے، تو نے فرمان کی تلاش کی لاج رکھ لی۔ وہ نجانے کہاں کہاں بیٹی کی تلاش میں خاک چھان رہے ہوں گے اور بیٹی مگر میں موجود ہے۔ رات دن کی جانے والی بے شمار دعاؤں کا شکر ہے۔ یہ خوشخبری خدا کا شکر کس طرح ادا کیا جائے کہ اس نے ہماری دونوں بیٹیوں کو مختلف مقامات پر رکھا مگر اپنی پناہ میں رکھا یا اللہ اب کہیں سے فرمان کو واپس لے، بہت بھگ لیا انہوں نے۔“ عابی خدا کے حضور شکرانہ ادا کر کے فرمان کی واپسی کی دعا مانگ رہی تھیں۔ راشو کے لیے یہ انکشاف نیا اور تکلیف دہ ضرور تھا، مگر اس نے فوری طور پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بس خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ جانے کیوں اندر اداسی ویران سی شام اتر آئی تھی۔ اور اس اداس شام کا دھندلا پن راشو کے وجہ چہرے پر چھا گیا تھا جیسے اشعر نے بڑی اچھی طرح سمجھ لیا تھا، مگر وہ بھی فی الحال چپ تھا۔ وہ راشو کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

”ہائے میری شمع کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کی ہیں، میری بیٹی نے، ہوئی تم اسے زبردستی ساتھ لے کر آ جاتے۔ علینہ۔۔۔۔ اشعر جاو علینہ کو لے کر آؤ، میں اپنی بیٹی کو محسوس کرنا چاہتی ہوں۔“

عابی پھر خود ہی علینہ سے ملنے کے لیے اٹھیں۔ وہ تو خوشی سے بے قابو ہوئی جاری تھیں۔ وہ اسی وقت شارع اور علینہ سے ملنا چاہتی تھیں۔

”نہیں خالد جانی ابھی علینہ کو کچھ مت بتائیے جب تک چچا جان نہیں آ جاتے۔ ہمیں یہ بات اپنے تک رکھنی ہے علینہ کے سلسلے میں ہمیں ڈاکٹر طاہرہ سے ملنا چاہیے تاکہ درست صورت حال سامنے آ سکے۔“

”تو ہم آج ہی ڈاکٹر طاہرہ کے پاس جائیں گے۔ چلو اشعر گاڑی نکالو۔“

عابی ہر کام آج ہی نمٹا لینا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ نرس راشدہ کا ایڈریس وغیرہ مل گیا تو فرمان تک رسائی ممکن ہو سکتی تھی، اور وہ چاہتی تھیں کہ جس بیٹی کی تلاش میں انہوں نے خود کو گم کر دیا اسے جلدی سے آ کر دیکھ لیں۔ اشعر ان کے کہنے پر اٹھ گیا۔

”راشو بیٹا! تم بڑے خاموش ہو تمہیں اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی۔“ عابی نے راشو سے پوچھا لیا تو وہ نظر چرا کر رہ گیا۔

”کچھ نہیں پچھو میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمارا خاندان دنیا کا عجیب ترین خاندان ہے کیسے کیسے راز چھپائے ہوئے ہیں آپ بڑوں نے ہم لوگوں سے کیسے کیسے انکشافات ہو رہے ہیں، ابھی نجانے کتنے اور ہوں گے۔“ راشو کے لہجے میں خاصی بے زاری سی تھی جسے ہوی اور عابی نے صاف محسوس کیا۔

”یہ زندگی سے بیٹا! یہاں بہت سے ایسے انکشافات ہوتے ہیں اور فرمان کے ساتھ تو یہ بد نصیبی رہی کہ کوئی خوش ان کو نہیں ملی، من پسند کی شادی کرنے کے باوجود ان کو خوشی نہیں ملی۔۔۔۔۔ اولاد ہوئی تو وہ چمکڑ گئی یہ ساری باتیں ہمارے علم میں تھیں مگر۔“

”گستاخی معاف پچھو! اگر سب کچھ آپ کے علم میں تھا تو مجھے لاعلم کیوں رکھا گیا۔ میری تو زندگی کا معاملہ تھا۔ آپ کو کاہیے تھا، مجھے بتا دیتیں اصل صورت حال۔ اب اتنے بھی بچے نہیں تھے کہ سمجھ نہ سکتے۔ میرے جذبات کو کھلونا کیوں بنایا آپ لوگوں نے۔“ راشو کو کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس سے کیا بات کر رہا ہے۔ اس نے یہ کہا

اور تیزی سے باہر نکل گیا۔



کی گرتی ہوئی دیوار پھر کھڑی ہو جائے۔“

حادث کو ہاشم نے ساری صورت حال بتادی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب کوئی بد مزگی پیدا ہو، حادث کی بات پر گویا بھولا ہوا واقعہ عالم شاہ کو یاد آ گیا، اور ساتھ ہی شہباز علی کا سراپا ان کی نظروں میں گھوم گیا، اور ایک بار پھر رگوں میں خون گردش کرنے لگا۔ بیمار دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

”اباجی! اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندگی دی۔ آپ کے بیٹے کو زندگی دی تو کیا آپ اس خدا کی خوشنودی کے لیے دوسروں کی اتنی چھوٹی سی خطا معاف نہیں کر سکتے۔ اس لیے اباجی کہ اللہ کو بھی ان لوگوں سے پیار ہے جو اس کے بندوں سے پیار کرتے ہیں۔ اباجی اگر آپ نے ایسی ویسی کوئی بات کی تو۔۔۔ تو۔“

حادث ان کی حالت سمجھ رہا تھا۔ وہ ان سے ناراض ہو گیا تو اتنی دیر میں عالم شاہ بھی آدمیت کے چکر سے نکل کر انسانیت کے خول میں آ گئے تھے۔

”بیٹا جی! بہت ہو گئیں نفرتیں، اب تو سب سے محبتیں ہوں گی۔ اللہ پاک مجھے معاف کرے، میں نے سب کو معاف کیا۔“ عالم شاہ نے خلوص دل سے خدا سے توبہ کی اور حادث کو ساتھ لگا لیا۔

اسی وقت نورین، حمیرا اور شہزاد کے ساتھ اندر داخل ہوئیں تو عالم شاہ نے چہ اچھا لیا۔ وہ حمیرا سے نظریں نہیں ملا سکتے تھے۔

”عالم شاہ! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔“ حمیرا براہ راست عالم شاہ سے مخاطب ہوئیں تو وہ خاموش نظروں سے دیکھ کر رہ گئے۔

”بھائی جی! حمیرا اباجی نے کچھ پوچھا ہے آپ سے کیا آپ نے ابھی تک ان کو معاف نہیں کیا۔“

”نہیں۔۔۔ نورین ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تو خود حمیرا کا گناہ گار ہوں۔ میں تو ان سے اتنا نام ہوں کہ نظریں نہیں ملا سکتا۔“ عالم شاہ کی ندامت سے لہر یز آواز ابھری۔

”چلیے بھائی جی! سارے گلے شکوے گھر جا کر کریں گے تیار ہو جائیں ہم گھر جائیں گے۔ حادث کو بھی ڈاکٹر نے چھٹی دے دی ہے۔“

شہزاد نے بڑھ کر عالم شاہ کو سہارا دیا تو وہ کسی بچے کی طرح ان سے پٹ گئے۔

شیراز کی روز سے شہباز علی کو سمجھا رہا تھا کیا کچن نہیں کڑا لے تھے اس نے مگر وہ ہار ماننے کو تیار نہ تھے اس روز نجانے کیوں وہ آپ ہی مان گئے۔

”تو اباجی! آپ شہر چلیں گے ناں؟“ شیراز خوش ہو گیا۔

”ہاں تم گاڑی نکالو میں آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر شہباز علی باہر نکل گئے، تھوڑی دیر بعد رفیق گھر آیا ہوا آیا۔

”باؤ جی وہ بڑے باؤ جی۔“



نہیں میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا یہ۔۔۔ یہ عالم شاہ اب بازی جیت لینا چاہتا ہے، میری اولاد کو میرے خلاف درغلا کر مجھے نچا کرنا چاہتا ہے میں۔ میں عالم شاہ سے معافی مانگ لوں یا اس کے پاؤں پڑوں ہرگز نہیں میں اس سے مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔

سب لوگ میرے دشمن میں۔ مجھے نچا دکھانا چاہتے ہیں، میری اولاد بھی مجھے نچا دکھانا چاہتی ہے۔ عالم شاہ اب پولیس میں میرے اوپر مقدمہ کرے گا وہ۔۔۔ وہ میرے ہاتھوں میں پھنسیاں دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو۔۔۔ تو میرے پاس کیا رہے گا۔ گاؤں والے کیا سمجھیں گے کہ میں اتنا بڑول ہوں، کمزور ہوں کہ۔۔۔ نہیں میں روپوش نہیں ہوں گا۔ کیا سوچ کر شیراز نے یہ بات مجھ سے کہی میری غیرت مر گئی ہے کہ میں اس دو ٹکے کے دشمن سے ہار مان جاؤں، چھپ جاؤں، سامنے تو آئے میں دیکھ لوں گا سب کو۔۔۔ ہونہر روپوش ہو جاؤں، پاگل ہو گیا ہے شیراز۔ سب پاگل ہیں اور سب مل کر مجھے بھی پاگل کرنا چاہتے ہیں۔ میں آگ لگا دوں گا سارے گاؤں کو، پھر کوئی میرا تمنا شادیکھنے کو۔۔۔ نہیں رہے گا۔ ہاں میں آگ لگا دوں گا۔“

مسلل سوچوں کھٹک اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے شہباز علی کو ذہنی طور پر اتنا ڈسٹرب کر دیا کہ انہوں نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ اور اب مسلسل وہ بلند آواز میں بولے جا رہے تھے۔ رشید کی اطلاع پر شیراز اندھا دھند جلی کی پمپلی طرف بھاگا جہاں شہباز علی نے خود کو بند کر لیا تھا۔

”اباجی دروازہ کھولیں ایسا مت کریں اباجی خدا کے لیے باہر آ جائیں۔ اگر آپ نے خود کو کچھ کر لیا تو۔۔۔ تو ہم کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔۔۔ شیراز نے دروازہ پینا۔

”میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے تم لوگوں نے مجھے دشمن کے سامنے نچا دکھا دیا ہے۔ میں عالم شاہ سے چھپ جاؤں، اس سے ہار مان لوں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ میری زمینوں پر قبضہ کر لے یہی چاہتے ہو ناں تم لوگ اس کی یہ جرات کہ مجھے وہ پولیس کے حوالے کرے، میرے اوپر مقدمہ چلائے۔ میں وہ وقت ہی آنے نہیں دوں گا جب پولیس میرے ہاتھوں میں پھنسیاں ڈالے گی۔ میں۔ میں۔“



بات نہیں تھی اسی لیے ان کو پرسکون ہونے کے انجمن دیے جا رہے تھے۔

”اباجی کو صرف عالم شاہ کی طرف سے خطرہ ہے کہ وہ ہمیں ان پر مقدمہ نہ کر دے اور۔۔۔“  
”نہیں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب عالم شاہ بدل چکا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ شہباز بھائی کا اندیشہ غلط ہے۔۔۔“

شہزاد کو یقین تھا کہ جب انسان ایک بار سیدھے راستے پر آ جاتا ہے تو پھر۔۔۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا اور عالم شاہ کا قول آئینے کی طرح شفاف ہو گیا تھا۔ دھل کر ہر بغض۔۔۔ ہر عناد سے پاک دل جس میں خدا اور رسول کا خوف تھا، اور احرام انسانیت تھا۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں ماموں جان، مگر غیث اور فیاض تو بھرے بیٹھے ہیں۔ قاسم بتا رہا تھا کہ وہ لوگ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔“ شیراز بھی خوف زدہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بات آگے بڑھے۔  
”دیکھا جائے گا جو بھی ہوگا۔“ شہزاد نے حارث اور شرین کو آتے دیکھ کر بات بدل دی۔



”ہونہہ اب بچتے کے لیے پاگل پن کا روپ دھار لیا ہے۔ بہرہ پیا کہیں کا۔“ فیاض نے اپنے ہاتھ پر مکہ مارا۔  
”پاگل بنے یا کچھ اور میں نے۔ اس شہباز کو ہرگز معاف نہیں کروں گا، ایسی سزا دوں گا کہ تمام عمر نہ جی سکے اور نہ مر سکے میں اسے قانون کے حوالے نہیں کروں گا وہ ہمارا مجرم ہے خود سزا دوں گا اور ایسی کہ زمانہ یاد کرے گا۔“

غیث اور فیاض اپنی طاقت کے غرور میں انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔ اور عالم شاہ جن کے دل میں خدا کا خوف اور رسول کے عشق کا نور پھیل چکا تھا۔ وہ عصر کی نماز کے بعد خاموش بیٹھے بیٹوں کی باتیں سنتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ نفرت کے انتقام کے ان پودوں کو خود انہوں نے سیچا ہے انہوں نے ہی بچپن سے اولاد کے دلوں میں محبت کے بجائے نفرت کے بیج بوئے تھے، اور پھر باقاعدہ آبیاری کی تھی، اب نفرت اور انتقام کے یہ پودے۔۔۔ تناور درخت بن چکے تھے تو ان درختوں کو کاٹنا ان کے لیے محال ہو رہا تھا۔ شعور اور آگہی کے جوراں ان پر منکشف ہوئے تھے، وہ چاہتے تھے ان کے بیٹے بھی اس نور سے فیض یاب ہو جائیں۔ مگر وہ خاموش تھے۔ کہ انتقام کا چڑھا ہوا پانی ذرا اترے تو وہ اپنی بات کریں۔

”اباجی کیا خیال ہے آپ کا، اب کیا کرنا ہے۔“ غیث ان کو خاموش پا کر ان کے قریب آ گیا، تو عالم شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے فیاض کو بھی بلا کر قریب بٹھالیا۔

”میرے بچو! میرا پنا خیال اس وقت ہوتا تھا جب میں کمری میں تھا۔ اس وقت میرا ہر عمل میرے نفس کے تابع تھا۔ لیکن بچو! اب میرا ہر عمل میرے مولائے حکم کے تابع ہے۔ اور میرے رب تعالیٰ نے بدلے لینے سے زیادہ معاف کرنے کو پسند فرمایا ہے۔ اور میں شہباز کو معاف کر چکا ہوں۔ اگر میرا بیٹا مر بھی جاتا تو میں اسے اپنے بیٹے کا خون معاف کر دیتا۔ میں تو خود شہباز کا قرض دار ہوں۔ مجھے معافی مانگنی ہے اس سے، اپنے گناہوں کا کچھ بلجو کم کرنا ہے۔ تو بہرے کو بیٹے معافی مانگ لو، اللہ تعالیٰ بڑا مغفور الرحیم ہے۔ انسان کی ہر خطا ہر کمزوری کو معاف کر دیتا ہے۔“

شہباز علی نے زور سے اپنے ہاتھ دیوار پر دے مارے تو شیراز، رشید کی مدد سے روشندان کے اوپر چڑھ گیا۔ اور اندر کے منظر نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ شہباز علی کے ہاتھ میں ماچس تھی، اور وہ کپڑے ایک جگہ جمع کر رہے تھے تاکہ آگ آسانی سے لگ سکے۔

”اباجی خدا کے واسطے ایسا کچھ مت کیجیے گا۔ ہم بازی جیت کر بھی ہار جائیں گے۔ عالم شاہ کوئی مقدمہ نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ حارث نے ساری بات سنیا لی ہے، اور پھر حارث بالکل ٹھیک ہو چکا ہے عالم شاہ بھی بدل چکا ہے۔ اباجی آپ بھی خود کو بدل لیں، آپ بھی سب کو معاف کر دیں۔ اور ان سے بھی معافی مانگ لیں۔ یونہی یہی انسانیت کی اصل اساس ہے۔“

”اچھا اب میں ان سے، اپنے دشمنوں سے معافیاں مانگتا پھروں، اس سے پہلے میں مر جانا بہتر سمجھتا ہوں اور خبردار جو کسی نے روکا مجھے۔“ شہباز علی پر جنوں سوار تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بولتے بھی جا رہے تھے، اور قریب تھا کہ وہ آگ لگاتے شیراز نے کمرے میں چھلانگ لگا دی، اور باپ کو قابو کرنے سے پہلے دروازہ کھول دیا تاکہ ملازم آ کر اسکی مدد کر سکیں۔ اب وہ باپ کو بازوؤں میں جکڑے گاڑی کی طرف لا رہا تھا۔ شہباز علی ہاتھوں سے نکلے جا رہے تھے۔ اور مسلسل بولے جا رہے تھے۔ ان کی ذہنی حالت نے شیراز کو بڑا پریشان کر دیا تھا۔ باپ کی یہ حالت تھی اور شیراز اکیلا۔ اس کا تو دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ شہباز علی کو ہوسٹل لے جانے کے بجائے شہزاد کے ہاں لے آیا تو سب ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ منزہ بیگم خود کو مجرم سمجھ رہی تھیں کہ اگر وہ ان کو چھوڑ کر نہ آتیں تو شاید ان کی یہ حالت نہ ہوتی۔

”میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ سب کو ختم کر دوں گا۔“ شہباز علی ہاتھوں سے نکلے جا رہے تھے۔  
”آپ کو کیا ہو گیا ہے شہباز ہوش میں آئیں، ساری عمر خود ساختہ پریشانیوں اور دشمنیوں میں گزار دی، اور اب، اب جو اس ہی کھود لیے ہیں خدا یا یہ سب کیا ہے۔“ منزہ بیگم ان کا ہاتھ پکڑ کر رو پڑیں۔  
”ہوش میں آئیں بھائی جی۔۔۔ اب تو دنیا ہی بدل گئی ہے، اب تو بڑے بڑے بے ہوش، ہوش میں آگئے ہیں۔ بھائی جی اور اب آپ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا ہے یا اللہ۔“ حمیرا بھائی کی حالت دیکھ کر بڑی طرح رونے لگیں۔

”حمیرا یہ کیا کر رہی ہیں، آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کریں، بھائی جی ٹھیک ہو جائیں گے، حوصلہ کریں وہ صرف ذہنی کشمکش کا شکار ہیں دعا کریں، شہباز بھائی ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ۔“  
”ماموں جان بالکل درست کہہ رہے ہیں پھوپھو! اباجی ٹینشن کا شکار ہیں۔ جب انسان کے خود ساختہ اصولوں کی عمارت اسی پر گرتی ہے تو اس کی حالت اباجی جیسی ہی ہو جاتی ہے۔ شیراز بھائی میں گاڑی نکالتا ہوں۔ ان کو ابھی ہوسٹل لے کر چلتے ہیں۔“ شہباز علی کو شیراز، ایاز اور شہزاد نے قابو کیا ہوا تھا۔ مگر ان پر عجیب ہڈیائی سی کیفیت طاری تھی، نورین خاموش نظروں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھیں جو ماضی میں ان کا طلبگار رہا تھا۔ اور۔۔۔۔۔ محض اس شخص کی وجہ سے ان کو گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ کیا ملا تھا آخر ان لوگوں کو اس طرح کی دشمنی سے۔

”خدا یا اس شخص کو بھی صحت عطا کر دے اور سیدھا راستہ دکھا دے جس طرح میرے بھائی کو سیدھی راہ دکھائی۔“ نورین نے صدقہ دل سے شہباز علی کے لیے دعا مانگی۔ شہباز علی کے دماغ میں خوفناک سوچیں متصادم تھیں وہ کسی صورت عالم شاہ سے شکست کھانا نہیں چاہتے تھے، ان کی بیماری ذہنی دباؤ کے سبب تھی۔ کوئی خاص

Scanned By Waqar Azeem Pakstani point



ہری سے وہ بہت مایوس ہوئی تھی۔

”کیوں کیا راشوا آپ نے ایسا جس دل میں رہتے ہیں اسے کیوں تڑپایا..... کیا قصو ہے میرا کہیں راشوا کو میری اصلیت تو پتا نہیں چلی گئی کہ میں شعاع نہیں علیہ ہوں۔ اُف میرے خدا! اگر ایسا ہوا تو میں ایک بلی بھی یہاں نہیں رہوں گی۔ مجھے خیرات میں ملی ہوئی محبت نہیں چاہیے۔ یا اللہ کیوں ہوا میرے ساتھ، میں نے کیا بگاڑا تھا کی کا۔ میری زندگی کے ساتھ یہ ڈراما کیوں ہوا۔ کیوں مجھے شعاع کی ہمشکل بنا دیا۔ جب سب کو پتا چلے گا کہ میں شعاع نہیں علیہ ہوں تو تو سب کچھ مجھ سے چھن جائے گا۔ راشوا میں سب کچھ کھو سکتی ہوں آپ کی محبت نہیں، میں مر جاؤں گی راشوا اگر آپ نے منہ موڑ لیا مجھ سے بدگمان ہوئے۔ آپ کی بدگمانی میری برداشت سے باہر ہے۔“

علیہ بستر پر پڑی مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ اس وقت اسے شدت سے کسی دوست کی ہمدردی کے شانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ جس پر سر رکھ کر وہ اپنا دل ہلکا کر سکے اسی وقت یعنی اندر داخل ہوئی تو علیہ جلدی سے اس سے لپٹ گئی۔ یعنی کی اس سے گہری دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے دل کی بات کہہ سن لیا کرتی تھیں۔

”ارے بھی ہوا کیا ہے، کیوں ہلکان ہو رہی ہو۔“

یعنی نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا تو جواب میں ہچکیوں کے درمیان اس نے ساری بات سنا دی۔

”اوہ تو یہ بات ہے میں..... سمجھی کہ پتا نہیں کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ ارے بھی اس وقت راشوا بھیا کو قد سیدہ آتی سے زبردست ڈانٹ پڑی تھی۔ اسی لیے شاید ان کا موڈ آف ہوگا۔ احسب ہوتم بھی حد ہو گئی بھلا راشوا بھیا تم سے کیوں ناراض ہونے لگے۔“

”تم سچ کہہ رہی ہو یعنی“ علیہ نے بے یقینی سے یعنی کو دیکھا۔

”تو بھی مجھے جھوٹ بول کر آپ سے انعام تو لینا انہیں تھا!“

یعنی نظریں چراتے ہوئے بولی، کیونکہ یہ سراسر جھوٹ تھا، اس نے تو علیہ کو مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ بولا تھا لیکن یعنی کا یہ جھوٹ زیادہ دیر راشوا کی پردہ داری نہ کر سکا۔ رات کو سب ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔ یاسر اور شرجی کی فرمائش پر علیہ کو کافی بنانا پڑی اب وہ سب کو تقسیم کر رہی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے وہ کپ لے کر راشوا کی طرف بڑھی۔ راشوا نے ایک نظر اس کی ہینکلی چکوں اور سو بے چہوں پر ڈالی۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھی کچھ بھی ہو وہ اس کی چاہت تھی مگر وہ پھر ختم ہو گیا۔ نجانے کیوں احساس تو ہیں ہونے لگا وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”سوری! مجھے اس وقت طلب نہیں۔“

گرم گرم کافی کا کپ علیہ کے ہاتھوں میں جھٹک پڑا ساتھ ہی آنکھوں کا پانا نہ بھی، وہ تو غنیمت ہوا کہ ٹی وی پر آنے والے دلچسپ پروگرام نے اس کی آبرودہ لگی، وہ آہستگی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اب اسے یعنی کی جھوٹی تسلی کا پتا چلا کہ اس نے صرف اس کا دل رکھنے کے لیے یہ جھوٹ بولا تھا۔ راشوا بدل گیا تھا۔ وہ اس سے کیوں بدگمان ہو گیا تھا۔

اس کا شدت سے جی چاہتا کہ راشوا سے اس کے رویے کی وجہ پوچھے اپنی خطا معلوم کرے مگر پھر اتنا آڑے آجاتی، جب اس کا کوئی قصور ہی نہیں تو پھر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ان دنوں اسے

راشوا نے تکیہ اٹھا کر دیوار پر..... دے مارا۔ سارے جذبات سرد پڑ گئے تھے، جب سے یہ بات پتا چلی تھی راشوا کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ نجانے کیوں اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ہر ایک سے وہ براہم سا تھا۔ سب سے غصہ آتا رہتا اسے، ہوئی مسکراتا تو اس کا جی چاہتا اس کی مسکراہٹ نوج لے۔ اس نے بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول کیا ہوا تھا۔ ورنہ تو اس زیادتی پر اس کا دل کیا کچھ کر گزرنے کو نہیں چاہتا تھا شعاع کو پا کر وہ خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھنے لگا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ خوشیوں کی اس مضبوط عمارت میں ایسی دراڑ پڑ جائے گی کہ وہ اسے منہ بھی نہیں سکے گا کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ راشوا..... رے کتنا ٹوٹ گیا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا کہیں باہر جانا چاہتا تھا۔ وہ چاہی اٹھا کر باہر آیا تو سامنے سے علیہ صدف کے ساتھ آگئی۔ علیہ اسے دیکھتے ہی اپنا آنچل درست کرنے لگی۔ صدف شوق سے مسکراتی لگی۔ مگر راشوا نے علیہ پر جو نظر ڈالی تھی۔ وہ بہت عجیب تھی۔ اجنبیت غم۔ کچھ غصہ کچھ۔ شکایت نجانے کیا کچھ تھا۔ اس نظر میں، علیہ کے اندر تک اتر گئی..... وہ کب راشوا کی ایسی نظروں کی عادی تھی۔ وہ کچھ بھی سی گئی۔

”بھیا، آپ کہیں جا رہے ہیں۔“

”ہاں۔“ راشوا نے مختصر جواب دیا اور آگے بڑھنے لگا۔

”تو پھر ہمیں بھی ساتھ لے جائیے، مجھے اور شعاع باجی کو کچھ شاپنگ کرنا ہے۔“

”شعاع۔“ راشوا نے پیچھے مڑ کر پھر شعاع کو ویسی ہی عجیب نظروں سے دیکھا تو وہ سر تاپا کانپ اٹھی۔ اس کے ہاتھوں میں نئی اتارنے لگی آنکھوں کے گوشوں کو اس نے ہمشکل ہینکلی۔

”کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ، میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“

راشوا نے رکھائی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ دونوں حیران تھیں، یہ وہی راشوا ہے جس کی آنکھیں شعاع کو دیکھتے ہی چمک جایا کرتی تھیں۔ اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ شعاع اس کے ساتھ کہیں باہر جائے، آج وہ خود تیارگی اور وہ نظر انداز کر کے چلا گیا تھا۔

”بائی داوے آپ دونوں کسی رسم قل سے آرہی ہیں یا جا رہی ہیں۔“ شرجی نے ان دونوں کے بنے ہوئے منہ دیکھ کر کہا۔

”یہ راشوا بھیا کو آج کل کیا ہوا ہے۔“ صدف کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

”پتا نہیں، یعنی میں نے نہیں کا تا۔“ شرجی جلدی سے بری الذمہ ہو گیا۔

”اچھا یہ کیا جو نہیں کا تا تمہارا سے کاٹنے کے تو ابھی انجکشن بھی ایجا نہیں ہوئے۔“

”چلو تو تم کاٹ لیا کرو، تمہارا سے کاٹنے کے تو انجکشن ایجا ہو چکے ہیں۔“ شرجی نے پلٹ کر یاسر کا قرض چکایا۔ ”ویسے شعاع یوں آنکھوں پر جبر نہ کریں رونا آ رہا ہے۔ تو اچھے بچوں کی طرح رو لیں۔ اس سے آپ کو فائدہ ہوں گے۔ ایک آپ کا دل ہلکا ہو جائے گا۔ اور دوسرا میرا دل ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس وقت جب آپ گپا..... رومال شرجی کے منہ پر پھینکیں گی اور، اور۔“

”یاسر پلیز۔“ علیہ سے وہاں نہ کا گیا وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ راشوا کا رویہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ تو راشوا کی محبت پا کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ زندگی کی محرمیاں تک بھول گئی تھیں۔ اس نے تو یہ بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں یا کبھی اسے یہاں سے جانا پڑا تو اس کا کیا حال ہوگا۔ مگر راشوا کی



شدت سے طاہرہ آفریدی تھیں۔ جو آج کل اپنے بیٹوں کے پاس امریکہ گئی ہوئی تھیں۔

”نہیں میں میں علیہ کو دھوکا نہیں دے سکتا وہ معصوم سمجھتی ہے میں اسے چاہتا ہوں مگر میں تو اسے شعاع سمجھ کر چاہتا رہا ہوں یہ غلط بات ہے میں علیہ کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا میں علیہ سے بھی شادی نہیں کروں گا۔ اور شعاع کو ہوی کا ہوتا بھی نہیں دیکھ سکوں گا نہیں میں اپنے دل کا درد چھپائے بیٹھ کے لئے ملک چھوڑ جاؤں گا، میں خود فریبی کی زندگی نہیں گزار سکتا میں میں انکار کر دوں گا نہ میں خود دھوکے میں رہنا چاہتا ہوں نہ اس معصوم لڑکی کو دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ راشونے دل مضبوط کر کے فیصلہ کر لیا تو اس کا خیال تھا کہ وہ مطمئن ہو جائے گا مگر یہ فیصلہ کر کے دل اور مضطرب ہو گیا تھا۔ علیہ کی معصوم چاہت آنکھوں میں آنسو لیے سامنے آکھڑی ہوئی تھی مگر اس نے سنگدلی سے نظریں موڑ لیں۔

”یا خدا! یہ سب کیا ہو رہا ہے مجھے کن گناہوں کی سزا دی ہے تو نے۔“

میری زندگی میں آئیں گے میری اپنی اولاد مجھے ایسے ایسے دن دکھائے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ایک ملتا ہے تو دوسرا پنچر جاتا ہے۔ اس بڑھاپے میں ایسے صدمات برداشت کرنا پڑ رہے ہیں میرے مولا! اب تو خطائیں معاف ہوں۔“

ساری صورتحال آغا جی کے گوش گزار کی گئی تو وہ لڑکھڑا گئے۔ کیسی کیسی انہونی باتیں ان کی زندگی میں رونما ہو رہی تھیں۔

”ہوی بیٹا! تمہیں شعاع کو ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا میری بچی کیسے ایسے حالات سے گزری ہے!“۔ بی بی جان شعاع کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئیں۔

”میں بھی اس سے یہی کہہ رہا تھا کہ تمہیں شعاع کو ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا۔“ رحمن نے تسنید سے لہجہ میں کہا۔

”میں نے تو بہت کوشش کی تھی ابو مگر میر اور اس کی امی کہنے لگیں کہ۔ کہ۔“ آگے وہ خاموش ہو گیا اب یہ بات کیسے بتاتا کہ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ تم بات کراچی سے لے کر آؤ تو شعاع کو لے جاؤ۔

”ٹھیک ہے ان کی محبت کی ہمیں بہت قدر ہے۔ اور ہم ان کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے ہماری بیٹی کو اتنے اچھے طریقے سے رکھا۔ لیکن رحمن تم اسی ہفتے لاہور روانہ ہو جاؤ۔ اور ہماری بیٹی کو لے کر آؤ یہ علیہ کہاں ہے، میرے پاس بلاؤ اسے۔“

آغا جی بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ علیہ آئی تو آغا جی کے کمرے میں سارے بڑوں کو دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ کہیں اس کا راز تو فاش نہیں ہو گیا۔

”یہاں آؤ میری بچی میرے بد نصیب بیٹے کی اولاد۔“

آغا جی نے علیہ کو ساتھ لگا لیا تو علیہ شدت سے رو پڑی اس کا بی چاہا وہ یوں ہی آغا جی کے سینے میں منہ بھپائے روتی رہے کیا رشتہ تھا ایسا جو اسے یوں سکون مل رہا تھا۔

”کیا تم ہے کہ ایک لٹی ہے تو دوسری کھو گئی ہے۔“ اب بی بی جان علیہ کو ساتھ لگائے شعاع اور فرمان کو دکر رہی تھیں۔

”یہ ڈاکٹر طاہرہ امریکہ سے کب آ رہی ہیں، کچھ پتا کرو ایسا تم لوگوں نے۔“ آغا جی نے رحمن سے پوچھا تو

یعنی اور علیہ کے خیال سے چپ ہی رہی علیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ جکر کیا ہے۔

”یعنی جی تم علیہ کو لے کر جاؤ اور پانی پلاؤ!“ یعنی اور علیہ سمجھ گئی تھیں کہ ان دونوں کو مصیبت وہاں سے بھیجا جا رہا ہے یعنی اور علیہ باہر آگئیں تو اشعر سے ملاقات ہو گئی۔

”یہ آپ ان کے ساتھ کیوں کبل ہوئی رہتی ہیں۔ اسی لیے راشونے آجکل خفا خفا سا نظر آتا ہے۔ کیوں شعاع درست کہہ رہا ہوں ناں میں۔“ اشعر علیہ کی طرف تھوڑا سا جھکا تو اس کی آنکھیں فوراً پھٹک چکیں۔

”پتا نہیں اشعر بھیا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان کو ہوا کیا ہے۔“

علیہ ضبط نہ کر سکی، اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ علیہ کے آنسوؤں نے اشعر کے دل پر اثر کیا تھا اس نے فوراً شوکا بدلا ہوا رویہ محسوس کیا تھا مگر وہ وجہ نہیں جان سکا تھا۔

”آپ کو معلوم ہے راشو بھیا بہت خراب ہیں۔“

علیہ کے جاتے ہی یعنی نے فتویٰ دینے کے سے انداز میں کہا تو اشعر کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔ ”اچھا ایسے میں نے آج شام پانچ بجے کی خبروں سے لے کر نو بجے کے خبر تاے تک ساری خبریں سنی ہیں، اخبار بھی پورا پانا تھا مگر ایسی کوئی خبر میری نظروں سے نہیں گزری لیکن چونکہ آپ کہہ رہی ہیں تو درست ہی کہہ رہی ہوں گی ہر ہے اب ہر کوئی میری طرح تو اچھا ہونے سے رہا۔“

”آپ اچھے ہیں۔“ یعنی اس کی نظروں سے خبر رانی تھی۔۔۔۔۔ وہ وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔

جی نہیں بہت برا ہوں احمق ہوں جو آپ جیسی بے حس لڑکی کو چاہتا ہوں، جسے میری ذرا بھی پروا نہیں۔ وہ ہم پر اتنا دودھ سم گئی۔

”تو بہ آپ کتنے لڑا کا ہیں۔“ وہ پیچھے ہٹ گئی۔

”جی لڑا کا ہوں، مگر اہوں جیسا بھی ہوں زندگی آپ کو میرے ساتھ ہی گزارانی ہے۔“

”تو بہ ہے، تو یہاں کس کو انکار ہے، لڑ، کیوں رہے ہیں۔“

”آپ ایک بار انکار کر کے تو دیکھیں۔ باپ رے پوری چھٹی ہڈی آرہی ہے۔“ اشعر نے یعنی کی گردن ہانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے ہی تھے کہ سامنے سے ہوی کو آتے دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ یعنی بھی وہاں سے ٹپٹکی

”کیوں یہ چہرے پر گلاب کیوں کھل رہے ہیں۔“

”بولا ہو رہا جا رہا ہے۔“ ہوی مسکرایا۔

”تو اس میں آپ کی شئی کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔“

”یہ پہلو کہ میں بھی جا رہا ہوں ان کے ساتھ!“

”جی نہیں آپ قطعی نہیں جا رہے ہیں میں اور چچا جائیں گے یعنی کہ حد ہو گئی نہ شرم نہ لحاظ، میں اور چچا جان لگائے، اور شعاع کو لے آئیں گے۔ سمجھے آپ۔“

”یہ کہاں جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں ہم بھی جائیں گے۔“

صدف اور فائزہ کے کانوں میں لفظ جانا پڑ جائے اور وہ فوراً ساتھ چلنے کو تیار نہ ہو جائیں، یہ کیسے ممکن تھا۔

”یہ لوگ تو جا رہے ہیں جنم میں، جانا ہے۔“ یاسر اور شرعی بھی ٹپک پڑے۔



”ماشاء اللہ کہو، تم کسی کو ہنستا ہوا دیکھ ہی نہیں سکتے۔“ یاسر اور فائزہ کی کچھ دیر قبل لڑائی ہوئی تھی اور وہ جلی بیٹھی تھی۔

”نہیں میں سوائے تمہارے ہر ایک کو ہنستا ہوا دیکھ سکتا ہوں۔“ یاسر اسے کاٹ کھانے کو دوزا۔  
 ”نہیں یار آب ایسی بات بھی نہیں بس دس پندرہ ہی تو کرتے ہیں۔ جب فائزہ ہنستی ہے۔“  
 دانی نے مسکرا کر کہا تو فائزہ نے کش کھینچ کر دانی کو مارا۔ وہ نیچے ہو گیا۔ اور کش پیچھے سے آئی سیدہ بیگم کو لگا۔  
 ”توبہ۔ توبہ۔“ دانی نے سیدہ بیگم کو غصہ دلانے کی غرض سے تو یہ کی۔  
 ”بدتمیز! میری بیٹیوں کو تنگ کرتے ہو۔“ سیدہ بیگم نے دونوں کے کان نرمی طرح مردوڑے تو وہ چیخ اٹھے۔



”آجیئے۔“ علیہ کے سر میں درد تھا۔ وہ لیٹے لیٹے بولی دروازہ کھلا تھا۔ ہوی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔  
 ”آپ علیہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔“  
 ”تم تیار نہیں ہوئیں علیہ۔“  
 ”آپ مجھے شعاع کے بجائے علیہ کیوں کہتے ہیں۔“ آجکل علیہ بہت الجھی ہوئی تھی، گھر کا ماحول بڑا پر اسرار سا ہو رہا تھا۔

”تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم شعاع نہیں علیہ ہو۔“ ہوی نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا تو علیہ نے آنکھیں جھپک گئیں۔  
 ”کاش۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا میں صرف علیہ ہی رہتی وہ حادثہ پیش نہ آیا ہوتا۔ شعاع بن کر جو روگ مجھے لگ گیا ہے، وہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ میں بازی ہار گئی ہوں، کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا، میں نے کسی کا۔“ بگاڑا تھا جو یہ سزا ملی ہے، آتنی پتا نہیں امریکہ سے کب لوٹیں گی میں اب واپس جانا چاہتی ہوں، آپ کو تو ساری حقیقت کا پتا چل گیا ہے ناں کہ میں شعاع نہیں علیہ ہوں۔“

”ہاں مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ لیکن تم ابھی اپنی حیثیت سے اپنی حقیقت سے بے خبر ہو اس لیے یہی باتیں کر رہی ہو۔“ ہوی نے اپنی جیب سے رد مال نکال کر اسے دیا۔  
 ”مجھے اور کچھ جاننے کی حسرت بھی نہیں۔ آپ پلیز مجھے آتنی کے ہاں چھوڑ آئیے، یا پھر امریکہ آتنی لونوں کریں کہ وہ جلدی لوٹ آئیں میں اب یہاں ایک سیکنڈ بھی رکتا نہیں چاہتی۔“  
 ”بڑی بات راشون لے گا تو کیا خیال کرے گا؟ آخر کو کتنے تھے تمہارا۔“

”ہونہر راشون کتنے۔“ ایک ٹیس علیہ کے دل میں ابھی راشو کے روپنے نے اس کا دل زخمی کر دیا تھا۔  
 ”کیوں راشو نے کچھ کہہ دیا ہے کیا، مجھے بتاؤ میں اس سے پوچھوں گا وہ کون ہوتا تمہیں کچھ کہنے والا تم مجھے اپنا بھائی کیوں نہیں سمجھتیں۔“

ہوی نے بڑے بھائیوں کی طرح اس کے ہتھکڑیوں پر ہاتھ رکھا تو علیہ اس کے بازو پر سر رکھ کر موسلا دھا۔  
 بارش کی طرح برس پڑی، کتنی ہی دیر وہ روئے گئی، جب دل ہلکا ہوا تو نرمی سے مسکرا دی یوں جیسے بارش برسنے کے بعد سورج کی شرمیلی سی کرنیں نکل آتی ہوں۔

”وہ کیوں نہیں جنم میں، تم دونوں جاؤ بے ٹن نہ ہو تو، آپ بتائیے بھیا کہ کہاں جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔“ لڑکیاں تو کبھی ہو رہی تھیں اور وہ لوگ! الحال اس پیٹ کی ہلکی قوم کو بتانا نہیں چاہتے تھے۔  
 ”ہاں بھی میں نے سوچا ہے کہ ایک عرصہ ہو گیا کہ کہیں گھونٹنے نہیں گے۔ بناؤ پروگرام ذرا تصریح ہو جائے کیوں اشعر۔“  
 بہت اچھے بھئی یہ پٹری لانا بھی سکھ لیا، ہاں بھی بہت ہی مناسب خیال ہے جاؤ لڑکیوں اپنی قوم کو نوید دینا دو، کل گھونٹنے میں گئے۔“

”سچ بھیا! دونوں لڑکیاں بے یقینی سے چیخ پڑیں۔  
 ”ہم لوگ نہیں جا رہے، ہم کہیں اور جا رہے ہیں۔“  
 شرجی اور یاسر بے نیازی سے شانے اچکا کر یوں بولے گویا اگر یہ نہیں جائیں گے تو کوئی بھی نہیں جاسکے گا۔  
 ”بڑے شوق سے جا رہے ہم آپ لوگوں کو لے جانے کا کوئی پروگرام نہیں رکھتے۔ اشعر نے انتہائی بے لحاظ سے کہا تو دونوں منہ بنا کر رہ گئے۔  
 ”اگر ہم لوگ نہیں جائیں گے تو کوئی نہیں جاسکتا!“

دونوں دھمکی دیتے ہوئے باہر نکل گئے، اشعر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آج ایک عرصے بعد خاندان کے سارے لوگ جمع اور خوش تھے، سب چپک رہے تھے۔ سب سے زیادہ ہوی خوش تھا اور سوائے اشعر کے اس کی خوشی کی وجہ کوئی نہیں جانتا تھا۔  
 ”یہ راشو بھیا کہاں ہیں وہ نہیں جائیں گے۔“  
 ”وہ نہیں جا رہے۔“

”یار یہ بڑی مصیبت ہے، پہلے ہوی بھیا شریک نہیں ہوتے تھے۔ اور اب راشو بھیا۔ ویسے یہ شعاع باقی اور راشو بھیا میں آجکل لگتا ہے کوئی ان بن چل رہی ہے۔“  
 ”ہاں مجھے تیار ہو سب لوگ۔“ ہوی چاہیاں گھماتا ہوا ان پر نظر ڈال کر بولا۔  
 ”یہ راشو اور شعاع کہاں ہیں، وہ لوگ کیوں نہیں آئے۔“ ہوی کو راشو اور شعاع کی عدم موجودگی پسند نہ آتی۔

”میں یہ بات لکھ کر آپ کو دیتا ہوں ہوی بھیا، ہمارے گھر میں جتنے بھی لوگ ایسے ہیں جن کے نام لفظ شین استعمال ہوتا ہے۔ وہ سب بگڑے ہوئے ہیں، اشعر بھیا گستاخی معاف۔“  
 شرجیل نے جل کر اشعر کی طرف دیکھا جو اس کی بات پر مسکرا کر اس کی طرف بڑھا۔  
 ”میں تمہاری بات سے پوری طرح متفق ہوں شرجیل میاں، اشعر نے شرجیل کو اتنے چبا کر ادا کیا تو وہ بڑا سامنے بنا کر رہ گیا۔

”اچھا تم لوگ نکلو، میں شعاع اور اشو کو لے کر آتا ہوں۔“ ہوی آگے بڑھ گیا۔  
 ”ویسے میری سمجھ میں ہوی بھیا کی تبدیلی نہیں آ رہی، کہاں تو یہ کہ دنیا ہی سے کٹ گئے تھے کہاں یہ حال ہے کہ۔“

یاسر سمیت سب کو حیرت تھی۔ یاسر تو اتفاق سے ہوی کے راز سے واقف تھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں ذرا آپ سیٹھی، اب ٹھیک ہوں۔“ وہ چاہنے کے باوجود راشو کی شکایت نہ کر سکی۔

”تو پھر جلدی کرو، تیار ہو جاؤ، باہر سب ہمارے منتظر ہیں۔“

”ہوئی بھیا! سر میں درد ہے ناں۔“ اس نے کترانا چاہا۔

”ڈسپرین لے لو، آرام آجائے گا، یہ لو۔“

پھر ہوئی نے جلدی سے اس کے ٹیبل پر رکھی ڈسپرین اس کے ہاتھ پر رکھی، ہوئی کے خلوص سے علینہ پھر بہل گئی وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو ہوئی کسی نہ کسی طرح راشو کو ساتھ لے جانے پر راضی کر کے باہر لے آیا۔

”گڈ گرل چلو، اب تم دونوں سب سے آگے آگے چلو۔“

ہوئی نے علینہ کا سر دسا ہاتھ راشو کے مضبوط ہاتھوں میں تھما دیا تو راشو نے ایک نظر علینہ کی بھیجی آنکھوں پر ڈالی، پھر اپنے ہاتھ میں اس کا نازک سا ہاتھ اور پھر ہوئی کو دیکھا جس کے صبیح چہرے پر زندگی مسکرا رہی تھی، نبھانے کیوں راشو کو اس کی مسکراہٹ زہر لگی ایک وقت جب وہ شعاع کی طرف دیکھتا بھی تھا تو ہوئی اسی وقت وہاں سے اٹھ جایا کرتا تھا۔ اور اب جبکہ اپنا دل پر سکون ہے تو کتنا اعلاظرف بنا ہوا ہے۔

”سوری آپ سب لوگ مجھے معاف کریں، میں نہیں جاسکتا۔“

راشو نے ایک جھٹکے سے علینہ کا ہاتھ جھٹک دیا اور آگے بڑھ گیا۔



راشو نے علینہ کا ہاتھ کیا جھٹکا تھا اسے یوں لگا۔ جیسے اس نے اسے بھری محفل میں تھپڑ مار دیا ہو، کیا حق پہنچتا تھا راشو کو اس کی تذلیل کرنے کا۔ لاکھ ضبط کے باوجود آنکھوں سے جھڑی ایسی لگی کہ سب کو پریشان کر گئی۔ مدہوتی ہے کوئی برداشت کی بھی۔ راشو کے رویے نے تو اسے پاتال کی گہرا یوں میں اتار دیا تھا۔ وہ ضبط کے بندو بستی ہی قریب کھڑی یعنی کے شانے سے سر نکال کر بہہ گئی۔ ہوئی گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اشعر نے تو راشو کو اسیدھا کرنے کا سوچ ہی لیا تھا مگر باقی سب بھی راشو کے سر ہو گئے۔

”یہ راشو بھیا کو کیا ہو گیا؟ کہاں تو مرا کرتے تھے شعاع کے لیے اور اب ان کا دماغ ہی الٹ گیا ہے جو اُن کا ہاتھ بھٹک دیا۔ میں ابھی جا کر ان کا سر دوکانوں کے درمیان کرتا ہوں آپ فکر ہی نہ کریں شعاع باجی!“ یاسر بڑے جوش میں کھڑا ہوا تو شرجی نے اس کا راستہ روک دیا۔

”بھائی میاں ان کا سر دوکانوں کے درمیان کرتے ہوئے اپنی ذم سنبھال کر رکھنا وہ دم کاٹ دیا کرتے ہیں۔“

”اچھا! اچھا تو تمہاری ذم ایسے ہی کسی حادثے کا شکار ہوئی ہے۔“ وہ یاسر تھا جو ادھر نہیں رکھتا تھا۔

”ارے شعاع باجی! آپ کو اب بھی ٹیسی نہیں آئی۔ بے چارے دد جو کر اپنے اپنے کرتب دکھا کر آپ کو

بھانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں؟“ صدف نے ان دونوں کو گھوڑا۔

”چلو، ہم تو ناکام ہو گئے ہیں لیکن تم کامیاب ہو جاؤ گی صرف ایک بار بندر یا سی ملی بن کر دکھا دو۔ شعاع

باجی تو کیا ان کی ساتھ پشتیں ہنس کر دہری ہو جائیں گی۔“

اور پھر اس سے قبل کہ صدف اور فائزہ ان پر حملہ آور ہوتیں دونوں بھاگتے ہوئے وہاں سے سیدھے راشو

کے کمرے میں آئے، جو ہاتھوں کا نکتہ بنائے سیدھا لینا چھت کو گھوڑے جا رہا تھا۔

کمرے میں قدرے تاریکی تھی۔ یاسر نے ہاتھ بڑا کر آہستگی سے لیپ روشن کر دیا، مگر راشو اپنی سوچوں

میں اس قدر غم تھا کہ کمرے میں پھیلی روشنی بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کر سکی۔

راشو اُس وقت چونکا جب چھت پر مختلف سائے ابھرنے لگے۔ وہ کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ وہ صورت حال کو

بالکل بھی نہ سمجھ سکا۔ قریب تھا کہ وہ اٹھ کر بھاگتا۔ بد قسمتی سے اسی وقت بجلی چلی گئی۔

یاسر اور شرجی جواس..... شرارت کے مرتکب تھے، بجلی جانے سے گھبرا گئے۔

ادھر راشو بھی حواس یاخند ہو کر باہر کی طرف لپکا مگر اندھیرے میں وہ جسے دروازہ سمجھا تھا، وہ کھڑکی تھی۔ جہاں یاسر اور شرجی چپے تھے، بکرا گئے۔ راشو کو تو یقین ہو گیا کہ یہ وہی بھوت ہیں جن کا سایہ وہ چھت پر دیکھا چکا ہے۔ اب کیا تھا، ہنر یوگ ہی تو چھ گئی۔ کمرے کی جو شور بنگامہ ہوا کہ خدا کی پناہ!

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تم لوگوں سے خوفزدہ ہو جاؤں گا۔“ راشو کا بھرپور ہاتھ تاریکی میں لہرایا تو یاسر کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”شرجی کے بچے! پچھلے قرض چکانے کا اچھا موقع ملا ہے تمہیں۔!

دھائیں یاسر کا ہاتھ اٹھا تو راشو کو کرکھا کر نیچے بیٹھ چکا تھا۔ یاسر کا ہاتھ شرجی کے جڑے پر آکر لگا۔

”یاسر! میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔“ اب شرجی صاحب قالین پر لیٹے راشو کی خاطر کر رہے تھے پھر تو

تینوں ایک دوسرے پر ہل پڑے اور اسی بنگامے میں بجلی بھی آگئی۔ اور پورا گھر ان کے کمرے میں جمع ہو گیا۔

اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ شرجی کا کان راشو کے دانتوں میں تھا اور راشو کی ناک کو شرجی نے کچھ ایسے پکڑ رکھا تھا کہ راشو اچھا خاصا خوفناک لگ رہا تھا جبکہ یاسر میاں کپڑوں کی الماری پر چڑھے بالکل جن مانس لگ رہے تھے۔ تینوں کے حلیے اتنے بگڑے ہوئے تھے کہ سب کا ہنس ہنس کے برا حال گیا۔

”موگی..... موگی.....! یہ یو موگ پھلی“۔ صدف نے ہاتھ میں پکڑی موگ پھلی یاسر کی طرف اچھالی۔

”دنیا میں اس سے زیادہ لذت چیزیں میں کھانے کی چھوڑ داس کا کان اور شرجی چھوڑ داس کی ناک۔“

”اس کی ناک تو اب میں کانوں گا، کھلاتا پھرے گا تک کتا، تک کتا۔“

اشعر نے بڑھ کر شرجی اور راشو کو الگ کیا تو اسی وقت یاسر نے الماری سے نیچے چھلانگ لگائی۔ بد قسمتی

سے اس کی پینٹ کی بیلٹ الماری کے کیل سے انک گئی اور وہ ہوا میں معلق ہو گیا۔

”میاں! یہ تم نے سر کس کب سے جوائن کی ہے؟“

”جی یہ کوئی چند گھنٹے ہوئے ہیں۔“ ہوا میں معلق ہونے کی وجہ سے حلق سے آوازیں بھی عجیب ہی برآمد ہو رہی تھیں۔

”بکومت اترو نیچے تماشا لگا رکھا ہے۔“ رحمن احمد نے یاسر کو ڈانٹا۔ ”جی میں تو اترا نہ چاہتا ہوں مگر یہ کیل

مجھے چھوڑ نہیں رہا چا..... چا.....“

یاسر نے غالباً کیل کی عزت نفس پر حملہ کیا تھا۔ کیل اکھڑ گئی اور یاسر صاحب دھڑام سے قالین بوس ہو گئے

”یہ تم کیاراشو کی گود میں چڑھے ہوئے ہو، ہٹو پیچھے۔“

اب رحمن صاحب شرجی کی طرف بڑھے اور کان سے پکڑ کر راشو سے الگ کیا۔

”چچا جان تو چاہتے ہیں گھر میں سب کے کان ہاتھی جتنے بڑے ہوں۔“ شرجی نے اپنا کان سہلاتے

ہوئے کہا۔

”راشو بیٹے! تم پر کیا افتاد آن پڑی، تم تو اچھے خاصے عقل مند تھے۔“ رحمن احمد نے کسی کا بھی خیال نہ کیا اور راشو کو لٹاڑا تو وہ شرمناک ہو گیا۔

”کچھ نہیں جی، میں تو بیڈ کے نیچے، نہیں جی بیڈ میرے اوپر سو رہا تھا کہ چھت پر بھوت ناچنے لگے، میں بھی بچے لگا پھر بجلی چلی گئی اور..... اور.....!“

راشو بے دھیانی میں بولے جا رہا تھا۔ رحمن احمد تو باہر نکل گئے باقی سب کا ہنسنے ہنسنے برا حال ہو گیا۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟ راشو کو اس وقت زیادہ تاؤ آیا جب علیہ بُری طرح ہنسے گئی۔ اس نے گھوڑا بھی اسی کو ”صاحبزادے! یہ بے ہودگی نہیں، بتکیہ ہے جو بھوتوں کے ناچ میں ادھر چکا ہے لہذا اسے چھوڑ دیا ہے۔“ اشعر نے تکیہ راشو کے ہاتھ سے لیا جو اس دھینگ مشتی میں اپنی شکل کھو بیٹھا تھا۔

”میاں مجنوں! اب تو کیسی بھی ہنس پڑی، جلدی سے حلیہ درست کر دو چلیں، پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔“

ہوئی نے راشو کے اچھے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر علیہ کو دیکھا جس کے خوبصورت چہرے پر بھی بیسی مسکراہٹ تھی۔ نہ جانے کیوں اس وقت راشو کو علیہ اور ہوی، بہت بڑے لگے مگر چونکہ سب کا اصرار تھا ان لیے اسے تیار ہونا پڑا۔ رات بھی ہو گئی تھی اور رات بھی چودھویں کی۔ متفقہ رائے کے بعد سب ساحل پر آگئے۔ ہوی گاڑی میں بی بی ڈرائیونگ سیٹ سے پشت لگا کر نیم دراز ہو گیا اور پورے چاند کو مسکراتا ہوا دیکھنے لگا۔

”یہ تم اکیلے ہاں جھک مارو گے؟“ اشعر جاتے جاتے مڑا۔

”ہاں اس لیے کہ بعض اوقات تنہائی محفل سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔“ ہوی کے تصور میں شعاع کا حسین

را بھرا آیا۔

”اچھا ابھی مزے لوٹو اپنی تنہائی کے، ہمارا سب کچھ تو محفل میں ہے۔“

اشعر نے جو گراتا کر گاڑی میں رکھے اور ننگے پاؤں ریت پر تقریباً بھاگتا ہوا شعاع اور عینی کے درمیان

میں آکھڑا ہوا۔

”یہ آپ کو کباب میں ہڈی بننے کو کس نے کہا؟“ عینی نے اسے گھورا۔

”توبہ..... توبہ عینی! بڑی بات۔ ٹھیک ہے شعاع کباب میں ہڈی بنی ہوئی ہے مگر تمہیں منہ پر تو نہیں کہنا چاہیے اب ایسی بھی کیا صاف گوئی کہ اگلا بھاگنے پر مجبور ہو جائے۔ شعاع! تم ہائڈ نہ کرنا۔ عینی کی عادت ہی ایسی ہے جہاں میرے اور اس کے درمیان کوئی آیا یہ جل گئی۔“

”اشعر! یہ کباب میں ہڈی میں آپ کو کبہ رہی ہوں۔“

عینی، اشعر کی شوخی کو سمجھ تو گئی، مگر شعاع کی خاطر وضاحت پیش کرنے لگی۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ نے مجھے ہڈی کہا ہو۔ محترمہ! ہڈی مونٹ اور میں مذکر ہوں۔ ویسے شعاع

فہمیں بھاگتا آتا ہے؟ اچھا ایسا کرو، وہ جو آگے اکیلا سا تنہا سا پاگل جا رہا ہے نا اس کو ہاتھ لگا کر آؤ، ثانی دوں گا۔“

اشعر نے اسے بچوں کی طرح بھلاتے ہوئے دور جاتے راشو کی طرف اشارہ کیا تو اک نہیں سی شعاع

لگدول میں ابھی کئی بار وہ لوگ ساحل پر آچکے تھے۔ دونوں کتنی دیر باتیں کرتے کرتے اتنی دور چلے جایا کرتے

تھے کہ ان لوگوں کو تلاش کرنا پڑتا۔

”اشعر بھائی! صاف کیوں نہیں کہتے کہ کباب میں ہڈی اچھی نہیں لگتی۔“

”ارے واہ! جیستی رہے میری بہن، کتنی عقل مند ہے۔ ظاہر ہے، بھائی ہی پر جانا ہے جاؤ شاباش۔ بھار کے اس آدمی کو پکڑ لو۔“ اشعر نے شوخی سے اسے بچوں کی طرح پکڑ کر آگے بڑھایا اور خود یعنی کی طرف پلٹا جو پانی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”لڑکی! امر نامت، اور نداب چچا جان میری خاطر تیرسی شادی تو کرنے سے رہے۔“

”بہت بدتمیز ہیں آپ، میرے ابو کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دوسری شادی کرنا گناہ تو نہیں۔ یعنی خفاسی ہوگئی۔“

”ارے بھئی میں نے کب کہا، گناہ ہے۔ بھئی عین کار خیر ہے۔ دیکھو ناں! اگر چچا جان دوسری شادی نہ کرتے تو میں تو رہ جاتا کنوارا!“

اشعر کے زندگی سے بھرپور قہقہے میں یعنی کی شرمیلی سی ہنسی کا جلت رنگ بھی علیحدہ کے کانوں میں اتر گیا، اس نے دل سے ان دونوں کی دانگی خوشیوں کے لیے دعا کی۔

”یار! یہ لڑکی کب سے اسی طرح چادر کی بکلی مار بیٹھی ہے۔ جانے کس کا انتظار ہے۔“ دانی نے ایک پتھر پلڑی کو دیکھا جو بے حس و حرکت چادر کی بکلی مارے گھٹنوں میں سر دیے جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”جناب! آپ کی منتظر وہ ہرگز نہیں لہذا ادھیان نہ دیں۔“ بولی نے دانی کو اپنی طرف کھینچا۔

”نہیں یار پتا تو کرنا چاہیے مجھے تو ہمدردی ہو رہی ہے کہیں کوئی پراہم نہ ہو۔“

شرجی کی رگ ہمدردی صنف نازک کے لیے کچھ زیادہ ہی پھڑکتی تھی۔

”تمہیں نو لڑکیوں سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہوتی ہے۔“ صدف جل ہی تو گئی شرجی کی بات پر۔

”تو تم کیوں جلتی ہو مجھے تم سے بھی تو ہمدردی ہے جب ہی تو منگنی کر لی تھی۔“ شرجی نے ریت کا لڈو دیکر

صدف کی طرف اچھالا۔

”ہاں، جب ہی تم سے منگنی کے بعد سب کی ہمدردیاں میری طرف ہو گئی ہیں۔“

اور اس سے قبل کہ صدف بھی اس پر ریت اچھالتی، وہ یاسر اور بولی، دانی کے ساتھ اس بکلی والی لڑکی کے گرد منڈلانے لگے جو ہنوز سر گھٹنوں میں دیے سوچے جا رہی تھی۔

”تم پوچھو۔“ شرجی نے بولی سے کہا۔

”کیوں میرے سر پر زیادہ بال نظر آ رہے ہیں؟“ بولی نے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”بالوں کی اتنی پرواہ ہے تو لڑکیوں کے کالج کے سامنے سے مت گزرا کرو۔“ یاسر نے بڑا دوستانہ مشورہ دیا۔

”نہیں یار! اس کا قصور نہیں، اصل میں اس کے دانتوں میں خلا ہے اور جب یہ بات کرتا ہے تو سینی کی نکل جاتی ہے اور لڑکیاں احق یہ سمجھتی ہیں یہ ان کو چھیڑ رہا ہے پس آؤ دیکھتی ہیں نہ تاؤ اور دھائیں دھائیں شروع۔“

”واقعی تجربہ بڑی چیز ہے اب اگر یاسر کو ایسا تجربہ ہوتا تو بھلا میری تکلیف کا اسے کیوں اندازہ ہو سکتا تھا۔“ دانی نے یاسر کا قرض فوراً چکا دیا۔

شرجی اور یاسر اس لڑکی کے گرد منڈلانے لگے۔

”ایکسی کیو می مس! آپ کو کوئی پراہم تو نہیں، اگر ہو تو ضرور بتائیں، پلیز بتائیں! آپ ہمیں اپنا۔۔۔۔۔“

”جی! آپ میرے علاوہ ان سب کو اپنا بھائی۔۔۔۔۔ سدا بھائی سمجھئے۔“

شرجی یا سمر کی بات کو کافی ہوا لڑکی کے قریبی پتھر پر بیٹھ گیا، مگر حیرت کہ لڑکی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ بے حس و حرکت بیٹی رہی۔

”دیکھیے میڈم! آپ بہت با پردہ خاتون ہیں۔ آج کل کے زمانے میں لڑکیوں کے لیے دوپٹا لینا دشوار ہے آپ چادر کی بکلی مارے بڑی خوبصورت لگا رہی ہیں۔ میں ابھی اپنے خاندان کی لڑکیوں کو بلا کر آپ سے ملواتا ہوں تاکہ ان کو بھی عقل آئے، بولی! ذرا یہ لڑکیوں کو بلواتا۔“

یاسر نے بڑے تعریفی لہجے میں کہا، مگر جواب اور حرکت ندر اذ اتنی دیر میں ساری لڑکیاں بھی آگئیں۔ اچھا خاصا ہجوم ہو گیا لڑکی کے گرد۔

”دیکھیے مس! اب تو گھونگھٹ الٹ دیجیے! آپ کی ہم صنف آگئی ہیں! ان کو بتائیں کہ لڑکیوں کو پردہ کرنا چاہیے۔ آپ ان کو پردے پر لیکچر دے ہی ڈالیں۔“ شرجی تھوڑا اور کھسکا تو بت میں جان پڑی۔ لڑکی نے گھونگھٹ الٹ دیا۔

”او خانہ خراب کا بچہ! تم نے امارا وظیفہ خراب کر دیا، ام کو بولنے پر مجبور کر دیا۔ او پاگل خانہ! ام لڑکی نہیں! ام لو اپنی گھر والی کو واپس بلانے کا وظیفہ کرتی تھی، مگر تم نے امارا وظیفہ خراب کیا! ام تمہارا حلیہ بگاڑے گی۔“

بکلی والی چیز کوئی نازک اندام پر ہی نہ تھی خان صاحب تھے جو اپنی روٹھی گھر والی کو بلانے کے لیے وظیفہ کر رہے تھے۔ انہوں نے پکڑ کر شرجی کی دھناتی کر ڈالی۔۔۔۔۔ بے چارے نے لڑکیوں کو خود ہی دعوت نظارہ دی تھی اور اب وہ پٹ رہا تھا اور لڑکیاں ہنستے ہنستے اس کی درگت کا نظارہ کر رہی تھیں۔

”اولو فروں کی استاد، ام تم کو حوالات میں ڈالے گی۔“

”ارے نہیں خان بھائی! مار پیٹ تو ان کا مقدر ہے ہی! اب حوالات نہ لے جائیں۔ خان بھائی ہمارے کہنے پر چھوڑ دیں۔“ صدف اگر آگے بڑھ کر خان کا ہاتھ نہ پکڑ لیتی تو شرجی کے چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

”جاؤ خدائی خوار! ام تم کو بہن جی کے کہن پر چھوڑتی اے۔“ خان بھائی نے بہن کے کہنے کی لاج رکھی اور ہنسنے سے شرجی کا گریبان چھوڑ دیا۔

”شرجی! یہ لو رمال! چہرہ صاف کرلو۔ گرین اور بلیک کا ملاپ کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“ صدف نے اپنا رمال نکال کر شرجی کی طرف اچھالا جس کے چہرے پر خان صاحب کی سنوار کے کی چھیننے پڑ چکے تھے شرجی بے چارہ تو پانی پانی ہو رہا تھا۔

”خدا کرے تمہاری گھر والی کبھی نہ مانے۔“ شرجی نے دل سے خان کو بدعادی اور بھاگ گیا۔

”ابھی ٹھہر و خانہ خراب! ام تم کو بتاتی اے۔“ خان بھی پیچھے بھاگا۔

”خان! تیرے لیے لے لے کان تیری چھوٹی سی دکان، تو بڑا بے ایمان۔“ شرجی کہتا ہوا بھاگ رہا تھا کہ

صرف وہی تھا کہ کلی جیسی لڑکی مر جھا کر رہ گئی تھی۔

”راشو شو گئے ہو کیا؟“ اشعر نے راشو کے منہ سے چادر ہٹائی۔

”نہیں یار! یوں ہی لیٹا ہوا تھا، طبیعت کچھ مضطرب سی ہے۔“ راشو کا دل بڑا بوجھل ہو رہا تھا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اور تمہیں معلوم ہے کہ تم ایسا کیوں محسوس کر رہے ہو، جب انسان کسی بے گناہ کو دکھ دیتا ہے ناں تو اس کا

بدلہ خدا خود لیتا ہے۔ کچھ احساس ہے تمہیں کہ تم علینہ کو کتنا دکھ دے رہے ہو۔ تم خود غرض ہو راشو! تمہیں محبت کا

شعور ہی نہیں تم صرف سراب کے پیچھے بھاگتے رہنا چاہتے تھے۔ تم اس وقت بھی ایک سائے سے محبت کرتے

تھے۔ جو تمہارا نہیں تھا جسے تمہاری کوئی چاہت تھی نہ طلب اور اب بھی تم ایسا ہی کر رہے ہو کیا یہ علینہ کی محبت کی

توہین نہیں کہ وہ تو روح کی تمام تر گہریوں سے سچائیوں سے تمہیں چاہ رہی ہے اس کی چاہت میں تو کوئی کھوٹ

نہیں اس نے تو تمہیں تم سمجھ کر ہی چاہا ہے توہین تو تم اس کی کر رہے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شعاع نے تمہیں

کبھی بھی نہیں چاہا وہ ہونی کو چاہتی تھی تمہاری وہ صرف عزت کرتی تھی اور علینہ تمہاری عزت بھی کرتی ہے اور

محبت بھی کیا ایک سچی محبت کرنے والے کو یہ ہی صلہ دینا چاہیے کہ اسے..... دوسرے کی محبت کا صدقہ سمجھا

جائے۔ آفرین ہے علینہ پر کہ ابھی تک خاموش ہے میں ہوتا تو تمہارا سر توڑ چکا ہوتا اس دھوکا دہی پر۔“

اشعر تپا ہوا تھا اس کے جومنے میں آیا وہ کہتا چلا گیا اور راشو بالوں میں انگلیاں پھنسائے سنتا رہا۔ ایک ایک

بات دل میں اتر رہی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔

”چپ ہو جاؤ خدا کے لیے اشعر! میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ کیوں میرے ساتھ مذاق کیا گیا مجھے کیوں

نہیں بتایا گیا کہ شعاع اور علینہ نہیں ہیں۔ اگر مجھے ابتدا ہی میں بتا دیا جاتا تو شاید میں بے اعتباری کے اس جنگل

میں نہ بھٹکتا۔ مگر۔۔۔۔۔ مگر یہاں تو کسی کو احساس ہی نہیں کسی کے احساسات کا۔“ راشو کو بس ایک ہی ملاں تھا کہ

اس پر اعتبار نہیں کیا گیا۔ اسے بتایا نہیں گیا۔

”راشو! تم بھی حد کرتے ہو۔ پہلے کہاں پتا تھا کسی کو کہ یہ علینہ ہی فرمان چچا کی دوسری بیٹی ہے۔“

”بزرگوں کو یہ تو پتا ہی تھا کہ چچا فرمان کی دو بڑواں بیٹیاں ہیں پھر یہ بات ہم لوگوں سے کیوں چھپائی گئی؟“

”تو تمہیں کیا فرق پڑا ہے راشو! بتاؤ کیا فرق ہے علینہ اور شعاع میں، دونوں ہی تمہاری کزنز ہیں اور اللہ

تعالیٰ نے دونوں میں بال برابر بھی فرق نہیں چھوڑا۔ ہاں فرق ہے تو تمہارے احساسات کا، تمہارے محسوسات کا

کہ تم شعاع کو چاہتے تھے اور علینہ تمہیں چاہتی ہے۔ کسی کے پیچھے بھاگنے سے یہی بہتر ہے کہ تم اس کے ہو جاؤ

جو تمہارے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ چاہنے سے، چاہے جانا زیادہ معتبر ہے۔ شعاع کے سائے کے پیچھے بھاگنے

سے بہتر ہے۔ علینہ کی بھرپور محبت کا جواب محبت سے دو۔ میں تو تمہیں چیز ہی اور سمجھتا تھا۔ بہت بلند انسان مگر تم

۔ ز تو اتنی چھوٹی سی بات کو ایک بہت بڑا جذبہ باقی مسئلہ بنا لیا ہے۔“

”یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے اشعر! اس چھوٹی سی بات نے میری بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔“ راشو جھنجھلا

کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ محض تمہارا وہم ہے خود ساختہ جس کی سزا تم خود کو بھی دے رہے ہو اور اس معصوم لڑکی کو بھی۔ یہ بات سب

سیدہ بیگم کو پریشانی لاحق تھی۔ انہوں نے عالی سے کہا تو راشو اپنی جگہ چورسا بن گیا۔ ظاہر ہے اس کی

اچانک کسی سے نگر گیا۔

”تم اماں پٹھان بانی کو بے ایمان بولا! تم کو ابھی جہنم رسید کرے گی۔“

اور دوسرے خان صاحب نے حق برادری نبھاتے ہوئے شری کی کچھ اتنی اچھی خاطر تو وضع کی جس نے

نتیجے میں اس کی بائیں آنکھ پھونکتے پچی مسلسل نگر بازی کی وجہ سے ماتھے پر گومڑا بھرا آیا اور دائیں ٹانگ میں لنگر

محسوس ہونے لگا۔

”ہائے..... ہائے۔“ وہ مستقل کر اہتا اور لنگڑا ہوتا ہوا چل رہا تھا۔

ہائے پردہ پوش حسینہ ہائے، لڑکیاں بسے جا رہی تھیں۔

وقت خاصا ہو گیا تھا۔ سب ہی کونوں کھدروں سے نکل آئے تھے۔ علینہ کے دل میں درد کے سائے زیادہ

گہرے ہونے لگے تھے۔ وہ ٹھنڈی ریت پر جلتے پاؤں رکھتے ہوئے گاڑی تک آگئی۔ ہونی اسے اکیلا دیکھ کر

حیران رہ گیا۔

”ارے علینہ! تم اکیلی؟ راشو کہاں ہے؟“

”مجھے کیا خبر ہوئی بھائی؟“ ایک ٹیس اندر ہی دم توڑ گئی۔

”کیوں وہ تمہارے ساتھ نہیں تھا؟“ ہونی کو خاصی حیرت ہوئی۔

”ہمارا ساتھ کب کا چھوٹ چکا ہے۔“ آخر کہاں تک ضبط کرتی، دل کا درد آنسو بن کر آنکھوں میں اتر آیا۔

”یہ راشو ہو کیا گیا ہے۔ تم دل میلانہ کرو علینہ! وہ کسی غلط فہمی کا شکار لگتا ہے ٹھیک ہو جائے گا۔“

ہونی اپنی سمجھ میں راشو کا رویہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے پھر وہ کتنی ہی دیر علینہ کو بھلاتا رہا۔

”ارے لڑکی! تم یہاں ہو اور یہ گواچی گاں کی طرح (گم ہوئی گائے کی طرح) آگے ہی آگے اکیلا

بز ستا جا رہا تھا میں بازو نہ پکڑ لیتا تو فرار ہو جاتا کسی لہر کے ساتھ اور تم روتی رہتیں تمام عمر۔“ اشعر نے راشو کو دھکیل

کر علینہ کے سامنے کر دیا۔

”رونا تو اب بھی ہے مجھے تمام عمر۔“ ٹوٹے لہجے میں علینہ کا جملہ تھوڑی دیر کے لیے راشو کو بھی تڑپا گیا وہ

کولامت کرنے لگا کہ کیوں معصوم لڑکی کو اذیت دے رہا ہے پھر یہ لوگ واپس آگے۔ سب ہی کھانے پر موجود

تھے سوائے علینہ کے۔

”یعنی بیٹا! شعاع کو لے کر آؤ وہ کھانا نہیں کھائے گی۔“

سیدہ بیگم تو بالکل بدل گئی تھیں۔ بہت حلیم اور مہربان ہو گئی تھیں یعنی اور شعاع پر تو کچھ زیادہ ہی مہربان تھیں۔

”امی جان میں گئی تھی مگر وہ کتنی ہے بھوک نہیں اس کے سر میں درد ہے کھڑی تھی، چائے کے ساتھ

ٹھیلٹ دیدینا ابھی دے آؤں گی۔“ یعنی نے چاول نکالتے ہوئے تفصیل بتائی۔

”یہ لڑکی بہت دنوں سے اپ سیٹ ہے۔ عالی تم ہی پتا کر آؤ۔ بڑی کمزور ہو گئی ہے۔ شعاع نہ ہنستی بولتا

ہے نہ سب میں ہنستے ہے۔“

سیدہ بیگم کو پریشانی لاحق تھی۔ انہوں نے عالی سے کہا تو راشو اپنی جگہ چورسا بن گیا۔ ظاہر ہے اس کی



بچوں سے پوشیدہ رکھی گئی تھی اور میرے خیال میں تو ایسی بات نہیں کہ اسے اٹھایا جائے اور پھر کیا فرق پڑتا ہے۔“  
اشعر اسے سمجھا سمجھا کر زچ ہو گیا تھا۔

”اچھا پلیز! اب مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ راشو نے خاصی بدتمیزی سے کہا تو اشعر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ راشو کتنی ہی دیر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ہوا خاصی خشک تھی مگر اسے سکون مل رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑا رہا، وہ ہنسنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر گلاب کے تختوں کے قریب بیٹھی علیینہ پر پڑی۔ وہ گھنٹوں میں سر دیے غالباً رو رہی تھی۔ راشو کے دل پر چوٹ سی پڑی وہ بلا سوچے سیزھیاں اترتا چلا گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا علیینہ کی طرف بڑھا۔ اس نے کچھ نہیں سوچا تھا کہ اس سے کیا کہنا ہے۔ اس کے زخموں پر اپنی محبت کا پھار کھنا ہے یا مزید نمک پاشی کرنی ہے۔ علیینہ نے سراٹھا کر دیکھا شدت گریہ سے اس کا چہرہ سرخ اور آنکھیں سوج رہی تھیں۔ اس سے قبل کہ راشو کچھ کہتا۔ علیینہ وہاں سے اٹھ گئی۔ اب اسے راشو سے خوف آنے لگا تھا۔ راشو گہرا سانس لے کر اس کی پشت پر لہراتی ہوئی چوڑا دیکھتا رہ گیا۔ علیینہ اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی کہ صدف نے بتایا کہ ڈاکٹر طاہرہ کا امریکہ سے فون ہے۔ وہ بھری ہوئی تو تھی ہی فون پر ہی پھٹ پڑی۔

”آئی! آپ کہاں رہ گئی ہیں۔ آپ کو میرا ذرا خیال نہیں۔ آپ فوراً آجائیے ورنہ مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔ میں اب یہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ آئی پلیز۔ پلیز۔“  
دل کا سارا درد آنکھوں میں اتر آیا تو وہ روئے گئی۔ دوسری طرف ڈاکٹر طاہرہ بری طرح پریشان ہو گئیں۔  
”ہیلو علیینہ بیٹے! کیا بات ہے؟ کیوں اس قدر ہلکان ہو رہی ہو؟“  
”بس آئی! میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ واپس آجائیں جلدی سے۔“  
”اچھا۔ اچھا بیٹے! ابھی تو ممکن نہیں، ایک ہفتہ کے اندر اندر آجاؤں گی۔ ڈونٹ وری بیٹے۔“  
”نہیں آپ جلدی آجائیے۔“ وہ روئے گئی۔  
”اچھا میں کوشش کرتی ہوں۔ ذرا راشو کی امی کو فون دو۔“  
”جی اچھا۔“

پھر علیینہ نے ریسیور قریب کھڑی قدسیہ بانو کو دے دیا۔

”جی ڈاکٹر صاحبہ! آپ تو امریکہ ہی کی ہو کر رہ گئیں۔ کب آتا ہے آپ کو۔ جلدی آجائیے۔ آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ اب تو حالات ہی بدل گئے ہیں۔“ قدسیہ بانو مسکرا کر علیینہ کو دیکھ رہی تھیں۔  
”ٹھیک ہے بھابھی میں ایک ہفتے میں آجاتی ہوں۔ لیکن شعاع اس قدر روکیوں رہی ہے۔ اسے خاموش کرائیں۔ مجھے بہت تکلیف پہنچی ہے اس کے رونے سے۔“

”ڈاکٹر صاحبہ آپ فکر مند نہ ہوں۔ راشو کے ساتھ ذرا سی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں خاص بات تو یہ ہے کہ علیینہ ہماری اپنی بیٹی ہے۔ آپ سے تو صرف مزید معلومات حاصل کرنا ہیں۔ پلیز آپ جلدی سے آجائیے تو مسئلہ حل ہو۔“ قدسیہ بانو نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ڈاکٹر طاہرہ کو ساری صورت حال بتادی۔  
”اچھا۔ تو کیا آپ کی دوسری بیٹی شعاع واپس آگئی ہے۔“

ڈاکٹر طاہرہ بہت خوش تھیں اس خبر پر۔

جی ہاں۔ بس آپ آجائیے ہماری خوشیاں مل کر ہی سمیٹیں گے۔“

قدسیہ بانو بس پڑیں تو علیینہ ان کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ ان کی مہمل سی باتیں اسکی سمجھ سے بالا تھیں۔ وہ اس سے ہٹ گئی۔ مگر میں کچھ ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے بہار اترنے والی ہو۔ اندر ہی اندر بزرگ جانے لگا کیا تیاریاں کر رہے تھے۔ کیسی باتیں ہو رہی تھیں۔ بس انتظار تھا تو فرمان کا۔ اور ان کی کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں ہیں۔ کس حال میں ہیں۔ والدین بہن بھائی کون تھا جو ان کا منتظر نہیں تھا۔ ان سب رشتوں سے الگ ہو گیا تھا۔ جسے محبت کہتے ہیں اور محبت کا الاؤ پلکوں پر روشن کیے وہ تو ایک عرصے سے انتظار کی رہ گذر بیٹھی تھیں۔ اب انتظار کے آگن میں تھکن کی شام اترنے لگی تھی مگر وہ دروازہ کھولے نظروں سے آنے والے کی ہانک رہی تھیں جس کے آنے کی کوئی امید ہی نہ تھی۔

”فرمان! آپ تو واپسی کا راستہ ہی بھول گئے ہیں۔ آپ کی تلاش تو اللہ تعالیٰ نے کب کی ختم کر لی۔ فرمان علیینہ کی صورت میں، آکر دیکھیں تو کتنی خوشیاں صرف آپ کے نہ ہونے سے ادھوری پڑی ہیں۔“

کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر جانے دل کی کتنی گہرائی سے یہ آہ دعا کی صورت ابھری تھی کہ بارگاہ ایزدی ان قبولیت کی سند لے کر فرمان کی صورت دروازے پر موجود تھی۔ انسان بے صبر ہوتا ہے۔ دعا تو کرتا ہے مگر سے خدا کی ذات پر رات یقین نہیں ہوتا کہ اس کی یہ دعا قبول بھی ہو جائے گی اور جب وہی دعا قبول ہو جاتی ہے تو بے یقینی سے آنکھیں پھیلانے ششدر رہ جاتا ہے۔ اصل بات تو انسان کے اپنے کمزور عقیدے کی ہوتی ہے ورنہ خدا تو مہربان ہوتا ہے ہر دعا سنتا ہے قبول کرتا ہے۔

”فرمان۔ فرمان آپ۔“ عالی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ شخص جو مسافروں کی گرد میں اٹا ہوا چہرے پر دیووں کی تھکن لیے تھکا ہارا کھڑا تھا ان کا فرمان ہی ہے۔ وہ خواب کی سی کیفیت میں ان کی طرف بڑھیں۔  
”مجھے معلوم تھا عالی۔ میں جب بھی پلٹ کر آؤں گا تمہیں اپنا منتظر پاؤں گا۔“ فرمان یقین کی منزل پر لڑے کہہ رہے تھے۔ انہوں نے بڑھ کر عالی کے ہاتھ تھام کر ان کے اس خیال کو یقین میں بدل دیا جسے وہ اپنا مانجی تھیں۔

”فرمان میں نے تو ان آنکھوں میں سوائے آپ کے انتظار کے کسی اور خواہش کے الاؤ کو روشن ہی نہیں کیا۔ فرمان اب میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔“

”ہاں عالی بہت تھک گیا ہوں۔ بہت بکھر چکا ہوں۔ جس کی تلاش میں اپنا وجود بھی کھو بیٹھا ہوں۔ اسے لگی نہیں کھون پایا۔ جانے کہاں ہے وہ۔“

فرمان نے اپنا..... دکھ عالی کے دامن میں ڈال دیا۔ تو عالی کتنی ہی دیر اس تھکے ہوئے انسان کو دیکھتی رہا۔ گزرتے ہوئے ایک ایک پل کی داستان رقم تھی ان کے چہرے پر ایک ایک داغ بے نقاب تھا ان کے اسنے فرمان کا۔ ان کی تمام عمر ہی اس بکھرے شخص کو سمیٹنے کی آرزو میں کٹ گئی تھی۔ مگر تقدیر نے کبھی بھی اس لڑے انسان کو سمیٹنے کا حق ان کو نہیں دیا تھا۔

مریض ہیں۔ وہ دونوں آپ کے لیے ایسے ہی بے قرار ہیں جیسے آپ اپنی اولاد کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ یہی مکافات عمل ہے انسان جب کسی کا دل توڑ رہا ہوتا ہے تو اسے اس اذیت کا احساس ہی نہیں ہوتا جو اگلے پر گزر رہی ہوتی ہے مگر وہی چوٹ جب اپنے دل پر پڑتی ہے تو تڑپ اٹھتا ہے۔ آپ یہ چاہئے ہیں۔ میں فون کر لوں پھر چلتے ہیں۔“

عابی نے گرم گرم چائے کا کپ جو ابھی ابھی بابا رکھ گئے تھے۔ فرمان کی طرف بڑھایا۔  
 ”نہیں عابی! مجھے کسی چیز کی طلب نہیں۔ میری بے کلی اب ایک بل بھی مجھے چمن سے نہیں بیٹھنے دے گی۔“  
 فرمان کے لیے عابی کے کالج سے گھر تک کا فاصلہ صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔ صدیوں بعد وہ پلٹے تھے۔  
 گیٹ پر ہی ان کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ وہ لڑکھڑکے اور زمین بوس ہو گئے۔ انہوں نے گھر کی منی کو آنکھوں سے لگایا ہونٹوں سے چوما۔

”فرمان میرے بچے میرے بیٹے۔“ ”بی بی جان۔ بی بی جان میں خطا کار ہوں آپ لوگوں کا۔ مجھے معاف کر دیں۔“

فرمان احمد ماں کے قدموں سے لپٹے بچوں کی طرح رورہے تھے مگر مگر گیٹ کے پاس ہی جمع تھا۔  
 ”میرے بچے کیسی غلطی۔ کیسی خطا۔ یہ سب تو قدرت کی طرف سے تھا۔ میرے چاند میں تم سے ناراض ہی کب تھی جو تو نے اتنا تڑپایا۔ میری ممتا کو۔“ بی بی جان کی ممتا میں لگی ہوئی آگ آج بجھ گئی تھی۔ وہ بیٹے کو سینے سے لگا لے اس ملن پر خدا کا شکر ادا بجالائیں۔

”آغا جی۔ خدا تو ہر بار بندے کو معاف کر دیتا ہے۔ آپ خدا کے بندے ہیں۔ آغا جی اس گستاخ اولاد کو معاف کر دیں۔“ اب فرمان آغا جی کے قدموں میں پڑے تھے۔

”میں تو اس کا خود گناہ گار بندہ ہوں۔ میں تو خود تو بے گناہ رہتا ہوں۔ میرے سینے سے لگ جاؤ میرے بیٹے میں نے تمہیں کب کا معاف کر دیا ہے۔ کاش میری بیٹی مریم بھی ان خوشیوں میں شریک ہوتی۔“

آغا جی کا نحیف جسم فرمان احمد کے بازوؤں میں جھول گیا۔ اور باپ بیٹا کتنی ہی دیر ہر ایک کے وجود کو بھلائے ایک دوسرے میں گم رہے۔ پھر فرمان باری باری سب سے ملتے رہے۔ ماحول خاصا بوجھل ہو چکا تھا۔  
 ہر کوئی اٹک رہا تھا لیکن یہ آنسو ملن کے تھے۔ جدائی کے نہیں تھے۔

”بھابھی جان آپ تو بہت بخار رہی ہیں مجھے سے۔ اب تو معاف کر دیا ناں آپ نے اپنے گناہ گار کو؟“  
 فرمان احمد سیدہ بیگم کے سامنے جھکے ہوئے تھے۔ وہ نادم سی ہو گئیں۔

”فرمان کیوں شرمندہ کرتے ہو بھائی۔ ہم گناہ گار لوگ اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے تو اسی لیے ایسی حرکتیں کرتے ہیں ورنہ تو جس کو خدا ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو ہر میدان میں تمہارے حق کے لیے لڑی ہے۔ میری عابی کا دل نہیں سمندر ہے۔“

سیدہ بیگم نے فرمان کے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عابی کو دیکھا جو مبروضہ کی تصویر بنی اب بھی مضبوط تھیں اپنی جگہ پر۔ فرمان کچھ دیر عابی کو دیکھتے رہے۔ بالوں میں کہیں کہیں چاندی نے ان کے روپ میں

”آپ نے کبھی پلٹ کر دیکھنا سیکھا ہی نہیں فرمان۔ کبھی دیکھا ہوتا تو..... تو زندگی دکھوں سے عبارت نہ ہوتی۔ نہ اتنی شکنجیاں ہوتیں، نہ اتنی محرومیاں مقدر بنیں۔“

لفظ آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت ٹوٹ کر گر رہے تھے اور فرمان کی تسکین میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس عورت نے تمام عمر ان کو چاہا تھا۔ عمر تیاگ دی تھی ان کی محبت میں اور انہوں نے سوائے انتظار کے لائق ہی سلسلے کے کچھ نہ دیا جو ختم بھی ہوا تو عمر کے اس موڑ پر جب جذبات مردہ اور خواہشات حسرتوں کی لحد میں اتر چکی تھیں۔  
 ”عابی! میں تنہا تھک چکا ہوں۔ پلیز مجھے سمیٹ لو۔ مجھے گھر لے چلو۔ میں اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری شعاع کیسی ہے عابی! وہ ٹھیک تو ہے ناں۔ میں نے تو اسے کہا تھا کہ اس کی بہن کو ڈھونڈ کر ہی واپس لوٹوں گا۔ مگر میری تلاش لا حاصل رہی۔ عابی میں نے اللہ تعالیٰ سے بہت معافیاں مانگیں کہ میں نے اپنے والدین کا دل دکھایا تھا عابی اور..... اور.....“

فرمان بکھر بکھر گئے۔ آج دل کا درد کچھ زیادہ ہی سوا ہو رہا تھا  
 ”انسان کے گناہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ فرمان اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحمت سے پھر بھی کم ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی ذات پاک معاف کر دیا کرتی ہے۔ جب ہی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی ساری خطائیں معاف کر کے آپ کی تلاش کو بہت پہلے ختم کر دیا تھا۔“

”کیا مطلب ہے عابی تمہارا۔“ فرمان نے غم آنکھوں سے عابی کو دیکھا جس کو روپ کے ڈھلنے ہوئے سورج کی کرنوں نے اور زیادہ حسین اور باوقار بنا دیا تھا۔ جب آہستگی سے فرمان کا ہاتھ تھا عابی نے ساری داستان ان کے گوش گزار کر دی تو حیرت اور خوشی کے احساس نے کچھ دیر کے لیے فرمان کی زبان گنگ کر ڈالی۔ وہ بس عابی کو دیکھے گئے۔

”عابی کیا۔ کیا یہ سب واقعی سچ ہے۔“ ان کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔  
 ”ہاں فرمان! اللہ تعالیٰ کریم ہے غفور الرحیم ہے۔ وہ ہمیں معاف کر دیتا ہے۔ پتا ہے فرمان! علیہ ہمیں کس طرح ملی بالکل ہوا کے لطیف جھونکے کی طرح وہ آکر اس گلشن کے ہر پھول میں مہکتے لگی۔ گھر چلیے فرمان۔ خوشیاں آپ کی منتظر ہیں بڑھ کر سمیت لیجیے۔“

وہ..... وہ کیسی ہے عابی؟ میری طرح مریم کی طرح؟ یا.....؟ فرمان کو بڑی بے چینی ہو رہی تھی علیہ کو دیکھنے کی۔ ”وہ شعاع کا دوسرا روپ ہے فرمان۔ چلیے خود ہی دیکھ لیجیے کسی ہے۔ میں گھر فون کر دوں کہ آپ آرہے ہیں۔“ عابی فون کی طرف بڑھیں۔

”نہیں عابی! میں اچانک اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی جنت میں خاموشی سے جانا چاہتا ہوں۔ فون نہ کرو گھر۔“

فرمان نے منع کر دیا۔

”نہیں فرمان! آغا جی اور بی بی جان بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ انہوں نے تمام عمر گزاردی ہے انتظار میں اور اب عمر کے آخری دنوں میں کو اچانک دیکھ کر کہیں ان کو شادی مرگ نہ ہو جائے۔ آغا جی تو پہلے ہی دل کے

”بیٹے انسان کے سنبھلنے کے لیے ایک ٹھوکر ہونی ہی چاہیے۔ جب تک کسی کو ٹھوکر نہ لگے۔ اسے دوسرے کی تکلیف کا احساس ہوتا ہی نہیں۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرا خدا تمہیں معاف کرے اور اب خدا تمہیں اولاد کی خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔“

”آمین۔“ ایک گوشے سے بلند آواز میں شوخی سے کہا گیا۔

”فرمان! آپ نے راشو کو نہیں پہچانا۔ یہ راشو ہے۔“

عابی نے ایک طرف خاموش کھڑے راشو کی طرف اشارہ کیا، تو عابی کے یوں خصوصی تعارف پر راشو کچھ جھینپ سا گیا۔

”یہاں آؤ راشومیاں۔“ فرمان نے راشو کو اپنے قریب بلایا تو علیہ کھسک کر پیچھے ہٹ گئی۔

”راشومیاں! سرسری کے پاس جا رہے ہیں۔ آنکھیں نیچی کریں، اور یہ لیں رومال! ذرا شرما کر دکھائیں انہیں وہ یہ نہ کہیں کہ..... ہے..... ہے میرا داماد کتنا ہوائی دیدہ ہے۔“ شرجی نے جان بوجھ کر اتنی آواز میں کہا کہ فرمان احمد نے صاف سن لیا۔

”تم بہت شیطان ہو۔“ فرمان ہنس پڑے۔

”جی چچا جان! آپ نے درست فرمایا یہ راشو بھائی بھی میرے بھائی ہیں۔ ہوی بھائی بھی یہ بھی..... وہ بھی میرے بھائی ہیں۔“

”لیکن میں تمہارا باپ ہوں.....“ یسین احمد نے زور سے اس کا کان مروڑا تو شرجی شرارت سے فرمان کی طرف دیکھنے لگا۔

”دیکھ لیجئے چچا جان! میں نے کچھ نہیں کہا..... کہا خود ہی کہہ رہے ہیں، میں تمہارا باپ ہوں۔“ اب میں کچھ کہوں گا، تو گستاخی ہوگی۔“ شرجی نے یہ کہا اور باہر بھاگ گیا۔

ڈاکٹر طاہرہ بھگوان امریکہ سے لوٹ آئی تھیں۔ فرمان سب سے پہلے ان سے ملے گئے، انہوں نے راشدہ کے متعلق پوچھا۔

”آپ کو مبارک ہو فرمان صاحب! آپ کی بیٹی آپ کو مل گئی۔ آپ چھوڑیں راشدہ کو۔ اب تو اس پچھاری لی روح بھی۔“

”لیکن اس نے مجھے کن گناہوں کی اتنی کڑی سزا دی؟“

”وہ بہت نادہم تھی فرمان بھائی! وہ اکثر رویا کرتی تھی کہ اس نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں۔ بعد میں اس نے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر اسے..... آپ لوگوں کا ایڈریس نہیں ملا۔ تو وہ ممتا کے چکر میں آکر موش ہو گئی۔ اس نے علیہ کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہا، اور محبت دی تھی۔ مرتے وقت وہ یہ لڑکی میرے پاس پ کی امانت کی حیثیت سے چھوڑ گئی تھی۔ کہ آپ کو تلاش کر کے آپ تک پہنچا دوں مگر بد قسمتی سے..... کو شش لہ باد جو آپ کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ مگر قدرت جب مہربان ہوتی ہے، تو خود ہی بگڑی سنوار دیتی ہے ایک روز اتنی حادثے نے علیہ کو اس کے اصل گھر میں پہنچا دیا۔ آگے کی ساری کہانی تو آپ کو معلوم ہے۔“

مزید نگار ہی پیدا کیا تھا۔

”بھابھی جان میں تو خود کو عابی کا مقروض سمجھتا ہوں۔“ فرمان جانے اور کیا کہتے کہ عابی علیہ کا ہاتھ تھامے آگئے بڑھیں۔

”یہ ہے آپ کی بیٹی علیہ۔“

عابی نے جس لڑکی کو آگے کیا تھا وہ اسے کیسے مان لیتے کہ یہ علیہ ہے شعاع نہیں۔ قدرت نے بال برابر بھی فرق نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اسے ایک ٹکڑے دیکھے گئے۔

دل سے اولاد کی محبت کے جشے اہل پڑے علیہ کے دل کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔ کیوں؟ یہ خود وہ سمجھ نہیں پائی۔ اس کے سامنے جو شخص بازو پھیلائے تم آنکھوں سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ شعاع کا باپ تھا۔ اس کا نہیں تھا مگر پھر دل میں عجب کشش پیدا ہوئی کہ وہ ابو کہہ کر فرمان سے لپٹ گئی اور پھر کچھ اس انداز سے روئی کہ سب آبدیدہ ہو گئے۔

”میری بچی! میری بیٹی! کہاں، کہاں تلاش نہیں کیا میں نے تمہیں۔ تمہاری کھوج میں تو میں اپنا وجود بھی کھو بیٹھا تھا۔“

فرمان علیہ کو ساتھ لگائے پیار کیے جا رہے تھے۔ صدیوں کی پیاس مٹ گئی تھی۔ علیہ فرمان سے لگی بری طرح روئے جا رہی تھی۔ سب کی نظریں ان پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ ماحول کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”ایک منٹ چچا جان۔ سارا پانی جمع کرتے جائیے۔ ہمارے کراچی میں پانی کا مسئلہ رہتا ہے۔ بوقت ضرورت کام آئے گا۔“

ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے یاسر اور بوبی جانے کہاں سے مٹکا اٹھالائے تو فرمان چونک کر ان دونوں کو دیکھنے لگے۔

”تم دونوں کون ہو بھی؟“ فرمان مسکرا کر دونوں کو دیکھنے لگے۔

”آپ ہی کے کھیت کی مولیاں اور گا جریں ہیں چچا جان؟“

اچھا تو پھر آؤ۔ فرمان نے یاسر اور شرجی کو ایک ساتھ لگا لیا۔

”چچا جان ہم بھی..... اسی کھیت کی مرچیں ہیں۔“ صدف اور فائزہ کی بات کو بوبی نے اچک لیا تو فرمان بڑے محفوظ ہوئے، انہوں نے ایک ساتھ سب کو ساتھ لگا لیا۔

فرمان احمد جدائی میں گزرنے والی کیفیات کو بیان کر رہے تھے۔ گھر بھر آغا جی کے کمرے میں جمع تھا۔ بی بی جان سجدہ شکر کی ادائیگی میں مصروف تھیں۔

”آغا جی میں نے آپ کا دل دکھا کر بڑے دکھ دیکھے ہیں۔“

آغا جی! کاش لوگ والدین کا دل دکھانے سے پہلے سوچ لیں کہ وہ بھی کسی والدین بنیں گے۔ تو ان کو بھی اولاد کا دکھ دیکھنا پڑ سکتا ہے۔ مگر ٹھوکر لگنے سے قبل اگر انسان سنبھل جائے تو پھر شاید وہ اتنا دکھی نہ ہو۔“ فرمان احمد اٹھ کر ایک بار پھر آغا جی کے ساتھ جا لگے۔

”شہباز علی! تم نے کبھی محسوس کیا کہ ہمیں کتنا اطمینان ہے۔ کتنا سکون، کتنا امن ہے دوستی میں، نہ انتقام کی آگ کے بھڑکتے شعلوں میں جلتے ہوئے ہمارے بدن ہیں اور نہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے عیارانہ چالیں ہیں کاش شہباز علی، ہم لوگوں نے جو اتنی زندگی نفرت کرنے میں ضائع کی ہے، اس میں ایک دوسرے کو معاف کر کے محبت کی ہوتی تو۔۔۔۔۔ تو کتنا اچھا ہوتا۔“ عالم شاہ شہباز علی کو ساتھ لگا کے پرانا وقت یاد کر رہے تھے۔ جب دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔

”او چھوڑ یا عالم شاہ! پرانے قصے۔ ودغفلت کا دور تھا۔ بھول جاؤ اسے۔ آج میں تمہارے پاس دوستی کے رشتے کو اور مضبوط کرنے آیا ہوں۔ کیوں منزہ کیا خیال ہے تمہارا۔؟ عالم شاہ سے کہو کہ آئندہ بیٹی کو ہماری بیٹی بنا دے۔“

شہباز علی نے زندگی میں پہلی بار منزہ بیگم کو ساتھ لیا اور ان کو بھی کسی فیصلے کے قابل جانا۔ تو زندگی بھر کے شکوے گلے جوان کو شوہر سے تھے محبت بھرے جملے کے اس تیز بہاؤ میں بہہ گئے تو وہ شوہر کی طرف دیکھ کر زندگی سے بھرپور انداز میں مسکرائیں۔

”بھائی عالم شاہ کی یہ مجال کہ بہن کے پھیلے دامن کو خالی لوٹائیں۔ کیوں بھائی عالم شاہ۔“ منزہ بیگم نے کچھ اس انداز میں بات کی تھی کہ عالم شاہ تو بل بھی نہ سکے۔

”نہ بہن! میری کیا مجال کہ تمہیں انکار کروں۔ آئندہ آج سے تمہاری بیٹی ہوئی۔ اور شیراز میرا بیٹا ہوا۔ کیوں سودا منظور ہے ناں۔“

”بالکل منظور ہے بھائی۔ مبارک ہو۔“

”عالم شاہ! ہر بڑے انسان کے اندر ایک اچھا انسان ضرور ہے، مگر وہ انسان کبھی جلدی اور کبھی دیر میں ظاہر ہوتا ہے اور آپ دونوں کا اچھا انسان بھی ذرا دیر میں ظاہر ہوا ہے۔ تو میں آپ جیسے اچھے انسان کو کھوتا نہیں چاہتی۔ میں آج اپنی بیٹی میرا کو خود حادثہ کے ساتھ منسوب کر کے بے حد خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ آپ کو یہ رشتہ منظور ہے ناں عالم شاہ؟“

ہمیشہ کی طرح ٹھنڈے لہجے اور بچے تلے الفاظ میں حمیرا نے ماضی کے تناظر میں بات کی تو عالم شاہ کی نظروں میں پڑنے واقعات فلم کی طرح گھوم گئے۔

”خدا گواہ ہے حمیرا! میری یہ دلی آرزو تھی۔ کہ میں اپنے حادثہ کے لیے تمہاری بیٹی میرا کا رشتہ مانگوں، مگر حوصلہ اس لیے نہیں پڑا کہ میرا ماضی داغدار تھا۔ تم نے خود یہ عزت بخش دی ہے تو میں کس زبان سے تمہارا شکر یہ ادا کروں۔“ احساس ندامت اور احساس ممنونیت سے عالم شاہ کا سر جھک گیا۔



”مبارک ہو دوست!“ ایاز نے خلوص سے حادثہ کو مبارک باد دی۔

”فکر نہ کرو۔ ابھی مبارک باد کا ادھار چکا دوں گا۔ آ جاؤ لائن میں لگ جاؤ۔“ حادثہ نے ایاز کو اپنے قریب

بٹھالیا۔

ہی.....“ ڈاکٹری طاہرہ نے ساری بات فرمان کے گوش گزار کر دی۔

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحبہ! راشدہ کو میں نے دل سے بہن بنایا تھا۔ اور اس نے بھی بہن ہی بن کر دکھایا۔ اتنی محبت مجھے اور میری بیوی کو دی کہ سبکی بہنیں بھی نہ دیتی ہوں گی۔ دکھ تو مجھے اس بات کا ہے کہ اس نے ایسی حرکت کیوں کی۔ وہ مجھے آزما کر تو دیکھتی..... ایک بار بہن بن کر دامن تو پھیلاتی..... میں دونوں بیٹیاں اس کی گود میں ڈال دیتا مگر اس نے تو وہ حرکت کر ڈالی کہ.....“

ساری باتیں انہیں ایک، ایک کر کے یاد آنے لگیں تو وہ دل میں درد سا محسوس کرنے لگے۔

”وہ مرتے وقت تک پشیمان رہی۔ پچھتاتی رہی، مگر کیا ہو سکتا تھا۔ بہر حال میں تو آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ گناہ گار ضرور تھی مگر مخلص تھی۔ وہ آپ سے معافی مانگتا چاہتی تھی مگر موت نے مہلت نہ دی۔ بہر حال اب تو کچھ فائدہ نہیں ایسی باتوں کا۔ آپ اس کا کو معاف کر دیں، اور نہ اس کی روح بے چین رہے گی۔“ ڈاکٹر طاہرہ نے کچھ اس طرح سے کہا کہ فرمان کا دل موم ہو گیا۔ اور انہوں نے دل سے مرحومہ راشدہ کو معاف کر دیا۔

علینہ کے لیے یہ انکشاف..... تکلیف دہ بھی تھا۔ اور انتہائی مسرت آگئیں بھی کہ یہ شخص اس کا باپ ہے اپنا باپ اسے یاد تھا..... وہ کتنا چلا کرتی تھی ابو کے لئے وہ اکثر راشدہ سے اپنے ابو کے بارے میں پوچھا کرتی، تو وہ کبھی تو بڑی طرح گھبرا جاتیں۔ اور کبھی پیار سے سے بہلا دیتیں۔ مگر اس کے اندر باپ کی محبت کی ٹھنکی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ شدت سے دعائیں کیا کرتی، کہ اس کے کھوئے ہوئے ابو اچانک ہی آجائیں، اور شاید وہی دعائیں قبول ہو کر ابو کی صورت میں ڈھلی اس کے سامنے موجود تھیں۔

”ابو۔۔۔ ابو جان!“..... علینہ ایک بار پھر فرمان احمد سے لپٹ کر رو پڑی۔

”نہیں علینہ بیٹی! اب نہیں، اب نہیں، اب تو آنسوؤں کا وقت ختم ہو گیا۔ خزاں کا موسم بیت گیا۔ خدا کا شکر بجالاؤ کہ اس نے تمہیں باپ اور بہن سے ملوایا۔“ ڈاکٹر طاہرہ نے بڑھ کر علینہ کو ساتھ لگا لیا۔

”بہن!“ کتنی ٹھنڈک تھی اس لفظ میں۔ کتنا پیار پوشیدہ تھا۔ اس میں..... وہ جب تنہا ہوتی، دکھی ہوتی، تو کسی دوست جیسی بہن کی کتنی شدت سے طلب ہوتی تھی، لیکن اسے کیا خبر تھی کہ خدا نے اسے یہ نعمتیں عطا کر رکھی ہیں مگر وہ خود ان کا شعور نہیں رکھتی۔

”مگر وہ جانے کہاں ہے کس دیس میں بسیتی ہے۔ اور ہے بھی کہ نہیں، اف میرے منہ میں خاک۔“ علینہ اپنی سوچ پر خود ہی لعن طعن کرنے لگی۔

”علینہ بیٹی! تمہاری بہن لاہور میں ہے..... تم پریشان نہ ہو۔“

”لاہور میں ہے؟“ علینہ نے حیرت سے عالی کو دیکھا۔

”ہاں بیٹی! جب اللہ کی ذات مہربان ہوتی ہے تو سارے دروازے آپ ہی آپ کھل جاتے ہیں۔

سارے عقدے داہوتے چلے جاتے ہیں۔



”یار! یہ کیا یہاں پر نیاز بٹ رہی ہے جولاٹن سے بیٹھے ہو۔“ اشعر اسی وقت آیا تو ان لوگوں کو کمرے سے باہر تظار میں بیٹھے دیکھ کر بولا۔

”میاں! یہاں مگیتریں بٹ رہی ہیں۔“

”ہیں..... یہاں مگیتریں بٹ رہی ہیں۔ مگیتری کی ضرورت تو ہمیں بھی ہے۔ ہم بھی لائن میں لگ جاتے ہیں۔“

”یہ تم یہاں کیوں پائے جاتے ہو۔ آج کل تو تمہارے اپنے گھر میں خوب مزے ہو رہے ہیں۔ شرمین ہاتھ میں کافی کاکل لیے اندر آتے ہوئے بولی۔

”ہاں خدا کا شکر ہے۔ بہت مزے ہیں ہمارے۔ مگر مزوں سے دل بھر گیا تو بے مزا ہونے تمہارے ہاں آ گیا۔ ویسے مجھے تو بے مزا ساری عمر ہی ہوتا ہے۔“ جانے کیا سوچ کر اشعر کی آنکھوں میں شوخی ناپنے لگی۔

”کیوں ساری عمر کیوں؟“ شرمین ہلکے آواز اور حارث کو تھماتے ہوئے مڑ کر اشعر کو دیکھا۔

”ظاہر ہے بھئی۔ تم جیسی خشک بد دماغ لڑکی سے شادی ہوگی۔ زندگی بے مزایا گزرے گی۔“ اشعر نے

ایاز کو دیکھ کر آنکھ بادی تھی۔ مبادا وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔ ویسے ایاز جانتا تھا۔ ان دونوں کی لگتی ہے اسی لے مسکرایا۔

”اور مجھ جیسی بد دماغ خشک لڑکی سے تمہاری شادی کیوں ہوگی؟“ شرمین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

”اس لیے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ بچپن کی منگ ہو تم میری۔ اور مرد جان دے دیا کرتے ہیں، مگر اپنی منگ نہیں چھوڑا کرتے۔۔۔ کیوں ڈاکٹر ایاز کیا خیال ہے تمہارا؟“

”بالکل درست کہہ رہے ہو۔“ ایاز نے جلتی پرتیل چھڑکا۔

”کیا..... کیا ایاز تم بھی..... میں..... میں تم دونوں کا خون پی جاؤں گی۔“ شرمین خونخوار انداز میں ان دونوں کی طرف لپکی۔

”اچھا..... تو آج پتا چلا محترمہ ڈاکٹر کے ساتھ ڈر کیولا بھی ہیں۔ ایاز اپنی گردن بچا کر رکھنا۔ یا ایسا کرنا گردن میرے پاس رکھوا دینا۔“

”اشعر کے بچے زک جاؤ ورنہ..... ورنہ.....“

شرمین نے کشن سمجھ کر اشعر کو مارا، مگر اندر آتی عذرا بیگم کو لگا۔

”تو یہ تو یہ۔۔۔ آج کل کی لڑکیوں کے دیدوں کا پانی ہی ڈھل گیا۔ ہونے والی ساس کو ابھی سے مارا جا رہا ہے۔ بعد میں کیا حال کرو گی۔“

”امی جان! آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔ دیکھ لیا ناں آپ نے کسی لڑکا لڑکی ہے، آپ کو بڑا ارمان تھا اسے بہو بنانے کا، کان پکڑ لیں کہ اسے بہو نہیں بنائیں گی۔“

اشعر ماں کی اوٹ میں چھپا شرمین کو سن رہا تھا۔

”تم کچھ بھی کہو میں تو شرمین کو اپنی بہو ضرور بناؤں گی۔“

عذرا بیگم نے پیار سے شرمین کو ساتھ لگا لیا تو شرمین کی جان ہی تو نکل گئی۔ کیونکہ وہ ان کی ضدی عادت سے واقف تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے اشعر بھی گڑبڑا گیا۔ کہ کہیں کھیل کھیل میں بات بگڑ نہ جائے۔ وہ اور یعنی تو سر جائیں گے۔

”کیوں بھئی نورین؟ تمہیں میرا بیٹا پسند ہے ناں۔ آپ اپنی بیٹی کو انگوٹھی پہنائیں، اور میں اپنے بیٹے کو۔“ نورین نے رضا مندی دے دی تو شرمین نے مار خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔

”مگنی مبارک ہو سسر!“

اشعر کی شوخ سرگوشی شرمین کے کانوں میں گونجی تو اس نے غصہ سے آنکھیں کھولیں۔ نورین ایاز کو انگوٹھی پہنا رہی تھیں۔ ایاز کی نظر میں اس پر انھیں تو وہ بولڈا سی لڑکی ڈھیر ساری شرم کے اثر میں آگئی اس کا چہرہ جھک گیا، پھر اشعر کتنی ہی دیر اسے چھینٹتا رہا مگر وہ کچھ نہیں بولی۔

جب سے سب پر یہ راز کھلا تھا کہ شعاع اور علیہ الگ الگ شخصیت ہیں وہ جڑواں بہنیں ہیں۔ سب نے اسے پاکستانی فلمی کہانی قرار دے دیا تھا۔

”یار! بالکل فلمی سچویشن ہے یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ وہی کھسی پئی کہانی..... دو جڑواں بہنوں کا ہم شکل ہونا پھر پھنچنا جانا، پھر حادثاتی طور پر ایک بہن کا غائب ہو جانا، اور ایک کا آ جانا۔ یار مزا نہیں آیا۔“ دانی بڑا سا منہ ہنسا کر بولا۔

”حالانکہ اس کہانی میں بارہ سالے ڈال کر خوب لذیذ بنایا، ہمارے بزرگوں نے..... کتنے موڑ آئے کتنی خوشیاں کتنے غم آئے، ویسے اگر یہ سب ہمارے بزرگ شروع ہی میں بتا دیتے تو شاید.....“

”یار تم لوگ اتنے بد دل کیوں ہو رہے ہو۔ سوچو ذرا اگر بچا جان کی دو جڑواں بیٹیاں نہ ہوتیں تو اپنے دو بزرگ بھائی را شا اور ہوی کو مار رہے جاتے۔ ان بچپاروں کو کس نے بیٹی دینی تھی۔ کتنا بڑا ہوتا۔ بے چارے کتنا احساس کمتری کا شکار ہوتے جب ہم سب اپنی اپنی بیگمات کے ساتھ گھومنے جاتے تو یہ لوگ کتنے افسردہ ہوتے..... اچھا اٹھ رہے ہیں.....“

ہوی اور را شا کو اٹھتا دیکھ کر پاس اور شرابی بھاگ لیے۔

فرمان احمد شعاع کے لیے بچل رہے تھے، اور آغا جی کی بھی خواہش تھی۔ کہ شعاع جلدی سے آجائے تو کوئی رسم ادا کر دی جائے۔

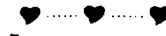
”عابی! پھر کیا خیال ہے تمہارا کس روزہ چلیں؟“

فرمان یوں عابی سے مشورہ کرتے تو عابی کو اپنا قد اونچا محسوس ہوتا نامراد اور تہی داماں تو وہ لوگوں کی نظروں میں تھیں۔ ان لوگوں کی نظروں میں جو ملاپ ہی کو محبت کا انجام سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ تو ہر بازی جیت گئی تھیں۔

وہ تو فاتح تھیں انہیں کسی کی کیا پروا تھی۔



”ہمیں اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے فرمان! آپ آغاجی اور جن بھائی سے مشورہ کر لیں، پھر چلتے ہیں۔“



کتنے ہی دن بیت گئے تھے۔ کراچی سے کوئی خبر نہیں آئی تھی، یوں جیسے اس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ اہمیت نہ ہو۔ اسے رہ رہ کر ہومی پر غصہ آ رہا تھا۔ مجال ہے جو کوئی خط لکھا ہو..... جانے کیسے حالات ہوں، کیا خبر گھر والے مجھے اب بھی قبول نہ کریں، بس وہ اکیلے میں یہ سب باتیں سوچ، سوچ کر ہولا کرتی۔ حالانکہ یہ لوگ روز اول کی طرح اسے اب بھی چاہتے تھے، جب سے ہومی ہو کر گیا تھا، شعاع گھر جانے کو بے چین تھی۔

”بھیا! کوئی خط، کوئی فون نہیں آیا کراچی سے، آپ کے آفس ہیں؟“ اس روز اس سے نہ رہا گیا تو اس نے عیسر سے پوچھ ہی لیا۔

”نہیں گڑیا! آتا تو میں تمہیں نہ بتاتا۔“ عیسر نیچے منہ کر کے مسکرا دیے۔ تو شعاع وہاں سے ہٹ گئی۔

”آپ نے شعاع کو کیوں نہیں بتایا کہ آج آفس میں ہومی کا فون آیا تھا۔ اب ناحق پریشان رہے گی۔“

رضوانہ بھابی نے عیسر کو ٹوکا، کیونکہ آج آتے ہی عیسر نے بتا دیا تھا کہ کراچی سے مہمان آرہے ہیں۔ لہذا انتظام کر لیا جائے۔

”ارے بھئی، ہر پرانز دینا ہے شعاع کو۔ ہومی نے بھی یہی کہا تھا۔ اس کے والد بھی آرہے ہیں۔“

”ارے یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ اس سے بڑھ کر شعاع کے لیے اور کیا سر پرانز ہو سکتا ہے۔“

”اچھا اب آپ اپنی خوشی کے تاثرات سے بھاٹا نہ پھوڑیں۔ ان لوگوں کے آنے میں تھوڑی دیر رہ گئی ہے۔ کھانا وغیرہ بنا لیں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ شہر بھی آگئی ہے۔ کامران چھوڑ گیا ہے۔“

اور پھر گھر میں اچھی خاصی..... ہلچل مچ گئی۔۔۔۔۔ ہر کوئی مصروف تھا۔ مگر شعاع کو کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی وہ بدولی سے پڑی رہی۔

جانے سب لوگ کہاں جمع تھے کہ باہر دروازے پر کوئی نئل پرانگی رکھ کر بھول گیا تھا۔ شاید شعاع ہی کو آنا پڑا۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ دروازے کی اوٹ میں اس کی جنت، اس کی خوشیاں بازو پھیلائے کھڑی ہوں گی۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ سامنے فرمان احمد ہی اسے نظر آئے۔

”ابو.....!“ وہ ابو کہہ کر جوآن سے لپٹی تو پھر اسے کسی کا ہوش نہ رہا۔

”ابو! آپ کہاں کھو گئے تھے؟ آپ کو کیا پتا۔۔۔۔۔ مجھ پر کیسا دقت گزرا ہے۔“

”بس میری جان آزمائش کی گھڑی بیت گئی۔ اب میں اپنی بیٹی کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھوں۔“

فرمان نے اپنے ہاتھوں سے شعاع کا چہرہ صاف کر دیا۔

”شعاع باجی! اپنی فوٹو اسٹیٹ کا پی سے تو مل لیں۔“

بوٹی نے علینہ کو شعاع کے آگے کر دیا تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ اور پھر ایک دوسرے کے گلے گلے گئیں۔

”لوکیو۔ بس کرو تم دونوں کی رخصتیاں بھی قریب ہیں سارے آنسوں یہاں برباد کر دیے تو رخصتی کے لپٹا کر دو کی انگریزوں کی نہیں تو لوگ کیا کہیں گے۔ اسے نوح دہن کے دیدوں کا پانی تو ڈھلا ہوا ہے۔“

شعاع پہچان گئی۔ اس نے بغیر دیکھے بوٹی کے کان پکڑ لیے۔

ان لوگوں کو آئے ہوئے ددون ہو گئے تھے۔ وہ اب واپس جانا چاہتے تھے مگر بشری بیگم کی خواہش تھی کہ ابھی آجائے تو وہ شعاع کو اپنے گھر سے دہن بنا کر رخصت کریں۔

”بہن جی آپ کی خواہش ہمارے سر آنکھوں پر۔ مگر آپ جانتی ہیں کہ آغاجی خدا کے فضل سے حیات ہیں اور ہماری خاموشی روایات ہیں۔ اس لیے، ورنہ تو ہم آپ کے احسان تلے اتنا دے ہوئے ہیں کہ آپ کے حکم سے اپنی کامناہ نہیں کر سکتے۔ آپ لوگ ہمارے ساتھ ہی چلیے ناں۔ اب تو بس ہم نے جا کر معافی کی رسم ادا کرنی ہے۔“

”ہومی اور شعاع بیٹی کی۔“ رحمن احمد نے ساری تفصیل بتا دی تو وہ تیار ہو گئیں۔ یہ بات۔ شعاع کے دل میں بھی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں سہنوں کی بارات اتر آئی تھی۔ علینہ اور شعاع ہی سب کی نگاہوں کا مرکز ہوئی تھیں۔ ہر کوئی چھیڑ رہا تھا دونوں پھڑکی بہنوں نے خوب باتیں کی تھیں۔

”کاش ایک ہم شکل جوڑا اللہ میاں ہمارے ناپ کا بھی بھیج دیتا۔“ یاسر نے حسرت بھر لہجے میں کہا۔

”یاسر بھائی! یہ بھی دونوں ہم شکل جوڑاں بہنیں ہیں۔“

جوانے دو بندروں کی تصویر یاسر کے آگے کر دی۔

شعاع ایک عرصے بعد آغا دوس واپس آئی تھی۔ اس نے کتنے ہی چکر لگائے تھے ساری کوشش کے علینہ اور اسے زیادہ تر ایک ساتھ ہی رہتیں۔ اس روز دونوں نے ہم رنگ کپڑے پہنے تو سب کو دھوکا ہوا یا سر کو تو تھپڑ بھی پکاتا تھا۔

”خدا کے واسطے لوکیوں خدا نے تو شکل بنانے میں کوئی فرق نہیں چھوڑا۔ تم لوگ کپڑے تو مختلف پہنا دو۔ ہماری تو چلو خمر ہے مگر آپ لوگوں کے مگتیر حضرات کو پریشانی ہوتی ہے۔ ہاتھ میں ننگر لیے سوچتے رہتے ہا کہ کون سی شعاع ہے۔ کون سی علینہ..... جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو وہ ننگر۔“

”وہ ننگر یاں تمہیں مارنا شروع ہو جاتے ہیں۔“ یاسر کا جملہ راشو نے مکمل کیا۔

”آجے راشو بھائی بیٹھے۔“

شعاع آگے بڑھ گئی تو راشو تھی ہی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس شعاع کے پیچھے بھاگ بھاگ کر تھک چکا تھا جو اس کے لیے سیراب اور ہومی کے لیے زندگی کی سب سے بڑی اور خوبصورت حقیقت تھی۔

تو پھر یہ کہاں کی محفل مندی ہے کہ انسان سیراب کے پیچھے بھاگ۔ بھاگ کر اپنا وجود ختم کر بیٹھے۔ کیوں حقیقت کو دل سے تسلیم کرے۔

”بہت خفا ہو علینہ مجھ سے؟“ وہ علینہ کی طرف مڑا۔

”نہیں میں آپ سے بالکل بھی خفا نہیں..... میں ایسے شخص سے خفا نہیں ہونا چاہتی جو جذبات کی پہچان

مل رکھتا۔

علینہ نے بمثل آواز کی لرزش کو روکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اگلے روز اس کی برتھ ڈے تھی۔ کسی کو خیال ہی نہ تھا حتیٰ کہ خود راشو کو بھی نہیں تھا مگر رات جب وہ کمرے میں آیا تو اس کے بیڈ پر پھولوں کے ساتھ ایک ٹیس سا کارڈ اور اس کی پسند کا پرنوم علینہ کی چاہت کی طرح مہک رہا تھا۔ وہ مسکرا اٹھا اور آہستگی سے علینہ کے کمرے میں چلا آیا وہ لائٹ آف کیے بالکونی میں پورے چاند کو دیکھ رہی تھی۔

”جن کو چاہا جاتا ہے۔ ان کو اتنا ترپایا تو نہیں جاتا علینہ۔“

راشو نے آہستگی سے اس کے نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے تو آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب راشو کے ہاتھوں کی زمین پر پھیل گیا۔

”میں نے تو کبھی آپ سے، یہ گلہ نہیں کیا راشو! کہ جن کو چاہا جاتا ہے۔ ان کو اتنا ترپایا رلا یا نہیں جاتا۔“

اس نے ایک ہی جملے میں سب کچھ کہہ دیا تو راشو نام ہو گیا۔

”سوری علینہ! میں ہی بھگ گیا تھا۔ جذبوں کو میں ہی پہچان نہیں سکا۔ آئندہ جیسے کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی وعدہ رہا۔“ راشو نے خلوص دل سے معافی مانگی تو وہ مان گئی۔ خیال آیا کہ راشو کافی دیر سے اس کے ہاتھ تھامے کھڑا ہے۔ ایک حجاب آلود سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔

جب سے علینہ کی غلط فہمی دور ہوئی تھی۔ وہ بہت شوخ ہو گئی تھی اور ہوی کو ان دونوں خوب چھیڑ رہی تھی۔ اس روز بھی لان میں ایزی چیئر پر بیٹھی تھی کہ ہوی سب کی نظر بچا کر اس کی طرف آ گیا۔

”اور جناب اب تو آپ نے معاف کر دیا ناں۔ ہماری ساری غلطیوں کو پتا ہے امی نے ان خوبصورت ہاتھوں میں پہنانے کو بے حد خوبصورت انگلیٹی بنوائی ہے۔ بولو امی کا یہ بیٹا قبول ہے ناں۔“

ہوی نے ذرا سا بھگ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر جیسے ہی اس کا سر مرین ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ چل کر پیچھے ہٹ گئی۔

”آپ کو جرات کیسے ہوئی ہمایوں صاحب کہ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کسی کا کوئی فیصلہ قبول نہیں۔ یہ میری اپنی زندگی ہے اور اپنی زندگی کے بارے میں میں خود فیصلہ کروں گی۔“ وہ پھٹ پڑی ہوی تو ہونق نکل بنائے اسے دیکھتا رہا گیا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو شعاع، قیامت آ جائے گی کمر میں۔ اگر تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو۔۔۔۔۔ ہوی کی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”آتی ہے تو آئے۔ سب کی وجہ سے آتی ہے تو میری وجہ سے بھی آئے۔ میں صرف آپ کی اور آپ کی والدہ کی وجہ سے کمر چھوڑ کر گئی تھی۔ میں آپ سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ میں راشو سے شادی کروں گی۔

میں ابھی جا کر بیڑوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتی ہوں۔“

ہوی کے تو کان سانس سانس کر رہے تھے۔ اور علینہ اپنی باتوں کی تباہ کاریاں کن اکیوں سے ہوی کے چہرے پر دیکھتی وہاں سے کھٹک گئی۔ اور اپنا یہ کارنامہ سوائے شعاع کے سب کو سنایا اور سب ہی محفوظ ہوئے۔

”ہوی بیوقوف تو نہیں ہو گئے؟“

”نہیں مگر بھی ان کی حالت دیکھنے والی تھی۔ اب مرے کو تب۔“

علینہ تو شرارت کر کے آگئی تھی مگر ہوی تو جیسے جم گیا تھا اپنی جگہ پر۔ بار بار وہ الفاظ کانوں میں سیسہ کی طرح اتر رہے تھے۔ سب لوگ خوش تھے۔ بہاروں کا میلہ لگا ہوا تھا مگر اس کا دل بجا ہوا تھا سب کہیں باہر جا رہے تھے شعاع نے سب میں ہوی کو نہ دیکھا تو اس کے کمرے میں آ گئی۔

”آپ نہیں چلیں گے ہوی؟“ وہ ہوی کی طرف بڑھی تو ہوی کا دماغ خراب ہو گیا۔ اس نے شعاع کو جھوٹا ملا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں مر جاؤں گا تمہارے بغیر۔ جاؤ جا کر کہہ دو کہ تم مجھ سے نہیں راشو سے

شادی کرنا رہتی ہو۔ میں نے تو بہت غلم ڈھائے ہیں ناں۔ انتقام لے لو جاؤ۔ چلی جاؤ یہاں سے۔“ وہ دھاتار رہا وہ ڈرتی رہی۔

”ہوی ایسے کیا ہے کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“

پھر شعاع سے وہاں کھڑا نہ ہوا گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر گئی اسی وقت علینہ اور صدف نے اسے ساری بات بتادی۔

”کتنی بد فیئر ہو تم۔ کیوں بھگ کیا ہوی کو اسی لیے وہ اتنے خفا ہو گئے ہیں۔ جاؤ متاؤ ان کو ساری صورتحال بتاؤ جا کر۔“ شعاع نے علینہ کو ڈانٹا۔

”بھئی یہ تمہارا اور دوسرے متاؤ جا کر۔“

علینہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ شعاع پھر بہت کر کے کمرے میں آئی وہ ریٹک سے لٹک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا تو وہ چمک کر مڑا۔ اسے دیکھ کر پھر ٹھکی سے منہ موڑ لیا۔

”کوئی تیر باقی رہ گیا ہے کیا؟“ ہوی بہت زیادہ خفا تھا۔

”خفا تو مجھے ہونا چاہیے کہ آپ کو اپنی محبت کی پہچان نہیں۔“

شعاع نے ہلکی سی ٹھکی سے کہا تو ہوی چمک پڑا۔

”کیا مطلب؟“ اور جواب میں شعاع نے ساری بات اسے بتادی تو وہ ہاتھ پر مکا مار کر رہ گیا۔

”علینہ کی بچی کو میں نے بہن بنایا تھا۔ وہ سالی ہی بن بیٹھی۔“ ہوی نے اپنے شانے پر رکھا اس کا ہاتھ

اپنے میں لے لیا۔

شعاع کے چہرے پر حیا کی سرخیاں اتر آئیں۔

سب خوش تھے سب کی خوشیاں مکمل تھیں ایک جی داماں تھیں تو عالی اور فرمان اس سلسلے میں خود کو مجرم سمجھ

رہے تھے۔

”عالی امیں اس جہاں میں بھی اور اس جہاں میں بھی اگر قرض دار ہوں تو صرف تمہارا۔ تم نے زندگی کے

سارے خواب میرے حوالے سے دیکھے اور میں۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکا۔“

فرمان آج بے حد نام سے عالی سے مخاطب تھے۔ عالی یوں فرمان کے ساتھ ٹپکتے ہوئے خود کو دنیا کی

## اختتام

”بکومت جاؤ“۔ ہومی دھارڑا